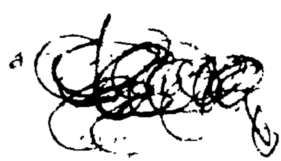


سہ ماہی

اردو

شمارہ خصوصی یاد غالب

۰ - ۴۵ شمارہ - ۱

جنوری ، فروری ، مارچ

۱۹۶۹ء

انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ

کراچی-۱

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	استاد شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔
مخمور اکبر آبادی	کراچی۔
نادم سیتاپوری	سیتاپور۔
کلب علی خاں فائق	مجلس ترقی ادب، لاہور۔
سید مرتضیٰ حسین فاضل	لاہور۔
محمد علی صدیقی	کراچی۔
مسلم ضیائی	کراچی۔
لطف اللہ	استاد شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، کراچی۔
سید سجاد حسین رضوی	ایگزیکٹو انجینئر، ایم ای ایس، حکومت پاکستان، کراچی۔
سید معین الرحمان	استاد شعبۂ اردو، ایف سی کالج، لاہور۔
خلیل قدوائی	انجمن ترقی اردو، کراچی۔
شمیم احمد	انجمن ترقی اردو، کراچی۔

فہرست مضامین

طابع: انجمن پریس، لارنس روڈ کراچی
ناشر: انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ کراچی
خطاطی سرورق: محمد اقبال ابن پروین رقم (تمغۂ خدمت)
قیمت فی پرچہ: تین روپے پچاس پیسے
قیمت سالانہ: چودہ روپے

اس شمارے کی قیمت:
12/= آٹھ روپے

حرفِ چند

غالب کی صد سالہ برسی تمام دنیا میں منائی جا رہی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ برصغیر کے کسی فن کار کو برصغیر سے باہر بھی اتنے بڑے پیمانے پر یاد کیا گیا ہو۔ بڑا فن کار زمان و مکان کی حدود توڑ کر اپنی عظمت کا لوہا منواتا ہے، آج غالب بھی انھی معنوں میں ایک بڑا فن کار ہے۔

غالب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اردو میں اقبال کے بعد کسی فنکار کے بارے میں اتنا کچھ نہیں لکھا گیا، لیکن ابھی غالب پر لکھنے کی بہت کچھ گنجائش ہے، کیوں کہ ہر عہد بڑے شاعر کی تفسیر و تعبیر خود اپنے جداگانہ انداز سے کرتا ہے۔ غالب کی شاعری ہر عہد میں زندہ رہی ہے اور رہے گی اور اسی لیے اس کے بارے میں ہر عہد کے سوچنے والے اپنا اپنا زاویۂ نظر پیش کرتے رہیں گے۔ غالب کے فن کی طرح اس کے حالاتِ زندگی بھی ہمارے محققین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ آئے دن غالب کے بارے میں بہت سی نئی باتیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں، یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہماری تحقیق اور تنقید کا سب سے بڑا موضوع غالب ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی پر انجمن نے جو اشاعتی منصوبہ بنایا ہے، اردو کا زیر نظر شمارہ اس کا ایک حصہ ہے۔ اس شمارے میں غالب کی شخصیت اور فن کے بارے میں بعض نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ توقع ہے کہ یہ مجموعہ علمی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔ ہم اپنے لکھنے والوں کے بے حد ممنون ہیں کہ ان کے تعاون سے بہت کم وقت میں یہ خاص اشاعت منظر عام پر آ رہی ہے۔ ان میں سے بعض اہل قلم نے اپنے پسندیدہ موضوعات پر لکھا ہے اور بعض نے ہمارے پیش کردہ عنوانات کے تحت اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ تمام موصولہ مقالات اس شمارے میں شایع نہیں کیے جا سکے۔ ڈاک کی بد نظمی کی وجہ سے بعض مقالات بہت تاخیر سے موصول

ہوئے ، اگر انھیں بھی شامل کیا جاتا تو یہ شمارہ وقت پر شایع نہیں ہوسکتا تھا - اب یہ طے کیا گیا ہے کہ 'اردو' کا آیندہ شمارہ بھی غالب ہی کے بارے میں ہو -

'اردو' کے زیر نظر شمارے کے علاوہ ماہ نامہ 'قومی زبان' کی جنوری سے مارچ تک کی اشاعتیں بھی غالب ہی سے منسوب ہیں - نیز مندرجہ ذیل پانچ کتابیں بھی جو غالب سے متعلق ہیں، شائع کی گئی ہیں -

١- فلسفۂ کلام غالب	ڈاکٹر شوکت سبزواری
٢- غالب ، ایک مطالعہ	پروفیسر ممتاز حسین
٣- غالب نام آور	سہ ماہی 'اردو' میں غالب سے متعلق شائع شدہ مضامین کا انتخاب
٤- ہنگامۂ دل آشوب	مرتبہ سید قدرت نقوی
٥- مہر نیم روز (اردو ترجمہ)	پروفیسر عبدالرشید فاضل

ان کے علاوہ عام اردو ادب سے متعلق چند کتابیں بھی اس موقعے پر شائع کی جا رہی ہیں -

سرورق کی تصویر

یہ تصویر ۱۲۸۲ھ کی بنی ہوئی ہے اور صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی مرحوم کے کتب خانے میں محفوظ ہے - یہ تصویر اصل رنگوں میں شائع کی جا رہی ہے ، جس کے لیے ادارہ مولانا خیر بھوروی کا ممنون ہے -

غالب کی صحیح تاریخ پیدائش

سید صمد حسین رضوی

عام طور پر یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ عیسوی روز چہار شنبہ ہے ۔ یہاں تک کہ مولانا غلام رسول مہر نے بھی اپنی کتاب ”غالب“ میں یہی تاریخ پیدائش لکھی ہے اور جناب مالک رام صاحب نے بھی ”ذکر غالب“ میں اسی تاریخ پیدائش کو صحیح بتایا ہے ۔ لیکن یہ معلوم کر کے اہل علم و ادب حضرات کو حیرت ہوگی کہ غالب کی صحیح تاریخ پیدائش وہ نہیں ہے جو عام طور پر مشہور ہو گئی ہے ، بلکہ جیسا کہ ذیل کے صفحات میں ثابت کیا جائے گا ، اُن کی صحیح تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز یکشنبہ ہے ۔ غالب یک شنبے کے دن اکبر آباد یعنی آگرے کے مقام پر علی الصباح طلوع آفتاب سے چار گھڑی قبل یعنی انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق صبح پانچ بج کر ۳۶ منٹ پر پیدا ہوئے تھے ۔

اگرچہ اہل اسلام ، اہل یونان اور اہل مغرب کے اصول کے مطابق غالب کی پیدائش اتوار کے دن ہی ہوئی تھی ، کیونکہ اہل اسلام کا دن ایک غروب آفتاب سے دوسرے غروب آفتاب تک سمجھا جاتا ہے ، و اہل یونان و اہل مغرب کا دن ایک نصف شب سے دوسری نصف شب تک مانا جاتا ہے ۔ لیکن ہندوؤں کی تقویم کے مطابق غالب کی پیدائش سنیچر کے دن کی سمجھی جائے گی کیونکہ ہندوستان کے تمام جیوتشی عام طور پر دن کا شمار ایک طلوع آفتاب سے دوسرے طلوع آفتاب تک کرتے ہیں ۔ چونکہ غالب اتوار کا سورج نکلنے سے چار گھڑی پہلے پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کی پیدائش اتوار کے دن

میں شمار نہیں کی جائے گی بلکہ اس سے پچھلے دن یعنی سنیچر کے دن میں شمار ہوگی ۔ ہندو جیوتشیوں کے مطابق نئے دن کی ابتدا طلوع آفتاب سے ہوتی ہے۔ ایک دن رات کی مدت کو ساٹھ برابر کے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر حصے کو ایک گھڑی کہتے ہیں ۔ ہر گھڑی کے بھی ساٹھ حصے کئے جاتے ہیں اور ہر حصے کو ایک پل کہتے ہیں ۔ طلوع آفتاب سے پیدائش کے وقت تک جتنی مدت گھڑی پل میں گزر جاتی ہے اسے ''اشٹ کال'' کہتے ہیں ۔ لہذا ہندو جیوتش کے مطابق غالب کی پیدائش سنیچر کے دن ، ۹ء گھڑی صفر پل اشٹ کال پر ہوئی تھی ، اور پیدائش کے وقت سمبت ۱۸۵۴ بکرمی تھا ، شاکا ۱۷۱۸ شالباہن تھا ، پوس کا مہینہ تھا ، شدی پا کھ تھا ، دشمی تتھی تھی ، بھرنی نکشتر تھا ، سادھیہ یوگ تھا ، تیتل کرن تھا ، اور دھن راس کی لگن تھی ۔

مندرجہ بالا تمام تفصیلات میں نے غالب کے اس زائچے کی مدد سے حساب لگا کر حاصل کی ہیں جو غالب کے '' کلیات فارسی '' کے نولکشوری ایڈیشن میں شائع ہوا تھا اور جس کا عکس اس مضمون کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے ۔ اس زائچے کے ساتھ ہی غالب کا وہ عظیم الشان قصیدہ بھی ہے جو انھوں نے سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں کہا ہے ۔ اس قصیدے کا ایک ایک لفظ پڑھنے ، سمجھنے اور غور کرنے کے قابل ہے ۔ اس قصیدے کی تشبیب میں غالب نے اپنے اسی زائچے پر سیر حاصل تبصرہ اپنے خاص انداز میں کیا ہے ، اور بڑے عالمانہ و شاعرانہ پیرائے میں زائچے کے مختلف سیاروں کے سعد و نحس اثرات کا ذکر کیا ہے جس سے بلا شک و شبہ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ غالب علم نجوم پر کامل عبور رکھتے تھے ۔ اس زائچے کی تفصیل اور متعلقہ قصیدے کی تشبیب پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ عام پڑھنے والوں کی سہولت اور دلچسپی کے لیے علم نجوم کی وہ چند ابتدائی باتیں اور اصطلاحات نہایت اختصار کے ساتھ آسان الفاظ میں بیان کردی جائیں جن کو سمجھے بغیر زائچے کی تفصیل اور قصیدے کی تشبیب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی ۔

منجمین نے آسمان پر اس فرضی دائرے کو ، جس پر آفتاب اور دیگر سیارے حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ، بارہ برابر کے حصوں میں تقسیم کرلیا ہے اور ہر حصے کو برج کہتے ہیں ۔ ان بروج کے سعد و نحس اثرات وغیرہ بھی مقرر کر لیے گئے ہیں جو کسی بھی نجوم کی کتاب کو پڑھ کر

معلوم کئے جاسکتے ہیں - اس مقام پر میں صرف وہی باتیں بتاؤں گا جن کا تعلق نفس مضمون سے ہے - چونکہ پورے دائرے میں ۳۶۰ درجے ہوتے ہیں اس لیے ہر برج میں ۳۰ درجے شمار کئے جاتے ہیں اور ہر درجے کے ساٹھویں حصے کو دقیقہ کہتے ہیں - ان بارہ بروج کے عربی نام بالترتیب یہ ہیں - (۱) حمل (۲) ثور (۳) جوزا (۴) سرطان (۵) اسد (۶) سنبلہ (۷) میزان (۸) عقرب (۹) قوس (۱۰) جدی (۱۱) دلو (۱۲) حوت - برج حوت کے فوراً بعد پھر برج حمل شروع ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح ایک دائرے کے اندر چلتا رہتا ہے - ہندوؤں کی پترہ کے مطابق برج کو راس کہتے ہیں اور ان بارہ راسوں کے نام بالترتیب یہ ہیں - (۱) میکھ (۲) برکھ (۳) متھن (۴) کرک (۵) سنگھ (۶) کنیا (۷) تلا (۸) برشچک (۹) دھن (۱۰) مکر (۱۱) کنبھ (۱۲) مین - ان بروج کے نام ان فرضی شکلوں کے مطابق رکھے گئے ہیں جو مختلف مجمع النجوم کی وجہ سے آسمان پر نظر آتی ہیں اور مشاہدہ فلک کی ذرا سی مشق کے بعد آسانی سے پہچانی جاسکتی ہیں - لہذا حمل کی شکل ایک مینڈھے کی طرح ہے جس کا مزاج آتشی ہے اور خاصیت منقلب ہے - ثور کی شکل ایک سانڈ کی طرح ہے جس کا مزاج خاکی ہے اور خاصیت ثابت ہے - جوزا کی شکل دو انسانی جسموں کی طرح ہے جس کا مزاج بادی ہے اور خاصیت ذوجسدین ہے - سرطان کی شکل ایک کیکڑے کی طرح ہے جس کا مزاج آبی ہے اور خاصیت منقلب ہے - اسد کی شکل ایک شیر کی طرح ہے جس کا مزاج آتشی ہے اور خاصیت ثابت ہے - سنبلہ کی شکل ایک لڑکی کی طرح ہے جس کا مزاج خاکی ہے اور خاصیت ذوجسدین ہے - میزان کی شکل ایک ترازو کی طرح ہے جس کا مزاج بادی ہے اور خاصیت منقلب ہے - عقرب کی شکل ایک بچھو کی طرح ہے جس کا مزاج آبی ہے اور خاصیت ثابت ہے - قوس کی شکل ایک کمان کی طرح ہے جو ایک عجیب و غریب مخلوق کے ہاتھ میں ہے ، جس کا مزاج آتشی ہے اور خاصیت ذوجسدین ہے - جدی کی شکل ایک عجیب الخلقت جانور کی طرح ہے جو دریائی بھی ہے ، صحرائی بھی ہے اور چھپ کر حملہ کرتا ہے ، جس کا مزاج خاکی ہے اور خاصیت منقلب ہے - دلو کی شکل ایک گھڑے کی طرح ہے جو ایک مرد کے ہاتھ میں ہے جس کا مزاج بادی ہے اور خاصیت ثابت ہے - حوت کی شکل دو مچھلیوں کی طرح ہے جن کی دمیں جڑی ہوئی ہیں - اس برج کا مزاج آبی ہے اور خاصیت ذوجسدین ہے -

برج حمل کی ابتدا کی شناخت کے لیے آسمان پر ایک چھوٹا سا ستارہ

مقرر کر لیا گیا ہے جسے اصطلاح نجوم میں نقطۂ اول حمل کہتے ہیں۔ اہل مغرب اس ستارے کو زیٹا پسیم کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہی وہ نقطہ تھا جہاں پر جب شمس پہنچتا تھا تو تمام دنیا میں دن اور رات برابر ہوجاتے تھے اور موسم اعتدال پر آجاتا تھا، اسی لیے اسے نقطۂ اعتدال بھی کہتے تھے اور چونکہ اس وقت فصل ربیع کا زمانہ ہوتا تھا اس لیے اسے نقطۂ اعتدال ربیعی کہتے تھے۔ لیکن سینکڑوں سال بعد معلوم ہوا کہ نقطۂ اعتدال ربیعی دراصل نہایت اہستہ آہستہ نقطۂ اول حمل سے پیچھے کی طرف ہٹ رہا ہے، یعنی شمس نقطۂ اول حمل پر پہنچنے سے پہلے ہی نقطۂ اعتدال ربیعی پر پہنچ جاتا ہے اور اس طرح شمس کے برج حمل میں داخل ہونے سے پہلے ہی دن رات برابر ہو جاتے ہیں اور موسم اعتدال پر آجاتا ہے۔ یہ فرق معلوم ہونے کے بعد اہل یونان نے نقطۂ اعتدال ربیعی ہی کو نقطۂ اول حمل بھی مان لیا اور عہد قدیم میں مقرر شدہ چھوٹے سے شناختی ستارے کو نظر انداز کردیا، اور بارہ بروج کی ابتدا نقطۂ اعتدال ربیعی ہی سے شمار کرنی شروع کردی۔ لیکن اہل ہند نے پیچھے ہٹتے ہوئے نقطۂ اعتدال ربیعی کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور بارہ بروج کی ابتدا اسی چھوٹے سے ستارے سے کرتے رہنے کا فیصلہ کیا جو عہد قدیم میں نقطۂ اول حمل کی شناخت کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اسی وقت سے اہل یونان اور اہل ہند کی تقویم میں فرق پڑ گیا۔ اس طرح اہل یونان کے بروج دراصل آسمانی مجمع النجوم کی شکلوں کے پابند نہیں رہے بلکہ محض فرضی و عارضی ہوکر رہ گئے، جو متواتر پیچھے کی طرف سرکتے جارہے ہیں۔ لیکن اہل ہند کے بروج عہد قدیم کی طرح اب بھی مجمع النجوم کی شکلوں کے پابند ہیں اور حقیقی ومستقل ہیں جو کبھی آگے یا پیچھے نہیں سرکتے۔ بہرحال یہ فرضی نقطۂ اول حمل آہستہ آہستہ حقیقی نقطۂ اول حمل سے پیچھے سرکتا جارہا ہے اور ایک سال میں تقریباً ایک دقیقے سے کچھ کم پیچھے سرک جاتا ہے۔ ان دونوں نقطوں کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے اسے اہل ہند اینانش کہتے ہیں۔ یعنی اگر استخراج تقویم ہندی کے مطابق معلوم کئے ہوئے ستاروں کے مقامات میں اینانش کو جمع کردیا جائے تو تقویم یونانی حاصل ہو جائے گی اور اس کے برعکس اگر استخراج تقویم یونانی میں سے اینانش کو تفریق کردیا جائے تو تقویم ہندی حاصل ہوجائے گی۔ اینانش کی مقدار میں بھی منجمین کا بہت کچھ اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف چند درجوں یا چند دقیقوں سے زیادہ نہیں ہے۔ غالب کی پیدائش کے وقت اینانش تقریباً

۲ درجے تھا ، اور آن کا زائچہ موافق استخراج تقویم یونانی بنایا گیا تھا ۔

مندرجہ بالا بارہ بروج کی شکلوں کے تمام ستارے اپنی جگہ ہمیشہ قائم اور ت رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان بروج کی شکلیں بھی ہمیشہ یکساں رہتی ں ۔ ان ثوابت کے درمیان چند ستارے بھی نظر آتے رہتے ہیں جو اپنی گہ قائم نہیں رہتے بلکہ ہمیشہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ تبدیل کرتے ہے ہیں ۔ یہ ستارے کبھی مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہوئے ظر آتے ہیں اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف سرکتے ہوئے معلوم وتے ہیں ۔ جب یہ ستارے مغرب سے مشرق کی طرف چلتے ہیں تو آن کی تار کو سیدھی چال یا استقامت کہتے ہیں ، اور جب یہ مشرق سے مغرب ی طرف چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تو ان کی رفتار کو آلٹی چال یا رجعت کہتے ہیں ۔ ان سیاروں کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں رہتی بلکہ کبھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی دھیمی پڑ جاتی ہے ۔ ان سیاروں میں شمس اور قمر سب سے زیادہ روشن ہیں ۔ ان دونوں کو نیرین کہتے ہیں اور یہ ہمیشہ استقامت میں رہتے ہیں ۔ نیرین کے علاوہ پانچ سیارے مریخ ، عطارد ، مشتری ، زہرہ ور زحل بھی ہیں جو کبھی استقامت میں ہوتے ہیں ، کبھی رجعت میں ، سی لیے ان پانچوں کو خمسۂ متحیرہ کہتے ہیں ۔ ان کے علاوہ دو فرضی قطے بھی ہیں جو در اصل مدار شمسی ور مدار قمری کے نقاط تقاطع ہیں ۔ ایک نقطے کو ذنب اور دوسرے قطے کو راس کہتے ہیں ۔ علم نجوم میں ان دونوں کو بھی شمس جیسے نیک و نحس سیاروں کی سی حیثیت دیدی گئی ہے ۔ یہ دونوں ہمیشہ رجعت میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے ہمیشہ چھ بروج کے فاصلے پر رہتے ہیں ۔ یعنی ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابل اور روبرو رہتے ہیں اس لیے اگر ایک کا مقام معلوم ہو جائے تو دوسرے کا مقام خود بخود حاصل ہو جاتا ہے ۔ ہندوؤں کی پترہ کے مطابق ان نو سیاروں کے نام بالترتیب یہ ہیں ۔ (۱) سورج (۲) چندر (۳) منگل (۴) بدھ (۵) برہسپتی (۶) شکر (۷) شنی (۸) راہو (۹) کیتو ۔ یہی نو عدد سیارے زیادہ مشہور ہیں اور ان سیاروں کے مختلف سعد و نحس اثرات مفصل طور پر مقرر کر لیے گئے ہیں جو علم نجوم کی مختلف کتابوں میں درج ہیں ۔ ان کی حرکتوں کا صحیح حساب بھی معلوم کر لیا گیا ہے جو علم ہیئت کی مختلف کتابوں میں درج ہے ۔ پڑھنے والوں کی واقفیت کے لیے صرف چند ضروری باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔

شمس : شمس نحس سیارہ سمجھا جاتا ہے اور فلک چہارم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج آتشی ہے اور شہنشاہ فلک کہلاتا ہے ۔ قمر ، مریخ اور مشتری اس کے دوست ہیں ۔ زہرہ اور زحل اس کے دشمن ہیں ۔ عطارد اس سے بے تعلق ہے ۔ یہ برج اسد کا مالک ہے اور برج دلو میں اس پر وبال آتا ہے ۔ حمل میں شرف اور میزان میں ہبوط ہوتا ہے ۔ جوزا میں اوج اور قوس میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً ایک دن میں ، ایک برج کو تقریباً ایک مہینے میں ، اور پورے دائرۂ بروج کو تقریباً ایک سال میں طے کر لیتا ہے ۔ یہ ہمیشہ استقامت میں رہتا ہے ۔

قمر : قمر سعد سیارہ سمجھا جاتا ہے اور فلک اول سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج آبی ہے اور وزیر فلک کہلاتا ہے ۔ شمس اور عطارد اس کے دوست ہیں ۔ کوئی اس کا دشمن نہیں ہے ۔ مریخ ، مشتری ، زہرہ اور زحل اس سے بے تعلق ہیں ۔ یہ برج سرطان کا مالک ہے ، برج جدی میں اس پر وبال آتا ہے ۔ ثور میں شرف اور عقرب میں ہبوط ہوتا ہے ۔ اس کے اوج و حضیض تیز رفتاری سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور حساب لگا کر معلوم کرنے پڑتے ہیں ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً پونے دو گھنٹے میں ، ایک برج کو تقریباً سوا دو دن میں ، اور پورے دائرۂ بروج کو تقریباً ایک مہینے میں طے کر لیتا ہے ۔ یہ بھی شمس کی طرح ہمیشہ استقامت میں رہتا ہے ۔

مریخ : مریخ نحس اصغر ہے اور فلک پنجم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج آتشی ہے اور جلاد فلک کہلاتا ہے ۔ شمس ، قمر اور مشتری اس کے دوست ہیں ۔ عطارد اس کا دشمن ہے ۔ زہرہ اور زحل اس سے بے تعلق ہیں ۔ یہ حمل و عقرب کا مالک ہے اور ثور و میزان میں اس پر وبال آتا ہے ۔ جدی میں شرف اور سرطان میں ہبوط ہوتا ہے ۔ اسد میں اوج اور دلو میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً دو دن میں ، ایک برج کو تقریباً دو مہینے میں ، اور پورے دائرۂ بروج کو تقریباً دو سال میں طے کر لیتا ہے ۔ یہ ایک سال میں تقریباً دس مہینے تک استقامت میں رہتا ہے اور تقریباً دو مہینے تک رجعت میں رہتا ہے ۔

عطارد : عطارد جیسے سیاروں کے ساتھ ہوتا ہے ویسا ہی سعد و نحس ثمرہ دیتا ہے ، اور فلک دوم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج بادی ہے اور

فلک کہلاتا ہے ۔ شمس اور زہرہ اس کے دوست ہیں ۔ قمر اس کا دشمن
۔ مریخ مشتری اور زحل اس سے بے تعلق ہیں ۔ یہ جوزا و سنبلہ کا مالک
ر قوس و حوت میں اس پر وبال آتا ہے۔ سنبلہ میں شرف اور حوت میں ہبوط
تا ہے ۔ میزان میں اوج اور حمل میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط
ر سے ایک درجے کو تقریباً چھ گھنٹے میں ، ایک برج کو تقریباً ساڑھے
ن دن میں ، اور پورے دائرہ بروج کو تقریباً تین مہینے میں طے کر سکتا ہے ،
ن چونکہ یہ ہمیشہ شمس کے آس پاس ہی رہتا ہے ، اور کبھی سیدھی
ھی اُلٹی چال چلتا ہے ۔ اس لیے یہ بھی تمام آسمان کا چکر کم و بیش
ں عرصے میں لگاتا ہے جس عرصے میں شمس لگاتا ہے ۔ یہ چار مہینے میں
یباً اٹھانوے دن استقامت میں رہتا ہے اور تقریباً بائیس دن رجعت میں رہتا
۔ یعنی یہ ایک سال میں تین دفعہ راجع ہوتا ہے ۔

مشتری : مشتری سعد اکبر ہے اور فلک ششم سے تعلق رکھتا
۔ اس کا مزاج بادی ہے اور قاضی فلک کہلاتا ہے ۔ شمس ، قمر اور مریخ
ں کے دوست ہیں ۔ عطارد اور زہرہ اس کے دشمن ہیں ، زحل اس سے
ے تعلق ہے ۔ یہ قوس و حوت کا مالک ہے اور جوزا و سنبلہ میں اس پر
بال آتا ہے ۔ سرطان میں شرف اور جدی میں ہبوط ہوتا ہے ۔ حوت میں اوج
ر سنبلہ میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریبا
رہ دن میں ، ایک برج کو تقریباً ایک سال میں ، اور پورے دائرہ بروج کو
ریباً بارہ سال میں طے کر لیتا ہے ۔ یہ ایک سال میں تقریباً آٹھ مہینے تک
ستقامت میں رہتا ہے اور تقریبا چار مہینے تک رجعت میں رہتا ہے ۔

زہرہ : زہرہ سعد اصغر ہے اور فلک سوم سے تعلق رکھتا ہے ۔
س کا مزاج بادی ہے اور رقاصۂ فلک کہلاتا ہے ۔ عطارد اور زحل اس کے
وست ہیں ۔ شمس اور قمر اس کے دشمن ہیں ۔ مریخ اور مشتری اس سے
بے تعلق ہیں ۔ یہ ثور و میزان کا مالک ہے اور حمل و عقرب میں اس پر وبال
تا ہے ۔ حوت میں شرف اور سنبلہ میں ہبوط ہوتا ہے ۔ جوزا میں اوج اور
وس میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً
سولہ گھنٹے میں ، ایک برج کو تقریباً بیس دن میں ، اور تمام دائرۂ بروج
کو تقریباً آٹھ مہینے میں طے کر سکتا ہے ، لیکن چونکہ عطارد کی طرح یہ
بھی ہمیشہ شمس کے آس پاس ہی رہتا ہے ، اس لیے یہ بھی تمام آسمان کا

چکر کم و بیش اتنے ہی عرصے میں لگاتا ہے جتنے عرصے میں شمس لگاتا ہے ۔ یہ ایک سال میں تقریباً گیارہ مہینے تک استقامت میں رہتا ہے اور تقریباً ایک مہینے تک رجعت میں رہتا ہے ۔

زحل : زحل نحس اکبر ہے اور فلک ہفتم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج خاکی ہے اور دہقان فلک کہلاتا ہے ۔ عطارد اور زہرہ اس کے دوست ہیں ۔ شمس ، قمر اور مریخ اس کے دشمن ہیں ۔ مشتری اس سے بے تعلق ہے ۔ یہ جدی و دلو کا مالک ہے اور سرطان و اسد میں اس پر وبال آتا ہے ۔ میزان میں شرف اور حمل میں ہبوط ہوتا ہے ۔ قوس میں اوج اور جوزا میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً ایک مہینے میں ، ایک برج کو تقریباً ڈھائی سال میں اور تمام دائرۂ بروج کو تقریباً تیس سال میں طے کر لیتا ہے ۔ یہ ایک سال میں تقریباً ساڑھے سات مہینے تک استقامت میں رہتا ہے اور تقریباً ساڑھے چار مہینے تک رجعت میں رہتا ہے ۔

راس اور ذنب : راس اور ذنب کو اہل ہند بالترتیب راہو اور کیتو کہتے ہیں ۔ یہ دونوں نحس سمجھے جاتے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابل اور روبرو یعنی چھ بروج کے فاصلے پر رہتے ہیں ۔ ان دونوں کو ایک اژدہے سے تشبیہ دی جاتی ہے جس کے سر کو راس اور دم کو ذنب کہتے ہیں ۔ اہل ہند راہو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن اہل یونان ذنب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ ان دونوں کی رفتار ہمیشہ یکساں رہتی ہے اور یہ دونوں ایک درجے کو تقریباً انیس دن میں ، ایک برج کو تقریباً انیس مہینے میں ، اور تمام دائرۂ بروج کو تقریباً انیس سال میں طے کر لیتے ہیں ۔ یہ دونوں ہمیشہ رجعت میں رہتے ہیں ۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد پڑھنے والوں کے ذہن میں بروج و سیارگان کا ایک دھندلا سا خاکہ آ گیا ہوگا ۔ جس کی مدد سے غالب کے زائچے کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جب کوئی سیارہ گردش کرتا ہوا اس برج میں پہنچتا ہے جو اس کا بیت یا گھر ہوتا ہے یعنی جس کا وہ مالک ہوتا ہے تو وہ سیارہ صاحب استقامت سمجھا جاتا ہے ، جب وہ اپنے برج وبال میں پہنچتا ہے تو صاحب ضعف سمجھا جاتا ہے ، جب وہ اپنے برج شرف میں پہنچتا ہے تو صاحب عزت سمجھا جاتا ہے ۔ جب

اپنے برج هبوط میں پهنچتا هے تو بے عزت سمجھا جاتا هے ، جب وہ
برج اوج میں پهنچتا هے تو بلند همت سمجھا جاتا هے ، جب وہ اپنے
حضیض میں پهنچتا هے تو پست همت سمجھا جاتا هے ۔ جب وہ اپنے
ت کے برج میں پهنچتا هے تو بشاش طبع سمجھا جاتا هے ، جب وہ اپنے
ن کے برج میں پهنچتا هے تو کبیدہ خاطر سمجھا جاتا هے ، جب وہ اپنے
ے تعلق کے برج میں پهنچتا هے تو اجنبی سمجھا جاتا هے ۔ جب وہ
امت میں هوتا هے تو تندرست سمجھا جاتا هے ، اور جب وہ رجعت
هوتا هے تو بیمار سمجھا جاتا هے ۔ غرض یه که هر سیارہ اپنی اصلیت ،
خاصیت ، اپنی حیثیت اور اپنی حالت وغیرہ کے مطابق مختلف زائچوں
مختلف ثمرہ دیتا هے ۔ منجمین نے مختلف بروج سیارگان کے انفرادی اور
ماعی اثرات بیان کرنے کا سب سے آسان طریقه یه نکالا هے که بروج
سیاروں کو مختلف صورتوں ، طبیعتوں اور کرداروں کے افراد فرض کر
هے اور زائچے میں جیسی ان کی حالت هوتی هے ویسی هی تاثیر اور ویسے هی
ات ان سے اخذ کر لیے جاتے هیں ۔ اس فن کو علم نجوم کی اصطلاح میں
تمزیج سیارگان '' کہتے هیں اور مرزا غالب اس فن کے میدان میں سب
گوئے سبقت لے گئے هیں ۔ تمزیج سیارگان کی افادیت کا دائرہ بهت وسیع
اور اس کا مفصل بیان کفایة التعلیم فی صناعة التنجیم میں کیا گیا هے ۔

اس مقام پر مناسب معلوم هوتا هے که تمزیج سیارگان کی چند مثالیں
ے کر اس فن کی کچھ وضاحت کردی جائے تاکہ غالب کے قصیدے کی تشبیب
مفهوم اچھی طرح سمجھ میں آسکے ۔ مثلاً زائچے میں زحل اگر اچھی
ت میں هو تو اسے دهقان یا کشاورز وغیرہ سے تشبیه دیتے هیں لیکن اگر وہ
ی حالت میں هو تو اسے کافر یا دزد وغیرہ سے تشبیه دیتے هیں ۔ مریخ اگر
ی حالت میں هو تو اسے سپاهی یا سپه سالار وغیرہ سے تشبیه دیتے هیں لیکن
وہ بری حالت میں هو تو اسے قاتل یا قصاب وغیرہ سے تشبیه دیتے هیں ۔
رہ اگر اچھی حالت میں هو تو اسے رقاصه یا مطربه وغیرہ سے تشبیه دیتے هیں
ن اگر وہ بری حالت میں هو تو اسے فاحشه یا قحبه وغیرہ سے تشبیه دیتے
ں ۔ اسی طرح دیگر سیاروں کے لیے بھی سمجھ لینا چاهیے ۔ ان سیاروں کے
می تعلقات کے لیے ان کی '' نظروں '' کو سمجھ لینا بھی ضروری هے ، یعنی
ر دو سیاروں کے درمیان چھ بروج کا فاصله هو تو کہا جاتا هے که وہ ایک
سرے کو نظر تنصیف سے دیکھ رهے هیں ۔ اگر چار بروج کا فاصله هو تو

اسے نظر تثلیث کہتے ہیں، اگر تین بروج کا فاصلہ ہو تو اسے نظر تربیع کہتے ہیں، اور اگر دو بروج کا فاصلہ ہو تو اسے نظر تسدیس کہتے ہیں۔ تنصیف کو مکمل دشمنی کی نظر، تثلیث کو مکمل دوستی کی نظر، تربیع کو نصف دشمنی کی نظر، اور تسدیس کو نصف دوستی کی نظر سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی زائچے میں مریخ اور زحل آپس میں ایک دوسرے کو نظر تربیع سے دیکھ رہے ہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ دونوں سیاروں پر ایک دوسرے کی نصف دشمنی کا برا اثر پڑ رہا ہے۔ یعنی اس زائچے کے مولود کو مریخ ایک بیدرد خاطر سنگدل انسان کی طرح ستا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی زحل بھی اس مولود کو خشم آلود کافر کی طرح برباد کر رہا ہے۔ یا مثلاً اگر کسی زائچے میں شمس، زحل اور زہرہ ایک ہی برج میں موجود ہوں اور اچھی حالت میں ہوں تو یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک شہنشاہ کے ساتھ ایک دہقان بیٹھا ہوا ہے اور ایک مطربہ ان دونوں کے سامنے گا رہی ہے۔ اسی قسم کی بہت سی اور بھی تشبیہات کو اصطلاحاً تمزیج سیارگان کہتے ہیں۔

تمزیج سیارگان کے بعد سہام کے متعلق بھی کچھ واقفیت بہم پہنچا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مختلف سہام کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کا مفصل بیان کتاب التفہیم لاوائل صناعتہ التنجیم میں موجود ہے۔ منجمین نے طالع کے لحاظ سے مختلف سیاروں کی ایک دوسرے سے دوری کی بنیاد پر مختلف سہام مقرر کیے ہیں جن کے استخراج کا طریقہ دن کے وقت کچھ اور ہوتا ہے اور رات کے وقت کچھ اور ہوتا ہے۔ چونکہ غالب کی پیدائش رات کے وقت ہوئی تھی اس لیے میں صرف رات کے وقت کا طریقہ بیان کروں گا اور صرف انھی چار سہام کا ذکر کروں گا جن کے نام غالب کے زائچے میں درج ہیں۔ سہم السعادت حاصل کرنے کے لیے شمس کے مقام میں سے قمر کے مقام کو تفریق کرتے ہیں اور حاصل تفریق میں طالع کو جمع کرتے ہیں۔ سہم الغیب معلوم کرنے کے لیے قمر کے مقام میں سے شمس کے مقام کو تفریق کرتے ہیں اور حاصل تفریق میں طالع کو جمع کرتے ہیں۔ سہم اولاد معلوم کرنے کے لیے مشتری کے مقام میں سے زحل کے مقام کو تفریق کرتے ہیں اور حاصل تفریق میں طالع کو جمع کرتے ہیں۔ سہم امراض معلوم کرنے کے لیے زحل کے مقام میں سے مریخ کے مقام کو تفریق کرتے ہیں اور حاصل تفریق میں طالع کو جمع کرتے ہیں۔ ان سہام کے بھی مختلف نیک و بد ثمرات مقرر کرلیے گیے ہیں لیکن ان کے متعلق یہاں کچھ بیان نہیں کیا جائے گا۔

اب زائچے کی شکل کے متعلق بھی چند ابتدائی باتیں درج کی جاتی ہیں تا کہ غالب کے زائچہ کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو سکے - کسی خاص شخص کی پیدائش کے وقت اُس کا زائچہ بنانے کے لیے بارہ خانوں والا ایک نقشہ دائرہ نما یا مربع نما ، یا مستطیل نما بنایا جاتا ہے - پھر پیدائش کی ساعت اور مقام پیدائش کے مطابق حساب لگا کر معلوم کیا جاتا ہے کہ اُس وقت افق مشرق میں کون سا برج طلوع ہو رہا ہے - جو برج طلوع ہو رہا ہوتا ہے اُسے اُس نقشے کے پہلے خانے میں لکھ دیا جاتا ہے اور اُس برج کے طلوع شدہ درجے اور دقیقے بھی اُس کے ساتھ ہی لکھ دیے جاتے ہیں - اس کے بعد اُس سے اگلے برج کو اُس نقشے کے دوسرے خانے میں لکھ دیا جاتا ہے اور پھر اُس نقشے کے باقی خانوں میں بھی باقی بروج بالترتیب لکھ دیے جاتے ہیں - اس طرح جو برج اُس وقت افق مغرب میں غروب ہو رہا ہوتا ہے وہ خود بخود اُس نقشے کے ساتویں خانے میں پڑ جاتا ہے ، جو برج سر کے اوپر خط نصف النہار پر ہوتا ہے وہ دسویں خانے میں پڑ جاتا ہے ، اور جو برج زمین کی دوسری سمت میں ہمارے قدموں کے نیچے (یعنی امریکہ کے نصف النہار پر) ہوتا ہے وہ چوتھے خانے میں پڑ جاتا ہے - اُن چاروں خانوں کو بہت ہی اہم سمجھا جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو وتد اور چاروں کو اوتاد کہتے ہیں - خصوصاً پہلے خانے کو یا اُس کے برج کو طالع اور ساتویں خانے کو یا اُس کے برج کو غارب کہتے ہیں - اہل ہند طالع کو لگن کہتے ہیں - اس کے بعد یہ حساب لگایا جاتا ہے کہ اُس دن اور تاریخ کو سیاروں کے مقامات کیا تھے - پھر جو سیارہ جس برج میں ہوتا ہے اُسے اُسی برج کے خانے میں لکھ دیا جاتا ہے اور اُس کے طے شدہ درجے اور دقیقے بھی اُس کے ساتھ لکھ دیے جاتے ہیں - اس طرح زائچہ مکمل ہو جاتا ہے - بعض منجمین سہم السعادت ، سہم الغیب ، سہم اولاد ، سہم امراض وغیرہ کو بھی زائچے میں مناسب مقامات پر لکھ دیتے ہیں - مختلف خانوں میں مختلف بروج کے درجے اور دقیقے معلوم کرنے کا بھی ایک جداگانہ طریقہ ہے جو یہاں بیان نہیں کیا گیا ، کیونکہ زیر تحریر مضمون سے اُس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے - زائچے کے بارہ خانوں کی سعادت و نحوست بھی اُن بروج اور اُن سیاروں پر منحصر ہوتی ہے جو پیدائش کے وقت اُن خانوں میں واقع ہوتے ہیں - زائچے کا ہر خانہ بھی ایک خاص شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتا ہے - مثلاً مولود کے زائچے کا پہلا خانہ جسم اور دل سے تعلق رکھتا ہے ، دوسرا خانہ دولت اور خاندان سے ، تیسرا خانہ بھائی اور

طاقت سے، چوتھا خانہ ماں اور سکون سے، پانچواں خانہ بیٹے اور علم سے، چھٹا خانہ دشمن اور بیماری سے، ساتواں خانہ بیوی اور عیش سے، آٹھواں خانہ موت اور عمر سے، نواں خانہ قسمت اور ایمان سے، دسواں خانہ حکومت اور کاروبار سے، گیارھواں خانہ آمدنی اور فائدے سے، اور بارھواں خانہ خرچ اور نقصان سے تعلق رکھتا ہے۔

غالب کے زمانے میں زائچے کے اندر ہندسے لکھنے کا رواج نہیں تھا بلکہ ابجد، ہوز کے قاعدے کے مطابق ہندسوں کے بجائے حروف لکھ دیے جاتے تھے۔ یعنی ھا کا صفر، الف کا ایک، ب کے ۲، ج کے ۳، د کے ۴، ھ کے ۵، و کے ۶، ز کے ۷، ح کے ۸، ط کے ۹، ی کے ۱۰، ک کے ۲۰، ل کے ۳۰، م کے ۴۰، ن کے ۵۰، س کے ۶۰، ع کے ۷۰، ف کے ۸۰، ص کے ۹۰، ق کے ۱۰۰، ر کے ۲۰۰، ش کے ۳۰۰، ت کے ۴۰۰، ث کے ۵۰۰، خ کے ۶۰۰، ذ کے ۷۰۰، ض کے ۸۰۰، ظ کے ۹۰۰، اور غ کے ۱۰۰۰ ہوتے ہیں۔ اب اگر ہمیں ۸ لکھنا ہے تو صرف ح لکھ دینا کافی ہوگا۔ اگر ہمیں ۲۷ لکھنا ہے تو ک اور ز کو ملا کر ہم کز لکھیں گے، اور اگر ۳۹ لکھنا ہے تو لط لکھیں گے۔ یعنی اگر کسی وقت کسی مقام پر طالع برج قوس کے ۲۷ درجے ۳۹ دقیقے پر ہے تو ہم زائچے کے پہلے خانے میں صرف ح کز لط لکھ دیں گے، کیونکہ آٹھ مکمل بروج طے ہو چکے ہیں اور نواں نا مکمل برج قوس طلوع ہو رہا ہے جس کے ۲۷ درجے ۳۹ دقیقے طلوع ہو چکے ہیں۔ اب اگر ہم حساب لگا کر معلوم کریں کہ اُس وقت سیارہ زہرہ بھی برج قوس میں تھا اور اُس برج کے ۱۴ درجے ۲۳ دقیقے طے کر چکا تھا تو ہم زہرہ کو بھی زائچے کے پہلے خانے میں لکھ کر اُس کے نیچے یدکج لکھ دیں گے۔ اسی طرح تمام سیاروں اور سہام کو زائچے کے متعلقہ خانوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔

اس ضروری تمہید کے بعد میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں۔ صفحہ ۲۲ پر غالب کے اُس زائچے کا عکس دیا جاتا ہے جو اُن کے کلیات فارسی کے نولکشوری ایڈیشن مطبوعہ ۱۲۷۹ ہجری (۱۸۶۳ عیسوی) میں شائع ہوا تھا اور جس کی اشاعت کے چھ سال بعد تک غالب زندہ رہے تھے۔ یہ زائچہ صفحہ ۱۹۸ اور صفحہ ۱۹۹ کے درمیان موجود ہے۔ غالب کا یہی زائچہ کلیات فارسی مطبوعہ ۱۲۶۳ ہجری (۱۸۴۸ عیسوی) میں بھی موجود ہے۔ اور اُس میں بھی اسی قسم کی تفصیلات درج ہیں لیکن ذرا کم ہیں۔ اس کی شکل و صورت میں بھی

ذرا سا فرق ہے اور اس میں سنہ عیسوی کا ذکر بھی نہیں ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ غالب کی پیدائش اکبرآباد یعنی آگرے کے مقام پر ہوئی تھی جس کا عرض البلد تقریبا ۲۷ درجے شمال ہے اور طول البلد تقریباً ۷۸ درجے مشرق ہے ۔ اس شائع شدہ زائچے کے طالع یعنی پہلے خانے کے سوا باقی خانوں کے درجوں اور دقیقوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ ہمارے مقصد کے لیے غیر ضروری ہے۔ طالع کے درجے اور دقیقے معلوم ہوجانے کے بعد اسی کی مدد سے باقی خانوں کے درجے اور دقیقے خود بخود حاصل ہوجاتے ہیں۔ زائچے کا عکس صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔

اس زائچے سے ہمیں مندرجہ ذیل خاص خاص باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔

غالب کے شائع شدہ زائچے کے مطابق تقویم سیارگان

۱- استخراج تقویم یونانی بروز یکشنبہ ۸ رجب ، بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع آفتاب بمقام اکبر آباد (شائع شدہ سنہ ہجری ۱۲۱۳ ہے اور سنہ عیسوی ۱۷۹۸ ہے ، لیکن دونوں مشکوک ہیں جیسا کہ بعد میں بتایا جائے گا)۔

۲- طالع یعنی پہلا خانہ ، برج قوس کے ۲۷ درجے ۳۹ دقیقے پر تھا۔

۳- شمس دوسرے خانے میں ، برج جدی کے ۱۸ درجے ۲۰ دقیقے پر تھا۔

۴- قمر چھٹے خانے میں ، برج ثور کے ۸ درجے ۲۱ دقیقے پر تھا۔

۵- راس آٹھویں خانے میں ، برج سرطان کے صفر درجے ۱۰ دقیقے پر تھا۔

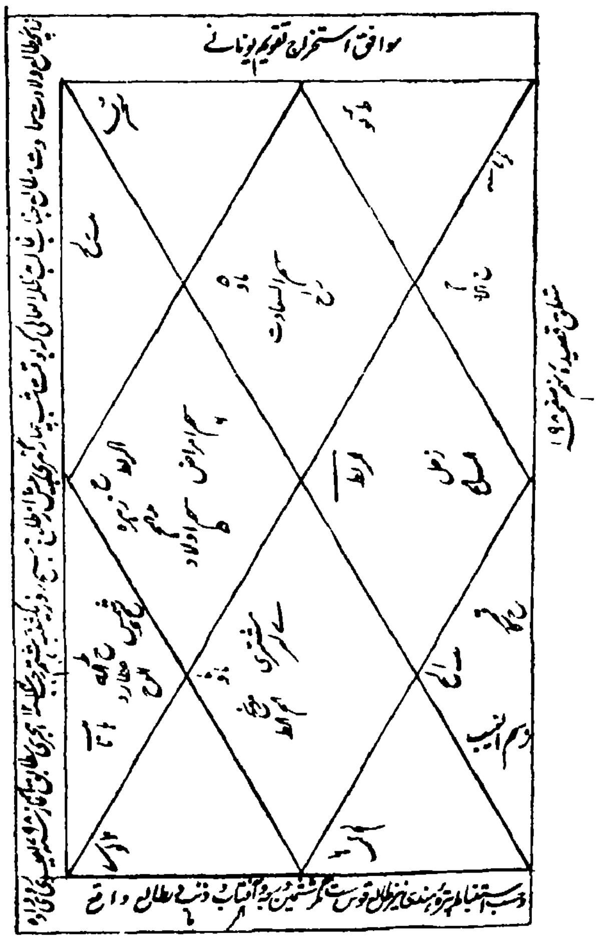
۶- ذنب دوسرے خانے میں ، برج جدی کے صفر درجے ۱۰ دقیقے پر تھا۔

۷- مریخ چوتھے خانے میں ، برج حوت کے ۲۳ درجے ۲۹ دقیقے پر تھا۔

۸- عطارد دوسرے خانے میں ، برج جدی کے ۲۶ درجے ۸ دقیقے پر تھا۔

۹- مشتری چوتھے خانے میں ، برج حوت کے ۱۰ درجے ۳۷ دقیقے پر تھا۔

۱۰- زہرہ پہلے خانے میں ، برج قوس کے ۱۴ درجے ۲۳ دقیقے پر تھا۔


موافق استخراج تقویم یونانی

۱۱- زحل ساتویں خانے میں ، برج جوزا کے ۲۲ درجے ۲۸ دقیقے پر تھا -

۱۲- سہم السعادت دسویں خانے میں ، برج سنبلہ کے ۷ درجے ۳۸ دقیقے پر تھا -

(سہم الغیب ، سہم اولاد اور سہم امراض کا ذکر بعد میں کیا جائے گا)-

نوٹ : ہندوؤں کی پترہ کے استنباط کے مطابق بھی طالع برج قوس میں تھا لیکن اُس برج کے چھ درجے پر تھا - اس کے علاوہ شمس بھی قوس کے ستائیس درجے پر تھا ، ذنب بھی برج قوس کے گیارہ درجے پر تھا -

معلوم نہیں غالب کا یہ زائچہ کس زیج کی بنیاد پر بنایا گیا تھا کہ اُس زمانے میں بہت سی زیجیں رائج تھیں اور ہر زیج کے حسابات دوسری زیجوں کے حسابات سے چند درجوں یا چند دقیقوں کا فرق ضرور آتا ہے - بہر حال اگر ہم اس معمولی سی اختلافی حقیقت کو سامنے رکھیں اور چند درجوں یا دقیقوں کے فرق کو نظر انداز کرنے کے بعد کسی زیج کی مدد سے یہ معلوم کرنا چاہیں کہ سیاروں کے مندرجہ بالا اجتماعات کب واقع ہوئے تھے تو ہم کو غالب کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم ہو جائے گا ، کیونکہ زائچے میں سیاروں کے مجموعی مقامات صرف ایک ہی دن اور خاص ساعت ہی میں حاصل ہوتے ہیں اور پھر ہزاروں سال میں بھی اُس قسم کا زائچہ نہیں بن سکتا - اس لیے اگر غالب کے شائع شدہ زائچے کی سرخی میں اُن کی پیدائش کا وقت ، دن ، تاریخ اور سنہ نہ بھی دیے ہوتے تو بھی صرف زائچے کے سیاروں کے مقامات ہی سے حساب لگا کر سب کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا - اس قسم کی ایک مثال اس مضمون کے آخر میں درج کر دی گئی ہے -

میں نے جن کتابوں اور زیجوں سے مدد لے کر مندرجہ ذیل حسابات کیے ہیں اُن کا ذکر اس مضمون کے خاتمے پر کر دیا گیا ہے - یہ زیجیں مختلف صدیوں میں لکھی گئی ہیں اور ان میں مختلف اہرگن ، جولین ڈے اور تقویم سیارگاں وغیرہ معلوم کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں - اہرگن

در اصل دنوں کی اس تعداد کو کہتے ہیں جو ایک خاص تاریخ سے دوسری خاص تاریخ تک گزر جاتے ہیں ۔ لہذا میرے حساب کے مطابق غالب کا یہ زائچہ صرف اور صرف ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی مطابق ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری، بروز یکشنبہ بمقام اکبر آباد طلوع آفتاب سے چار گھڑی قبل یعنی انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علے الصباح ۵ بج کر ۳۶ منٹ کے لیے ہی ہو سکتا ہے ، کسی اور وقت ، دن ، تاریخ یا سنہ کے لیے ہر گز نہیں ہو سکتا ۔ مثال کے طور پر صرف قمر کے مقام ہی کو لیجئے ۔ اگر تاریخ پیدائش میں ایک دن کا بھی فرق ہو جائے تو قمر کے مقام میں تقریباً تیرہ درجے کا فرق ہو جائے گا ۔ یعنی اگر غالب کی پیدائش بتاریخ ۷ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز شنبہ فرض کریں تو قمر پانچویں خانے میں برج حمل کے تقریباً ۲۵ درجے پر آتا ہے ، حالانکہ غالب کے زائچے کے مطابق قمر چھٹے خانے میں برج ثور کے تقریبا ۸ درجے پر ہے ۔ یہ بات بھی بالکل یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ زائچہ غالب کی پیدائش کے وقت ہی اُن کے والد نے کسی قابل منجم سے بنوایا تھا کیونکہ اگر یہ زائچہ بعد میں بنایا گیا ہوتا تو اس میں اتنی صحیح تفصیلات درج نہ ہوتیں ۔ خصوصا ہندوؤں کی پترہ کے استنباط کے مطابق ذنب کو برج قوس کے گیارہ درجے پر بتایا گیا ہے ۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ مکرند ساری سے بنی ہوئی اس سال کی پترہ کو بغور دیکھ کر حساب لگایا گیا ہو ۔ ورنہ اگر یہ زائچہ کوئی منجم بعد میں بناتا تو ذنب کی یونانی تقویم (یعنی برج جدی کے صفر درجہ ۱۰ دقیقے) میں سے ایناشن کے ۲۱ درجے تفریق کر کے ہندی تقویم (یعنی برج قوس کے ۹ درجے ۱۰ دقیقے) حاصل کر لیتا اور نتیجتا گیارہ درجے کے بجائے ۹ درجے لکھ دیتا ۔ میرے حساب کے مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو صبح ۵ بجکر ۳۶ منٹ پر زائچے کے لیے مندرجہ ذیل تقویم سیاروں حاصل ہوتی ہے ۔ عام پڑھنے والوں کی سمجھ میں اگر بعض علمی اصطلاحات نہ آئیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ ان کو سمجھے بغیر بھی نفس مضمون کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے ۔ میں نے طالع کے استخراج کے لیے این سی لاہری کی جدولوں سے کام لیا ہے ۔ شمس کی تقویم کے لیے نیوکومب کی زیچ کے مطابق حساب لگایا ہے ۔ قمر ، راس اور ذنب کی تقویم کے لیے ای ڈبلیو براؤن کی زیچ کا سہارا لیا ہے ۔ باقی سیاروں کے لیے گرہ لاگھو کی زیچ کو بنیاد بنایا ہے ۔ استنباط پترۂ ہندی کے لیے مکرند ساری کی زیچ کو استعمال کیا ہے اور تاریخوں

طابقت کے لیے غرۃ الزیجات کو اپنایا ہے ۔ طلوع آفتاب کا وقت اور
ن اسٹینڈرڈ ٹائم وغیرہ معلوم کرنے کے لیے آگرے کی پلھا کو تقریباً
انگل سات وینگل مانا ہے ۔ چرکھنڈوں کو بالترتیب ۲۱ پل ، ۳۹ پل
۲۰ پل مانا ہے ۔ عرض البلد کو تقریباً ۲۷ درجے شمال مانا ہے ، طول البلد
تقریباً ۷۸ درجے مشرق مانا ہے ، قدیم لنکا کو تقریباً ۷۵ درجے ۵۴ دقیقے
ق طول البلد پر مانا ہے ، اور انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کو ۸۲ درجے ۳۰ دقیقے
ق طول البلد کے مطابق مانا ہے ۔

میرے حساب کے مطابق تقویم سیارگاں

۱۔ استخراج تقویم یونانی بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۱ ھجری مطابق ۸ جنوری
۱۷ عیسوی بروز یکشنبہ بمقام اکبر آباد بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع
ب انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علی الصباح ۵ بجکر ۳۶ منٹ پر ۔ اساتش
بیا ۲۱ درجے ۔ مساوات وقت تقریباً ۷ منٹ مثبت ۔ غرۃ الزیجات اھرگن
۳۰۳۳۲ ۔ کرہ لاکھو چکر ۲۵ ، اھرگن ۶۹۳ ، جولین ڈے ۲۳۷۰۹۰۶ ۔

۲۔ طالع یعنی پہلا خانہ ۔ برج قوس کے ۲۹ درجے ۱۸ دقیقے پر
فرق ۱ درجہ ۳۹ دقیقے مثبت)

۳۔ شمس دوسرے خانے میں ۔ برج جدی کے ۱۸ درجے ۲۰ دقیقے پر
فرق صفر درجہ صفر دقیقہ)

۴۔ قمر چوتھے خانے میں ۔ برج ثور کے ۹ درجے ۱۸ دقیقے پر
فرق صفر درجہ ۵۷ دقیقے مثبت)

۵۔ راس آٹھویں خانے میں ۔ برج سرطان کے صفر درجے ۴۰ دقیقے پر
فرق صفر درجہ ۱۱ دقیقے منفی)

۶۔ ذنب دوسرے خانہ میں ۔ برج جدی کے صفر درجہ ۴۰ دقیقے پر
رق صفر درجہ ۱۱ دقیقے منفی)

۷۔ مریخ چوتھے خانے میں ۔ برج حوت کے ۲۵ درجے ۲۳ دقیقے پر
فرق ۱ درجہ ۴۵ دقیقے مثبت)

۸۔ عطارد دوسرے خانے میں ۔ برج جدی کے ۲۸ درجے ۱۲ دقیقے پر
فرق ۲ درجے ۴ دقیقے مثبت)

۹- مشتری چوتھے خانے میں - برج حوت کے ۱۱ درجے ۳۶ دقیقے پر
(فرق ۱ درجہ ۹ دقیقے مثبت)

۱۰- زہرہ پہلے خانے میں - برج قوس کے ۱۴ درجے ۴۰ دقیقے پر
(فرق صفر درجہ ۷ دقیقے مثبت)

۱۱- زحل ساتویں خانے میں - برج جوزا کے ۲۰ درجے ۱۶ دقیقے پر
(فرق ۲ درجے ۴۸ دقیقے مثبت)

۱۲- سہم السعادت - دسویں خانے میں ، برج سنبلہ کے ۸ درجے ۲۰ دقیقے پر
(فرق صفر درجہ ۴۳ دقیقے مثبت)

نوٹ : ہندوؤں کی پترہ کے استنباط کے مطابق طالع برج قوس کے چھ درجے پر تھا ، شمس برج قوس کے ستائیس درجے پر تھا ، اور ذنب برج قوس کے گیارہ درجے پر تھا - (یہ مقامات بجنسہ وہی ہیں جو غالب کے شائع شدہ زائچے میں درج ہیں اور ان سے میرے بیان کی صداقت کسی شک و شبہ کے بغیر ثابت ہو جاتی ہے) -

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں - ایڈورڈ ماہلر کی تقویم ہجری و عیسوی ، سلسلۂ انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۱۲۲ ، مطبوعہ دہلی (۱۹۳۹ء) کے مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو ۹ رجب ۱۲۱۱ ہجری کی تاریخ پڑتی ہے ، لیکن غالب کے زائچے کی سرخی کے مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری کی تاریخ تھی - اس بات سے شاید عام پڑھنے والوں کے دلوں میں شک پڑ جائے ، اس لیے پہلے میں ایڈورڈ ماہلر کی تقویم ہجری و عیسوی کی اصل حقیقت کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں - یہ تقویم در اصل شمس و قمر کی صرف اوسط رفتاروں کی بنیاد پر بنائی گئی ہے ، اور اس میں عام طور پر سلسلہ وار ایک قمری مہینہ ۳۰ دن کا اور دوسرا قمری مہینہ ۲۹ دن کا سمجھا جاتا ہے - سال کبیسہ میں ذی الحجہ کے مہینے کو بھی ۲۹ کے بجائے ۳۰ دن کا سمجھ لیا جاتا ہے - لیکن جیسا کہ زیج الغ بیگ میں ثابت کیا گیا ہے ، حقیقی رویت ہلال کے مطابق کبھی دو ، کبھی تین ، کبھی چار اور کبھی پانچ قمری مہینے یکے بعد دیگرے متواتر تیس تیس دن کے ہو سکتے ہیں - اسی طرح کبھی دو اور کبھی تین قمری مہینے یکے بعد دیگرے متواتر انتیس

انتیس دن کے بھی ہو سکتے ہیں - اس کا یہ مطلب ہوا کہ ایڈورڈ ماہلر کی تقویم ہجری و عیسوی کے مطابق معلوم کی ہوئی اوسط ہجری تاریخ اور رویت ہلال کے مطابق معلوم کی ہوئی حقیقی ہجری تاریخ کے درمیان کبھی ایک دن اور کبھی دو دن کا فرق پڑ سکتا ہے - بلکہ اگر مطلع صاف نہ ہو تو تین دن کا فرق بھی پڑ سکتا ہے ، اس لیے جو حضرات کسی تحقیقی کام کے لیے ایڈورڈ ماہلر کی تقویم ہجری و عیسوی کو حرف آخر سمجھ لیتے ہیں ، وہ بہت بڑی غلطی کرتے ہیں - میں نے اکثر ایسے ناواقف لوگوں کی تحریریں پڑھی ہیں جنھوں نے محض ایڈورڈ ماہلر کی تقویم کی بنا پر بڑے بڑے تاریخی واقعات کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے -

در اصل علم ہیئت کی مختلف کتابوں میں حقیقی رویت ہلال معلوم کرنے کے لیے معیاری قاعدے درج ہیں - اس لیے تحقیقی کام کرنے والوں کو لازم ہے کہ وہ ان معیاری قاعدوں سے صحیح ہجری تاریخ کا تعین کریں - اگر چہ وہ کتنے ہی دشوار کیوں نہ ہوں - علم ہیئت کے ان معیاری قاعدوں کو استعمال کرنے کے باوجود بعض اوقات ہجری تاریخ میں ایک دن کا فرق پڑ سکتا ہے - جس کا سبب یہ ہے کہ کبھی کبھی شام کے وقت ہجری مہینے کی ۲۹ تاریخ کو آسمان اس قدر گرد و غبار و ابر آلود ہوتا ہے کہ لوگوں کو چاند نظر نہیں آتا ، حالانکہ چاند نظر آنے کے قابل ہوتا ہے - ایسی حالت میں شرعی طور پر رویت ہلال نہیں مانی جاتی بلکہ اس ہجری مہینے کے ۳۰ دن پورے کرنے کے بعد اگلا ہجری مہینہ شروع کیا جاتا ہے - یعنی جس دن حقیقی طور پر اگلے مہینے کی یکم تاریخ ہونی چاہیے تھی ، اس دن کو شرعی طور پر پچھلے مہینے کی ۳۰ تاریخ سمجھ لیا جاتا ہے - ایسی صورت میں دن کے نام کو بنیاد بنا کر حسابات لگانے چاہئیں ، کیونکہ دن کے نام میں کسی حالت میں بھی کوئی اختلاف یا شک و شبہ پیدا نہیں ہو سکتا - اسی قسم کا اتفاق غالب کی پیدائش کے وقت بھی ہوا تھا ، جس کی تفصیل اس جگہ بیان کرنا ضروری ہے - میں نے علم ہیئت کے معیاری قاعدوں سے حساب لگا کر معلوم کیا ہے کہ یکم دسمبر ۱۷۹۶ عیسوی کو آگرے میں بروز پنجشنبہ جمادی الآخر ۱۲۱۱ ہجری کا چاند نظر آیا تھا ، اس لیے ۳۰ دسمبر ۱۷۹۶ عیسوی کو بروز جمعہ جمادی الآخر ۱۲۱۱ ہجری کی ۲۹ تاریخ تھی - اس دن آگرے کے مقام پر غروب آفتاب کے وقت تقویم یونانی کے مطابق شمس برج جدی کے ۹ درجے ۳۹ دقیقے پر تھا ، قمر برج جدی کے

۲۳ درجے ٦ دقیقے پر تھا اور راس برج سرطان کے ۱ درجہ ۸ دقیقے پر تھا - ان مواضع کی بنیاد پر علم ہیئت کے معیاری قاعدوں کے مطابق حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اُس شام کو رویت ہلال کا قوی امکان تھا کیونکہ ہلال نظر آنے کے قابل ہو چکا تھا - لیکن قراین سے پتا چلتا ہے کہ اُس وقت افق مغرب اس قدر مکدر تھا کہ لوگوں کو رجب کا چاند نظر نہ آسکا - اس لیے اُنھوں نے شرعی طور پر بروز شنبہ ۳۱ دسمبر ۱۷۹٦ عیسوی کو ۳۰ جمادی الآخر ۱۲۱۱ ھجری مانا - اور بروز یکشنبہ یکم جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو یکم رجب ۱۲۱۱ ھجری مانا - یہی وجہ ہے کہ غالب کے زائچے کی سرخی میں بروز یکشنبہ ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو ۸ رجب ۱۲۱۱ ھجری مانا گیا ہے - اُس زمانے میں نشر و اشاعت کے ذرائع اتنے مؤثر نہیں تھے کہ اگر کسی دور دراز کے علاقے میں چاند نظر آجائے تو اُس کی اطلاع فوراً ملک کے ہر حصے میں پہنچ جائے - اس لیے آگرے والوں نے صرف اپنے ھی افق کے مطابق ھجری تاریخ کا تعین کیا تھا ، حالانکہ ملک کے بعض دوسرے حصوں میں ۳۰ دسمبر ۱۷۹٦ عیسوی کو بروز جمعہ چاند ضرور نظر آیا ہو گا - یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ غالب کا زائچہ اُن کی پیدائش کے وقت ھی بنایا گیا تھا - اگر بعد میں بنایا جاتا تو زائچہ بنانے والا منجم ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو لازمی طور پر ۹ رجب ۱۲۱۱ ھجری مانتا کیونکہ اُسے اتنے عرصے بعد اس حقیقت کا علم کس طرح ہو سکتا تھا کہ ۳۰ دسمبر ۱۷۹٦ عیسوی کو آگرے میں رجب کا چاند نظر نہیں آیا تھا ، جبکہ ایڈورڈ ماہلر کی تقویم کے مطابق ، غرۃالزیجات کے اوسط طریقے کے مطابق ، اور علم ہیئت کے معیاری قاعدوں کے مطابق بھی ۳۰ دسمبر ۱۷۹٦ عیسوی کو ضرور چاند نظر آنا چاھیے تھا -

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جب غالب کی صحیح تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۱ ھجری مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز یکشنبہ ہے تو پھر غالب نے اُسے ۸ رجب ۱۲۱۲ ھجری کیوں سمجھا ہے اور ہر مقام پر اپنی پیدائش کا سنہ ھجری ۱۲۱۲ کیوں بتایا ہے ، جیسا کہ اُن کے خود نکالے ہوئے مادہ ہائے تاریخ یعنی شورش شوق ، غریب اور تاریخا سے بھی ظاہر ہوتا ہے - نیز اُن کے شائع شدہ زائچے میں سنہ ھجری ۱۲۱۳ اور سنہ عیسوی ۱۷۹۸ کیوں درج ہے - اس کا جواب یہ ہے کہ میں ازروئے قراین

ق کے ساتھ کہ سکتا ہوں کہ غالب کے زائچے کے اصل مخطوطے کی سرخی "بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۱ ہجری بق آغاز ۱۷۹۷ عیسوی" لکھا ہوا ہوگا۔ اس زمانے میں عیسوی تاریخ کو ہ اہمیت حاصل نہیں تھی ، اس لیے ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کے بجائے صرف ز ۱۷۹۷ عیسوی لکھنا ہی کافی سمجھا گیا ہوگا۔ یا ممکن ہے اصل مخطوطے سنہ عیسوی کا ذکر ہی نہ ہو اور بعد میں اسے شامل کیا گیا ہو۔ حال جب غالب نے ایک عرصے تک یتیمی اور مصیبت کی زندگی گزارنے بعد ہوش سنبھالا ہوگا اور پرانے کاغذات میں اپنے بوسیدہ زائچے کو بھی نہا ہوگا تو ممکن ہے اُس وقت اُس کی سرخی کے بعض حروف صاف صاف پڑھے جا سکے ہوں اور بالخصوص سنہ ہجری اور سنہ عیسوی کے بارے دوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو ، جس کی بنا پر ۱۲۱۱ ہجری کو ۱۲ ہجری اور ۱۷۹۷ عیسوی کو ۱۷۹۸ عیسوی فرض کر لیا گیا ہو۔ لانکہ اگر ۱۲۱۱ ہجری کو ۱۲۱۲ ہجری فرض کر لیا گیا تھا تو آغاز ۱۷ عیسوی کو اواخر ۱۷۹۷ عیسوی فرض کرنا چاہیے تھا۔ ایسا معلوم ا ہے کہ شاید غالب کو بھی اس امر کی تحقیق کا موقع نہیں مل سکا ہوگا آنھوں نے ۱۲۱۲ ہجری ہی کو صحیح ماننے میں کوئی مصلحت ھی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر غالب کے زائچے کا اصل مخطوطہ نہا جائے ، یا کلیات فارسی کا وہ مخطوطہ دیکھا جائے جس کی بنیاد پر کشوری ایڈیشن شائع ہوا تھا تو زائچے کی سرخی میں سنہ ہجری اور ، عیسوی کے آخری ہندسے یعنی بالترتیب "۲" اور "۸" ضرور مشکوک و تبہ نظر آئیں گے ، جن کو اگر غور سے دیکھا جائے تو بالترتیب "۱" "۷" بھی پڑھا جا سکتا ہوگا۔ اور شاید اس مشکوکیت ہی کی وجہ نولکشور پریس والوں نے مخطوطے کے سنہ ہجری کو نہ ۱۲۱۱ پڑھا ، ۱۲۱۲ پڑھا بلکہ ۱۲۱۴ پڑھ لیا اور اُسی طرح شائع کر دیا۔ بہر حال یہ دوسرے اہل علم حضرات کا کام ہے کہ وہ اس مشکوکیت کی اصل قت معلوم کریں۔ میں تو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ غالب کی مح تاریخ پیدائش ازروئے زائچہ ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز یکشنبہ ابق ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری ہے۔

غالب نے اپنی تحریروں میں بار بار یکشنبہ کو اپنا یوم پیدائش ۸ رجب کو اپنی تاریخ پیدائش بتایا ہے ، جیسا کہ نواب علائی کے نام

ایک خط مورخہ جون ۱۸۶۱ عیسوی سے اور تذکرہ مظہرالعجائب کے لیے بھیجی ہوئی آن کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان حقائق سے اس بات کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ آن کا سنہ پیدائش ۱۲۱۲ ہجری نہیں ہے بلکہ ۱۲۱۱ ہجری ہے ، کیونکہ ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری کو یکشنبہ نہیں تھا بلکہ چہار شنبہ تھا اور جیسا کہ بعد میں بتایا جائے گا سیاروں کے مواضع بھی غالب کے زائچے سے بالکل مختلف تھے - ۸ رجب ۱۲۱۳ ہجری کو ضرور یکشنبہ تھا ، لیکن اس دن بھی سیاروں کے مواضع غالب کے زائچے سے بالکل مختلف تھے - ۸ رجب ۱۲۱۳ ہجری کو بھی یکشنبہ نہیں تھا بلکہ جمعہ تھا اور سیاروں کے مواضع بھی غالب کے زائچے سے بالکل مختلف تھے -

غالب کے زائچے میں سیاروں کے جو مواضع درج کئے گئے ہیں اور جن کی بنیاد پر میں نے غالب کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم کی - آن کی تصدیق غالب کے اس لاجواب فارسی قصیدے کی تشبیب کے اشعار سے بھی ہوتی ہے جو آنھوں نے سیدالشہداء حضرت امام حسین علیہ‌السلام کی شان میں کہا تھا - یہ قصیدہ آنھوں نے اپنی کہنہ مشقی کے زمانے میں یعنی تقریباً چالیس سال کی عمر میں کہا تھا - اس کا ایک ایک شعر معارف و معانی کا دریا ہے - اس قصیدے کے کل ایک سو بارہ اشعار میں سے صرف وہ اٹھ اشعار جن کا نفس مضمون سے تعلق ہے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں - ان اشعار میں غالب نے اپنے زائچے کے سیاروں کی سعادت و نحوست پر اپنے مخصوص عالمانہ و شاعرانہ انداز میں خود ہی تبصرہ فرمایا ہے - اگر ان زیر مطالعہ مضمون کی تمہید کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لیا جائے تو ان اشعار کے سمجھنے میں ذرا سی بھی مشکل پیش نہیں آئے گی -

مگر مرا دل کافر بود شب میلاد
کہ ظلمتش دھد از گور اھل عصیاں یاد

خود اصل طالع من جزوے از کمانستے
کزوست ناوک غم را ھزار گونہ کشاد

خرام زھرہ بطالع اگرچہ دادہ نشاں
ھم از لطافت طبع و ھم از صفائے نہاد

ولے ازاں کہ غریب است زھرہ اندر قوس
نشستہ بر رخ نقد قبول گرد کساد

تو گوئی از اثر انتقام هاروت است
که سر بطالع من چرخ زهره را جاداد
به صفر جدی ذنب را اشارة باشد
بخاک و حلقهٔ دام و کمیں گه صیاد
چه دام؟ روح روان را گذازش پر و بال
چه صفر؟ رنج و الم را فزائش اعداد
زمهر و پیکر تیر آشکار شد بجدی
فروغ اخگر رخشنده و کفِ زرماد
بحوت در شده هم مشتری و هم مریخ
یکے کفیل صلاح و یکے دلیل فساد
یکے بهیئت پیرے که ناگه از غوغا
بکنج صومعه وامانده باشد از اوراد
یکے بصورت ترکے که از پئے یغما
ستیزه جوئے در آید بخانهٔ زهاد
قمر به ثور که کاشانه ششم باشد
چو نور خویش کند دستگاه خصم زیاد
سیاه گشته دو پیکر زسیلیٔ کیوان
چنانکه از اثر خاک تیره گردد باد
بدیں دو نحس نگر تا چه شکل مستقبل
کشیده اند ز تربیع خویش در اوتاد
به چارمیں کده بهرام پنجمیں پایه
به هفتمیں زده کیوان هفتمیں بنیاد
کند چو ترک ستمگر به کشتن استعجال
کند چو هندو رهزن به بردن استبداد

ز حوت ہیبت طوفان نوح پردہ کشا
عیان ز صورت جوزا نہیب صرصر عاد
تو و خدا کہ درین کشمکش کہ من باشم
چگونہ چون دگران زیستن توان بمراد

ان اشعار کا اردو ترجمہ اور علمی اصطلاحات کی وضاحت نہایت اختصار کے ساتھ ذیل میں درج ہے۔

شعر ۱۔ (ترجمہ) میرے لیے میرا دل کافر ایسی شب ولادت ہے جس کی تیرگی کے آگے بڑے سے بڑے گنہگار کی قبر کی تاریکی ہیچ ہے۔ (وضاحت) اس شعر میں غالب نے کنایۃً یہ بتا دیا ہے کہ آن کی پیدائش رات کے وقت ہوئی تھی۔

شعر ۲۔ (ترجمہ) در اصل میرا طالع ولادت کمان (یعنی برج قوس) کا ایک حصہ ہے جس کے ذریعے ناوک غم کو ہزار گنی سہولت حاصل ہو گئی ہے۔ (وضاحت) کسی زائچے میں برج قوس اگر طالع ہو جائے تو مولود کو بڑی دکھ بھری زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ اسی بات کو غالب نے نہایت ہی لطیف اور شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

شعر ۳، ۴۔ (ترجمہ) اگرچہ میرے طالع میں زہرہ کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ مولود لطافت طبع اور صفائے نہاد میں یکتائے روزگار ہوگا لیکن چونکہ برج قوس میں ہونے کی وجہ سے زہرہ کی حیثیت ایک غریب کی سی ہے، اس لیے میرے نقد قبول کے چہرے پر کساد بازاری کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ (وضاحت) برج قوس کا مالک مشتری ہے جو زہرہ سے بے تعلق ہے، گویا زہرہ ایک ایسے شہر میں پڑا ہوا ہے جہاں آس کی حیثیت ایک اجنبی مسافر کی سی ہے اور اسی وجہ سے وہ سعد اصغر ہوتے ہوئے بھی اپنا پورا اثر دکھانے سے معذور ہے۔ یعنی آس نے اتنا نیک اثر تو دکھایا کہ غالب کو لطیف طبع اور نیک نہاد بنا دیا لیکن اس درجہ نیک اثر نہیں دکھا سکا کہ غالب کی متاع سخن کے خریداروں کی ریل پیل ہوتی۔

شعر ۵۔ (ترجمہ) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چرخ نے (مجھ پر مہربان ہو کر نہیں بلکہ) ہاروت سے انتقام لینے کی غرض سے (آس کی محبوبہ یعنی) زہرہ کو میرے طالع میں جگہ دی ہے (تا کہ ہاروت چاہ بابل کے عذاب کے ساتھ ساتھ آتش رقابت میں بھی جلتا رہے اور مجھے بھی بد دعا دیتا

ہے) - (وضاحت) اس شعر میں غالب نے ہاروت و ماروت کی مشہور تلمیح سے کام لیا ہے جو دو فرشتے تھے اور بالترتیب زہرہ و مشتری پر عاشق تھے وہ اپنی بدکرداری کی پاداش میں چاہ بابل میں ابھی تک الٹے لٹکے ہوئے ہیں - تمزیج سیارگاں اور تخئیل شاعرانہ کا یکجائی تاثر اس سے بہتر کوئی پیش نہیں کر سکتا -

شعر ۶- (ترجمہ) برج جدی کے صفر درجے پر ذنب کی موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ میری قسمت میں خاک ، حلقہ دام اور کمین گاہ صیاد کے سوا کچھ بھی نہیں ہے - (وضاحت) برج جدی کا مزاج خاکی ہے جس سے خاک کی طرف اشارہ ملتا ہے ، ذنب کی شکل اژدہے کی حلقہ نما دم کی سی ہے جس سے حلقہ دام کی طرف اشارہ ملتا ہے ، اور جدی کی شکل چوب پر حملہ کرنے والے جانور کی سی ہے جس سے کمین گاہ صیاد کی طرف اشارہ ملتا ہے - اس شعر میں بھی غالب نے تمزیج سیارگاں کا بڑا اچھوتا تصور پیش کیا ہے -

شعر ۷- (ترجمہ) یہ دام کہا ہے : یہ میری روح رواں کے پر و بال کو جلا دینے کی طرف اشارہ ہے - اور صفر یہ کہا ہے : یہ میرے رنج و الم کے لیے افزائش اعداد کی طرف اشارہ ہے - (وضاحت) صفر میں یہ خصوصیت ہے کہ جس عدد کے آگے لگا دیا جاتا ہے اس کی قیمت دس گنی ہو جاتی ہے - صفر کی اسی خصوصیت کا سہارا لے کر غالب نے ذنب کے صفر جدی پر ہونے سے رنج و الم کے لیے افزائش اعداد کا نہایت لطیف نکتہ پیدا کیا ہے -

شعر ۸- (ترجمہ) برج جدی میں شمس بھی ہے اور عطارد بھی ہے - جس سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ میری قسمت میں آتش عشق اور اس کے بعد جلی ہوئی راکھ لکھی ہوئی ہے - (وضاحت) شمس کا مزاج آتشی ہے اور وہ آگ کے ایک گولے کی طرح ہے جو متحرک بھی ہے - اس لیے غالب نے شمس کی برج جدی میں موجودگی کو اخگر رخشندہ سے نسبت دی ہے ، جو مجازاً آتش عشق کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے - تیر یعنی عطارد کا مزاج بادی ہے جو آگ کو بھڑکانے میں مدد دیتا ہے اور جدی کا مزاج خاکی ہے جو جل کر راکھ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے - کف کے معنی سوختہ چقماق کے بھی ہیں - اس شعر میں غالب نے تمزیج سیارگاں کی ایک لاجواب مثال قائم کی ہے -

شعر ۹- (ترجمہ) برج حوت میں مشتری بھی موجود ہے اور مریخ بھی

موجود ہے۔ ان دونوں میں سے ایک (یعنی مشتری) دلیل صلاح ہے، اور ایک (یعنی مریخ) دلیل فساد ہے۔ (وضاحت) مشتری سعد اکبر ہے اور اس کی شکل ایک معمر شخص کی سی ہے جو نیک مشورہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مریخ نحس اصغر ہے اور اس کی شکل ایک ایسے جنگجو جوان کی سی ہے جو قتل و غارت کے لیے بہانے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

شعر ۱۰- (ترجمہ) ایک (یعنی مشتری) ایسی حالت میں ہے جیسے کوئی بوڑھا آدمی نا گہانی شور و غل سے گبھرا کر اپنی خانقاہ کے گوشے میں وظیفہ اور ورد بھی چھوڑ بیٹھا ہو۔ (وضاحت) برج حوت کا مالک مشتری ہے اور وہ اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہے۔ ایسی حالت میں مشتری سے نیک ثمرہ ملنے کی توقع تھی کیونکہ یہ سعد اکبر ہے، لیکن چونکہ مریخ بھی ساتھ ہی موجود ہے اور فتنہ و فساد اور شور و غل میں مشغول ہے، اس لیے ایسی پریشان کن حالت پیدا ہو گئی ہے کہ مشتری بھی نیک ثمرہ دینے سے قاصر ہو گیا ہے۔ اس شعر میں غالب نے مشتری کی تمزیجی حیثیت کا جو مکمل نقشہ کھینچا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔

شعر ۱۱- (ترجمہ) ایک (یعنی مریخ) ایسی صورت میں ہے جیسے کوئی خونخوار و ظالم ترک لوٹ مار کرنے کے ارادے سے زاہدوں کے گھر میں گھس آیا ہو۔ (وضاحت) مریخ برج حوت میں داخل ہو گیا ہے جو مشتری کا گھر ہے اور مشتری بھی اسی گھر میں بیٹھا ہے۔ گویا کہ مشتری تمزیجی حیثیت سے ایک زاہد کی مانند ہے۔ لہذا برج حوت خانہ زہاد کی مانند ہوا۔ اس تمزیج میں غالب نے ایک نہایت ہی لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ یعنی اگر کوئی ڈاکو کسی غریب زاہد کے گھر میں ڈاکہ ڈالنے آجائے اور اسے وہاں ذرا سا بھی مال ہاتھ نہ آئے تو پھر اندازہ لگائیے کہ مسلسل تلاش مال، ناامیدی اور غصے کی حالت میں اس ڈاکو کی شکست خوردہ ذہنیت اور اس کے ظلم و ستم کا کیا حال ہوگا۔ اپنے زائچے میں مریخ کی نحوست انگیزی کا اس قدر جامع اور مؤثر نقشہ پیش کرنا غالب ہی کا حصہ ہے۔

شعر ۱۲- (ترجمہ) قمر برج ثور میں ہے اور برج ثور زائچے کے چھٹے خانے میں پڑا ہے، اس لیے قمر اپنے نور کی طرح میرے دشمن کی دستگاہ کو بھی بڑھا رہا ہے، (وضاحت) برج ثور میں قمر کو شرف حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا نیک ثمرہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن غالب کے زائچے

میں قمر برج ثور میں ہوتے ہوئے بھی زائچے کے چھٹے خانے میں جا پڑا ہے۔ چونکہ چھٹا خانہ دشمن سے تعلق رکھتا ہے اس لیے قمر کا سارا نیک اثر بجائے غالب کے حق میں ہونے کے ان کے دشمن کے حق میں ہو گیا ہے۔ قمر کا یہ نیک ثمرہ غالب کے حق میں اسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ قمر برج ثور میں ہوتے ہوئے زائچے کے پہلے خانے میں بھی ہوتا، جس کا تعلق مولود کے جسم اور دل سے ہے۔ غالب نے اس تعزیج میں بھی ایک باریک نکتہ بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ کے قمری مہینے کی آٹھ تاریخ کا واقعہ ہے اس لیے قمر کا نور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں نور قمر کی زیادتی کے تناسب سے دشمن کی دستگاہ بھی زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔

شعر ۱۳۔ (ترجمہ) زحل کے طمانچے سے جوزا کا چہرہ سیاہ پڑ گیا ہے جس طرح کہ (آندھی کے وقت) خاک کے اثر سے ہوا تاریک ہو جاتی ہے۔ (وضاحت) برج جوزا کو دو پیکر اور زحل کو کیوان بھی کہتے ہیں۔ برج جوزا قدرتی نیک ثمرہ دینے والا ہے لیکن چونکہ اس میں زحل بھی موجود ہے جو نحس اکبر ہے، اس لیے برج جوزا کا تھوڑا بہت نیک اثر بھی زائل ہو گیا ہے۔ چونکہ جوزا کا مزاج بادی ہے اور زحل کا مزاج خاکی ہے، اس لیے غالب نے مٹی کے اثر سے ہوا کے تاریک ہو جانے کی تشبیہ استعمال کی ہے جو نہایت با معنی اور حسب حال ہے۔

شعر ۱۴، ۱۵ - (ترجمہ) ان دونوں نحس سیاروں (یعنی مریخ و زحل) کی حالتوں پر غور کرو کہ آپس میں نظر تربیع بھی رکھتے ہیں اور اوتاد میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس طرح ان دونوں نے مل کر میرے مستقبل کی کیسی (مہیب) تصویر کھینچ رکھی ہے یعنی فلک پنجم سے تعلق رکھنے والا مریخ زائچے کے چوتھے خانے میں ہے اور فلک ہفتم سے تعلق رکھنے والا زحل زائچے کے ساتویں خانے میں ہے۔ (وضاحت) مریخ کو بہرام بھی کہتے ہیں۔ جب دو سیاروں کے درمیان تین بروج کا فرق ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے کو نظر تربیع سے دیکھتے ہیں۔ یہ نصف دشمنی کی نظر سمجھی جاتی ہے۔ غالب کے زائچے میں مریخ برج حوت میں ہے اور زحل برج جوزا میں ہے، اس لیے ان دونوں کے درمیان نظر تربیع ہے جس کی وجہ سے ان دونوں کی نحوست میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ مزید برآں دونوں سیارے اوتاد میں یعنی چوتھے اور ساتویں خانوں میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں جس سے ان کی نحوست اور بھی مستقل اور دیرپا ہوگئی ہے۔

شعر ۱۶ - (ترجمہ) اولاً ذکر (یعنی مریخ) ظالم ترک کی طرح مجھے ہلاک کرنے میں تیزی دکھا رہا ہے اور مؤخرالذکر (یعنی زحل) ہندو ٹھگ کی طرح مجھے لوٹنے کھسوٹنے میں انتہا پہنچا رہا ہے۔ (وضاحت) مریخ اور زحل دونوں کے فطری خواص اور زائچے میں ان کی مخصوص حالتوں کے مطابق غالب نے جو تشبیہیں ان دونوں ستاروں کے لیے پیش کی ہیں وہ نہایت ہی بلیغ اور مکمل ہیں۔ غالب کے سوا کوئی دوسرا شاعر اتنی صحیح عکاسی نہیں کرسکتا۔

شعر ۱۷ - (ترجمہ) برج حوت (اور اس میں بیٹھے ہوئے مریخ) پر نظر ڈالنے سے طوفان نوح کی سی ہیبت سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح برج جوزا (اور اس میں بیٹھے ہوئے زحل) کی شکل کو دیکھنے سے صرصر عاد کی سی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ (وضاحت) حوت کا مزاج آبی ہے اور اس میں مریخ موجود ہے جو نحس اصغر ہے، اس لیے اس کے نحس اثرات کو طوفان نوح کی غرقابیوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسی طرح جوزا کا مزاج بادی ہے اور زحل اس میں موجود ہے جو نحس اکبر ہے، اس لیے اس کے نحس اثرات کو اس آندھی کی تباہ کاریوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو قوم عاد کے لیے بھیجی گئی تھی۔ یہ تمزیج بھی غالب نے بڑے شاعرانہ انداز میں بیان کی ہے اور دو مشہور تلمیحات کا ذکر کر کے حسن بیان کو اور بھی دو بالا کر دیا ہے۔

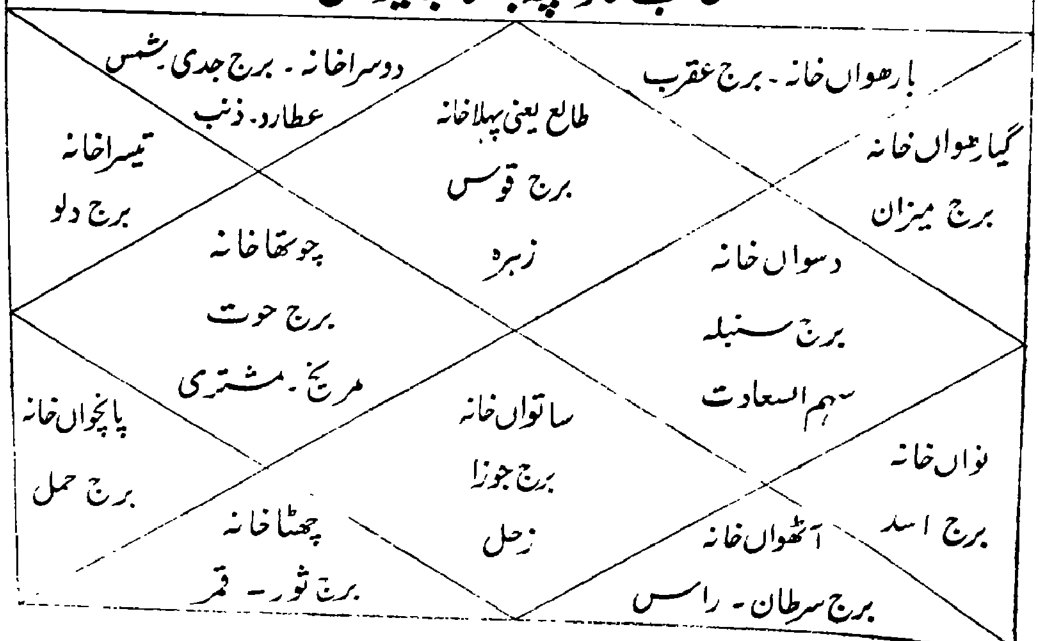
شعر ۱۸ - (ترجمہ) خدا کے لیے مجھے یہ تو بتا دو کہ (اپنے زائچے کے ستاروں کے نحس اثرات کی) اس کشمکش میں پڑ کر میں کیوں کر دوسرے لوگوں کی طرح بامراد زندگی گزار سکتا ہوں۔ (وضاحت) غالب نے اپنے زائچے میں سارے ستاروں کے مجموعی اثرات کو اپنے لیے بڑا مایوس کن بتایا ہے۔ علم نجوم کی رو سے غالب کا ایک ایک لفظ صحیح ہے۔ انھوں نے راس او سہم السعادت وغیرہ کا ذکر کرنا اپنے قصیدے میں ضروری نہیں سمجھا کیونکہ ان کے اثرات کو نظر انداز کر دینے کے باوجود زائچے کے مجموعی اثر میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

غالب کے قصیدے کے ان اشعار سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ غالب کا شائع شدہ زائچہ بالکل صحیح ہے اور اس صحیح زائچے کی بنیاد پر غالب کی صحیح تاریخ پیدائش ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی مطابق ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری بروز یکشنبہ ہے۔ اس شائع شدہ زائچے میں سہم الغیب

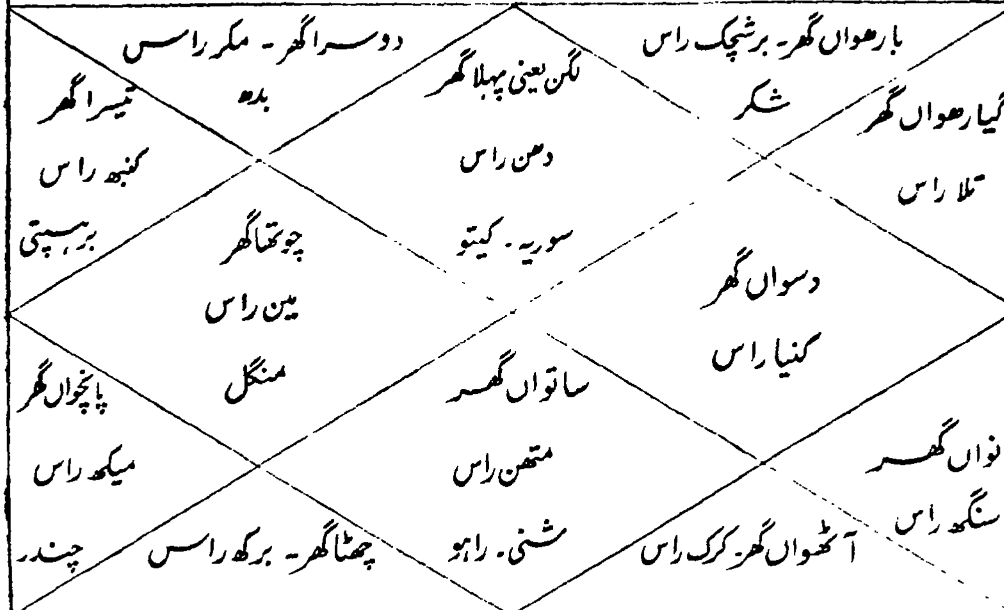
سہم اولاد اور سہم امراض کے مقامات غلط درج ہوگئے ہیں جو محض کاتب کی غلطی پر محمول کیے جاسکتے ہیں ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصل زائچے کے مخطوطے میں ان تینوں سہام کا ذکر نہ ہو بلکہ بعد میں کسی نے ان تینوں کو زائچے کے خانوں میں غلط طور پر درج کردیا ہو ، کیونکہ یہ تینوں سہام زیادہ اہم نہیں سمجھے جاتے اور عام طور پر صرف سہم السعادت ہی کو زائچے میں لکھنا کافی سمجھا جاتا ہے ۔ اگر صحیح حساب لگایا جائے تو غالب کے زائچے میں سہم الغیب پانچویں خانے میں برج حمل کے ۱۷ درجے ۴۰ دقیقے پر ہونا چاہیے ، سہم اولاد دسویں خانے میں برج سنبلہ کے ۱۰ درجے ۴۸ دقیقے پر ہونا چاہیے ، اور سہم امراض چوتھے خانے میں برج حوت کے ۲۶ درجے ۳۸ دقیقے پر ہونا چاہیے ۔ اغلب یہی ہے کہ ان تینوں سہام کو شائع شدہ زائچے میں کسی نے بعد میں غلط طور پر درج کر دیا ہوگا ، ورنہ زائچے کے اصل مخطوطے میں ان تینوں سہام کا اندراج نہیں ہوگا ۔ بہر حال ان تینوں سہام کے غلط مواقع سے زائچے کی اصل حقیقت پر ذرہ بھر بھی اثر نہیں پڑتا ، کیونکہ یہ سہام کوئی علاحدہ حیثیت نہیں رکھتے ، بلکہ طالع اور دیگر سیاروں کے مقامات کی مدد سے اخذ کر لیے جاتے ہیں ۔ لہذا اگر سہم السعادت کا مقام بھی غلط درج ہوتا تو بھی زائچے کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا ۔ عام پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے صفحہ ۳۸ و ۳۹ پر غالب کے دو مختلف زائچے مختصر اور آسان کر کے درج کیے جا رہے ہیں ، ایک زائچہ بحساب یونانی اور ایک زائچہ بحساب ہندی ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اگر ہم یونانی حساب میں سے ہرجگہ ایناشن یعنی ۲۱ درجے کم کرتے چلے جائیں تو ہندی حساب حاصل ہوجاتا ہے ۔ اہل ہند کی قدیم کتب میں سہام کا ذکر نہیں ہے ، اس لیے حساب ہندی کے مطابق سہام کا استخراج نہیں کیا جاتا اور حساب یونانی میں بھی صرف سہم السعادت ہی کو زیادہ قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے ۔

ان زائچوں کو دیکھنے سے ہمارا اصل مقصد حاصل ہو جاتا ہے ، پھر بھی میں نے پڑھنے والوں کی مزید دلچسپی کے لیے ذیل میں ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری ، ۸ رجب ۱۲۱۳ ہجری اور ۸ رجب ۱۲۱۴ ہجری کے مطابق تین زائچے بحساب یونانی بنائے ہیں اور ان کے سیاروں کے مقامات کا حساب درج کیا ہے ۔ غالب کے شائع شدہ زائچے کے سیاروں کے مقامات میں اور ان تینوں زائچوں کے سیاروں کے مقامات میں جو نمایاں فرق آتا ہے وہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے جس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہوجائے گی کہ غالب کی صحیح تاریخ پیدائش صرف

غالب کا زائچہ بحساب یونانی



غالب کا زائچہ بحساب ہندی



۸ رجب ۱۲۱۱ ھجری ھی ھو سکتی ھے جیسا کہ پہلے بھی ثابت کیا جا چکا ھے۔

"۸ رجب ۱۲۱۲ ھجری کا زائچہ"

۱ - استخراج تقویم یونانی بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۲ ھجری مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ عیسوی بروز چہار شنبہ بمقام اکبرآباد بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع آفتاب۔ انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علی الصباح ۵ بجکر ۳۳ منٹ پر۔ ایانانش تقریبا ۲۱ درجے۔ مساوات وقت تقریبا ۷ منٹ مثبت۔ غرۃالزیجات اھرگن ۳۰۴۷۹۰ - کرہ لاگھو حکر ۲۵، اھرگن ۱۰۳۶ - جولین ڈے ۲۳۷۷۷۶۲ -

۲ - طالع یعنی پہلا خانہ - برج قوس کے ۱۷ درجے ۵۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۹ درجے ۴۳ دقیقے منفی)

۳ - شمس، دوسرے خانے میں - برج جدی کے ۵ درجے ۵۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۲ درجے ۳۰ دقیقے منفی)

۴ - قمر، پانچویں خانے میں - برج حمل کے ۱۲ درجے صفر دقیقے پر تھا - (فرق ۲۶ درجے ۲۱ دقیقے منفی)

۵ - راس، ساتویں خانے میں - برج جوزا کے ۱۱ درجے ۵۸ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۸ درجے ۵۳ دقیقے منفی)

۶ - ذنب، پہلے خانے میں - برج قوس کے ۱۱ درجے ۵۸ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۸ درجے ۵۳ دقیقے منفی)

۷ - مریخ، بارھویں خانے میں - برج عقرب کے ۱۴ درجے ۵۹ دقیقے پر تھا - (فرق ۷ بروج ۲۱ درجے ۳۰ دقیقے مثبت)

۸ - عطارد، دوسرے خانے میں - برج جدی کے ۲۰ درجے ۵۵ دقیقے پر تھا - (فرق ۵ درجے ۱۳ دقیقے منفی)

۹ - مشتری، پانچویں خانے میں - برج حمل کے ۱۱ درجے ۲۸ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج صفر درجہ ۱۵ دقیقے مثبت)

۱۰ - زھرہ، تیسرے خانے میں - برج دلو کے ۲۲ درجے ۱۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۲ برج ۷ درجے ۵۱ دقیقے مثبت)

۱۱ - زحل ، آٹھویں خانے میں - برج سرطان کے ۱۱ درجے ۵۲ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۹ درجے ۲۵ دقیقے مثبت)

۱۲ - سہم السعادت ، دسویں خانے میں - برج سنبلہ کے ۱۱ درجے ۴۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۴ درجے ۲ دقیقے مثبت)

نوٹ : ہندوؤں کی پترہ کے استنباط کے مطابق طالع برج عقرب کے ۲۶ درجے پر تھا ، شمس برج قوس کے ۱۴ درجے پر تھا ، اور ذنب برج عقرب کے ۲۲ درجے پر تھا -

" ۸ رجب ۱۲۱۳ ہجری کا زائچہ "

۱ - استخراج تقویم یونانی بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۳ ہجری مطابق ۱۶ دسمبر ۱۷۹۸ عیسوی بروز یکشنبہ بمقام اکبر آباد بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع آفتاب - انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علی الصباح ۵ بجکر ۲۸ منٹ پر - اینانش تقریباً ۲۱ درجے - مساوات وقت تقریباً ۴ منٹ منفی - غرہ الزیجات اہر گن ۳۰۰۱۴۴ - گرہ لاگھو چکر ۲۵ ، اہر گن ۱۴۰۰ - جولین ڈے ۲۳۷۸۱۱۶ -

۲ - طالع یعنی پہلا خانہ - برج قوس کے ۱۷ درجے ۲۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۲۰ درجے ۱۹ دقیقے منفی)

۳ - شمس ، پہلے خانے میں - برج قوس کے ۲۴ درجے ۲۳ دقیقے پر تھا - (فرق ۲۲ درجے ۰۷ دقیقے منفی)

۴ - قمر ، پانچویں خانے میں - برج حمل کے ۲ درجے ۳۲ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۰ درجے ۴۹ دقیقے منفی)

۵ - راس ، چھٹے خانے میں - برج ثور کے ۲۳ درجے ۱۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۷ درجے ۳۷ دقیقے منفی)

۶ - ذنب ، بارھویں خانے میں - برج عقرب کے ۲۳ درجے ۱۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۷ درجے ۳۷ دقیقے منفی)

۷ - مریخ ، پانچویں خانے میں - برج حمل کے ۳ درجے ۴۷ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۰ درجے ۱۸ دقیقے مثبت)

۸ - عطارد ، دوسرے خانے میں - برج جدی کے ۱۲ درجے ۳۸ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۳ درجے ۳۰ دقیقے منفی)

۹ - مشتری، چھٹے خانے میں - برج ثور کے ۱۸ درجے ۰ دقیقے پر تھا -
(فرق ۲ بروج ۷ درجے ۲۸ دقیقے مثبت)

۱۰ - زہرہ، پہلے خانے میں - برج قوس کے ۲۱ درجے ۱۶ دقیقے پر تھا - (فرق ۶ درجے ۵۳ دقیقے مثبت)

۱۱ - زحل، آٹھویں خانے میں - برج سرطان کے ۲۸ درجے ۶ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۵ درجے ۳۸ دقیقے مثبت)

۱۲ - سہم السعادت، نویں خانے میں - برج اسد کے ۲۹ درجے ۱۱ دقیقے پر تھا - (فرق ۸ درجے ۲۷ دقیقے منفی)

نوٹ : ہندوؤں کی پتره کے استنباط کے مطابق طالع برج عقرب کے ۱۶ درجے پر تھا، شمس برج قوس کے ۳ درجے پر تھا، اور ذنب برج عقرب کے ۴ درجے پر تھا -

"۸ رجب ۱۲۱۴ ہجری کا زائچہ"

۱ - استخراج تقویم یونانی بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۴ ہجری مطابق ۶ دسمبر ۱۷۹۹عیسوی بروز جمعہ بمقام اکبرآباد بوقت چہار گھڑی قبل از طلوع افتاب - انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علے الصباح ۵ بجکر ۲۱ منٹ پر - اینانش تقریبا ۲۱ درجے - مساوات وقت تقریباً ۹ منٹ منفی - غرۃالزیجات اہرگن ۳۰۴۴۹۹ - کرہ لاکھو چکر ۲۵، اہرگن ۱۷۵۵ - جولین ڈے ۲۳۷۷۴۷۱ -

۲ - طالع یعنی پہلا خانہ - برج عقرب کے ۲۶ درجے ۵۵ دقیقے پر تھا -
(فرق ۱ برج صفر درجہ ۴۴ دقیقے منفی)

۳ - شمس، دوسرے خانے میں - برج قوس کے ۱۳ درجے ۵۷ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۴ درجے ۲۳ دقیقے منفی)

۴ - قمر، چھٹے خانے میں - برج حمل کے ۴ درجے ۴۸ دقیقے پر تھا -
(فرق ۱ برج ۳ درجے ۳۳ دقیقے منفی)

۵ - راس، ساتویں خانے میں - برج ثور کے ۴ درجے ۲۶ دقیقے پر تھا -
(فرق ۱ برج ۲۶ درجے ۲۵ دقیقے منفی)

۶ - ذنب - پہلے خانے میں - برج عقرب کے ۴ درجے ۲۶ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۲۶ درجے ۲۵ دقیقے منفی)

۷ - مریخ ، پہلے خانے میں - برج عقرب کے ۱۰ درجے ۱۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۷ بروج ۲۱ درجے ۵۴ دقیقے مثبت)

۸ - عطارد ، تیسرے خانے میں - برج جدی کے ۳ درجے ۴۹ دقیقے پر تھا - (فرق ۲ ۲ درجے ۱۹ دقیقے منفی)

۹ - مشتری ، آٹھویں خانے میں - برج جوزا کے ۲۹ درجے ۳۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۳ بروج ۱۹ درجے ۶ دقیقے مثبت)

۱۰ - زہرہ ، پہلے خانے میں - برج عقرب کے ۴ درجے ۵۲ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۹ درجے ۳۱ دقیقے منفی)

۱۱ - زحل ، دسویں خانے میں - برج اسد کے ۱۰ درجے ۴۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۲۳ درجے ۱۲ دقیقے مثبت)

۱۲ - سہم السعادت ، دسویں خانے میں - برج اسد کے ۶ درجے ۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۱ درجہ ۴۳ دقیقے منفی)

نوٹ : ہندوؤں کی پترہ کے استنباط کے مطابق طالع برج عقرب کے ۵ درجے پر تھا ، شمس برج عقرب کے ۲۲ درجے پر تھا ، اور ذنب برج میزان کے ۱۰ درجے پر تھا -

مندرجہ بالا تینوں زائچوں کا مقابلہ غالب کے شائع شدہ زائچے سے کرنے کے بعد یہ امر یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ غالب کی صحیح تاریخ پیدائش ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز یکشنبہ ہے ، جبکہ جولین ڈے ۲۳۷۴۰۹ تھا - آن کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ عیسوی کو بروز دو شنبہ ہوئی تھی جبکہ جولین ڈے ۲۴۰۳۷۴۴ تھا - اس طرح غالب نے اس دارفانی میں کل ۲۶۳۳۵ دن قیام کیا تھا -

اس مقام پر ہمارا مقصد پورا ہو جاتا ہے ، لیکن ضمنی طور پر غالب کے اس قصیدے کا بھی ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو انھوں نے ابو ظفر بہادر شاہ کی شان میں کہا تھا ، کیونکہ اس سے ہمارے نفس

مضمون کو کافی تقویت پہنچے گی ۔ اس قصیدے کی تشبیب میں بھی غالب نے سیاروں کے آن مقامات کا ذکر کیا ہے جو اس مخصوص ساعت میں واقع ہوئے تھے ، جبکہ غالب نے بہادر شاہ ظفر کے سامنے یہ قصیدہ بہ نفس نفیس پڑھا تھا ۔ وہ دس اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ۔

بو ظفر قبلۂ آفاق کہ در مسلک شوق
ہر کہ رو سوئے تو دارد بہ جہاں قبلہ نما ست

ہمچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دہر قلم مدعی و نکتہ گو است

ذوق مدح تو بر آن داشتہ باشد کامروز
رگ اندیشہ زدم گر چہ قمر در جوزاست

اینکہ خور در حمل و مہ بہ دو پیکر باشد
ہست تسدیس ہمایوں نظر مہر فزا ست

بادہ با نیر اعظم زدہ کیواں بہ حمل
ہم نشینی بہ شہنشہ ز کشاورز خطا ست

زہرہ دیدم بہ حمل تن زدم از خبث زحل
بہر شہ مطربہ آوردہ نہ دہقان تنہا ست

قاضی چرخ کہ در خوشہ بود واژوں بوئے
متحیر کہ چرا اوج و وبالش یکجاست

چوں فرود آمدہ مریخ بہ منزلگہ ماہ
کلبۂ پیک طرب گاہ سپہبد نہ رواست

تا چہ افتادہ کہ در خانۂ قاضیست دبیر
پرسش واقعۂ ہست اگر پرسی راست

گشتہ در دلو و اسد روئے برو جادہ نورد
ذنب و راس کہ از طالع و غارب پیداست

مضمون کو مختصر کرنے کی غرض سے ان اشعار کے ترجمے کو اور اصطلاحات کی تشریح کو چھوڑ دیا گیا ہے ۔ اگر اس مضمون کی تمہید کو سمجھ کر پڑھ لیا جائے تو ان اشعار کی تنجیمی اہمیت کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکتی ۔ ان اشعار میں بھی غالب نے تمزیج سیارگان کی بڑی اعلیٰ و ارفع مثالیں قائم کی ہیں اور کنایتہً اپنے حریفوں پر ، خصوصاً استاد شاہ یعنی شیخ ابراہیم ذوق پر بڑی چوٹیں کی ہیں ۔ یہ ملحوظ رہے کہ ان اشعار میں غالب نے شاعرانہ طور پر کنایتہً بہادر شاہ ظفر کو شمس سے تشبیہ دی ہے ، اپنے آپ کو قمر سے تشبیہ دی ہے ، ذوق کو زحل سے تشبیہ دی ہے ، اور زہرہ کو اس مطربہ سے تشبیہ دی ہے جس نے شاید اس محفل میں ذوق کا قصیدہ ترنم کے ساتھ پڑھ کر یا گا کر سنایا ہو گا ۔ اسی طرح باقی سیاروں کو بھی حسب مناسبت اپنے دوسرے حریفوں سے تشبیہ دی ہے ۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ تمزیجی اعتبار سے غالب نے شمس کو شہنشاہ ، قمر کو پیک طرب ، مریخ کو سپہبد ، عطارد کو دبیر ، مشتری کو قاضی ، زہرہ کو مطربہ ، زحل کو کشاورز و دہقان ، اور ذنب و راس کو روئے رہرو جادہ نورد بتایا ہے ۔ اس طرح تمزیج سیارگان کی لذت میں شاعرانہ شوخی کی چاشنی بھی شامل ہو گئی ہے ۔

ان اشعار سے جن باتوں کا علم ہوتا ہے وہ یہ ہیں ۔ اس وقت طالع برج دلو میں تھا اور اس میں ذنب بھی موجود تھا ۔ غارب برج اسد میں تھا اور اس میں راس بھی موجود تھا ۔ شمس برج حمل میں تھا اور اس کے ساتھ زحل و زہرہ بھی تھے ۔ قمر برج جوزا میں تھا اور اس پر شمس کی نظر تسدیس بھی پڑ رہی تھی جو مبارک سمجھی جاتی ہے ۔ مشتری راجع ہو کر برج سنبلہ میں پڑا تھا جہاں اس کا اوج بھی ہے اور وبال بھی ہے ۔ قمر کے گھر یعنی برج سرطان میں مریخ تھا ۔ اور مشتری کے گھر یعنی برج حوت میں عطارد تھا ۔ سیاروں کے ان مواضع پر غور کر کے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے یہ قصیدہ جشن نو روز کے موقع پر کہا تھا اور جس تقویم سیارگان کا اس قصیدے میں ذکر ہے وہ دراصل زائچہ نوروز کی تقویم تھی ، جیسا کہ غالب نے لفظ ''امروز'' استعمال کر کے ظاہر کیا ہے ۔ میں نے اس تقویم سیارگان کو بھی اسی طرح معلوم کر لیا ہے جس طرح کہ غالب کے زائچے کے لیے حسابات لگائے تھے لیکن اس تقویم کی تفصیلات کو اس جگہ بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا ۔ صرف اتنا سمجھ لیجیے کہ اس وقت طالع برج دلو کے ۲۲ درجے پر

تھا ، شمس برج حمل کے صفر درجے پر تھا ، قمر برج جوزا کے ۲۷ درجے تھا ، راس برج اسد کے ۲۲ درجے پر تھا ، ذنب برج دلو کے ۲۲ درجے تھا ، مریخ برج سرطان کے ۲ درجے پر تھا ، عطارد برج حوت کے ۱۸ در پر تھا ، مشتری برج سنبلہ کے ۲۰ درجے پر تھا ، زھرہ برج حم کے ۵ درجے پر تھا ، اور زحل برج حمل کے ۸ درجے پر تھا ۔ یہ یاد ر کہ جب شمس برج حمل میں داخل ھوتا ھے تو اُس داخلے کو علم نجو کی اصطلاح میں '' تحویل شمس در برج حمل'' کہتے ھیں اور اس ساعت تقویم سیارگان کو زائچہ' نوروز کہتے ھیں ۔ یہ ساعت نہایت مبارک سمجھ جاتی ھے اور اھل یونان و ایران کے مطابق اُس وقت سے نئے شمسی سال کا آغ ھوتا ھے ۔ اسی لیے اس موقع پر نہایت شاندار جشن نو روز منایا جاتا ھے او تہنیتی قصیدے پڑھے جاتے ھیں ۔ غالب نے بھی شاھجہان آباد (یعنی دھلی) می ایک ایسے ھی جشن نو روز کے موقع پر بہادر شاہ ظفر کی شان میں یہ تہنیت قصیدہ پڑھا تھا ۔ لہذا جس ساعت میں غالب نے یہ قصیدہ پڑھا تھا وہ ساعت بتاریخ ۲۱ مارچ ۱۸۵۰ عیسوی ، بروز پنجشنبہ مطابق ۷ جمادی الاو ۱۲۶۶ء ھجری ، علی الصباح ۴ بج کر ۱۷ منٹ (انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم) سے شروع ھوئی تھی جبکہ تحویل شمس در برج حمل واقع ھوئی تھی اور تقریب ۴۵ منٹ کے بعد ۵ بج کر ۲ منٹ پر ختم ھو گئی تھی جب کہ طالع برج دل سے برج حوت میں تبدیل ھوا تھا ۔

کتابیات :

۱۔ غرۃالزیجات : یہ ابو ریحان محمد البیرونی کی وہ لاجواب زیج ہے جو اُس نے گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھی تھی ۔ اس کا واحد مخطوطہ احمد آباد شہر میں درگاہ پیر محمد شاہ کے کتب خانے میں محفوظ ھے۔ دراصل یہ سنسکرت کی کتاب کرن تلک کا عربی ترجمہ ھے جو بیرونی نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ھے ۔ اصل سنسکرت کتاب کا مصنف وجے نندی تھ جو کاشی کا رھنے والا تھا ، لیکن وہ سنسکرت کتاب اب ناپید ھو چکی ھے میں نے غرۃالزیجات کو اُس کے انگریزی ترجمے ، تشریح اور تصحیح کے ساتھ مکمل کرلیا ھے ، اور اب اس کتاب کو میں حیدرآباد (دکن) کے انگریزی سہ ماہی رسالے '' اسلامک کلچر'' میں بالاقساط شائع کرا رھا ھوں ۔ اس وقت تک اپریل ۱۹۶۳ء ، جولائی ۱۹۶۳ء ، اکتوبر ۱۹۶۳ء ، جنوری ۱۹۶۴ء ۔

جولائی ۱۹۶۳ء، جنوری ۱۹۶۰ء اور اپریل ۱۹۶۰ء کے شماروں میں سات قسطیں شائع ہوچکی ہیں۔

۲۔ کتاب التفہیم لاوائل صناعتہ التنجیم: یہ علم نجوم کی معرکہ آرا کتاب ہے اور اسے ابو ریحان محمد البیرونی نے گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھا تھا۔ بیرونی نے اس کتاب کو خود ہی عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا تھا۔ اس کا ایک مطبوعہ فارسی نسخہ لیاقت میموریل نیشنل لائبریری کراچی (پاکستان) میں محفوظ ہے، یہ ایران میں شائع ہوا تھا۔

۳۔ کفایتہ التعلیم فی صناعتہ التنجیم: یہ بھی علم نجوم کی بڑی مستند کتاب ہے اور بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی تھی۔ اس کا ایک فارسی مخطوطہ میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے جو سو سال پرانا ہے اور بہت اعلیٰ معیار کا ہے۔

۴۔ زیج الغ بیگ: یہ زیج پندرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جدولوں کی شکل میں لکھی گئی تھی اور اس کے حسابات سمرقند کی رصد گاہ کی مدد سے مقرر کئے گئے تھے۔ اس کا ایک نادر فارسی مخطوطہ آج کل اسلامیہ کالج پشاور (پاکستان) کی لائبریری میں محفوظ ہے یہ بڑی قابل اعتماد زیج سمجھی جاتی ہے۔

۵۔ مکرند سارنی: یہ زیج پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی گئی تھی اور آج تک ہندو جیوتشیوں میں مقبول عام ہے۔ اس کے حسابات جدولوں کی شکل میں سوریہ سدھانت کے مطابق ہیں لیکن بعض مقامات پر بیج سنسکار سے یعنی ترمیمات سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ یہ کتاب سنسکرت میں لکھی گئی ہے اور اس کے مطبوعہ نسخے بھارت کے بازاروں میں عام ملتے ہیں۔

۶۔ گرہ لاگھو: یہ زیج سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھی گئی تھی اور اس کے مصنف گنیش دیوگیہ نے ذاتی طور پر مشاہدات فلک کرنے کے بعد اس کے حسابات مقرر کئے تھے۔ حسابات کی صحت کے لحاظ سے یہ زیج بہت مشہور ہے اور ہندو جیوتشی اسے مکرند سارنی سے زیادہ قابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب بھی سنسکرت میں لکھی گئی ہے اور اس کے مطبوعہ نسخے بھی بھارت کے بازاروں میں عام ملتے ہیں۔

۷۔ ای ڈبلیو براؤن اور نیو کومب کی زیجیں: یہ دونوں زیجیں دور

حاضر کے ہیئت دانوں نے مغربی ممالک کی رصد گاہوں کے مشاہدات کے مطا
لکھی ہیں ، اور جدولوں کی شکل میں ہیں ۔ ان زیجوں کا جزوی اور مختص
ہندی ترجمہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی کے ریڈر ڈاکٹر گورکھ پرشاد :
کیا تھا جسے کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے ''چندر سارنی'' اور '' سور
سارنی'' کے ناموں سے بالترتیب ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۸ء میں شائع کیا تھا
ان زیجوں کے حسابات موجودہ سائنسی تحقیقات کی بنیاد پر مقرر کئے گیے ہیں

۸- این سی لاہری کی جدولیں : یہ جدولیں خط استوا سے لے کر
درجے عرض البلد تک کے لیے علاحدہ علاحدہ بنائی گئی ہیں ، اور انگریز
رسم الخط میں لکھی گئی ہیں ۔ ان جدولوں کی مدد سے ہر مقام کا اور
ساعت کا طالع معلوم کیا جاسکتا ہے ۔ ان جدولوں کو این سی لاہری ۔
مرتب کیا ہے ، اور ایسٹرو ریسرچ بیورو کلکتہ نے شائع کیا ہے ۔
جدولیں اپنے صحیح حسابات کے لحاظ سے بڑی اہم سمجھی جاتی ہیں ا
آج کل کے منجمین میں مقبول ہیں ۔ ان کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں اور دوسر
ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا ۔

طلسم گنجینۂ معانی

ڈاکٹر شوکت سبزواری

[۱]

غالب نے اپنی شاعری پر فخر کرتے ہوئے فکر اور فن دونوں کو سراہا ہے:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن میں سمجھتا ہوں فن یعنی انداز بیان اور روش خاص یعنی بداعت اسلوب پر غالب کو زیادہ ناز ہے کہ اس میں شاعر کی صد رنگ شخصیت اور ہمہ رنگ انفرادیت کے جوہر زیادہ روشن نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ اس نے ایک طرف اپنے عہد کے اہل خرد کی روش خاص کا مضحکہ اڑایا ہے:

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہ عام بہت ہے

دوسری طرف اپنے بیان کی ندرت کا واشگاف طور پر اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

بیان سے کیا مراد ہے اور انداز بیان کی ندرت ، جس کا ذکر غالب نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ، کیا ہے ۔ یہ تو میں تفصیل کے ساتھ نہ بتا سکوں گا صرف اتنا عرض کروں گا کہ بیان کا فنی تجزیہ کرنے سے تین اجزا ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ اول الفاظ جو مفرد بھی ہو سکتے ہیں اور مرکب بھی ، دوم فقرے یا ترکیبیں ، سوم پورے پورے جملے ۔ ان سب میں ایک طرح کی حیاتیاتی ترتیب پائی جاتی ہے ۔ فقرے الفاظ سے ترکیب پا کر وجود میں

آتے ہیں اور جملوں کا کالبد فقروں کی وضع اور ترتیب کا منت کش ہوتا ہے۔ بیان نام ہے لفظوں ، فقروں اور چھوٹے بڑے جملوں کے مجموعے کا جنھیں ایک سے زیادہ طریقوں سے برتا جاسکتا ہے۔ جس طرح خشت و گل کی مدد سے ہر نقشے کا مکان تعمیر ہو سکتا ہے ، اسی طرح لفظوں اور جملوں کی ترکیب ، وضع خاص اور ترتیب سے بیان کے رنگا رنگ ڈھانچے تشکیل پاتے ہیں جن میں سے بعض عام انداز کے ہوں گے اور بعض جدت ، بداعت یا آب و رنگ کے حامل ہونے کی وجہ سے خاص انداز کے ۔ بیان کی جدت ، بداعت ، رنگینی و رعنائی اس وقت زیر بحث نہیں ، اس لیے چند مثالوں سے اس کی وضاحت شاید کافی ہوگی ۔

[۱]

غالب کہنا چاہتے ہیں کہ شب فرقت کے رنج و اندوہ کا بیان خود عاشق حرماں نصیب کے صلاح کار کے لیے ضروری ہے ۔ اظہار و بیان سے اگر اسے باز رکھا گیا تو اس کا انجام دیوانگی کے سوا کچھ نہ ہوگا ۔ عاشق ماہ زدہ ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چپ سادھ لے گا ۔ اس مضمون کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے :

گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

چاند کا دیوانگی سے خاص تعلق ہے ۔ اس بنا پر داغ ماہ کو مہر دہاں قرار دینا اور اس سے حرماں نصیب عاشق کا جنوں مراد لینا ایک بالکل نیا اور روش عام سے ہٹا ہوا انداز بیان ہے ۔

یا مثلاً کہنا یہ ہے کہ کسی زمانے میں ہمیں بزم آرائی کا شوق تھا ۔ جب سے یہ شوق دھیما پڑا ہے ہم اس کی یاد کے سہارے زندگی گزار رہے ہیں ۔ اب یہ یاد بھی مٹتی جارہی ہے ۔ اسے اس طرح کہا ہے :

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

بزم آرائی کی بھولی بسری یاد کو طاق نسیاں کا نقش و نگار قرار دینا پر لطف ہی نہیں دل نشین بھی ہے جو تیر کی طرح دل میں بیٹھتا چلا جاتا ہے ۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے :

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

"بخیۂ چاک گریباں" سے عاشق زار کے اخفائے حال کا حال کہنا ہے۔ ضبط گریہ نے چاک گریباں پر بخیہ کا کام کیا اور راز الف طشت از بام نہ ہوسکا۔ ذیل کے شعر کا انداز بھی کچھ اسی قسم کا ہے:

نکوہش مانع بے ربطی شور جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

اوپر ضبط گریہ نے آہوں کو بخیۂ چاک گریباں بنایا تھا۔ یہاں خندۂ احباب بخیۂ جیب و دامن قرار پایا اور اس طرح جنون کی بے ربطی پر بدستور پردہ پڑا رہا۔ مذکورہ بالا غزل کا آخری شعر ہے:

یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

زبان کے عام محاورے اور قواعد کے خلاف اس شعر میں مستقبل کی بجائے ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ کہنا یہ تھا کہ غالب اگر یونہی اشک باری کرتا رہا تو دیکھ لینا ایک دن بستیاں سب تباہ و برباد ہو جائیں گی، لیکن کہا یہ کہ بستیاں ویران ہوگئیں۔ مستقبل کی جگہ صیغۂ ماضی کا استعمال وثوق اور یقین ظاہر کرتا ہے۔ غالب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بستیوں کی ویرانی یقینی ہے، ویران ہو کر رہیں اور پھر رہیں۔

ذیل کا شعر سطور بالا میں درج ہو چکا ہے۔ اس میں ماضی کی جگہ مستقبل کا صیغہ استعمال ہوا ہے:

گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

مطلب یہ ہے کہ آج تک چار و ناچار جس طرح ہوا ضبط سے کام لیا گیا، آیندہ اظہار و بیان سے باز رکھا گیا تو اس کا نتیجہ دیوانگی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

ایک مثال اور پیش کرتا چلوں تاکہ انداز بیان کی وہ تمام صورتیں روشنی میں آجائیں جنھیں میں واضح کرنا چاہتا ہوں :

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

"خدا کرے" کو الٹ کر "خدا نہ کرے" کہنے میں جو لطف ہے اسے بجلی کے تمقمے کے روشن ہونے اور بجھنے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

ایک غزل کے یہ تین شعر بھی اسی سلسلے کے ہیں :

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جاتے ہے
اس کی بزم آرائیاں سن کر دل رنجور یاں
مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

پہلے شعر میں کھوئے جانے اور پائے جانے کا تقابل داد کے قابل ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں بالترتیب بیٹھنا اور کھنچنا دو فعل دو مختلف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جن کا لطف صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

یہ کل دس مثالیں ہوئیں جن میں سے پہلی چار مثالوں کا تعلق بلاغت کے شعبہ' بیان سے ہے جس میں عموماً اظہار کے گوناگوں طریقوں ، ان کے حسن و اثر یا چمک دمک سے بحث کی جاتی ہے ۔ دوسری قسم کی دو مثالیں شعبہ' معانی کے ذیل میں آتی ہیں جسے فلسفہ' قواعد کہنا چاہیے ۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ زبان کے محاوروں اور قاعدوں کی پابندی کے کیا معنی ہیں اور وہ کون سے مواقع ہیں جہاں قواعد سے انحراف ، لطافت و بلاغت سمجھا جاتا ہے۔ تیسری اور آخری چار مثالوں سے طرز اظہار کی چاشنی یا چٹ پٹے پن پر روشنی پڑتی ہے جو شعبہ' بدیع کا موضوع ہے۔

بیان اور اس کے اسالیب سے ہٹ کر اس وقت صرف اجزائے بیان یعنی الفاظ اور ان کے آمیزے زیر بحث ہیں جو بقول غالب :

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

کلام غالب کے لیے طلسم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ غالب کے کلام کی روح تک رسائی کے لیے اس کے لفظوں کی طلسم کشائی ضروری ہے ۔ الفاظ و مرکبات کی قدر و قیمت کی تعیین جو کلام غالب کے آینہ خانے کی تعمیر میں صرف ہوئے ہیں ، اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان کی ساخت ، حقیقت اور اصول انتخاب سے پوری طرح آگاہ ہوں ۔

[۳]

ڈاکٹر بجنوری مرحوم فرماتے ہیں " مرزا کی شاعری دلی کی گلیوں یا لکھنؤ کے کوچوں کی پابند نہیں بلکہ آزاد اردو زبان ہے " ۔ غالب کی زبان آزاد ہی نہیں تازہ اور جدید بھی ہے ۔ غالب ایک حد تک خود اپنی زبان کے واضع ہیں ۔ انھوں نے پیش پا افتادہ ، پامال ، گھسے پٹے الفاظ ، مرکبات اور محاورے کم سے کم استعمال کیے ہیں ۔ وہ زبان کے مزاج کے پارکھ ہی نہ تھے ، اس کے نوح اور لچک کا صحیح ذوق بھی رکھتے تھے ، فارسی اور اردو کے خلا ملا کا بھی انھیں پوری طرح احساس تھا ۔ اس لیے انھوں نے ماہر صنعت کار کی طرح لفظ سازی سے کام لیا ، حسب ضرورت کھلے ڈھلے الفاظ وضع کیے ، پرانے الفاظ کی رگوں میں نئے معانی کا تازہ خون دوڑا کر ان کا کایا کلپ کیا ۔ غالب کے کلام کی تازگی بڑی حد تک تازہ کاری ، ایجاد اور رستخیز الفاظ و مرکبات کی منت کش ہے ۔

" آینہ دار " فارسی میں مشاطہ کو کہتے ہیں جو حسینہ کے سامنے آینہ رکھ کر اس کے شوق جمال آرائی کا سامان کرتی ہے ۔ غالب نے شاید اس بنا پر کہ آینہ چہرے کے حسن وقبح کو دکھاتا ہے ، آینہ دار کو (مثال دے کر یا دکھا کر) بتانے والے یا دکھانے والے کے معنوں میں استعمال کیا ہے :

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

حیرت نقش پا نے اپنی افتادگی دکھا کر کوئے یار میں رہنے کی وضع بتادی ۔ " آینہ داری " اظہار کے معنوں میں غالباً بعد میں وضع ہوا ۔

غالب کے یہاں آیینہ داری جمال آرائی ہے :

تماشا کر اے محو آیینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

" سیہ گلیم " فارسی کی عام ترکیب ہے اور اس کے معنی ظاہر ہیں ، غالب نے سیاہ بخت اور بدقسمت کے معنوں میں استعمال کیا ہے :

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

غالب کے ان تصرفات کو میں لفظوں کا حشر و نشر کہتا ہوں ۔ کہیں انہوں نے زبان کے عام قواعد کے مطابق نئے لفظ یا پرانے لفظوں کی ترکیب سے نئے انداز کے مرکب ڈھالے ہیں ، کہیں پرانے مرکب سے نئے مناسب ترکیبی معنی مراد لیے ہیں ، اور ایک ماہر فنکار کی طرح اسے اس انداز سے استعمال کیا ہے کہ نئے معنوں کی طرف قاری کا ذہن بآسانی منتقل ہوجاتا ہے اور مفہوم تک رسائی میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ۔ یہ صحیح ہے کہ نئے خیال کو نئے لفظ کے قالب میں ڈھال کر ہی پیش کیا جاسکتا ہے ، لیکن فنکار کو زبان پر قدرت یا لفظ سازی میں مہارت نہ ہو تو یہ خطرہ بہرحال رہتا ہے کہ خیال کی باریکی پر بیان کی تاریکی چھا جائے اور مفہوم واضح نہ ہونے پائے ، غالب کے یہاں خیال کی باریکی تو ہے بیان کی تاریکی نہیں ۔

[۲]

سوال یہ ہے کہ غالب اس مشکل کام سے کس طرح عہدہ برآ ہوئے ، نئے خیالات کی ادائی کے لیے نئے الفاظ کا ذخیرہ انہوں نے کہاں سے حاصل کیا ، کن اصولوں کے مطابق نئے لفظ ڈھالے اور کس طرح پرانے الفاظ کو نئے معنوں میں استعمال کر کے ان کا خلق نو کیا اور اس طرح ایک تازہ کار ، زندہ اور نئے تصورات و خیالات سے پوری طرح ہم آہنگ زبان کا ڈول ڈالا ۔

غالب نے فارسی کی آغوش میں تربیت پائی تھی جس کی توانائی و برنائی کا انہیں پوری طرح احساس تھا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ، اردو اور فارسی کے تال میل سے بھی وہ بے خبر نہ تھے ۔ انہوں نے فارسی کے

ذخیرے سے بے دریغ استفادہ کیا۔ فارسی کے ڈھلے ڈھلائے الفاظ مستعار لیے، انھیں ترکیب دے کر نئی وضع کے مرکبات ڈھالے، فارسی افعال و محاورات کے اردو میں ترجمے کیے اور فارسی کا ایک بڑا سرمایہ اردو میں منتقل کردیا۔ فارسی الفاظ سے جنھیں غالب نے اپنے اردو کلام میں استعمال کیا ہے ایک طویل فرہنگ مرتب دی جاسکتی ہے جو اپنی جگہ ایک مستقل کام ہے۔ فارسی حروف سے ترکیب پا کر جو کلمے بنے ہیں ان میں سے بقدر، بانداز، از بسکہ، بسکہ، از بس، برنگ (= طرح) بجز وغیرہ کا غالب نے کثرت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ درخور، باب (= بابت) زنہار (= ہرگز) وغیرہ کی بھرمار بھی ہے لیکن باب (= لائق) اور زنہار (بطور فجائیہ) ذیل کے شعروں میں ملے ہیں:

دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوس نا و نوش ہے

کثرت بتانے کے لیے ظرف کی تکرار یا بطور پیمانہ اس کا استعمال فارسی میں عام ہے۔ غالب نے بڑے شوق و رغبت سے اسے اردو میں جگہ دی ہے۔ صرف چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
[یک جہاں ہنگامہ = فراوانی ہنگامہ]
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
[خیاباں خیاباں = کثرت کے ساتھ]
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
[یک شہر آرزو = ہجوم آرزو]
نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
[یک بیاباں ماندگی = کثرت ماندگی]

فارسی لفظ صد (= سو) سے کثرت یا تنوع کا اظہار غالب کے بیان کی ایک خصوصیت ہے۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے

صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

فارسی جمع و خوباں، اور 'دل آشفتگاں' وغیرہ کا بغیر اضافت استعمال بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ یہ اردو محاورے کے خلاف ہے۔

[۵]

فارسی محاورات کے اردو ترجمے غالب کے یہاں بہت زیادہ ہیں جن میں سے بعض شاید اردو میں نہ کھپ سکیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب نے موقع و محل کے لحاظ سے انہیں بڑی خوبصورتی سے کھپایا ہے اور ان سے جو کام لیا ہے وہ غالباً ان کے ہم معنی خاص اردو محاورات سے نہیں لیا جا سکتا تھا اور اگر لیا جا سکتا تھا تو بیان وہ تازہ کاری نہ آتی جو ان ترجموں نے پیدا کی۔ چند ترجمے ملاحظہ ہوں:

وا کرنا (وا کردن) انتظار کھینچنا (انتظار کشیدن) درست کرنا (درست کردن) تماشا کرنا (تماشا کردن) بباد دینا (بباد دادن) عذر لانا (عذر آوردن) باور آنا (باور آمدن) شادمانی کرنا (شادمانی کردن) جا دینا (جا دادن) رنگ پکڑنا (رنگ گرفتن) شکایت کی جا نہ رہنا (جائے شکایت نہ ماندن) خجالت کھینچنا (خجالت کشیدن) ناز فرمانا (ناز فرمودن) کنارہ کرنا (کنارہ کردن) ناز کھینچنا (ناز کشیدن) تسلی ہونا (تسلی شدن) منت کھینچنا (منت کشیدن) رخصت دینا (رخصت دادن) دریغ آنا (دریغ آمدن) دریغ رکھنا (دریغ داشتن) طرف ہونا (طرف شدن) شعار کرنا (شعار کردن) جا گرم کرنا (جا گرم کردن)۔ ذیل کے شعر میں تقریر کرنا بمعنی بیان کرنا:

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

فارسی 'تقریر کردن' کا ترجمہ ہے۔ یہی حال اس شعر کا ہے:

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

"ازو ہم آغوشی آرزو دارم" کو لفظ بلفظ اردو میں منتقل کر دیا گیا ہے ۔ ایک اور شعر ہے:

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس سے جان عزیز رکھوں ، ترجمہ ہے "ازاں بت جان عزیز دارم" کا

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعف دماغ
سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

سر کرنا ، کے معنی ہیں شروع کرنا اور یہ فارسی 'سر کردن' کا ترجمہ ہے ۔

ان محاورات و استعمالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب فارسی رنگ میں کچھ اس طرح رنگ گئے تھے کہ فارسی میں سوچتے اور اردو محاورے کا خیال کیے بغیر بے تکلف اردو میں بیان کر دیتے تھے، مثلاً شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے، ترجمہ ہے 'خالی ز ادا نیست' کا ۔ 'نہ' اردو محاورے کے خلاف ہے ۔

فارسی (عربی) الفاظ بھی اسی ضمن میں آتے ہیں جو اگرچہ فارسی میں مستعمل تھے ، اور انھی معنوں میں مستعمل تھے ، جن معنوں میں غالب نے انھیں استعمال کیا ، لیکن اردو میں ان کا رواج نہ تھا ، یا تھا تو عام نہ تھا ۔ غالب نے سکۂ رائج الوقت کی طرح انھیں چلن عطا کیا ۔ مثلاً محابا ، ڈر کے معنوں میں :

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا

مقدم ، بمعنی آمد :

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

جلترنگ کو ساز صدائے آب کہنا بھی لطف سے خالی نہیں ۔ صرفہ ، فائدے کی جگہ اور اس کے معنوں میں :

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

رقیب بمعنی دشمن :

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

''معلوم'' کے بعد عموماً غالب ''ہے'' یا ''تھا'' وغیرہ فعل خذف دیتے ہیں اور اس سے نفی کے معنی مراد لیتے ہیں -

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

غنچہ تا شگفتن ہا برگ عافیت معلوم
باوجود دل جمعی خواب گل پریشان ہے

بنالہ حاصل دل بستگی فراہم کر
متاع خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

[٦]

جدید فارسی مرکبات کی شرح و تفصیل سے پہلے مناسب معلوم ہے کہ ان صفات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جو کسی لفظ کی توضـ

تعیین کی غرض سے غالب نے بطور صفت یا بطور خبر استعمال کی ہیں۔ صفت کی خوبی یہ ہے کہ جس لفظ کی توضیح یا تعیین مقصود ہو اسے کچھ اس طرح واضح کر دے کہ حقیقت آیینہ ہو جائے اور نظر کے سامنے اس کی تصویر کھینچ جائے۔ غالب نے قریب قریب ہر جگہ جہاں ضرورت سمجھی مناسب اور برمحل صفات کی مدد سے لفظ کی حقیقت کو بر افگندہ نقاب کیا ہے۔ اور دو ملتی جلتی ہم جنس حقیقتوں کے لیے دو مختلف لیکن موزوں ترین صفات استعمال کی ہیں جس سے غالب کی دقت بینی کا پتا چلتا ہے:

آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

آہ کے لیے بے اثر اور نالہ کے لیے نارسا مناسب ترین صفات ہیں -

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم

دوست دار کی جگہ دوست بھی ہو سکتا تھا لیکن دوست دار مرکب لفظ ہے جس کے معنی ہیں دوست یعنی عزیز رکھنے والا -

حال اور طاقت کے نازک ترین فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا ہے:

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

چند الفاظ اور ان کی صفات درج کی جا رہی ہیں - غور فرمایئے کہ صفات نے حقائق کی وضاحت میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

بت آیینہ سیما ، نگاہ بے محابا ، مے مرد افگن ، بت بیداد فن ، نگاہ غلط انداز ، نگہ سرمہ سا ، رند شاہد باز ، خامہ خونچکاں ، عشق خونتابہ مشرب ، تغافل تمکین آزما ، شکایت رنگیں ، نوازش بے جا -

دو یا دو سے زیادہ لفظوں کے جوڑنے کی دو بڑی بنیادی صورتیں ہیں - ایک یہ کہ اجزائے کلمہ مل جل کر شیر و شکر ہو جائیں - اس قسم کے لفظ کو مرکب کہیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ترکیب کے باوجود اجزا الگ الگ رہیں اور گھلنے ملنے نہ پائیں - ایسے ترکیب کہتے ہیں - آیینہ سیما ، اور بیداد فن ، مرکب ہیں - اس کے مقابلے میں طاق نسیاں ، روح و رواں ، اور روئے زیبا ترکیبیں ہیں - کیوں ؟ اس لیے کہ آیینہ سیما ، اور بیداد فن ، میں دو اسم برابر برابر رکھے ہوئے ہیں جن میں باہم کوئی رشتہ نہیں - نہ ان کو جوڑنے والی کوئی ظاہری علامت ہے۔ اس کے بر عکس طاق نسیاں ،

وغیرہ کلموں میں ان کو جوڑنے والی علامات موجود ہیں جو ان کے باہمی تعلق یا رشتے کو ظاہر کرتی ہیں - طاق نسیاں کا کسرہ اضافت کے لیے ہے - طاق مضاف ہے اور نسیاں مضاف الیہ - 'روئے زیبا ، کا کسرہ صفت کے لیے ہے - روح کو رواں کے ساتھ واو عطف سے جوڑا گیا ہے - روح و رواں عطفی ترکیب ہے - اس قسم کی تمام ترکیبیں جن کا باہم تعلق ہو اور کسی حرف یا حرکت کی مدد سے انھیں وصل کیا جائے نحوی ترکیبیں کہلائیں گی -

نحوی ترکیبیں اردو میں عام طور سے مستعمل رہی ہیں - لیکن غالب نے جو ترکیبیں استعمال کی ہیں ان میں زبان کی تازہ کاری بھی ہے اور تخیل کی رعنائی اور نادرہ کاری بھی - غالب نے تشبیہ ، استعارے اور کنایے سے کام لے کر لفظوں کا جو چمن کھلایا ہے اس میں ہر رنگ کے پھول ہیں اور ہر پھول میں رنگا رنگ پتیاں ہیں - ڈاکٹر بجنوری نے اس قسم کی ترکیبوں کی ایک فہرست ، اور خاصی طویل فہرست ، پیش کی ہے - لیکن ان ترکیبوں کا تعلق لفظ سازی سے نہیں شاعرانہ تخییل اور اس کی خلاقی سے ہے - ان سے بے شبہ غالب کی فن کارانہ خلاقی پر چھوٹ پڑتی ہے - لیکن اس وقت میں غالب کی صنعت گری دکھانا چاہتا ہوں اور یہ ، جیسا کہ میں نے عرض کیا ، لفظ سازی سے ظاہر ہوگی یا پیوند کاری یعنی نادر اور تازہ کار مرکبات کی وضع و تعمیر سے -

غالب نے فارسی قواعد کے مطابق جو مرکبات وضع کئے ہیں ہیں صوتی اعتبار سے وہ رواں دواں اور خصوصی آہنگ کے حامل ہیں - معنوی اعتبار سے ان میں گہرائی اور دور رسی ہے - وہ مفہوم کو اس کی تمام پہنائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ بیان ہی نہیں کرتے اس کی اس طرح تصویر کشی یا تجسیم کر دیتے ہیں کہ مفہوم اپنے تینوں ابعاد کے ساتھ نظر کے سامنے آ جاتا ہے - آتش دیدہ اور آتش زدہ غالب نے دو مرکب استعمال کیے ہیں جن کا پہلا جز اتش دونوں میں مشترک ہے - دونوں سہل اور رواں دواں ہیں - آتش دیدہ کے معنی ہیں وہ چیز جسے آگ سے اس طرح قریب کیا جائے کہ جلنے نہ پائے - آتش زدہ وہ ہے جو آگ پکڑنے کی وجہ سے جھلس جائے - حلقۂ زنجیر کو موئے آتش دیدہ کہا گیا کہ بال آگ کے قرب سے گرم ہو کر مڑ جاتا اور حلقے کی شکل اختیار کر لیتا ہے - اب ذرا ذیل کے مرکبات ان کی ساخت ، بناوٹ ، صوتی آہنگ ، گیرائی اور گہرائی پر غور

فرمائیں - ان میں سے ہر مرکب میں فکر و خیال کی ایک وسیع دنیا آباد نظر آئے گی -

بے سبب رنج ، بے سبب آزار ، زبونی کش ، روکش (روکشی) سبک سر ، سرگراں ، نیم باز ، نیم کش ، حسرت سنج ، پردہ سنج ، نشاط آہنگ ، زود پشیماں ، رستخیز اندازہ ، جنوں جولاں ، وحشت خرام ، (وحشت خرامی) آرزو خرام (آرزو خرامی) لب تشنہ ، جگر تشنہ ، نظارہ سوز ، زوال آمادہ ، بہشت شمائل ، تنک آب (تنک آبی)، خدا ساز ، فنا تعلیم ، پشت گرمی ، واشد -

ان کی مدد سے غالب نے لا تعداد تازہ کار ترکیبیں وضع کی ہیں جن سے جملے بنے - یہ ترکیبیں اور جملے ان کے کلام کے آینہ خانے کی تعمیر و تشکیل میں صرف ہوئے ہیں -

[۷]

اس میں شک نہیں کہ غالب حیات و کائنات دونوں میں رم یعنی حرکت کے قائل ہیں :

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

اور یہ امر بھی شبہہ سے بالا تر ہے کہ سرمایۂ زبان میں سے تنہا فعل ایک ایسا کلمہ ہے جس سے حرکت کا اظہار ہوتا ہے - فعل میں حدوث بھی ہوتا ہے اور زمانہ بھی - اپنی دلالت یعنی معنی اور مفہوم کے اعتبار سے فعل گریز پا ہے - اور متحرک تصور یا خیال کی لفظی تصویرکشی کرتا ہے - اس لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ غالب کے یہاں اس کے اپنے حرکی تصور اور رجحان کے تعلق سے افعال مقابلتہً زیادہ استعمال میں آتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غالب نے افعال کے مقابلے میں اسما یا مرکبات زیادہ استعمال کیے ہیں - عام افعال ہونا ، کرنا ، ہے ، تھا، کو چھوڑ کر جو حسب موقع و محاورہ حذف بھی ہوئے ہیں ، جیسا کہ ذیل کے شعر میں منفعل کے بعد " ہو " محذوف ہے :

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

غالب نے اردو کے ذخیرۂ افعال میں سے چند منتخب اور متداول فعل

استعمال کئے ہیں ۔ چنانچہ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ جہاں تک افعال کے استعمال کا تعلق ہے غالب کا مقام ان کے ہمسر انگریزی شاعر شیکسپیر سے فروتر ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھی کہ غالب کی شاعری بیانیہ نہیں فکری ہے جس میں وسعت کی جگہ عمق اور پھیلاؤ کی جگہ گہرائی ہونی چاہیے ۔ غالب کی شاعری میں عمق یا گہرائی بھی ہے اور حرکت بھی ہے ، لیکن یہ حرکت افقی نہیں عمودی ہے ۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ غالب نے عام طور سے وہ افعال زیادہ استعمال کیے میں جو معاون افعال کی ترکیب سے وجود میں آئے ۔ مثلاً '' جانا '' یہ معروف کو مجہول بنانے کے علاوہ فعل کی تکمیل بھی بتاتا ہے اور اس کا امکان و استمرار بھی ۔ غالب نے '' جانا '' سے تمام معانی مراد لیے ہیں ۔

وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

پہلا '' جانا '' مجہول کے لیے ہے اور دوسرا ' سکنا ' کے معنوں میں امکان کے لیے ۔

اٹھ جانا ، آجانا ، ڈر جانا ، رہ جانا ، کھل جانا ، لگ جانا ، مٹ جانا ، مل جانا ، وغیرہ افعال بھی غالب کے یہاں استعمال ہوئے ہیں جن میں '' جانا '' اصل فعل کی تکمیل یا تتمیم بتاتا ہے ۔

سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

' مرنے ' اور ' مر جانے ' کے فرق پر غور فرمائیں ۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

'' چلی جائے '' کے معنی ہیں مسلسل اور لگا تار چلتی رہے ۔ '' جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں '' یعنی کہتے رہیں ۔

اس کے علاوہ آنا ، بیٹھنا ، پانا ، پڑنا ، پھرنا ، دینا ، رہنا ، کرنا ، لگنا ، لینا ، نکلنا وغیرہ افعال سے بھی غالب نے فعل معاون کا کام لیا ہے ۔ جیسے دیکھ آنا ، دھو بیٹھنا ، اڑنے نہ پانا بمعنی اڑ نہ سکنا :

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

آپڑنا ، رکھتا پھرنا ، مٹا دینا ، پڑے رہنا ، کیا کرنا ، رکنے لگنا ، سن لینا ، چل نکلنا وغیرہ افعال کا تجزیہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں عمودی حرکت ہے ۔ یہ عمل کی گہرائی بتاتے ہیں ۔

[٨]

اس سلسلے میں غالب کے لفظی سرمائے کی ان چند خصوصیات کا ذکر بھی ہونا چاہیے جن سے غالب کے کلام میں لطف ، چاشنی یا چٹ پٹا پن پیدا ہوا ۔

غالب نے مفرد کے ساتھ مرکب افعال بھی استعمال کیے ہیں ۔ لیکن محاورے ان کے یہاں بہت کم ہیں ۔ محاورہ پامال اور فرسودہ ہوتا ہے ۔ غالب فطری طور سے جدت پسند تھے ۔ وہ نئی بات نہیں کہہ سکتے تھے تو اس کے روادار بھی نہ تھے کہ رہ و رسم قدیم کی پابندی کریں ۔ کسی خاص وجہ سے پامال انداز بیان انھیں اختیار کرنا پڑا ہے تو کسی خاص لفظ یا مرکب سے بیان میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیرباد نہیں

اس سے قطع نظر کہ شعر کے دونوں مصرعے چست اور ایک دوسرے کے مقابل یا معادل واقع ہوئے ہیں ' آؤں ' اور 'جاؤں ' کا تقابل توجہ کے قابل ہے جس سے لطف کلام دوبالا ہوگیا ہے ۔ ذیل کے شعر میں مہرباں اور نامہرباں میں تضاد داد کا خواہاں ہے ۔

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

نیچے کے شعر میں نفی و اثبات کا اجتماع تو ہے ہی ۔ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک فعل دو مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

نہ نکلا دل سے ، یعنی فراموش نہ ہوا ۔

غالب نے اکثر ایک ہی فعل کو ایک شعر میں یا ایک مصرعے میں دو مختلف معنوں میں برتا ہے اور اس طرح دھوپ چھاؤں کی سی عجیب وغریب کیفیت پیدا کی ہے ۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

پہلے مصرعے میں ' چھوڑنا ' اصلی معنوں میں ہے اور دوسرے مصرعے میں مجازی معنوں میں ۔

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

جلتا ہوں = حسد کرتا ہوں ۔ ذیل کے مصرعے میں جانا کے دونوں معنی مراد ہیں :

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

پہلے مصرعے میں " ملتی ہے " کے معنی ہیں مشابہ ہے ۔

مر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

" رہنا " کے دو معنی ہیں ۔

کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

یہاں " کہنا " دو معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔

ان مثالوں میں فعل کی تکرار تھی ۔ ذیل میں ایک ہی فعل بیک وقت دو معنی دے رہا ہے ۔

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

قسم بھی کھائی جاتی ہے اور زہر بھی ۔

اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

"باندھنا" قید کرنے کے معنوں میں بھی ہے اور نظم کرنے کے معنوں میں بھی -

[۹]

ایک اور قابل توجہ خصوصیت جس کا ذکر اس سلسلے میں ہونا چاہیے یہ ہے کہ غالب نے مستقل طور سے کسی قدر اصرار یا استمرار کے ساتھ فعل مضارع کی جگہ امر کے صیغے استعمال کیے ہیں -

دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں

وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوشہائے مژگاں کا

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے

پرسش طرز دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے

بزم میں اس کے رو برو کیوں نہ خموش بیٹھیے

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھایے

یہ صرف چند مثالیں ہیں -

مضارع اور امر کے صیغے اردو اور فارسی دونوں میں مشترک تھے - کم سے کم صورت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہ تھا - اس لیے شاید غالب نے مضارع کی جگہ امر کے صیغے استعمال کیے ہیں - لیکن مثالوں پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے امر کے صیغے استعمال نہیں کیے امر احترامی کے

صیغے استعمال کیے ہیں جو فعل '' چاہیے '' کی طرح صورت و معنی دونوں اعتبار سے مجہول کے صیغے ہیں ۔ '' عرض کیجے '' کے معنی ہیں عرض کیا جائے ۔ ''باندھیے'' کے معنی ہیں باندھی جائے ۔ اس کے علاوہ مذکورہ مثالوں میں کوئی فعل ایسا نہیں جس کا فاعل مذکور ہو یا کم سے کم معلوم ہو ، اس لیے اس کا امکان ہے کہ وہ تمام صیغے جنھیں ہم امر کے صیغے سمجھتے ہیں مضارع مجہول کے صیغے ہوں اور غالب نے انھیں اس لیے استعمال کیا ہو کہ وہ فاعل کو غیر اہم ہونے کی وجہ سے تاریکی میں رکھنا چاہتے تھے ۔

بعض مقامات پر امر غائب کی جگہ امر حاضر کے صیغے بھی استعمال ہوئے ہیں :

کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اس باب میں غالبا بہتر روش یہ ہے کہ اسے غالب کی زبان یا اس کی خصوصیت قرار دینے کی بجائے یہ کہا جائے کہ غالب کے زمانے میں زبان کا انداز یہی تھا جسے غالب نے برقرار رکھا ۔ ویسے غالب عموماً مصدر سے جو دراصل استفہامیہ ہے امر حاضر کا کام لیتے ہیں ۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

دستۂ دیدۂ خوں بار مجنوں دیکھنا

اٹھے تبھی سر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

غالب کے زمانے میں لکھنؤ کی نام نہاد لسانی اصلاحی تحریک کا آغاز ہوچکا تھا ۔ چنانچہ اردو کو بنانے سنوارنے کی غرض سے متاخرین شعرائے لکھنؤ نے زبان میں جو تصرفات کیے ان میں سے ایک تصرف یہ بھی تھا کہ اہل لکھنو مصدر میں تصریف یعنی قواعدی تغیر کے روا دار نہ تھے ۔ ہر حال میں مصدر کو واحد مذکر نظم کرتے تھے خواہ اس کا فاعل (یا مفعول جس سے مصدر کا تعلق ہے) مونث یا جمع کیوں نہ ہو ۔ غالب ہر چند ناسخ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جو لکھنوی زبان اور اس کی شریعت کے پیغمبر سمجھے جاتے ہیں

اپنے رقعات میں غالب نے لکھنؤ کی زبان کو سراہا بھی ہے ، لیکن لکھنؤ کی لسانی اصلاحات کی انھوں نے پیروی نہیں کی اور اپنی زبان کو ، جو قصبوں کی پیداوار ہے ، ایک خاص طبقے کے من مانے تصرفات سے پاک رکھتے ہوئے مصدر کو فاعل کے مطابق مذکر یا مونث استعمال کیا ہے ۔

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یہاں بات کے تعلق سے ' سمجھنا ' کی جگہ سمجھنی نظم ہوا ہے۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

' جاں ' اور ' نذر ' دونوں مونث ہیں ، اس لیے غالب نے " دینی " بصورت تانیث لکھا ۔

[۱۰]

غالب کا زمانہ زبان کی تخریب و تعمیر اور سلاست و صحت کا زمانہ تھا ۔ تہذیبی قدروں کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں زبان میں بھی توڑ پھوڑ ہوئی ۔ کچھ لفظ متروک ہوئے اور ان کی جگہ دوسرے لفظ آگئے ۔ کچھ ایسے تھے جنھوں نے اپنا روپ بدل لیا ۔ کچھ ادھر ادھر سے تراش دیے گئے ۔ بعض میں معنوی تبدیلیاں ہوئیں اور وہ اپنے قدیم معنوں سے مختلف ، اور بعض صورتوں میں مخالف ، معنوں میں برتے جانے لگے ۔ یہ سب کچھ غیر ارادی طور سے زبان کے عام بدلنے والے فطری رجحان کے تحت ہوا اور جیسا کہ عام طور سے ایسی صورتوں میں ہوا کرتا ہے ، تراش و اختیار کا عمل غیر شعوری طور پر جاری رہا ، نئے الفاظ اور ان کی نئی بدلی ہوئی صورتوں کے پہلو بہ پہلو پرانے لفظ اور ان کی پرانی صورتیں بھی رائج رہیں ۔ دونوں سکے اردو کے بازار میں چلتے رہے ۔ غالب کے یہاں لفظوں کی یہ آنکھ مچولی دیکھی گئی ہے ۔

' کسی ' کی قدیم شکل ' کسو ' کے بارے میں تو غالب نے خود ہی لکھا ہے ، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں ، البتہ فصیح نہیں ۔ قافیے کی رعایت سے لکھا جائے تو عیب نہیں ، ورنہ فصیح بلکہ افصح ' کسی ' ہے ۔ میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ ' کسو ' واقع ہوا ہے اور سب جگہ ' کسی ' ہے ۔

غالب نے جس شعر کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے :

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

'آگے' اب آیندہ کے معنوں میں ہے۔ غالب کے زمانے تک گزشتہ یعنی گزری ہوئی مدت کے لیے بولا جاتا تھا ، غالب نے انھی معنوں میں استعمال کیا ہے :

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

آنا ، جانا ، دینا ، لینا وغیرہ افعال کے آخر میں 'الف' یا 'ے' ہے۔ آج جب ان سے مضارع یا مستقبل کے صیغے ڈھالے جاتے ہیں تو 'لینا' اور 'دینا' کو چھوڑ کو باقی افعال کے آخر میں ہمزہ یا 'ے' اضافہ کر کے کہتے ہیں: آئے ، جائے ، پئے ، سنے ، آئے گا ، جائے گا ، پئے گا ، سنے گا۔ 'لینا' سے لے ، لے گا۔ 'دینا' سے دے ، دے گا وغیرہ۔ غالب کے زمانے میں ان کے آخر میں 'و' اضافہ کیا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ رجحان کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اس لیے غالب کے یہاں آوے ، جاوے ، لیوے ، دیوے ، وغیرہ صیغے بھی ملتے ہیں اور آئے ، جائے وغیرہ بھی :

نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آیینہ میں روے نگار آتش

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

غالب کی ایک پوری غزل 'آوے' کی ردیف میں ہے جس کا مطلع ہے :

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

دوسری غزل 'آئے' کی ردیف میں ہے اس کے درج ذیل دو مصرعوں میں ''آئے'' مضارع کا صیغہ ہے :

ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

" آئے " میں یک گونہ اشتباہ تھا کہ ماضی کا صیغہ جمع بھی ہو سکتا ہے جو اردو میں احترام و تعظیم کے لیے ہے - جیسے وہ آئے اور بیٹھ گئے - غالب نے شاید اس اشتباہ سے بچنے کے لیے 'آوے' کو برقرار رکھا اور اسے ردیف قرار دے کر پوری ایک غزل کہہ ڈالی -

قریب قریب یہی حال قدیم فعل حال آئے ہے، جائے ہے، کا ہے - غالب نے 'آتا ہے' اور 'جاتا ہے' کے ساتھ ساتھ اسے بھی قائم رکھا ہے - اس میں شک نہیں کہ 'آئے ہے' میں بڑی روانی ہے - بعض مقامات پر 'آئے ہے' 'آتا ہے' سے زیادہ سبک، سلیس ملائم اور رواں محسوس ہوتا ہے -

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

'آئے ہے' کی جگہ 'آتا ہے' پڑھ کر دیکھیے زبان لڑکھڑا جائے گی - ایک شعر ہے :

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

'آساں' کا 'ن' ظاہر کر کے یوں پڑھ سکتے ہیں :

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آسان سمجھے ہیں

لیکن یہ موقع فعل حال کا ہے اور 'سمجھے ہیں' سے گزرے ہوئے زمانے کا اشتباہ ہوتا ہے -

'ہوجیو' یا 'ہو جیے' وغیرہ متروک صیغے بھی کہیں کہیں غالب کے یہاں ملے ہیں - لیکن میرے نزدیک جس رجحان کو اس سلسلے میں زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ غالب نے آج کی زبان اور محاورے کے خلاف عموماً مصدر کی جگہ ماضی کے صیغے استعمال کیے ہیں -

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
[غبار ہوئے پر = غبار ہونے پر]

کہ جس کو دیکھیے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
[دیکھے سے = دیکھنے سے]

دیکھوں اب مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

[مر گئے پر = مرجانے پر ۔ ویسے ' پر '
'مگر ' کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے]

آج ''دیکھا چاہیے'' مستقبل کا صیغہ ہے اور دیکھنے کے معنوں میں ہے۔ غالب کے زمانے میں ' دیکھنا چاہیے ' کے معنوں میں تھا ۔ غالب نے 'چاہیے ' کے ساتھ ہر جگہ مصدر کی بجائے ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے :

نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب

منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے

' کہ ' اور ' جو ' دو آزاد حرف ہیں ۔ غالب نے انہیں جوڑ کر ' کہ جو ' لکھا ہے :

خوش حال اس حریف سیہ مست کا کہ جو

غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

بعض اہل علم ' جوکہ ' بولتے اور لکھتے ہیں ۔ صحیح اور فصیح ، جیسا کہ میں نے عرض کیا ، تنہا جو یا کہ ہے ۔ * اس کے علاوہ 'سو' بمعنی 'وہ' آج قابل ترک ہے ۔ غالب نے ذیل کے شعر میں استعمال کیا ہے :

ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا

[سو بھی = وہ بھی]

آخر میں چند متروکات کا ذکر کروں گا ۔

' کر ' بجائے ' کرنا ' :

ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

---

* ''دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا '' اس میں ' کہ ' بیانیہ 'جو' سے الگ ہے ۔ غالب نے ' جوکہ ' بھی لکھا ہے : بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار میں ....

'تسپر' بجائے 'اس پر' :

ایک دل تسپر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

'آن بیٹھنا' 'بجائے آبیٹھنا' :

سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

'کے' یا 'کر' اضافہ کیے بغیر عاطفہ کا استعمال :

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

'بھوں پاس' بجائے 'بھوں کے پاس' :

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

[١١]

غالب کو زبان کے لطائف و نکات کا کس درجہ شعور تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے میں دو ایک لسانی نکتے بیان کروں گا، جن سے قارئین کرام کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ غالب کے بعض نکتہ چینوں نے غالب کی جو لسانی گرفت کی ہے اس میں قصور فہم کا کیا حصہ ہے اور کس حد تک غالب کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

عام طور سے فعل 'کہنا' کا صلہ اردو میں 'سے' آتا ہے۔ جیسے :

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے

لیکن غالب نے اس شعر میں 'سے' کی جگہ 'کو' استعمال کیا ہے :

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

بادی النظر میں یہ غلط سمجھا جائے گا لیکن جو زبان کا صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ 'کہنا' اگر امر اور حکم کے معنوں میں ہو تو اس کا صلہ 'کو' ہوگا۔ مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں کہ 'ہاں اور' میں حکم کا پہلو ہے اس لیے کہے جائیں کا صلہ 'کو' صحیح ہے جیسا کہ باغ و بہار میں ہے :

''ساتھ والوں کو کہا کہ یہ سب نقد و جنس بار کر لو''۔

غالب کا ایک شعر ہے :

جیسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

بظاہر ' میرا سا ' کی جگہ ' مجھ سا ' ہونا چاہیے لیکن غور کرنے سے دونوں کا فرق واضح ہوتا ہے ۔ ' میرا سا ' کے معنی ہیں میرے دن جیسا ، یہاں یہی معنی مراد ہیں ۔ اگر ' مجھ سا ' کہا جاتا تو اس کے معنی ہوتے ' مجھ جیسا ' ۔ یہ غلط ہے اس لیے کہ خود شاعر سیاہ نہیں اس کا دن سیاہ ہے ۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر

اثر گریہ میں یعنی اثر گریہ کے بارے میں ۔ یہاں ' باب ' یا ' بارے ' وغیرہ مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ۔ خود ' میں ' سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے ۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن

جگر کھودنے لگا یعنی جگر کو کھودنے لگا ۔ ' کو ' کی چنداں ضرورت نہیں ۔ ہم عام طور سے بولتے ہیں ، جو گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گر جاتا ہے ۔

کبھی نیکی بھی اس کے دل میں گر آجائے ہے مجھ سے

' سے ' کے معنی ہیں ساتھ ۔ ' مجھ سے ' یعنی میرے ساتھ جیسا کہ اس مصرعے میں ہے :

تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے
[قد دلکش سے — قد دلکش کے ساتھ]
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

قاعدے کی رو سے ' مجھے ' کے بعد ' اپنی اوقات سے ' آنا چاہیے تھا ، لیکن غالب نے ' میں ' کی نسبت سے ' مجھے ' نظم کیا ہے تاکہ اس کی ذات سامنے رہے اور کسی دوسرے کا اشتباہ نہ ہو ۔ " اپنی " غیر یا غائب کے لیے بھی ہوسکتا ہے ۔

[۱۲]

موسیقت ، نغمگی یا ترنم نے غالب کی لفظی صنعت گری میں اہم بنیادی کردار ادا کیا ہے جو لفظوں کے انتخاب اور آوازوں کے زیروبم یا ان کے

صوص متوازن آهنگ کا منت کش ہے۔ آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے خصوصیت ساتھ غالب نے اپنے کلام کو پر شکوہ بنایا ہے ۔ کبھی خاص جھنکار ا نوہ والی آواز کے تسلسل سے :

نقش ناز بت طناز بآغوش رقیب

اس میں 'ن' اور 'ز' کا تسلسل ہے۔

لوں وام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

اس میں 'خ' کا تسلسل ہے جو حلقی آواز ہے ۔

پائے طاؤس پے خامۂ مانی مانگے

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ان دونوں مصرعوں میں 'ب' کی آواز کا تسلسل توجہ کے قابل ہے ۔

آوازوں کے تسلسل کی کئی صورتیں ہیں ۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک ز کسی مصرعے یا شعر میں بلاترتیب بار بار آئے ، جیسے نقش ، ناز ، طناز ، 'ن' کی آواز یا بخت ، خفتہ ، خواب میں 'خ' کی آواز ۔ دوسری صورت ہے کہ ایک ہی آواز کلمے کے شروع میں ہو ۔ جیسے 'پیرہن' اور پکر' یا 'پائے' اور 'پے' میں 'پ' کی آواز ہے ۔ انگریزی میں اسے (Alliteratic کہتے ہیں ۔ تیسری صورت غالب کے یہاں ذرا کم استعمال آئی ہے ۔ وہ یہ کہ ایک کلمہ جس آواز پر ختم ہوا تھا ، اسی آواز سے ہرے کلمے کی ابتدا ہوئی ، جیسے ذیل کے مصرعے میں :

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

'رکھوں' کے آخر میں 'ن' ہے اور یہی 'ن' 'نوحہ گر' کے شروع ہے ۔ ایک چوتھی صورت بھی دیکھنے میں آئی ہے ۔ یعنی جدا جدا دو دی لفظ ہیں جن کے بارے میں کچھ کہا گیا ہے ۔ دونوں لفظوں کی ابتدا ۔ خاص آواز سے ہوئی ہے۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

' خزاں ' اور ' خاطر ' بنیادی لفظ ہیں، دونوں کی ابتدا میں ' خ ' ہے۔ اس کے علاوہ ' بہار اگر ہے بھی ' میں ' ہ ' کا تسلسل بھی ہے۔

کام کر رک گیا روا نہ ہوا

اس میں ' ر ' کا تسلسل ہے :

لے کے دل ، دل‌ستاں روانہ ہوا

اس میں ' دل ' اور ' دلستاں ' کا تسلسل ہے۔

بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

' بحر ' اور ' بیاباں ' دونوں ' ب ' سے ہیں۔

بعد یک عمر رواں بار تو دیتا بارے

کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

رواں ، بار ، بارے ، رضواں ، در ، یار ، درباں ، میں ' ر ' اور ' د ' کی آوازوں نے فردوس گوش کا منظر پیش کیا ہے۔

راز مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے

کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

وابستگیٔ رسم و رہ عام بہت ہے

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں جو اہتمام کے بغیر محض یادداشت سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں مختلف آوازوں کے صوتی آہنگ کی ترنگ دیکھی جا سکتی ہے۔

ابوالفضل محمد عباس رفعت شروانی

[غالب کے ایک بھوپالی دوست اور شاگرد]

پروفیسر عبدالقوی دسنوی

مولانا عباس رفعت(۱) کے دادا مولانا مرزا محمد تقی خاں جو بعد میں شیخ محمد شروانی کے نام سے مشہور ہوئے ، اپنے وقت کے بڑے عالم تھے ۔ مولانا احمد یمنی شروانی انھی کے بیٹے تھے جو مدت تک کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں عربی کے مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ عربی زبان و ادب میں بڑی صلاحیت کے مالک تھے ، بقول سید ممتاز علی مصنف آثار الشعرا ''مولانا احمد علامہ عصر اپنے وقت کے حریری اور متنبی تھے'' ۔ نفحتہ الیمن ، عجب العجائب ، حدیقتہ الافراح ، منہج البیان ، مناقب حیدریہ اور جوہرالوقاد وغیرہ کتابیں لکھیں ، جو شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں کی طرح مشہور ہوئیں اور تمام مدارس میں ان کا درس دیا جانے لگا ۔

۱۔ تاریخ آل امجاد ، ص ۱۰۶ پر رفعت کے نسب و خاندان کے بارے میں اس طرح درج ہے :

> ''نسب ابوالفضل عباس بن احمد بن محمد بن علی بن ابراهیم بن یوسف بجابر بن عبداللہ انصاری الخزرجی السلمی رضی اللہ عنہ منتهی میشود ۔ اجداد کرامش از مدینہ منورہ بشہر بغداد آمدند و مدت دراز در دار السلام بسر بردند و بعد مرور دهور بہمدان کہ نزهت کوہ الوندش مشہور آفاق است شتافتند ۔ و قرنہا در آں نزهتکدہ توطن نمودند و چون نادر ایران گرفت مرزا ابراهیم خاں بن یوسف مشیر و وزیر شاہ شد و بعدہ پسرش مرزا محمد علی خاں مستوفی الممالک کہ مرزا مہدی کوکب در تاریخ جہاں کشا او را بالقاب علامی فہامی

جب وہ بہت زیادہ مشہور ہوئے تو غازی الدین حیدر شاہ نے گورنمنٹ سے انھیں مانگا۔ حکام نے انھیں لکھنؤ بھیج دیا جہاں وہ مدت تک بہ حیثیت مصاحب کام کرتے رہے۔ اسی دوران میں مناقب الحیدر یہ تصنیف کی اور اسی زمانے میں سید اسماعیل خاں مرشد آبادی رئیس بنارس کی دختر سے ان کی شادی ہوئی۔ وہ غازی الدین حیدر شاہ کی وفات کے بعد بنارس چلے گئے جہاں راجا صاحب کاشی نے انھیں اپنے ہاں ملازم رکھ لیا، یہیں سے لانسیلٹ ولکنسن صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال کے ایما سے بھوپال تشریف

(جاری)

خلاصتہ الفضلاء الکرام میرزا محمد علی خان نائب الصدارۃ ممالک محروسہ یاد میکنند، بمراتب امارت وزارت فائز گشته و مدتی بر مسند اقبال نشسته، قبل دو ماه از قتل نادر جام شهادت نوشیده، پسرش مرزا محمد تقی خان از اردوی نادر بدر رفته بشروان سرکشید و چون مدتی بعد کشته شدن نادر ایران دار الجدال والقتال بود مرزا در شروان مانده خود را محمد شروانی نامیده، هر گه فرصت یافت بنجف اشرف شتافت و در حلقه تلامذه اغا باقر به بهانی و سید مهدی طباطبائی که هر دو مجتهد العصر بودند زانو زده از علوم متعارفه بهره ور گردیده، رو بهند نهاد چه شنیده بود که عمش مرزا محمد حسین خان همدانی و شیخ علی حزین گیلانی در شهر بنارس اند و چون وارد بلده کاشی شد مزار هر دو بزرگوار یافته فاتحه خواند و بخدمت آصف الدوله وزیرالممالک فرمان ده اوده رفت و چندی ضعیف آصف هندی مانده نطاق سفر حرمین بست و چون وارد بندر حدیده شد که از بنادر یمن ست با تاجر نامی سید محمد حیدر بغدادی برخورد، سید حیدر چون ایشان را بنام و نسب میشناخت با دختر خود کتخدا نموده مقیم بندر حدیده کرد، محمد بیاد الٰہی گوشه گیر گردید تا که بجوار رحمت الٰہی پیوست، خلف الرشید او مولانا احمد یمنی الشبیر ما بشروانی که ۱۲۰۰ھ بعالم وجود خرامیده بود از محسن بن عیسیٰ النجفی و بہا الدین جبل عاملی و علی بن یحییٰ الدریهمی الزبیدی و سید ابراهیم امیر صنعائی و سید زین العابدین جمل اللیل مدنی علوم و فنون آموخته فاضل و ادیب کامل گشته وارد کلکته شد"۔ (تاریخ آل امجاد، ص ۱۰۶)

لائے اور نواب دولہ جہانگیر محمد خاں صاحب بہادر کے اتالیق مقرر ہوئے ، یہاں سے پونا پہنچے جہاں ۱۹ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ کو ان کا انتقال ہوا اور وہیں تکیہ رضا شاہ میں مدفون ہوئے ۔

مولانا عباس رفعت انہیں احمد شروانی کے فرزند تھے ۔ ان کی پیدائش ۲۲ شوال ۱۲۴۱ھ (۳۰ مئی ۱۸۲۶ء) کو بنارس میں ہوئی ۔ عربی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور فارسی میر خیرات علی خاں مشتاق خیر آبادی شاگرد علی حزیں گیلانی سے پڑھی ۔ ذہن سلیم اور اچھے حافظے کی وجہ سے جو کتابیں زیر مطالعہ رہیں وہ یاد بھی ہوگئیں ۔ طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے سیف زلی کے فن سے بھی آگاہ ہوئے ، گویا اس طرح صاحب سیف و قلم بن گئے ۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر کی ، دہلی پہنچے ، اس وقت بہادر شاہ ظفر حکمران تھے ، ان تک پہنچنے کی کوشش کی ، وہیں سے مرزائی ، خانی اور ابوالفضل دوراں کے خطاب ملے ۔ اسی قیام دہلی کے زمانے میں مرزا غالب سے ملاقات ہوئی ، ان کے شاگرد بنے اور ان سے فارسی کلام پر اصلاح لی ۔ دہلی میں کچھ دن قیام کیا لیکن جب وہاں مالی امداد کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو بھوپال تشریف لائے ، جہاں سکندر جہاں بیگم نے کچھ عرصے کے لیے انہیں ملازم رکھا ۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ کی طرف سے محکمہ اجنٹی بھوپال میں چند ماہ وکیل رہے ۔ پھر بیگم سکندر جہاں اور نواب فوجدار محمد خاں اور نواب جہانگیر محمد خاں بہادر کے درمیان متوسطے کا کام انجام دیا ، بعد میں قدسیہ بیگم والدہ سکندر جہاں بیگم نے اپنے ہاں بلالیا اور انہیں جامع مسجد کی تعمیر کے لیے مہتمم بنایا ۔ یہ مسجد بیچ باز چوک میں ہے جو انہیں کے اہتمام میں تعمیر ہوئی ہے ۔ محراب باب شمال پر جو کتبہ ہے اس میں علی عباس رفعت کا نام ہے ۔ اس کے بعد چند ماہ تجارت کی اور پھر وکالت کی طرف متوجہ ہوئے ، پھر جمال الدین مدارالمہام کے روبکار ہوئے ۔

نواب شاہجہاں بیگم نے ۱۲۸۸ھ میں مولانا عباس رفعت کو کسی درخواست کے بغیر ان کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے تاریخ نگاری کی ذمہ داری دی اور ''قانون نویسی'' کا جس کا نام ''محکمہ تنظیمات شاہجہانی'' تھا ، مہتمم مقرر کیا ۔ مولانا سولہ برس تک اس عہدے پر مامور رہے اس کے

علاوہ بھی جو مختلف کام ریاست نے سپرد کئے ، بحسن و خوبی انجام دیے ۔ سرکار عالیہ کے حکم سے تاریخ بھوپال ، تاریخ افاغنہ ، تاریخ سکہ جات کہنہ ، تاریخ دکن وغیرہ مرتب کیں ۔ سالانہ رپورٹ جو ایجنٹ کے ذریعے حکومت ہند کو بھیجی جاتی تھی ، وہ بھی مولانا عباس رفعت تیار کرتے تھے ۔ وہ مجلس مشورہ کے ممبر بھی رہے ۔

سنہ ۱۳۰۴ھ میں سرکار بھوپال نے بغیر کسی خدمت کے وظیفہ مقرر کردیا ، اس کے بعد مولانا نے نہایت خاموشی سے زندگی گزاری ۔

مرزا غالب کے اگرچہ وہ شاگرد تھے لیکن ان کی قابلیت کی وجہ سے غالب ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے ۔ چنانچہ جب نواب یار محمد خان شوکت ، غالب سے دھلی میں ملے اور مرزا غالب انھیں اپنا شاگرد بنانے پر راضی ہو گئے تو انھوں نے اصلاح کے لیے شوکت سے کہا :

”آپ میرے شاگرد ہوئے ، اگر چندے یہاں رہنے کا اتفاق ہوتا تو فن شاعری میں آپ کو مہارت کلی حاصل ہوجاتی ، مگر قیام ممکن نہیں ، بھوپال میں مولانا عباس رفعت شروانی میرے دوست ، مرد فاضل ، ادیب کامل ، موجود ھیں ۔ فارسی زبان آن کی نہایت فصیح اھل زبان سے ملتی ھے ، بارھا اپنا کلام میرے پاس بھیج کر مولانا نے مجھ سے اصلاح بھی لی ھے ، ان سے بہتر دوسرا شخص مجھے وھاں نظر نہیں آتا ۔ آپ کو میں اجازت دیتا ھوں کہ آپ آن سے اصلاح اپنے کلام میں لے کر میرے پاس بھیجا کریں ......“ ۔

(شہنشاہ نامہ ، ص ۱۱۶)

یار محمد خان شوکت نے مرزا کے ارشاد کی تعمیل کی اور ان کے انتقال کے بعد بھی نظم و نثر مولانا رفعت عباس کو دکھاتے رہے اور اصلاح لیتے رہے ۔

مولانا عباس رفعت نے مرزا غالب کو خط لکھتے ہوئے یہ خواھش ظاھر کی کہ وہ انھیں فارسی میں خط لکھیں ۔ اگرچہ اس زمانے میں مرزا نے آردو میں مکتوب نگاری شروع کر دی تھی لیکن مولانا عباس رفعت کے خط کا جواب فارسی میں دیا جو حسب ذیل ھے :

"والا یزدان هست و بود آفرین که گماشتن وخشور و فرستادن منشور از الائے اوست بمیر نیایش داورنده گرامی منشور همانا همایون وخشور را که پس از وی ازان ده دود بهره وخشور که بازپسین آن گروه با خداوند در نام انبازی دارد ، بهر هنگام هر یکی بجائے اوست بے اندازه ستایش اگر درین مرده دلی سوئے کلک و کاغذ گرایش میرود بمن توانائی آن نیایش و نیرو فزائی این ستایش میرود ۔ غالب سخن گزار را بسا دوستانند که سواد مردم چشم گرزگه آنان نشده و در سیه خیمه سویدائے دل میهمانند نیرنگ روزگار دو رنگ نگریستن و بسرشکے که در شدت خنده از چشم کشاید گریستن دارد حاشا که اینچنین پست پایه بلند نام که خود از فروماندگی خاک نشین یک شهر باشد و بمیانجیگری نامه و خامه روشناس اعیان دهر باشد جز من در دهر توان یافت از دیر باز نبشتن نثر بپارسی زبان آئین من نیست ، نامه ها یکدست به اردو نبشته میشود اینک خواجه روشن فرح اثر حق پرست حق شناس مولانا محمد عباس که هم ازان گروه پر شکوه است که بامن بزبان قلم راه سخن کشوده اند از بهوپال فرمان فرستاد که غالب فرسوده روان در پارسی زبان بنام آن همه دان نامه نویسد یارب این فرمان چون بجائے آرم و در نامه چه نویسم باری ز جنبش خامه لفظی چند که اگر بخواندن ارزد به ستودن نیرزد ، برروئے ورق فرو ریخت تا آن ورق بهم بپیچیده سوئے کار فرمان روان داشته آمد چشمداشت آنکه برگ سبز اردو رویش به تحفگی پذیر رفته آید " ۔

(انشائے نور چشم ، ص ۳۶ - کلیات نثر غالب ، ص ۲۴۰)

" انشائے نور چشم " میں یار محمد خاں شوکت نے اس خط کو یہ لکھتے ہوئے شامل کیا ہے :

" چند سال پہلے مرزا صاحب نے خطوط اردو میں لکھنا اختیار کیا تھا ، مولانا محمد عباس رفعت نے بھوپال سے مرزا صاحب کو لکھا کہ میں فارسی عنایت نامے کا مشتاق ہوں ، جناب مرحوم نے ان کو خط فارسی میں تحریر فرمایا جوکہ ہر دو خط منظوم(۱) و منثور (۲) کلیات

۱- منظوم خط بنام نواب وزیر محمد خاں بہادر مرحوم رئیس ٹونک ۔

۲- منثور خط بنام مولانا محمد عباس رفعت ۔

دیوان و انشائے جناب موصوف میں میری نظر سے نہیں گزرے''
(انشائے نور چشم ، صفحہ ۳٦)

''انشائے نور چشم'' کی اشاعت ۱۲۸۹ھ میں اور کلیات نثر غالب جو میرے پیش نظر ہے، اس کی اشاعت ۱۳۰۵ھ میں ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس خط کو بعد میں کلیات نثر میں شامل کر لیا گیا ہو۔

مولانا عباس رفعت اپنی تصنیف ''عباس نامہ'' کے آخر میں مرزا غالب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

از کرمہائے النہی رفعتا		ختم شد عباس نامہ مرحبا
از کلام حضرت اوستاد من		غالب سحرالبیان جادو سخن
هست بر این نہج قادر نامہ نظم		من تتبع کردہ ام اے نور چشم
آں کلام و این کلامم یادگیر		هر دو را انگار تنگ شہد و شیر
(عباس نامہ ، صفحہ ۸)

'' نوردیدہ '' میں مولانا عباس رفعت اپنے استاد غالب کے لیے مندرجہ ذیل باتیں تحریر کرتے ہیں :

'' نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب ، اکبرآبادی المولد دہلوی المسکن است ، نسبتش بہ افراسیاب و جمشید منتہی میشود ، دیوان اردو و دیوان کلیات فارسی ، مہر نیم روز و ماہ نیم ماہ ، پنج آهنگ ، دستنبو ،قاطع برهان ، تیغ تیز ، عود هندی ، درفش کاویانی ، گوهر افشاں ، قادر نامہ ، پساچین ، [سبد چین ؟] مشتمل قصائد و اشعار کہ بعد طبع کلیات خود فرمودہ است روان شیرین اردوئے معلا ، دلائل اعجاز فضل و بلاغتش هستند ، راقم الحروف غائبانہ بدید کلام مبینش معتقد گشت و از دور سر فرود آوردہ در حلقہ شاگردان زانو شکست ، جناب ممدوح از راہ اخلاق بی پایان مانند حکمائے اشراقیان چند مرتبہ توجہ دلی فرمود و اشعار بندہ را کہ ذریعۂ نیایش نامہ ها فرستادہ بودم اصلاح نمود یک دو شعر میر عماد در صفت آں سلالہ امجاد راست بی کم و کاست ست :

امروز بشیریں دہنی چون تو یکی نیست
حقا کہ چنین ست و دریں ہیچ شکی نیست
زاں دم کہ بیا راست لبت خوان ملاحت
بر ہیچ لبی نیست کہ حق نمکی نیست

و چوں بکشش آب و دانہ اتفاق رفتم بدہلی شد از ملاقات جناب غالب بہرور شدم و مورد الطاف شان گشتم ۔

دوم ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ در دہلی برحمت حق پیوست و در خلد بریں زیر سایہ طوبیٰ نشست ۔ "

مولانا عباس رفعت نے اپنے استاد کی وفات پر حسب ذیل اشعار کہے :

جان ارباب سخن غالب عالی ہمت　　ناظم سحر بیان ناثر والا فطرت
رشک فردوسی و خاقانی و عالی و کمال　　ثانی خسرو و سعدی و حزیں و شوکت
ابر مدرار کمالات و فرات دانش　　ماہر علم معانی و بیان و حکمت
از جہاں کرد سفر سوئے ریاض رضوان　　گفت عباس کہ " شایان سریر جنت "
[۱۲۸۵ھ]
(تذکرہ فرح بخش ، ص ۶۱)

مولانا عباس رفعت غالب کے ممتاز اور با صلاحیت شاگردوں میں سے تھے ۔ عربی ، فارسی اور اردو میں بڑی اچھی صلاحیت کے مالک تھے ۔تقریباً باسٹھ کتابیں لکھیں ۔ فارسی اور اردو زبان میں شاعری بھی کرتے تھے ۔ کسی بات پر ناراض ہو کر اپنی شاعری کا تمام سرمایہ تالاب میں ڈال دیا اور شعر و شاعری چھوڑ دی ۔ اب ان کا کلام مختلف کتابوں میں بکھرا ہوا ملتا ہے ۔ تذکرہ "فرح بخش" میں فارسی کے علاوہ اردو کے دو شعر ملتے ہیں جو حسب ذیل ہیں :

پھرا ہے رقیبوں کا چھپر کھٹ کے برابر
دس بیس تئیں ہوں گے یہاں کٹ کے برابر

...

نغمۂ چنگ و رباب و دف و نے
بن ترے مرثیہ خوانی سمجھا

رفعت کی ایک منظوم کتاب ''عباس نامہ'' ہے جو انھوں نے سید علی حسن خاں صاحب خلف الصدق سید محمد صدیق حسن خاں صاحب بہادر کی خواہش پر لکھی ہے - یہ کتاب بچوں کو لغت کی تعلیم دینے کی غرض سے لکھی گئی تھی جو صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے -

حمد کے لائق خدائے پاک ہے   عاجز اس کے وصف میں ادراک ہے
قابل مدح و ثنا ہے وہ رسول   حق سے قرآں کا ہوا جس پر نزول
بعد ازیں ہے یہ نصاب لا جواب   غیرت الماس و در و زر ناب
بیشتر اس میں لغت ہیں فارسی   شعر دل کش مثل روئے آرسی

اس کتاب میں الفاظ کے معنی اس طرح بتائے گئے ہیں :

زآچ کو ہندی میں کہتے ہیں چچا   انو بی بی اور اودر ہے چچ
اور دیو رانی نیاجہ سن ذرا   خازنہ سالی ممانی ماززا
اور سمدھن سامنہ اے با تمیز   فارسی سمدھی کی سامن ہے عزیز

در حقیقت یہ کتاب خالق باری ، قادر نامہ فروغی ، قادر نامہ غالب ، چراغ فوائد ، فیض شاہجہانی ، نصاب بے نظیر اور حیات عزیز کے طرز پر ہے -

رفعت کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے :

چشم ناظر تیرہ میگردد ز تاب چہرہ اش
روئے او را دامن برقع فگندن برقع است

بہرہ ز ملک بقا تا کہ تصور گرفت
دل ز مقام فنا بوی تنفر گرفت
شد بسر اوج عرش ہر کہ تواضع نمود
رفت بقعر بلا انکہ تکبر گرفت

نہ شکیبم کرد ہجر دلبرم
جسم زارم را شرار نالہ سوخت
سوختیم و کس نہ فریادم شنفت
نار ہجر دلبر سی سالہ سوخت

(صبح گلشن ، صفحہ ۱۸۱)

حال من آشفته بجانان که کند عرض
درد من رنجور بدرماں که کند عرض
روداد دل خسته و سوز دل وحشی
جز خامهٔ عباس سخنداں که کند عرض

سوز من از گریه هرگز کم نه گردد مثل شمع
آب اشکم بر سر آتش مثال روغن است
یافت بازار محبت رونقی از داغ من
دودمان عشق از نور چراغم روشن است

تا چشم تو آموخت فن فتنه گری را
در فتنه گری داد سبق چشم پری را
مهر و مه و انجم همه ها گرم گزافند
وقت است که آزاد کنی جلوه گری را

دید چوں جوهر خوں نبه به چشم رفعت
موج خوں از جگر لعل بدخشاں برخواست

(شمع انجمن ، ص ۱۸۲)

تصانیف :

تاریخ بھوپال ، تزک افغانی ، تاریخ نسب افاغنه ، سلطان نامه ، تاریخ روم ، تاریخ دکن موسوم به چار چمن ، تاریخ نقد روان در بیان سکھهائے شاهان ، تاریخ نکو شمر حال قوم بوهره ، تاریخ سیلون سراندیپ ، تاریخ گرامی نامه در حال سلاطین هند ، تاریخ دلچسپ ، تاریخ نفیس ، داستان باستان ، تاریخ آل امجاد ، چشمه نوش ، آئین محبوب ، آئین بهشت دستور العمل سلاطین ، قبات القبسات و مراسلات ، سرمن رای در حال علم جفر ، نور دیده ، روان افزا ، گل نسرین ، لخلخهٔ عبهری ، مثنوی راح روح ، جواهر خانه ، جواب باصواب ، جواب شافی ، تقریر دل پذیر ، مجربات عباسی ، نشاط

افزا ، ثمرالعمل ، در نجف ، سلک گوہر ، سرداد سرور ، زر ناب انشا ، تسرالناظرین ، عباس نامہ ، ہمایوں نامہ ، منظومات رفعت ، گل صد برگ ، سبحتہ العجد ، انسان الانسان ، زینتہ الانشا ، بہارگل ، ساغر مل ، دلکشا ، گلدستہ ، آرسی پارسی درلغت پارسی ، تاریخ ملوک فاطمہ مصر ، خیالات رفعت ، گلزار رفعت ، مراسلات عباسیہ ، سراج الاقبال ، چار باغ رفعت ، نور مشتری ترجمہ اخلاق ناصری ، تاج الطائف (دو حصے) ، صفحات جہانگیری (در مدح نواب جہانگیر محمد خاں) ، قیصر نامہ ، دلفروز ، گلزار معرفت وقائع سیر دکن ، تاریخ اندلس ، تاریخ جشن تاج محل ، رازدل ۔

رفعت نے سنہ ۱۳۱۵ھ میں وفات پائی اور بھوپال میں احمد آباد کے قریب کربلا میں دفن کئے گئے ۔ ان کے دو لڑکے ابوالقاسم محتشم اور ابوالحسن محترم بھی عالم فاضل بزرگ تھے ۔

✤✤✤✤

"وہ زندہ ہم ہیں ــــ"

ڈاکٹر وزیر آغا

بعض فن کار ایک ایسی تیز روشنی کی جلو میں نمودار ہوتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو اُن کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر " وہ آیا ، اُس نے دیکھا ، اُس نے فتح کرلیا " کی مثل صادق آتی ہے ۔ مگر تیز روشنی بجائے خود ایک اضافی شے ہے ، ایک تنگ و تاریک ڈیڑھ اینٹ کی کوٹھری میں تو شاید موم بتی کی روشنی بھی تیز کہلائے گی مگر اس موم بتی کو میدان کے بیکراں اندھیرے میں شاید ایک جگنو سے زیادہ اہمیت نہ ملے ۔ چنانچہ دیکھنے کی بات محض یہ نہیں کہ فن کار کتنی تیز روشنی کے ساتھ نمودار ہوا ، بلکہ یہ ہے کہ جب اس روشنی کو ایک وسیع پس منظر میں آنا پڑا تو کہیں یہ سمٹتی تو نہیں چلی گئی ؟ فن کے سلسلے میں پس منظر سے مراد شہر ، ملک یا براعظم کی حدود نہیں ، کیونکہ یہ تو محض مکان Space سے متعین ہوتی ہیں ۔ اس سے مراد وہ دائرہ ہے جس کی حدود کو زمان Time متعین کرتا ہے ۔ گویا دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ وہ روشنی جو آج سے پچاس یا سو برس پہلے نمودار ہوئی تھی ، وقت کے ساتھ ساتھ مدھم ہوتی چلی گئی یا تیز ؟ اگر وہ مدھم پڑ گئی تو یہ طے پایا کہ اس کی حیثیت اور زور محض عارضی تھا لیکن اگر وہ تیزتر ہوتی چلی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے نہ صرف وقت کے چیلنج کو قبول کیا بلکہ اپنی داخلی توانائی کی مدد سے وقت کو شکست بھی دی ۔ غالب اسی تیزتر ہونے والی روشنی کا نمایندہ ہے اور آج کہ بین قومی سطح پر اُس کی صد سالہ برسی کے انعقاد کا اہتمام ہو رہا ہے تو اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی ۔

یہ نہیں کہ غالب کو اُن کے اپنے عہد نے نظر انداز کر دیا، گو غالب کے ساتھ زمانے نے جو سلوک کیا اسے دیکھتے ہوئے بعض لوگ اسی طرح سوچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے تبحر علمی کا چرچا تو ابتدا ہی سے ہونے لگا تھا۔ وہ عربی اور فارسی کے ایک مستند استاد تھے۔ ان کا تصوف کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ حد یہ کہ انہیں طب اور نجوم پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ غالب کی زندگی میں جو ادبی معرکے ہوئے ان کا مطالعہ کریں تو غالب کے تبحر علمی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً کلکتے میں جب غالب نے قتیل اور واقف ایسے فارسی شعرا کو استاد ماننے سے انکار کیا تو ایک ادبی ہنگامہ برپا ہو گیا، اور غالب پر طرح طرح کے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی، جس کے جواب میں غالب کو مثنوی ''باد مخالف'' لکھنی پڑی۔ اس ہنگامے میں غالب نے جس وثوق اور اعتماد نیز علمی برتری سے معترضین کو خاموش کیا اس سے ان کے وسیع مطالعے اور اعلا زباں دانی کا سراغ ملتا ہے۔

اسی طرح جب غدر کے بعد غالب خانہ نشین تھے تو وقت کاٹنے کے لیے فارسی لغات کی مشہور کتاب ' برہان قاطع ' کا مطالعہ کرنے لگے اور پھر بقول مولانا غلام رسول مہر اس میں جہاں جہاں انہیں غلطیاں نظر آئیں، ان کے متعلق کتاب کے حاشیے پر اشارات لکھتے گئے۔ بعد ازاں ان اشارات کو کتابی صورت میں مرتب کر دیا، اور اس کا نام ' قاطع برہان ' رکھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس وقت غالب کی تحویل میں کوئی اور کتاب بھی نہیں تھی جس سے وہ مدد لیتے اور وہ محض اپنی یادداشت پر بھروسا کرتے ہوئے اغلاط کی نشان دہی کر رہے تھے۔ غالب کے وسیع مطالعے کا یہ ایک ادنا ثبوت ہے کہ ان کی وفات کے چار برس بعد رضا قلی خاں ہدایت نے ایران میں فارسی لغت کی ایک کتاب '' فرہنگ ناصری '' لکھی اور ' برہان قاطع ' کی اغلاط کی نشان دہی کی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ ''جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کئے تھے ان کی جا بجا ' فرہنگ ناصری ' سے تائید ہوتی ہے''۔ مگر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جب غالب نے 'قاطع برہان' لکھ کر یہی اعتراضات کئے تو ان کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور '' محرق قاطع '' '' ساطع برہان '' '' قاطع القاطع '' '' موید برہان '' وغیرہ کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں سے بیشتر کا لہجہ انتہائی قابل اعتراض تھا۔

غالب کا فارسی کلام، ان کے قصائد، ان کی نثری تحریریں — غرض ہر جگہ غالب کی بے پناہ ذہانت اور علمی استعداد کا پتا چلتا ہے۔ کچھ عجب

نہیں کہ غالب کی علمی شخصیت سے ان کے معاصرین مرعوب ہوئے اور انھوں نے ہر موقع پر ایک شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا ۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ غالب نے اپنے عہد میں اذہان کو اس قدر متاثر نہیں کیا جتنا مرعوب ! متاثر کرنے کی صورت کچھ یوں ہے جیسے کوئی نہر ایک طویل و عریض علاقے کو سیراب کرے لیکن مرعوب کرنے کا عمل یوں ہے جیسے کسی ڈیم کے بند ٹوٹ جائیں اور سارا علاقہ ایک آہی طوفان کی زد میں آجائے ۔ پہلے عمل سے اذہان کی آبیاری ہوتی ہے ، یہ گویا خوشہ چینی کا ایک ایسا عمل ہے جو فیض پانے والوں کی شخصیتوں میں توانائی ، وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے ۔ دوسرے عمل سے معاصر شخصیتیں یا تو تابع مہمل ہو کر رہ جاتی ہیں اور یا اپنے تحفظ کے لیے مدافعتی عمل میں مبتلا ہوتی ہیں اور ایک نہایت شدید ردعمل وجود میں آجاتا ہے ۔ غالب سے ان کا اپنا عہد اس لیے متاثر نہ ہوا کہ ان کی علمی شخصیت کے قرب نے اذہان کو احساس کمتری کے حوالے کر دیا اور وہ تاثر قبول کرنے کی بجائے اپنی مدافعت کرنے لگے — کلکتے کے واقعے ، قاطع برہان کے تنازعے ، حتیٰ کہ سہرا لکھنے کے ' سانحے ' تک کو اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ ان تمام ہنگاموں میں بیشتر لوگوں نے بغض معاویہ کا مظاہرہ کیا اور غالب کے خلاف اپنے دبے ہوئے انتقامی جذبات کی پرورش کی ۔ غالب کی زندگی کے آخری ایام تو اس قسم کی انتقامی کارروائیوں کا اس قدر نشانہ بنے کہ غالب کے لیے زندہ رہنا ہی مشکل ہو گیا اور وہ کھلے بندوں موت کی آرزو کرنے لگے ۔ ہوتا یوں تھا کہ ہر روز کی ڈاک میں انھیں ایسے خطوط موصول ہوتے تھے جن میں فحش گالیوں کی بھرمار ہوتی تھی ، جن کا مقصد غالب کو ذہنی کرب پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں تھا ۔ اس سلسلے میں مولانا حالی نے " یادگار غالب " میں ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے غالب کے ذہنی کرب کا کچھ اندازہ ہوتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

> " ان دنوں مرزا کی عجیب حالت تھی ۔ نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے اور جب چٹھی رساں ڈاک لے کر آتا تھا تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی اسی قسم کا خط نہ آیا ہو ، ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا .... [ایک روز] مرزا کھانا کھا رہے تھے ۔ چٹھی رساں نے ایک لفافہ آ کر دیا ۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے ان کو یقین ہو گیا کہ یہ کسی مخالف کا

ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آچکے ہیں ۔ لفافہ مجھ کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو ۔ میں جو دیکھتا ہوں تو فی‌الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا ۔ پوچھا کس کا خط ہے اور کیا لکھا ہے ؟ مجھے اس کے اظہار میں تامل ہوا ۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگرد معنوی کا لکھا ہوا ہے ۔ پھر اول سے آخر تک خود پڑھا ۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی ۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ الو کو گالی دینی بھی نہیں آتی ۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تا کہ اس کو غیرت آئے ، جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے ، بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا ۔ یہ قرم ساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بیوقوف ہوگا ؟ ''

ان خطوں کے ساتھ ساتھ جب اس قسم کی تحریفات کو بھی ملحوظ رکھیں ، جیسے ' پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال ' اور غالب کے اس رد عمل کو بھی جس کا اظہار ' گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی ' ایسے مصرعوں میں ہوا تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب سے اس کا اپنا عہد کس قدر مرعوب ہوا کہ ایک شدید برہمی کے اظہار کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ کار نہ رہ گیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے افکار اس قدر نئے ، ان کی جرات اظہار اتنی شدید اور ان کا علمی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ عام لوگوں کے لیے ان کے ساتھ مفاہمت کرنا ممکن ہی نہ رہا ۔ چنانچہ یہ لوگ ایک رد عمل میں مبتلا ہوئے اور اس رد عمل نے غالب سے متاثر ہونے کے عمل کو فوری طور پر منسوخ لیکن دراصل معرض التوا میں ڈال دیا ۔ غالب کی وفات کے بعد مولانا حالی نے '' یادگار غالب '' لکھ کر گویا غالب کو سماجی طور پر Reinstate کرنے کی کوشش کی ۔ چنانچہ یوں لگتا ہے جیسے '' یادگار غالب '' کا اولین مقصد بھی غالب کی اس شخصیت کو مجتمع کرنا تھا جسے ان کے اپنے زمانے نے مسلسل سنگ باری سے پارہ پارہ کر دیا تھا نہ کہ ان کے شعری مرتبے کو اجاگر کرنا ! اس کے لیے زمانے کو مزید انتظار کرنا پڑا حتی کہ عبدالرحمان بجنوری نے اپنا تریخی فتویٰ ——— ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ، وید مقدس اور

دیوان غالب " لکھ کر عوام کو جھنجھوڑا کہ غالب کے شعری مرتبے کو پہچانو ، اُس کی علمی شخصیت سے مرعوب ہونے اور ارضی شخصیت پر لعن طعن کرنے کی روش سے باز آجاؤ ۔ یوں بھی وقت کے ساتھ ساتھ شخصیت کے وہ " سقم " اغماض و در گزر کے طالب قرار پاتے ہیں جو ایک خاص وقت میں ناقابل برداشت قرار پائے تھے ۔ نیز دم گھٹنے کی کیفیت بھی از خود ختم ہو جاتی ہے اور لوگ تعصبات سے آزاد ہو کر فن کار کے فن کا محاکمہ کرنے لگتے ہیں ۔ ایک وجہ اور بھی ہے ، وہ یہ کہ بعض فن کار اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتے ہیں ، اس لیے ان کا اپنا عہد انہیں پوری طرح سمجھ نہیں سکتا ، متاثر ہونا تو بہت دور کی بات ہے ۔ پھر زمانہ آہستہ آہستہ فکر و وجدان کے اُس معیار کے قریب پہنچتا ہے ، یعنی اُسے ایک نئی بصارت حاصل ہو جاتی ہے تو اُسے فن کار کی اصل روشنی کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ غالب کے ساتھ بالکل یہی کچھ ہوا ۔ اُن کی شدید انفرادیت (اور فرد کی انفرادیت ہمیشہ انبوہ کے اجتماعی رخ سے متصادم ہوتی ہے) نیز اُن کے ہاں فکر کا تحرک اس بات کا متقاضی تھا کہ متاثر ہونے والے اذہان بھی اس مقام کے قریب ہی کھڑے ہوتے جہاں غالب کھڑے تھے تا کہ فیض رسانی اور فیض یابی کے اعمال میں مفاہمت پیدا ہوتی اور نہر کا پانی چھوٹی چھوٹی نالیوں کی صورت میں زمین کو سیراب کر سکتا ۔ مگر ایسا ممکن نہ ہوا اور غالب سے متاثر ہونے کا میلان زیر سطح پڑا رہا تا آنکہ جب حالات نے کروٹ لی ، اذہان متحرک ہوئے ، ذہنی افق کشادہ اور تعصبات کی گھٹن کم ہوئی تو غالب کی شعری عظمت یکایک ابھر کر سامنے آ گئی ۔ اس ضمن میں بجنوری تو محض " پہلا قطرہ " تھا ، کیونکہ بجنوری کے بعد ہی در اصل غالب سے متاثر ہونے کا رجحان عالمگیر سطح پر پھیلا ۔ پچھلے تیس چالیس برس میں غالب کے کلام نے کس طرح اردو شاعری کو متاثر کیا ، یہ ایک بالکل سامنے کی بات ہے ، لیکن اس نے کس طرح اذہان کی داخلی ضرورت کو پورا کیا ، اس کا اندازہ تو شاید مردم شماری کے موقع ہی پر ہو سکے ۔ تاہم غالب کی صد سالہ برسی کی تقریب تاثیر و تاثر کے اس عالم گیر رجحان کا ایک روشن ثبوت ضرور ہے ۔

آج سے پورے سو برس قبل غالب اس دنیا سے رخصت ہوئے مگر دراصل وہ اس تمام عرصے میں وقت سے برسر پیکار رہے ، تاآنکہ انھوں نے امتحانی دور بخیر و خوبی طے کیا اور زندہ جاوید ہو گئے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

غالب کے اشعار میں وہ کیا بات تھی جو وقت پر غالب آ گئی ؟ اس کے شاید کئی جواب مہیا کئے جائیں ، مثلاً جو لوگ ماضی اور اس کی روایات کو فن کی بقا کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں ، شاید یہ موقف اختیار کریں کہ غالب نے ماضی کی روایات ، تلمیحات بلکہ روح تک کو اپنے اندر اس طور سمو لیا تھا کہ جب انہوں نے اشعار کہے تو یہ روح اُن کے کلام کی ہئیت میں از خود شامل ہو گئی ۔ اس بات کو جدید نفسیات کی روشنی میں یوں کہنا بھی ممکن ہوگا کہ غالب ایک اتنے اچھے شاعر تھے کہ اُن کے ہاں سائکی Psyche نے اپنے جملہ خزائن کو گویا اُلٹ دیا اور نسل کا وہ سارا سرمایہ' شعری قالب میں ڈھلنے کے لیے مہیا ہوگیا جو Archetypal Images کی صورت میں موجود تو ہوتا ہے لیکن اُبھرتا صرف وہاں ہے جہاں فن کار کے شعور اور لاشعور کے مابین آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوجائے ۔ بعض لوگ جو ماضی کو رجعت اور فرسودگی کی علامت قرار دے کر 'حال' اور حال کے مسائل کو تمام تر اہمیت تفویض کرتے ہیں شاید یہ موقف اختیار کریں کہ غالب کو اُن کے اپنے دور کے جزر و مد کا بھرپور احساس تھا اور وہ اُن تمام کروٹوں کے نباض تھے جو چاروں طرف ایک کہرام سا برپا کر رہی تھیں ۔ نہ صرف یہ بلکہ غالب خود بھی بار بار ان کروٹوں کی زد میں آئے ۔ معاشی بدحالی ، قیدوبند ، عزیزوں دوستوں کی بے وقت موت ، غدر کا ہنگامہ ، مسلسل بیماری ، بے عزتی اور کس مپرسی ——— ان تمام باتوں نے غالب کو اُن کے اپنے ماحول سے اس درجہ منسلک رکھا کہ اُن کے ہاں نہ صرف ' حال ' کے مسائل کا سامنا کرنے اور یوں ان سے اخذ کردہ تاثرات کو شعر میں سمونے کی تحریک ہوئی بلکہ وہ ' حال ' میں دلچسپی لینے کے باعث ارد گرد کی اشیا اور مظاہر کو پیار کرنے کی طرف بھی مائل ہوئے ۔ چنانچہ ان کے شعر کی توانائی کا باعث ماضی کی خوشبو یا مستقبل کی خوابناک کیفیت نہیں بلکہ حال کا شعور ہے (اسے ' معاشرتی شعور ' کہہ لیجیے) ـــ اسی طرح بعض لوگ جو خواب‌کار ہونے کے باعث ماضی یا حال کی بجائے مستقبل میں رہتے ہیں ، شاید اس طرح سوچیں کہ غالب تو گلشن نا آفریدہ کے عندلیب تھے یعنی در اصل ایک خواب‌کار تھے جنہوں نے حال کی گھٹن سے گویا فرار حاصل کر کے ایک ایسا شعری یوٹوپیا تعمیر کیا جو لطافتوں اور رفعتوں کی آماجگاہ تھا اور جس کا ادراک قارئین کی تھکاوٹ اور ذہنی اضمحلال کو کم کرنے کا باعث ثابت ہوا ۔ چنانچہ غالب کے اشعار میں نہ صرف افراد کے زخموں پر پھاہا رکھنے کا وصف موجود ہے بلکہ وہ ان

کی باصرہ کو بھی یوں متحرک کرتے ہیں کہ نگاہیں ماضی کی طرف پلٹنے یا حال میں الجھنے کے بجائے کسی دور کی منزل پر مرتکز ہو جاتی ہیں -

بات یہ ہے کہ ہر قاری ، شاعر کو اپنے مزاج کے مطابق ہی پرکھتا ہے اور اگر شاعر کا کلام اس کی داخلی طلب کی تسکین کر سکے تو اس تسکین کی نسبت ہی سے وہ اسے چھوٹا یا بڑا شاعر قرار دیتا ہے ۔ خود شعرا کے ہاں بھی یہی مزاج ان کے کلام میں ایک ''خاص رنگ'' کو جنم دیتا ہے جو ایک خاص قسم کے قاری ہی کو تسکین دے سکتا ہے ۔ بے شک کوئی ایسا شاعر مشکل ہی سے ملے گا جو محض حال ، محض ماضی یا محض مستقبل کا شاعر ہو ، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کے ہاں بالعموم کوئی ایک رجحان اتنا نمایاں ہوگا کہ وہ اسی کا نمایندہ قرار پائے گا ۔ مگر بعض شعرا بیک وقت ان تینوں سطحوں پر 'بڑے شاعر' ہوتے ہیں اور اس لیے قارئین کے جملہ طبقات کو شعری کیف مہیا کرنے کی خود میں سکت رکھتے ہیں ۔ غالب کی عظمت کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ بیک وقت ماضی حال اور مستقبل کے شاعر ہیں اور اس لیے نہ صرف ایک خاص دور کے بشتر اذہان خود کو غالب سے جذباتی سطح پر منسلک محسوس کرتے ہیں بلکہ ہر زمانے کو غالب اس کا اپنا عکس نظر آتا ہے ۔ میرے نزدیک بڑے شاعر کی تعریف یہ ہے کہ وہ لفظ کو یوں صیقل کر کے پیش کرے کہ اس میں ہر زمانے کو اپنا خوب تر عکس نظر آنے لگے ۔ یوں دیکھیے تو یہ کلیہ کچھ ایسا جاندار دکھائی نہیں دے گا کہ شاعر وہی اچھا ہے ، جو اپنے ماحول کی عکاسی کرے ۔ وجہ یہ کہ ماحول تو ہر دم بدل رہا ہے ۔ جو شاعر محض آج کے ماحول کا عکس پیش کرے گا وہ آج سے سو برس بعد کے ماحول کا عکاس کیوں کر قرار پائے گا ؟ حقیقت یہ ہے کہ شاعر اپنی پوروں کے لمس سے لفظ کے مزاج ہی کو بدل ڈالتا ہے ، اس طور کہ اب یہ لفظ کسی ایک لمحے کا پابند نہیں رہتا بلکہ وقت کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے ۔ غالب کے کلام میں یہی معجزہ رونما ہوا ہے اور اسی لیے سو برس گزرنے کے باوجود غالب آج بھی تازہ ، زندہ اور نیا ہے :

غالب — فکر و فن

مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں - انھوں نے غالب کی شخصیت ، اس کے ماحول اور فن کے بارے میں جو مقالات لکھے ہیں ، ان میں سے چند اس کتاب میں یک جا کر دیے گئے ہیں - یہ مقالات حسب ذیل ہیں :

- غالب محقق کی حیثیت سے
- میر و غالب
- غالبؔ کے اردو کلام کی اشاعت
- غالب ، خطوط کے آیینے میں
- ذال معجمہ فارسی میں
- غالب درد میرٹھ
- غالب کی شخصیت

قیمت : پانچ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ — کراچی

غالب کا فکری جائزہ

سید محمد تقی

۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو مرزا غالب کی وفات کو ٹھیک سو سال کا عرصہ گزر جائے گا ۔ سو سال گزرنے کی یہ یاد ، صد سالہ برسی کی تقریبات کی شکل میں منائی جا رہی ہے اور ایسے تزک و احتشام سے کہ اس طرح دلی کے بادشاہ کی سالگرہ منانے کا بھی لال قلعے کے خوشامدیوں نے خیال نہ کیا ہوگا ۔ کوئی نصف درجن ملک اس برسی کے منانے میں شریک ہیں ، جن میں دنیا کی دو سب سے بڑی مملکتیں ، سوویٹ روس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہیں ۔ اور تو اور اب تو وہ برطانیہ بھی غالب کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں شامل ہو گیا ہے جس کے ادنا درجے کے ایک کارندے یعنی کوتوال نے اس ' فرمانروائے کشور ہندوستان ' کو جیل میں ڈلوانے کی کامیاب کوشش کی تھی ۔

آج اگر مرزا صاحب اپنی برسی کی ان تقریبات میں خود شرکت کر سکتے تو اُن شکووں اور شکایتوں کے سارے تیر توڑ ڈالتے جو اس ناقدر دنیا پر انھوں نے برسائے تھے ۔

اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی نے غالب کو دریافت کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی تھی اور اس لیے اُن کی یہ مایوسیاں بھی حق بجانب تھیں ۔ غالب کی صحیح عظمت دریافت کرنے کا سہرا تو بیسویں صدی کے سر ہے ۔ دریافت کا مطلب یہ کہ اس عہد کی ادبی زندگی نے یہ مان لیا ہے کہ وہی خرابیاں اور نقائص جنھیں غالب کے معاصرین نے قابل گرفت سمجھا تھا اور جن پر غالب کو یہ احتجاج کرنا پڑا تھا کہ :

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

وہی فی الاصل جوہر ہیں اُن کے کلام کے اور وہی اختصاصی خوبی ہے اُن کے ہاں جو دوسروں میں نظر نہیں آتی ۔

عام انداز کے لوگوں سے توقع یہ رکھی جاتی ہے کہ وہ اُس فکری ، تہذیبی اور تاثراتی تانے بانے میں مقید رہیں گے جو ماضی اور حال تمام انسانوں کے گرد بن دیتے ہیں اور جس سے رہائی پانا صف اول کے دانشوروں کے علاوہ اور کسی کے بس کی بات نہیں ۔ غالب کو تاریخ نے ایک طاقتور تہذیبی ورثہ دیا تھا جس میں بابل ، مصر ، یونان اور مشرق وسطی کی ذہانتوں اور فارس کے قد آور شعرا کے وہ تخیلی کارنامے شامل تھے اور جس کے بوجھ تلے اچھی خاصی شخصیت رکھنے والے دانشور کے شانے کچل جاتے ، لیکن موجودہ عہد کے لوگ یہ دیکھ کر متعجب رہ جاتے ہیں کہ اتنے طاقتور اور بوجھل ماضی کا ورثہ رکھنے کے باوجود غالب نے اپنی شخصیت کی انفرادیت منوالی ۔ انفرادیت منوانے کا مطلب یہ ہے کہ خیال کے نئے گوشے ڈھونڈ لیے ۔

مجھے معلوم نہیں کہ غالب نے اپنی اس غزل کو کہ :

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں		ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں		غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

اپنے کلام کے کس درجے میں رکھا تھا ، لیکن میرا مشورہ شامل حال ہو سکتا تو میں اسے اُن کی تخلیقات کے سب سے بہتر نمونوں میں شامل کرنے کا مشورہ دیتا ، اس لیے کہ جب مرزا نے دانشورانہ کرب میں ایسے سوال اٹھائے جن کی تسکین ان کا ماضی کر سکا نہ اُن کا مستقبل یعنی ہمارا حال ، نہ ہم اپنے مستقبل سے اتنے پر امید ہیں کہ وہ اس کرب کو مطمئن کرنے میں کامیابی حاصل کرلے گا تو پھر اس دانشور کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری ہے ۔

لیکن بنیادی اہمیت خود ان شواہد کی اپنی نہیں ہے ، اہم بات یہ ہے کہ غالب نے ماضی اور حال کو ٹھکرا کر پوری کائنات کو ایک سوالیہ علامت کی طرح سمجھنے کی جرأت کی اور ہیہات کہ یہ سوالیہ علامت آج بھی اپنی جگہ جمی ہوئی ہے اور ایک ڈراؤ نے بھوت کی طرح اس عہد کے دانشوروں کے ذہنوں کا پیچھا کرتی رہتی ہے ۔

شعرا کے جانچنے میں ایک بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے ، اور صرف شعرا ہی کے کیوں تمام دانشوروں کے پرکھنے میں یہی مشکل دامن پکڑ

لیتی ہے کہ ان کی اپنی تخلیق ، ماضی کے دانشوروں کے خیال آفریں کارناموں سے اتنی وضاحت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے کہ سرقے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ کم سے کم توارد تو ضروری ہوتا ہے اور یہ توارد اتنا عام ہے کہ کم ، بہت ہی کم ایسے لوگ گزرے ہیں جو واقعی اپنے قدموں پر کھڑے نظر آئیں ۔ ورنہ سبھی تخلیقی بیسا کھیوں پر کھڑے رہتے ہیں ۔ یہ بیسا کھیاں ماضی کے دانشور مہیا کرتے ہیں جنہیں اپنے اپنے انداز بیان میں منتقل کر دیا جاتا ہے ۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ تخلیق صرف نئے تصور کو پیدا کرنے کا نام نہیں ہے ۔ تخلیق پرانے تصور کو نیا جامہ پہنانے یا قدیم تخلیق کو نئے اطلاقات دینے اور مختلف انداز میں بیان کرنے کا نام بھی ہے ، لیکن اس جیسی تخلیق ایک بالکل نئے رخ کو دیکھنے کی اہمیت تو نہیں رکھتی ۔

دانشوری کی تمام شاخوں ، خاص طور پر شاعری میں کلام کی اہمیت تین درجوں سے گزرتی ہے ۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ ماضی سے جو کچھ کسی کو ملا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا جائے ۔ یہ درجہ بالکل ابتدائی قسم کا ہے اور وہ عام درجہ ہے جس پر شعرا کی بہت بڑی تعداد پہنچ کر رک جاتی ہے ۔ تخلیق کے ارتقا کے عمل میں دوسرا درجہ اس جگہ آتا ہے جب پرانے تخلیقی کارناموں کو نئے تجربات کی روشنی میں برتا جاتا ہے اور نئے اسلوب بیان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ۔ یہاں تخلیق توارد کی زد سے بچ جاتی ہے اور پرانے تخلیقی ریزے نئے قالبوں میں ڈھل کر نئے مجسموں کی شکل حاصل کر لیتے ہیں ۔ لیکن بہت کم ایسے شاعر ہیں جو اس درجے تک پہنچ سکے ہوں ۔ زیادہ تر پہلی منزل پر پہنچے اور رک گئے اور دوسرے درجے تک پہنچتے پہنچتے اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کے سوتے خشک کر بیٹھے ۔ پہلی قسم میں تاریخ ادب کی سب سے بڑی اکثریت آجاتی ہے ، اسی اکثریت کو متشاعر بھی کہا جاتا ہے ۔ البتہ دوسری قسم ، جو چند افراد پر مشتمل ہے ، شاعر کہلانے کی حق دار ہے ۔ یہ شاعر اردو ادب کی تاریخ میں اتنے کم ہوئے ہیں کہ آپ ان کے نام بہ آسانی انگلیوں پر گن سکتے ہیں ۔ اس دوسری قسم کے بعد تیسرے درجے پر فائز ہونے والوں کی باری آتی ہے لیکن یہ تو صدیوں کے حساب سے پیدا ہوتے ہیں ۔ مگر اس منزل تک پہنچنے والے شعرا

اپنے تخلیقی عمل میں ہمیشہ نہیں ، صرف کبھی کبھی اُس درجے کو چھو سکتے ہیں جہاں اُن کی تخلیقی صلاحیتیں محض آزادانہ عمل کرتی ہیں ۔ وہ ان لمحوں میں ماضی کے ورثے کو اتار پھینکتے ہیں اور اپنی تخلیق کے ذریعے براہ راست حیات و کائنات سے دست وگریباں ہو جاتے ہیں ۔ شعرا کا یہ طبقہ دنیا بھر کی تاریخ ادب میں نادرالوجود رہتا ہے ۔ لیکن اس نوع کے شعرا بھی ہمیشہ ماضی اور حال سے رشتے توڑ کر اور زمانے کی وسعتوں اور پہنائیوں کو اپنی گرفت میں لینے کے قابل نہیں ہو پاتے ۔ بہت کم لمحے اور تجربے ایسے ہوتے ہیں جب یہ اپنے تنہا شعور کے سہارے روحی تجربوں کی گہرائیوں میں اُترتے اور تاثرات یا کائناتی رد عمل کے سمندر سے نئے موتی رول لاتے ہیں ۔

مرزا صاحب کے کلام کا تھوڑا سا حصہ اسی قسم کے روحی تجربے کی نمایندگی کرتا ہے ، اور اسی سے اُن کی عظمت کو جدید نسل نے دریافت کیا ہے ۔ میرے خیال میں غالب کا یہ اعزاز بڑا ہی نادر اعزاز ہے کہ اپنے زمان و مکان کی فوری بندشوں کو توڑ کر حیات و کائنات کے دوام و قدم سے چند حقیقتیں چن لینے میں اُنھوں نے کامیابی حاصل کی ، اس لیے کہ یہ اعزاز دنیائے ادب کے صرف گنتی کے چند افراد کی قسمت میں ہی لکھا گیا تھا ۔

مجھے معلوم ہے کہ غالب کو خود بھی اپنی اس عظمت کا اعتراف تھا لیکن یہ اعتراف محض وجدانی رہا ، شعوری نہ ہوسکا ۔ اس کی ذمہ داری خود ان پر عاید نہیں ہوتی بلکہ ان کے ابنائے زمانہ پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے اپنی خود پسندی سے اپنے دور کے اکابر کو بھی اتنا متاثر کرلیا تھا کہ وہ ٹھیک طرح خود اپنی شخصیت کی معرفت حاصل نہ کر سکے تھے ۔

"مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست"

اسی ذہنیت کی نمایندگی کرتا ہے جس کا غیر محسوس اثر خود مرزا صاحب پر پڑتا تھا ، چنانچہ وہ خود بھی اپنی شخصیت کی گہرائی اور گیرائی کا عمق اور وسعت نہ ناپ سکے ۔ دوسرے اردو شعرا کی طرح غالب بھی ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتے تھے جسے ماضی سے طے شدہ نظریے اور طے شدہ تصورات کے ڈھانچے ملے تھے ۔ یہ تصورات اور نظریے اس کائنات کی بناوٹ ، تخلیق ، زوال اور موت ، وسعت ، پھیلاؤ اور اندرونی نظام سے بھی تعلق رکھتے تھے اور کائنات میں انسان کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی متعلق تھے ۔ ان تصورات اور نظریوں میں وہ دیو مالائی تشریحیں ، کہانیاں

اور قصے بھی شامل ہیں جو مشرق وسطائی تہذیب کا حصہ ہیں اور جو ادبی استعاروں کی جان اور بلاغت کا منبع خیال کی جاتی ہیں - عربی اور فارسی کی شاعری، جس کی کڑیوں میں اردو شاعری بھی پروئی ہوئی ہے، اس وقت منظم ہوئی تھی جب مشرق وسطی کا یہ کلچر اپنے تقریباً سارے ساز و سامان مکمل کر چکا تھا - رہا فکری تصورات کا معاملہ تو وہ عربی شاعری کو تو نہیں لیکن فارسی شاعری کو بڑی حد تک منظم شکل میں ملے تھے - پھر خوش قسمتی سے مشرق وسطائی تہذیب نے وحدت الوجود کے نظریے کی تکمیل کی تو اس وقت فارسی شاعری بھی ساتھ ساتھ ترقی کر رہی تھی - ہاں جہاں تک اردو شاعری کا معاملہ ہے آسے فکر کے سارے سانچے بنے بنائے ملے اور اس لیے اردو شعرا کے لیے بڑی آسانی یہ رہی کہ وہ اپنے انفرادی تجربات ورثے میں ملے ہوئے فکری سانچے میں ڈھال لیتے تھے -

اردو شاعری میں تین موضوع بار بار سامنے آتے ہیں - صوفیانہ خیالات جن میں وحدت الوجود کا نظریہ بھی شامل ہے - رومانی تصورات جو شاعری کے بڑے حصے پر حاوی ہیں، اور مذہبی جذبات جو تبرک کے طور پر سب کے ہاں ملتے ہیں - رہے حکمرانوں کے لیے مدحیہ قصیدے تو ان کی اس سے زیادہ اہمیت نہیں ہے جتنی ملازمتوں کی ان درخواستوں کی ہوتی ہے جو بے روزگاروں کی طرف سے روزگار دلانے والوں کو پیش کی جایا کرتی ہیں، چاہے ان میں " دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا " کا انداز بیان ہو یا:

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

کا طنز اختیار کیا گیا ہو - بلکہ پورے کا پورا 'شاہنامہ' بھی اس لیے اپنا ادبی مقام گرا بیٹھا کہ وہ ایک تاجدار کو خوش کرنے کے لیے بہت سے تاجداروں کی مدح پر مشتمل ہو گیا - یہ اور بات ہے کہ 'شاہنامہ' اپنے انداز بیان، وسعت اور ادبی سلوک کی بنا پر کلاسیکی ادب میں شامل کیا جاتا ہے -

ادب کا یہ مفاہیمی سرمایہ تمام اردو شعرا کو ماضی کی میراث میں ملا تھا، ہمارے بہت سے نامور شعرا اس لیے سر بلند کر کے نہیں چل سکتے کہ جو مفاہیم وہ دیتے ہیں وہ زیادہ تر دوسروں کے چبائے ہوئے

ہیں ، جن کی بار بار جگالی کر دینے سے ان مفاہیم کی نوعیت نہیں بدل جاتی ۔ البتہ عاشقانہ شاعری میں تجربوں کی ذرا زیادہ گنجایش تھی ، اس لیے کہ عشق و رومان فرد کے اپنے اپنے تجربے کی بات تھی ۔ لہذا جہاں بھی ذہانت کی چمک موجود ہوئی ، کوئی نیا تجربہ سننے میں آیا یا پرانے تجربے کو نئے انداز میں بیان کر کے اس تجربے کا کوئی تاریک پہلو روشن کردیا گیا ۔ مذہبی شاعری میں بھی تخلیق کی بہت زیادہ گنجایش نہیں ہے ، یہ اور بات ہے کہ مذہب کو جب بحران کا سامنا ہوا تو اقبال کو اپنی ذات اور اپنے سماج میں ڈوب کر کچھ نئے تجربے کرنے پڑے ۔

ماضی کے اس تخلیقی ورثے کا بوجھ ہر نئی نسل پر پرانی نسل کی بہ نسبت زیادہ پڑتا ہے ، اس لیے کہ گزشتہ نسل کے تجربے بھی ماضی کے ورثے میں شامل ہو جاتے ہیں ، ان حالات میں ٹھوس اور فکر انگیز شاعری کے لیے ہر نیا دور زیادہ مشکلیں پیدا کردیتا ہے ۔

مرزا اسداللہ خاں غالب کو بھی ماضی سے طے شدہ سانچے ملے تھے۔ مگر ہماری ادبی تاریخ میں جو فارسی و عربی پر بھی مشتمل ہے ، یہ اختصاص غالب کو حاصل ہوا کہ انھوں نے ماضی کے ورثے کو اپنی زندگی میں برتا اور پرانے فکری سانچوں کو جوں کا توں تسلیم کرنے سے انکار کردیا ۔ غالب حیات وکائنات سے صاف دل و دماغ کے ساتھ نمٹتے ہیں ، اگر پوری طرح نہ بھی سہی تو بڑی حد تک ان کے کلام میں فرد کی اپنی آزادی اور اس کی انا کی ناپابندی کا اظہار ہوتا ہے ۔ غالب کی ایغو حیات وکائنات سے آزاد فضا میں الجھتی ہے اور اپنے ذاتی تجربے کرتی ہے ۔

شعرائے قدیم ہوں یا شعرائے جدید ، کسی نہ کسی فکری مدرسے سے تعلق ضرور رکھتے ہیں ۔ بعض رومان پسند ہیں ، بعض تصوف نواز، چند نفرت پسند ہیں اور دوسرے ارتیابیت کیش ۔ رہے وہ شعرا جو صرف مرقع نگاری یا حرف پیمائی کرتے ہیں ، وہ بھی کسی نہ کسی فکری مدرسے کے پس منظر سے ابھر کر آئے ہیں ۔ مگر میرزا غالب کسی ایک فکری خانے میں سمانے کو تیار نہیں ، وہ وحدت الوجود کا ذکر بھی چھیڑتے ہیں تو اپنے لا ادریت پسندانہ رجحان کے پیش نظر :

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

کہہ کر وحدت الوجود کے تصور کے ایک مشکل پہلو پر انگلی رکھ دیتے ہیں ۔ یہ بات دوسری ہے کہ پلوتینس یا ابن عربی اس مشکل کا حل ڈھونڈ نکالیں گے ، لیکن غالب کی نظر کا ایک ایسے پہلو پر جانا جو اس نظریے کے کمزور رخ کو ظاہر کرتا ہے ، ان کی شدید لا ادریت کا اظہار ہے ۔ لا ادریت خود بھی ایک فلسفیانہ مدرسہ ہے اور اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ غالب کسی نہ کسی مدرسے سے تعلق ضرور رکھتے ہیں ۔ لیکن لاادری علم اشیا کی نفی کرتے ہیں اور یہ نفی دلائل اور ثبوت سے ہوتی ہے ۔ بالفاظ دگر کہا جا سکتا ہے کہ لاادریوں کے ہاں بھی اثبات شے پایا جاتا ہے مگر غالب صرف سوالوں کی حد تک محدود رہتے ہیں ، وہ کسی منفیت کا اثبات نہیں کرتے بلکہ ہر اثبات کو سوال کی زد میں لے آتے ہیں ، لہذا انہیں مروجہ معنی میں لاادری کہنا بھی مشکل ہی ہوگا ۔ البتہ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح کے اختراع کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ میرزا غالب ایک نئے مدرسے کے بانی تھے جسے ' سوالیت ' کہا جاسکتا ہے ۔ یعنی حقائق کو سوال کی زد میں لانا اور اس کے جواب سے مایوس رہنا ۔ جدید فلسفہ وجودیت کا مدرسہ خود سوالوں کے وجود سے انکار کرتا ہے اور منطقی اثباتیت — لاجیکل پازی ٹیوزم ، سوالات کو جملوں کی ساخت سے متعلق کرکے چپ ہو جاتی ہے ، گویا منطقی اثباتیت کے خیال میں فلسفے کے سارے سوالات محض لسانی مسئلہ ہیں ، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ اللہ اللہ ، خیر سلا ۔ لیکن غالب اس طفلانہ انداز نظر کی صحت تسلیم نہیں کرتے ، اس لیے کہ ان کا عمق نواز ذہن سوال اٹھاتا ہے اور ان سوالات کو بڑی فکری جسارت کے ساتھ وہ پیش بھی کرتے ہیں ۔ ✓

میں یہاں یہ کہنے کی کوشش نہیں کررہا کہ غالب نے شعوری طور پر ایک فکری مدرسے کی بنیاد رکھی ہے ، جس کے لیے میں نے سوالیت کی اصطلاح وضع کرنے کی جرات کی ہے ۔ میں اسے ایک جداگانہ مدرسہ قرار دے کر غالب کے فکری رجحان کو دیکھتے ہوئے اس فکری مدرسے کا اہم نمایندہ قرار دینے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ۔ غالب کی اس سوچ کی صحیح نمایندگی ان کے اس مصرع سے ہوتی ہے :

ہرکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

دین بزرگان سے ان کی مراد صرف وراثتی دین ہی سے نہیں ہے ، ایسے

ماحولی دین سے بھی ہے ، جیسے وہ ' خوش نکرد ' کہہ کر فکری آزادی کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں ۔ اس ' دین بزرگاں خوش نکرد ' کی تشریح کے ضمن میں مولانا حالی نے یہ کہہ کر کہ '' ہم نے سنا ہے کہ مرزا کے والد سنی المذہب تھے اور خود غالب اثنا عشری '' سارے شعر کا مزا کرکرا کر دیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی نے غالب کے بہت سے اشعار کی اس بری طرح مٹی پلید کی ہے کہ ان کی ان تشریحوں کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ '' شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد '' ۔

البتہ مولانا حالی کی اس رائے میں واقعی وزن ہے کہ غالب کے بعض اردو اشعار میں وہ بلندی پائی جاتی ہے جس کی مثال فارسی کی تمام شاعری سے ملنی مشکل ہے ۔ سچی بات یہ ہے کہ غالب کی یہ رائے صحت پر مبنی نہیں ہے کہ :

'' بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است ''

اس لیے کہ ان کا فارسی کلام نظیری ، عرفی اور ظہوری کے وضع کیے ہوئے نمونوں سے باہر نہیں نکلتا ۔ ہاں اردو میں انہوں نے واقعی 'قاعدۂ آسمان ' کو الٹ کر رکھ دیا ہے اور زندگی کے ان گوشوں کو جھانکنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن تک دوسرے شعرا کا تخیل بار پانے کی جسارت نہ کرسکا ۔

حضرت علی کی منقبت میں غالب نے جو قصیدہ لکھا ہے اس کے چند اشعار ، مثلاً :

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آینۂ فرق جنون و تمکیں
نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسیں
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں

عشق بے ربطی شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگار رخ آینۂ حسن یقیں

ان کے پورے فارسی کلام پر بھاری ہیں ، بلکہ ان جیسے اشعار کا بوجھ تو پوری فارسی اور اردو شاعری اٹھانے کی سکت نہیں رکھتی - ہر چند ان اشعار کی باغیانہ نوعیت سے گھبرا کر انہیں گوبز کرتے ہوئے یہ بھی کہنا پڑا :

نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں

لیکن یہی تحریری ہذیان ان کی فکری برتری اور عظمت کا سبب بن گیا -

غالب اپنے فکری انحراف میں نطشے کا سا انداز رکھتے ہیں جب کہ فکری گہرائی اور طرز بیان میں مارکس اور اشپنگلر کا سا دماغ اور طرز ادا ظاہر کرتے ہیں - ان میں اور ان جیسی فکر رکھنے والے ان مغربی اکابر میں ماحول کا فرق ہے ، ورنہ ذہنی اعتبار سے وہ یکساں برتری کے حامل ہیں - ہاں ان میں انداز بیان اور اسلوب کی ہیئتوں کا فرق بھی ہے مگر یہ فرق ثانوی اہمیت کا حامل ہے - بنیادی چیز رد عمل ہے جو کئی اعتبارات سے ان میں اور نطشے ، مارکس اور اشپنگلر میں یکساں ہے - نطشے بھی اپنے ماحول سے باغی ہیں اور غالب بھی ، اسی طرح غالب بھی اتنی ہی گہرائی میں اترتے ہیں جس قدر مارکس یا اشپنگلر فکری عمق میں جاتے ہیں - لیکن یاد رہے یہ تشابہ محض فکری اعتبار سے ہے ورنہ غالب و مارکس اور اشپنگلر میں نہ مضامین کا اشتراک ہے نہ ماحول کا ، نہ اسلوب کا اشتراک ہے اور نہ طرز بیان کا - البتہ نطشے اور غالب میں ایک مزید مفاہمت اور پائی جاتی ہے کہ دونوں طرز نگارش میں ادبی ضرورتوں کا بھرپور خیال رکھتے ہیں ، گو غالب اس میدان میں نطشے سے آگے نکل گئے ہیں -

کلام غالب کے فکری پہلوؤں سے متعلق یہ صرف چند باتیں ہیں جو تشنہ بھی ہیں اور مختصر بھی، لیکن اس ایک مختصر سی گفتگو میں جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ غالب کسی فلسفیانہ چوکھٹے میں فٹ نہیں ہوتے اور یہی ان کی خوبی اور اختصاص ہے جس نے تاریخ ادب میں ان کی شخصیت کو نادر بنا دیا ہے -

ہفت مقالہ

یہ رسالہ " اردو " کے ایسے مضامین کا انتخاب ہے جو فارسی زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ یہ انتخاب ممتاز ماہر ایرانیات سید حسام الدین راشدی نے کیا ہے۔ اس مجموعے کے چند مقالے :

★ تصانیف شیخ فریدالدین عطار	حافظ محمود شیرانی
★ شاہ نامے کا دیباچۂ قدیم	حکیم شمس اللہ قادری
★ فردوسی کا مذہب	پروفیسر شیخ محمد اقبال
★ رباعیات عمر خیام	عبد الباری آسی
★ فارسی زبان کے زیر سایہ اردو زبان کی تدریجی ترقی	ڈاکٹر سید عبد اللہ
★ نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں (صاحب مآثر الامرا)	محمد حسین محوی صدیقی

قیمت آٹھ روپے

انجمن ترقی اردو (پاکستان)

بابائے اردو روڈ ۔ کراچی

مجموعہ دہلی اور غالب

قاضی عبدالودود

ایک مجموعہ فارسی نیشنل آرکائیوز دہلی میں ہے ، جس کا علم مجھے جناب اکبر علی ترمذی کی مہربانی سے ہوا ۔ میں نے اسے جا بجا سے دیکھا ہے لیکن مقالہ ہذا اس کے عکس پر مبنی ہے ۔ اس میں پہلے غالب کی تحریریں ہیں ، ان کے بعد ایک صفحہ سادہ اور پھر تین صفحات میں دوسروں کی تحریریں ہیں ۔ کسی صفحے میں ۲۱ ، کسی میں ۲۰ اور کسی میں اس سے بھی کم سطور ہیں ۔ ایک مکمل سطر کی عبارت یہ ہے :

" چه مایه بیکسم که مرا در عرض مراسم پوزش خود شفیع خویشتن باید بود ، خدارا بر تلخ کامی های غالب زهرابه نوش رحمی بحق خدای که ناز "

کم اوراق ہیں جو ناقص نہیں ، کتاب بدون تمہید و خاتمہ ہے ، اس کا امکان ہے کہ اول و آخر اور درمیان کے کچھ ورق ضائع ہو گئے ہوں ۔ صفحہ آخر میں فارسی کی آخری سطر کے بعد تین سطور کی جگہ خالی ہے ، اور پھر انگریزی عبارت جو بجنسہ درج ذیل ہے :

" Writen (کذا) by moonshee Aly Hassan of mowzah Kahra"

قبل اس سے کہ تحریرات غالب سے بحث ہو ، دوسروں کی تحریروں کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے یہ فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی کہ کاتب منشی علی حسن ہے یا نہیں ، اور زمانہ کتابت کی کسی حد تک تعیین ہو سکے گی ۔ پہلے ایک خط ہے جس کا عنوان یہ ہے :

" نقل صحیفه ... مخدومی مولوی سید افضل علی ...... تحصیلدار پرگنه بدوسا و کالنجر ضلع باندا بوندیل کهنڈ ، موسومه این روشناس زاویه خمول ... " ۔

اس خط کے آخر میں منشی محمد نسیم اللہ کو سلام ہے ، دوسرے خط کا عنوان " بشرح ایضاً " ہے اور اس کے آخر میں مرقوم ہے :

" شرح لفافہ ...... در باندا بسامی خدمت ...... مخدوم و معظم لیازمندان ...... منشی سید علی حسن خان ... زاد مجدکم العالی ۔ ذریعۂ اخلاص افضل علی ... پنجم اگست ۱۸۳۹ء ، باندا " ۔

تیسرا خط (اور یہ آخری تحریر ہے) غلام امام شہید کا ہے جو پیش کار صدر عدالت دیوانی تھے ۔ یہ دوران اقامت باندا میں ، وقت روانگی الہ آباد منشی محمد نسیم اللہ " سررشتہ دار عدالت فوجداری قسمت جنوبی ضلع بوندیل کھنڈ " کو لکھا گیا تھا ۔ " قسمت ... بوندیل کھنڈ " کے متعلق اطلاع ہے کہ " در آن ایام عبارت از ضلع باندا بودہ است " ۔

میرا خیال ہے کہ عبارت فارسی کے منشی سید علی حسن خان ، اور انگریزی عبارت کے منشی علی حسن فرد واحد ہیں ۔ اور یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس مجموعے کے کاتب نہیں ۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تحریرات غالب کا زمانۂ کتابت تحریرات افضل وغیرہ کے زمانے سے مختلف ہوسکتا ہے ، اس سے قطع نظر کرلی جائے اور شہید کے خط کا زمانہ کم و بیش وہی تصور کیا جائے تو زمانۂ کتابت ۱۸۳۹ء یا اس کے کچھ بعد معین کیا جاسکتا ہے ۔ یہ متیقن ہے کہ غالب کی کل تحریریں جو اس مجموعے میں ہیں ، اس سے قبل کی ہیں ۔

اس مجموعے کے خطوط کی بڑی اکثریت محمد علی خان کے نام ہے ، خواہ ان کا نام آغاز خط میں ہو یا نہ ہو ۔ باقی خطوط علی اکبر خان طباطبائی کے نام کے ہیں ، اور ان کے ساتھ بھی ان کا نام لازماً نہیں ۔ ان خطوط میں سے چند پنج آہنگ میں بھی ہیں ، بعض میں تو بڑے اختلاف ہیں ، میرا خیال ہے کہ مجموعے میں ، اغلاط کتابت سے قطع نظر ، اصلی خطوں کی نقلیں ہیں ، پنج آہنگ میں مصلحت کارفرما رہی ہے ۔ بعض تحریریں خط نہیں کہی جاسکتیں ۔ خط (۲) و (۶) دراصل ایک ہیں ۔ (...) کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قبل کچھ الفاظ ضائع ہوگئے ہیں ۔ اردو خلاصہ تیار کرتے وقت تعظیمی الفاظ عموماً حذف کر دیے گئے ہیں ۔

مجھے اس کا افسوس ہے میں یہ مقالہ حسب دلخواہ نہیں لکھ سکا ، بیشتر خطوط سے متعلق حواشی تحریر ہی نہ ہو سکے ۔

[۱]

ابتدا میں بدون اسم مصنف ظہوری کا ایک شعر، اس کے بعد چند سطور نثر، اس کے بعد "فرمانروائے کشور آگہی ملاذ و مطاع رہی سلامت"۔ میرا خیال ہے کہ سطور بالا جزو مکتوب ہیں، اور قیاس ہے کہ مکتوب الیہ محمد علی خان ہیں اور خط زمانۂ اقامت باندا کا ہے۔

میر کرم علی "اغلب اوقات" آپ کی جانب سے "قدم رنجہ" نہ فرمانے کا غدر کیا کرتے ہیں، اور یہ کہا کرتے ہیں کہ آپ میری تعریف کرتے ہیں۔ یہی بہت ہے کہ اس "ننگ آفرینش" کو "صدر بزم قبول" میں بٹھاتے ہیں۔ میرے "دیر دیر" سے آنے کی وجہ شوق کی کمی نہیں، "وفور ناتوانی" ہے، دماغ کو فکر سخن سے سر گرانی ہے۔ "یاد باد آن روزگاران کاعتباری داشتم الخ"۔ 'ہیچ' کو 'ہمہ' اور 'بد' کو 'نیک' سمجھنا آئین غریب نوازی ہے۔ دو نثریں جو مختلف مواقع پر لکھی گئی تھیں، حاضر ہیں۔ ایک خط ہے جو "صنعت تعطیل" میں "عمو صاحب قبلہ فخرالدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ" کی "جاگیر" سے "فخرالعلما مولوی محمد فضل حق" کو جو میرے دوست ہیں، اور جن سے بر بنائے عجلت، دهلی سے روانگی سے قبل، نہ مل سکا تھا، بھیجا گیا تھا۔ دوسری ایک عرض داشت (۱) ہے جو لکھنؤ میں "بتکایف دوستان جدید، سبحان علی خان و میر نیاز حسین خان (۲) و دیگر دوستان جدید(...)" معتمدالدولہ کے لیے لکھی گئی تھی، اور اس کی صورت بھی نکلی تھی کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ "اما چون درباب معانقہ وقت نجستین ملازمت

۱۔ دونوں تحریریں پنج آہنگ کے خاتمۂ گل رعنا میں ہیں، خاتمے میں جو دوسری تحریر ہے، اس کے آخری الفاظ مجموعے میں نہیں۔ جناب مالک رام کی عنایت سے ان کا نسخۂ گل رعنا میری نظر سے گزرا ہے، مگر یاد نہیں کہ یہ تحریریں اس میں ہیں یا نہیں۔

۲۔ کمال الدین حیدر کی تاریخ اودھ جلد اول میں میر نیاز حسین (بدون "خان") داروغۂ دیوان خانۂ معتمدالدولہ کا ذکر ہے، قریب بہ یقین ہے کہ وہی ہوں جو مجموعے میں ہیں۔

از آن طرف (......) سخنها رفت آن معاملہ ذہنی در خارج صورت نگرفت ... ، مستغنیانہ پاس ناموس خاکساری ورزیدم ، و دامن از اختلاط آن نو دولتان بیمدار (۱) بر چیدم '' ۔ اس کی ' ہوس ' سینے سے محو ہو گئی مگر ' رقم ' ' سفینے ' میں باقی ہے ۔ ''محدوما و مکرما ، من دانم و دل کہ بدین حسن اتفاق چہ قدر شادمانی میکنم ، یعنی دعائے بے اثر از قبول بیگانہ کہ چون نالہ های دلہای بیدرد اهل هوس را بجائے نمیبرد ، اینک در خاتمہ این عبودیت نامہ تشریف قبول یافت ۔ هم نقش مدعای خاطر مشتاق بکرسی نشست ، و هم زحمت تفرقہ نفاق و وفاق از میان برخاست ۔ امید کہ آثار این دعا بری از ریا ، بروزگار خجستہ آثار جناب سامی مدظلہ باد '' ۔

[۲]

خط بنام محمد علی خان ، پنج آہنگ کے مطابق :

''قبلہ قبلہ پرستان و کعبہ حق پژوهان سلامت ''۔ پنجشنبے کو مودها (پنج آہنگ غلطی ، مؤدہ) پہنچا ، دو شنبے کو روانہ ہوا ،رات ایک گاؤں میں گزاری ۔ ''بروز سہ شنبہ در چلہ تارا رسید '' (...) بخار غائب ہو گیا ۔ ''امشب (۲) (...) اگر حیات باقیست بسیچ راہ فتحپور کردہ خواهد شد '' ۔

[۳]

خط بنام محمد علی خان ، پنج آہنگ کے مطابق ۔ پنج آہنگ کی عبارت '' خلاصہ تحریر ... حد ادب '' مجموعے میں نہیں ، اور ' قدیر ' کے بعد مجموعے کی عبارت ذیل پنج آہنگ سے غیر حاضر ہے : بخدمت جناب شاہ غلام زکریا صاحب و خان صاحب عمیم الاحسان العام احمد خان صاحب و جناب محمد صالح علی خان المشتہر بہ مرزائی صاحب سلامہائے نیاز افشان اشتیاق بار پذرفتہ باد ۔

[۴]

بنام محمد علی خان، مگر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں ۔ عنوان ''مشتمل

۱- مگر یہ بعد کو سبحان علی خان سے استمداد سے مانع نہ آیا ، پنج آہنگ میں ان کے نام کے خطوط ہیں ۔

۲- امشب در چلہ تارا رسیدہ (کذا) بامداد آن اگر حیات باقیست ... شد ... زیادہ حد ادب '' (پنج آہنگ ، قلمی)

بر ہجو الہ آباد و صفت بنارس ''۔ آغاز شعر ذیل ہے :

ابن شکایت نامہ' آوارگیہائے منست
قصہ' درد جدائی ہا جداخواہم نوشت

دیوانہ ام ہر چہ گویم معافم ، و درد مندم ہر چہ نویسم مرفوع القلم

مغلوب سطوت شرکا غالب حزیں
کاندرتنش زضعف تواں گفت جاں نبود

دوبند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است
مارا باس گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

چلہ تارہ کا ماجرا دو عرض داشتوں میں لکھ چکا ہوں ۔ گھاٹ پر کشتی کرایہ لی اور نوکر اور گھوڑے کے ساتھ اس پر سوار ہوا ۔ '' از پیچ و تاب رنج معدہ در کشا کش دل حرارت غریبہ حمی بر آرش''۔ '' روز ہفتم دویرانہ (..) ورود افتاد ، آہ ازالہ آباد و لعنت خدا بداں خرابہ باد نہ در وی دوائی درخور بیمار و نہ متاعی شایستہ' مردم (..................) مرد و زنش ناپیدا ، و مہر .... از طبع پیر و جوانش کم ''۔ اس ' وادی ہولناک ' کو شہر کہنا نا انصافی ہے ، اور '' آدم زاد '' کا اس '' دامگاہ غول '' میں رہنا ''بے حیائی''۔ جہنم اس نسبت پرکہ اس شہر کا مقابل کہتے ہیں ، پر از آتش ہے ، اور ہوائے زمہریر اس سے سخت ناخوش ہے کہ اس '' بروئکدے '' کی ہوا سے اسے نسبت دیتے ہیں (۱) ۔ یہ سن کر کہ '' بداں را بنیکاں بہ بخشد '' بہ شہر ' ہزار امیدواری ' بلکہ ' صد ہزار خواری ' کے ساتھ بنارس کے پہلو میں مقیم ہے اورگنگا کو بطریق شفاعت اس کی طرف بھیجا ہے ۔ اس روسیاہ کی طرف دیکھنا بنارس کی طبع نازک پرگراں ہے ، مگر گنگا سفارشی ہے ۔ بحدا اگر کلکتے سے واپسی کا انحصار اس پر ہوکہ الہ آباد سے گزرنا لازم ہے ، تو 'ترک وطن ' کروں ۔ ایک شب و روز فقدان باربرداری کی وجہ سے اس ' دیولاخ ' میں

۱۔ الہ آباد کے متعلق رائے غیر ذمہ دارانہ ہے ، قیام اتنا مختصر رہا تھا کہ وہاں کے باشندوں کی نسبت اظہار رائے کا حق ہی نہ تھا ۔ بعض اصحاب نے حسب دلخواہ سلوک نہ کیا ہوگا ، الہ آباد سے نفرت کی یہی وجہ ہے ۔

رہا ۔ دوسرے دن سہل ملی اور وقت سحر ساحل گنگا پر پہنچا ، دریا سے گزرا ، اور " پائے شوق " سے سوئے بنارس " گرم پوبہ " ہوا ۔ روز ورود بنارس نسیم جانفزا سوئے شرق سے چلی ، اس کا اثر یہ ہوا کہ اثر ضعف بالکل نہ رہا ۔ اگر فرط دلنشینی کی وجہ سے اسے سویدائے عالم کہوں بجا ہے ، اور اس کے اطراف میں سبزہ و گل کا جوش دیکھ کر بہشت ارضی کہوں روا ہے ۔ کثرت عمارات کا کیا بیان ہو ۔ یہ تماشاگاہ اتنا دلفریب ہے کہ غربت کا غم فراموش ہے ۔ مقدمہ درپیش نہ ہوتا اور شماتت اعدا کا خوف نہ ہوتا تو بے محابا ترک دین کرتا ، سبحہ توڑتا ، قشقہ لگاتا ، زنار باندھتا اور اس وضع میں تا زندگی گنگا کے کنارے بیٹھتا ۔ اس " ارم آباد " میں بغیر دوا عوارض جدید غائب ہوگئے ، اور اصل مرض بھی کسی قدر کم ہوا ۔ ' مرکبات معمول ' کی فراہمی حزم و احتیاط استقبال کی بنا پر ہے ، ورنہ تلافی ماضی یا رعایت حال مدنظر نہیں ۔ خاطر اقدس میں یہ نہ گزرے کہ غالب ' خیرہ سری ' سے بنارس میں شہد کی مکھی یا دلدل کا گدھا ہوگیا ہے ، حاشا ثم حاشا ، مجھ فلک زدہ کو دماغ تماشا کہاں ؟ (۱) ' مگر دواؤں کی فراہمی اور زمستان کے لیے رخت سفر کی تیاری میں کم از کم چار ہفتے صرف ہوں گے ۔ ایک ہفتہ جو گزر چکا ہے اسی میں شامل ہے ۔ پانچ روز سرائے بزنگ‌آباد مشہور بہ سرائے نورنگ‌آباد میں فضول بسر ہوئے ، اب مکان اسی سرا کے عقب میں مل گیا ہے ۔

---

۱ ۔ میرا خیال ہے کہ بنارس میں کسی صورت سے تعلق ہوگیا ہوگا ، طول اقامت کی اس کے علاوہ کوئی وجہ قرین قیاس نہیں ۔ وہ خود ، جیسا کہ خود معترف ہیں ، بڑی مبتذل سی جگہ مقیم تھے ۔ مگر اس کے باوجود بنارس کی مدح اتنی کی ہے کہ کسی اور جگہ کی نہیں کی ، بنارس اس کا ہرگز مستحق نہیں ۔ اس خط میں ایک مثنوی کے ۱۲ اشعار ہیں ، جن میں سے ۱۱ چراغ دیر سے ہیں ، ان ۱۱ اشعار کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں ، ترتیب مطابق مجموعہ : تعالی اللہ، خس و خارش ، سروش (صحیح : سوادش) ، بنارس را کسے ، بخوش پرکاری ، بنارس را تو ، حسودش ، بتانش را ، میانہا ، تبسم ، بلند افتاد ۔ ایک شعر جو کلیات ۱۲۵۴ھ میں نہیں ، یہ ہے :

فرنگستان حسن بے نقاب است
ز خاکش ذرہ ذرہ آفتاب است

کبھی جی میں آتا ہے کہ عظیم آباد تک خشکی کی راہ سے جاؤں اور وہاں کرائے کی کشتی لوں ، کبھی یہ سوچتا ہوں کہ یہیں سے براہ دریا جانا چاہیے ۔ آپ خط ضرور لکھیں ، اس کے جواب میں یہاں سے روانگی کی تاریخ وغیرہ لکھوں گا ۔ ہر چند کہ آپ کا خط آنے کی بیش از بیش خواہش ہے ، لیکن دل شرم گمنامی و ہیچ کسی سے زخمی ہے ۔ میری اقامت گاہ ایک بڑھیا کا گھر ہے ، جو خود روغن چراغ کی محتاج ہے اور اس کا خرابہ برس و جو سے فارغ ۔ اس کے پہلو میں کوئی ایسا مکان بھی نہیں کہ اس کے پتے سے خط منگواؤں ۔ یہی ایک صورت ہے کہ آپ یہ لکھیں " محلہ نورنگ آباد عقب سرائے نورنگ آباد قریب حویلی گوسی خانساماں در حویلی مٹھالی و میاں رمضان بمطالعہ اسداللہ غریب الوطن تازہ وارد برسد " ۔ ممکن ہے کہ " قاصدان ڈاک انگریزی " خط مجھ تک پہنچادیں ۔ شاہ محمد زکریا ، خان صاحب (......) اور مرزائی صاحب کو سلام ۔

[۵]

"قبلہ قبلہ پرستان و کعبہ حق پژوہان" ۔ حامل مکتوب محض اتفاقاً ملا ، ...... مودھا پہنچا ، اتوار تک وہاں آرام کرتا رہا ، دو شنبے کو وہاں سے رخصت ہوا ، رات ایک گاؤں میں بسر کی ، منگل کو چلہ تارہ پہنچا ۔ شکر ہے کہ درد اور بخار سے نجات ملی ۔ رات یہاں گزار کر علی الصباح عازم فتحپور ہوں گا ۔ اسداللہ ۔

[۶]

بنام محمد علی خاں بموجب پنج آہنگ ، جس میں یہ نامکمل ہے :

" جناب فیض مآب قبلہ و کعبہ نشأتین " ، بنارس میں " عطوفت نامہ " ملا ۔ منگل ۴ شعبان کو براہ خشکی عظیم آباد روانہ ہوا اور وہاں سے کلکتہ پہنچا ۔ وہاں ایک اچھا مکان چھ روپے (پنج آہنگ میں دس) کرائے کا مل گیا ۔ آپ کا خط لے کر ہگلی گیا ۔ " بدر نواب صاحب (۱) (...) نخست

۱۔ مراد از علی اکبر خان طبا طبائی ، ذکر ملاقات پنج آہنگ کے خط میں بھی "بدر ... باید دید" کے مطالب پنج آہنگ میں نہیں ، اور اس میں طباطبائی کی جو تعریف ہے ، مجموعے کے اس خط میں نہیں ۔

روبسوی ایوانی که ضریح جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا درو بود ، آوردم وز (...) چوں بگوشهٔ بساط قرب معنوی رسیدم از فرط عنایت برخاستند ۔ ... (......) در انتظار تو روز ها گذشت چوں از کیفیت منشا' انتظار پرسیده شد ایں معنی گل (......) نواب صاحب رسانیده اند ، و بے ذریعهٔ ملاقات صوری روشناس معنوی گردانیده ۔ روز ملاقات (..) درمیان نیامد ، دو سه ساعت نشسته برخاستم و به غمکده معاودت کردم ، بعد دو روز که دوباره (....) بیت افتاد ، دو روز و یک شب صحبتها ماند و پرس و جوها بمیان آمد ، حال مقدمه مفصل گفته (......) دل نه داده که بدان خرسند توان گشت و ناامیدی نیز نه بخشیده که از سر ایں کار توان گذشت (......) "۔

" جہان بے مہر و گیتی دشمن و دلدار مستغنی مرا بر آرزو ہائے ثانی خنده می آید" ۔

" آشفتگی بخت (.....) باید دید " ۔ " مرگ (۱) نواب احمد بخش خاں بہادر به سمع اقدس رسیده باشد " ... " ہر چند انہدام پیکر عنصری نواب نفس مقدمه را چنانکه سود ندارد زیاں ہم ندارد ، اما از خود رفتهٔ ایں دو کیفیت باشم ، یکی آنکه ... دست گدائی پیش برادران دراز کردن ، دیگر آنکه مسرتے که بعد از فتح متصور بود ، باطل شد ، یعنی انتقام از غاصب قوی کشیدن و در انجمنہا بدان ناز کردن ۔ خطا پوشر عیب پوش من سلامت ، بندهٔ تازه خریدهٔ جناب را ... دو لغزش واقع گشته ، یکے اینکه غزلے که از بنارس فرستاده ام و مطلع آن اینست (۲) :

اے بصدمهٔ آہی بر دلت ز ما باری
ایں قدر گراں نبود نالهٔ ز بیماری

۱- " مرگ ...... کردن " نه یه عبارت پنج آہنگ میں ہے ، نه اس کے مطالب ۔ حذف کی وجه ظاہر ہے ، انتقام کی مسرت کے متعلق جو کچھ تھا ، اسے غالب چھپانا چاہتے ہوں گے ۔

۲- مطلع کے متعلق عبارت پنج آہنگ میں نہیں ، عبارت کی خامی عیاں ہے ، جو مطلع غالب نے بھیجا تھا ، وہ نہ تھا جو مجموعے میں ہے ۔

" اُمید که جناب مطلع مذکور را محو فرموده این مطلع را بدل ما یتحلل آن دو مصرع سازند - دوم اینکه قصیده که در مدح آغا میر گفته ام ، خدا میداند که برائے خاندان من طرفه داغ بدنامیست (۱) ، و لطف اینکه یکصد و ده شعر را از صفحه حک ساختن نمی توانم (......) نواب مرشد آباد نیز سید زاده است ، این قصیده را بنام وی شهرت دهم ، گو بملازمتش نارسیده (......) لیکن مداح بودن من بر همایون جاه را (کذا) بر من ناگوار نیست - توقع که تا زمانی که اشعار موضح اسم ممدوح را (...) آن قصیده را بکس ننمایند ، و عیب خردان را چون بزرگان بپوشند و نوازشنامه که (......) عنوانش باید که چنیں باشد ، شهر کلکته قریب چیت بازار در محلیا (کذا) بازار نزدیک تالاب کرد (کذا) (.........) بمطالعهٔ اسد برسد ، زیاده آرزوی مدمبوس حه (کذا) عرضه دارد - محمد اسدالله " -

[۷]

مکتوب الیه محمد علی خاں ہوں گے : آغاز " دو سه روز گذشته باشد که کتابتی از غمکدهٔ راقم رسیده بود " - یه مرسل ہے اور کچھ حال اس " داوری گه " کا مرقوم ہے - آج سنیچر یکم رجب ہے - ' کار فرما ' کا خط آیا ، ان کا ذکر سابق میں کرچکا ہوں - " فرستاده آمد " میرا " یار " چاره جوئی

۱- وجه یه نہیں که خاندان کی بدنامی ہوگی ، غالب قصیدے سے دوسرا کام لینا چاہتے تھے - اگر نظم باعث ننگ تھی ، تو مدحیه نثر بھی اس کا سبب ہوسکتی تھی ، مگر اس کی نقل محمد علی خان کو خود بھیج (خط ۱) ، اسے خاتمهٔ گل رعنا میں شامل کیا ، اور اس پر قناعت نه کر کے پنج آہنگ میں بھی رکھا - نواب مرشد آباد کے نام کا کوئی قصیده غالب کا نہیں ، اس لیے یه کہا جا سکتا ہے که ان کے نام قصیدے کو شہرت دینے کا اراده قوت سے فعل میں نہیں آیا - غالب کا صرف ایک قصیده - جس کے بعض اشعار سے واضح ہوتا ہے که لکھنؤ میں لکھے گئے تھے کلیات میں یه قصیده مدح نصیرالدین حیدر و روشن الدوله وزیر میں ہے ، کلیات کے قدیم خطی نسخے میں اس کا جو عنوان ہے ، اس سے صاف ظاہر ہے که قصیده بادشاه تک نه پہنچا ، بعد کو غالب نے مصلحتاً یه قصه گڑھا که پانچ ہزار روپے صله دیے جانے کا حکم ہوا -

سے غافل نہ تھا - مجھ پر مجھ سے زیادہ مہربان اور مجھ سے زیادہ قاعدہ دان ہے ' خط دیر سے لکھا تو اس لیے کہ کوئی خبر نہ تھی ' اور یہ خاموشی بھی " بغرور یکدلی و یگانگی " تھی - محمد اسد اللہ

[۸]

بنام ایضاً (بدون اسم مکتوب الیہ) : " حضرت قبلہ گاہی ولینعمی مد ظلہ العالی"- پرسوں منشی عاشق علی خاں بہادر کا خط آیا کہ تمہارے یہاں آرہا ہوں ' اس کے ساتھ آپ کا خط بھی ان کے نام کا تھا جس میں انہیں میری "خاکساریوں" سے آگاہ کیا گیا تھا - میں خود ان کے یہاں گیا ' ہر چند دفترخانے میں تعارف ہو چکا تھا (..) اور علی اکبر خاں کے یہاں اتفاق معانقہ بھی ہوا تھا ' لیکن (...) " نقش بکرسی بکرسی نشست " وہ " اہل وحدت وجود " کے مذاق کی باتیں کرتے ہیں -

[یہ خط جس میں اور باتیں بھی ہیں ، پنج آہنگ میں بھی ہے]

[۹]

بنام محمد علی خاں، بدون اسم مکتوب الیہ : " حضرت قبلہ گاہی" میں منشی عاشق علی خاں کے یہاں گیا تھا ، عنایتیں کیں، میں " ھذا من برکت البرامکہ" کہتا ہوا اٹھا اور گھر واپس آیا - چند روز بعد ، اتوار کے دن وہ میری غیرحاضری میں میرے یہاں آئے ' میں اس کی تلافی کے لیے ان کے پاس گیا ' نواب علی اکبر خاں بہادر ہوگلی میں ہیں - " وعدہ بود کہ ترا خواہم ماند (...) یاد نکردہ اند -گزارش جناب قبلہ گاہی وابستہ بزبان حضور است ، غالب کہ پس از فراغ امور شادی (...) " ولایت حسن صاحب پھر دورے پر گئے ہیں - راجہ بنارس (...) ملازمت گورنرجنرل کی استدعا کی اور دربار عام قرار پایا ' " اما (...) میان نماند کس خبر نیافت یعنی بروز آدینہ چہار دھم فروری چون وقت برخاستن عملہ (...) صاحب سکرتر کہ من از بندگان اویم ، بنائب میر منشی کہ در غیبت میر منشی کارروائی میکند (......) اہل بار صلا باید زد کہ روز دو شنبہ روز بار است (...) شبانہ کتابتی شعر این ماجرا بمن فرستاد ، فردائے آن شب دو شنبہ بود خود را بملازمت صاحب (...) رسانیدم و تمنائے ملازمت کردم و پذرفت ... نام برادر صف اصحاب الیمین (......) دھم بر کرسی اعتبار نشاند " - نمبر (۱) راجہ ہوت (بھوپ ؟) سنگھ "جانشین راجہ

بیان سنگھ عظیم آبادی (...) از بدر اوست (؟) " - تیسرا نمبر سفیر شاہ دھلی ، ۵ سفیر شاہ اودھ ، ۶ وکیل ھمایوں جاہ ، ۷ وکیل جودھپور ، ۔ وکیل جیپور ، ۸ وکیل راجہ نیپال ، ۹ اکبر علی خان ـ خوش قسمتی کہ ایسے شخص کی بغل میں جگہ ملی جیسے میں نے سب " اعیان بنگالہ " میں سے چنا تھا - مگر وہ شریک نہ ھو سکے - میں نے " منعم " کی عنایت دیکھی ، خلعت کی آرزو کی ، کچھ سوچ کر بولے کہ اتنی تھوڑی مدت میں بھی غنیمت ھے ، تمھارے چچا کو کبھی خلعت نہیں ملا ، میں یہ نہیں کہتا کہ کبھی نہیں ملے گا ، مگر اس کے لیے معاملے کو کونسل میں پیش کرنا ھوگا - مطمئن رھو کہ وقت رخصت خلعت گرانمایہ با ضمیمہ خطاب بہادری جس کی تمنا کی ھے [مگر اس سے قبل خطاب کا ذکر نہیں] پیش گاہ لارڈ صاحب سے دلواؤں گا - دوشنبے کو حاضر دربار ھوا - میں نے نواب گورنر کو دو اشرفیاں نذر پیش کیں ، علی الرسم معاف کی - " توقف نمودہ و نیازمند یہای مرا (...) پرورش و عنایت داد و عطر و پان بدست خود عنایت فرمودند " (...) دھلی و سفیر شاہ اودھ وکیل نواب مرشد آباد نے اپنے موکلوں کا شوق بیان کیا ، کہا کہ میں خود ان اضلاع میں پہنچتا ھوں - اس سے قبل " زبان زد عوام " تھا کہ نواب گورنر (............) و مجموع افراد عملہ کونسل " ھندوستان " جائیں گے - اب ثابت ھوگیا کہ سفر متیقن ھے - سوال یہ ھے کہ کونسل ساتھ جاتی ھے یا نہیں ، پہلی صورت میں مجھے بھی جانا پڑے گا ، مولوی فضل حق کا خط جو " خط خانگی " کے ساتھ دھلی سے آیا ھے ، عرضداشت کے ساتھ جاتا ھے - ۱۰ فروری مطابق ۱۳ شعبان -

[۱۰]

بشرح صدر : " حضرت قبلہ گاھی ... " کل ۳ رمضان اور روز دو شنبہ تھا - " زاویہ نشینان وطن " کا ایک خط ملا کہ ۵ شعبان کو تمھارا مقدمہ " داخل کواغذ مسل " ھوا - ھر چند کہ یہ بات سمجھ میں نہ آئی ، لیکن اس سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ عرضداشت پیش ھوئی - غالب کہ اسی ھفتے کارفرما یا وکیل کا خط آئے جس سے حالات معلوم ھوں - نواب سید علی اکبر خاں بہادر کو " کاروبار شادی " سے فراغت ھوئی ، دربار میں حاضر نہ تھے ، اس لیے میں نے خط لکھا اور جویائے حال ھوا ، جواب آیا کہ طبیعت ناساز ھے ، میں عیادت کو گیا ، انھیں " عارضہ رنگ گردہ " تھا ، ظاھر ' مادہ ' کم تھا ،

جلد صحت ہوگئی ۔ کامل پانچ دن وہاں گزار کر کل گھر واپس آیا تو " پاسبان کاشانہ " نے مکتوب دہلی دیا جس کا مضمون اوپر درج ہے ۔ (.......) مقدمۂ بھگوانداس میں کہ اس سے قبل دریافت کر چکا ہوں کہ روپے اسی قدر (.....) "بھگوانداس رسانید و...... آن قبلہ سہو در تحریر فرمودہ بودند ۔ اما در باب بیع کتب (... ..) رنگی از معاملہ داشت ...... زحمت تحریر بر انامل مخدومی (... ..) روا داشتم چنانچہ رقعۂ مرقوم بہ ستحط خود شان در نورد عرضداشت بنظر خواہد گذشت "۔ خبر ہے کہ برسات میں نواب گورنر کونسل اور عملے کے ساتھ ہندوستان جائیں گے اور تین سال ضلع میرٹھ دارالسلطنت قرار پائے گا ۔ اس صورت میں " وابستگان کونسل " وکلا ہوں ، یا اہل داد ، سب ہم سفر ہوں گے ۔ مجھے یہاں تاب اقامت نہیں ، مگر سر و برگ سفر کہاں ؟ مقدمے نے کوئی صورت اختیار کی ہوتی تو سرکار سے قرض مانگتا ۔ " یا خود آن بودی که حضرت ...... در پیچتاب اجارہ فرونماندہ بودندی تا کارمن رونق ... .. گرفتی و دریں باب سگالش نرفتی "۔ مگر یہ شکل ہے ، نہ وہ ، کیا کہوں میری کیا کیفیت ہے ۔ کاش نواب ذوالفقار بہادر کو اس کی توفیق ہو کہ امین کرن سے ہزار روپے اور دلوادیں ۔ جی میں آتا ہے کہ نواب کے نام اس مضمون کی ایک عرضداشت آپ کے پاس بھیجوں کہ آپ پڑھیں اور مرزا اوزبک جان برادر کوچک مرزا مغل بیگ کو کہ میرے بھائی اور قوت بازو ہیں ، اچھی طرح سمجھادیں کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیں ۔ " قبل از مرگ واویلا " اس لیے ہے کہ اس رستخیز میں صرف چار ماہ کی دیر ہے اور وہ گروہ جس کا میں حاجت مند ہوں ، سخت بے پروا ہے ۔ تہی دستی کا حال یہ ہے کہ رمضان آگیا ہے اور توبہ ختم ہو گیا ہے ۔ اگر شعبان میں لارڈ صاحب کی ملازمت نہ ہوتی تو رمضان اچھی طرح کٹتا ، لیکن روپے انعام " عملہ و خدمہ سکرتری و گورنری " میں صرف ہوئے ، ہر چند کہ اس میں صرف بھی فراخدستی و کشادہ دلی نہ تھی ۔ چار پانچ ماہ کی اقامت کے لیے اسی قدر کافی ہوگا ، جو پہلے عنایت ہوا تھا ۔ امید ہے کہ آپ یہ رقم روانہ فرمائیں گے ۔ " و در باب آخروی تاملی بسزا فرمودہ شود "۔ اسداللہ ، ۳ رمضان سہ شنبہ ۔

[۱۱]

بشرح صدر : " حضرت قبلہ گاہی ... " دربار وغیرہ کا حال لکھ چکا ہوں ، اور یہ بھی کہ روپے کس طرح فراہم ہوں ۔ آج پنجشنبہ ۱۲ رمضان

ہے ، ایک خط ''پا شکستگان وطن '' کا آیا ہے ، ہر چند کہ لکھوانے والوں کا '' مذاق آگہی '' خام ہے ، اور نویسندہ سلیقۂ اظہار مدعا نہیں رکھتا ، اتنا معلوم ہوا کہ وہاں کی ' داوری گاہ ' میں مقدمہ 'روبکار' ہوا اور ' فرماندہ' نے اپنے کار پردازوں کو جستجو (...) پر مامور کیا - یقین ہے کہ چند دنوں میں وکیل یا ' کارفرما ' کا خط آئے - رسیڈنٹ ۲ شعبان کو دھلی پہنچا ، ۵ کو 'داد نامہ ' ' داد گاہ ' میں گزرا ، اور یہ خط جو اب جاتا ہے ۱۹ شعبان کا ہے - مصلحت ہے کہ آپ منشی محمد حسن کو ایک دوستانہ خط لکھ کر حالات معلوم کریں - ' کار فرما ' ذرا ' کاهل قلم ' ہیں اور یہ '' غرور یکدلی '' کی وجہ سے ہے ، ورنہ ان کی دوستی کا کئی بار امتحان ہو چکا ہے - رات ایک غزل کہی ہے ''چوں مطلع آن... داشت طراز خامۂ عبودت نامہ'' ہوتا ہے :

لذت عشقم بفیض بے نوائی حاصل است
آنچناں تنگست دست من کہ پنداری دل است

۱۳ رمضان پنجشنبہ پھر (عمہ) کا خط جو دھلی سے آیا ہے ملفوف ہے ، پڑھنے کے بعد چاک کر کے سپرد آب و آتش ہو -

[۱۲]

قبلہ گاھا ، جان بیلی جو اعظم و ارفع اجزائے کونسل ہیں ، برھا گئے تھے ، کلکتہ آ گئے - لارڈ ہنٹنک گورنر شکار کو پورب گئے تھے آج واپس ہوں گے - ایک ' معتمد ' کہتا تھا کہ ' اچانک ' واپسی ہوئی - راجہ اودت سنگھ بنارس ایک جماعت کے ساتھ جاھمندانہ وارد کلکتہ ہیں ، مشتہر یہ کیا ہے کہ جگن ناتھ جاتا ہوں، لیکن دراصل اس لیے آئے ہیں کہ صاحبان نے ان کی عملداری کے لیے جو نیا قانون بنایا ہے ، وہ اس پر راضی نہیں ، وہ اس کی تبدیلی چاہتے ہیں - اور یہ بجا بھی ہے کہ اس سے ان کی سطوت فرماں روائی کی بربادی ہے ، مگر قانون بدلنے کا نہیں - اگست میں گورنر مع اعیان کونسل و اشخاص دفتر خانہ عازم ہندوستان ہوں گے اور وہاں کے معاملات وہیں طے ہوں گے - داد خواہ لکدکوب رسیڈنٹ و ایجنٹ سے بچیں گے - اوائل فروری میں ایجنٹ لا محالہ دھلی پہنچ گئے ہوں گے - صاحب سکرتر کو مجھ سے التفات تام ہے ، بسبیل مطائبہ کہتے تھے کہ اب آپ لوگوں کو رزیڈنٹ سے ایمنی ہے ، جناب لارڈ صاحب ہر مقدمے کا خود فیصلہ کریں گے - مولوی ولایت حسن خان

دورے سے واپس آکر دو چار دن کے بعد پھر گئے - مجھے بعد کو خبر ملی ورنہ ان کے پاس جاتا - علی اکبر خان طباطبائی سا صاحب دل بنگالہ میں نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ " گرامی گوہر " کس کان کا ہے - ہگلی سے آتے ہیں تو میرے یہاں ضرور آتے ہیں - " (......) ایں دیار از راہ حسد با من در افتادہ بودند " - انہوں نے میری مدد کی - ان کی چھوٹی بیٹی کی شادی درپیش ہے ، مجھ سے فرما گئے ہیں کہ میں طلب کروں تو ایک ہفتے کے لیے میرے یہاں آکر رہو - اس کا منتظر ہوں ، ظاہرا ابھی تاریخ مقرر نہیں ہوئی - ان کے دو رقعے ملفوف ہیں کہ آپ ان کی خاکسار نوازی سے آگاہ ہوں -

[۱۳]

" قبلہ گاہی ... " - جمعہ ۲۹ ربیع الاول تھی کہ مولوی ولایت حسن کا آدمی ان کا اور آپ کا خط لایا - آپ کی اور آپ کے بھائیوں اور عزیزوں کی خبر معلوم کر کے خدا کا شکر بجالایا - مولوی صاحب کے خط میں ہے کہ دوسو روپوں کے تین قطعہ نوٹ " مطابق زبان ایں دیار " آپ کے ارشاد کے بموجب مرسل ہیں - حیرت ہے کہ آپ کے خط میں اس کی طرف اشارہ نہیں ، اور یہ بھی بدیہی کہ یہ آپ کے ایما کے بغیر نہیں - ایک صورت یہ کہ آپ نے انہیں میری " پرورش " پر مامور کیا ہے ، یہ ہے تو اس کا ادا کرنا ضرور ہے ، خواہ آپ ادا کریں یا میں خود - دوسری یہ کہ روپے آپ کی طرف سے ہیں ، " کاروبار اجارہ " میں آپ کو جو نقصان ہوا ہے ، اسے دیکھتے ہوئے ، ضمیر پراگندہ ہوتا ہے ، لیکن "چوں حاجت خود را قوی تر و خودرا درماندہ تر می نگرم، در قبول آن (...) " اگرچہ یہ جانتا ہوں کہ " پیچتاب تقاضائے سرکار " میں روپے بھیجنا آسان نہ تھا - حق یہ ہے کہ یہ روپے نہ آتے تو سخت مشکل کا سامنا ہوتا - اب " ابن السفر والا قامت " تردد نہیں ، اس لیے گھوڑا ۱۰۰ میں بیچ دیا - ایک سائیس اور ایک خدمت گار کو برطرف کر دیا ہے ، اور تین خدمت گار اور ایک کہار اس وقت میرے پاس ہے - اور میں خود آدھا آدمی ہوں ، اس لیے کہ اور لوگ دن بھر میں کم از کم دوبار کھاتے ہیں (...) بیع اسپ کے بعد پچاس روپے صرف میں آئے ، سو روپے باقی تھے ، فکر تھی کہ جاڑا آگیا ، کمل وغیرہ کی ضرورت ہے ۔ آپ کی دستگیری نے اضطرار سے رہائی دی - قیمت اسپ ساز و برگ سرما کی فراہمی اور ربیع الثانی کے چار ہفتوں تک کے کام آئے گی اور دو سو روپے

غرۂ جمادی‌الاول سے غرۂ رمضان تک وفا کریں گے ۔ اس لیے کہ پچاس روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہ کرنا طے کر لیا ہے ۔ پانچ مہینوں میں اگر مقدمہ انفصال کے قریب آیا تو ممکن ہے کہ سرکار سے قرض مل سکے ۔ خدایگانا آج " کواغذ مقدمہ " دھلی بھیجے ہوئے بیالیسواں دن ہے ۔ اب تک جواب نہیں آیا ۔ اس ڈاک میں خط تلف نہیں ہوتے ، مکتوب‌الیہ " ہمدمان یکدل" سے ہیں ۔ اس انتظار میں ہوں گے کہ مقدمے کی ہدایت ہو جائے تو خط لکھیں ۔ میر کرم علی کے نام کا خط ملفوف ہے ، انھیں طلب کر کے مطالب سمجھا دیں کہ انھیں " دخل فکر الہامی " کی ضرورت نہ پڑے ، ان کا جواب بھی اپنے خط کے ساتھ روانہ فرمائیں ۔ " برادران و عزیزان و نور چشمان " کو ماوجب ۔

[۱۴]

'قبلہ گاہا' منگل ۲۷ رجب کو ایک خط بھیجا ہے " بر (......) یکشنبہ بود کہ بریدی از بریدان ڈاک رسید " اور ربوبیت نامہ وصول ہوا ۔ " تا عنوان ... گشودہ شد نظارہ فروز رقمی موسومہ مخدومی (...) دام شوکتہ کہ در نظر جلوہ کرد چوں میدانستم کہ جناب ممدوح تشریف آوردہ بودند و باز رفتند ناگزیر نیاز نامہ (...) جناب میر صفات علی خان صاحب رقم زد ، و آن گرامی نامہ را در وی نوردیدہ بملازمی دادم تا بہ اثالی بخدمت میر صاحب موصوف (...) ھنوز برندۂ آن نامہ معاودت نکردہ بود کہ آدم ... مولوی ولایت حسن صاحب رسید و منشور سرفرازی (...) نوک خامۂ جناب ولینعمی درنورد عنایت نامہ جناب ممدوحی بمن رسانید ... نوازشنامۂ جناب (...) قبلہ مرقومۂ بیست و نہم جنوری کتابتی بود کہ ملفوف مکتوب لالہ کالجی مل سمت ترسیل یافتہ بود ، بندہ خود در تفقد نامہ ازیں عبارت کہ (...) عرضداشت از جانب تو رسید ، یکی را جواب پیش ازیں فرستادہ ام ، حیرتی برداشتہ بودم کہ کدام پاسخ بمن رسیدہ ، اکنوں پردہ از روی کار افتاد کہ ایں ھماں عنایت نامۂ موعود است "۔ بہر حال یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب دورے سے پھر واپس آ گئے ہیں ۔ " ناکامی روزگار گذشتہ " کی تلافی کی اور ان کے پاس گیا ، اس وقت انھیں کے یہاں ہوں اور یہ عرضداشت آپ کے پاس بالذا بھیجنے کے لیے انھیں حوالے کی ہے ۔ نواب علی اکبر خاں کے یہاں شادی میں شرکت کے لیے گیا تو آپ کا پیام ان تک پہنچاؤں گا ۔ محمد اسد اللہ ، ۴ فروری چہار شنبہ ۔

[۱۵]

قبلہ گاہا ، روز ورود کلکتہ سے اس کا خوگر ہوں کہ مہینے میں دو بار آپ کا

خط آئے ، لیکن اس بار دو مہینوں سے خط نہیں ملا - صحت کا کیا حال ہے ، اور معاملہ اجارہ دیہائے سرکار کی کیا کیفیت ہے ؟ دھلی سے خط آیا ہے کہ کواغذ مرسلہ پہنچے ، کارفرمائی (...) ہنوز وکالت سے قوت سے فعل میں نہ آئی تھی کہ داور دورے پر چلے گئے ، ان کا انتظار ہے - یہ مجھ پر مجہول ہے کہ وہ جب تھے تو کارروائی کیوں نہ ہوئی - پانچ ماہ سے صاحب سکرتر کے سلام کو نہ گیا تھا لیکن ''یوم عید یوم الاکبر'' آیا تو ناچار جانا پڑا (...) شکایت کی اور وعدہ لیا کہ بعد ہفتہ عشرہ ان کی خدمت میں پہنچا کروں - میں خدا سے چاہتا تھا (...) اور نہ جانا شرم ناواقفیت حال مقدمہ کی وجہ سے تھا - مقدمے کے متعلق گفتگو ہوئی - ''انداز و ادا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ '' اہالی کونسل (...) فائدہ سرکار کہ درضمن مشاهرۂ پنجاه سوار که بحساب هزار روپیه ماهوار وجه بیست و چهار سال به سهه لک روپیه میرسد ، .... امید تو ہے کہ کامیابی ہو - منشی ولایت حسن صاحب دورے پر گئے ہیں - جان بیلی صاحب ''اعظم و ارفع صاحبان کونسل '' ہیں اور زمانۂ سابق میں گورنر بھی رہ چکے ہیں ، برھما گئے ہیں ، اور ہنٹنگ صاحب گورنر شکار کے لیے پورب گئے ہیں ، خبر ہے کہ دو ہفتوں میں واپس ہوں گے ، ایک ہفتہ گزر چکا ہے - مولوی عبدالکریم میر منشی دفتر خانۂ فارسی آٹھ ماہ کی رخصت پر بعبور دریا عازم لکھنؤ ہوئے ہیں ، اور عظیم آباد تک پہنچ چکے ہوں گے - '' از نوادر حالات آنکه سخن فهمان و نکته رسان این دیار پس از ورود این خاکسار بزم سخن ترتیب داده بودند که در هر ماه شمسی ، انگریزی به یکشنبهٔ نخستین سخن گویان و سخن فهمان در مدرسهٔ سرکار کمپنی فراهم شدندی ، و غزلها خواندندی و شنیدندی - نا گاه سفری که از طرف پادشاه هرات حرسها الله تعالیٰ عن الآفات رسیده است ، در آن انجمن حاضر گردید ، اشعار پارسی گویان این گرامی ...... شنید ، مرا بیانگ بلند ستود ، و گفت قدر این کلام را در هندوستان که خواهد دانست ؟ آنچه تو میگوئی درخور آنست که فصحائے ایران این را بشنوند ، و حظ بردارند - دیگر رو بجماعت کرده گفت یاران این شخص درمیانهٔ شما مغتنم است ، و قطع نظر از شعر و شاعری عالم زبان پارسیست - چون طبائع بالذات مفتون خود نمایسیت ، حسد بردند و کلانان انجمن و گرانمایگان (...) اعتراض نادرست برآورده آن را بنام بعضی از سفها شهرت دادند ، جوابها یافتند ، و پس بزانوای خاموشی نشستند (...) دام اقباله درین داوری بامن همزبان بود ، و شوریدگان را بحسن ادا فرونشانده چنانچه فقیر

(...) عرض عجز و انکسار خویش رقم کردہ است ، و باوجود اظہار ایاز جوابہای اعتراض نیز موزوں ساختہ (...) غالب کہ بغالب طبع نیز ریختہ شود " آیندہ جائے گی ۔ میر کرم علی کے نام کا خط جاتا ہے ۔ محمد اسداللہ ، ۴ رجب ۔

[۱۶]

والا نامے کے جواب میں عبودیت نامہ غرہ ذی الحجہ کو مرسل ہوا ، آج اس ماہ کی آٹھویں ہے ۔ کل مولوی ولایت حسن آئے تھے ۔ بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ " حضور لامع النور نواب معلی القاب نواب ذوالفقار بہادر دام شوکتہ " کا شقہ میری پانچ عرض داشتوں کے جواب میں موصول ہوا ۔

[۱۷]

قطعہ ہنڈوی جو بعد تفتیش شاہ جوگ نکلی ، حوالہ مولوی ولایت حسن ہوئی ، اور دو سو روپے جس میں سے "وجہ ... چہل روزہ" (.......) وصول ہوئے ۔ سنیچر ۲۷ شوال کو منشی عاشق علی خان بہادر میرے یہاں آئے ۔ افسوس کہ وہ سفارت سے مستعفی ہو گئے ہیں اور دو ہفتوں سے 'بارگاہ' میں نہیں جاتے ، بطور خود یہاں مقیم ہیں ۔ دوران گفتگو میں بولے کہ منشی محمد حسن دہلی پہنچ گئے ہیں اور اپنے خدمات پر مامور ہیں ۔ ۲۸ شوال کو وکیل کا خط دہلی سے آیا ، اس کے ساتھ نوازش نامہ مہری ریذیڈنٹ بنام احقر تھا ۔ اس کی ہو بہو نقل یہ ہے : " خانصاحب مہربان سلامت ۔ بعد شوق ملاقات واضح باد کہ خط آں مہربان در خصوص اظہار مطالبات با دیگر کاغذات مصحوب پنڈت ہیرا لعل وصول نمودہ مندرجہ چہرہ ایضاح گشود ۔ مہربانا دریں مقدمہ بحضور اعالیان کونسل صدر حسن ترقیم یافت ، بعد ورود جوابش بداں مہربان سمت تسطیر خواہد یافت ، مرقومہ ہفدہم اپریل " ۔ دوشنبے کے دن جو روز بار وکلا ہے ، دفتر خانے گیا ، ریذیڈنٹ کا خط دکھایا ، خداوند بارگاہ نے کہا کہ کوابروگ (کذا) صاحب کو یہاں سے 'جواب با صواب' گیا ہے ۔ 'با صواب' خود ان کی زبان کا لفظ ہے ۔ یہ بھی بولے کہ رزیڈنٹ کی نظر عنایت آپ پر ہے اور قریب ہے کہ ان کی تحقیقات کی رپوٹ یہاں آئے ۔ کل کہ روز سہ شنبہ اور ۳۰ شوال تھی خطوط لکھتا رہا ، آج آپ کو لکھتا ہوں (...) ۔

[۱۸]

بیکساں پناہا ، دو ماہ سے زیادہ ہوا کہ خط نہیں آیا ، مولوی ولایت

حسن سے 'استشعار' ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی منتظر خط ہیں ۔ عرضی کونسل میں پیش ہوئی ، ابھی جواب نہیں ملا ۔ '' تازہ '' یہ کہ مقدمہ صاحبان کونسل نے قبول کیا ، لیکن یہ کہا کہ قاعدے کے مطابق پہلے رسیڈنٹ دھلی کے پاس پیش ہونا چاہیے ۔ میں نے کہا کہ '' سر و برگ سفر و تاب و توان معاودت '' نہیں ، تو جواب ملا کہ وکیل کے ذریعے سے یہ کام انجام دو ۔ وطن کے ایک دوست سے رجوع کیا ، اس نے '' کارفرما '' ہونا منظور کیا اور ایک وکیل مقرر کیا ، میں نے مختار نامہ مع دیگر کاغذات دوست کو جو مجھ سے زیادہ مجھ پر مہربان اور مجھ سے زیادہ قاعدہ دان ہے ، بھیج دیا ہے ۔ '' تا درمیانہ خواستہ' کرد گار چیست '' کامیابی کی امید تو بندھتی ہے ۔ پسر احمد بخش خان جو ان کا جانشین ہے ، رندانہ زندگی بسر کرتا ہے ، اور اس کی شوریدہ وصفی '' حکام و اهل القوم '' کے نزدیک ناستودہ ہے ، شہری بھی اس کے اختلاط سے نفور ہیں ۔ ایک امیر کلکتہ کی مہربانی سے ایک صاحب عالیشان نے کولبروک صاحب کے نام تو خط لکھ دیا اور وہ دھلی گیا ، لیکن کوئی آدمی جو التفات حسین خان منشی کولبروک کو سفارشی خط لکھ سکے ، یہاں نہ ملا ۔ '' التفات حسین خان (......) مولوی عزیز اللہ نام بزرگیست '' اگر آپ سے اشنائی ہو تو براہ راست انہیں خط لکھ دیں کہ مقدمہ' اسد اللہ خان جو بتوسط ہیرا لعل وکیل دائر ہوا ہے ، '' این جانب '' کا مقدمہ ہے ، اگر آپ سے واقفیت نہ ہو تو حکیم سلامت علی خان سے ان کے نام کا خط لے کر دھلی بھیج دیں ، یہاں ہرگز نہ آئے ، اس میں دیر ہوگی ۔ ایک خط بنام مرزا امیر بیک خان نواب ذوالفقار بہادر دام اقبالہ ملفوف ہے ، اسے دیکھ لیں اور مکتوب الیہ تک پہنچا دیں ۔ محمد اسداللہ ۔

[۱۹]

'' حضرت قبلہ گاهی ... '' والا نامے میں القاب ہیں '' قبلہ' مہجوران سلامت '' یہ مغز جان کے لیے نشتر ہے اور مدت العمر یاد رہے گا ۔ عرض‌داشت جو اخوی مولوی ولایت حسن کے خط کے ساتھ ملفوف ہے ، میرے سوز سینہ کی پردہ کشا ہوگی ۔ '' اگر بفرزندی مہر نمیدارند ، غلامی خریدہ انگارند و خواهی نخواهی بتلافی 'قبلہ' مہجوران سلامت ' القابی کہ دست آویز نازش این ننگ افرینش تواند بود رقم فرمایند '' :

گر تو مرا نخواهی من خویش را بسوزم
جائے کہ آب نبود روزی کے یاد باشد

'' لختے بنیروی ازو پارہ بسعی نظر ، رپورٹ فرمائندہ دہلی با ضمیمہ حکم ... '' حاصل ہو گئی ہے اور اس خط کے ساتھ مانوف ہے ۔ مکتوب وکیل ابھی دہلی سے نہیں آیا (...) لیکن مضمون صفحہ راز سے خبر ملتی ہے کہ '' درنگ مکتوب وکیل مبشر است بہ تندر (؟) ہفتہ گذشتہ (..) —

۵۰۴م روپوں کی ہنڈوی اکبر آباد سے آئی ، روپے وصول ہوئے اور جواب اکبر آباد (...) ، ابھی تک آپ کے عطیے میں سے کچھ باقی ہے ، اور قبل '' خرامش کاروان کونسل '' کامیابی کا اُمیدوار ہوں ۔ خاطر جمع رہے کہ اب ایسا اضطرار نہیں کہ اہالی بزم نواب کے آگے بگدائی ہاتھ پھیلاؤں ۔ امید ہے کہ اس جماعت سے اس معاملے میں گفتگو نہ کریں مگر اسے اس راز کا محرم بھی نہ بنائیں ۔ منشی عاشق علی خان یکم ذی الحجہ کو براہ دریا کلکتہ سے روانہ ہوئے ۔ جہت سفر مجھے معلوم نہیں ۔ حکیم نفر علی خان جو اشراف نفض آباد سے ہیں ، ان کی جگہ عہدہ سفارت پر لکھنؤ سے آئے ہیں ۔ مولوی عبد الکریم رخصت ہشت ماہ پر لکھنؤ گئے تھے ، واپس آ رہے ہیں اور عظیم آباد تک پہنچ چکے ہیں ۔ غالباً اس مہینے کے آخر تک یہاں آجائیں گے ۔ منشی محمد حسن دہلی پہنچ کر اپنے عہدے پر قائم ہیں ۔ نواب علی اکبر خان بہادر کاشا کاشی حکام سے فارغ ہیں اور '' انشاب وآثر '' آم بھیجتے رہتے ہیں ۔ اسد اللہ

[۲۰]

عنایت نامہ ملا ، حسب الارشاد مزار کثیر الانوار جناب اقضی القضات پر جانا ہوا ، مکتوب اسمی میر کرم علی سے معلوم ہوا ہوگا ۔ خط لکھنے میں دیر تساہل سے نہ تھی ، چاہتا تھا کہ کوئی قابل تحریر امر ہو تو لکھوں ۔ گرامی نامے کے وصول ہونے کے بعد عرض داشت جناب بیگم صاحبہ و قبلہ (...) '' ۔

ایک دوست نے راہنمائی کی اور دولت سرائے مخدومی مرحومی میں اپنا لیا ۔ پہلے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا ۔ '' بیاد عہد (.) و لختی بر بیکسی خویشتن گریستم '' عریضے کو حرم سرا میں بھجوایا ۔ مولوی غلام علی مجھے حرم سرا میں لے گئے اور بیگم صاحبہ نے بے توسط پردے کے پیچھے سے بات کی ۔ آپ کا حال پوچھا ، میری کیفیت دریافت کی ، اور یہ کہا کہ میرے

بھانجے مولوی ولایت حسن موجود نہیں ، وہ آئیں گے تو آپ کے پاس جائیں گے اور اس گھر میں آپ کے ٹھہرانے کا انتظام ہوگا۔ بازار سملا شہر اور بارگاہ حکام سے دور ہے۔ اس کے بعد جناب ، خدومہ ممدوحہ کے در دولت پر حاضر نہیں ہوا ، اور میر ولایت حسن ابھی تک دورے سے واپس نہیں ہوئے ۔ ایک " معتمد " صبح کو کہتا تھا کہ آج آئیں ۔ گے آج سہ شنبہ ۱۲ شوال ہے ۔ میں کاغذات کی نقل کی فکر میں رہا ، یہ دشوار نظر آیا تو اس سے در گزرا اور ان کواغذ کو خصوصاً اور دفتر سرکار کو عموماً مقدمے میں بطور ثبوت قرار دیا ۔ ایک عرض داشت مشتمل بر ماجرائے بیست سالہ لکھی ، دو شنبہ ۱۳ تاریخ کو روز دربار ہے اور مجموع سفرا و وکلا و اھل بار اس دن فریزر صاحب سے ملتے ہیں ۔ ان کے پاس پہنچا ۔ یہ ایک صاحب عالیشان ہیں اور اس درگاہ کے " بواب " بلکہ بمنزلہ باب ہیں ۔ وہ کل اھل حاجات اور صاحبان کونسل کے درمیان واسطہ ہیں ۔ عرائض پہلے انھیں کے پاس پہنچتے ہیں ، اور وہ ان کا انگریزی ترجمہ صاحبان کونسل کو پیش کرتے ہیں ۔ میں مع عرض داشت موسومہ نواب گورنر بعد اطلاع ان کے پاس پہنچا ۔ اٹھے اور معانقہ کیا ۔ میں نے مجملاً حال بیان کیا ، نصراللہ بیگ خان ، میرے چچا کا نام سنا تو بولے کہ میں انھیں جانتا ہوں ، آپ ان کے کون ہیں ؟ میں نے جواب دیا کہ ان کا حقیقی بھتیجا ہوں ۔ عرضی گریبان قبا سے نکال کر پیش کی ، رزیڈنٹ کی خدمت میں عدم ارجاع کا عذر قبول ہوا ۔ فریزر صاحب کو اختیار ہے کہ اگر کسی مقدمے کو کونسل کے قابل نہ سمجھیں ، خود جواب دیں ۔ وقت رخصت عطر و پان اپنے ہاتھ سے دیا اور تمام قد کرسی سے اٹھ کر میرا سلام لیا ۔ ان امور کے وقوع کو احیائے اموات سمجھتا ہوں ، جو ہوا ہرگز گمان میں نہ تھا ۔ (...) مرزا یوسف دیوانہ سرشار تھے ، سراپا برہنہ رہتے اور ماں کو ماں نہ کہتے (...) ۲ رمضان کو ان کا خط ملا ، القاب و آداب ہوش مندوں کی طرح لکھتے ہیں ۔ خوشی سے زار زار رونے لگا ۔ اس کے بعد " خط خانگی " دیکھا تو لکھا تھا آپ کے جانے کے بعد ہم سب ڈرتے رہتے تھے ۔ اور دن رات ان کے نالہ و فریاد اور زدوکشت سے بری طرح گزرتے تھے ۔ ایک سرکار شاہی کا فیلبان ایک خادمہ محل کے ذریعے بہم پہنچا ، وہ کہتا ہے کہ میرزا پر جادو ہوا ہے ۔ اس کے کہنے سے شہر کے باہر ایک درخت کی جڑ کھو دی گئی اور ایک کنواں ڈھونڈا گیا ، اس نے جو کچھ بتایا تھا ، وہاں ملا ۔ اس کے

معالجے سے انھیں قدرے افاقہ ہے ۔ چنانچہ کپڑے پہنتے ہیں ، ہر عورت کو چھپاتے ہیں ، بول و براز سے احتراز کرتے ہیں ، کھانا دسترخوان پر کھاتے ہیں ، اور زن و دختر و مادر کو زن و دختر و مادر سمجھنے لگے ہیں ۔ '' باللہ صحت او را گرامی تر از زندہ گشتن پدر مردہ دانستہ ام "۔ امید ہے کہ آپ اسے اپنا فرزند سمجھ کر مسرور ہوں گے ۔ میر کرم علی صاحب کو بھی اس کی اطلاع ہو ۔

گر کسے شکر حق فزون گوید
شکر توفیق شکر چون گوید

[۲۲]

۲۹ ذیقعدہ روز جمعہ تھا کہ ربوبیت نامہ وارد ہوا ۔ دل بہت پریشان تھا اور میں آپ کی کرامت پر ایمان لایا ۔ ۲۰ رمضان کی دوپہر تھی کہ آپ کا پہلا خط لے کر ایک دوست کی رہنمائی میں فاتحہ خوانی کے بعد ، بیگم صاحب کے یہاں پہنچا ۔ کچھ لوگ جو اس در دولت کے متوسل تھے ، مجھ سے پرس و جو کرنے لگے ، ہر چند میں نے کہا کہ اس سفر میں مولوی محمد علی خان صاحب سے پہلے پہل ملا ہوں ، مگر قبول نہ کرتے تھے ، اور مجھے آپ کا رشتہ دار سمجھ کر اندیشہ کرتے تھے کہ میں خصومت کے لیے آیا ہوں ۔ بعد کو مولوی غلام علی برادر زادہ' بیگم صاحبہ آئے (...) '' ہر چہ گفتند یکی از آن مفہوم کتب (کذا) و تردد در ارسال آن بود بنوعی کہ ما میخواستیم بفرستیم ، و برندہ بہم نمی رسد '' ۔ میں نے جواباً کہا کہ یہ خط تک مشکیں رقم کی تراوش ہے ، مجھے زحمت کیا ہے ، اگر حصول کتب کا طریقہ بتایا جائے تو میں انھیں اپنے پاس رکھ لوں گا ، اور وقت معاودت حوالے کردوں گا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتابیں '' یکایک '' نہ دیں گے ۔ مولوی ولایت حسن اوائل شعبان میں دورے سے واپس ہوئے ، آپ کا خط بیگم صاحبہ کی خدمت میں پہنچاؤں گا ، اور جو بات پہلے کہی تھی ، پھر کہوں گا ۔ علی اکبر خان ہگلی میں ہیں ، تین بار وہاں گیا ہوں ، اور وہ بھی ایک بار جب کلکتہ آئے تھے تو میرے یہاں تشریف لائے تھے ۔ کافر ہوں اگر دہلی سے کلکتہ تک ایک ، '' معمر امیر '' اس ''لطافت طبع ، نزاکت ادا ، حسن بیان ، فہم درست اور مشرب صاف '' کے ساتھ دیکھا ہو ۔ یہ '' مہذب '' بھی ہیں اور '' مہذب '' بھی، مگر مولوی محمد علی خان کہاں کہ میرے سے شخص کے

کام آئیں ۔ آب و ہوائے کلکتہ مجھے سازگار ہے ، شدت گرما میں ناریل کا تازہ پانی '' باضافۂ قند و نبات '' مفید ثابت ہوا ۔ آج کل برسات کا موسم ہے ، میں نے اس کا استعمال ترک کردیا ہے ۔ عوارض بدنی کی شکایت نہیں ، بلکہ یہاں دہلی سے بہتر ہوں ۔ افضل بیگ '' از یاران و معاشران و ہم صحبتان راقم '' یہاں وکیل اکبر شاہ ہیں ، ان کی اور منشی عبدالکریم کی دوستی ہے ، بلکہ دونوں ایک ہی جگہ رہتے ہیں ۔ افضل بیگ خواجہ حاجی کے سالے ہیں ، اور یہ وہ شخص ہے جسے احمد بخش خان نے میرے چچا کا رشتہ دار بتا کر میرا شریک قرار دیا تھا ، اور میرے مقدمے میں ایک درخواست یہ بھی ہے کہ اس کی شرکت غلط ہے ۔ افضل بیگ مجھے مجمع اہل تسنن میں رفض و غلو اور اسامیہ میں الحاد و زندقہ (......) لیکن اس سے میرا کچھ نقصان نہیں ہوا ۔ '' وقت ملاقات فریزر صاحب چہ رنگینیہا از مولوی عبدالکریم سر زدہ بود ، اما اعجاز بیں این اضطراب را نازم کہ فریزر صاحب با من در ملاقات و مشایعت بجا آورد ، و معانقہ و عطر و پان را کہ اعم و اضعف ازانست کہ می پرسد ''۔ پہلی ہی صحبت میں عرضداشت لی گئی ، اور مطابق قاعدہ حوالۂ پائن صاحب ہوئی ۔ ان کا کام فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرنا ہے ، فریزر صاحب ترجمے کا اصل سے مقابلہ کر کے کونسل میں پیش کرتے ہیں ۔ گذشتہ دو شنبے کو میں ان سے ملنے گیا تو ادائے تعظیم و پرسش مزاج کے بعد انھوں نے ترجمہ دکھا کر کہا کہ مقابلہ کر چکا ہوں ، اور اب یہ صاحبان کونسل کے پاس پہنچے گا ۔ تمھارا حق سرکار پر ثابت ہے ، اور اہالی سرکار کو حق دار کا حق دلانے میں محابا نہیں ۔ کونسل میں عرائض کی پیشی کے لیے پنجشنبہ اور جمعہ مقرر ہے ، آج جمعہ ہے ، شاید عرضداشت کونسل میں پیش ہو چکی ہو ۔ اندریو اسٹرلنگ صاحب '' قوس عروجی کونسل '' کے لیے '' نقطۂ ہدایت '' اور '' قوس نزولی '' کے لیے '' نقطۂ نہایت '' ہیں ۔ سنا ہے کہ سرمایۂ علم و آگہی رکھتے ہیں ، سخن فہم ہیں اور لطف سخن تک پہنچتے ہیں ۔ میں نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس میں کچھ اپنا حال بھی نظم کیا تھا ، بغیر کسی دوسرے شخص کی سعی کے ان کی ملاقات '' بردلش گزیدہ '' میسر آئی ۔ '' اعتبار خاکساریہا افزود ، و امید کامیابی (......) '' قصیدہ پیش کیا ، اور اس کا کچھ حصہ سنایا ، محظوظ ہوئے اور دلجوئی کی ۔ '' وعدہ ہا داد و کاغذ ہائے مقدمہ مرا (...) '' اس کے بعد پھر ملنا نہیں ہوا ۔ فریزر صاحب ان کے

پیشکار و پیشدمت ہیں - کچھ مقدمے رجوع کونسل کے ایے جمع ہو جاتے ہیں تو '' فریزر صاحب (......) داد خواہان بوی عرضہ میدارند و او بآن مدعیان فراخور انداز و مقدار ہر یک ملاقات میکند'' قابل سماعت اور ناقابل سماعت مقدموں کو جدا کرتے ہیں - اس وقت '' نوید پر نوید '' ہے - افضل بیگ نے ایک بات اور کی ، شعرا میں شہرت دی کہ غالب ، قتیل کو نامزا کہتا ہے ، اور شعرائے کلکتہ کو نظر میں نہیں لاتا - '' ہمہ را بر من بشورانید ، و خلق را با من معارض گردانید''- مولوی عبدالکریم کے ایک رشتہ دار نے خاص طور پر میری تذلیل و تحریب کی غرض سے '' انجمن بنا نہادہ و مشاعرہ قرار داد'' - شعرائے ریختہ کو مصرع ریختہ ، شعرائے فارسی کو مصرع فارسی ، اور مجھے دونوں بھیجے - یکشنبہ گذشتہ ۸ جون کو میں بھی گیا ، اور دونوں زبانوں کی طرحی غزلیں پڑھیں ، خاص و عام متلذذ ہوئے - اور منصفین کے ایک گروہ نے کہا کہ '' ہرکرا این مایہ فصاحت ، قتیل چہ بلاست ؟ بل اگر برگذشتگان دگر چون امیر و بیدل و امثال اینہا ناز کند ، میرسدش و می زیبدش'' خدا کا شکر کہ جس ہنگامے کی غرض میری رسوائی تھی ، وہی باعث شہرت و اظہار کمال ہوگیا - آب و ہوائے کلکتہ سے خشنود ہوں ، اگر مقدمے کا آغاز اچھا نہ ہوتا تو آج میں حیدرآباد یا ایران میں ہوتا ، ہرگز یہاں نہ رہتا ، اسپ و متاع بیچ کر قلندرانہ آوارگی اختیار کرتا - امید نے یہاں اقامت کی قوت بخشی - '' مخفی نخواہد بود کہ فقیر بچہ بے سروسامانی از وطن (......) خانہ را پاک رفتہ ، و ترک وطن و اہل وطن گفتہ ، چو در باندا رسیدم دو ہزار روپیہ از نواب (.....) خرابی دادہ - ما خود اندیشیدم کہ غالب ایں ہمہ غنیمت است - کروبرد (کذا) اگر مقدمہ بہ کلکتہ نخواہد شد (......) رخت قلندری ببر خواہی کرد و سرتاسر آفاق خواہی گردید ' (......) یک ماہ بودہ پارہ از باپستنیہای زمستان گرد آوردم و ...... کلکتہ رسیدم روز ورود (......) شش صد بود ، شعبان و رمضان و شوال و ذیقعدہ گذشت ، اینک ذی‌الحجہ رسیدہ است (.....) از فلک نرہزد تا دو ماہ دیگر از فکر روزی فارغم - توقع موہومی بدستگیر بہای نواب داشتم ، اما (......) چہ ہرگاہ نامہ بجناب فرستادہ ام ، اول مکتوبی بخدمت نواب و دیگر اخوان و احباب خط جدا (......) اگر بخدمت پنج عریضہ رسیدہ اند ، در آن انجمن نیز پنج عریضہ رسیدہ اند ، اما صدای بر نخاستہ ''- حتیٰ کہ مہر کرم علی نے '' اتنی کوچک دلی و کرم خولی '' کے باوجود

جواب نہ دیا ۔ خیال تھا کہ ہزار روپے اور قرض مانگوں ، لیکن امید کا وجود موہوم ہوگیا ۔ ذرا آپ تنہائی میں میر کرم علی سے دریافت توکریں کہ نواب اور ان کے مقرب میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ۔ مقدمے کا حال ان سے پنہاں نہیں ، کوہ و کاہ کا مقابلہ ہے ۔ اگر نواب کی مدد رہی تو ''دود از نہاد احمد بخش خان و ہوا خواہانش برمیآرم ۔ ہرگز لطفی نکرد و لانعمی نگفت '' ۔ آپ تحقیق کر کے ان لوگوں کی خاموشی کی وجہ لکھیں ۔ ''فرصت دو ماہ آں قدرہا نیست ، ناچار ہم ازینجا ویرانۂ خود را بکاوم...... ہرچند دو ماہ را روزان و شبان بسیار است ، اہل توکل (...) اگر ہمہ در وعدۂ قتل یک شب درمیان باشد نمیترسند ، اما بشریت اقتضای ذاتی دارد کہ آدمی را گاہ در تصور ماضی افگندد و صور مستقبلہ را بر ضمیرش ارتسام میدہد ورنہ درحقیقت ماضی و مستقبل جز حال نیست ، و حال خود نقطہ ایست موہوم کہ از گردش فلک فرض کردہ اند و ہمچنان گردش افلاک نیز کیفیت از عالم وہم و خیال ، لا موجود فی‌الوجود (...) و از موثر فی‌الوجود الا اللہ '' ۔

[۲۳]

تین ہفتے گزرے کہ پنج شنبے کے دن مولوی ولایت حسن آئے اور بولے کہ بر سر راہ ہوں اور دورے پر جا رہا ہوں (...) جسر جاوں گا ۔ دروازے تک مشایعت کی اور خدا کے سپرد کیا ۔ وقت رخصت کہنے لگے کہ میر صفات علی خان (...) میرے دوست (...) '' جانشین و وکیل '' ہیں ، خط بھیجنے کا طریقہ وہ بتائیں گے ۔ آپ کو خط کا انتظار تھا ، ان کے پاس آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ کل باندا سے خط آیا تھا ، جسر بھیجا گیا ، میرے نام کا خط اس کے ساتھ ملفوف ہوگا ۔ آج سہ شنبہ ۲۱ جمادی الاولیٰ ہے ، میر صفات علی خان کا آدمی آیا اور مولوی ولایت حسن کا خط لایا ، کھولا تو آپ کا خط نکلا ۔ ''پیش نگشتن مقدمہ در دھلی بتازگی دل را شورش‌کدہ ساخت ''۔ '' ارباب اربعۂ کونسل '' نے دھلی جانے کا حکم دیا تو میں نے مسٹر اندرو اسٹرلنگ سے فریاد کی ۔ جواب ملا کہ نہ جانا ہو تو نہ جاؤ ، مقدمہ وہاں بھیج دو ۔ مجھے تامل ہوا تو بولے کہ کیا سوچتے ہو ، مقدمہ قابل سماعت ہے ، کوئی وجہ نہیں کہ رزیڈنٹ نہ توجہ کریں ۔ اس سے دل کو اطمینان ہوا ۔ گھر آیا تو یہ فکر ہوئی کہ کسے یہ کام سپرد کروں ۔ دشمن '' جاہ مند ''

ہے ، کہیں وہ شخص اس سے نہ مل جائے ۔ آخر مولوی فضل حق ابن مولوی فضل امام کی طرف دھیان گیا جو منشی برکت علی خان مرحوم کے اقربا سے ہیں اور آج کل "سررشتہ دار دیوانی و فوجداری ضلع خاص دھلی" ہیں ۔ خدا انہیں زندہ رکھے اور پایہ ھائے بلند کو پہنچائے ۔ میں نے انہیں لکھا کہ وہ اس کام کو اپنے ذمے لیں اور وکیل مقرر کر کے مطلع کریں ۔ " بالجملہ من کواغذ مقدمہ با عرضی دستخطی کونسل و خط صاحب سکرتر کونسل کہ محتوی ایمای شمول رزیڈنٹ در مبادی مقدمہ بود برائے استواری بنائے مقدمہ و چٹھی صاحب عالیشانے بنام کولبروک صاحب و خط مخدومی نواب علی اکبر خان بہادر موسومہ منشی التفات حسین خان ، این مجموع کاغذ پارہ ھا را در ورقی نوردیدہ خود بڈاک خانہ رفتم و صاحب ڈاک و اھالی ڈاک را بر جمیع آن کواغذ گواہ گرفتہ و سرنامہ را در حضور آنان بلک فروبستہ ، چون وزن آن لفافہ گرفتہ شد بدہ روپیہ برآمد ، محصول ڈاک انگریزی برائے روانگی دھلی یک روپیہ سنک (کذا) بیک روپیہ میر سد ، دہ روپیہ محصول ڈاک سرِبسر گزاردہ ، و رسید ڈاک گرفتہ باخود آوردم"۔ یہ سہ شنبہ ۱۴ صفر کی بات ہے ، مولوی فضل حق کا خط آیا ، مضمون یہ کہ مختار نامہ مہری بے دستخط رجسٹری نہ بھیجا جائے ، اور جو مختار نامہ گیا تھا ، وہ رجسٹری کا طراز نہ رکھتا تھا ، فوراً اسٹامپ لیا ، مختار نامہ لکھا اور رجسٹری کرا کے روانہ کیا ۔ "چنانکہ سہ روز وانکی (کذا) این قطعہ چہارم ربیع الاول روز دو شنبہ است تا امروز کہ ھفدھم یا ھیژدھم جمادی الاول است (...) نہ خبری ازاں نامہ و اثری ازاں ھنگامہ پدیدنیست " ۔ چارہ گر کا یہ حال ہے ۔ بھائی دیوانہ ، تین پردہ نشین خواتین ، ان میں سے ایک کا شوھر نہیں ، دوسری کا شوھر ہے ، مگر وہ سالا ہے خواجہ حاجی کا ۔ "ھر آیینہ از وی وحشتی دارم(...) بفتوای خرد (...) لہ بدستوری وھم " ۔ تیسری کا شوھر سادات دھلی سے ہے ۔ ھر دانشمند (...) اقرار کرے گا کہ یہ شخص اھل جنت سے ہے ۔

آدم از خاک و سید از نور است
آدمیت ز سیداں دور است

اس میں صلاحیت نہیں ، اسے اس پر مامور کیا ہے کہ اخبار مقدمہ سے آگاہ کرتا رہے اور اکثر مولوی فضل حق کے پاس جاتا رہے ، لیکن اس کے جد امجد کے قربان کہ تین ماہ میں صرف ایک خط اس کا آیا ہے ، اور اس میں بھی کسی بات کی نوید نہیں ۔ انگریزی ڈاک کا خط تلف نہیں ھوتا ، خاص

طور پر جب صاحب ڈاک کی مہر ہو ۔ سخت پریشان ہوں ، '' منعم'' کے پاس بھی نہیں جاتا ، وجہ یہ کہ وہ مقدمے کا حال دریافت کریں تو میں کچھ نہ کہہ سکوں گا ۔ ' کارفرما ' کے متعلق کچھ شک نہیں ، ان کے تغافل کا البتہ شکوہ ہے ۔ جانتا ہوں کہ وہ اس خیال میں ہوں گے کہ مقدمے کا آغاز ہولے تو خط لکھوں ۔ '' و خط منشی محمد حسن ...... لامحالہ تاریخی یک ماہ پیش از امروز خواهد بود ، اگر بعد تحریر این قطعه مقدمه در پیش گردانده باشد عجب نیست '' ۔

[۲۴]

خط بتوسط اخوی مولوی ولایت حسن ملا ۔ ہنڈوی لے کر خود بازار گیا ، بالآخر اسے مولوی ولایت حسن کے سپرد کیا ، اور جیسا کہ عریضۂ سابق میں ہے ، رپے وصول ہوئے ۔ '' سخن اینست که مرا (...) گرانمایگی چہار صد [صد کے اوپر ہزار مرقوم] روپیه در نظر است ... چه من ناظر آن کیفیت و جدائیم که سراپائے دل را فرو گرفته و منشأ (...) با آنکه حق (...) خدمتی ندارم ، سیما در عالمی که خود به پیچ و تاب خسارۂ اجاره و رنج و تعب و مطالبۂ عوام پراگنده خاطر خواهند بود ... منت برمت طالع آوارگی ہائے خویشم که مرا در عرض این سفر متعمی و خداوندی دست بهم داده که مکرمت ہائے او جز رحمت ایزدی مشبه به ندارد هم ازینجاست که فارغ از تب و تاب ادای سپاسم ... مرا در مدت العمر خویشتن دو جا اتفاق نازش پدر خواندگی افتاده است ، یکی با میر ببر علی خان مغفور و دیگر با حضور مکرمت ظہور ، حقا که هر دوجا آثار عطوفت پدری باستیفا معاینه کردم ، جناب مغفور نیز پس از روزی چند شیوۂ تحرر گردانده و در القاب سهیم و انباز اخوی مخدومی میر وارث علی خان ساخته بودند ، ایدون از جناب چشم دارم که بدین القاب یاد نشده باشم و بخطابی که برائے مولوی ولایت حسن و دیگر عزیزان موضوعست سرفراز گردم .....

خرسندیٔ غالب نبود زین همه گفتن
یک بار بفرمای که اے هیچ کس ما

حالت استغنائے برادران ... (...) التفات نواب صاحب بحال این آوارۂ رنج و محن آشکار شد ... فرسانده دهلی که در مکتوب اسمی من اشاره باطلاع

ثانی صدر (...) کہ مقدمہ مرادر نظرش استواری پدید آمد ، و کواغذ عہد جرنیل لیک صاحب آنچہ در دفتر رسیڈنٹی (...) صدر طلبید ، و اجازت تحقیقات ایں مقدمہ بتجدید از صاحبان کونسل گرفت چنانکہ نواب گورنر بہادر (..) کونسل فرمان تحقیق و تشخیص وجوہ تنظام مسائل باضافہ لفظی کہ آن ترجمہ آن معنی زود و شتاب بر میخیزد (...) و کواغذ عہد جرنیل صاحب فرستادند و ایں معنی مرا بہ تک و دو بسیار معلوم گشتہ چنانکہ نقل رپورٹ فرمانده دھلی با حکمی کہ ازینجا صادر گشتہ بجنسہہ "ہ" بکف آوردہ ام و ... مسٹر اندرو اسٹرلنگ بہادر هر آنچہ گفتند هو بہو بودہ نست (کذا) بلکہ از انداز بیان خدیو حق پژوہ چنان می تراوید کہ گویا زمان رسیدن رپورٹ ثانوی نیز قریبست"۔ حقیقت جو معلوم هوئی یہ ہے " بعد رحلت عم مرحوم بیست هزار روپیہ سالانہ در وجہ پرورش باز ماندگان و لوکری سوارانش بر احمد بخش خان .. گردیدہ... بالجملہ دو هزار روپیہ سالانہ در وجہ تنخواہ پنجاہ سوار است ، و دہ هزار روپیہ سالانہ کفاف ...... میراث خوار" - ۳۰ هزار رپے جو میں سمجھتا تھا ، غلط نکلا ۔ انداز و ادا سے معلوم هوتا ہے کہ حکام کو زر نوکری سواران کی طرف التفات نہیں اور میرا اس میں گھاٹا نہیں ، میں خود اس سے باز آچکا هوں ۔ " گویا اهالی سرکار سواران منظور دارند خواهی از احمد بخش خان و خواهی از نصراللہ بیگ خان ، اما ایں دہ هزار روپیہ نقد است در مستقبل و مطابق قوانین سرکار وصول باقیات سنین ماضیہ نیز بدیہیست" ۔ تحقیقات اب دو باتوں کی هوگی ، ایک میری اور میرے 'شرکا' کی 'بازیافت ' جاگیر احمد بخش خان سے میں نے جو کچھ پایا ہے وهی بتایا ہے ، اور مدعا علیہ بھی اس کے خلاف نہیں کہہ سکتا ۔ دوسری خواجہ حاجی کا معاملہ ، دیکھیے اس باب میں رزیڈنٹ کی کیا رائے هوتی ہے ۔(...)" بخواجہ حاجی و پسرانش رسیدہ اگر در وجہ پرورش مجرا نخواهد شد هفت هزار روپیہ سالانہ (...) تا امروز میباید ، و بالفرض اگر برعایت تحریر سرکار گو همہ خلاف نمائی احمد بخش خان (...) نیز محسوب گشت ، پنج هزار روپیہ سالانہ من ابتدائے سنہ ۱۸۰۶ ع لغایت سنہ ۱۸۲۱ ع بذمہ خصم واجب (...) " امید تو ہے کہ کامیابی هو ۔ میر کرم علی کے خط کا جواب لکھیں آتا " استخبار رویہ آن بظهور آمد جواب یا سکوت منافاتی ندارد "۔ آیندہ خط مولوی ولایت حسن کے توسط سے نہیں ، اس پتے سے بھجیں : سملا بازار گول تالاب حویلی میر احمد ۔ مولوی ولایت حسن آج کل یہاں نہیں هیں ۔ دو تین دن میں "عدم آباد" دهلی سے اگر کوئی خبر آئی تو

اسی دن پھر خط لکھوں گا ، اور اس کے ساتھ میر کرم علی کے نام کا بھی خط ہوگا۔ جواب نوازشنامہ اس کے ورود کے دن ہی جا رہا ہے۔ سہ شنبہ ۱۷ یا ۱۸ جمادی الاولیٰ۔

[۲۰]

''قبلہ خواهم یا پیمبر یا خدا یا کعبہ ات اصطلاح شوق بسیار است و من دیوانہ ام''۔ 'ربوبیت‌نامہ' ملا۔ اپنا ایک شعر نذر ہے ''خرسندی' غالب الخ''۔ نامہ اسمی مولوی ولایت حسن ان کی '' خدمت رفعات درجت '' میں پہنچا دیا گیا۔ نواب علی اکبر خاں کے نام کا خط، وہ ائیں گے تو انھیں دوں گا۔ ان کا خط آیا تھا کہ بعد عشرہ' محرم کلکتہ آؤں گا اور تم سے ملوں گا ، آج ۸ محرم ہے۔ مخدوم واجب‌التعظیم مولوی عبدالکریم واپس آگئے ، مولوی ولایت حسن کہتے تھے کہ بعد عشرہ دورے پر جاؤں گا۔ '' ظاهرا شیوع فتنہ' قوانین جدیدہ هنوز فرصتی میخواهد۔ صدر نشینی کہ هنوز فرمانرواست ندانم کہ چہ درد سر دارد و چہا میکند۔ شنیدہ میشود کہ هم انجمنان وی از کربزیہائے وی ستوهند و در مخالفتش با یکدیگر گروہ ... گویند اهل سعایت یا ارباب درایت بکونسل رسانیدند کہ فرماندهان اطراف بطریق نذر رہ آورد ارمغان کہ از اقسام رشوت است هزارها و صد هزارها ... میستانند فرمان .. فرستادہ آمد کہ رسم نذر و پیشکش باطل و ارمغان و رہ آوردگو همہ سبدی از فواکہہ و طبقی از نبات باشد موقوف ... بدیں سبب منع رشوت ستانی حکام نتوان کرد ... همت بلندان این قوم ... جز تواضع از خلق نخواستندی ... از تلخی این حکم رو در هم کشیدہ اند ... و باعتقاد فقیر حق بجانب آنانست۔ چہ ابن حکم چارہ' درد رعیت لکرد و هیچی بحال حکام رسانید بالجملہ چوں قہرمان ['' فرمان '' چاهیے] رسم نذر بر افتاد''۔ اس بارگاہ کی رسم تھی کہ عیدین اور روز بزرگ کے موقع پر کل و دلا اور اهل بار (...) '' دادگر مستر اندرو استرلنگ بہادر نذر پیش میکشیدند اگرچہ پذرفتہ نمیشد اما نغز رسمی و نیکو (...) '' عمل میں نہ آئی۔ غالب نے رباعی لکھ کر گزرانی ... بہت خوش ہوئے اور بولے کہ '' زهی نذر مخلصان (......) نہ منع میتوان کرد و نہ معاف ''۔ رباعی '' سرتابسر دهر باغ و بستان تو باد الخ''۔ حیرت یہ ہے کہ معاملات تنقیح طلب صرف دو ہیں ، مگر ابھی تک دھلی میں اس مقدمے کی طرف فرمان دہ دھلی کو توجہ نہیں۔ اواسط اپریل میں یہاں سے حکم جا چکا ہے ، و دہلی کی تحریر اس پر مشعر ہے کہ ۱۰ جون = هفتم ذی‌الحجہ تک کچھ

پرسش نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سے ۸ محرم تک کیا ہوا، مجھے علم نہیں۔ تہی دستی سے امنی ہے، اور کلکتہ کی آب و ہوا بھی مقابلۃً دہلی سے سازگار تر ہے، لیکن "...... رپورٹ فرمانده دہلی و عیار حکم صدر مقتضی درنگ نیست"۔ آپ منشی محمد حسن سے دریافت کریں کہ حکم صدر، اور نامہ' ریزیڈنٹ اسمی غالب کے باوجود اب تک کچھ کیوں نہ ہوا۔ مدعا یہ کہ اگر وکیل لاابالی ہے تو اسے متوجہ کیا جائے اور حاکم محابا کرتا ہے تو صدر میں اس کی شکایت کی جائے۔ نواب کا خط آتا ہے، محض شوقیہ، کوئی مطلب کی بات نہیں، اسے جواب ہی سمجھیے۔ "تاریخ بنائے امام باڑہ در جوار مزار حضرت اقضی القضات" تاریخ مسجد نہ اسی امام باڑے کے صحن میں ہے۔
۸ محرم روز شنبہ۔

[۲۶]

"دریا بوجود خویش موجی دارد خس پندارد که این کشاکش با اوست"۔
۱۰ جون مطابق ۷ ذیحجہ تک باز پرس عمل میں نہ آئی تھی۔ اس کی وجہ کہ دشمنوں نے ریزیڈنٹ پر تہمتیں لگائی ہیں اور وہ بالفعل امور مرجوعہ کی طرف متوجہ نہیں۔ الزام سے بری ہوگئے تو توجہ کریں گے، ورنہ کوئی دوسرا شخص ان کی جگہ لے گا۔ سنیچر یکم اگست کو لارڈ صاحب کا دربار عام ہوا، میرا نمبر دسواں، نواب علی اکبر خان کی بغل میں تھا۔ اس کے بعد "نواب معلی القاب" کے "ہندوستان" جانے کی خبر شائع ہوئی، ستمبر میں دفتر خانہ براہ دریا جائے گا، اور آخر اکتوبر میں لارڈ صاحب ڈاک یا دخانی جہاز سے جائیں گے۔ دخانی جہاز اس 'فرقے' کے معترضات سے ہے۔ اور کشتی بار کلکتہ سے الہ آباد تک دو ہفتوں میں پہنچا ہے۔ خیال آیا کہ اس قافلے سے قبل روانہ ہونا چاہیے۔ "داور" سے رخصت ہو چکا ہوں۔ اور باندا تک کے لیے کشتی مل چکی ہے (......) وہاں سے براہ خشکی دہلی جاؤں گا۔ آج جمعہ ہے، کچھ سامان کشتی پر لد چکا ہے، شنبہ ۱۴ صفر مطابق ۵ اگست سے لے کر دو شنبے تک کسی دن روانہ ہو جاؤں گا۔ نواب علی اکبر خان نے آپ کے خط کا جواب دیا ہے۔ 'عرصہ' دو ماہ' میں باندا پہنچوں گا۔ آپ کا خط میری روانگی کے بعد یہاں آیا تو موافق قاعدہ آپ کے پاس واپس جائے گا۔ اگر کوئی خط دہلی یا کلکتے سے میرے یا آپ کے نام کا پہنچے تو بعد ملاحظہ محفوظ رکھیں۔ دہلی کا خط اخوی مکرمی مولوی محمد فضل حق کا ہوگا،

اور کلکتہ کا خط مخدومی مولوی سراج الدین احمد برادر زادہ مولوی عبدالکریم کا ہوگا ۔ یہ '' اعیان دفتر خانہ فارسی '' میں خود بھی شامل ہیں ۔

[۲۷]

''مربی بے کساں'' ۔ '' متاعی کہ در بار منست باشد کہ شایستہ قبول دزد نباشد '' ۔ نواب صاحب بھی باہر جا رہے ہیں اور سمت مخالف ، اس لیے باربردار کا انتظام مشکل ہے ۔ آپ شحنہ شہر کو جو مجھ سے نا آشنا ہے (...) کہوادیں کہ بنارس تک نہ ہو تو الہ آباد تک کے لیے اس کا انتظام کردیں ۔ مشہور ہے کہ پنجشنبے کا سفر مبارک ہے ، اس لیے کل روانگی کا ارادہ ہے ، یہ نہ ہو سکا تو جمعے کے دن ، علی الصباح حاضر ہوں گا اور شرف پابوسی حاصل کر کے رخصت ہوں گا ۔ خطوط آج عنایت ہوں ، تاریخ بداؤنی و رسالہ تصوف واپس ہے ۔ محمد اسداللہ ۔

[۲۸]

''حضرت قبلہ گاہی'' ۔ کلکتہ کے لیے خط جاتا ہے ، کسی نوکر کو حکم ہو کہ '' کدہ ڈاک '' تک پہنچادے ، اور '' محصول '' ادا کردے ۔ غالباً شب کو حاضر ہوں گا ۔

[۲۹]

صبح ہنگامے میں اور نیم روز خامہ فرسائی میں گزرا ، آخر روز '' نوید بساط بوس حضرت نواب '' ہے ، شب کو دھن الخروع (کذا) نمک آپ کے ساتھ پینے کا ارادہ ہے ۔ زندگی ہے تو کل صبح حاضر ہوں گا ۔ مکتوب موعود جاتا ہے ۔ میرا نوکر '' جادہ شناس و قاعدہ دان ڈاک کدہ '' نہیں ، خط دیکھ کر ، اپنا نوکر اس کے ساتھ کردیں کہ محصول دے کر رسید حسب دستور لے ۔ اسداللہ ۔

[۳۰]

'' اعلیٰ حضرت نواب صاحب قبلہ و کعبہ کونین مدظلہ العالی '' ۔ یکم جمادی الاول جمعے کو باندا پہنچا ، اور اسی دن (......) آپ کا خط ملا ۔ '' بے داور ماندن بزم آں داد کدہ (رزیڈنٹی) ... عیانست '' ۔ '' فرانسس ہاکنس بہادر جاہمندی از حکام اربعہ دائر سائر بہ دہلی رسیدہ ... شکار دوست و بے پروا خرام افتادہ است ، بدادخواہاں نمی پردازد ، و سر بسر کارہائے امروز بفردا می اندازد ۔ وای اگر (......) بہ دہلی رسیدہ باشم ، مصداق مضمون

' تاتو ہما میرسی مابخدا میرسم ' گردیدہ باشم " - خیال تھا کہ بنارس جاؤں اور قافلہ وہاں سے آگے بڑھے تو اس قافلے کی ' گرد ' بنوں ، لیکن عقل نے اس کا موقع نہ دیا - ۹ ماہ رواں کو عازم دہلی ہوں گا اور پایان ماہ تک وہاں پہنچوں گا - اگر ممکن ہو تو مسٹر ہاکنس کے نام کا ' سپارش نامہ ' اس ' قوم ' کے عمائد میں سے کسی کا روانہ فرمائیں - ہر چند ' حکم صدر عیار کامل ' ہے ، خط کی غرض یہ کہ ایک ' داد خواہ گمنام ' بے توجہی کا شکار نہ ہو - اگر کوئی صاحب جو مسٹر ہاکنس بہادر کا آشنا اور آپ کا یا آپ کے کسی دوست کا دوست ہو ، مل جائے تو " سپارش نامہ " بانداز مولوی محمد علی خان صاحب کے پاس بھیج دیا جائے - ۶ جمادی الاول چہار شنبہ -

[۲۱]

" جوہر جان گرامی فدای خاک پای حضرت قبلہ گاہی ولینعمی باد ، مدظلہ العالی "- سنیچر پہلی جمادی الثانی کو وطن پہنچا - لوگوں کا حال تباہ ہے - " حاکم معزول " گوشہ نشین ہے اور فرماں دہ حال لا آبالی ، ایک " اعادۂ جاہ " کا امیدوار ، دوسرا " بیم سرعت زوال دولت " سے پریشان - خبر ملی ہے کہ قافلہ بنارس تک پہنچ کر حسب الحکم کلکتہ واپس ہوا اور یہاں آنا ملتوی ہوا - میں نے مسٹر ہاکنس کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا ، " مطبوع طبع نکتہ داں " ہوا - "انجمنیاں با من حکایت کردند کہ ایں داور ... تا امروز از ہیچ یک از اعیان دہلی التفات و اختلاط نکردہ ، آری خلاف واقع نیست ، چہ روز نخستین ملازمت تا یک ساعت نجومی ہا (کذا) بخواندن قصیدہ و پرسیدن اخبار کلکتہ و باز جستن وجہ تظلم ملتفت ماند ... بزعم خویشتن سخن فہمست ، چہ خوش بودی اگر لختی معاملہ فہم و ادا شناس نیز بودی... در ماہ اپریل سنہ ۱۸۲۹ء رپورٹ مقدمۂ من از دہلی بصدر رسید و ہم در آں ماہ جوابش صادر گردید - اتفاق چناں افتاد کہ رسیدن حکم صدر و ہنگامۂ معزولی حاکم و پریشانی شیرازۂ اوراق دفتر ہمہ در یک جزو زمان واقع شد - رسیدگی بخت من ... خاص ہمان صفحہ را بے نام و نشان ساخت کہ طراز کامیابی غالب سیہ روز است - اہل دفتر ... ورق ہا گردانند و آں ورق دست بہم نداد - صاحب سکرتر رسیدنسی دہلی بمن میگفت کہ حالیا دریں مقدمہ بصدر نبشتہ ام و مثنای آن حکم...طلبیدہ "- بھائی کو جو افاقہ تھا ، وہ "رنگے از فنون جنون" تھا - عین الیقین ہے کہ مرزا یوسف جب تک زندہ ہیں ، بیمار رہیں گے - کہا

قسمت کہ آتشکدہائے یزد (...) و میخانہ ہائے شیراز تک نہ پہنچ سکا ، جنت البلاد بنگالہ ہی میں رہنا ہوتا ، مگر اس ''خارزار'' اور '' غولستان '' میں واپس آنا پڑا - واللہ در قائل : غالب چو ز دام کہہ بدر جستم من الخ - نواب اور دیگر احباب کو کثرت آشوب پریشانی سے خط نہ لکھ سکا ، اس خط کا ذکر نہ ہو ، ورنہ ان لوگوں کو شکایت ہوگی- ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۴۰ ہجری -

[۳۲]

'' حضرت قبلہ گاہی و اینعمی مد ظلہ العالی '' - ۴ جنوری دو شنبے کو '' فرماں دہ دہلی '' کا خط بنام جاگیردار فیروز پور روانہ ہوا ، مکتوب الیہ یہیں تھا ، اس لیے دیکھنے میں آیا - '' خلاصہ تحریر '' انہیں کے الفاظ میں :

'' چوں برائے تحقیقات مقدمہ دعوی محمد اسداللہ خاں حکم صدر عالی قدر اصدار یافتہ ، نقل عرضی خاں مرقوم ... حوالہ قلم محبت رقم میگردد کہ بفحوای مضمونش وا رسیدہ ، جواب شرحوار آن بزودی ارسال دارند'' -

ہنوز ریذیڈنٹی سے '' اجرائے حکم صدر '' عمل میں نہیں آیا ، لیکن ' داور ' کی طبیعت میں '' حیف و میل '' نہیں - '' حسن اتفاق اینکہ از اہل دفتر ہم کسی روشناس من نیست '' - '' دفتر خانہ '' کی بنارس سے واپسی ، اور '' سوہن داور '' ''روشناس حقیر '' کی آمد کا سال آیندہ پر موقوف ہونا محتاج بیان نہیں - مجھے رنج اس بات کا ہے کہ آپ کا خط نہیں آیا - قصیدہ جو مدح '' ناظم الملک مستر فرانسس ہاکنس بہادر ہیبت جنگ '' میں ہے ، نقل کیا جاتا ہے -

[اس کے بعد ۲۷ شعر (ایک شعر کی جگہ شعر ہفتم کے بعد خالی ، ممکن ہے کہ عکس میں نہ آیا ہو) شعر اول :

بافت آیینہ بخت تو ز دولت پرداز
جلوہ ہا ساز کن اے دہلی و بر خویش مناز

مصرع آخر دیوان میں یوں ہے :

ہلہ کلکتہ بدیں حسن خداداد بناز

اس کے بعد مجموعہ و دیوان دونوں میں چھ شعر یکساں ، شعر ہفتم دیوان '' فرصتت الخ '' مجموعے میں ہوگا مگر ضائع ، شعر نہم دیوان ، مجموعے میں یوں :

(...) بر خیال چمن کوئے او
بستہ بر دامن نظارہ ز فردوس طراز

دیوان میں مصرع اول اس طرح : " چارلس مٹکف فرخندہ شمائل کہ بدہر "۔ اشعار ۱۰ تا ۲۱ دونوں میں ایک طرح ، شعر ۲۲ مجموعے میں یوں ہے :

بندہ ام لیک دریں مرحلہ مہمان توام
کردہ ام طی بامید تو رہ دور و دراز

اس کا مصرع اول دیوان میں اس طرح ہے : " یاد باد آنکہ ازیں مرحلہ تا کلکتہ " ۔ شعر ۲۳ مجموعے میں کسی قدر مختلف طور پر :

گر نہ آوازۂ عدلت شدی آہنگ حدی
ناقۂ من ز رہ سعی نگردیدی باز

شعر ۲۶ کا مصرع اول مجموعے میں اس طرح : بیست (دیوان ' ہفت ') سالست کہ با یکدگر آویختہ ایم " ۔ اس کے بعد تا شعر ۳۲ دونوں یکساں ، اور ۲۰ شعر جو دیوان میں ہیں ، مجموعے میں نہیں ، قرینہ قوی ہے کہ مجموعے کا ایک ورق یا اس سے بھی زیادہ یہاں سے غائب ہے ۔ دیوان میں قصیدہ بنام سرچارلس مٹکف بہادر ۔]

[۲۳]

نقل رقعہ کہ جناب محمد اسداللہ خان صاحب عرف مرزا نوشہ بجناب نواب سید علی اکبر خان بہادر طباطبائی در خصوص فرمائش انبہ مفوضۂ خامۂ قدرت نگار فرمودہ و ھوھذا : " قبلۂ محمدیان آفاق سلامت ، ممدوح از ستایش مستغنی و مادح در بیان نارسا ، عرض نیاز فضولی و ابرام در اظہار شوق بد نما ، چہ باید گفت تا آبروی خموشی نریزد ، و چہ توان نوشت تا داغ کوتہ قلمی برخیزد ۔ ہمانا کہ ایں عبودیت نامہ قماش سلام روستائی دارد ، و دائرۂ ہر حرفش پرداز کاسۂ گدائی ۔ لختی شکم بندہ ام و قدری ناتوان ، ہم آرایش خوان جویم و ہم آسایش جان ۔ خرد پژوھان دانند کہ این ہر دو صفت بانبہ اندر است ، و اہل کلکتہ بر آنند کہ قلمرو انبہ ہوگلی بندر است ۔ آری انبہ از ہوگلی و گل از گلشن ایثار از جناب و سپاس از من ۔ شوق میسگالد کہ ہر آیینہ تا پایان

فصل دوسہ بار بخاطر خداوند خواہم گذشت و آز مینالد کہ حاشا بدین مایہ تمتع خرسند خواہم گشت :

گلویم تشنہ و خون (..........) ہے ساقی
بدہ نوشینہ داروئے کہ ہم آتش ہم آبستی

نخل مراد ہم بارور باد دھم ثمر افشان (...) دامان نگاہ و این بفرق درویشان ہوا خواہ "۔

[۳۴]

مخفی نہ رہے کہ میں کلکتہ پہنچا تو دھلی کے ایک " نکوھیدہ سیر " شخص نے جو یہاں پہلے سے تھا ، اور "ارباب دیوان داد " سے واقفیت رکھتا تھا، اس امر کو شہرت دی کہ ایک شخص نے جو دھلی سے ابھی آیا ہے ، اپنا نام و تخلص دونوں بدلا ہے۔ "اعیان بارگاہ را در اظہار اسم ابن ھیچمیرز بخداوند دفترکدہ تاسل رو [یہ لفظ نامکمل ، ممکن ہے کہ اس کے بعد ایک اور لفظ ہو جو ضائع ہو گیا] چار دیوان ریختہ کہ گرد آوردن آن را بیش از ھفت سال گذشتہ و معہذا مہری از مواھیر این روسیاہ کہ اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ نقش نگین و جلوۂ سال ۱۲۳۱ ھجری طراز دامن و آستینش بود ، بر خاتمۂ اوراق آن سفینہ رقم آخر ' زبان بندی اعدا داشت ' بخدمت سر حلقۂ افراد دفترکدہ بشہادت فرستادم ، و سوزسینہ را بدستیاری برگ گیاہ بر صفحہ بدین رنگ جلوہ دادم " :

" قبلۂ سعی ستمرسیدگان " ۔ " تفرقۂ اسم و علم" کی گفتگو آئی تھی۔ میں دو سو " فرسنگ " سے اس دادگاہ میں آیا ہوں ، نہیں چاہتا کہ میری نسبت یہ کہا جائے کہ ایک " مجہول الاحوال " شخص یہاں آیا تھا ، جو ہر سال نیا تخلص رکھتا تھا اور ہر ہفتے نام بدلتا تھا ۔ نقش خاتم خاتمۂ دیوان اور مقطع دیرین غزلیات دیدنی ہے ، اور مسکت مدعی ۔ میرا نام اسد اللہ خان ، عام مرزا نوشہ اور تخلص غالب ہے ، لیکن یہ کلمۂ رباعی ہے اور بعض بحور میں اچھی طرح نہیں آتا ، لفظ ' اسد ' کو جو مخفف "اسم " اور کلمۂ ثلاثی ہے، کبھی کبھی بطور تخلص استعمال کرتا ہوں ۔ " چشم دارم کہ داغ دنائت تبدیل اسم از دامن حال من بشویند و پس ازان ... بہر نامی کہ خوانند از من بسر دویدنست " ۔ مہر : اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ

" از واردات جناب سابق الالقاب من لوامع برقہ " ۔ میں کلکتہ آیا تو

بہت لوگ نکتہ چینی پر آمادہ ہوئے۔ " جمعیتی خاص از برائے پراگندگی ساختند ... بمہر باہم نشستند از ہر سو گرد آمدہ آں بزم را مشاعرہ نام نہادند و از تمہید این صحبت بر من منتی تمام نہادند "۔ صحبت دوم میں میں نے غزل کے دس بارہ شعر پڑھے، حکیم ہمام کے مقطع سے اس کی زمین معلوم ہوگی:

درمیان من و دلدار ہمام است حجاب
دارم امید کہ ایں ہم ز میان برخیزد

ایک ہفتے کے بعد خبر ملی کہ ایک " بے دانش " نے شعر ذیل:

جزوی از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موی کہ بتاں را ز میاں برخیزد

پر یہ اعتراض کیے ہیں: 'ہمہ' لفظ 'عالم' کے ساتھ جو مفرد ہے، درست نہیں۔ "چار شربت و نہر الفصاحت خبری از آن ندارد "۔ 'بیش' کی جگہ 'بیشتر' چاہیے۔ رستن موی بر کمر معشوق عقلاً [بعض الفاظ ضائع]۔ 'رستن موی و سبزہ' کو برخاستن سے تعبیر نہیں کرسکتے۔ اعتراضات و معترض کو میزان نظر میں تولا تو زحمت جواب کی ضرورت نظر نہ آئی، لیکن حق کی پاسداری [چند الفاظ ضائع] ناگوار گزرا اور صحبت سومیں میں اعتراضات کے جواب کا متعہد ہوا۔ اسی زمانے میں ایک 'گرانمایہ' شخص 'اعیان عجم' سے بطور سفیر آیا اور اس مشاعرے میں منتظمین کی استدعا سے شریک ہوا، دوسروں کے اشعار سنے، اور میری نوبت آئی تو باوجود نا آشنائی اپنے کو میرا مشتاق ظاہر کیا۔ ایرانی جو قبل سے کلکتہ میں موجود تھے، میری تعریف اس سے کر چکے تھے۔ اس نے کہا کہ آپ سب پر غالب اور اسم بامسمیٰ ہیں۔ مجلسیوں کو مخاطب کر کے اس نے کہا کہ اس شخص کی قدر کرو، شعر و شاعری سے قطع نظر، زبان پارسی کا عالم ہے۔ "ہم در عرض این گفتگو اشہب نطقم توسنی کرد، و در میدان داوری گرد فتنہ برانگیخت۔ چوں لب بپاسخ اعتراضات گشودم، سفیر ممدوح با من ہمزبان شد و مرا بیشتر ستودن و بر آناں خندیدن گرفت "۔ اساتذہ کے چند اشعار جو اس نے اس موقع پر پڑھے، ان میں سے حافظ، سعدی، ظہوری اور ایک استاد کا شعر مجھے یاد ہے:

گر من آلودہ دامنم چہ عجب
ہمہ عالم گواہ عصمت اوست (حافظ)

بجہاں خرم از آنم کہ جہاں خرم ازوست
عاشقم برہمہ عالم کہ ہمہ عالم ازوست (سعدی)

کم ازانم کہ در معذرتم باید زد
بیش ازانم کہ دہی خجلت تقصیر مرا (ظہوری)

از رخ خط مشک سود برخاست
آتش بنشست دود برخاست (استاد)

خاتمۂ صحبت کے بعد ، حاضر مندان (؟) آن بقعہ چہ شاعر و چہ غیر شاعر شوریدہ ترگشتند و رونق خویش در شکست من دیدند''۔ میرے شعر :

شور اشکی بفشار بن مژگان دارم
طعنہ بر بے سرو سامانی طوفان زدہ

پر یہ اعتراض کیا کہ ' زدہ ' مضاف الیہ چاہتا ہے ، جواب دیا گیا کہ 'زدہ' کا کسرہ اضافی نہیں ''یای وحدت'' (کذا) ہے ، تو دوسرا اعتراض کیا کہ ، ' زدہ ' جز بمعنی مفعول نہیں آتا ۔ اس کا جواب مثنوی میں ہے ۔ مخالفین میں سے ایک '' بزرگ '' نواب سید علی اکبر خان کے پاس گئے اور میری شکایت کی کہ آپ کا نیازمند اسد اللہ جلسوں میں شوخی کرتا ہے ، مغلوب الغضب ہے اور زبان دراز ۔ اسی صحبت میں جس کا ذکر آیا ہے ، میں نے کہا تھا کہ کوئی مخاطب صحیح اور پارسی‌دان مسلم نہیں کہ فیصلہ کرسکے ۔ ان بزرگ نے اس ' کلمۂ درد مندانہ '' کو اس طرح پیش کیا کہ یہ گویا سب کی توہین تھی ۔ نواب نے مجھے نصیحت کی اور سرزنش کی کہ یہاں سخن‌پروری اور شعر گوئی کے لیے نہیں آئے ، راہ دشوار ہے اور راہزن بہت ۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا کروں کہ اس کی تلافی ہو ۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ معذرت نامہ لکھو اور مجھے بھیجو کہ میں مخالفین کو دکھاؤں ۔ میں نے اسے قبول کیا ۔ مثنوی نظم کی ۔ اس کا آشتی نامہ نام رکھا اور ' ناصح محسن '

کو بھیج دی - [اس کے بعد مثنوی کے اشعار میں سے دیوان کا شعر ۱۰
مجموعے میں یوں ہے :

میہماں را نواختن رسم است
کار او نیک ساختن رسم است

دیوان کے شعر ۳۰ کے بعد ، شعر ذیل مجموعے میں زائد ہے :

اندہ خویش کردہ زار مرا
با سخن پروری چہ کار مرا

دیوان کا شعر ۴۸ " با بشوورید ... خیوی سری " مجموعے میں نہیں ،
اور بعد شعر ۵۹ دیوان ، مجموعے میں یہ شعر زائد :

رخ دعویٰ نہ برفروختمی
بے سخن ہمچو شمع سوختمی

شعر ۷۴ دیوان کا صرف ایک لفظ مجموعے میں ہے - اور اس کا امکان ہے
کہ اصلاً اس کے بعد ایک شعر رہا ہو ، جو اب محو ہے - شعر ۷۹ مجموعے میں
ذرا مختلف طور پر ہے ، مصرع اول کا بہت بڑا حصہ ضائع ، مصرع آخر یوں ہے :
" بہ خیال فقیر منلوبست " - اس کے بعد کے دو شعر ۸۰ و ۸۱ مجموعے سے
غائب ہیں - " کردہ ام ...... زدہ " " مگر ... غلط نبود " ، ان دونوں میں
سے ایک مجموعے میں اصلاً رہا ہوگا ، مگر اب اس کی جگہ عکس میں خالی
ہے - شعر ۸۹ دیوان " وعدہ ...... رفت " مجموعے میں نہیں - یہی حال شعر
۱۱۳ " زاہ ...... ہاشم " کا ہے - شعر ۱۲۹ دیوان ، کے بعد مجموعے میں یہ
شعر زائد :

پردہ سنجان پاستانی (کذا) را
طالب و سعدی و فغانی را

دیوان کا شعر ۱۳۶ " آنکہ ... واقف را " مجموعے میں نہیں ، شعر
۱۳۸ " دل ... احبابست " کی جگہ عکس میں سادہ ، یہ اصلاً رہا ہوگا -
شعر ۱۴۹ و شعر ۱۵۰ " پادشاہی ...... شگرف " " خامہ ...... فرمائش "
مجموعے میں نہیں - شعر ۱۵۰ کے بعد مجموعے میں یہ شعر زائد :

بوجود چنیں شگرف بیان
شکوہ دارد عجم ز ہندستان

مجموعے میں مثنوی کی وہی روایت کچھ اختلاف کے ساتھ ہے ، جو
دیوان فارسی میں ہے ۔ میں نے " باد مخالف کی اولین روایت " میں جس روایت
کا ذکر کیا ہے اور جو متفرقات غالب میں بھی ہے ، اس سے بہت مختلف ہے
اور یقین ہے کہ " ناصح محسن " کو وہی بھیجی گئی ہوگی ۔ سوال یہ ہے کہ
مجموعے میں جو روایت ہے وہ مرتب مجموعہ کو ان عبارات کے آخر میں ملی
تھی جو بعنوان " از واردات ...... برقہ " درج ہیں ، یا اس نے خود اضافہ
کی ہیں ، اور اس صورت میں یہ روایت کہاں پائی ۔ غالب سے یہ ناممکن
نہیں کہ انھوں نے مثنوی دو شکلوں میں کلکتہ ہی میں لکھی ہو ، ایک
شکل جسے میں نے 'روایت اولین' کہا ہے ، اہل کلکتہ کے لیے ، اور دوسری
باہر والوں کے واسطے] ۔

غالب کے متعلق چند غیر معتبر روایات

نادم سیتاپوری

غالب اپنی زندگی میں مقبول رہے ہوں یا نا مقبول — لیکن ان کی 'هشت پہلو' شخصیت اپنے عہد ہی میں مرکز توجہ بن چکی تھی - یہی وجہ ہے کہ ان کے 'دامن شہرت' میں گلوں کے ساتھ کچھ خار بھی سمٹ آئے ہیں جنھیں اگر روایت نگاروں کی خوش نیتی سے الگ کرکے روایت و درایت کے اصولوں پر پرکھا جائے تو یہ روایتیں اس میزان پر پوری نہیں اترتیں۔ میں صاحب 'آب حیات' کے کمال فن تذکرہ نویسی کا بھی معترف ہوں اور ان کی نیک نیتی کا احترام بھی کرتا ہوں، مگر اس کے باوجود 'آب حیات' کے ان کمزور پہلوؤں کو متوازن تنقیدی جائزوں سے محروم نہیں کیا جا سکتا جن کی زد سے شاید ہی کوئی تذکرہ نگار بچا ہو - اس سلسلے میں ''آب حیات'' کا یہ مشہور لطیفہ 'روایت بالمعنیٰ' کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، پھر بھی صاحب آب حیات نے اس کے سیاق و سباق کی یقیناً کوئی چھان بین نہیں کی اور اس عہد میں جس طرح سنا تھا، من وعن نقل کردیا۔

> ''مولوی فضل حق صاحب مرزا (غالب) کے بڑے دوست تھے - ایک دن میرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ ان (مولانا فضل حق) کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا مصرع پڑھا کرتے تھے:
>
> بیا برادر آؤ رے بھائی
>
> چنانچہ میرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا - ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب

(فضل حق) کی ' رنڈی ' بھی دوسرے دالان سے اٹھ کر پاس آن بیٹھی ۔ مرزا نے فرمایا ، ہاں صاحب ، اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے ۔

به نشیں مادر بیٹھ ری مائی '' (۱)

جہاں تک غالب کی بدیہہ گوئی کا تعلق ہے ، یہ لطیفہ ان کے کمال فن کا عکاس ہے ، مگر اس کے ساتھ ہی مولانا ' فضل حق کی رنڈی ' کا تذکرہ یقیناً درست نہیں ہے ، کیونکہ اس عہد کے سب سے بڑے ' منکر حقائق ' مرزا حیرت دھلوی نے اس واقعے کی تفصیلات میں مولانا فضل حق کی ' رنڈی ' کا ذکر نہیں کیا ہے ، حالانکہ یہ مرزا حیرت دھلوی وہی ہیں جنھوں نے حضرت شاہ اسمعیل شہید سے ' غلو عقیدت ' کی بنا پر ایشیا کے اس بڑے منطقی خاندان کی علمی عظمت سے انکار کر دیا تھا ۔ اگر انہیں مولانا فضل حق کی اس کمزوری کا پتا چل جاتا تو وہ ' آب حیات ' سے زیادہ بڑھا چڑھا کر اسے پیش کرتے ۔ مرزا حیرت نے اس لطیفے کو اس طرح نقل کیا ہے :

'' کسبیوں کا ناچ ہو رہا تھا اور میرزا نوشہ (غالب) تشریف لائے ۔ ان کے ایک بھائی نے جو ایک چھوٹی ریاست کے نواب تھے ، امیر خسرو کی ' خالق باری ' کا میرزا نوشہ کو دیکھ کے مصرع پڑھا :

بیا برادر آؤ رے بھائی

میرزا نوشہ نے بے ساختہ جواب دیا کہ دوسرا مصرع بھائی تم نے کس کے لیے رکھ چھوڑا ہے ۔ بی صاحبہ (یعنی طوائف) کی طرف خطاب کر کے پڑھ دو ۔ اس پر مجلس میں بڑا قہقہہ پڑا ۔ اور دوسرا مصرعہ ہے :

به نشیں مادر بیٹھ ری مائی''

(چراغ دھلی ، صفحہ ۳۰)

صحیح واقعہ کس طرح پر تھا اور کیا تھا — ؟ اس سلسلے میں تقریباً اسی عہد کی ایک روایت اور بھی ملتی ہے جو اس لحاظ سے قریب تر کہی جا سکتی ہے کہ اس کے نقل کرنے والے غالب کی حقیقی بہن چھوٹی خانم کے

۱۔ آب حیات ، ساتواں ایڈیشن ۱۹۱۳ء ، صفحہ ۵۲۸/۵۲۷

پوتے سرور جنگ(۱) آغا مرزا بیگ ھیں ، جنھوں نے کچھ زمانہ اپنے دادا (غالب) کا بھی پایا تھا اور پھر اپنی خاندانی روایات سے انھیں ایک خاص لگاؤ بھی تھا - سرور جنگ نے لکھا ھے :

''مرزا غالب کی مولانا فضل حق (خیر آبادی) سے کمال دوستی تھی - ھر شب کو معمولاً مرزا غالب مولانا (فضل حق) کے پاس جایا کرتے تھے - ایک شب کو مولانا جو سررشتہ دار ریزیڈینٹ تھے ، باھر صحن میں تخت پر بیٹھے ھوئے کچھ مسلیں دیکھ رھے تھے - ایک ' رنڈی ' بھی اس امر کی منتظر کہ مولانا دیکھ لیں تو سلام کر کے بیٹھ جاؤں ، کھڑی ھوئی تھی -

اس عرصے میں مرزا (غالب) لالٹین لیے آگے آگے پہنچے - مولانا (فضل حق) نے سر اٹھا کر کہا :

بیا برادر آؤ رے بھائی

۱- غالب کی حقیقی چھوٹی بہن ' چھوٹی خانم ' دھلی کے 'سبز پوش' خاندان میں مرزا اکبر بیگ بدخشی کو بیاھی تھیں - مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل) آن کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے اور سرور جنگ مرزا جواد بیگ کے سب سے بڑے بیٹے تھے - غالب کی انھیں بہن ، چھوٹی خانم سے ان کے تین بھانجے اور ایک بھانجی امانی خانم تھیں جو نواب علی بخش خان لوھارو کو بیاھی گئی تھیں - ان کی پوتی سکندر زمانی بیگم سرور جنگ کی اھلیہ تھیں ، اس کے علاوہ سرور جنگ کی ساس عزیزالنسا مرزا غالب کی حقیقی بھتیجی تھیں ، یعنی مرزا یوسف کی اکلوتی صاحبزادی - اس لحاظ سے غالب اور سرور جنگ میں تہری رشتہ داریاں تھیں - سرور جنگ کے والد اپنے پورے خاندان کو لے کر ۱۸۵۷ء میں سیتاپور چلے آئے تھے ، جہاں ان کے بڑے بھائی مرزا عباس بیگ مستقل طور پر رہ بس گئے تھے - سرور جنگ کی ابتدائی تعلیم سیتاپور اور لکھنؤ میں ھوئی ، پھر اس خاندان کا بڑا حصہ دکن چلا گیا - سرور جنگ نظام دکن آصف جاہ سادس کے استاد تھے - زندگی کے آخری ایام میں علی گڑھ آگئے تھے ، یہیں جون ۱۹۳۳ء میں وفات پائی - لاش دلی لے جائی گئی - اپنے خاندانی قبرستان ''مہندیوں'' میں آسودۂ خواب ھیں -

مرزا (غالب) نے کہا — دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجیے کہ
دیر سے (یہ) منتظر کھڑی ہے - دوسرا مصرع یہ ہے :

یہ نشیں مادر بیٹھ ری مائی" (۱)

یہ متضاد روایات اس حقیقت کی نشاندھی کرتی ھیں کہ غالب کی زندگی میں ان کا فن ھی نہیں شخصیت بھی ایک ایسی شہرت سے دو چار ھوچکی تھی جس کے پس منظر میں مشتبہ اور مشکوک روایات کا جنم پا جانا کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے - پھر ان کے مرنے کے بعد تو تعریف سے تنقیص اور مدح سے قدح کے ایسے ایسے پہلو نکالے گئے جن کی مکمل تفصیلات بھی آج نہیں ملتیں - غالب کی وفات کے تیس سال بعد جب مجددالسنہ مشرقیہ مولانا سید احمد حسن شوکت میرٹھی کی شرح دیوان غالب چھپی تو اس میں نہ محض غالب کے فن کو شوکت میرٹھی کی تحریفات کا سامنا کرنا پڑا بلکہ شوکت نے بعض جگہ بغیر کسی حوالے کے نہایت ھی مبتذل واقعات کو غالب سے منسوب کر دیا - مندرجہ ذیل شعر :

میں مضطرب ھوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وھم نے کس پیچ و تاب میں

کی شرح کرتے ھوئے شوکت میرٹھی تحریر فرماتے ھیں : (۲)

" ... ھم کو معلوم ھوا ہے کہ جب مرزا غالب نے یہ شعر مشاعرے میں پڑھا تو ختم مشاعرہ کے بعد مولوی امام بخش صہبائی مرحوم نے جو ایک مقدس اور متورع بزرگ تھے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس شعر میں کیا معنی پہنا دیے ھیں - مرزا صاحب نے کہا کہ مولانا ! آپ اس شعر کے معنی کیا سمجھیں گے ، نہ آپ نے رنڈی بازی کی ، نہ خانگی بازی ، نہ امرد بازی کی ، نہ فاعل بنے نہ مفعول ، میں نے تو اپنا ایک واقعہ لکھا ہے - یعنی جس 'مسماۃ' پر میں فریفتہ تھا ، بڑی تدبیروں اور چالوں سے اس کو کسی کونے

۱- کارنامۂ سروری ، مطبوعہ مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ، حاشیہ ص ۳۷ -
۲- حل کلیات اردو ، غالب دھلوی ، شوکت المطابع میرٹھ ، اکتوبر ۱۸۹۹ء ، صفحہ ۸۸ -

کھدرے میں ڈھب پر چڑھایا۔ مگر اس خوف سے کہ کوئی آ کھڑا ہوگا، رجولیت چوہے کے بل میں گھس گئی ۔ مسماۃ سمجھی کہ غالب خضی نامرد اور عنین ہے۔ میں نے معذرت میں یہ شعر پڑھا "۔

ایسے مبتذل اور غیر ادبی جھوٹ کی مثال شاید شوکت میرٹھی کے بعد مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی (یگانہ چنگیزی) ہی کے یہاں ملے تو ملے۔ دوسری جگہ ممکن نہیں – مرزا یاس (وفات ۱۹۵۶ء) نے اپنے رسالہ' عروض و قوافی (چراغ سخن) میں بلاکسی حوالے کے ایک ایسی ہی من گڑھت حکایت تحریر فرمائی ہے :

" غالب یہ کیا ؟ کتنے ہی ہونہار شاعر اس قوت متخیلہ کی آزادی اور مطلق العنانی کی بدولت گمراہ ہو گئے اور بعضے جو گمراہ ہوئے وہ اس وقت تک راہ پر نہیں آئے جب تک قوت ممیزہ کو تخیل پر حاکم نہ بنا لیا۔ ہائے میر تقی میر ! کتنا جوہری' سخن تھا ، مرزا غالب کے شعر سن کر صاف کہہ دیا کہ اس لڑکے کو اگر کوئی استاد کامل مل گیا اور سیدھے راستے پر لگا دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا – وہی ہوا کہ غالب نے کسی کو استاد نہ بنایا اور نہ راہ راست پر آئے – چنانچہ غالب کے کسی بے تکلف دوست نے یہ مطلع پڑھ کر از راہ تمسخر ان کی بہت تعریفیں کیں –

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
بعد اس کے جزو کل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نہایت آزردہ ہوئے اور کہا – نہ معلوم کس مسخرے نے یہ مطلع میری طرف منسوب کردیا ہے– اس پر ان کے مہربان نے فرمایا کہ بھئی برا کیوں مانتے ہو ، تمھارے شعر تو ایسے ہوتے ہی ہیں"۔ (۱)

غالب کے فن اور شخصیت کے سلسلے میں اس قسم کی فرضی حکایتوں اور جھوٹی روایتوں کو خاصی اہمیت حاصل ہے ، جنھیں احتیاط و توازن کے ساتھ اگر جانچا اور پرکھا نہ گیا تو غالبیات کے بہت سے گوشے تاریکی میں چلے جائیں گے۔

---

(۱) چراغ سخن، صفحہ ۹۳، مطبع منشی نولکشور لکھنؤ، دسمبر ۱۹۲۱ء -

شوکت میرٹھی اور یاس عظیم آبادی کے بعد اس ضمن میں مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم (وفات ستمبر ۱۹۶۸ء) کا نام لاشعوری طور پر سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے ایسی ہی مشتبہ ، مشکوک اور غلط روایات کا ایک " دفتر بے پایاں " چھوڑا ہے - ایک کثیر التصانیف مصنف کی حیثیت سے جو اہم ذمہ داریاں ان پر عاید ہوتی تھیں ، افسوس کہ وہ کبھی ان کو پورا نہ کرسکے - " لطائف الشعرا " مفتی صاحب مرحوم کی ایک مشہور تصنیف ہے جس میں محض غالب ہی کے متعلق نہیں ، بلکہ دیگر مشاہیر کے بارے میں بھی جابجا ایسی فرضی حکایتیں شامل کردی گئی ہیں جن کا سر پیر نہیں - بعض جگہ فرضی کتابوں کے حوالے بھی ہیں لیکن زیادہ تر روایات ایسی ہیں جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا - غالب کے متعلق جو لطائف اس کتاب میں نقل کیے گئے ہیں ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس سے پہلے قبول عام حاصل کر چکے ہیں - مگر اسی کے ساتھ ساتھ چند لطیفے ایسے بھی ہیں جو بہر قیمت غلط یا مشکوک اور مشتبہ ہیں - چند لطیفے ملاحظہ ہوں :

" مرزا غالب نے مولانا غلام امام شہید سے اپنے خاص ظریفانہ انداز میں دریافت کیا ، آپ شہید کب سے ہوئے اور کیوں کر ہوئے ؟ غلام امام نے فرمایا کہ جب سے ' کافر غالب ہوئے ' - اور مرزا کا یہ شعر لکھ کر بھیج دیا :

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

مرزا مسکرا کر رہ گئے " - (۱)

اسی طرح ایک دوسرے لطیفے (دلی کی ادبی صحبت) میں تحریر فرمایا ہے :

" حکیم مومن خان مومن کے یہاں احباب کا مجمع تھا - مرزا غالب ، نواب شیفتہ ، مفتی صدر الدین آزردہ ، حکیم آغا جان عیش سے حضرات شریک صحبت تھے - قاضی نجم الدین برق آبادی بھی حکیم صاحب (مومن) سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے - ناسخ

۱- لطائف الشعرا ، مطبوعہ فاروقی پریس دہلی ، صفحہ ۲۳ -

لکھنوی کے کلام پر بحث تھی، میر تقی میر کا ذکر آ گیا، مرزا غالب فی البدیہہ فرماتے ہیں :

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

عیش کہنے لگے، استاد ناسخ نے کیا خوب شعر کہا ہے :

یوں نزاکت سے گراں سرمہ ہے چشم یار پر
جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار پر

ہر ایک نے توجہ سے سنا اور داد دی۔ برق سکندر آبادی نے دست بستہ عرض کی کہ حضرت ناسخ نے سرمہ چشم یار پر لکھ کر جدت کا ثبوت دیا ہے اور ہم سے نو آموزوں کے لیے اب تو سند ہوگئی اور ادھر استادوں نے توثیق بھی کر دی۔ حکیم صاحب بولے میاں برق خوب بات پیدا کی اور معقول گرفت ہے . . . .''۔ (۱)

یہ تیسرا لطیفہ (ذوق و غالب) بھی اسی رنگ میں ترتیب دیا گیا ہے :

" حضرت ذوق اور مرزا غالب میں شاعرانہ چشمک تھی۔ ذوق کا قلعہ معلی میں طوطی بول رہا تھا، بادشاہ کے استاد کیا تھے جگت استاد بنے ہوئے تھے۔ اکثر شہزادے مرزا غالب سے مانوس تھے، مرزا بلانے پر قلعہ جایا کرتے، حضرت ذوق کی کوشش رہتی تھی کہ مرزا اسداللہ خان کا کہیں قلعہ میں پالا نہ جم جائے تو اس کی ریختہ گوئی پر حرف گیری کیا کرتے۔ خضر سلطان کو مرزا سے تلمذ تھا، انہوں نے قلعہ والوں کی باتیں جا لگائیں۔ مرزا فرماتے ہیں :

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم من و از راست سر نتوان کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است (۱)

اس قسم کا ایک اور لطیفہ (تازہ نہال) بھی غالب کے ایک شعر سے گڑھا گیا ہے۔

۱- لطائف الشعرا، ص ۳۰ - ۲۹
۲- ایضاً - ص ۳۱ - ۳۰

" مرزا غالب قلعۂ معلیٰ میں جب جاتے تو حضرت سلطان (۱) آپ کی بڑی خاطر مدارات کرتا اور جہاں مرزا پہنچے اور اپنے والد ماجد بہادر شاہ سے جا کر کہا ، مرزا صاحب آئے ہیں ۔ حضور بادشاہ سلامت جلد باریابی کا موقع عطا فرما دیتے ، ورنہ حضرت ذوق کے مقابلے میں کسی کی دال گلنے والی نہ تھی ۔ ایک دن بادشاہ سے مرزا صاحب (غالب) نے خضر سلطان کے لیے کہا :

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سر سبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے" (۲)

اور یہ لطیفہ بھی غالباً پہلی بار مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کی وساطت سے اہل ادب تک پہنچا ہے :

" مرزا غالب رام پور گئے ہوئے تھے ۔ حضرت جلال (حکیم ضامن علی) مرزا صاحب سے ملنے آئے ۔ شراب نوشی میں مصروف تھے ، ایک جام مے ناب سے بھر کر جلال کے سامنے پیش کیا ، انھوں نے کہا میں نہیں پیتا ہوں ۔ مرزا نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا آج تو ابر ہے ۔ جلال نے کہا ، حضرت مجھے اس سے رغبت نہیں ہے ۔ غالب بولے ، اجی حضرت ابر بھی ہے ، سردی بھی ہے ۔ آخر جلال جھلا سے گئے اور کہنے لگے ، حضرت میں حرام جانتا ہوں ۔ اس پر مرزا مسکرائے اور کہنے لگے ، پھر یہ شعر آپ نے کیوں کر کہا :

رات سے خوب سی پی صبح کو توبہ کرلی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی" (۳)

ان لطائف کے سلسلے میں مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم نے کسی راوی کے حوالے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی اور ان لطیفوں کے سیاق و سباق سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ غالب کے مختلف اشعار کو واقعات کا جامہ پہنا کر

۱۔ ' حضرت سلطان ' غالباً کتابت کی غلطی ہے ' خضر سلطان ' ہونا چاہیے ۔

۲۔ لطائف الشعرا ، ص ۳۵ - ۳۶

۳۔ ایضاً ۔ ص ۲۹ ۔

لطائف کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اول تو یہ روایات لطیفوں کے انداز میں کہیں دوسری جگہ نظر بھی نہیں آئیں ، اور اگر فرض کر لیا جائے کہ جس التزام کے ساتھ جلال لکھنوی اور غالب کی ملاقات کو قلم بند کیا گیا ہے، کسی حد تک سچ بھی ہو تب بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ غالب نے جلال کا شعر پڑھ کر انہیں لا جواب کر دیا ہو۔

مفتی صاحب مرحوم نے کچھ لطیفوں کے ساتھ مولوی اکرام اللہ گوپاموی کی ' تصویر الشعرا ' کا حوالہ بھی دیا ہے مگر یہ مزید نہیں فرمایا ہے کہ یہ کتاب کب لکھی گئی۔ اور کہاں ہے، یا مخطوطے کی شکل میں کس کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اور نہ اس کتاب (لطائف الشعرا) میں مولوی اکرام اللہ گوپاموی کے اس تعلق کو ظاہر فرمایا ہے جو مرزا غالب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ' مولوی سید مدد علی تپش ' کے عنوان سے " لطائف الشعرا " میں اس شعر:

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غالب
غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا

کو بھی غالب سے منسوب کردیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

" حضرت تپش مرزا صاحب (غالب) کے شاگرد تھے۔ مراسلت سے شاگرد ہوئے تھے۔ دھلی مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ گھبراہٹ میں دیوان کا صاف شدہ مسودہ بھول آئے۔ ایک دوسرا مجموعہ تھا وہ ہمراہ چلا آیا۔ مرزا صاحب سے اپنے دیوان کا ذکر کیا اور اس مجموعے کو ملاحظہ سے گزارا ، اس میں بہت تھوڑا کلام ان کا تھا۔ باقی دوسروں کا کلام تھا، پوری پوری غزلیں بھی نہ تھیں۔ مرزا صاحب (غالب) نے دیکھ کر کہا:

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

تپش صاحب نے اس مجموعے کو واپس لے کر دیکھا تو دیوان نہ تھا ، دوسرا نسخہ تھا ، جلد ایک سی بنی تھی اس سے دھوکا ہوا۔ مرزا صاحب سے بھی معذرت کی اور دوبارہ وہ دیوان لے جاکر دکھایا اور اصلاح لی۔ یہ دیوان ان کے پوتے منشی عبدالحمید تاج محلی کے یہاں بطور تبرک محفوظ ہے " - (۱)

۱- لطائف الشعرا ، ص ۴۸ -

یہ شعر نہ تو غالب کا ہے، نہ سید مدد علی تپش اکبرآبادی کے دیوان سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ اس غلط انتساب سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے مصرع ثانی میں ' غالب ' کے تخلص کو دیکھ کر ایک فرضی حکایت گڑھ دی گئی ہے۔ یہ شعر حقیقتاً عبداللہ خاں اوج کا ہے۔ جس کا ذکر ' آب حیات ' میں موجود ہے۔

" اوج تخلص ، عبداللہ خاں نام ۔ ۴۰ ، ۵۰ برس کے مشاق تھے ۔ ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لاسکتے تھے اور انھیں عمدہ الفاظ میں ایسی چستی و درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہ سکتا تھا ۔ اس لیے کبھی تو مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا ۔ سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں غزل کہتے تھے ، فکر مضامین اور تلاش الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا ۔ غور کے ساتھ کاوش کرتے تھے اور آپ ہی آپ مزے لیتے تھے۔ ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہو گیا تھا ۔ بعض دفعہ پڑھ کر کہتے تھے کہ آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا ، جب یہ شعر کہا تھا۔ بعضے (شعر) پر کہتے تھے کہ چھ مہینے تک برابر پڑھتا رہا ۔ پڑھتے اس زور شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے تو صف مجلس سے آگے نکل جاتے تھے ۔ بعض اشخاص شہر میں اور قلعے میں اکثر مرشد زادے (شہزادے) شاگرد تھے ، مگر استاد سب کہتے تھے۔ شعرائے با کمال کو جا کر سناتے تھے اور واہ واہ کی چیخیں اور تعریفوں کی فغان و فریاد لے کر چھوڑتے تھے ، کیونکہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ ذوق مرحوم باوجود کم سخنی اور عادت خاموشی کے " خوب خوب ... بہت خوب" کہتے اور مکرر پڑھواتے تھے ۔ مسکراتے اور چہرے پر سرور ظاہر کرتے گویا شعر کی کیفیت میں بیٹھے ہیں ۔ اور میرزا (غالب) تو ایسی دل لگی کے مصالحے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں کہ — ' نعمت خدا دے ، شعر سنتے اور کہتے تھے کہ یہ سب کافر ہیں جو تمھیں استاد کہتے ہیں ۔ شعر کے خدا ہو خدا ! سجدے کا اشارہ کرتے اور کہتے سبحان اللہ ! سبحان اللہ — میں ان دنوں میں مبتدی شوقین تھا ۔ اپنا مشتاق سمجھ کر مجھ سے بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو ۔

رستے میں مل جاتے تو دس قدم دور سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور جو نیا شعر کہا ہوتا اسے وہیں سے اکڑ کر پڑھتے - پھر شعر سنتے سناتے چلتے ، قلعے کے نیچے میدان میں گھنٹوں ٹہلتے اور شعر پڑھتے رہتے تھے - غریب خانے پر بھی تشریف لاتے اور پہر پہر سے کم نہ بیٹھتے - ایک دن رستے میں ملے ، دیکھتے ہی کہنے لگے ، آج گیا تھا ، انہیں (غالب کی طرف اشارہ ہے) بھی سنا آیا - میں نے کہا کیا ؟ کڑک کر کہا :

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا" (۱)

غالب سے ایک ' نئے شعر ' کا انتساب کرتے ہوئے مفتی انتظام اللہ بی مرحوم نے ایک واقعے کو دو جگہ کھپانے کی کوشش کی ہے - نا عرشی رام پوری نے اس کی تفصیل ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے :

" یہ شعر مفتی انتظام اللہ شہابی نے ' انشائے بے خبر ' کے دیباچے میں اس تمہید کے ساتھ لکھا ہے :

"ایک بار مرزا صاحب دہلی سے آگرے گئے تو ' لیل کے کٹھرے ' میں مجلس احباب منعقد ہوئی - مرزا حسام الدین بیگ ، خواجہ غلام غوث بیخبر وغیرہ سخن سنج شریک مجلس تھے - شعر و شاعری کا چرچا تھا - اس زمانے میں فرقۂ اہل نشاط سے ایک رقاصہ ' صنم ' تھی جس کا شہرہ بہت تھا اور وہ خود بھی فکر سخن کرتی تھی - وہ بھی شریک مجلس ہوئی ، مرزا صاحب (غالب) نے فی البدیہہ (یہ شعر) (۲) ارشاد فرمایا " -

" اس کے بعد مفتی صاحب (انتظام اللہ شہابی) نے اخبار قومی زبان کراچی بابت یکم دسمبر ۱۸۰۷ء (۳) میں " غالب اور ساحر " کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا ، اس میں لکھا ہے کہ :

۱- آب حیات ، مطبوعہ مفید عام لاہور ، حاشیہ صفحات ۳۰-۲۸ء

۲- سیہ چوٹی ، زر افشاں مانگ ، سبز اس پر دوشالا ہے
تماشا ہے پر طاؤس میں کالے کو پالا ہے

۳- یہ ٹائپ کی غلطی ہے ، ۱۹۰۷ء چاہیے -

' مرزا غالب آخری مرتبہ دلی سے سنہ ۱۸۳۳ء یا ۱۸۳۴ء میں (اپنے) وطن (آگرہ) آئے ' مرزا حسام الدین بیگ خلف مرزا مغل بیگ رئیس برارا کے یہاں چند روز مقیم رہے۔ لنوپال میں کوئی نہ رہا تھا ، ماموں باندے جا چکے تھے۔ مرزا صاحب کی تشریف آوری پر صحبت احباب منعقد کی گئی ... صحبت میں مہر (مرزا حاتم علی بیگ) راجہ (راجہ بلوان سنگھ) بے خبر (غلام غوث خان بے خبر) شیخ احمد علی شیون ، میر زین العابدین شورش وغیرہ شریک ہوئے۔ تمام اصحاب جمع ہوگئے تو ' صنم ' زرق برق لباس میں آئی ، اس پر غضب یہ تھا کہ سبز دوشالہ اوڑھ رکھا تھا ، پیشانی پر قشقہ لگا ہوا۔ داخل محفل ہوئی ۔ ہر ایک کی نگاہ اس پر پڑے بغیر نہ رہی۔ مرزا غالب بے ساختہ کہتے ہیں :

سیہ چوٹی زرافشاں مانگ سبز اس پر دوشالا ہے
تماشا ہے پر طاؤس میں کالے کو پالا ہے" (۱)

بلاشبہ یہ شعر غالب کا نہیں ہے ، لیکن اگر یہ واقعہ ' انشائے بے خبر ' کی روایت تک محدود رہتا تو شاید ' من حیث الواقعہ ' ایسی مضبوط گرفت میں نہ آسکتا جتنا ' قومی زبان ' (کراچی) کی تفصیلات کے بعد واضح ہو گیا ہے ، کیوں کہ اس دوسری روایت میں صرف مرزا حاتم علی بیگ مہر کا نام ہی اس کے بے بنیاد ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے مرزا حاتم علی بیگ مہر کا کوئی تعلق کبھی آگرے سے نہیں رہا ۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے، ان کا آبائی مکان آج بھی کٹرہ ابوتراب خان میں موجود ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے ، غدر کے بعد جب انگریزوں نے فتح پور سیکری کے پاس دو گاؤں جاگیر میں دیے تو پہلی بار آگرے سے ان کا تعلق قائم ہوا ۔ اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مرزا غالب کبھی آگرے گئے ہوں ۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں :

" ۱۸۵۷ء کے غدر میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں چھپایا ،

۱- دیوان غالب ، نسخہ عرشی ، ص ۳۹۳ -

اس خدمت میں مرزا سخاوت علی بیگ اور مہر (مرزا حاتم علی بیگ) کے ماموں شریک تھے۔ پھر لکھنؤ سے ان کو آگرے لے گئے، گورنمنٹ سے اس خدمت کے صلے میں بائیس پارچہ کا خلعت مع مالائے مروارید اور گھوڑا اور اسلحہ عطا ہوئے اور جاگیر میں دو موضع قریب فتح پور (سیکری) مرحمت ہوئے۔ اب (مہر نے) اپنا قیام آگرے میں کرلیا اور وہیں ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے" ۔ (۱)

جناب مالک رام نے اسی شعر کے سلسلے میں لکھا ہے:

"شرح غالب (ص ۳۹۳) میں جناب عرشی صاحب نے اس شعر سے متعلق صاحب موصوف (مفتی انتظام اللہ شہابی) کے دو مختلف مضمونوں کے اقتباس دیے ہیں۔ دونوں کا مضمون ایک ہی ہے کہ جب مرزا غالب 'آخری مرتبہ' آگرے گئے تو وہاں محفل احباب میں ایک رنڈی 'صنم' نامی کو زرق برق لباس میں ملبوس، سبز دوشالہ اوڑھے دیکھا تو (غالب نے) فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

مفتی صاحب موصوف نے خلاف معمول اس روایت کے لیے حوالہ نہیں دیا۔ بہرحال اگر وہ ایسا کرتے جب بھی قابل قبول نہ ہوتا۔ میں افسوس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ شاید بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ مفتی صاحب روایتیں 'وضع' کرنے میں بہت مشاق ہیں۔ وہ بالعموم کسی قلمی کتاب کا نام اختراع کر کے اس کی سند دیں گے کہ یہ کتاب 'مفتیان گوپامؤ' (ضلع ہردوئی) کے کتاب خانے میں ہے یا آرکاٹ (مدراس) کے شاہی کتاب خانے کی زینت ہے یا کسی اور جگہ ہے۔ حالانکہ اس کا کہیں وجود نہیں ہوتا۔ گوپامؤ میں خیر سے کوئی کتاب خانہ ہے ہی نہیں۔ اور جن کتابوں سے متعلق انہوں نے بعض مضامین میں 'آرکاٹ' کا نام لیا ہے، تحقیق سے وہ بھی غلط ثابت ہوا ہے۔ وہ (مفتی صاحب) پچھلے ۲۵ - ۳۰ برس سے اس 'جعل' کے مرتکب ہو رہے ہیں اور بہت لوگ اس سے گمراہ ہوئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو اس پر متنبہ کیا جائے اور ان کی کوئی روایت اس وقت تک تسلیم نہ کی جائے جب تک کہ یہ کسی دوسری مصدقہ

۱- آب بقا، نول کشور لکھنؤ، ص ۱۱۹ ۔

شہادت سے درست نہ ہو ۔ فی الحال اتنے اشارے پر اکتفا کرتا ہوں ۔ میں اس شعر کو محض مفتی صاحب کی سند پر غالب کا تسلیم کرنے سے انکاری ہوں " ۔ (۱)

غیر معتبر اور غیر مستند روایات کے سلسلے میں جناب مالک رام نے مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے ، انھیں الفاظ کی مستحق اسی عہد کی ایک اور شخصیت بھی ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ مولانا عبدالباری آسی الدنی مرحوم (وفات ۱۹۴۶ء) اپنے دور کے ان باکمالوں میں تھے جنھیں اگر زمانہ چین سے بیٹھنے کی مہلت دیتا تو شاید آج اردو ادب کی تاریخ میں وہ ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے ہوتے ۔ لیکن گردش ایام کی ناسازگاری نے انہیں پل بھر کی مہلت نہیں دی ۔ لکھنؤ پہنچے بھی تو اس دور میں جب ' عزیز و یاس ' کی ادبی ہنگامہ آرائیوں کا آغاز ہو چکا تھا ۔ ' معرکہ چکبست و شرر ' کا غبار بھی فضاؤں میں موجود تھا ۔ لکھنوی اور غیر لکھنوی کی تلخیاں بھی باقی تھیں ۔ اس ' اجنبی دیار ' میں زندہ رہنے کے لیے انھیں " نولکشور " کا سہارا لینا پڑا ۔ اردو اور فارسی کتابوں کی نشر و اشاعت کا شعبہ ان کے ہاتھ میں تھا ۔ قابل اشاعت کتابوں کا انتخاب ، ان کی ترتیب و تدوین ، تشریح نگاری اور حواشی نویسی ، سب کچھ انھیں سے متعلق تھا ۔ ان کے زمانے میں بےشمار نئی اور پرانی کتابوں کا قابل قدر اضافہ ہوا ۔ اور نولکشور پریس کو نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی ۔ اسی زمانے میں نیاز فتح پوری مرحوم ' نگار ' کو لے کر بھوپال سے لکھنؤ پہنچ چکے تھے اور مقبول حسین وصل بلگرامی بھی لکھنؤ کی بساط ادب پر جلوہ نما ہو چکے تھے ۔ وصل مرحوم کے یہاں روزانہ نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی کے ساتھ غالب کے دیوان میں ' نیا اضافہ ' ہونے لگا ۔ کلام غالب میں کئی سو نئے اشعار شامل کر کے مولانا آسی نے " مکمل شرح دیوان غالب " تصنیف فرمادی جسے صدیق بکڈپو لکھنؤ نے ۱۹۲۱ء میں شائع کیا ۔

' مکمل شرح دیوان غالب ' میں نہ محض غالب کے نام سے جعلی کلام کا (۲) الحاق کیا گیا بلکہ کچھ ایسے نئے انکشافات بھی کیے گئے جن سے

۱- سہ ماہی " فکر و نظر " علی گڑھ ، جنوری ۱۹۶۱ء ، ص ۱۵۲ ۔
۲- ملاحظہ ہو ' غالب کے کلام میں الحاقی عناصر ' شائع کردہ فروغ اردو ، لکھنؤ ۔

ہل علم و ادب اس وقت تک بے خبر تھے - مکمل شرح کے طویل مقدمے میں و ایسی بیاضوں کی نشان دہی کی گئی جن میں غالب کا ' غیر مطبوعہ ' کلام مویا گیا تھا - اور اس کے ساتھ ہی اس فاضلانہ مقدمے میں بعض ایسی باتیں ہی کہی گئیں جن کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا - چنانچہ جناب مالک رام یسے محقق نے بلا کسی تحقیق کے تذکرہ '' تلامذہ غالب '' میں صرف ولانا آسی کے بیان کا سہارا لے کر منشی خلیفہ حسام الدین احمد الدنی کو الب کا شاگرد لکھ دیا جو قطعا ایک مشکوک و مشتبہ روایت ہے اور روایت و رایت کے جن اصولوں پر پرکھنے کے بعد جناب مالک رام نے مفتی انتظام اللہ سہابی کی روایت ماننے سے انکار کیا ہے ، مولانا آسی بھی اس میزان پر ررے نہیں اترتے -

' مکمل شرح دیوان غالب ' کے اسی مقدمے میں مولانا آسی نے آب حیات ' کی اس روایت کی تکذیب کرتے ہوئے '' کہ غالب کا مروجہ وان مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی خان کا انتخاب کیا ہوا ہے '' ک سخت تنقید کی ہے اور ایک ایسی روایت تحریر فرمادی ہے جس کا کوئی کر کہیں نہیں ملتا - مولانا آسی نے تحریر فرمایا ہے :

'' مرزا خانی (خان) ہوں یا مولانا فضل حق (خیرآبادی) ، میرا ہر گز یہ خیال نہیں ہے کہ مرزا (غالب) ایسے غیور طبع نے اپنے جگر پاروں کو ان کے حوالے کرکے ان کی زندگی اور موت کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہوگا ، غلط ہے اور بالکل غلط ہے ، یہ اور بات ہے کہ ان دونوں نے صلاحیں دی ہوں اور مرزا نے ان کی دوستانہ صلاح کو مانا بھی ہو - مگر یہ انتخاب مرزا ہی نے کیا ہے ... خود میرے والد (خلیفہ حسام الدین احمد الدنی) مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں تھے ، ان کے کمال فن کے پورے رازدان تھے - وہ جب آزاد کا یہ ' آب حیات ' والا لطیفہ دیکھتے تھے کہ مرزا نے مولوی فضل حق سے انتخاب کرایا تو غصے کے مارے سرخ ہو جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ کیا بہتان باندھا ہے -

'' والد صاحب بیان کرتے تھے کہ مرزا اصلاح دے کر بعض شاگردوں سے ایک ہندو تمبولی کی نسبت تو ضرور یہ کہتے تھے کہ ذرا اس کو بھی سنا لینا اور باقی کسی کو وہ کچھ نہیں سمجھتے

تھے - صہبائی (امام بخش) کو ملائے مکتبی ، آزردہ (مفتی صدرالدین) کو ایک حکمران ، ذوق کو بادشاہ کا استاد ، مومن کو لڑاکو جانتے تھے اور ذرا بھی ان کی پروا نہ تھی'' - (۱)

قطع نظر اس سے کہ مروجہ دیوان غالب کے انتخاب کی نوعیت کیا تھی ، مولانا آسی اپنے والد منشی خلیفہ حسام الدین احمد کے بارے میں کوئی ثبوت اس کا پیش نہیں کر سکے کہ وہ غالب کے ' کمال فن کے پورے رازداں ' تھے - غالب کا کوئی ایسا خط آج تک سامنے نہیں آسکا جس میں خلیفہ حسام الدین احمد کا ذکر کسی سلسلے میں آیا ہو - جناب مالک رام نے محض مولانا آسی کے خود نوشت حالات (مطبوعہ ماہنامہ نگار لکھنؤ ، بابت جنوری فروری ۱۹۴۱ء) کو بنیاد بنا کر خلیفہ حسام الدین احمد کو غالب کا شاگرد اور ' کمال فن کا پورا رازدان ' تصور کر لیا - حالانکہ انہیں خود نوشت حالات کے جس ٹکڑے پر جناب مالک رام نے یہ عظیم عمارت تعمیر فرمائی ہے ، اگر اس کے صرف اسی حصے پر توجہ فرما لیتے تو پوری بات سمجھ میں آجاتی - جناب مالک رام نے مولانا آسی کے خود نوشت حالات کا جو حصہ نقل کیا ہے ، اس کی ابتدائی سطور یہ ہیں :

'' حسام ، خلیفہ حسام الدین احمد الدنی -

ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) کے نواح میں ' الدن ' ایک قصبہ ہے ، وہیں کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے - شاعری گویا ورثے میں پائی تھی - ان کے والد مولوی شیخ خدا بخش بھی شاعر تھے ، عاجز تخلص تھا - عاجز کے والد شیخ عبد الحکیم عرف میاں ننھن عاشق تخلص کرتے تھے - یہ میر تقی میر کے ہم عصر اور جلیس تھے ، آپس میں خوب صحبتیں رہتی تھیں اور ایک ساتھ شعر و شاعری سے شوق کرتے تھے ...'' - (۲)

جس طرح غالب کے ' کمال فن کے رازدان ' (خلیفہ حسام الدین احمد) کا نام یا کوئی شعر آپ کو کسی تذکرے میں نہ ملے گا ، اسی طرح تمام قدیم و جدید تذکرے میر تقی میر کے ان ' ہم عصر اور جلیس ' سے خالی نظر آئیں گے -

---

۱- مکمل شرح دیوان غالب ، مطبوعہ اشاعت العلوم لکھنؤ ، ص ۱۱-۹

۲- تلامذۂ غالب ، ص ۹۴ - ۹۳

اگر جناب مالک رام ' کلیات میر ' مرتبہ مولانا آسی کے طویل مقدمے میں میر کے ان ' ہم عصر اور جلیس ' کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو شاید بلا تصدیق خلیفہ حسام الدین احمد کو غالب کا شاگرد تسلیم نہ کرتے -

مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کی طرح مولانا آسی مرحوم کا ذہن بھی ہمیشہ احساس ذمہ داری سے خالی رہا اور ایسی ایسی روایتیں ان کے قلم سے بیساختہ نکل گئی ہیں جنھیں کوئی غیر تحقیقی ذہن و شعور بھی مشکل سے قبول کرے گا - ' ہندو تمبولی ' کا ذکر مولانا آسی نے مذکورہ بالا روایت میں کیا ہے - اس کا ذکر آپ کو آزاد کے یہاں ملے گا نہ حالی کے یہاں - غالب کے کسی ہم عصر نے ایسے سخن فہم تمبولی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا حالانکہ اگر ایسی کوئی با ذوق شخصیت اس وقت دلی میں ہوتی تو آزاد و حالی نہ سہی ، خواجہ حسن نظامی ، مولانا راشدالخیری اور ناصر نذیر فراق جیسے روایت نگار تو اسے کبھی فراموش نہ کرتے -

مولانا آسی نے غالب کے اردو کلام میں الحاقی کلام تو شامل ہی کیا تھا ، سب سے بڑا ستم یہ کیا کہ ۱۹۲۰ء میں دیوان غالب (اردو) کا ایک نیا ایڈیشن نولکشور پریس لکھنؤ سے ایسا شایع کرایا جس میں ایک طرف تو نسخۂ حمیدیہ (مکتوبہ ۱۸۲۱ء مطبوعہ ۱۹۲۱ء) کا ایک انتخاب بھی "انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ مرزا غالب مرحوم" کے عنوان سے شامل کر دیا اور نسخۂ حمیدیہ کے حوالے کے بغیر تحریر فرمایا :

> "چونکہ مرزا غالب کی غیر مطبوعہ غزلیں یا وہ کلام جسے غالب نے خود قابل طبع نہ سمجھا تھا ، اکثر بیدل اور شوکت ، اسیر وغیرہ کے رنگ میں ہیں اور اس وجہ سے وہ بیحد الجھی ہوئی اور بعیدالفہم ہیں ، لہذا ان غزلوں میں سے وہ اشعار انتخاب کیے گئے جو اس رنگ میں بیحد سہل اور آسان ہیں - ہمارا ارادہ تھا کہ ان اشعار کو ان کے مروجہ دیوان کی غزلوں میں شامل کر دیا جائے مگر چونکہ خود مرزا نے ان کو علاحدہ کر دیا ہے لہذا ہم نے بھی مصنف مرحوم کا اتباع کیا " - (۱)

۱- دیوان غالب ، ایڈیشن ۱۹۲۰ء ، ص ۱۱۰ -

دوسری طرف اس دیوان میں حاشیے پر بعض اشعار کی شرح بھی کی گ
ہے ، اور بے سروپا روایات بلا کسی حوالے کے لکھ دی گئی ہیں - ۱۹۲۵
کے ایڈیشن کا جو نسخہ میرے سامنے ہے اس پر سرورق نہیں ہے اس لیے
کہنا دشوار ہے کہ اس پر بحیثیت مرتب مولانا آسی کا نام ہے یا نہیں ؟ لیک
یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ دیوان مولانا آسی ہی کا ترتیہ
دیا ہوا ہے اور شرح کے پیرائے میں جن اشعار پر غیر مستند روایات کے حواشہ
لکھے ہوئے ہیں ، وہ سب مولانا ہی کی جدت طبع سے تعلق رکھتے ہیں - مولا
آسی مرحوم کے ایک قریبی دوست میرزا محمد عسکری ہی - اے نے اپ
خود نوشت حالات '' من کیستم '' میں مولانا آسی کا ذکر کرتے ہو۔
لکھا ہے :

''شاعر و ناقد و شارح ، مشہور نولکشور پریس میں بعہدہ مصحح و
شارح ملازم ہیں ، خوشا نصیب پریس کے کہ ایسا گوهر بے بہا
کوڑیوں کے مول مل گیا اور وہ اس کی قدر نہیں کرتا '' - (۱)

اس ایڈیشن میں شرح کے پردے میں جو '' روایت سازی '' کی گئ
ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور افسوسناک بھی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ۔
ان اشعار کے ' پس منظر ' میں جھانک کر کچھ تصوراتی خاکے بنا ڈالے ہی
جو اس دیوان کے حاشیوں کے سوا شاید کہیں بھی نظر نہ آئیں گے - اب آ
ان اشعار کے آیینے میں وہ روایات ملاحظہ فرمائیں جنھیں بلا کسی مستند حوا
کے اس دیوان غالب میں لکھا گیا ہے :

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سنا ہے کہ غالب مرحوم نے یہ غزل قلعہ میں پڑھی تھی -
بہادر شاہ ظفر مرحوم نے جب یہ مقطع سنا تو فرمایا کہ ہم تو اس
وقت بھی آپ کو ایسا نہ سمجھتے - مرزا نے از راہ شوخی عرض
کیا کہ حضور تو اب بھی ایسا ہی کہتے ہیں مگر یہ اس لیے ارشاد
ہوتا ہے کہ میں اپنی حالت پر مغرور نہ ہو جاؤں - (صفحہ ۲۱)

۱- من کیستم ، نامی پریس لکھنؤ ، ۱۹۴۳ء ، ص ۹۶ -

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ذوق مرحوم اس شعر کو پڑھ کر پہروں سر دھنتے تھے اور غالب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے تھے کہ غالب کو اپنے اچھے شعروں کی خود بھی خبر نہیں ہوتی - (صفحہ ۲۹)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

مولانا آزردہ کبھی غالب کے کسی شعر کی تعریف نہیں کرتے تھے ، اس لیے کہ وہ خود نہایت صاف شعر کہتے تھے اور شعر میں صفائی کو پسند کرتے تھے - ایک دن کسی نے اچانک یہ شعر پڑھا ، بھڑک گئے اور پوچھا یہ کس کا شعر ہے ؟ کسی نے کہا - غالب کا شعر ہے - جواب دیا کہ پھر اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے ، یہ تو ہماری روش خاص ہے اور اس کے مستحق ستائش ہمیں ٹھہرتے ہیں - (صفحہ ۴۰)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

ذوق مرحوم کہیں پالکی میں بیٹھے جا رہے تھے غالب کی نظر پڑی ، چونکہ ان سے ہم عصرانہ چشمک تھی ، انھوں نے یہ مصرع فی البدیہہ کہہ کر پڑھا - ذوق مرحوم نے سن لیا اور بادشاہ سے شکایت کی - بادشاہ نے غالب کو بلوایا اور پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے - انہوں نے پوری غزل سنائی - آخر میں مقطع میں یہ مصرع شامل کر کے سنا دیا - (صفحہ ۹۱)

اس قسم کی متعدد روایات (۱) اس دیوان کے حاشیوں پر لکھ دی گئی ہیں جن کے بارے میں کوئی قابل اعتبار ثبوت یا حوالہ نہیں دیا گیا ہے - جو مکالمات ان روایات میں درج کیے گئے ہیں یقیناً بے بنیاد اور من گھڑت ہیں -

---

۱- مولانا آسی کی بیان کردہ روایات میں سے بعض " یادگار غالب " میں بھی موجود ہیں - (ادارہ)

مولانا آسی کے مرتبہ دیوان غالب اردو کا ایک ہی ایڈیشن جون ۱۹۲۰ء میں نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا تھا کہ ۱۹۳۲ء میں مولانا کا انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات کے بعد مولوی امیر حسن نورانی (رکن شعبہ طباعت دہلی یونیورسٹی) ان کے قائم مقام کی حیثیت سے نولکشور پریس کی راجہ رام کمار برانچ میں پہنچ گئے۔ ان کے زمانے میں اس دیوان غالب کے دو ایڈیشن ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئے جن کے سرورق پر مولوی امیر حسن نورانی کا نام اس التزام کے ساتھ چھپا ہوا ہے کہ " مع تصحیح و اضافہ حالات زندگی" لیکن سوائے اس کے کہ مولانا آسی کے لکھے ہوئے حالات میں رد و بدل کیا گیا ہے، باقی ان ایڈیشنوں میں سب کچھ وہی موجود ہے جو مولانا آسی نے لکھا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۷ء کے ایڈیشن میں صفحہ ۱۱۰ پر " انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ غالب مرحوم" کی خوش خبری ۱۹۶۰ء کے ایڈیشن میں بھی موجود ہے اور صفحات ۱۳۴ و ۱۳۵ پر غالب کا مشہور ' سہرا ' شایع کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ:

> " یہاں تک ' غزلیں ' دیوان غالب کی تمام ہوئیں۔ اب آگے قصائد اور قطعات ہیں "۔

مولانا نورانی کے تصحیح کیے ہوئے ایڈیشنوں میں بھی یہ تمام ارضی جزئیات بدستور موجود ہیں، کہیں ایک نقطے کا فرق نہیں۔ نسخہ' حمیدیہ کو چھپے ہوئے نصف صدی سے زیادہ زمانہ ہو گیا۔ اس کے نہ جانے کتنے انتخابات شائع ہو چکے مگر مولانا نورانی کے نزدیک یہ آج بھی ایسا نادر ذخیرہ ہے جس کی دریافت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

غالب کا مزاج شعری

مخمور اکبر آبادی

غالب کی نوائے شوق پارسی ہے اور مزاج شعری بھی ایرانی ۔ اپنے عہد کے نصاب کے مطابق ، اس نے فارسی زبان پڑھی تھی اور اپنے شوق کے جوش سے اس زبان میں اہل زبان کی سی مہارت و دستگاہ حاصل کرلی تھی ، لیکن حقیقت اس سے بالاتر اور کچھ مختلف ہے ۔ وہ یہ کہ نسل و خون کی بنا پر یہ زبان اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی ۔ اس کی فطنت کو اس سے فطری لگاؤ تھا ، چنانچہ اس کی لسانی بصیرت اپنی ہی فطنت کی مرہون منت ہے ۔ اس کو اپنے نسب کی صحت اور اپنے آبا کے فن کی شرافت پر ناز ہے اور اس نازش کا ذکر اس نے اپنی زبان کی صحت و شگفتگی کا ڈنکا بجانے کے لیے کیا ہے :

غالب از خاک پاک تورانیم   لا جرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی   بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک   در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست   مرزبان زادۂ سمرقندیم
ور ز معنی سخن گزاردۂ   خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم   عقل کل را بہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہم نفسیم   ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم   بہ معاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گرییم   ہمہ بر روزگار می خندیم

نفسیاتی زبان میں ، اس قطعے کے ' فیض حق ' اور ' عقل کل ' سے

اپنی فطنت کی بداعت و ندرت ، ' تابش و بخشش ' سے اپنے ذوق کی شگفتگی فراوانی ، ' تلاش ' سے اپنی بصیرت اور ' خرسندگی ' سے اپنا ھی غ مراد ہے۔

غالب یکتا و یگانہ بھی ہے ، خود شناس و خود آگاہ بھی ، او حق پسند و صاحب دیانت بھی ہے ۔ اس کے ان تین پہلوؤں کا اگر اعتب ہو جائے تو کوئی نقاد ، اس جیسے ہنرمند کا ، خود اس سے بہتر نقاد نہیں ہو سکتا ۔ اپنے فارسی کلیات کے دیباچے میں ، ارسطو کے فلسفے کی رموز حرا کرتے ہوئے ، مثنوی میں خود اپنی داستان سرائی و ژرف نگاھی کا ذکر چھیڑ ہے ۔ اس کے مزاج شعری کی نوعیت کا انکشاف ، چونکہ خود اس سے بہ ممکن نہیں ، اس لیے یہ مختصر مثنوی تمام وکمال درج کی جاتی ہے :

اے نہاں بخش ، آشکارا نواز　　دل بہ غم، تن بہ جاں گرامی ساز
شررے کز تو ، در دل سنگست　　بر رخ لعل ، جلوۂ رنگ است
اے بساط زمیں نشیناں را　　وے مشام یگانہ بیناں را
از رگ نو بہار نافہ کشائے　　وز دم باد صبح غالیہ سائے
اے قلمدہ بروئے شاھد ذات　　عنبریں طرّہ از نقاب صفات
بہ فروغت سپہر نہایش جائے　　از بساط سیاہ کیواں زائے
اے فلکہا ، حباب قلزم تو　　وے زمیں لائے بادۂ خم تو
از رحیق خمت بدیر مغاں　　لای پالای می سہیل فشاں
بودنی بخش خوب و زشت توئی　　رونق کعبہ و کنشت توئی
اے گزیں نقشہا ، کشیدۂ تو　　ہر چہ و ہر کہ آفریدۂ تو
دیدہ را جوئے خوں کشادۂ تست　　نالہ را بال و برق دادۂ تست
اے مرا فر خسروی دادہ　　پارسی را بہ من نوی دادہ
ہم بہ تسلیم عجز تن زدہ ام　　کز تو در مدح خویشتن زدہ ام
ناتوانی قوی اساسیہاست　　خود نمائی خدا شناسیہاست

مذکورہ مثنوی کا دوسرا مصرع غالب کے نقطۂ نظر کا انکش ہے ۔ اس میں وہ اپنے فلسفۂ حیات کا پہلا اصول بتاتا ہے۔ جاں سے قطع نظ

دل کو غم سے گرامی بناتا ہے ۔ غم کے معنی یہاں محبت ہیں اور محبت، بنی نوع انسان کی محبت کی مترادف ہے ۔ یہ بتاتا ہے کہ 'دل' اس نے گرامی منزلت ہے کہ غم محبت بشر سے لبریز و سرشار ہے ۔ 'غم' کے اس معنی کی شرح و وضاحت سے، اس کا فارسی اور اردو کا سارا کلام بھرا پڑا ہے ۔ حق یہ ہے کہ یہ اس کا نہایت محبوب موضوع ہے ۔

دوسرا شعر فکر انگیز ہے ۔ اس میں یہ بتاتا ہے کہ واجب الوجود کے وجود کا ایک شرر، سنگ کی رگ کو ودیعت کیا گیا ہے ۔ وہی شرر لعل کے رخ پر رنگ بن کر نمودار ہو گیا ہے ۔ یہ مادے کے مدارج ارتقا کی جلوہ نمائی ہے ۔ لعل کا رنگ اس جد و جہد کا انجام کار ہے جو مادے کی ازلی فطرت کا خاصہ ہے ۔ یہ بھی بتاتا ہے کہ رنگ لعل کی یہ نمود فوری یا اضطراری نہیں ہے، تدریجی ہے ۔ یہی خیال دوسرے انداز سے اردو کے اس شعر میں ظاہر کیا ہے :

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس شعر میں جہدللبقا کا پہلو زیادہ وضاحت سے نمودار کیا ہے ۔ قطرے کی بے مقداری سے گہر کی منزلت تک پہنچنے کے مدارج ارتقا کی کشمکش پر توجہ دلائی ہے ۔

اس کے آگے ایک شعر میں 'خوب و زشت' اور 'کعبہ و کنشت' دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے ۔ یعنی یہ کہ دونوں وجود کے مظاہر ہیں اور معرض وجود میں نمودار ہو کر ایک ہی حیثیت کے حامل ہیں ۔ یہاں غالب کی نظر کی پہنائی، پیمائش سے بالا تر ہو جاتی ہے ۔

دوسرے، پانچویں اور نویں شعر سے ظاہر ہے کہ وہ 'عقل کل' کے متواتر دخل یا بر کلے کے بہ قول، خدا کے لمحہ بہ لمحہ توسط و تخلل کا قائل نہیں ہے ۔ بلکہ مسلسل و متواتر سعی و جہد کا حامی ہے ۔ یہ تینوں شعر ہیگل کی جدلیت کی شرح و وضاحت سے تمام و کمال ہم آہنگ ہیں ۔

اس کے علاوہ پہلے اور آخری شعروں کے دوسرے مصرعے، ارسطو کے فلسفے کا بھی مغز و ماحصل ہیں اور ہیگل کی جدلیاتی حیات آفرینی کا نچوڑ بھی ۔ مادے کے وجود کے اثبات اور اس کے تنوعات کی ایسی دلنواز شرح کے

باب میں غالب کا زاویہ' نظر خصوصیت سے نیا ہے ۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ صفات ہی کے ظہور کا نام جدید فلسفے نے حیات کی جدلیاتی آویزش اور مظاہر حیات کا ارتقا رکھ لیا ہے۔

غالب کا موقت معاشرہ ، خود نمائی کو اپنی شدید فریسیت کی بنا پر عیب قرار دے چکا تھا ، لیکن خود غالب ، خود نمائی ، کو ، خداشناسی ، بتاتا ہے ۔ یہ جدت ہے اور جدت کی حیثیت سے عہد کی فریسیت کی کھلی ہوئی مخالفت ۔ اسی ، خود نمائی ، سے علامہ اقبال نے ، خودی ، کا فلسفہ وضع کیا اور وہی مسلمانوں کے سیاسی نشاۃ الثانیہ کا مشعل راہ بنا ۔

فارسی کلام سے قطع نظر ، اس نے مذکورہ صدر قدرت ، نوی ، سے معیاری و یادگاری کام لیا ہے یعنی یہ کہ فارسی الفاظ ، جملے ، ترکیبیں ، اسالیب ، محاورے اردو سیاق و سباق میں اس قدرت سے کھپائے ہیں کہ شیر و شکر کردیے ہیں ۔ کارنامہ یہ ہے کہ فارسی کی بہت سی نئی اضافت ترکیبیں اس نے اردو انداز بیان میں کھپا کر مانوس بنا دی ہیں ۔ مثلاً :

فنا تعلیم :

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

سر بہ سر انداز :

اے ترا جلوہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم ، سر بہ سر انداز

ستم ظریف :

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

لب تشنہ :

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ' تقریر بھی تھا

آشفتہ سر اور جواں میر :

پیشے میں عیب نہیں ، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

برف آب :

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

اس رباعی کے چوتھے مصرعے میں ' برف آب ' کی ترکیب اضافت مقلوب کہلاتی ہے۔

آسماں اورنگ ؛ آفتاب آثار :

اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاں دار آفتاب آثار

حسین ، بے اضافت ترکیبیں ، غالب کے فارسی کلام میں کثرت سے میسر آتی ہیں ۔ یہ اتنی مفید اور لطیف ہیں کہ اردو عبارت میں بہ سہولت کھپ سکتی ہیں ۔

چمن ساماں :

چمن ساماں بتے دارم کہ دارد وقت گل چیدن
خرامے کز ادائے خویش ، پر گل کردہ داماں را

اس شعر میں غالب نے اپنے حسن بیان سے ' خرام ' کو بھی پھول کا مماثل بنا دیا ہے ۔ ایسے ہی انواع محاسن کی بنا پر اس کے بیان کو صناعی و جدت طرازی کہا جاتا ہے۔

لا ابالی پیشہ :۔

کباب نو بہار اندر تنور لالہ می سوزد
چہ فیض از میزبان لا ابالی پیشہ مہماں را

شیریں حرکات :

بس کہ ہموارہ ، دل آویزی و شیریں حرکات
سایہ طوبیٰ و جوئے عسلی را مالی

مغز خام و تلخ کام :

غمت در بوتہ' دانش گدازد مغز خاماں را
لبت تنگ شکر سازد دھان کا تلخ کا ماں را

دیرمست و زود رنج :

در بادہ دیرمستم ، آری ز سخت جانیست
در غمزہ زود رنجی ، آری ز نازنیست

ھزار شیوہ :

رند ھزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نہ خواست

مشکیں غزال :

مشکیں غزالہ ھا کہ نہ بینی بہ ھیچ دشت
در مرغزار ھائے ختا و ختن بسیست

دل خستہ :

دل خستہ' غمیم و بود مے دوائے ما
با خستگاں حدیث حلال و حرام چیست

خونیں نفس :

دادہ خونیں نفسی ، درس خیالم غالب
رنگ بر روئے من از سیلی' استاد آمد

کافرادا ، بالا بلند ، کوتہ قبا :

تابم ز دل برد کافر ادائے
بالا بلندے ، کوتہ قبائے

یہ نادر و جدید ، رنگ بہ رنگ اضافہ اس کا کارنامہ ہے ۔ اس سونت اردو کو متمول کیا ، نوع بہ نوع خیالات کے اظہار کا اہل بنایا ،حاس و کم صلاحیت زبان کے بیان میں وقتی تصورات کے حمل و قبول صلاحیت پیدا کردی ۔ ایسا علمی شکوہ پیدا کرنے میں تا ہنوز کوئی ؛ کامیاب نہ ہوا تھا ۔ یہی وہ پہلو ہے جسے سخن شگرف ، ژرف نگاہ ذوق نوی ، جیسے معنوی اشاروں سے واضح و واشگفت کیا جاتا ہے ۔

غالب کے فارسی کلام کے باب میں حالی کا یہ لکھنا کہ :

'' مرزا نے اپنی غزل کی بنیاد نظیری ، عرفی، ظہوری ، طالب اور اسیر کی غزلوں پر رکھی ہے ''۔

کچھ غالب کی مدح سرائی یا داد گستری نہیں ۔ اس سے اگر غزلوں کی مینیں متعلق ہیں تو یہ خیال بجا سہی ، لیکن اگر اس سے غزلوں کی بندش یان یا مغز مراد ہے تو یہ منفی داد ہے اور انفرادیت کی تکذیب ۔

اس کے علاوہ یادگار غالب میں حالی کا یہ لکھنا کہ اس کی :

" غزل کا معتدبہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم الثبوت اُستاد کی غزل سے گرا ہوا نہیں "۔

یری نظر میں غالب کی اہانت ہے ۔ اس کی جدت و خلاقی ، اس کی قدرت نوی ' کی کھلی توہین و تکذیب ہے ۔ اس کے ذوق بے ہمتا کی جان ر ستم ہے۔

حیرت یہی ہے کہ حالی جیسا ترقی پسند ، پیش رو بزرگوار ، اس عل ر قدامت و روایت کا ایسا پرستار بن جائے کہ رعب قدامت کے دائرے سے باہر کل کر سانس بھی نہ لے سکے ، جدت طرازی سے اتنا قاصر رہے۔

یہ فرسودہ و بے روح تبصرہ ، بے شک و شبہ ایسے لمحے کی پیداوار ہے جو قنوطیت و بے حوصلگی سے لبریز تھا ۔ حالی کی یہ رائے غالباً اس لیے قائم ہوئی کہ غالب نے مذکورہ صدر شعرا کی عظمت کا اکثر اعتراف کیا ہے۔ یکن دوسرے ہی سانس میں اس نے اپنی عظمت کا آوازہ بھی بلند کردیا ہے۔

اس سے قبل مرثیے میں حالی نے جو داد دی ہے ، وہ غالب کے مقام ستادی کی رتبہ شناس اور حالی کی شاگردی کے شایان شان ہے ۔ اُس کی منزلت کا یہ احساس و عرفان اس کی فطنت کا آیینہ دار ہے :

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اهل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالب نکتہ داں سے کیا نسبت — خاک کو آسماں سے کیا نسبت

سوچی سمجھی بات یہی ہے کہ اُس کو اگلوں پر ' ترجیح ' ہے - ' نکتہ داں ' کہنا ، اس کی مختصر سی مگر سچی توصیف ہے ۔ وہ خود ایک عیار کا خالق ہے جو اچھوتا ، البوکھا اور نرالا ہے ۔ خود اُس کے بہ قول نوی ' ہے ۔

یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا حالی کی مذکورہ صدر ، دو متضاد روایوں میں کیوں کر مطابقت پیدا کی جائے ، اس لیے کہ کم سے کم ایک استاد یعنی اسیر ، دونوں میں مشترک ہے۔

چنانچہ غالب کے کلام کو ، فارسی ہو یا اردو ، قدما یا معاصرین کے معیار پر جانچنا اعلا نقادی نہیں ہے ۔ اس کے فن کی قدر سنجی کے لیے خود اسی کے کلام سے معیار اخذ کرنا ہوگا۔ اس کے باب میں شیفتہ یا آزاد کی رائیں تمام و کمال قابل قبول نہیں ۔ یہ شعر کی عامیانہ سطحیت کو معیار قرار دے کر اپنا فیصلہ صادر کرچکے ہیں ، لیکن ادب کی کسوٹی اس وقت تک بدل چکی ہے۔ خود قدیم معیار کی اساسی قدریں فرسودہ ،کرم خوردہ ، لایعنی قرار پا چکی ہیں ۔

ہمارا عہد انفرادیت کی جویائی اور زاویہ' نظر کی تلاش کا عہد ہے. کسی کی شاعری کو منزلت دینے کے لیے ہمیں انفرادیت کی وضاحت اور زاویہ' نظر کی شرح بھی کرنی ہوگی۔ ان پہلوؤں سے قطع نظر ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ اس شعر :

خیز و بے راہہ روی را سر راہے دریاب
شورش افزا نگہ' حوصلہ گاہے دریاب

میں جس ' بے راہہ روی ' کا اس شد و مد سے اعلان ہے، وہ کیا ہے ۔ غالب کے مزاج شعری کے باب میں اس کا فارسی کلام ، مشعل را ہے اور ' بے راہہ روی ' کا ثبوت اردو سے بہت زیادہ فارسی میں ملتا ہے۔ از سب سے بالا تر غالب کے باب میں ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ اس کی انفرادیت، اس کے زاویہ' نظر اس کی ' بے راہہ روی ' نے متاخرین کو کس طرح متاثر کیا غالب کے کلام کو ' قومی سرمایہ ' ہم اسی لیے کہیں گے کہ اس کے مزاج شعری نے قوم کے متاخرین ، بالخصوص بیسویں صدی والوں میں گمبھیرتا ، جلالت مآبی پیدا کی ۔

یادگار غالب میں ان پہلوؤں کا فقدان اور غالب پذیرائی کے موضوع پر ، مولانا حالی کا نیازمندانہ لب و لہجہ ، غالب کے کاخ بلند کا دروازہ نہیں کھولتا ۔

غزل میں اس کو عرفی و نظیری اور مثنوی میں ظہوری کا ہم سر او ہم مرتبہ قرار دے کر مولانا حالی نے جگہ جگہ ہتھیار ڈال دیے ہیں ۔ مگر خو

اس نے عرفی کا ایک مصرع پلٹ کر اپنی ' بے راہ روی ' کی عظمت کا جھنڈا گاڑا ہے - عرفی کا مصرع یہ ہے :

روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتشست

غالب نے غزل میں یوں کہا ہے :

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتشست

اور اس اصلاح کا اعلان اس طرح کیا ہے :

گشتہ ام غالب ، طرف با مشرب عرفی کہ گفت
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

اس ' بے راہ روی ' سے جرأت کا زاویہ نظر پیدا ہے - یہ ' زاویہ نظر ' کسی بھی محکوم قوم کے مجاہدے کا نعرہ نجات و رستگاری بن سکتا ہے - ویتنام میں جل جل کر مرنے والے حریت کے مجاہد ، یہ شعر پڑھتے پڑھتے خوشی سے جان دے سکتے ہیں -

قصہ کوتاہ ، میری نظر میں تقابل کا یہ اسلوب و لہجہ غالب کی بڑائی کا اعتراف نہیں ، حالی کے احساس کمتری کا غماز ہے - میری جانب سے یہ اظہار خیال چھوٹا منہ بڑی بات ہے ، لیکن یہ ادب التمس ہے کہ نفس الامر یہی ہے اور یہ ہماری منحوس محکومیت کی رکیک یادگار ہے - یہ وہی احساس کمتری ہے جو ہم دیسیوں کو ، بدیشیوں کے مقابلے میں ہمیشہ رہا ، ہر عہد پر رہا اور جس نے ہماری سیاسی و اخلاقی نجات کی جد وجہد میں ہمیشہ رکاوٹ پیدا کی - یہاں بھی غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے :

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

کہتا ہے کہ ہم نے بہت سے بت توڑ ڈالے ہیں مگر اپنے فطری احساس کمتری کا بت توڑے نہیں ٹوٹتا - ممکن ہے کہ عہد کے افاضل ، اس شعر میں دوسرے معنی دیکھیں ، لیکن میری کم بینی یہیں ٹھٹک کر رہ جاتی ہے -

حالی کے یہاں اس ناسطبوع احساس کمتری کا صرف یہی ایک ممکن ہے کہ چونکہ معاشرے کے ذہن پر ایرانی استادوں کے کمال کا رعب کی طرح چھایا ہوا تھا، اس لیے نہ اس سے مفر تھا، نہ اس سے لیے بغیر چارہ ۔ اس تدبیر کے علاوہ کسی کی بڑائی تسلیم کرانے کوئی تدبیر ہی پیش نظر نہ تھی ۔ نہ جراٗت ایقان کی پشت پناہی حاصل نہ ساز و برگ کی اعانت و توانائی ۔ اگر ایک ہاتھ میں وہ سپر ہوتی دوسرے میں نہ تلوار تو بات بن جاتی اور شرم بھی رہ جاتی ۔ لیکن عذر و جواز بھی، حالی سے کمتر منزلت کے نقاد کی طرف سے قابل قبول مگر حالی جیسے صاحب بصیرت نقاد و ادیب کی جانب سے نہیں ۔

کاش مولانا حالی ہمیں یہ بتاتے کہ عرفی، عرفی تھا اور غالب، غالب نظیری، نظیری تھا اور غالب، غالب ۔ ظہوری، ظہوری تھا اور غالب غالب ۔ اور مغربی نقادوں کی طرح، ان عظیم الشان شخصیتوں میں ہمیں ڈیٹس، شیلی، بائرن، کولرج کا سا ما بہ الامتیاز نمایاں کرکے دکھاتے سب کی خصوصیات اگر ایک نقطے پر منتہی ہوتی ہیں اور ان ہی کے غالب کی بھی، تو غالب نقال تھا، خداوند فطنت نہ تھا ۔

انوری اور عرفی، قصیدے میں حرف آخر کا مرتبہ رکھتے ہیں کی عظمت، ان کی آفریدگاری سے وابستہ ہے ۔ قصیدے کی سرزمین میں غ کی آفریدگاری، انھی اساتذہ کی ہم طرح و ہم منزلت ہے ۔ اسی بے قدرت، اسی صناعی، اسی نوک پلک کے ساتھ، مگر اپنی انفرادیت، اپنا ر لیے ہوئے غالب کے قصائد میں نمایاں ہے ۔

عرفی کہتا ہے :

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نہ خورد، نیشتر لا و نعم را

اس مطلع میں اخلاقی قدر نقطۂ عروج پر ہے ۔

اسی زمین میں غالب نے قصیدے کا مطلع کہا ہے اور مدت تم ہے ۔ اس وقت کہا ہے جب عرفی، اقلیم شہرت کا تاجدار بنا بیٹھا تھ اس کی معیاریت کا سکہ چلتا تھا ۔ اس لیے قدر و قیمت کے ہر پہلو میں، افزایش اور معتد بہ افزایش نہ ہو، محض تاخر کے گناہ کی بنا پر غالب

.طالع برابر کا مقابلہ نہیں کرسکتا - یعنی یہ کہ جب تک عرفی سے یہ مر سے بلند نہ ہو ، معرفین کی ذہنیت کو ، ہم بانکی محسوس نہیں کرا سکتا - غالب کا مطلع یہ ہے :

آوارۂ غربت نہ تواں دید صنم را
خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را

غالب نے اپنے تاخر کا خلا ، اپنی جمالیاتی حس کی ذکاوت ، حذاقت ، جدت ذوق نوی کی شدت و حلاوت سے پورا کیا - جمالیاتی خلاقی ، اعلاقی خلاقی سے اس لیے گراں تر ہے کہ دقت نظر کا مطالبہ کرتی ہے -

صنمیاتی جمال کے علاوہ ، اس مطلع میں آفاقی عنصیت کا شعور ، عرفی سے عمیق تر ہے - پیکر کی چستی کا جوش ، عرفی کا ہم نوع و ہم طرح ہے اور اپنی ' بے راہ روی ' کا اعلان و آوازہ عرفی پر مستزاد ہے -

قومی غیرت و تبختر کا جوش ، یہ سوال کر دینے پر اکساتا ہے کہ نامبردہ اساتذہ کا کلام ، غالب کے آفریدہ کیف شعر یا اُن عناصر کے بغیر ، جن کو اس نے ' بے راہ روی ' ' ژرف نگاہی ' ، سخن شگرف قرار دیا ہے ، معیار کیوں گردانا جائے - یعنی یہ کہ وہ کلام ، اس جہت سے معیار سے گرا ہوا کیوں نہ باور کیا جائے کہ اس میں غالب کے سے محاسن و معارف ناپید ہیں اور محض یہ اتفاق کہ وہ متقدم ہے ، اس کے آڑے نہیں آسکتا - تقدیم و تاخیر کی بنا پر محاسن کا فیصلہ کرنا وقت پرستی ہوئی کمال شناسی نہ ہوئی -

مولانا حالی اگر اپنے استاد کی فکر کا جائزہ لیتے تو وہ معاشرے کو یہ بتا سکتے تھے کہ اس کے قلب پر گرانی کا جو ایک ہمالیہ رکھا ہوا ہے ، اس کی اصل کیا ہے - اس کا سوز دروں ، اس کی قنوطیت نہیں ہے ، بلکہ بدیشی حکومت کے ملعون ورود نے اس کے دل میں آتش فشاں کا دہانہ شگافتہ کر دیا ہے - اس انکشاف سے وہ نوخیز متاخرین کی فکر بھی مشتعل کر سکتے تھے - میں مکتب کا پڑھا ہوا ، پرانی تربیت کا ایک کمترین انسان ہوں - حاشا ، یہاں مولانا حالی سے گستاخی مد نظر نہیں - میری طرف سے خود غالب ارشاد فرما گیا ہے :

شوخیٔ عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں

بالفرض محال ، عرفی ، نظیری ، ظہوری کا وجود نہ ہوتا تو غ
کی بے مثل و عدیل فطنت و قدرت کو کس معیار پر پرکھا جاتا - یہ بھی -
پیدا ہوتا ہے کہ ان ارباب کمال کو کس معیار پر پرکھا گیا - جواب یہ ہے
ان کے لیے کسوٹی بھی نئی بنائی گئی - یہی حق غالب کو بھی حاصل ت
لیکن اس کی زندگی میں معاشرہ ، اس نوع ذوق و نظر سے محروم ن
اس محرومی پر اس نے ملال بھی ظاہر کیا ہے :

جاہ ز علم بے خبر ، علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر نہ دید ، ہم زر من محک نہ خواست

اور انتباہ بھی دیا ہے :

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اس مقطعے میں ' محو ' اور ' منکر ' بلیغ اشارے ہیں - ' مح
کے معنی یہ ہیں کہ قدامت کے بت نے تجھے اپنا پرستار بنا کر تیرا فہم
کر دیا ہے - تیری مغلوب و اسیر ذہنیت میں عناصر ندرت و جدت پرک
کی صلاحیت نہیں رہی - ' منکر ' میں متانت کے ساتھ عظمت کی عالی حوص
مستور ہے - اپنی زبان سے اپنی ستایش پسند نہیں کرتا - اشارے سے م
کرتا ہے کہ غالب کے کمال کا انکار نہ کرو - ' زمانۂ تست ' انسان
فطرت پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور عہد کے ذوق محرومی و بے کیفی کا
ماتم گسار ہے - غالب کا مطالعہ نادرست اور احصا دور از کار نہ ت
محکوم قوم کے معائب کی تعداد معین کر لینا ، لب ساحل کے سنگ پار
گن لینے کی طرح محال ہے -

انیسویں اور بیسویں صدیوں میں مغرب والوں نے اپنے اہل ک
کو ابھارا ، اچھالا اور سر پر بٹھایا - ہماری قوم نے علی الرغم اپنے ہنرمند
کو بسارا ، اتارا اور گرانے کی کوشش کی - مغرب کے اور ہمارے رویے
فرق ، بلند و پست ، زندہ و مردہ ، چڑھاؤ اور اتار کا تضاد ہے - اس میں ھ

زیادہ قصور نہیں - میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ ہمارا حب وطن آج کس منزل میں ہے -

مولانا حالی نے غالب کے مزاج شعری یا اس کی فارسی دانی کی اہم سے اہم جو داد دی ہے ، وہ یہ ہے :

" خسرو اور فیضی کے بعد مرزا جیسا ادیب و شاعر ہندوستان کی سر زمین سے نہیں اٹھا " -

اس گرانمایہ داد سے غالب کی جلالت مآبی کا بیشک اندازہ ہوتا ہے - خسرو کے ذکر سے مولانا کے تحت الشعور میں اس دیوسار فضل و کمال کی ہمہ داں فطنت کا وہ زور جلال مستور تھا ، جس نے دول رانی خضر خاں اور لا ٰلی عمان جیسے کمال پارے خلق کردیے اور فیضی کے اسم گرامی سے اس دوار شخصیت کی علمیت و صلاحیت کا وہ فیضان ، جس نے نل دمن جیسے شعری صناعت پارے کی تخلیق سے ، ذہن انسان کی فراخی و کشادگی کی بشارت دی ، غالب بے شک و شبہ ، انھی فرزندان ہند کا ہم وزن و ہم سنگ ہے - ان ھی آفریدگاران کمال و صناعت کی طرح تمدن کا نشان منزل ہے - مولانا کی تحریر میں لفظ ' بعد ' سے صرف عہد کا تآخر مراد ہے - اس کے مفہوم سے خسران کا کوئی پہلو لازم نہیں آتا - اس کی انفرادیت اور مجددین کے مماثل نہیں ، ان کی ہم اساس و ہم گہر ہے -

غالب کے مزاج شعری کی پارسی افتاد مستعار نہیں ، طبع زاد ہے - وصف اضافی نہیں ، ہنر ذات ہے - اس کی خلقت کی طبعی و داخلی خصوصیت کے علاوہ معاشری و خارجی دلیل بھی ہے - زبان کے نشو و نما کے اس عہد تک اردو زبان میں اُن دقیق و کائناتی مفاہیم و مباحث کے صناعانہ حمل و قبول کی قوت پیدا نہ ہوئی تھی جو غالب کی فطنت اس میں سمو سکنے کی اہل و آرزو مند تھی - اس منزل میں فارسی کے مکلف انداز بیان سے استعانت ناگزیر تھی - چنانچہ تراکیب مستعار لینے اور حسب محل وضع بھی کرنے کی ضرورت پیش آئی - یہ بھی اس کی فطنت کا فیضان ہے کہ وہ اھلیت کے دوش بدوش ، اھلیت کا صائب و موزوں مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہوا - یعنی یہ کہ جو کمال آفرینی چاھتا تھا ، وہ کرسکا اور اس میں ایرانی ترنم سرائی کا مزاج بھی پیدا کرسکا - یہی وہ پہلو ہے جو اس کو پیش رو کہلواتا ہے اور جس کی نا فہمی سے معاشرہ ناحق اس کا دشمن بنا -

ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں بیدل کا انداز بیان نادر و بدیع ہے
غالب اس کی ندارت و بداعت کا نہ صرف معترف بلکہ مداح بھی ہے :

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا　　　اسداللہ خاں قیامت ہے

اسد تخلص سے ظاہر ہے کہ غالب میں یہ شعور اپنے دور شعری کے آ
ہی میں پیدا ہو گیا تھا ۔ اس مقطع میں ' طرز بیدل ' کا مفہوم فار
کیف و مزاج کی تراکیب کے ساتھ شعر کہنے کا مترادف ہے ۔ اس کی نوا فجائیہ
اور فجائیت میں سوال کے ساتھ نفی بھی محلول ہے ۔ یعنی میرے لیے دشوار تر
ہے ، اگر قیامت سمجھا جاتا ہے تو میں یہ قیامت برپا کر سکتا ہوں ۔

[غالب سے متعلق کتاب کا ایک باب

غالب کا اجتماعی احساس

(خطوط کے آئینے میں)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

بر عظیم پاک و ہند میں مغل سلطنت کے انحطاط کے ساتھ سیاسی کشمکش کا جو سلسلہ شروع ہوا ، وہ غالب کے زمانے تک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا تھا ۔ ملک کے بیشتر حصوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری قائم ہو گئی تھی ۔ مرہٹہ جنگ (۱۸۰۳ء - ۱۸۰۵ء) میں لارڈلیک نے ۱۸۰۳ء میں آگرے سے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کیا ۔ مرزا غالب کے حقیقی چچا نصراللہ بیگ ان فتوحات میں جنرل لیک کے ساتھ تھے ۔ فتح دہلی کے بعد کٹ پتلی مغل بادشاہ (شاہ عالم ثانی) جو پہلے مرہٹوں کے زیر اثر تھا ، اب کمپنی کے کنٹرول میں آ گیا ۔ اس کے بعد برعظیم میں کوئی ایسی بڑی قوت موجود نہیں تھی جو کمپنی کی یلغار کو روک سکے ۔ پنجاب کی سکھا شاہی ، کمپنی کے مقبوضات اور افغان سلطنت کے مابین ایک عارضی بفر سٹیٹ کا کام دے رہی تھی ۔ کمپنی کی باج گزار دیسی ریاستیں ' سب سڈی ایری سسٹم ' اور الحاق کی حکمت عملی کے تحت جاں کنی کی حالت میں تھیں ۔ اس طرح عملاً سارا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں آ چکا تھا اور کشت وخون کا وہ بازار قدرے سرد پڑ گیا تھا ، جو اٹھارویں صدی میں مغلوں کے مرکزی نظام حکومت کی کمزوری کی وجہ سے خاصا گرم رہا تھا ۔ نظم و نسق کے قیام سے اجتماعی زندگی بظاہر پر سکون ہو گئی تھی ۔ کاروبار ، رسل و رسائل اور زراعت وغیرہ معمول پر آ گئے تھے ۔ اجڑے ہوئے نگر آباد ہونے لگے تھے ۔ کمپنی کا مرکز حکومت اگرچہ کلکتہ تھا ، لیکن دہلی انگریزی تسلط کے بعد پھر آباد ہونے اور اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے لگی ۔ لال قلعے کا شاہی اقتدار تو

ایک عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا لیکن برائے نام مغل بادشاہ کے نام سے اس کا ایک بھرم سا باقی رہ گیا تھا ۔

سیاسی کشمکش یا جنگ و جدل کا سلسلہ ختم ہوکر ماحول بظاہر پرسکون ہو گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی جنگ کا ایک دوسرا مرحلہ شروع ہوگیا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار نے ملک سے بد امنی اور شورش تو ختم کردی ، لیکن خود یہ اقتدار جس صورت میں قائم ہوا وہ یہاں کے تاریخی حالات اور تہذیبی روایات کے منافی تھا ۔ اگر مغل سلطنت کو ختم کر کے برسراقتدار آنے والی طاقت یہاں کے حالات و روایات کے مطابق ہوتی اور حاکم و محکوم کے درمیان رنگ و نسل اور تہذیب و تمدن کی مغائرت کی اونچی دیواریں حائل نہ ہوتیں ، تو یہ انقلاب حکومت ملک کے لیے بڑا خوش آیند ہوتا ۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ نئے فاتحین اجنبی تھے اور اجنبی بن کر ہی یہاں اپنا راج قائم کرنا اور ملکی دولت کا استعمال کرنا چاہتے تھے ۔ سامراج کا یہ وہ انوکھا روپ تھا جس سے بر عظیم کے باشندوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا ۔ اس لیے قدرتی طور پر نئے نظام حکومت سے یہاں کے باشندوں کی ذہنی و جذباتی مفاہمت ممکن نہیں تھی ۔ مغل سلطنت جیسی تھی یہاں کے باشندوں کے لیے بلا امتیاز مذہب و ملت ایک طرح کی قومی حکومت کا درجہ رکھتی تھی ۔ کمپنی کی حکومت نفسیاتی طور پر اس کی جگہ پر نہیں کر سکتی تھی ۔ اس لیے کمپنی کی عملداری قائم ہوجانے کے باوجود ملک کے جمہور ذہنی طور پر برائے نام مغل بادشاہ سے عقیدت رکھتے تھے ۔

کمپنی کی حکومت کے قیام کے ساتھ ملک میں جو معاشی ، تعلیمی ، تہذیبی اور معاشرتی تبدیلیاں ظہور میں آرہی تھیں ، اُن کو جمہور بجا طور پر شک اور شبہے کی نظر سے دیکھ رہے تھے ۔ لیکن چونکہ عملاً بے بس ہو چکے تھے ، اس لیے بے چینی اور اضطراب کی ایک داخلی لہر تھی جو قلب و ذہن میں پھیلتی جارہی تھی ۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ذہنی و جذباتی کشمکش کا یہ سلسلہ شروع ہوا ، اور کمپنی کے مقبوضات میں توسیع کے ساتھ ساتھ یہ اندرونی اضطراب بھی بڑھتا گیا ۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں یہ آتش فشاں لاوا انتہا تک پہنچ کر پھٹ پڑا ۔ لاکھوں انسانوں کی قربانی لے کر یہ آگ فرو ہوئی اور بر عظیم پر اجنبی سامراج کا تسلط ایک تاریخی حقیقت بن گیا ۔

غالب کی ذہنی نشو و نما اس پر اضطراب اجتماعی ماحول میں ہوئی

والد اور چچا کی وفات کے بعد بچپن ہی سے انھیں سنگین حالات سے دوچار ہونا ، اور آرزوؤں اور خواہشوں کی لامتناہی فضاؤں میں رہتے ہوئے زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہو کر اپنا راستہ بنانا پڑا ۔ غالب ایک رومانی ادیب و شاعر تھے لیکن عملی زندگی میں ہم انھیں ایک حقیقت پسند اور معاملہ فہم انسان کی طرح اپنے نجی مسائل و معاملات سلجھاتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔ اپنی پنشن کے جھگڑے کے سلسلے میں کلکتے تک کا سفر ، سرکار انگریزی میں اپنے موروثی تعلقات کی بنا پر حصول عزت وجاہ کی کوشش ، قلعۂ معلیٰ کے وظیفے اور مصاحبت شاہ کے علی الرغم ''کوئین پوئیٹ'' بننے کے لیے تگ و دو ، یہ وہ مراحل تھے جن سے وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے گزرے ۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں کمپنی کی حکومت کی نہ تو خیر خواہی کی اور نہ ہی اس سے کوئی بے وفائی کی (۱) ، اور پھر انقلاب کے بعد جب ملکی باشندے جرم و سزا کے شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آتے تھے ، غالب کا اپنی پنشن کی بحالی کے لیے کوشش کرنا اور حکام سے رابطہ قائم کر کے اپنے بارے میں شکوک و شبہات کو رفع کرنا ، یہ سب باتیں عملی زندگی میں ذاتی سطح پر بڑی حقیقت پسندانہ ہیں ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کاروبار زندگی میں اپنے ماحول سے مفاہمت کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور جیسا موقع ہوتا تھا اُس کے مطابق کارروائی عمل میں لاتے تھے :

'' چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو ۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے ، ویسا عمل میں آتا ہے ''۔

[خط بنام میر مہدی مجروح ، خطوط غالب ، مرتبہ مہر ، صفحہ ۲۹۳]

عملی زندگی کا یہ وہ میدان تھا جس میں ایک عام دنیا دار فرد کی حیثیت سے غالب کو حالات سے مفاہمت کرکے زیست کو اپنے اور اپنے لواحقین کے لیے خوشگوار بنانا پڑ رہا تھا ۔ بعض اوقات اپنی مطلب براری کے لیے غالب خودداری کے معروف مفہوم سے بھی گزر کر حالات سے سمجھوتہ کرتے نظر آتے ہیں ۔ یہ بات اُن کی شاعرانہ انا کے برعکس معلوم ہوتی ہے (۲) ۔ لیکن

۱۔ بحوالہ مکاتیب غالب ، خط نمبر ۱۶ ، مرقومہ ۷ نومبر ۱۸۵۹ء

۲۔ شاعری میں تو غالب کی خود شناسی کا یہ عالم ہے کہ :

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس واقعہ کا کیا کیجیے۔ جو لوگ غالب کو ایک قومی ہیرو کی حیثیت دیکھتے اور انھیں بشری کمزوریوں سے مبرا سمجھتے ہیں، آن کے لیے شاید باتیں ناقابل قبول ہوں ، لیکن حقیقت موجود ہو تو اس سے گریز اچھا ہوتا ۔ غالب کو ایک عام فرد کی طرح زندگی میں اگر اس طرح کے سمجھو کرنے پڑے تو اس میں آن کی بشری کمزوریاں اور حالات کی مجبوریاں قابل لحاظ ہیں ۔ لیکن جہاں تک آن کے ذہنی عمل اور شاعرانہ فکر و احد کا تعلق ہے ، ضروری نہیں کہ عملی زندگی کی یہ مفاہمتیں اس کے راستے بھی حائل ہوتی ہوں ۔ شاعر کا جسم اگر حالات کا پابند ہوتا ہے تو یہ ا اس نہیں کہ اس کی روح بھی حالات میں جکڑی ہوئی ہو ۔ ایک انسا زندگی کو یوں دو خانوں میں تقسیم کرنا طبیعی لحاظ سے شاید ممکن نہ مگر اس کا دیا جائے کہ شاعر اور فن کار اس معاملے میں بالعموم دو دن میں گھومتے نظر آتے ہیں ۔ ایک دنیا ہم آپ اور شاعر سب کی ہے؛ دوسری آرزو کی وہ دنیا جہاں شاعر کا فکر و احساس مادی آرائشوں سے قد بلند ہو کر تخیل کے وسیع مرغزاروں کی گلگشت کرتا ہے ۔ تخیل اور حقیقہ یہ کشمکش زندگی میں لازمی ہے ۔ انسان جتنا زیادہ حساس ہوگا ، اتنی ہی یہ کشمکش شدید ہوگی ۔ غالب کا اجتماعی احساس اس لحاظ سے غالب آس طرز عمل سے ، جو عام کاروبار زیست میں حالات سے مفاہمت کے ا پر مبنی ہے ، خاصا الگ معلوم ہوتا ہے ۔ اس کا اظہار آن کی شاعری میں ہوا ہے اور خطوط میں بھی ۔ چونکہ شاعری میں (خصوصاً غزل م صراحت کم اور خارجی ماحول کے بارے میں رمز و کنایہ کا زیادہ ہوتا ہے ، اس لیے یہاں فکر و احساس کی صحیح جہت کا اندازہ قدرے دشوار ہے ۔ خطوط میں یہ بات نہیں ہوتی ۔ یہاں ہم شا کی بحث کو الگ رکھتے ہوئے خطوط کے آیینے میں غالب کے اجتماعی احد کا مطالعہ کرتے ہیں ، تاکہ ذہنی کشمکش کے اس دور میں غالب کی سو یہ رخ واضح ہوجائے ۔ پھر اس کے حوالے سے آن کی شاعری کا تجزیہ آسانی سے ہو سکتا ہے ۔

خطوط غالب میں ایک رویہ تو حالات سے مفاہمت اور موقع کے مد کارروائی کرنے کا ملتا ہے ، جو غالب کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کو کرتا ہے ۔ معاملے کے اس پہلو کے علاوہ خطوط غالب میں حالات و واقعات

بارے میں وہ ذہنی رد عمل بھی ملتا ہے ، جس کا تعلق محض غالب کی ذات سے نہیں بلکہ اُن کے اجتماعی ماحول سے تھا ۔ اس ذہنی رد عمل سے ہم غالب کے اجتماعی احساس کا اندازہ کرسکتے ہیں اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے قلب و ذہن میں اس انقلاب زمانہ پر کیا محسوس کر رہے تھے ۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل کمپنی کے پنشن خوار اور شاہ کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے غالب کی روزی کا سامان بنا ہوا تھا ۔ کمپنی کی حکومت میں مغل بادشاہت کی آخری نشانی کا وجود نفسیاتی طور پر کشمکش کا ایک اہم مظہر تھا ۔ اگرچہ یہ کشمکش ایک نقطہ ارتقا کی طرف بڑھ رہی تھی اور سوچنے والے لوگوں کے ذہن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے ۔ خصوصاً الحاق کی پالیسی کے مطابق جس طرح دسی ریاستیں اور موروثی امارتیں ختم کی جارہی تھیں ، اس سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آ گئی تھی کہ مغل بادشاہت کی آخری نشانی اب قلعہ معلیٰ میں آخری دموں پر ہے ۔ ۱۸۵٦ء میں انتزاع سلطنت اودھ ایک بڑے حادثے کی طرح ظہور میں آیا ۔ یہ حادثہ بھی آیندہ حادثات کا پیش خیمہ تھا ۔ غالب نے اس موقع پر جو کچھ محسوس کیا ، اس کا اظہار ایک دوست کے نام خط میں اس طرح کیا :

> " ... آپ ملاحظہ فرمائیں ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے ؟ اور کی فیض رسانی اور قدر دانی کو کیا روئیں ، اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں ۔ تباہی ریاست اودھ نے با آنکہ بیگانہ محض ہوں ، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا ، بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت نا انصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے ' اللہ ہی اللہ ہے ! "

[خط بنام میر غلام حسنین قدر بلگرامی ، ۲۳ فروری ۱۸۵۷ء]

انقلاب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ۱۱ مئی کو برپا ہوا ۔ یہ خط ۲۳ فروری کو یعنی اس واقعہ سے تقریباً ڈھائی ماہ پیشتر لکھا گیا ۔ اس میں جس واقعے (انتزاع سلطنت اودھ) پر افسردہ دلی کا اظہار کیا گیا ہے ، وہ اُن بے شمار واقعات میں سے ایک تھا ، جو بتدریج کشمکش کو تیز تر اور انقلاب کے ہنگامے کو قریب تر لارہے تھے ۔ خود دھلی کی ' بزم آخر ' میں ، خصوصا اس کی ٹمٹماتی ہوئی آخری شمع ' قلعہ معلیٰ ' میں جو کچھ ہو رہا تھا ، وہ

سب غالب کی نگاہوں کے سامنے تھا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت جس تدریج کے ساتھ اس شمع کو گل کرنے کے لیے اقدامات کر رہی تھی اور لال قلعے کے بے دست و پا تاجدار اور اس کے وابستگان دامن دولت جس بے بسی سے ان حالات کے بہاؤ میں بہہ رہے تھے ، اس کا اندازہ اس خط سے لگایے جو واقعہ انقلاب سے تین برس پیشتر لکھا گیا :

''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا ۔ قلعے میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر غزل خوانی کر لیتے ہیں ۔ وہاں کے مصرع طرحی کو کیا کیجیے گا ، اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا ؟ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا ، اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے ، اس کو دوام کہاں ؟ کیا معلوم ہے اب ہی نہ ہو ، اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو'' !

[بنام قاضی عبدالجمیل جنون ، ۱۸۵۴ء ، خطوط غالب ، ص ۵۲۰]

آخر وہ حادثہ پیش آ کر رہا جس کا ایک مدت سے انتظار تھا ۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو انقلاب کا آغاز ہوا ، اور کمپنی کی باغی سپاہ نے دہلی پہنچ کر مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے نام پر یہاں کا نظم ونسق سنبھالا ۔ ستمبر ۱۸۵۷ کے تیسرے ہفتے میں انگریزی سپاہ ، سکھ لشکر کی معیت میں دوبارہ دہلی پر قابض ہوئی اور 'کالوں' کے ہنگامے کے بعد 'گوروں' کی انتقامی کارروائی اور قتل و غارت گری شروع ہوئی ۔ اس طرح برعظیم کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔ دہلی میں مغلیہ بادشاہت کی آخری شمع بجھ گئی ۔ اس کے ساتھ کمپنی کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے زیر سایہ آ گیا ۔

یہ انقلاب عظیم غالب کی نگاہوں کے سامنے برپا ہوا ۔ وہ اس خونیں ہنگامے کے عینی شاہد ، بلکہ اس قلزم خوں کے شناور تھے (۱) ۔ ہر چند کہ ہنگامہ انقلاب کے فرو ہو جانے کے بعد روزی کی مشکلات اور پنشن کی باز یافت کے لیے غالب کو وہ سب کچھ کرنا پڑا ، جو ایک عام دنیا دار انسان

۱۔ '' میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں'' ۔ [خط بنام چودھری عبدالغفور سرور ، ستمبر ۱۸۶۰ء]

ایسے حالات میں کرتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُن کا اجتماعی احساس اس تہذیبی المیے پر خون کے آنسو بہائے بغیر بھی نہ رہ سکا ۔ خون جگر کے ان قطروں کی تھوڑی سی جھلک تو اس قطعے میں ملتی ہے جو غالب نے علاءالدین علائی کے نام ایک خط (محررہ ۱۸۵۸ء) میں لکھا ہے :

بسکہ فعال مایرید ہے آج ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دھلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے ' یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب کیا مٹے دل سے داغ ھجراں کا

اس کے علاوہ خطوط میں بھی غالب نے اپنے قلبی جذبات کا اظہار کیا ہے ۔ یہ اظہار وہ برملا نہیں کر سکتے تھے ۔ انگریزی دار و گیر میں صاف صاف لکھنا اور ایسے ڈاک کے سپرد کرنا ممکن نہیں تھا (۱) ۔ پھر بھی غالب

۱۔ اس ذھنی گھٹن کا اظہار غالب کے بعض خطوں میں ہوا ہے ، مثلاً:

" آدمی تو آتے جاتے رہتے ھیں ۔ خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو ۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا ۔ ورنہ قصہ مختصر ، تمام ہوا ۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں "۔

[خط بنام مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب ، ۸ فروری ۱۸۵۸ء]

" مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے ۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ھیں " ۔

[خط بنام منشی ہر گوپال تفتہ ، ۵ دسمبر ۱۸۵۶ء]

(جاری)

نے واقعہ انقلاب کے سلسلے میں حالات و کوائف بیان کرتے ہوئے دیے د۔
میں اپنے تاثرات و احساسات بھی پیش کردیے ہیں ۔ انقلاب کے بار۔
مذکورہ بالا قطعے کے علاوہ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں اس
عظیم کو وہ جس خیال انگیز پیرائے میں بیان کرتے ہیں ، اس سے
دل کی کیفیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے :

" صاحب ! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا وا
ہوا ؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے ا
طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے
شعر کہے ، دیوان جمع کیے ۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے ک
وہ ہمارے تمارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام ا
حقیر تخلص تھا ۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا ، نہ وہ معاملات ، ن
وہ اختلاط ، نہ وہ انبساط ۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم ک
ملا ۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہہ مثل پہلے جنم کے ہے
یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا ، اس
جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منش
ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو ، آج آیا ، اور میں جس شہر می
ہوں ، اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے
لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا ۔ واللہ

(سابقہ صفحے سے)

" انصاف کرو ، لکھوں تو کیا لکھوں ؟ کچھ لکھ سکتا ہوں !
کچھ قابل لکھنے کے ہے ؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا ؟ او
اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں ؟ بس اتنا ہی ہے ک
اب تک ہم تم جیتے ہیں ۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں
لکھوں گا "۔

[خط بنام حکیم غلام نجف خاں ، ۲۶ دسمبر ۸۵۷

" قلم ہاتھ میں لیے ہر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے ، مگر
کچھ نہیں لکھ سکتا ۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے ، تو کہہ لیں گے ،
ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون "۔

[ایضاً ، ۱۹ جنوری ۸۵۸

ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا ۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں ۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں ''۔

[شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء ، خطوط غالب ، مرتبہ مہر ، صفحہ ۱۰۲]

اس انقلاب عظیم کو دو جملوں کی تمثیل سے بہتر انداز میں پیش کرنا غیر ممکن ہے !

دہلی اور لکھنؤ کے قدیم تہذیبی گہواروں کا مٹنا کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا ۔ غالب نے اس پر کوئی باقاعدہ مرثیہ تو نہیں لکھا لیکن وہ اس تہذیبی المیے کو محسوس کیے اور مضطرب ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ اس احساس و اضطراب کا اظہار خطوط میں جا بجا ہوا ہے :

'' خداوند نعمت ، کیا تم دلی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو ، جو حضرت شیخ (۱) کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخرالدین علیہ‌الرحمہ کا حال پوچھتے ہو ؟ این دفتر را گاؤ خورد ، گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد '' ۔

[خطوط غالب ، مرتبہ مہر ، صفحہ ۴۳۰]

'' لکھنؤ کا کیا کہنا ، وہ ہندوستان کا بغداد تھا ۔ اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی ، جو بے سروپا وہاں پہنچا ، امیر بن گیا ۔ اس کی یہ فصل خزاں ! ''

[خطوط غالب ، صفحہ ۴۳۷]

'' بھائی ، کیا پوچھتے ہو ؟ کیا لکھوں ؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی ۔ قلعہ ، چاندنی چوک ، ہر روز مجمع جامع مسجد کا ، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی ، ہر سال میلہ پھول والوں کا ۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں ۔ پھر کہو دلی کہاں ؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا ''۔

[خطوط غالب ، صفحہ ۲۹۳]

۱۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی (بحوالہ خطوط غالب ، مرتبہ مہر)

" بھائی ، ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا ۔ لاکھوں مر گئے ۔ جو زندہ ہیں ، ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں ۔ "

[خطوط غالب ، صفحہ ۲۰۶]

" پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا ۔ پہلا باغیوں کا لشکر ، اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا ۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا (۱) ، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے ۔ تیسرا لشکر کال کا ، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے ۔ چوتھا لشکر ہیضے کا ، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے ۔ پانچواں لشکر تپ کا ، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی " ۔

[خطوط غالب ، صفحہ ۳٦۷]

" ۷ نومبر ، ۱۴ جمادی الاول سال حال (۱۲۷۹ھ/۱۸٦۲ء) جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوئے ۔ اناللہ و انا الیہ راجعون ۔ "

[خطوط غالب ، صفحہ ۳۱۴]

واقعۂ انقلاب کے نتیجے میں مجلسی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ، تو غالب نے بہت ہی شدت سے محسوس کیا بلکہ غالب کی اردو خط نویسی اسی مجلسی خلا کو پر کرنے کی ایک کوشش تھی جس کے انھوں نے مراسلے کو مکالمے کی صورت دی ہے ۔ صاحب عزت لوگوں دارو گیر کا شکار ہونا اور احباب کا شہر بدر ہو کر بچھڑ جانا ، ایک ایسا اجتما حادثہ تھا جسے غالب نے نجی طور پر بھی محسوس کیا اور اجتماعی طور بھی وہ اس سے متاثر ہوئے :

" مگر دیکھا چاہیے ، درخت جگہ سے اکھڑ کر بدشواری جمتا ہے ۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں ۔ "

[بنام میر مہدی مجروح ، ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء]

۱۔ یعنی انگریزوں کا جن کی وردی خاکی تھی ۔

غالب نے اپنے احباب کے نام کئی خطوں میں دھلی کی بربادی اور پھر اس کی بتدریج آبادی کے سلسلے میں متعدد واقعات بیان کیے ھیں۔ یہ بیانات اس دور کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کے سلسے میں بہت اہم ھیں۔ واقعات کے بیان کے ضمن میں بعض جگہ وہ اہم سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں اپنے تاثرات بھی پیش کر جاتے ھیں۔ ان تاثرات کی روشنی میں ہم اس نازک دور کی ذھنی کیفیات کی ایک جھلک دیکھ سکتے ھیں۔ مثلاً انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جو اہم سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، ان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ اور برعظیم کا براہ راست تاج برطانیہ کے زیر سایہ آنا تھا۔ غالب اس تبدیلی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ھیں:

"حضرت، یہاں دو چیزیں مشہور ھیں، ان کے باب میں آپ سے تصدیق چاھتا ھوں۔ ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ھیں کہ آگرے میں اشتہار جاری ھو گیا ھے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ھے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاھی عمل ھندوستان میں ھوگیا۔ دوسری خبر یہ کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر گورنمنٹ کلکتہ کے چیف سکرٹر اکبر آباد کے لفٹنٹ گورنر ھوگئے۔ خبریں دونوں اچھی ھیں خدا کرے سچ ھوں"۔

[بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء]

یہ ایک تاریخی حقیقت ھے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں برعظیم کے سب باشندے بلا امتیاز مذھب و ملت شریک تھے۔ لیکن آتش انقلاب کے فرو ھونے کے بعد برطانوی حکومت نے سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپا اور 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی حکمت پر عمل کرتے ھوئے ھندوؤں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کی بیخ کنی کا سلسلہ شروع ھوا۔ دھلی میں مسلمانوں کو شہر بدر کرنے اور مسلمان شرفا کے دار و گیر کا شکار ھونے کے اکثر واقعات خطوط غالب میں بیان ھوئے ھیں، جن سے ھندو مسلم کی اس نئی سامراجی تفریق کا اظہار ھوتا ھے۔ بعض جگہ معاملہ اس سے مختلف بھی تھا۔ مثلاً لکھنؤ کے بارے میں غالب ایک خط میں لکھتے ھیں:

"بھائی، لکھنؤ میں وہ امن و امان ھے کہ نہ ھندوستانی عمل داری میں ایسا امن و امان ھوگا، نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے

انگریزی عمل‌داری میں بے چین ہوگا ...... اور ایک نقل سنو ، وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے ہوئے ہیں ' اہل اسلام نہیں ، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا ۔ یہ آفت تو دلی پر ٹوٹ پڑی ہے ۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عمل‌داری کی وہ صورت ہے ، جو غدر سے پہلے تھی ۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں ۔ میں نے بھی دیکھے ۔ فارسی عبارت یہ ہے '' ٹکٹ آبادی درون شہر دہلی بشرط ادخال جرمانہ ''۔ مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے ۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے ''۔

[بنام میری مہدی مجروح ' فروری ۱۸۵۹ء

نئے دفتری نظام کے بارے میں بھی غالب نے اپنے بعض خطوط میں اظہار خیال کیا ہے ۔ ہنگامہ' انقلاب کے بعد غالب نے اپنی پنشن کی بازیافت کے لیے جو کوششیں کیں اور اس سلسلے میں انھیں جن مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ' اس کا اظہار بھی خطوط میں خاصی تفصیل سے ہوا ہے انگریز حکام سے ملاقاتوں میں بعض اوقات عزت نفس کو ٹھیس لگتی تو و صبر کا دامن پکڑتے ' اور جب کبھی باریابی کے موقع پر حسن سلوک کا اظہا ہوتا تو حکام کی تعریف و توصیف کے پل باندھتے ۔ اس طرح غالب ک دفتری نظام کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا ۔ بعض موقعوں پ انھوں نے دفتری نظام پر تنقید بھی کی ہے ۔ خصوصاً انقلاب کے بعد ہنگام حالات میں ' سکھا شاہی ' کی طرح ' گورا شاہی ' کا جو سلسلہ دراز رہا غالب نے اس کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار جابجا کیا ہے :

'' نقل حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقل لینی ، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہوجائیں ۔ حکام بے پروا ، مختار عدیم الفرصت ، میں پا شکستہ ... ''

[خطوط غالب ، صفحہ ۲۰۰

'' تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھوگے ۔ کیسا نوٹد رائے ، کیسی نقل حکم ، کیسا مرافعہ جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں ، وہ احکام قضا و قدر ہیں ۔

ان کا مراسلہ کہیں نہیں۔ "

[خطوط غالب، صفحہ ۴۰۳]

" ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممو بے گناہ ثابت ہوچکے، رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہوچکا، صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے، مسل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا: حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ ' میں '۔ پھر پوچھا: حافظ ممون کون؟ عرض کیا کہ ' میں ' اصل نام میرا محمد بخش ہے ' ممو ممو مشہور ہوں '۔ فرمایا: یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مسل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممو اپنے گھر چلے آئے "۔

[خطوط غالب، صفحہ ۴۰۵]

" اے لو، کئی دن ہوئے حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھیے حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نونڈ رائے کی مختار کاری پر قناعت کی گئی، جو کچھ ہونا ہے وہ ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سر نوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے، نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے "۔

[خطوط غالب، صفحہ ۴۰۶]

" زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا کہ دلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلاد شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے، نہ قانون ' نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے، وہ ایسا ہی کرے "۔

[خطوط غالب، صفحہ ۴۷۶]

غالب کے اشک غم کی جھلک یوں تو علائی، تفتہ اور مجروح کے نام خطوط میں جا بجا ملتی ہے، لیکن یوسف مرزا کے نام مندرجہ ذیل خط میں انہوں نے جس طرح اپنے ذاتی اور اجتماعی غم کی روداد بیان کی ہے، اس سے

ان کے داخلی جذبات و احساسات پوری طرح واضح ہوتے ہیں ۔ ہر حالت میں خوش رہنے اور زندہ دلی کا احساس دلانے والا غالب ہجوم غم کے آگے سپر انداز تو نہیں ہوتا لیکن شدت کرب سے تڑپ ضرور اٹھتا ہے :

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں ، پیالا و ساغر نہیں ہوں میں

" یوسف مرزا، میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا ۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں ، عقل جاتی رہتی ہے ۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو کیا عجب ہے ، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے ۔ پوچھو کہ غم کیا ہے ؟ غم مرگ ، غم فراق ، غم رزق ، غم عزت ۔ غم مرگ میں قلعہ' نا مبارک (۱) سے قطع نظر کرکے اہل شہر کو گنتا ہوں ۔ مظفرالدولہ ، میر ناصر الدین ، میرزا عاشور بیگ ، میرا بھانجا ، اس کا بیٹا احمد میرزا ، انیس برس کا بچہ ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں ، قاضی فیض اللہ ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا ؟ اے لو ، بھول گیا ۔ حکیم رضی الدین احمد خاں ، میر احمد حسین میکش ، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں ؟ غم فراق حسین میرزا ، میر مہدی ، میر سرفراز حسین ، میرن صاحب ، خدا ان کو جیتا رکھے ۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے ، وہاں خوش ہوتے ! گھر ان کے بے چراغ ، وہ خود آوارہ ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں ' کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے ۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے ، مگر میں علی کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے ۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ ہوگیا۔ اس کی بیٹی ، اس کے چار بچے ، اس کی ماں یعنی میری بھاوج ، جے پور میں پڑے ہوئے ہیں ۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا ۔ بھتیجی کیا کہتی

۱۔ لال قلعے کو مبارک کہتے تھے ۔ اس کے حوادث کی وجہ سے غالب کو پے در پے رنج پہنچے تو شدت غم میں اسے ' نا مبارک ' کہہ دیا۔

ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز، یہ باہر مداری کی جورو بچے بدستور گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں، اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم (۱) سے کچھ آنے جاتا ہے اور بقدر سد رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں۔ دیو نہیں، بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟"

[۲ جمادی الاول ۱۲۷۶ھ / ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء]

ذاتی اور اجتماعی ماحول کے اس دکھ ساگر میں سانس لیتے ہوئے بھی غالب نے اگر خوش طبعی کے دیپ جلائے، تو یہ بڑے حوصلے کی بات ہے!

۱- رام پور۔

(بحوالہ خطوط غالب، مرتبہ مہر، صفحہ ۲۱۱)

غالب، مرات الاشباہ اور حکیم احسن اللہ

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

۱۹٦۷ء میں برٹش میوزیم لندن میں فارسی مخطوطہ بنام ''مرأت الاشباہ'' دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ اس کی تفصیل فہرست نگار ڈاکٹر چارلیس ریو نے یوں دی ہے :

''مرأت الاشباہ ۔ سلاطین آسمان جاہ ، سلاطین تیموریہ ہندوستان کی یہ جدولیں ان کی تاریخ پیدائش ، مقام جلوس ، تاریخ وفات وغیرہ (مع مختصر حالات) بہم پہنچاتی ہیں ۔ اس کا مصنف فخرالدین حسین ہے ۔ اس میں امیر تیمور سے لے کر اس کے جانشین ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ (جو ۱۲۵۳ھ میں تخت نشین ہوا) کے تیرھویں سال جلوس (مطابق ۱۲٦٦ھ) تک کا بیان ہے ۔ اس کے مصنف نے اسے حکیم احسن اللہ خاں ، مصور غلام علی خاں اور بابر علی خان کی اعانت سے سر انجام دیا ہے ۔ اس میں جگہ چھوڑ دی گئی ہے تاکہ اسے معاصر تصاویر شاہان سے مکمل کیا جائے'' ۔

(فہرست فارسی مخطوطات ، صفحہ ۲۸۰)

آج تک اس مختصر فارسی مخطوطے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی ۔ غالب کے ضمن میں حکیم احسن اللہ خان کی شخصیت خاصی اہمیت رکھتی ہے ۔ میری نظر سے ''مرأت الاشباہ'' (فارسی) مطبوعہ صورت میں نہیں گزری ، خیال ہے کہ ہنوز طبع نہیں ہوئی ۔

خوش قسمتی سے ''مرأت الاشباہ'' کا اردو ترجمہ مطبوعہ صورت میں میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے جو ۱۸۷۸ء میں طبع ہوا تھا ۔ مطبوعہ

کتاب کے چھ صفحات کا عکس جو براہ راست غالب سے تعلق رکھتے ہیں ، یہاں پیش کرتا ہوں ۔ پہلے عکس سے یہ واضح ہے: ''کتاب لب لباب حالات فرمارواہان ہند مسمی بہ مرأت الاشباہ معہ مختصر حالات وزرائے اودھ مولفہ من مہتمم مطبع ھذا المتخلص بہ شیدا در مطبع مرتضوی محمد ارتضیٰ خاں طبع نمود ۱۸۶۸ء'' ۔ دوسرا عکس مطبوعہ کتاب کا صفحہ اول ہے جس سے واضح ہے کہ محمد ارتضیٰ خان مہتمم مطبع مرتضوی دھلی نے رسالہ مرأت الاشباہ (مولفہ احترام الدولہ ، عمدۃ الحکما ، معتمد الملک ، حاذق العہد و الآوان حکیم احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ) کو لوگوں کے اصرار پر فارسی سے اردو میں عبارت سلیس اور عام فہم میں خلاصہ کیا اور کچھ مختصر حالات دیگر کتب تاریخ سے لے کر ناظرین کی خاطر اضافہ کیے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مرأت الاشباہ کے مصنف حکیم احسن اللہ خان تھے ۔ نیز یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی اردو تلخیص (مع اضافہ) ۱۸۶۸ء میں طبع ہوئی ۔ یاد رہے کہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا ۔

تیسرے اور چوتھے عکس کا تعلق کتاب کے صفحات ۶۷ و ۶۸ سے ہے۔ ان میں شعرائے دھلی کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ترجمہ' غالب انھیں صفحات میں ہے ۔ پانچویں اور چھٹے عکس مرأت الاشباہ کے آخری صفحات ۱۰۳ و ۱۰۴ کے ہیں ، جن سے کتاب کی اہمیت واضح ہوتی ہے ۔ (۱)

حکیم احسن اللہ خان سر سید کے معاصرین میں سے تھے ۔ سرسید نے حکیم احسن اللہ کا ذکر اپنی تالیف '' آثار الصنادید '' (مولفہ ۱۸۴۷ء) میں تذکرہ' اہل دھلی کے تحت کیا ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کا خاندان ہراتی الاصل تھا اور کشمیر میں آ کر آباد ہوا تھا ۔ کشمیر میں

۱۔ مرأت الاشباہ کی طباعت پر پہلا قطعہ محمد مظہر حسن مظہر نامی شاعر کا ہے ۔ مظہر کا حال تذکرہ' سخن شعرا میں صفحہ ۴۴۸ پر ملتا ہے ۔ دوسرا قطعہ سید جمعیت علی کا ہے ۔ آخری تین قطعات محمد صادق علی مداح کے ہیں جو مرزا غالب کے شاگرد تھے ، ان کا ذکر بھی تذکرہ' سخن شعرا میں صفحہ ۴۲۶ پر ملتا ہے ۔ ان قطعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دھلی میں ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں طبع ہو گئی تھی ۔

لمن الملک الیوم لله الواحد القهار

المنت مدرک کتاب لب لباب حالات فرمان روایان ہند مسمی بہ

مرآت الاشباہ

معہ مختصر حالات وزرای اودھ مؤلفہ من مہتمم مطبع ہذا المتخلص بہ شیدا

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد حمد خدا و نعت ختم انبیاء کے ہیچمدان کج مج زبان محمد مرتضیٰ خان مہتمم مطبع مرتضوی
دہلی کی رسالہ مرات الاشباہ سلاطین خاندان تیموریہ مؤلفہ احترام الدولہ عمدۃ الحکما
معتمد الملک حاذق الزمان حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ کو
بہ تکلیف بعض احباب زبان فارسی سے اردو میں بعبارت سلیس عام فہم خلاصہ کیا
اور کچھ کچھ حال مختصر دیگر کتب تواریخ سے بھی ایزاد کیا گیا ناظرین کی خدمت
بابرکت میں التماس ہے کہ اگر کسی جگہ سہو یا غلطی ہوئی ہو بنظر چشم پوشی معاف فرماویں

❁ بر کریمان کارہا دشوار نیست ❁

یگانہ حکیم محمد نسیم الدین خان انکی اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ احاطۂ تحریر اور حیطۂ تقریر سے باہر ہین اور انکے واسطے حضرت کے مروت جبلی اور خلق طبعی سے باہر ہین شافی مطلق نے وہ دست شفا بخشا ہے کہ آجتک یہ کبھی نہ سنا ہے جو مریض کہ دوا ہو انکی علاج سی ایک دم مین اچھا نہ ہوا

حکیم حسام الدین خان عرف حکیم نجفی صاحب

حکیم حکیم نکتہ طبیب با فرہنگ افلاطون زمان حکیم حسام الدین خان خلف الصدق حکیم نجف خان مرحوم مغفور۔ یہ صاحب نبض شناسی مین یگانہ اور مرض دانی مین مشہور زمانہ ہین بیشتر علاج آنکھوں کا کرتے ہین نابینا کو چشم زدن مین بینا کرتی ہین گل نرگس اِن سی چارہ یرقان چاہے تو بجا ہے اور صنوبر علاج خفقان کیواسطے ان سی رجوع لائی تو زیبا ہے

حکیم محمد علی خانصاحب

مناص لاثانی مشخص امراض ابدانی ارسطو فطرت افلاطون حکمت مسیح الزمان حکیم محمد علی خان بن حکیم محمد بن حکیم مغفر اسد خان صاحب مرحوم۔ یہ صاحب فن طب مین یکتای جہان اور مستعد علامہ زمان ہین انکا دامن اخلاق وسیع اور کشادہ ہے طبیعت حضرت کی ہمیشہ بتواضع و تکریم آمادہ ہے باعث نواب والی دوجانہ کی سرکار مین مامور ہین فن کتابت مین مشہور نزدیک علاقہ

شعرای دہلی

جناب مرزا اسد اللہ خان غالب

[illegible]

شاہد نکتہ دانی غواص محیط تدقیق پیشانی بحر تحقیق افصح الفصحا ابلغ البلغا بادشاہ کشور فصاحت فرمانروای قلمرو بلاغت خلاق مضامین لطیف موجد قافیہ و ردیف ناظم بی بدیل ناثر بی مثل نخبہ شعرای جہان نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خان بہادر — انکی کمالات کا اندازہ ظرف خیال سی بیرون اور حد شمار سے افزون ہے معنی تازہ قالب الفاظ مین جان ڈالنا اور انفاس عیسوی سی معانی پژمردہ کو تازہ تر از گل بنانا حضرت ہی کا کام ہے انکے محاورات نمکین کی خوبی دلبران چگل اور مضامین پاکیزہ سے مزاج لطیف طبعان منغص سودا کو انکے رشک سخن سے جنون اور میر انکے کلام بلاغت نظام سے سرنگون فردوسی انکی عہد مین ہوتا تو مصنف رشک آج زندگی سے ہاتھ دھوتا کلام کلام سعدی انکی خوان فیض کے ریزہ خوار اور شیرین زبان حافظ شیراز انکے مقال سے بہرہ ور زینہ دار جو جو خوبیان شعرای سلف مین کسیکے ساتھ مختص نہین وہ بالتمام حضرت کے ذات بابرکات مین موجود ہین مصرعہ آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری + اونکے شاگرد آپکا دم خاقانی بھرتا ہے ہر ایک کو حضرت کا انوری و نظامی کی کلام پر سو احتراض کرتا ہے نظم اس صاحب کمال کی رنگین تر از گل ہے نثر مطبوع تر از گل کے کلام معجز نظام حضرت سے پایا جاتا ہے کہ قسام ازل نے فن شاعری انکی ہی حق مین عطا فرمایا ہے قطع نظر اس کمال کے علم اخلاق مین طاق مروت مین شہرہ آفاق ہین سن شریف آپکا ۷۰ اور ۸۰ کے درمیان ہے چراغ سحری ہین مگر انکہ باصرہ کی سامعت مین فرق بالکل آگیا ہے جسکسیکو کچھ عرض کرنا ہوتا ہی بذریعہ تحریر جواب پاتی ہین

نواب علاء الدین احمد خان صاحب بہادر

زبدۂ اہل تمیز آئینہ سخندانی مصقل مرارت نکتہ رانی بلبل خوش لہجہ گلزار سخنوری طوطی خوش بیان شکرزار سخن پروری رشک افزای کلام ظہوری حسرت گزای مضامین انوری وحید العصر و اکرم الزمان نواب علاء الدین احمد خان بہادر خلف الرشید نواب مستطاب

تاریخ طبع مرات الاشتباہ نتیجۂ فکر سامی محمد مظہر حسن صاحب مظہر عرف
عنایت الٰہی متوطن سکندرہ راؤ ضلع علی گڈہ

بحالات شعبان باوجود خوشی	ندا این نسخہ معدوم شد و طبع
جو پرسید سال طبع مظہر	بگو این نسخہ معدوم شد و طبع شستہ برچہ

تاریخ طبع از سید جمعیت علی صاحب ساکن گڈہ مکتیسر ضلع میرٹھ

دعا دل کرد جان مطبع نو تمام	پئے طبع نسخہ سال شعبان بدو شگفت
سنہ کہ طبع برشتہ فی البتہ	طبع گردید و کتاب مستطاب زیبا گفت

قطعات تاریخ طبع از نتائج افکار ناظم بیدل ناتر شاگرد رشید
میرزا غلام محمد صادق علی صاحب مراح مقیم سکندرہ راؤ ضلع علی گڈہ
تلمیذ باتمیز نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ غالب

شد چو در مطبع ارتضیٰ خان	کتابی بحالات شعبان ذی جاہ
رقم کرد مراح تاریخ طبعش	کرد و طبع گردیدہ مرات الاشتباہ

سنہ ہجری

ایضاً

در مطبع چو طبع شد معدوم کتابی	با طرز خوش سلوب بہ زیبائی شعبان
تاریخ رقم کرد چو تاریخ خجستہ	مطبوع شد و نسخہ باز یب عنوان

تمت الامر

عکس — ۵

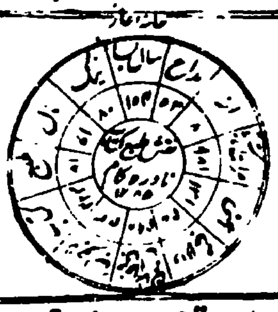
خوش عروس کتاب پر زینت | شستہ از نہفتہ
گفت ہاتف حسن خود تاریخ | بیہ شد آز نہفتہ

طریق استخراج تاریخ از دائرہ

واضح ہو کہ دائرہ سے دو طرح سے تاریخ سال طبع حاصل ہو سکتی ہے طاق و جفت طاق یہ ہے کہ آغاز سے خانہ
تین خواہ پانچ یا اس سے زیادہ خانہ شمار کرو تا مدعا بہم پہنچے گی اعداد خانہ گنی ہوئی سے سن مطلوب نکلے گا
مثلاً خانہ آغاز سے گنا اول اوسی خانہ کی ۱۵۴ لکھو پھر اوس سے ایک دو تین گنا خانہ ملی ثانیا
اوس کی ۱۰ عدد لئے پھر اوس سے ایک دو تین گنا خانہ کتاب ملا ۲۲۴ عدد پائے اسیطرح خانہ مبتہل کے
۹۸۰ کا اور احمق ۱۳۱ کا اور آز ۸ کا ہے کل کی میزان دے ۱۲۶۸ ہجری موجود ہے
اب لیجیے جفت کا حساب یعنی دو یا چار خواہ زیادہ اوسی خانہ آغاز سے ایک دو گنا خانہ نیک ابتدا یا
جسکے ۸۰ عدد ہیں شمار جفت میں جس خانہ سے گنتی آغاز کیجائے مثل شمار طاق اوس خانہ کی عدد
نہیں لیتے چنانچہ خانہ نیک کی اگلی خانہ سے ایک دو گنا خانہ طبع ۱۰ کی عدد کا موجود ہے اسیطرح خانہ
لاجواب ۴۴ عدد کا اور اوالاحیاء ۵۰ کی عدد کا مرآت الاشباہ ۱۰۸۱ عدد کا مدائح ۲۰۳ عدد کا
ان سب کو جمع کیا ۱۲۶۸ حاصل ہے نقط اور مصرعہ وسط دائرہ سے بھی ۱۲۶۸ ہجری پیدا ہوتی ہیں فقط

اشتہار

خانہ آغاز



مطبع مرتضوی دہلی محمد مرتضیٰ خان و ریو سپر مین محمد مرتضیٰ خان کی اہتمام سے چھپے

انھوں نے جہاں قیام کیا تھا ، وہ مقام ڈل کے کنارے " زمیندار شاہ " کے نام سے مشہور ہے ۔ ان کے والد حکیم محمد عزیز اللہ خاں تحصیل علم طب کی طرف متوجہ ہوئے تو دھلی میں آ کر حکیم ذکا اللہ خاں سے فیض حاصل کیا اور اطبائے شاھجہان آباد سے سبقت لے گئے ۔ ان کے لڑکے حکیم احسن اللہ خاں نے علم طب اپنے والد سے حاصل کیا اور تھوڑے عرصے ھی میں مدارج کمال کو پہنچ گئے تو نواب فخرالدولہ احمد بخش خان والی فیروز پور کی ملازمت میں داخل ہوئے ، اس کے بعد نواب فیض محمد خان والی جھجھر کے پاس آ گئے ۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت معین الدین اکبر بادشاہ کی خدمت میں آ گئے ، ان کے انتقال پر بادشاہ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ نے طلب کرکے سعادت نبض گیری سے مستفید فرما کر احترام الدولہ اور ثابت جنگ کے خطابات کا اضافہ کیا ۔

دربار شاہی سے تعلق اور فرماں رواؤں سے خصوصی روابط کی بنا پر سر سید کی زندگی کے بعض واقعات سے بھی حکیم صاحب کا گہرا تعلق پایا جاتا ہے ۔

حالی ' حیات جاوید ' میں لکھتے ھیں کہ بہادر شاہ نے سر سید کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا تھا ۔ ۱۸۵۲ء میں جب وہ مین پوری سے تبدیل ہو کر فتح پور میں آئے تو چند روز کے لیے بتقریب رخصت یا تعطیل دلی آئے ۔ اس زمانے میں حکیم احسن اللہ خاں بادشاہ کے یہاں نیابت کا کام کرتے تھے ، انھوں نے بادشاہ سے سر سید کی سفارش کی کہ ان کو ان کے دادا کا خطاب ملنا چاہیے ، بادشاہ نے منظور کرلیا ۔ اگرچہ سر سید کے دادا کا خطاب صرف جوادالدولہ تھا اور یہی خطاب لکھ کر حکیم احسن اللہ خاں نے پیش کیا تھا ، مگر بادشاہ نے خود اس پر عارف جنگ کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کرکے جوادالدولہ سید احمد خان عارف جنگ کا خطاب سر سید کو عنایت کیا ۔ اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں ۔ (۱)

اسی طرح غالب سے تعلقات پر بھی مولانا حالی نے خاصی روشنی ڈالی ہے ۔ حالی یادگار غالب میں لکھتے ھیں ۔ " ۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواھر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل

۱۔ حیات جاوید ، مطبوعہ دھلی (انجمن ترقی اردو) ۱۹۳۹ء ، ص ۵۴

مروارید کے، دربار عام میں مرحمت فرمایا اور خاندان تیموریہ کی تاریخ نویسی خدمت پر بہ مشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا اور یہ قرار پایا کہ احترام الدو حکیم احسن اللہ خان مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین التقاط کر کے مرزا حوالے کیا کریں اور مرزا ان تمام مطالب کو اپنی طرز خاص کی فارسی نثر م بیان کریں۔ اور کتاب دو حصوں میں تقسیم کی جائے۔ پہلے حصے میں کہ مختصر حال ابتدائے آفرینش سے صاحب قران تیمور گورگانی تک اور کسی ق مفصل حالات تیمور سے نصیرالدین ہمایوں کے اخیر زمانے تک بیان کی جائیں اور دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لے کر سراج الدی بہادر شاہ کے زمانے تک کے تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج کیے جائیں مرزا نے تمام کتاب کا نام 'پر توستان' اور اس کے پہلے حصے کا ن 'مہر نیمروز' اور دوسرے حصے کا نام 'ماہ نیم ماہ' تجویز کیا تھا"۔ (

آگرے کے ہفت روزہ اخبار "اسعد الاخبار" بابت ۲۵ جولائی ۱۸۵۰ء م ذیل کی خبر بھی چھپی تھی: (۲)

" ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسداللہ خان غال کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کی لکھن پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو، مامور کیا اور اس کے کاتبو کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیرالملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے چھ پارچے کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تواری مذکور ایسی دلچسپ ہو گی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیض یا ہو گا"۔

مالک رام 'ذکرغالب' میں لکھتے ہیں کہ مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ عل کے پوتے مولانا نصیرالدین میاں کالے بہادر شاہ کے پیر تھے اور غالب کے بھی دلی دوست اور پرانے مہربان، ان کے علاوہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خا

۱۔ یادگار غالب، حالی، مطبع نامی کانپور، ۱۸۹۷ء، ص ۳۴-۳۳

۲۔ ہندوستانی اخبار نویسی، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ ۱۹۵۷ء صفحات ۸ - ۲

مدارالمہام بھی ان کے قدر داں تھے - ان صاحبوں نے سفارش کی اور بہادر شاہ نے منظور کر لیا کہ مرزا خاندان تیموری کی تاریخ فارسی زبان میں لکھیں - مولانا محمد حسین آزاد اس کے بارے میں یوں گوہر فشانی کرتے ہیں - "حکیم احسن اللہ خاں طبیب شاہی تھے اور بڑے مقرب تھے ، انہیں کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں ، یہی دیوان ظفر ترتیب دیتے اور مرتب کر کے چھپواتے تھے - مطبع سلطانی انہیں کے اہتمام میں تھا - سخن کے جوہر شناس تھے - استاد ذوق کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے - کلام کی محبت سے استاد کی محبت رکھتے تھے ، مگر خلیفہ صاحب (یعنی محمد اسمعیل صاحب خلف استاد ذوق) کے سبب سے کھٹکتے تھے ، خیال تھا کہ حضور پھر انہیں خدمت نہ سپرد کر دیں - ان کے سامنے حکیم صاحب کے اختیار ضعیف ہو جاتے تھے - اسی لیے مرزا نوشہ غالب مرحوم کو حضور میں پہنچایا تھا - حالانکہ استاد نے ترقی و تنزل خلیفہ کے کسی معاملے میں کبھی دخل نہیں دیا "- (۱)

غالب سے حکیم احسن اللہ خاں کے تعلقات کا پتا اس بات سے بھی ملتا ہے کہ ہفتہ وار 'اسعدالاخبار' مورخہ ۲ مارچ ۱۸۴۹ء میں مرزا غالب کی پنج آہنگ کا اشتہار ایک طویل نظم کی صورت میں شائع ہوا ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب حکیم احسن اللہ خاں کے توسل سے قلعہ دہلی کے مطبع سلطانی میں چھپی تھی (۲) - ان دونوں کے روابط قریبہ کا حال اس واقعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں نے مرزا سے جب وہ کلکتے میں مقیم تھے خواہش کی تھی کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجیے - اس کے جواب میں مرزا نے لکھا :

"دردمند نوازا! نسیم ورود مشکیں رقم نامہ غنچہ این راز را پردہ کشائے و شمیم این نوید را غالیہ سائے آمد کہ روزگار بہ کزلک مد طول زماں فراق نقش بے اعتباری ہائے من از صفحہ خاطر احباب نہ سترده و ترکتاز صرصر بیداد جدائی خاکساریہائے مرا ازیاد عزیزاں نبردہ است "- (۳)

غالب کو درباری معاملات میں ایک اور موقع پر بڑی حکیم صاحب

۱- دیوان ذوق ، مرتبہ آزاد ، ص ۱۳۷

۲- ہندوستانی اخبار نویسی ، ص ۲۸۸

۳- یادگار غالب ، ص ۳۸۵

سے سابقہ پڑا ۔ یہ دمغ الباطل کی اشاعت کا واقعہ ہے ۔ حالی نے ''یادگار غالب'' میں اس کی تفصیل دی ہے ۔

''ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے ۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر بادشاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ ان کا مذہب اثنا عشری تھا۔ ... مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی ۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہوجائے گی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے علم چڑھاں گا ، چنانچہ ... بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور انھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا ... ۔ اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے ، اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے... مرزا صاحب(غالب) نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی ، جس کا نام غالبا دمغ الباطل (۱) رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا ۔

''جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہدالعصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے ۔ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں ، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں ، اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں''۔ (۲)

حسن اتفاق سے مثنوی دمغ الباطل کا مطبوعہ نسخہ راقم کے کتب خانے میں بھی موجود ہے ۔ یہ مثنوی ۱۲۷۱ھ میں فخرالمطابع میں باهتمام حافظ عبداللہ طبع ہوئی تھی۔ یہ مطبوعہ کتاب کل ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر ۱۳

۱- 'یادگار غالب' میں واقعات کسی قدر غلط درج ہوئے ہیں ؛ صحیح واقعات کے لیے دیکھیے: 'متفرقات غالب' مرتبہ مسعود حسن رضوی (ادارہ)

اشعار ہیں ، یعنی اس مثنوی میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں -

حکیم احسن اللہ خاں کی زندگی کے واقعات میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو بہت اہمیت حاصل ہے - ۱۸۵۷ء میں اہل ہندکی طرف سے انگریزی حکومت سے بیزاری کا مظاہرہ ہوا ، ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی چھاؤنی سے ابتدا ہوئی اور میرٹھ ہی ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے بڑی چھاؤنی تھی - اس کے دوسرے روز دھلی میں مسلمانوں نے ہنگامہ شروع کیا اور قریب قریب پورے ملک میں آگ بھڑک اٹھی - ان واقعات کے ثقہ راویوں میں ایک تو عبداللطیف کا روز نامچہ (۱) ہے اور دوسرا حکیم احسن اللہ خاں کا -

حکیم احسن اللہ خاں نے جنگ آزادی سے متعلق یادداشتوں کو محفوظ کیا تھا ، ان کا انگریزی ترجمہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں سرجان کئی Jhon Kaye کے کاغذات میں ہے - حکیم صاحب نے خود مترجم کی خواهش پر ان یادداشتوں کو قلم بند کیا تھا - یہ روز نامچہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوچکا ہے - (۲)

عبداللطیف لکھتے ہیں :

۱۹ رمضان المبارک (۱۲ مئی ۱۸۵۷ء) صبح کے وقت بادشاہ کو اصلاح ملکی کا خیال پیدا ہوا - عمدۃالحکما حکیم احسن اللہ خاں کے ساتھ نیازمندانہ طور پر بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے اور عمدۃالحکما کی سفارش پر اس معمورہ اور بیرونجات کی حفاظت پر معین کیے گئے اور کچھ فوج شہر کی نگہبانی کے لیے ان کو دی گئی - دن ڈھلے پروانہ عطا کرنے کا حکم ہوا کہ راست کرداری اور نیک نیتی سے ان شوریدہ سروں کو جو بھڑوں کے چھتے کی مانند ہیں، ایسا کچلیں کہ وہ ختم ہو جائیں اور پریشان مخلوق آرام پائے - رضائے الٰہی اور حفاظت مخلوق کو دائمی طور پر فرض عین اور عین فرض مانیں اور ہماری خیر اندیشی میں مشغول ہوں -

---

۱- خلیق احمد نظامی : ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، از عبداللطیف دھلی ۱۹۵۸ء

۲- Memoirs of Hakim Ahsanulla Khan, edited by S. Moinul Haq, Karachi, 1958.

۲۴ رمضان (۲۰ مئی ۱۸۵۷ء): عمدة الحکما محمد احسن اللہ خاں کچھ عرض کرنے بارگاہ میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ تمام گروہ بداطوار لوگوں کا، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ، وقت نا وقت ہندو اور مسلمان شاہی ملازمین اور اہل دولت کے ساتھ طرح طرح کے حیلے اور بہانے کرکے ہرجگہ اور ہر مقام پر جہاں چاہتا ہے ، جھگڑا کرنے اکتا ہے۔ اس وجہ سے آج کل بے رونقی کی گرم بازاری ہے۔ عمدة الحکما اچھے حکیم اور خلیق ، نیک اور سخی آدمی تھے ، اسی سبب سے ان کے بھانجے ظہیرالدین احمد ان کے متبنیٰ تھے - ہم ان کا ذکر کیوں نہ کریں کہ وہ پسندیدہ روش اور نیک سیرت آدمی ہیں اور مجھ ہیچمداں کے بزرگ ترین احباب میں سے ہیں - یقیناً وہ ایک بڑے ادیب اور شفیق اور عظیم المرتبت ہستی ہیں -

۱۷ شوال (۱۱ جون) : عمدة الحکما نے جو طبیبوں کے افسر تھے ، اپنے مقام پر کھڑے ہو کر گزارش کی کہ نابکار لوگ بازار میں گشت لگاتے ہوئے دکانوں کو توڑتے ہوئے ، ننگی تلواریں لے کر نہایت مفسدانہ طریقہ سے پھر رہے ہیں ، جس کے باعث باشندگان شہر کو بڑی پریشانی ہے - بادشاہ نے بخت بلند خاں کو تاکید کی کہ اس روش کو بند کرانے کے لیے کمربستہ ہو اور فرمایا اس عالم فانی میں نیست و نابود ہوجانا اس سے بہتر ہے کہ مخلوق کے ساتھ بدی کرے -

۱۹ شوال (۱۳ جون) : چونکہ بدذات باغیوں نے انگریز مردوں کے مقابلے میں اپنی مکاری اور روباہ بازی سے نامردی کا ثبوت دیا ، اس لیے سب نے سمجھ لیا کہ ان بدمست لوگوں سے لڑائی میں کوئی بڑا کام انجام نہیں پائےگا اور یہی بات بادشاہ کے دل میں بھی جم گئی۔ بس بادشاہ نے حسرت کے ساتھ آج شام کو ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اولاً نواب زینت محل اور شہزادے سے دریافت فرمایا ، پھر عمدة الحکما احسن اللہ اور نواب سیف الدولہ میر عباس وکیل شاہی سے بھی رائے دریافت کی گئی ، جب ان کی رائے سے اطمینان خاطر نہیں ہوا تو چند خاص امیر زادوں کو بھی بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی ، چنانچہ سب امرا کو بلا کر انجمن آراستہ کی -

۲۱ شوال (۱۵ جون): بادشاہ نے فرخ جاہ نواب صمصام الدولہ بہادر احمد قلی خاں کو جنھیں ایک بیش بہا خلعت سے حال ہی میں سرفراز فرمایا گیا تھا ، اب وزارت عطا فرما کر ان کے اعزاز میں اضافہ کیا گیا -

اس بات پر عمدۃالحکما حکیم احسن اللہ خان کو حسد پیدا ہوا اور وہ ایک دن گم سم بیٹھے رہے ، چند ساعت گزرنے پر انھوں نے علاحدہ بادشاہ کے پاس جا کر ان کی غیبت کی ، جب گفتگو میں مبالغہ کیا تو بادشاہ نے فرمایا کہ خاموش رہو غیبت زنا سے بھی زیادہ شدید گناہ ہے ۔

۲۶ ذی الحجہ (۱۸ اگست) : ناگاہ بارود خانے میں ایک پتھر آ کر گرا اور اس سے آگ لگ گئی اور اس حادثے سے پانسو بیس بارود بنانے والوں کو ایسا جلا ڈالا کہ ان کی روح دنیا سے پرواز کر گئی، بدکردار لشکریوں نے یہ حرکت عمدۃالحکما احسن اللہ خان کی طرف منسوب کی اور انھیں ملامت کی اور ان کے گھر اور اسباب کو لوٹ لیا ۔ بادشاہ کی حمایت سے ان کی جان بچی ۔ بادشاہ نے فرمایا کہ عمدۃالحکما ہمارے دشمن کا دشمن ہے ۔ (۱)

مولانا غلام رسول مہر نے " غالب " میں غالباً اسی واقعے کو یوں لکھا ہے :

" حکیم احسن اللہ خان کے ایک لے پالک نے ناجائز طریقوں سے روپیہ جمع کرلیا تھا ، حکیم صاحب اس راز سے آگاہ تھے ، لے پالک نے اس بددیانتی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے افواہ اڑادی کہ احسن اللہ خان انگریزوں کا بھی خواہ ہے اور ان کے لیے جاسوسی کی خدمت انجام دے رہا ہے ، باغی بگڑ گئے اور حکیم صاحب کے قتل کی نیت سے ان کے مکان پر چڑھ دوڑے ۔ حسن اتفاق سے حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس موجود تھے ۔ باغی تعاقب میں قلعے پہنچے اور جاتے ہی حکیم صاحب کو گھیرلیا ، خادم نواز بادشاہ نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈال دیا ۔ اس طرح جان بچ گئی ، لیکن باغیوں نے حکیم صاحب کا سامان لوٹ لیا اور مکان کو آگ لگادی ، سارا مکان جل کر راکھ بن گیا ، دیواریں دھویں سے سیاہ ہوگئیں، گویا مکان کے ماتم میں انھوں نے سیاہ لباس پہن لیا "۔

حکیم احسن اللہ خاں کے اس دور کے حالات غالب کی تحریروں میں بھی ملتے ہیں ، ان سے واضح ہوتا ہے کہ حکیم احسن اللہ خان کو نظر بند بھی کیا گیا تھا ۔ غلام نجف خاں کے نام حکیم احسن اللہ خاں کے متعلق

۱- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، عبداللطیف ، مرتبہ خلیق احمد نظامی ، ص ۱۲۳ ، ۱۳۵ ، ۱۳۶ ، ۱۳۸ ، ۱۶۲ ۔

یکم اپریل ۱۸۵۸ء مطابق پنجشنبہ ۱۳ شعبان ۱۲۷۴ھ کو غالب ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"میاں تم کو مبارک ہو ، حکیم جی (احسن اللہ خاں) پر سے وہ سپاہ جو ان کے اوپر متعین تھا اٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا ہے کہ اپنی وضع پر رہو مگر شہر میں رہو ، باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ او ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو ، چنانچہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے مرزا جا کسن کے مکان میں آ رہے ۔ جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے ، اگرچہ از راہ احتیاط جا نہیں سکتا"۔ (۱)

اسی ماہ اپریل کے بعد کے خط میں غالب غلام نجف خاں کو پھر لکھتے ہیں :

"جناب حکیم صاحب ایک روز از راہ عنایت یہاں آئے تھے ، کیا کہوں کہ ان کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے ، خدا ان کو زندہ رکھے ، خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو میرا جاننے والا کوئی نہ بچا ہوگا"۔ (۱)

پھر ۳ فروری ۱۸۶۰ء کے خط میں لکھتے ہیں : "جناب حکیم صاحب کو سلام و نیاز"۔ (۱)

خلیق احمد نظامی '۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ' کے دیباچے میں حکیم احسن اللہ خاں کے بارے میں لکھتے ہیں :

"جہاں تک امرا کا تعلق ہے ان میں بیشتر ایسے تھے جو ذاتی مفاد اور منفعت کی خاطر بڑے سے بڑے مفاد کر قربان کر سکتے تھے ۔ حکیم احسن اللہ خاں ، نواب احمد قلی خاں وغیرہ جو دربار کے عمائدین میں سے تھے ، عوام کی نظر میں اسی بنا پر معتبر نہ رہے تھے ۔

"اپنے دوستوں میں عبداللطیف نے صرف حکیم احسن اللہ خاں کے بھانجے ظہیر الدین احمد خاں کا ذکر کیا ہے ۔ حکیم صاحب کا ذکر احتراماً کیا گیا ہے ، جس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید عبداللطیف بھی حکیم احسن اللہ خاں کا ہم خیال ہو اور ہنگامے کے

۱۔ خطوط غالب ، ص ۳۷۷ ، ص ۳۷۹ ۔

دوران میں اس کا طرز عمل بھی وہی رہا ہو جو حکیم صاحب کا
تھا ، لیکن روزنامچے سے اس شبہے کی تائید نہیں ہوتی - (۱)

جنگ ۱۸۵۷ء کے خاتمے پر انگریزوں نے ابو ظفر بہادر شاہ پر مقدمہ چلایا ' اس مقدمے کی روداد طبع ہو چکی ہے - مقدمے میں حکیم احسن اللہ خاں نے انگریزوں کی حمایت میں بہت اہم کردار ادا کیا ، بطور گواہ بھی پیش ہوئے ، مقدمے کی روداد کے علاوہ اس واقعے کی کچھ جھلک " واقعات دارالحکومت دہلی " میں بھی ملتی ہے :

" ۲۰ جنوری ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ فوجی کمیشن کے روبرو لائے گئے جن میں تین سردار ملکۂ معظمہ کی طرف سے اور دو کمپنی بہادر کی جانب سے - بادشاہ پر چار الزام تھے یا یوں کہو کہ چاروں طرف سے گھیرے گئے تھے - ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ ۱۶ مئی کو جو قلعے میں انچاس انگریز مارے گئے ان کے بانی مبانی یہی تھے — ایک دن نہ دو دن ، پورے اکتیس دن مغلیہ تاجدار کمیشن کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت سے کشاں کشاں پھرتا رہا - ہوا بگڑنی شرط ہے ، گواہوں کی کیا کمی تھی ، خود حکیم احسن اللہ خاں وزیر بادشاہ کے روبرو کھڑے تھے - یوں سمجھیے کہ زمین آسمان اور اپنے دست و پا تک دشمن تھے - لسانی شہادت کے علاوہ دستاویزی شہادت کا ایک طومار تھا - بادشاہ کو جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیا - پانچ سال کے بعد وہیں آخر ۱۲۷۹ھ - ۱۸۶۲ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا " - (۲)

قصہ کوتاہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حکیم احسن اللہ کا کردار کچھ خوشگوار اثر نہیں چھوڑتا - اہل دہلی انہیں علم طور ناپسند کرنے لگے تھے - حکیم احسن اللہ نے عافیت اسی میں سمجھی ، جے پور جا کر ملازم ہو گئے ، صرف کبھی کبھار دہلی آتے تھے - غالب کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے اور غالب کے روابط بہت بڑھ گئے تھے - وہ غالب کے آخری زمانے کی تصویریں پیش کرتے ہیں :

" سن شریف آپ کا ۷۰ اور ۸۰ کے درمیان ہے ، چراغ سحری ہیں ،

۱- روزنامچہ ، ص ۴۸-۴۴

۲- واقعات دارالحکومت دہلی ، جلد سوم ، ص ۳۶۷

خدا نگہبان ہے ، سماعت میں بالکل فرق آگیا ہے - جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہو بذریعہ تحریر جواب زبانی حاصل کرتا ہے'' -

مرزا غالب کو مرض کی شدت کے باعث موت سے چند روز پہلے متواتر غشی کے دورے پڑتے تھے اور دیوان خانے ہی میں رہتے تھے - کھانا پینا بالکل ترک ہو چکا تھا - ۱۴ فروری ۱۸۶۹ء کو غالب یکایک بے ہوش ہوگئے - فوراً حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو اطلاع دی گئی ، انہوں نے تشخیص کی کہ دماغ پر فالج گرا ہے - تمام کوششیں اور علاج کیے گئے مگر بے سود ، انہیں ہوش نہیں آیا نہ اس کے بعد انہوں نے کوئی بات کی - اسی حالت میں اگلے روز ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء (مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ) بروز شنبہ دوپہر ڈھلے بوقت ظہر اس باکمال کا انتقال ہوگیا - (۱)

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ جنازہ سہ پہر بعد اٹھا ، دلی دروازے کے باہر نماز جنازہ پڑھی گئی - ''راقم بھی موجود تھا اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیا الدین احمد خاں ، نواب محمد مصطفیٰ خاں ، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم اور بہت سے اہل سنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے'' - (۲)

حکیم احسن اللہ خاں اس کے چند برس بعد تک زندہ رہے - ۱۲۹۰ھ مطابق ستمبر ۱۸۷۳ء میں بڑودہ میں عالم غربت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے - نواب ضیاالدین احمد خاں نیر نے الفاظ '' حکیم غریب '' سے تاریخ وفات نکالی : '' بود سال فوتش حکیم غریب '' (۳)

احسن اللہ خاں محض طبیب نہ تھے ، انہیں تعمیرات سے خصوصی لگاؤ تھا - ان کی تعمیر کردہ عمارتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے - سنہ ۱۲۷۰ھ میں حکیم صاحب نے پرانی حویلی بدل بیگ کو خرید لیا تھا - بدل بیگ خاں جن

۱- ذکر غالب ، مالک رام ، ص ۱۶۶ -

۲- یادگار غالب ، حالی ، ص ۱۰۰ -

۳- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، مرتبہ خلیق احمد نظامی ، دہلی ۱۹۵۸ء ، ص ۱۲۶-۱۲۷ - غالب ، از غلام رسول مہر ، لاہور ، ۱۹۳۶ء ، ص ۲۹۱ - اورینٹل بائیوگرافی ، لندن ۱۸۹۴ء ، ص ۳۴ -

کے نام سے حویلی مشہور تھی، ان کا اصل نام ترکی بیگ تھا ۔ اوائل زمانہ شاہ عالم ثانی (۱۸۰۶ء - ۱۷۵۹ء) میں سمرقند سے آئے تھے اور امیرالامرا مرزا نجف خان کے تحت رسالدار مقرر ہوئے تھے ۔ حویلی بدل خان در اصل نواب قمرالدین خان کی بنوائی ہوئی تھی ۔ اس حویلی کا کیا ٹھکانا تھا ۔ اجمیری دروازے تک اس کا سلسلہ چلا گیا تھا اور اتنے متعدد قطعات تھے کہ نواب صاحب کا سارا خاندان اور دیگر متعلقین سب اسی میں رہتے تھے ۔ نواب قمرالدین خان کے بعد یہ حویلی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ، جس میں سے صرف ایک قطعہ نواب بدل خان کو ملا تھا اور جب حکیم احسن اللہ خان نے خریدا تو اس وقت بھی یہ اسی بدل بیگ خان کے نام سے مشہور تھی ۔

حکیم صاحب کے زمانے میں اس کے مالک محمد سلام اللہ خان خلف خان بہادر مولوی اکرام اللہ خان صاحب تھے ۔ حویلی کے اندر بہت وسیع صحن اور دلکشا ہال تھا ۔ اس کا دروازہ حکیم احسن اللہ خان نے سنہ ۱۲۷۰ھ میں خود بنوایا تھا ۔ جس پر مندرجہ ذیل منظوم تاریخی کتبہ نصب تھا جو غالب کا نتیجۂ فکر ہے :

نہادہ بنا احسن اللہ خان		سر رہ بد انساں در دلکشا
کہ غالب پے سال تاریخ او		رقم زد — در دلکشا حبذا
۱۲۷۰ھ

حکیم صاحب نے اس حویلی کے احاطے میں ایک حمام بھی تیار کیا تھا ۔ حمام کے اندر دیوار پر سنگ مرمر کی تختی پر مندرجہ ذیل کتبہ تھا :

هو الحکیم

مرتب گشت ایں حمام دلخواہ		بہ تعمیر فقیر احسن اللہ
عہد امیر رضوی

سنگ مرمر کی تختی پر باہر کی دیوار پر دوسرا کتبہ بھی تھا :

بدہلی احسن اللہ خاں بنا کرد		یکے گرمابہ با قدسی نشیمن
پے سالش کہ یارب جاوداں باد		بفرق بانی خود سایہ افگن

نبشتم روئے لفظ آنگاہ گفتم　　شدہ تعمیر ایں حمام احسن

۳۰　　۱۲۹۸ - ۳۰ = ۱۲۶۸

اس کے علاوہ مہرولی میں (متصل درگاہ قطب الدین بختیار کا کی رح حکیم احسن اللہ خان نے بادشاہ کو خوش کرنے کی خاطر ایک مسجد اور حویلی بنوائی تھی - مسجد اور مکان دونوں پر قطعات تاریخی پاکستان کے ظہور میں آنے سے پیشتر موجود تھے -

تاریخ مسجد

مسجدے ساخت چوں بحسن عمل　　احسن اللہ خان پاک سرشت

اے ظفر بہر سال تاریخش　　خامہ ام '' خانۂ خدا '' بنوشت

۱۲۶۱ھ

تاریخ مکان

ارسال بنائے نو بدرگاہ　　پیر خردم نمود آگاہ

برداشت لب از دیار دھلی　　تعمیر فقیر احسن اللہ

۳۲　　۱۲۹۵ - ۳۲ = ۱۲۶۳ھ

مولانا بشیر الدین احمد دھلوی مولف '' واقعات دار الحکومت دھلی '' نے اپنی کتاب میں مسجد و مکان احسن اللہ خان کی تصویریں بھی دی ہیں (۱) - حکیم احسن اللہ خان شاعروں کے قدردان ھی نہیں خود بھی شاعر تھے ، سخن شعرا میں نساخ نے ان کا کلام احسن تخلص کے تحت درج کیا ہے (۲) - ان کی علمی صحبتوں کے ذکر سے تاریخ کے صفحات خالی نہیں لال قلعے کے مشاعرے بہت مشہور تھے - تمام شعرا بہادر شاہ ظفر کے حضور میں جمع رہتے اور علمی صحبتیں گرم رہتیں ، حکیم احسن اللہ بھی اسی بزم کے

۱- واقعات دارالحکومت دھلی ، مولفہ مولانا بشیرالدین احمد ، آگرہ ۱۹۱۹ء ، ج دوم ، ص ۲۱۰ - ۱۹۹ و ج سوم ص ۲۸۹

۲- سخن شعرا ، ص ۱۳ -

ساختہ و پرداختہ تھے۔ ایک دن معمولی دربار تھا، ذوق موجود تھے، ایک شہزادہ آیا اور بادشاہ سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ کر چلا گیا۔ حکیم احسن اللہ خان نے عرض کیا یہ آنا کیا تھا اور جانا کیا تھا۔ بادشاہ کی زبان سے نکلا:

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ذوق نے اس وقت کہا:

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے (۱)

ا۔ آجکل دہلی، اپریل ۱۹۶۰ء: شاہان دہلی کی بزم شاعری، مولانا صباح الدین عبدالرحمن۔

قاموس الکتب

کتابوں سے متعلق یہ کتاب انجمن کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہے جو کئی جلدوں میں مکمل ہوگی - پہلی جلد شایع ہو چکی ہے جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے - اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں جتنی بھی کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں ، یہ ان کی مکمل فہرست ہے - اس میں تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق تفصیلی معلومات دی گئی ہیں جو ۲۰ × ۳۰ / ۸ سائز کے چودہ سو صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں - ۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے -

شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے -

قیمت : چالیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی - ۱

غالب کے ہم معنی اردو اور فارسی اشعار

مضمون ، بیان اور زبان کی مناسبت

مولانا غلام رسول مہر

میرزا غالب کی متعدد خصوصیتیں ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے با کمال شاعر تھے اور اس خصوصیت میں میری دانست کی حد تک اقبال کے سوا کوئی اردو شاعر مرزا کا شریک و سہیم نہیں - میرا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ بعض دوسرے مشہور اساتذۂ اردو نے فارسی میں شعر نہیں کہے ، یقیناً کہے بلکہ بعض کے تو مطبوعہ فارسی دیوان بھی موجود ہیں لیکن یہاں شعرگوئی کا معاملہ مطلوب نہیں بلکہ شعر گوئی کا ایک خاص پیمانہ پیش نظر ہے -

شعرگوئی کی مجمل کیفیت :

مرزا نے بالکل ابتدائی دور میں زیادہ تر اردو شعر کہے ، پھر ان کی زندگی کا بڑا اور بہترین حصہ فارسی شاعری کی نزہت گاہ میں بسر ہوا اور ان کا منظوم فارسی کلام آج بھی اردو کے مقابلے میں کم از کم پانچ گنا ہے - متوسط دور کے آخر میں پھر ان کی توجہ اردو کی طرف مبذول ہوئی، جب لال قلعے سے مستقل تعلق قائم ہو گیا تو وہ زیادہ تر بہادر شاہ کی فرمایش پر اردو شعر کہتے رہے - خود لکھتے ہیں :

> ”جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں ، سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں - آج میں نے دوپہر ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا“ -

(نادرات غالب)

میرزا کا بہترین اردو کلام زیادہ تر اسی دور کا ہے ، اگرچہ پہلے دور کی بھی بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی مثالیں مشکل سے ملیں گی ۔

شیرانی مرحوم کا مقالہ :

میرا احساس یہ ہے کہ مرزا کی اس خصوصیت پر بہت کم اصحاب علم و فضل نے توجہ فرمائی اور جنھوں نے اس کا اندازہ فرما لیا تھا وہ بھی مفصل بحث کی فرصت نہ نکال سکے ۔ میرے علم کی حد تک سب سے پہلے حافظ محمد محمود خاں شیرانی مرحوم و مغفور نے ایک مختصر سا مقالہ اس موضوع پر تحریر فرمایا تھا جو رسالہ "غالب" (امرتسر) میں شائع ہوا ، (جلد اول نمبر ۷ جون ۱۹۲۷ء) ۔ اس میں فاضل موصوف نے میرزا کے بائیس یا تیئیس ہم مضمون اردو اور فارسی اشعار بالمقابل درج کر دیے تھے ، ساتھ ہی لکھ دیا تھا :

"مرزا غالب اگر اس التفات کا نصف حصہ بھی اردو پر صرف کرتے جو انھوں نے فارسی کے لیے مخصوص کیا تھا تو ان کی اردو ، ان کی فارسی سے بلاشبہ گوے سبقت لے جاتی ۔ تاہم یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے قلب پر جو وجدانی کیفیت ان کے اردو کلام سے طاری ہوتی ہے وہی لذت ان کے میخانے کی شراب شیراز سے حاصل نہیں ہوتی ۔ یہ عقیدہ ممکن ہے ملحدانہ مانا جائے اور بنظر امعان بے بنیاد ثابت ہو ، لیکن ذوق و وجدان کے معاملات میں بحث کرنا ، میں جانتا ہوں ایک بے سود فعل ہے" ۔

مسئلہء ذوق و وجدان :

بلاشبہ ذوق و وجدان کے معاملات پر بحث بے سود ہوتی ہے ، تاہم ذوق و وجدان کی حیثیت ایک ایسے صفحے یا تختی یا سلیٹ کی نہیں جس پر کچھ مرقوم نہ ہو ۔ یہ بھی تحصیل علم اور مطالعے کے ساتھ نشو و ارتقا پاتا رہتا ہے ۔ جو شخص فارسی شعر و ادب کا مطالعہ وسیع پیمانے پر پہنچا دے گا اور مشہور اساتذۂ شعر کے کلام کی مزاولت جاری رکھے گا ، اس کا ذوق ہر ایسے شخص کے ذوق سے یقیناً مختلف ہوگا جس کا مطالعہ صرف اردو شعر و سخن تک محدود رہے گا ۔ ہاں ، یہ ممکن ہے کہ ایک زبان کے وسیع مطالعے کے باوصف مختلف اصحاب کے ذوق و وجدان مختلف رہیں ۔ بعض معنی آفرینی اور

حقیقت گوئی کو رفعت کلام کا معیار بنا لیں اور بعض کے ذوق کی پرواز لطف زبان کے دائرے ھی میں محدود رہ جائے۔

مشترک مضمون کے اشعار :

میں نے سرسری طور پر محض غزلیات اور ایک قصیدے کی تشبیب سے اردو اور فارسی کے ھم مضمون اشعار منتخب کیے اور ان کی تعداد چالیس سے بھی زیادہ نکل آئی۔ بعض کی حیثیت محض ترجمے کی ھے اور بظاھر یہی معلوم ھوتا ھے کہ پہلے ایک مضمون فارسی میں باندھا گیا، پھر اسے اردو میں بھی لے لیا گیا۔ بعض شعروں میں مضمون ایک ھے لیکن جب اردو میں اسے باندھا تو اس میں نہایت پر لطف اضافہ ھو گیا۔ بعض اردو اور فارسی اشعار میں محض جزوی اشتراک ھے۔

اس سلسلے میں غور و فکر اور جائزے کی اصل بنیاد میرے نزدیک یہ تھی کہ آیا مضمون فارسی میں بہتر طریق پر ادا ھوا ھے یا اردو میں؟ اسے فی‌الجملہ اردو کی فطرت سے زیادہ مناسبت ھے یا فارسی کی فطرت سے، یا دونوں میں ھر مضمون کی حیثیت یکساں رھی ھے؟

غور و بحث کی ابتدا :

مجھے بے تامل اعتراف کرلینا چاھیے کہ میرا مطالعہ اور علم محدود ھے کم از کم میری نظر سے اب تک کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں اردو اور فارسی کے ھم مضمون اشعار پر اس نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ھو۔ میں بحث کا حق تو ادا نہیں کرسکتا لیکن چاھتا ھوں اس کی ابتدا ھوجائے۔ شاید یہی ابتدا اصحاب فکر و نظر کے لیے توجہ فرمائی کا سبب بن جائے۔

انسان کی طلب و تلاش :

میرزا ایک قصیدے کی تشبیب میں فرماتے ھیں :

جز در آیینہ نہ دہدم اثر سعی خیال
ھر قدر بہر طلب گاریٔ انسان رفتم

انسان کی تلاش اور عالم حقیقت میں اس کی نایابی یا کم یابی نیا خیال نہیں، ایک ایرانی شاعر کہتا ھے :

با صد ہزار دیدہ بگردد جہاں سپہر
جویاے آدمی است، ولے آدمی کجاست !

وارستہ کہتا ہے :

آنچہ پر جستیم و کم دیدیم و در کار است و نیست
در حقیقت نیست جز انساں کہ بسیار است و نیست

عالمگیر اعظم نے وارستہ کے دوسرے مصرع میں نہایت عمدہ تصرف کی اور اس کے رقعات میں یہ شعر ایک سے زیادہ مرتبہ نقل ہوا ہے :

آنچہ پر جستیم و کم دیدیم و در کار است و نیست
نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار است و نیست

میرزا غالب نے اردو میں یہی مضمون ایسے انداز میں باندھ دیا کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا :

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ظاہر ہے کہ یہ اردو شعر نہ محض میرزا کے فارسی شعر پر بلکہ بعد کے دونوں فارسی شعروں پر بدرجہا فائق ہے اور یہ معاملہ میرے اندازے کے مطابق بحث کا محتاج نہیں ۔

طور و تجلیٔ طور :

میرزا فارسی میں کہتے ہیں :

چرا بہ سنگ و گیا پیچی اے زبانۂ طور
براہ دیدہ ز دل در رو و ز جاں برخیز

یعنی اے طور کی تجلی تو جمادات و نباتات سے کیوں الجھتی ہے؟ اپنے کرشمے حجر و شجر کو کیوں دکھاتی ہے؟ آ اور میری آنکھوں کے راستے دل میں اتر جا ، پھر جان سے ابھر کر ہوش افگن جلووں کا تماشا دکھا ۔

اردو میں بھی مضمون زیادہ پر تاثیر اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی ، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

جو برق تجلی طور پر گری ، اس کا اصل نشانہ ہم تھے طور نہ تھا ۔ شراب ہر میخواز کو اس کے ظرف بمعنی حیثیت برداشت کے مطابق دیتے ہیں۔ یہ مناسب نہ تھا کہ طور کی حیثیت برداشت کا اندازہ ملحوظ رکھے بغیر اسے ایسی تیز و تند شراب پلادی جاتی جس کا وہ حریف نہ تھا ۔

دیکھیے اس شعر میں جو صرف سولہ الفاظ پر مشتمل ہے ، اپنے لیے ذوق طلب اور مطلوب کے لیے انتہائی بے تابانہ تڑپ کا اظہار بھی نہایت موثر انداز میں کردیا ۔ طور پر جو قیامت گزری اس کا سبب بھی آشکارا ہو گیا ۔ اس کے ساتھ اظہار ہمدردی بھی کردیا گیا اور سب سے آخر میں سورۂ احزاب کی اس آیت کے مضمون کی طرف بھی اشارا فرما دیا جس میں ' امانت ' کا ذکر ہے اور جس کی بنا پر خواجہ حافظ نے کہا تھا :

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بہ نام من دیوانہ زدند

تسکین شوق کا معاملہ :

میرزا کا ایک خاص مضمون یہ ہے کہ شوق اگر واقعی ' شوق ' ہے اور ہوس کے ہر شائبے سے پاک ہے تو محبوب و مطلوب تک رسائی ہو جانے پر بھی اس کی بیتابیوں اور بیقراریوں کو آسودگی نصیب نہیں ہو سکتی ۔ وصال بھی اس کی دہکتی ہوئی آگ کے لیے سکون و اطمینان کا پانی مہیا نہیں کر سکتا ۔ فارسی میں فرماتے ہیں :

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل
شوق است کہ در وصل ہم آرام نہ دارد

چمن بلبل کے لیے محبوب کا کاشانہ ہے جہاں ہر طرف اور ہر سمت پھول ہوتے ہیں لیکن دیکھیے بلبل چمن میں بھی مصروف آہ و فغاں رہتی ہے ۔ اس کے

حلق سے بہ دستور دلدوز نالے بلند ہوتے ہیں ۔ شمع محفل میں روشن ہوتی ہے تو پروانوں کا ہجوم شروع ہو جاتا ہے، وہ محبوب کے وصال سے لطف اندوز ہونے کے بجائے تڑپ کر اس پر گرتے ہیں اور جب تک جل جل کر اپنی ہستی فنا نہیں کر لیتے ان کے جوش بے تابی کا سمندر سکوں پذیر نہیں ہوتا ۔

دونوں مثالیں ایسی ہیں جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا ۔ اردو میں یہی مضمون پیش کیا تو اثبات حقیقت کے لیے تیسری مثال لے آئے ۔ فرماتے ہیں :

گر ترے دل میں ہو خیال ، وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست وپا کہ یوں

یعنی اگر تیرے دل میں خیال ہو کہ وصال میں شوق کی آگ ٹھنڈی پڑجاتی ہے تو دیکھ کہ موج سمندر میں رہ کر بھی بدستور ہاتھ پاؤں مارتی چلی جا رہی ہے اور اس کی بے تابی میں کوئی کمی نہیں آتی ۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ حقیقی شوق کی تیزی و تندی پر وصال قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتا ۔

دیکھیے اردو اور فارسی کا اصل مضمون ایک ہے لیکن دونوں جگہ مثالیں الگ الگ پیش کیں، اس سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ کسی ایک حقیقت کی توضیح کے بعد بھی اس پر غور وفکر کا سلسلہ بدستور جاری رہتا تھا ۔

مصائب حیات کی تلافی :

مرزا کہتے ہیں کہ جنت کتنی ہی بیش بہا متاع ہو جو اہل ایمان کو عمل صالح کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی ۔ ان کے نزدیک انسان کو زندگی میں جو مشقتیں اٹھانی اور جو مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں جنت کو ان کی تلافی کا متوازن صلہ نہیں سمجھا جاسکتا ۔ فارسی میں کہتے ہیں :

جنت نہ کند چارۂ افسردگیٔ دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانیٔ ما نیست

یعنی زندگی میں دل پر جو افسردگی طاری ہوتی اس کا مداوا جنت نہیں

کر سکتی، ہمارے لیے تعمیر کا جو سامان مہیا کیا، کیا اسے ہماری تخریب سے کوئی مناسبت نہیں ۔ اردو میں فرماتے ہیں :

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

مضمون وہی ہے، البتہ مثال دوسری پیش کردی ۔ فارسی میں تعمیر و تخریب کا تقابل تھا ، اردو میں فرمایا کہ ہم خمار کے شکنجے میں جتنی مصیبتیں اٹھا چکے ہیں ان کے برابر شراب نہیں ملی جسے پی کر سابقہ مصیبتوں کی تلخیوں کا ازالہ کر سکتے ۔

مطالعۂ کائنات :

مرزا نے خود کائنات کا مطالعہ کیا اور وہ اس مطالعے کی دعوت ہر فرد کو دیتے ہیں ۔ اس کے دو حصے ہیں ۔ اول، ہر شے جس شکل اور جس صورت میں نظر آرہی ہے، اس کے مطالعے پر خاص توجہ کی جائے ۔ دوم، ہر شے میں جو گوناگوں بھید چھپے ہوئے ہیں، ضروری ہے کہ گہرے اور مسلسل غور و فکر کے بعد ان کے چہرے سے پردے اٹھائے جائیں ۔ آج تک انسانوں نے جتنے علوم پیدا کیے اور عالم انسانیت کی ترقی و تعالی کے لیے جو کارنامے انجام دیے، وہ اسی مطالعے کا نتیجہ ہیں ۔ میرزا فارسی میں فرماتے ہیں :

عالم آیینۂ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نہ داری بہ نگاہے دریاب

یہ جہان رازوں اور بھیدوں کا آیینہ ہے، خواہ اس کے ظواہر پر نظر ڈالی جائے یا بواطن پر، دونوں صورتوں میں بھید کھلتے جائیں گے ۔ اے مخاطب اگر تجھ میں غور و فکر کی صلاحیت نہیں تو محض نظر اٹھا کر ظواہر ہی سے بصیرتیں اور عبرتیں حاصل کر لے ۔

اردو میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے :

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

یعنی اگر تجھ میں معنویت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں تو نہ سہی ، صرف نیرنگ صورت ہی کا تماشا اپنے لیے باعث برکت سمجھ ۔

غالب کی برزخیت :

واضح رہے کہ اس قسم کے اشعار مرزا سے پیشتر شاذ ہی نظر آتے تھے پھر ان کے بیان میں طرز و انداز کی جدت کہاں تھی؟ حقائق کے ایسے جواہرپارے مرزا ہی کی بدولت اردو کے دامن میں پہنچے ۔ ایسے ہی مطالب کی بنا پر مرزا نے قدیم و جدید کے درمیان برزخ کی شان پیدا کر لی ۔ عام نہج ، اسلوب قدیم ، معنویت زیادہ تر نئی ، انداز بیان میں ایسی وسعت کے دروازے کھول دیے کہ جو شاعری عموماً عامیانہ ہوسناکیوں کے لیے وقف ہو گئی تھی ، اس میں ہر قسم کے مطالب کو قبول کر لینے کی صلاحیت آشکارا کر دی خواہ ان کا تعلق حقائق حیات سے تھا یا حقائق کائنات سے ۔

چند مثالیں ، ایسے اشعار کہاں ملتے ہیں جیسے یہ ہیں :

در شاخ بود موج گل از جوش بہاراں
چوں بادہ بہ مینا کہ نہان است و نہان نیست

ماہ و خورشید دریں دایرہ بیکار نیند
تو کہ باشی کہ بخود زحمت کارے نہ دہی

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازیں کس در دسد آں را مہیا کردہ ای

ہر چہ در دیدہ عیاں است نگاہش دارند
ہر چہ در سینہ نہان است ز سیما بینند

یخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چار سو ست
بے رود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

مرد نبود کز ستم بر خاطرش بارے رسد
هم ز خود رنجم گرم از دوست آزارے رسد

پیشہ اور غیرت و حمیت :

میرزا کے دل میں غیرت و حمیت کے لیے خاص تڑپ نظر آتی ہے ، وہ سمجھتے ہیں کہ جس انسان میں غیرت نہ ہو اس میں کوئی بھی خوبی نہیں رہ سکتی ۔ فرہاد نے ' مزدوروں ' کا کام کیا یعنی عام افسانے کے مطابق بے ستون پہاڑ کاٹنے اور شیریں کے باغ کے لیے نہر لانے پر آمادہ ہوگیا ۔ وہ باغ دراصل پرویز کی عشرت گاہ تھا ، مزدوری کے پیشے پر طعن میرزا کو گوارا نہ ہوا ، فرماتے ہیں :

پیشے میں عیب نہیں ، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

لیکن جب غیرت کا پہلو سامنے آیا تو اسی ' آشفتہ سر جواں میر ' کے خلاف فیصلہ صادر کرنے میں ایک لمحے کے لیے بھی میرزا کو تامل نہ ہوا ۔ فارسی میں فرماتے ہیں :

از جوے شیر و عشرت خسرو نشاں نہ ماند
غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند

جوے شیر یا خسرو پرویز کے مقام عیش و نشاط کا نشان تک باقی نہ رہا ۔ وہ سب آثار مٹ گئے اور تاریخ ماضی کے محض افسانے رہ گئے ۔ تا ہم غیرت آج بھی فرہاد پر طعنہ زن ہے جس نے پہاڑ کاٹ کر پرویز کی عشرت گاہ کے لیے نہر بہم پہنچائی یا جوے شیر کھو دی اور پرویز لاریب فرہاد کا رقیب تھا ۔

اردو میں یہی مضمون یوں ادا کیا ہے :

عشق و مزدوریٔ عشرت گہ خسرو کیا خوب!
ہم کو مطلوب نکو نامیٔ فرہاد نہیں

نیز :

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب

عظمت انسان :

میرزا کا ایک خاص مضمون انسان کے دعوے کی انتہائی بلندی کا ہے
فارسی کے ایک شعر میں کہتے ہیں :

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بہ گرد نقطۂ ما دور ہفت پرکار است

یہ مضمون انھوں نے کئی مقامات پر نئے نئے انداز میں باندھا ہے ۔ ایک غ
میں فرماتے ہیں :

اے آنکہ از غرور بہ ہیچم نمی خری
زاں پایہ باز گوی کہ پیش از ظہور بود

یعنی آج تو غرور کا یہ عالم ہے کہ مجھے مفت بھی لے لینے پر آ
نہیں ۔ کیا تجھے میرا وہ مرتبہ یاد نہیں جو اس دنیا میں ظہور سے پیشتر مج
حاصل تھا ؟

یہی مضمون اردو میں یوں بیان کیا اور ایسا شعر کہہ دیا جس کی مثا
ہمارے ہاں بہت کم ملیں گی ۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

آہ و فغاں اور آداب و قواعد :

جو فرد ماتم و سوگواری کا نشانہ بنا ہوا ہو اور اس کے قلب و د
کو حزن و اندوہ کے تواترنے بے طرح مجروح کر رکھا ہو، اس سے کوئی طب
صورت حال کے آداب و قواعد کی پابندی کا امیدوار نہیں ہو سکتا ۔ ماتم
کی ہر حرکت سوگواری کا مرقع ہوگی ۔ جس کے دل میں امیدوں اور آرزوود
خون موجزن ہو اس سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ کسی کے ساتھ اسی ا
میں باتیں کرے گا جیسی عام حالات میں کر سکتا تھا ۔

میرزا غالب نے ' ابر گہر بار ' کی مناجات میں ایک مقام پر ا
مصیبتیں بیان کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا تھا :

دریں خستگی پوزش از من مجوی
بود بندۂ خستہ گستاخ گوی

یہ ایک بدیہی مضمون تھا۔ میرزا فارسی میں کہتے ہیں :

از نغمۂ مطرب نتواں لخت دل افشاند
اے نالہ پریشاں رو و ہنجار میاموز

مطرب کا گانا مقررہ قواعد و آداب موسیقی کا پابند ہے، ان آداب و قواعد کی پابندی کا لحاظ رکھتے ہوئے دل کے ٹکڑے اچھالنا ممکن نہیں ۔ اے میرے نالے تو تمام آداب و قواعد سے کنارہ کش رہتے ہوئے جس انداز پر رواں دواں رہنا چاہتا ہے، رہ، تجھے آداب و قواعد سیکھنے کی ضرورت نہیں ۔

پھر یہی مضمون اردو میں بیان کیا تو صرف گیارہ لفظوں میں وہ حقیقت انتہائی درد و گداز کے ساتھ واضح کر دی اور ان گیارہ لفظوں میں بھی چار لفظ دو مصرعوں کی ردیفوں کے ہیں ۔ حقیقۃً صرف سات لفظ استعمال کیے :

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

پھر 'نے' کے ساتھ 'پابند' کی خوبی کسی تشریح کی محتاج نہیں ۔ ایسے ہی مقامات ہیں جہاں شاعری ایک گونہ اعجاز کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔

متاع اور رہزن:

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ جس کے پاس کوئی متاع ہو گی چور یا رہزن سے اسی کو ڈر ہوگا ۔ جس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں وہ قلندرانہ شان کے ساتھ جہاں پھرے گا، بے خوف و خطر پھرے گا ۔ میرزا فرماتے ہیں :

تو داری دین و ایمانے بترس از دیو و نیرنگش
چو نبود توشۂ راہے چہ باک از راہزن باشد

تیرے پاس دین و ایمان کی متاع عزیز ہے، اس لیے شیطان کی عیاریوں اور فریب کاریوں سے خوفزدہ ہونا سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ یہ ڈر ہو سکتا ہے کہ انسان کا یہ دشمن قدیم اس قیمتی متاع کو اچک نہ لے جائے ۔ جس کے پاس توشہ ہی موجود نہیں، بھلا اسے رہزن کا کیا ڈر ہو سکتا ہے اور کیوں ہو ؟

اردو میں یہی مضمون دوسرے انداز میں باندھا اور حقیقت حال کے اعت
سے اسے انتہائی بلندی پر پہنچا دیا ، فرماتے ہیں :

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

دنیوی علائق کے لوازم :

فارسی کے شعر میں توشے سے یاد آ گیا کہ زاد راہ کا مضمون اب
اور فارسی غزل میں بھی خوب باندھا ہے ، یعنی :

براہ کعبہ زادم نیست شادم کز سبک باری
بہ رفتن پاے بر خار مغیلانم نمی آید

کعبے کا راستہ اختیار کر لیا ہے مگر زاد راہ پاس نہیں - ہلکا پھلکا چ
جا رہا ہوں اور چلنے میں کانٹوں ، پتھروں اور دوسری چیزوں سے بچتا بچ
منزل طے کر رہا ہوں ، اگر زاد راہ کا بھاری بوجھ سر پر ہوتا تو راستے میں پا
اپنی مرضی کے مطابق دھرنے کی گنجایش کہاں رہتی ؟ رفتار میں اضطرار آ جا
پھر کانٹوں سے بچتا ہوا کیوں کر نکل سکتا ؟

ایمان و اخلاص :

میرزا اسی ایمان کو حقیقی ایمان سمجھتے تھے جو تمام اغراض کے ل
سے بالکل پاک و مبرا ہو ، یہاں تک کہ اس میں بہشت کی گوناگوں نعمت
سے بھی کوئی دلبستگی نہ ہو - صرف رضائے ذات باری اس کا محور و مر
ہو - جو ایمان نعائم جنت کی امید اور عقوبت جہنم کے خوف کی آغوش
پرورش پائے گا اس میں روح اخلاص کے لیے بالیدگی کی کوئی گنجایش ہو سک
ہے ؟ انسان کی خواہشات کا سدرۃالمنتہیٰ رضائے باری تعالیٰ ہے - اس
شبہ نہیں کہ جنت رضائے باری تعالیٰ ہی کا ایک انعام ہے اور دوزخ سے ب
کا طریقہ بھی یہی ہے کہ انسان کا ہر فعل اور ہر عمل رضائے خدا کے
مطابق رہے لیکن میرزا کے نزدیک یہ چیزیں مقصود نہ ہونی چاہیں ، چنا
وہ فرماتے ہیں :

ایماں اگر بہ خوف و رجا کردم استوار
اخلاص در نمود ونایم دو رو گرفت

اگر میں خوف و رجا کی بنا پر ایمان استوار کروں تو اخلاص میں دو رنگی پیدا ہو جائے گی۔

اردو میں یہی حقیقت ایک اور ہی انداز میں بیان فرمائی ، کہتے ہیں :

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

بہشت کو دوزخ میں ڈال دینے پر اس لیے آمادہ ہو گئے کہ شراب اور شہد نیز دوسری نعمتوں کا ذکر بہشت ہی کے سلسلے میں آیا ہے ، نہ یہ چیزیں موجود ہوں گی اور نہ کوئی ان کی خاطر بندگی اختیار کرے گا۔

تن پروری اور اسیری :

اغراض سے کاملاً پاک رہنے کی مثابش میرزا کے کلام میں جابجا ملتی ہے ، مثلاً :

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود
خوش بود گر دانہ نبود دام را

جال بچھا کر اس پر دانے ڈال دیتے ہیں تا کہ ان کے لالچ میں پرندے درختوں سے اتر آئیں اور جال میں پھنسا لیے جائیں - میرزا کے نزدیک یہ گرفتاری اور اسیری پرندوں کی تن پروری کا نتیجہ ہے۔

کہتے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ جال بچھائے جائیں تو ان پر دانے نہ ڈالے جائیں تا کہ تن پروروں کے لیے پھنسنے کی کوئی گنجایش باقی نہ رہے۔ جو پھنسیں بے غرضانہ پھنسیں -

اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہے کہ بلند مقاصد کے لیے کام حقیقتہً وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل میں اپنی ذات کے لیے قطعاً کوئی خواہش نہ ہو - خواہشات کے بندے جو کچھ کریں گے ، انھیں مقاصد کی حقیقی اور پر خلوص کوشش قرار نہیں دیا جا سکتا -

مرزا کا مسلک :

مخمور مکافات بہ خلد و سقر آویخت
مشتاق عطا شعلہ ز گل باز نہ دانست

جس شخص کو حسن عمل کا غرہ ہے وہ بہشت و دوزخ کے جھگڑے میں الجھ سکتا ہے لیکن جس کی آرزو کا مرکزی نقطہ یہ ہو کہ جو کچھ ذات پاک باری تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو وہی حقیقی دولت ہے ، اسے پھول اور شعلے میں امتیاز پیدا کرنے کا خیال کب آسکتا ہے ۔ نعمتوں سے بھرے ہوئے باغ ملیں تو خوش ، دھکتی ہوئی آگ کے شعلے میسر آئیں تو خوش ۔ عطا کے مشتاق کی نظروں میں ہر شے مرغوب و مطلوب ہی ہوگی ، نامرغوب یا نامطلوب کبھی نہ ہوگی ۔ اس کی پوری دولت نفس عطا ہے ، جنس عطا پر نظر جا ہی نہیں سکتی ۔

پسندیدہ مضامین :

جو مضمون مرزا کو پسند آ جاتا ہے ، اسے وہ بار بار مختلف صورتوں میں پیش کرتے ہیں اور ہر انداز بیان میں اس کے اندر ایک نیا لطف ، نئی لذت اور نئی جاذبیت پیدا کر لیتے ہیں ۔

مثلاً ان کے نزدیک وہی شے اچھی ہے جس سے گردش و تغیر کی خصوصیت زائل ہو جائے یعنی ایک حالت پر رہے اور اس میں تبدیلی نہ آنے پائے ۔ ایک مقام پر کہتے ہیں :

زینہار از تعب آتش جاوید مترس
خوش بہارے است کزو بیم خزاں برخیزد

دوزخ کے دوامی عذاب سے ڈرنے کا کیا مطلب ؟ کیا وہ بہار ہر اعتبار سے قابل خیر مقدم نہیں جس میں خزاں کا کوئی خوف باقی نہ رہے ؟

پھر فرماتے ہیں :

فیض عیش نوروزی جاودانہ خوش باشد
روز من ز تاریکی با شبم برابر کن

عیش نو روز میں دوام کی شان پیدا ہو جائے تو بہت اچھا ہو ۔ اے کارفرمائے گردش ایام ! میرے دن کو اتنا تاریک بنا دے کہ وہ میری رات کے برابر پہلو مارنے لگے ۔

نومیدیٔ ما گردش ایام نہ دارد
روزی کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

میری مایوسی میں زمانے کی گردش کا کوئی دخل نہیں۔ ہر لمحہ ایک ہی حالت برقرار رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو دن سیاہ ہو جائے اس میں شام و سحر کے تغیرات کیوں کر نظر آئیں گے؟

ایک مقام پر کہتے ہیں:

گشتہ در تاریکی روزم نہاں
کو چراغے تا بجویم شام را

میری شام دن کی تاریکی میں گم ہو گئی ہے، ایسا چراغ کہاں سے ہاتھ آئے جو اس کی جستجو میں معاون بن سکے۔

مشترک اشعار:

اب میں تشریحات سے کنارہ کش ہو کر صرف ہم معنی اشعار (کلاً یا جزواً) درج کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں:

فارسی: رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد
محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود

اردو: چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

فارسی: رسیدہ ایم بہ کوئے تو جائے آن دارد
کہ عمر صرف زمیں بوسی قدم گردد

اردو: واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

فارسی: دیگر ز ساز بے خودیٔ ما صدا مجو
آوازے از گسستن تار خودیم ما

اردو: نے گل نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

فارسی : بنازم سادگی ، طفل است و خونریزی نمی داند
به گل چیدن هماں ذوق شمار کشتگاں دارد

اردو : ہوائے سیر گل آیینۂ بے مہری قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

فارسی : در آیینۂ ما که ناساز پختیم
خط عکس طوطی به زنگار ماند

اردو : کیا بد گماں ہے مجھ سے کہ آیینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

فارسی : دهد به مجلسیاں باده و به نوبت من
بمن نماید و در انجمن فروریزد

اردو : مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

فارسی : لاله و گل دمد ازطرف مزارش پس مرگ
تا چها در دل غالب هوس روے تو بود

اردو : مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاک حسرت پابوس تھا

فارسی : سرت گردم ، بزن تیغ و درے بر روے دل بکشا
دلم تنگ است ، کار از زخم پیکاں برنمی آید

اردو : نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

فارسی : گریه کرد از فریب و زارم کشت
نگه از تیغ آبدار تو است

اردو : کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

فارسی : ناکس ز تنومندیٔ ظاہر نہ شود کس
چون سنگ سر رہ کہ گران است گران نیست

اردو : قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

فارسی : در مژدہ ز جوے عسل و کاخ زمرد
چیزے کہ بہ دل بستگی ارزد بۓ ناب است

اردو : وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

فارسی : عہد وفا ز سوے تو نا استوار بود
بشکستی و ترا بہ شکستن گزند نیست

اردو : تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

فارسی : دریوزۂ راحت نتوان کرد ز مرہم
غالب ہمہ تن خستۂ یار است گدا نیست

اردو : جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
یارب اسے لکھ دیجیو قسمت میں عدو کی

فارسی : گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
مے تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

اردو : زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فارسی : کف خاکیم از ما بر نہ خیزد جز غبار آں جا
فزوں از صرصرے نبود قیامت خاکساراں را

اردو : بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

فارسی : در آغوش تغافل عُرض یک رنگی تواں دادن
تہی تا مے کنی پہلو بہ ما بنمودہ ای جا را

اردو : تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

فارسی : اندر آں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گزشت
کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

اردو : آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نیز :

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

فارسی : با تغافل بو نیامد طاقتم لیک از ہوس
در تمنائے نگاہ بے محابایم ہنوز

اردو : نگاہ بے محابا چاہتا ہوں
تغافلہائے تمکیں آزما کیا

فارسی : تاخود از بہر نثارے کیست مے میرم ز رشک
خضر و چندیں کوشش و عمر دراز آوردنش

اردو : وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

فارسی : بنائے خانہ ام ذوق خرابی داشت ، پنداری
کز آمد آمد سیلاب در رقص است دیوارش

اردو : مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

فارسی : اختلاط شبنم و خورشید تاباں دیدہ ام
جرأتے باید کہ عرض شوق دیدارش کنم

اردو : پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

فارسی : آغشتہ ایم ہر سر خاری بہ خون دل
قانون باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

اردو : لخت جگر سے ہے سر ہر خار شاخ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

فارسی : تا حسن ز بے پردگیٔ جلوہ صلا زد
دیدیم کہ تارے ز نقاب است نظر ہم

اردو : نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فارسی : رنگہا چوں شد فراہم مصرفے دیگر نہ داشت
خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ام

اردو : یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

تلخیص الاردو

یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی ''اُردو'' کے تیس پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے۔ اس میں مشاہیر اہل قلم کے ہوئے مندرجہ ذیل علمی و ادبی مقالات شامل ہیں :

— اصول وضع اصطلاحات	وحیدالدین سلیم
— ہجو سلطان محمود	حافظ محمود شیرانی
— کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ	مولوی عبدالحق
— بنگالی زبان و ادب کی نشو و نما	ونیش چندرسین
— ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی	مرزا فرحت‌اللہ بیگ
— عمادالملک بلگرامی	عبدالحلیم شرر
— بنگالی اور اُردو	محمد اجمل خاں
— رومی، نطشے اور اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالح
— اُردو میں دخیل الفاظ	مولوی عبدالحق
— ولی کے سنہ وفات کی تحقیق	مولوی عبدالحق
— پرانی اردو میں کتبے	مولوی عبدالحق

قیمت : پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ کراچی

غالب اور تلامذہ غالب

تذکرۂ بشیر میں

لالہ سری رام نے ''خم خانۂ جاوید'' میں بہاءالدین بشیر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

> '' شاہ بہاء الدین دھلوی معروف بہ عبد اللہ شاہ بشیر ، آپ شاہ نصیر کے چھوٹے بیٹے شاہ نجم الدین صغیر کے حقیقی نواسے تھے اور چونکہ ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی ، اس لیے انھوں نے انھیں متبنیٰ کر لیا تھا ، چنانچہ اُن کی وفات کے بعد درگاہ و جاگیر آبائی خانقاہ صدر جہاں (دھلی) کے مالک ھوئے - فن سخن کا مذاق موروثی تھا ، اور اس میں اپنے عزیز ، شاہ تنویر سے مشورہ لے لیا کرتے تھے - عربی فارسی کی تحصیل اچھی تھی ، تصوف اور فن سخن کی کتابوں کا اکثر مطالعہ کرتے تھے - افکار زمانہ نے کبھی دل جمعی نہ ھونے دی - ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا لکھنا شروع کیا تھا مگر اُسے پورا نہ کر سکے - سات برس کا عرصہ ھوا انتقال کیا - ۵۵ - ۶۰ برس کے قریب عمر پائی - قلمی دیوان ...... راقم کے کتب خانے میں موجود ھے ......''-

(جلد اول ، ص ۵۹۹)

خود بشیر نے اپنی تصانیف میں چند مقامات پر اپنا ذکر کیا ھے اور اس سے معلوم ھوتا ھے کہ اُن کی تاریخ پیدائش ۶- شوال ۱۲۶۶ھ (۱۵ اگست ۱۸۵۰ء) ھے اور وہ شاعری میں تنویر کے نہیں ، اپنے نانا صغیر کے شاگرد تھے - لالہ سری رام کا بیان ھے کہ بشیر نے ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا

جو مکمل نہیں ہو سکا ، یہ درست نہیں ۔ بشیر نے تین تذکرے لکھے تھے جن کی تفصیل یہ ہے ۔

۱۔ نگارستان بشیر ۔ یہ قطعہ گو شاعروں کا تذکرہ ہے ۔

۲۔ بہارستان اشعار ۔

۳۔ فیضان نصیر ۔ شاہ نصیر کے تلامذہ کا تذکرہ ۔

ان تذکروں کے نام تاریخی ہیں ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دو تذکرے ۱۲۹۳ھ میں مکمل ہوئے اور تیسرا ۱۲۹۱ھ میں ۔ یہ تذکرے اب دستیاب نہیں ہوتے ، لیکن اتفاقاً ان تذکروں کا " بنیادی مواد " دستیاب ہو گیا ہے ۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بشیر کی یہ عادت تھی کہ اُن کے پاس جو مختلف مطبوعہ تذکرے تھے ، اُن کے حواشی پر وہ اضافے کرتے رہتے تھے یا اپنی بیاضوں میں یادداشتیں درج کرتے رہتے تھے ۔ بشیر کے کتب خانے کی ایسی مطبوعہ کتابیں ، جن پر بشیر کے حواشی ہیں ، انجمن ترقی اردو کراچی اور پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے کتب خانوں میں ہیں ۔ ایک بیاض انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتب خانے (۱) میں ہے ۔ " نگارستان بشیر " کے چند ابتدائی اوراق بھی دستیاب ہو گئے ہیں ، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ چھپنے کے لیے پریس بھی بھیجا گیا تھا ، لیکن طباعت کی نوبت نہ آئی ۔

بشیر کو تاریخ گوئی سے بے حد دلچسپی تھی ۔ " کنز تواریخ " کے نام سے انھوں نے ایک مجموعہ تیار کیا تھا ، جس میں انھوں نے اپنے عہد کے بہت سے افراد اور واقعات کی تاریخیں لکھی ہیں ۔

بشیر نے ضرب الامثال پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جس کا ابتدائی مسودہ انجمن ترقی اردو کراچی میں ہے ۔

۱۔ اس بیاض کا نام " کشکول بشیر " ہے ۔ سہ ماہی " صبح " دہلی بابت جولائی ستمبر ۶۱۹۷ میں عتیق صدیقی نے " ایک تذکرہ جو لکھا نہ جا سکا " کے عنوان سے اس کشکول کا تعارف کرایا ۔ ہے اس میں عتیق صدیقی نے خود بشیر کے حوالے سے لکھا ہے وہ کہ شکر شکوہ آبادی کے بیٹے تھے ۔ یہ درست نہیں ۔ شکر شکوہ آبادی ، منیر شکوہ آبادی کے والد تھے ۔

دیوان بشیر جو لالہ سری رام کے پاس تھا ، اب بنارس یونی ورسٹی ہے ، اس کے بارے میں ڈاکٹر حکم چند نیر کا ایک تعارفی مقالہ وہی زبان '' (دسمبر ۱۹۶۸ء) میں شائع ہو چکا ہے ۔

بشیر نے '' سخن شعرا '' پر جو حواشی لکھے ہیں ، آن میں نہ صرف خ کی پیش کردہ معلومات پر اضافہ کیا گیا ہے ، بلکہ تقریباً سترہ سو ۱۷۰) ایسے شعرا کے حالات دیے گئے ہیں ، جن کا ذکر نساخ نے نہیں - ان میں سے بیشتر گزشتہ صدی کے آخر کے شعرا ہیں اور اس اعتبار سے بشیر یہ کام ہماری ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ شعرا کے حالات سے لق بشیر کی جس قدر تحریریں دستیاب ہوئی ہیں ، آنھیں '' تذکرہ بشیر '' نام سے مرتب کر لیا گیا ہے ۔

'' تذکرہ بشیر '' میں غالب کے ۳۸ شاگردوں کا ذکر ہے ، ان میں سے چ (۱) ایسے ہیں جنھیں کسی دوسری جگہ غالب کا شاگرد نہیں لکھا گیا ۔ یر نے ان شعرا کے بارے میں بعض اہم معلومات پیش کی ہیں ۔

'' کنز تواریخ '' میں بھی غالب اور تلامذۂ غالب کے بارے میں چند مات ملتے ہیں ۔ بشیر نے غالب کی وفات پر نو قطعات تاریخ لکھے تھے جو اس موعے میں ہیں ۔ غالب اور تلامذۂ غالب سے متعلق یہ تمام غیر مطبوعہ اد یہاں پیش کیا جا رہا ہے ۔ [م - خ]

قطعات تاریخ وفات غالب

مرزا اسداللہ خاں غالب المخاطب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ :

غالب یکتائے دوراں مخزن دانشوری
رفت زیں دارالمحن سوئے چمن زار بہشت
خامۂ فکر بشیر نوحہ خواں سال وفات
موجد طرز فصاحت شد ازیں دنیا [نبشت]

دوم ذیقعدہ روز دو شنبہ سنہ ۱۲۸۵ھ ۔

۱- میر افضل علی افضل ، میر چھوٹے صاحب حقیر ، شاہ سردار شائق ، اجی محمد اسحاق عرف مظہرالحق مظہر ، غلام محمد خان نحیف ۔

جناب حضرت غالب صد افسوس
ازیں دنیا شد و در خلد آباد
بشیر خستہ جاں سالش رقم زد
کہ " بنیاد سخن از پا بیفتاد " ۱۲۸۵ھ

چو شد زیں جہاں غالب شاد خوار
مذاق سخن ہمرہ خویش برد
بتاریخ فوتش رقم زد بشیر
کہ " سرشار صہبائے معنی بمرد " ۱۲۸۵ھ

خسرو اقلیم معنی غالب شیریں مقال
چوں ز دنیا با اجل شد پیش رب ذوالمنن
سر بجیب فکر بردم گفت آنکہ پیر عقل
شد " فرشتہ فکر" تاریخِ شہہ ملک سخن ۱۲۸۵ھ

مرگ غالب سے سوئے ملک عدم
ہو گیا ہے عزم بالجزم سخن
ہے یہی تاریخ اس اندھیر کی
گل ہوئی ہے مشعل بزم سخن ۱۲۸۵ھ

غالب شہہ اقلیم سخن مرگئے افسوس
صد حیف کہ بے سر ہوا اب لشکر معنی
تاریخ بشیر ان کی کہی یہ مرے دل نے
" ہے ہے موا افسوس شہ کشور معنی " ۱۲۸۵ھ

اٹھا ساقیٔ بزم معنی اسد
زمانے میں کہرام ہے پڑ رہا
بشیر ان کی تاریخ ھجری ہے یہ
" پیا آج غالب نے جام فنا " ۱۲۸۵ھ

سحر بستر خواب سے اٹھ کے میں
سوئے بزم رنداں روانہ ہوا

عجب ڈھنگ کچھ واں کے آئے نظر
کہاں اتنا یارا کہ لب کیجیے وا

صراحی کو دیکھا گلا گھونٹتے
اور اک شور قلقل کے نالوں سے تھا

چنے تھے جو طاقوں پہ شیشے تمام
سیہ فام رنگ ان کا ظاہر ہوا

پہن کر لباس عزا جس طرح
کسی کا کوئی ماتمی ہو بنا

مثال مئے سرخ خون جگر
ہر اک جام کے دیدۂ تر میں تھا

خزاں میں گل ورد کا ہو جو حال
گلابی کو اس طور دیکھا پڑا

نظر کی جو پیمانے کی سمت کو
تو آنکھوں کو اس نے دبا ڈبڈبا

جو تھے اپنے مشرب کے احباب انھیں
خبر سر کی ، نے ہوش تھا پاؤں کا

جدھر دیکھتا تھا میں بھر کر نظر
کسے ہوش تھا لوٹنے کے سوا

ادھر اور ادھر کی جو میں نے نگاہ
کہ تا مجھ کو معلوم ہو مدعا (۱)

تو ساقی پری چہرہ و حور وش
مجھے ایک جانب نظر آ گیا

یہ جی چاہا اس سے ہی کچھ پوچھیے
کہ ان مے پرستوں کو کیا ہو دیا

وہ اس درجہ بیہوش تھا مطلقاً
کہ اپنی خودی کا نہ کچھ ہوش تھا

اٹھا شیشہ راوق کا بھر جام کو
وہاں آپ میں اپنا ساقی بنا

یہ کیا حال ہے اس شش و پنج میں
مئے یاس کا ایک ساغر پیا

تو کیفیت اصلا نہ حاصل ہوئی
میں بے نشہ جیسا تھا ویسا رہا

گزک کی جگہ (۲) لخت دل بھون کر
غرض (۳) حرص کے منہ کو جھلسا دیا

سرور آیا جب کچھ نہ تو ہر طرف
سراسیمہ سا میں ٹہلنے لگا

جو یاران بزم خرابات تھے
ادھر سے ادھر تک انھیں گن گیا

سبھی یار و احباب آئے نظر
نہ تھے میرزا نوشہ اہل صفا

۱- حاشیے پر بشیر نے '' مدعا '' کی جگہ '' ماجرا '' لکھا ہے۔

۲- حاشیے پر '' جگہ '' کی بجائے '' عوض '' لکھا ہے ۔

۳- حاشیے پر '' غرض '' کی بجائے '' عوض '' لکھا ہے۔

ز بس مجھ کو ان کی رہی جستجو ولیکن ملا کچھ نہ ان کا
غم و یاس و حسرت کے ہمراہ میں مکان مقدس پہ ان کے گ
وہاں جا کے پوچھا تو اک شخص نے بصد نالہ و آہ مجھ سے کہ
کہ وہ آج میخانۂ دھر سے گئے جام کوثر کا چکھنے مز
یہ سنکر میں رونے لگا زار زار پس از نالہ و یاس و آہ و
جو تھی مجھ کو تاریخ کی جستجو تو اس فکر میں سر بہ زانو ہو
ارم سے ملک آیا اک ناگہاں کہ تھا ان کی جانب سے بھیجا ہو
کہا کس تفکر میں ہے اے بشیر ”پیا آج غالب نے جام فنا“

۱۲۸۵ھ

بر زمانہ فتاد صد افسوس صدمۂ مرگ حضرت غالب
از سر اسم ذات شد تاریخ وشک عرفی و همسر صائب

۱۲۸۵ھ

تلامذۂ غالب

آگاہ، سید احمد مرزا خان

آگاہ تخلص، سید احمد مرزا خان، شاگرد مرزا اسد اللہ خان غالب مورخ سرود غیبی۔

ادیب، محمد سیف الحق

ادیب تخلص، محمد سیف الحق ابن مفتی احسان الحق، باشندۂ دہلی شاگرد مرزا عزیز و مرزا سالک، (۱) صاحب تذکرۂ شعرا۔

خالی خیال یار سے دل ایک دم نہیں
رہتے ہیں اپنے گھر میں بھی اک میہماں سے ہم

[بشیر ہی کے بیان سے پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ ادیب نے ایک تذکرۂ شعرا بھی لکھا تھا۔ ”کنز تواریخ“ میں اس کے مندرجہ ذیل قطعات تاریخ بھی ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے یہ تذکرہ سنہ ۱۲۸۹ھ میں لکھا گیا تھا]

مرتب ساخت در ایام نیکو ادیب افسانۂ شیریں مقالاں

۱- بشیر نے تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا۔

بجستم سال اتمامش ز ہاتف که هست ایں قصهٔ صاحب کمالاں
به گفتا کاے بشیر خسته خاطر بگو "گلدستهٔ نازک خیالاں"
۱۲۸۹ھ

چوں ایں تذکره سیف حق جمع ساخت به فضل خدا باد شہرت نصیب
پئے سال تاریخ ترتیب آں بگفتا بشیر "اختراع ادیب"
۱۲۸۹ھ

عجب ایں تذکره رقم فرمود آں ادیب سخن ور دوراں
گو بشیر شگفته دل تاریخ "جمع شد گونا گوں بہارستاں"
۱۲۸۹ھ

سخن را تیغ سیف الحق ادیب است به اوقات حسن حق کرد تائید
نمود اجماع اوراق پریشاں به حسن صحت امعان خوش دید
بشیرش یافت کشت زعفرانے مثال غنچهٔ صد برگ خندید
خیال آمد که تاریخش نگارد نکات آں ز سر تا پائے فہمید
نبشت ایں سال اوراق نگاریں "بہارستان رنگا رنگ پیچید"
۱۲۸۹ھ

افضل ، میر افضل علی

افضل تخلص ، میر افضل علی خلف میر قاسم ، سکنه لکھنؤ - دهلی میں بھی رهتے هیں ، شاگرد غالب - ۱۲۹۰ھ میں عمر ان حضرت کی قریب چالیس کے ہے - آدمی عاشق مزاج ، فارسی داں هیں ، اکثر فارسی اشعار کہتے هیں ، گاه گاه ریخته بھی لکھتے هیں -

بیمار ، محمد مراد علی

بیمار تخلص ، مولوی محمد مراد علی خلف سید کرم علی ، جاگیردار دولت پوره ، مہتمم مطبع چراغ راجستھان ، اجمیر شریف -

ناصحا آپ بھی ہوتے جو مریض الفت
کچھ اثر پھر نه دعا کا نه دوا کا ہوتا

دل کو ہوتا نہ اگر فکر معیشت کا گلہ
میرے اشعار میں مضمون بلا کا ہوتا

[بشیر نے ترجمۂ بیمار ، دوسری جگہ ان الفاظ میں لکھا ہے]

بیمار تخلص ، مولوی محمد مراد علی ابن سید کرم علی ، سا ک
جاگیردار سنگھ پورہ ، پرگنہ تھور ، علاقہ بیکانیر۔ ایڈیٹر اخبار راجپوتانہ ' اجـ

پھانسنے کے واسطے مرغ دل بیمار کو
دام سے کیا کم ہے حلقہ زلف عنبر فام کا

اسی کاتب کی غلطی سے مرحوم ہوا ۔ (کذا)

پیر جی [قمرالدین دهلوی]

پیرجی تخلص ، باشندۂ دهلی ، مدرس دهلی ۔

گو پیر جی سے تم کو محبت نہیں نہ ہو
کیا اعتقاد بھی نہیں اُن کی جناب میں

تپش ، میر مدد علی

تپش تخلص ، میر مدد علی متوطن اکبر آباد ۔ ان کا سلسلۂ ذ
حضرت امام جعفر صادق رحمتہاللہ علیہ تک پہنچتا ہے ۔ یہ گلزار علی اسیر
مشورہ کرتا ہے (۱) ۔ نغمہ عندلیب [گلستان بے خزاں ، باطن] میں اور اشعار ہ

دین و دل عشق میں کھو بیٹھے تھے ہم برسوں سے
طاقت و صبر بھی جاتے رہے کل پرسوں سے

تپش ، غلام محمد خان

تپش ، غلام محمد خان ، سوانح نگار ، ایڈیٹر اودھ اخبار ۔ پہلے ر
پاٹودی...... دهلی میں نواب اکبر علی خاں بہادر کے عہد میں بہ زمرۂ
ملازم تھے ، بعد اُن کی وفات کے شعر گوئی ترک کر کے اکثر تکمیل
میں مصروف رہے ۔ چنانچہ نظم و نثر اردو فارسی عربی میں اور فن تاریخ
آپ کو وہ کمال حاصل ہے کہ وہ ملکہ راسخہ کسی کو میسر نہ ہ

۱- بشیر نے تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا ۔

پندرہ برس مختلف مقامات میں رہنے کا اتفاق ہوا ۔ چند سال پہلے منشی نول کشور کے مطبع میں تعلق ... ۱۲۹۱ھ میں ان کی ایک غزل گلدستۂ سخن میں چھپی ...... آپ کے کمالات اظہر من الشمس ہیں ۔

رتبہ دستار سے یوں سہرے کا بالا تر ہے
نیچے دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

[بشیر نے دوسری جگہ ترجمۂ تپش ان الفاظ میں لکھا ہے]

تپش ، منشی غلام محمد خاں دہلوی ، مالک و راقم اخبار مشیر قیصر ہند ۔

تفتہ ، منشی ہرگوپال

تفتہ تخلص ، منشی ہرگوپال کایستھ ، متوطن سکندر آباد ، شاگرد رشید مرزا غالب ، صاحب تصانیف کثیرہ ہیں ۔ ایک دیوان ذخیم [ضخیم] بزبان فارسی مطبع نول کشور میں چھپا ہے اور سنبلستان ، بوستان کے طور پر اور پند نامۂ سعدی کا خمسہ تو بندے کی نظر سے گزرا ہے ۔

حقیر ، میر چھوٹے صاحب

حقیر تخلص ، میر چھوٹے صاحب......باشندۂ دہلی ، شاگرد شاہ نصیر و مرزا غالب ۔ الور میں راجہ سیوا دا [س] ...... کی سرکار میں ...... ملازم ہیں ۔ مجھ سے کہتے تھے کہ میرا دیوان الور میں چھپا ہے ، میں جاتے ہی روانہ کروں گا ، قیمت بھی لے گئے ، آج تک بھیجتے [ہیں] ۔ پتا اُن کا یہ ہے ، مقام الور ، لعل دروازہ ، مکان ننلو عامل ، متصل حویلی بخشی رام چند ۔ ان میں یہ بڑا سخت عیب ہے کہ اوروں کے کلام کو اپنا بتاتے [ہیں] ۔ یہ رباعی (کذا) لکھا گئے ہیں ، ۱۲۸۷ھ میں ، مگر مجھ کو یقین نہیں کہ اُن کی تصنیف ہے ۔

عین سے عین عبادت کا سر انجام ہوا
لام وہ لام کہ جس لام سے اسلام ہوا
''ی'' بھی یاور ہوا بندے کی ہر اک مشکل میں
صدقے جاؤں میں کہ کیا خوب علی نام ہوا

حیدر ، مرزا حیدر علی بیگ

حیدر تخلص ، مرزا حیدر علی بیگ دہلوی ...... واسوخت مسمیٰ بہ '' فغان حیدر'' نظر سے گزرا -

کفر و بدعت [سے] نہ اسلام سے ہے کام مجھے
دھر فانی میں نہیں چاہیے کچھ نام مجھے

راضی ، جانی بہاری لال

راضی تخلص ، جانی بہاری لال ، دیوان ملک کچھ ، قوم برہمن ناگر متوطن اکبر آباد - ہمیشہ جلیل القدر عہدوں پر سرفراز رہے - دیوان اس کا ۱۲۸ صفحوں پر بہ کتابت میاں جی عبداللہ بن میاں جی ابراھیم بہ مطبع دریا کچھ واقع بھونگر [بھاؤنگر] ۱۲۷۷ ھجری میں بہ ماہ ربیع الثانی چھپ کر مشتہر ہوا - اس میں ایک قصیدہ منشی محمد امین متخلص..... نے فارسی میں تصنیف کر کے چھپوا دیا ہے ، جیسے [جس میں ؟] سوانح عمری دیوان صاحب درج ہے ، طول کے خوف سے چھوڑ دیا گیا -

کروں شکوہ میں کیا اس شوخ کی نا مہربانی کا
دم رخصت دیا مجھ کو نہ اک چھلا نشانی کا

مفت رسوا ہیں چاہ میں تیری
کچھ نہ ٹھہرے نگاہ میں تیری

رضوان ، مرزا شمشاد علی

رضوان تخلص ، مرزا شمشاد علی بیگ خان خلف نواب مرزا عالم بیگ خاں شاگرد مرزا غالب ، وطن ان کا حیدر آباد ، مقیم دھلی - اشعار ان کے با مزہ ہوتے ہیں ، اکثر مشاعرے میں غزل پڑھتے ہیں ، حضرت سالک کے برادر حقیقی ہیں - ۱۲۹۳ھ میں وفات پائی (۱)-

مری فریاد سے ظاہر ہے بیان دھلی
دل خوں گشتہ رہے داغ زبان دھلی

۱- آخری جملہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے -

رفعت ، محمد عباس شروانی

رفعت تخلص ، مولانا محمد عباس شروانی خلف احمد عرب شروانی ، صاحب تصانیف کثیرہ ، مقیم بھوپال - مرزا ابراھیم خان وزیر و مرزا محمد علی خان مستوفی الملک صدر اعظم ، ان کے اجداد ، نادر شاہ بادشاہ ایران کے وزیر مشیر تھے - فارسی و اردو ہر دو زبان میں شعر کہتے تھے - خصوصاً تاریخ خوب کہتے تھے -

پھرا ہے رقیبوں کا چھپر کھٹ کے برابر
دس بیس تئیں ہوں گے یہاں کٹ کے برابر

سالک ، مرزا قربان علی بیگ

تاریخ طبع دیوان :

دیوان چھپا حضرت سالک کا بہت خوب
یہ سیر کے قابل چمنستان سخن ہے
چشمک زن خورشید ہیں ہر لفظ کے معنی
ہر لفظ یہاں اختر تاباں سخن ہے
دیکھا جو بشیر ادب آموز نے اس کو
تاریخ یہ لکھی " گل بستان سخن ہے " (۱۲۸۸ھ)

مضامین سالک میں گرمی ہے کیا		کہ جس سے ہوا گرم بازار نظم
ہر اک سطر ہے اس کی زلف سخن		ہر اک مد ہے ابروئے خم دار نظم
جو تزئین اوراق ہر لفظ ہے		تو ہر نقطہ ہے خال رخسار نظم
بشیر اس کی تاریخ سمبت ہے یہ		چھپا خوب دیکھو یہ گلزار نظم
(سمبت ۱۹۲۷)

[کنز تواریخ]

زکی ، محمد زکریا خان

زکی ، محمد زکریا خان ، نائب میر منشی سررشتہ ڈائرکٹری ممالک مغربی و شمالی - مورخ دیوان سالک -

اے خامہ در فشاں برس جا		اے ابر کرم نشاں برس جا

سجاد، سجاد مرزا دہلوی

سجاد تخلص، سجاد مرزا دہلوی، مدرس مدرسہ زنانہ، واقع نہر سعادت خاں - نبیرہ نواب حسام الدین حیدر خاں نامی، شاگرد مرزا قربان علی بیگ صاحب سالک (۱) - محرم (۱۲۹۰) بارہ سو بچیانوے ہجری میں گھوڑے سے گر کر انتقال کیا - (۲)

یہ جو دیوانہ سا پھرتا ہے، وہی ہے سجاد
شہر میں شہرہ ہے جس شخص کی دانائی کا

سرور، چودھری عبدالغفور

سرور تخلص، چودھری عبدالغفور نام، شاگرد اسداللہ خاں غالب، متذکرہ شبیہ عشرت -

محو نظارہ نوشہ ہو نہ کیوں کر سہرا
گل نرگس سے بنایا ہے سراسر سہرا

سوزاں، حسیب‌الدین احمد سہارنپوری

سوزاں تخلص، حسیب‌الدین احمد سہارنپوری، کچھ دنوں دہلی کی عدالت خفیفہ میں سر رشتہ دار تھے، بعدہ ایک مطبع میں گوری سہانے میں (؟) کتابت کیا کرتے تھے - اب مفقودالخبر ہیں - شاگرد غالب -

کس تمنا سے تہ خنجر قاتل آئے
ہائے کیا لطف شہادت دم بسمل آئے

شائق، شاہ سردار

شائق تخلص، شاہ سردار صاحب ولد محمد شاہ صاحب گیلانی، متوطن

۱- بشیر نے تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا -

۲- صحیح تاریخ وفات ۱۲۹۳ھ ہے، مادہ تاریخ یہ ہے :

ہے ہے ز پشت اسپ افتادہ

(تلامذہ غالب، ص ۱۳۶)

لاہور ، قوم سیادت سے ہیں ، نسبت تلمند مرزا غالب سے رکھتے ہیں ۔ صاحب دیوان فارسی ۔ بارہ سو ترانوے ۔ (کذا)

ندید از عشق خالی لامکاں را ہم نگاہ ...
خدا ہم نیست بے معشوق پیغمبر گواہ ...

تشبیہ .... کا کل پر پیچ و تاب کی
تصویر کیا کھنچی ہے مرے اضطراب کی

شوخی ، نادر شاہ خاں

شوخ (۱) تخلص ، نادر شاہ خان ، متوطن رام پور ، ناظر عدالت کا کلکٹری بنارس ۔ شاگرد مرزا صابر دھلوی (۲) ۔

ہوئی حجت جو وصل شوخ پر اس ماہ پیکر سے
گواہی ہم نے دلوائی شکن آلودہ بستر سے

شوکت ، یار محمد خاں

شوکت تخلص ، یار محمد خان بن نواب فوج دار خان بہادر بن نواب غوث محمد خان بہادر خلف نواب حیات محمد خان بہادر بن نواب یار محمد خان بہادر بن سردار دوست محمد خان بہادر ، میرزائے خیل ، قرابت دار نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیہ بھوپال سے ہیں ۔ شاگرد مولوی سید عبداللہ .. خوشاب اور اخوند منشی احمد علی ...... سید علی اکبر خان غازی اور مولانا محمد عباس شروانی و مرزا نوشہ دھلوی ...... کچھ اپنے والد صاحب سے اس فن کو حاصل کیا ۔ ایک تذکرہ مسمی بہ تذکرہ فرح بخش ان کا مطبع نظامی میں اسی صفحوں پر چھپ کر ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۸۸ بارہ [سو] اٹھاسی ھجری میں دستیاب ہوا ۔

مست ہر شخص اپنے رنگ میں ہے
شیخ تسبیح ، رند بنگ میں ہے
آپ کہتے ہو شعر اے شوکت
فکر تازہ تمھارے ڈھنگ میں ہے

۱۔ " شوخ " سہو قلم ہے ، صحیح " شوخی " ہے ۔
۲۔ بشیر نے تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا ۔

شہیر، حافظ خان محمد خان

شہیر تخلص، افتخارالشعرا حافظ خان محمد خان، ملازم سرکار دارالاقبا بھوپال ۔ شاگرد ....

صوفی، سید فرزند علی

صوفی تخلص، سید فرزند علی صاحب متیری شاہ آبادی، سور سروش سخن -

طالب، احمد سعید خان

قطعهٔ بشیر، شادی احمد سعید خان [طالب] خلف نواب ضیاء الدین :

نیر ہند کو یہ شادیٔ فرزند سعید
دل اعلیٰ کو نہ ہو طعنهٔ اسفل بھاری
میرے حصے کا بھی تورا وہ عنایت کیجے
بیاہ کے پیچھے ہوا کرتی ہے پتل بھاری

ظفر، بہادر شاہ

تاریخ روانگی شہر رنگون، محمد ابو ظفر مرزا سراج الدین بہادر شا بادشاہ دهلی :

بو ظفر را ببرد در رنگون — چون نه عالم سیاه شد افسوس
گفت هاتف برائے تاریخش — شاه دهلی تباه شد افسوس
۱۲۷۴ھ

[کنز تواریخ

قطعات تاریخ وفات :

چون بهادر شاه، شاه هند مرد — در غمش از گریه نورالعین شد
گفت تاریخ بشیر از جهد ما — بادشاه کشور کونین شد
۱۲۷۹ھ

سراج الدیں بہادر شاہ غازی
ز دنیا گشت سوے خلد راہی
بشیر آمد پئے تاریخ آواز
بملک قدس از حق یافت شاہی (۱)
۱۲۷۹ھ

ز دنیائے فانی بہ ملک فنا
چو شد شاہ دھلی بعز و وقار
بشیر ... سال فوتش بگفت
زھے شاہ والا گہر تاجدار
۱۲۷۹ھ

ظہیر ، منشی پیارے لال

ظہیر تخلص ، منشی پیارے لال کا یستھ ، شاگرد مومن خاں مومن - ۱۲۹۰ ھجری میں فوت ہوئے -

شب ھجراں کا اندھیرا نہ گیا ، پر نہ گیا
کام کافور کی آئی نہ اگر کی بتی
خط .... اس کو جلاؤ تو نہیں
خط عاشق کی جو کی آپ نے مل کر بتی

عاقل ، نواب محمد سلطان دھلوی

عاقل تخلص ، نواب محمد سلطان دھلوی ، مقیم بنارس ، شاگرد مرزا صابر -

زمانے میں رھی تعلیم خود بینی سکندر سے
رھے گا سلسلہ جاری یہ آیینے کے جوھر سے

عرشی ، مولوی احمد حسن

عرشی ، مولوی احمد حسن ، برادر کلاں مولوی صدیق حسن ، امیر منشی ریاست بھوپال - بڑے عمدہ و فاضل شاعر تھے ، نوجوان شہر بڑودہ میں فوت ہوئے - قصاید فارسی و عربی آن کے نہایت فصیح و بلیغ ھیں - ایک غزل اردو کی تذکرہ' فرح بخش میں نظر سے گزری ، جس کا مطلع یہ ھے :

۱- اس مصرع سے مطلوبہ اعداد بر آمد نہیں ہوتے -

اب تو ہم شائستہ' آغوش دل بر ہو گئے
ناتوانی میں جو گل کھائے مشجر ہو گئے

متوطن قنوج ، خلف مولوی اولاد حسن خلف نواب سید اولاد علی خ' بہادر انور جنگ ، امرائے نظام الملک آصف جاہ والی' حیدر آباد دکن میں شہ ہوتے تھے ...... اجداد تا حضرت سجاد ...... اپنے اپنے عہد میں بڑے فاضل ذی لیاقت گزرے۔

عزیز ، میرزا یوسف علی خان

قطعات تاریخ وفات :

جب عزیز سخن سرا کا بشیر باغ فردوس میں مقام ہوا
اہل معنی کے لب پہ مثل جرس آہ و نالوں کا اژدہام ہوا
شہرہ' مرگ اوستاد زماں ہند سے تابہ روم و شام ہوا
روئے صبح الم سے ہے فق فق (کذا) رنگ شب کا سیاہ فام ہوا
یہی صدمہ جہاں میں حضرت دل باعث رنج خاص و عام ہوا
فکر تاریخ جب ہوئی مجھ کو سر بزانو برائے نام ہوا
ناگہاں غیب سے صدا آئی آج کسب سخن تمام ہوا
۱۲۸۹ھ

چوں عزیز سخنور کامل در جناں شد ز عالم فانی
کک تاریخ رحلتش بہ نوشت شاعر بے عدیل لاثانی
(۱۲۸۹ھ)

عزیز یوسف مصر معانی بہ جنت نقل کرد از دار دنیا
بشیر از سن سنین رحلتش گفت امام شاعراں تاج المعالی
۱۲۸۹ھ

[کنز تواریخ

کوکب ، منشی تفضل حسین خان

کوکب تخلص، منشی تفضل حسین خاں ...... شاگرد غالب دہلوی

مٹ گئے ہائے مکیں اور مکان دھلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشان دھلی

محمود ، محمد حسین

محمود تخلص ، محمد حسین دھلوی ، شاگرد حضرت استاد غالب ، ملازم سرکار کنور بکرمان سنگھ والی ریاست کپور تھلہ ، مولف نسخۂ حلوائے بے دود ۔

مسافر کو علم و ھنر چاھیے پئے رھبری راھبر چاھیے

[دوسری جگہ بشیر نے ترجمۂ محمود ان الفاظ میں لکھا ہے]

محمود تخلص ، محمد حسین ، شاگرد مرزا اسداللہ خان غالب ، باشندۂ دھلی ۔ ان کا حلوائے بے دود جو کنور بکرمان سنگھ برادر والیٔ کپور تھلہ کی فرمائش سے تصنیف کیا ہے ، نظر سے گزرا ۔ اس میں چند غزلیں نصیحت آمیز مضامین کی اپنے اپنے موقع پر درج ھیں ۔

مظہر ، حاجی محمد اسحاق عرف مظہر الحق

مظہر تخلص ، حاجی محمد اسحاق عرف مولوی مظہرالحق خلف اصغر مولوی ظہور علی ظہور ، شاگرد اپنے والد اور مرزا غالب کے ، صاحب دیوان و تذکرہ ، متوطن ھریانہ ، باشندۂ دھلی ، حال اتالیق و تحصیل دار ریاست پاٹودی ، راقم کے احباب ھیں ۔ (کذا)

میکش ، سید احمد حسین

میکش تخلص ، سید احمد حسین خلف سید کرار حسین ، قوم سادات سے ، نواب شائستہ خان کی اولاد میں ھیں ۔ کتب عربیہ آخون فیض احمد [صہ] جو مسجد کلاں میں رھتے تھے ، پڑھتا تھا ۔ نواب اسداللہ خان غالب سے اصلاح لیتا تھا ۔ صدر امین اول کی کچہری میں وکالت کرتے تھے ۔ ۱۲۶۳ھ میں بائیس برس کی عمر رکھتے تھے ۔ بیشتر فارسی اور کم کم اردو میں کہتے تھے ۔

ناصر ، امتیازالدولہ عرف یوسف مرزا

ناصر تخلص ، امتیازالدولہ عرف یوسف مرزا ۔

ترشنے سے بتوں کے بڑھ گئی توقیر پتھر کی
صنم بن کر ہوئی مشہور یہ تصویر پتھر کی (۱)

نحیف ، غلام محمد خان

نحیف تخلص ، غلام محمد خاں ، شاگرد غالب -

شوق وصل یار ہے اور غم نہیں اغیار کا
گل سے ہم پہلو ہوں میں کیا خار کھانا خار کا

نشاط ، بابو ہرگوبند سہائے

نشاط تخلص ، بابو ہرگوبند سہائے ، ان کا دیوان مسمی بہ نشاط احباب چھپ کر شائع ہوا -

نظام ، محمد مردان علی خان

نظام تخلص ، نظام الدولہ منتظم الملک نواب محمد مردان علی خان بہادر قائم جنگ ، سابق دیوان و وزیر اعظم ملک مارواڑ - صاحب تصانیف کثیرہ ابتدا میں آپ کا تخلص مضطر تھا ، پھر رعنا ، اب بہ اعتبار خطاب کے نظام ہے جو آپ کے ...... سے ظاہر ہے -

آغاز سخن وری میں مضطر تھا نام	رعنا تھا شباب شاعری سے ہنگام
ہے زیر نگیں کشور نظم تو اب	نواب خطاب اور تخلص ہے نظام

کلیات میں سوانح عمری کل درج ہے -

یکتا ، خواجہ معین الدین

بعد غدر بصارت چشم جاتی رہی تھی - ۱۲۸۹ھ [میں] مر گیا -
از فکر بشیر : آہ دلا شاعر یکتا بمرد ۱۲۸۹ھ
['' کنز تواریخ '' میں قطعہ' تاریخ وفات ہے] :

شاعر یکتا ز جہاں شد بہ خلد	لطف سخن ہم رہ خویش آہ برد
گفت خرد سال وفاتش بشیر	آہ دلا شاعر یکتا بمرد
(۱۲۸۹ھ)

۱- ناصر کا یہ واحد شعر ہے جو دستیاب ہوا ہے - ' تلامذ غالب ' میں لکھا ہے افسوس کہ کلام دستیاب نہیں ہوا - (ص ۲۷۰)

غالب کا آیینۂ فن

ممتاز حسین

جس طرح نفسیات کے پہلو بہ پہلو ایک عمیق نفسیات ہوتی ہے جو نفس کے پاتال کی خبر لاتی ہے ، اسی طرح سیاسی سماجی تاریخ کے پہلو بہ پہلو ایک عمیق تاریخ بھی ہوتی ہے ، جو سیاسی و سماجی رشتوں سے گزرتی ہوئی ، معتقدات ، محسوسات ، جمالیات ، بالفاظ دیگر روحانی دنیا کا پتا چلاتی ہے - یہ دونوں تاریخیں ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں ، ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں - یہ روحانی دنیا خارجی دنیا سے صرف متعین ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کو متغیر بھی کرتی ہے - لیکن جس تیزی سے سیاسی اور سماجی دنیا میں تغیرات رونما ہوتے ہیں ، اسی تیزی سے روحانی دنیا میں جوابی تبدیلیاں رونما نہیں ہوتیں - اس کے درمیان کوئی میکانکی رشتہ نہیں ہے - خیالات بڑی مشکل سے مرتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی داخلیت کے بھی حامل ہوتے ہیں - ہم آج 'تسخیر مکان' کے عہد سے گزر رہے ہیں ، آج کی تاریخ میں دم تحریر انسان نے ساٹھ میل کے فاصلے سے چاند کو جا کر دیکھا ہے اور چند سالوں میں وہ مریخ ، زہرہ اور دوسرے سیاروں کو بھی اسی طرح دیکھ کر واپس آئے گا اور یہ بتائے گا جیسا کہ وہ آج بتا رہا ہے ، اس کائنات میں نہ تو کوئی عرش ہے اور نہ فرش ہے ، چاند پر جاؤ تو زمین عرش ہے اور وہ زہرہ و مریخ سے بھی زیادہ عشوہ گر ہے -

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو ، اے خدا
آیینہ فرش شش جہت انتظار ہے

لیکن اس عشوہ گری کو کتنے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سیارۂ زمین کا بھی ایک غمزہ ہے - عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ، لیکن ہم سے

کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اپنا قبلہ بہ کعبہ' ارض درست کیا ہے ۔ زمین بھی آسمان ہے اور سب سے دور ستارے سے اتنی ہی بلند ہے جتنا کہ وہ ستارہ اس زمین سے بلند ہے۔ بہر حال کہنے کا مطلب تو یہ کہ اعتقادات کی جڑیں آسانی سے نہیں ہلا کرتی ہیں ۔ یہی حال ہمارے غالب کا تھا ۔ وہ اس تاریخی سماجی تغیر کی انقلابیت سے با خبر تھے ، کہنگی' تماشا کو بھی اپنی نظر سے دور کر چکے تھے اور اپنی چشم نگراں سے صفات نو کا تماشا بھی کر رہے تھے ۔ لیکن زندگی ، انسان اور کائنات کی حقیقت کے بارے میں ان کا جو علم تھا وہ قدیم دنیا کا تھا ، اس سے تعلق تھا جو قدیم دنیا کا بہترین سرمایہ تھا، جس کی گود سے جدید دنیا سترھویں صدی یورپ کی پیدا ہوئی تھی ۔ پھر بھی یہی کہا جائے گا کہ اس کے علم کا تعلق قدیم دنیا سے تھا ، یونان و عجم اور ہند کی سر زمین سے تھا ، اس میں جدید یورپ کا علم شامل نہ تھا ۔ غالب اور سر سید کے درمیان بعد زمانی کچھ بہت زیادہ نہیں ۔ غالب سر سید سے صرف بیس سال عمر میں بڑے تھے، لیکن ' تہذیب الاخلاق ' کے مدیر اعلیٰ سر سید اور غالب کے افکار کے درمیان دو مختلف عہد کا فاصلہ تھا ، اور یہ مغرب کی کارستانی تھی کہ اس نے دونوں کو پیوند کردیا تھا ۔ معاشرے کی حرکیات تہذیب کی تاریخ کا جو علم سر سید کے یہاں ملتا ہے وہ غالب کے یہاں نہیں ہے ، سرسید نے اسے مغرب سے اخذ کیا ، ولایت کا سفر کیا ، ولایت جانے سے پہلے اتنے بے خبر کہ '' ابطال حرکت '' پر رسالہ لکھا ، گلیلیو کو جھٹلایا ، اور لوٹنے پر اتنے آزاد کہ اس رسالے کی تردید کا اعلان کیا غالب نے مشرق کے علم پر بھروسا کیا اور ابدی تغیر و حرکت کا کلمہ پڑھا :

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار باد یاں

آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آینہ دایم نقاب میں

کس نے اس تغیر ابدی کا نظریہ دیا ، یونان کے ہراکلیٹس ، زردشت اپشد کے ابدی تغیر کو دنیائے اسلام میں حکمائے اسلام نے اسے رائج کیا ، اشراقین اسکندریہ نے اسے رائج کیا ، اخوان الصفا کے لوگوں نے اسے رائج کیا اور پھر صوفیوں نے اسے رائج کیا ۔ اسے کارگاہ کون و فساد

کا نام دیا اور یہ بتایا کہ یہ سلسلۂ کون و فساد لامتناہی ہے ۔ رومی کہتے ہیں :

پشہ کے داند کہ ایں باغ از کسے است
در بہاراں زاد و مرگش در دے است

اور غالب لکھتے ہیں :

'' گروہا گروہ مردم از دانایان ہند و دانش اندوزان خطا [خطا و ختن] و فرزانگان یونان برآنند کہ آفرینش را از ہر دو سو کرانہ پدید نیست ۔ از نا آغاز روز تا انجام جاوید پیوند ، ہمیں نمایش ، ہم بدیں گونہ آرایش در کار است۔ نبودہ است کہ نبودہ است و نخواہد بود کہ نخواہد بود''۔ (دیباچۂ مہر نیمروز)

ترجمہ : دانایان ہند سے بہت سے لوگ ، خطا و ختن اور یونان کے بہت سے دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ تخلیق بے کراں ہے۔ اس کا نہ تو کوئی روز آغاز ہے اور نہ کوئی روز انجام ۔ یہ ' لا آغاز روز ' سے ' انجام جاوید پیوند ' تک ہے ۔ یہی نمایش اور اسی طرح سے آرایش (کائنات) درکار ہے ۔ نہیں ہوا ہے کہ نہیں ہوا ہے ، نہ ہوگا کہ نہ ہوگا ۔ ہر شے لازمی ہے ہے ' دایم تاہم متحرک ہے ۔

منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں : '' آرے در کارگاہ کون و فساد ، ہیچ فساد بے کون و ہیچ کون بے فساد نیست '' ۔

غالب نے فطرت کے اسی ابدی قانون تغیر کے تحت اس سماجی تغیر کو قبول کیا تھا جو برصغیر کی تاریخ میں پہلا سماجی انقلاب تھا ' اور پوری انسانیت کی آزادی کے لیے ضروری تھا ۔ اس سے پہلے برصغیر کے لوگوں کی سماجی زندگی کی کوئی تاریخ ہی نہ تھی ، تاریخ تغیر سے ہے ، ان کی سماجی زندگی میں صدیوں سے کوئی تغیر آیا ہی نہ تھا ۔ لشکر جرار موج بہ موج فصیل کوہسار کو توڑتا ہوا آتا ، لیکن طوفان کے مانند ان کے سر سے گزر جاتا ، سماجی زندگی غیر متغیر رہ جاتی ۔ جات پات کے بندھن ، درجات کے بندھن ویسے کے ویسے ہی رہ جاتے ، جگر ناتھہ کے رتھ کا جوا ان کے کندھوں پر ہوتا اور وہ رامو رام کہتے ہوئے اس میں پستے رہتے ۔ مغرب سے ایک برق چمکی اور اس نے سماجی حقیقت کو تہ و بالا کیا ۔ غالب نے اس کا استقبال کیا ۔

خوشم کہ گنبد چرخ کہن فروریزد
اگرچہ خود ہمہ بر فرق من فروریزد

اور اس نے اس چرخ کی جنبش بھی دیکھی ۔ اس نے اس کا استقبال ایک برق آسمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عمل خرد کی حیثیت سے کیا ۔

دیدہ بینا آمد و بازو قوی کہنگی پوشید تشریف نوی

کیا اس بات سے غالب کو مغرب کے علوم سے استفادہ نہ تھا ؟ وہ ایک مشرق کا آدمی تھا ، کلاہ پاپاخ اور چغہ پہنتا تھا ، اور مشرق ھی کے فلسفے میں ڈوبا ہوا تھا ، اس کے خیال کی اہمیت گھٹ جاتی ھے ۔ اگر کوئی شخص ایسا سوچتا ھے تو وہ تاریکی میں ھے ۔ غالب ھی سے سارے نئے خیالات کا رشتہ ملتا ھے غالب ھی سے سر سید اور ان کا لشکر ھے ۔ بدگمان بھی بعد میں اس کے ساتھ ھیں ۔ غالب ھی کے سرچشمۂ فکر سے از آں روز تا ایں زمانہ سب مستفید ھیں ۔ پہلی ضرب کلیم سنگینیٔ حیات پر اسی کی تھی ۔ اسی نے ایک نئی بیداری ایک نئی روح ، اپنی ' نوا سنجیٔ قانون راز ھستی ' سے ھماری زندگی میں پیدا کی ۔ جو کڑیاں سلسلۂ فکر کی ، اجتہاد کی ، مدت سے بے آواز تھیں ، انہیں و آشوب نغمہ دے گیا ۔ اس جمود فکر کو اپنے جگر کی آگ سے پگھلا گیا جسے جاگیردارانہ نظام نے اپنے قیام زوال کی کوشش میں ھماری زندگی پر صدیوں سے مسلط کر رکھا تھا ۔ اس میں شبہ نہیں اس پر پہلی ضرب اندیشہ مغرب سے لگی اور ایسی کاری ضرب لگی کہ سلسلۂ وقت کی کڑیاں ٹوٹ گئیں ، ماضی سے رشتہ چھوٹ گیا اور جب وقت کی کڑیوں کا سلسلہ ھی نہ ملے تو نبض ھستی چھوٹنے لگتی ھے کیونکہ وقت حقیقت کا ایک لازمی حصہ ھے ۔ اس وجودی صورت حال سے دوچار غالب کے عہد کا مشرقی آدمی ، تقلیدی آدمی ، بڑا سراسیمہ ، مضطرب اور بے چین تھا ۔ جن چیزوں پر اس کے وجود کا انحصار تھا ، جو آسمان کہ اس نے اپنے خیال کا تخلیق کیا تھا ، نیچے آرہا تھا ۔ اور جس زمین پر کہ اس کا قدم تھا وہ زمین اس کے پیروں تلے سے نکلی جا رھی تھی ۔ اور وہ رسی ایمان اور عقیدے کی بھی ٹوٹ رھی تھی جسے وہ کبھی مضبوطی سے پکڑے ھوئے تھا ۔ اسی حالت کی ترجمانی غالب نے اپنے اس شعر سے کی ھے :

زخمی ھوا ھے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ھے

انسان جو اپنی زندگی کے مادی اسباب کا خالق ہے ، جو اپنے مقاصد کو بروے کار لاتا ہے ، جو فطرت نامرضیہ کو اپنی مرضی کے تابع کرتا ہے ، اپنے جہان کا خود خالق بنتا ہے ، اور اس جہان کی تخلیق میں ہر شے کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے - ہیرے سے قلم ، سنگ سے شرارے کا کام لیتا ہے ، فولاد کو مثل آب پابند ظرف کرتا ہے - وہ آدمی جس کی گمشدگی کا اعلان میر نے بھی کیا تھا :

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا		خدائی صدقے کی انسان پر سے

وہ مشرق کا آدمی غالب کے عہد میں رہن بستہ ، جہاں شاکی اپنی اس بندگی کا تھا :

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی		بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

وہاں اس احساس ندامت کا بھی حامل تھا وہ جو سرمایہ' نازش وجود تھا ، اب ننگ وجود ہے :

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

اس کا وجود اپنی اس روحانیت و انسانیت کو ضایع کر چکا تھا جس کو فلسفیانہ اصطلاح میں ماورائیت یا عینیت کہتے ہیں - اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان فطرت کو متغیر کر کے اپنی فطرت کو بھی ترقی دیتا رہتا ہے - اس عمل میں وہ صرف اپنے ہی کو بلند نہیں کرتا ہے ، اپنی حدود ذات سے تجاوز کرتا ہے بلکہ کائنات کی ہر اس شے کے جوہر کو بھی جسے وہ اپنے تصرف میں لاتا ہے ، بے نقاب کرتا ہے - وہ ذرے کو آفتاب اور قطرے کو گہر بناتا ہے ، زہے طالع مریخ جو اس کی جبین انسان کے قدموں پر ہو - پھر یہ دیکھیے کہ اس کا جوہر کیوں کر کھلتا ہے - انسان کا یہ عمل اس تضاد کے بغیر نہیں ہے کہ انسان صرف موضوع فطرت نہیں بلکہ معروض فطرت بھی ہے ، وہ فطرت خارجیہ کی مخالفت اس کے ایک حصے کی حیثیت سے کرتا ہے - فطرت خارجیہ اسے اپنی طرف بھی کھینچتی رہتی ہے ، رزق خاک بنانے کے درپے ہوتی ہے ، لیکن وہ تاریخی وجود جسے ہم انسان کہتے ہیں ، وہ اپنی معروضیت سے نہیں بلکہ اپنی موضوعیت سے پہچانا جاتا ہے - اس کے وجود کی بنیادی تعریف یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایستادہ جانور ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ صاحب نطق و شعور ، اپنی زندگی کے مادی

ذرایع کا خالق ہے ، اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ حسن آف
ہے ۔ وہ صرف اپنی جبلت کو دہراتا نہیں جس طرح کہ بیا اپنا گھونسلا یا مکڑ
اپنا جالا بنتی ہے ، بلکہ وہ فطرت کے ہر معیار کے مطابق چیزیں خلق کرتا ہے
ہمیشہ نئی سے نئی صورت حسن کا جویا ہوتا ہے :

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اس کا اطلاق اس کی زندگی کے ہر تحلیقی عمل پر ہے ۔ اسی
فلسفیوں کی زبان میں انسان کی ماورائیت کہتے ہیں ۔ ہم آپ اسے انسان
کہتے ہیں ۔ غالب کے زمانے کا مشرقی آدمی اپنی اس ماورائیت یا انسانیت
صدیوں سے ضایع کر رہا تھا ، رو بہ زوال تھا وہ جو کہ خالق مخلوق نما تھا
صرف مخلوق رہ گیا تھا ۔ اس سے اس کی ربوبیت چھین لی گئی تھی ۔ وہ '
بندۂ مجبور اس خاکدان کا قیدی تھا ۔ زندگی زندہ رہنے کے لیے رہ گئی تھ
جسم و جان کے پیوند کو برقرار رکھنے کے لیے تھی نہ کہ مقصود بالذات تھ
اور جب اسی چیز کو ہم اس کے اور ظل اللہ کے رشتے سے دیکھتے ہیں تو
محسوس کرتے ہیں کہ اس کی زندگی کا مقصد ظل اللہ کی مشیت کے تابع
تھا ۔ ظل اللہ جو تن تنہا تنویر ربوبیت کا حامل تھا ۔ محکوم سے بالکل ایک جدا
مخلوق تھا ۔ اگر ظل اللہ دن کو رات بتائیں تو وہ ستاروں کی نشاندھی کر
اور اگر ظل اللہ کے غیض و غضب کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خون
کی حاجت ہو تو وہ تہ تیغ ہو ۔ مطلق العنان شاہوں کے اس دور میں آدمی
ماورائیت یا اس کی ربوبیت پر نہیں بلکہ اس کی بندگی بیچارگی اور مجہولیت پر
دیا جاتا رہا ۔ اور اس مشقت زندگی اور اس حبس زندگی سے نکلنے کا ایک
دروازہ اس کے لیے کھلا رکھا گیا تھا کہ وہ راحت و مسرت کا خواب اس ز
عنصری سے ، اس زندان خاک سے رہا ہونے کے بعد یعنی بعد المرگ ، دوس
دنیا میں دیکھے ، اگر اس نے واقعتاً یہاں اپنے کو زندگی کی تمام لذتوں
محروم رکھا ہے ۔ لیکن سرسید کہتے ہیں کہ دین ان کا ہے جن کی دنیا ۔
جن کے پاس دین حاصل کرنے کی مالی استطاعت ہے ، اور لارڈ مکالے جس کے
معاشرے کی ترقی کا تصور سانکھیہ ہے ، اس نے بہشت کے دروازے پر یہ تخ
لٹکا دی کہ اس میں غریب داخل نہیں ہو سکتے ، اور وہ تختی الٹ
جو مسیح نے لکھی تھی کہ دولت مند اس میں داخل نہیں ہو سکتے ۔
دونوں تختیوں میں سے کون سی تختی صحیح ہے ، یہ موضوع زیر بحث نہیں
بتلانا تو یہ تھا کہ جب وہ اپنے عمل کا مسبب نہ رہا ، تو وہ کیونکر راس

اور راست کردار بن سکتا تھا جس سے کہ وہ اپنی عاقبت کما سکتا ۔ وہ تو صرف فرمانبردار تھا ، فرماں روائی میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا ۔ وہ تو وہی کرتا جو اس سے کرنے کے لیے کہا جاتا ۔ پاکباز بننے کی اس سے بنیاد ہی چھن چکی تھی ۔ وہ بہشت کا مطالبہ اپنے اعمال پر نہیں کر سکتا ، اختیار چھن چکا تھا ۔ جس سے تو وہ حق انکار بھی لے لیا گیا تھا جو معلم الملکوت کو حاصل تھا ۔ ایسی صورت میں بھلا اس پر شیطان کیوں نہ ہنستا ، کیا یہی میرا مسجود ہے ۔ میر نے اسے بہت پچکارا :

پھر نہ شیطان سجود آدم سے
شاید اس پردے میں خدا ہووے

لیکن اس حالت میں وہ انسان کو پاکر کیوں کر میر کے بہلاوے میں آتا ۔

یہ اسی کا رد عمل تھا کہ جس طرح دنیائے اساطیر میں کاوا نے ضحاک خون آشام کے خلاف درفش کاویانی بلند کیا تھا ، اسی طرح تاریخی دور اسلامیہ میں ایک معمولی حلاج نے اپنے محراب قلب سے صدائے انا الحق بلند کی اور سارے انسانوں میں کبریائی تقسیم کی :

کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خودنما اتنے
یہ حسن اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا (میر)

تاکہ ہر شخص مقصود بالذات بن سکے اور اپنی ذات کے جلال و جمال دونوں سے لذت یاب ہو ۔ پرامیتھیس کو بھی پہاڑ کی چٹان سے باندھا گیا تھا ، کیونکہ اس نے دیوتاؤں کے خفیہ ہتھیار ، یعنی آگ کو انسانوں میں تقسیم کر دیا تھا ۔ ایسے میں یہ کوئی عجب نہیں کہ حلاج کو بھی دار پر کھینچا گیا ۔ ع : ایکو کو دار کھینچا ایکو کی کھال کھینچی ۔ کیونکہ وہ بھی ایک ایسے ہی جرم کا مرتکب تھا ۔ مگر سوچنے کی بات ہے جب کہ کچھ بھی خدا کے باہر نہیں ، " وہی ظاہر وہی باطن وہی اول وہی آخر " ہے تو پھر انسان اس سے کیونکر باہر ہوسکتا ہے ۔ مگر واہ رے اجارۂ ظل سبحانی ، یہ آیۂ رحمانی بھی اس کے کام نہ آئی ۔ انسان کے اقتدار پر حملہ خدا کا نام لے کر یہ کیا فساد معرفت ہے ۔ ع : سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے ۔ یہ آواز ، گنہگار آواز سمجھی گئی ، کیونکہ سوسائٹی کی تشکیل درجات پر تھی ' انسان کو

بہ حیثیت انسان کے نہیں بلکہ اس کے منصب سے پہچانا جاتا تھا ، کس ق
جاگیر اورکتنی سپاہ ہے - ایک حلاج اور یہ آواز انا الحق - لیکن کسی شاعر
قول ہے ، اور شعر اپنے قول میں بڑا کھرا ہوتا ہے کہ اس کی کوئی بھی آ
ضایع نہیں ہوتی ، بھلا وہ آواز کیونکر رایگاں جاتی جو محراب دل سے اٹھ
ہو، آئینہ' ہستی کی تابندگی لیے ہوئے ہو - چنانچہ یہ اسی آواز کی برکت تھ
کہ فقہائے سلطنت کی مخالفت کے باوجود بندگان حرم سجدہ' عبودیت سے اٹھ گ
اور خدا کی محبت اور رحمت سے ہمکنار ہو گئے - بندگی سے محبت کا راستہ
ایک نیا راستہ عرفان ذات کا پیدا ہوا - بندگی میں خودی کا زیاں ، محبت خود
آشنا ہے - یہ اتصال و گریز ، فراق و وصال کی شے ہے نہ کہ اتصال ذات
صفات کی - یہی وجہ ہے کہ صوفیہ نے خدا کو صرف ناز پرور ہی نہ
بلکہ انسان کا نیازمند بھی بتایا ہے ، اسی کے آئینے میں اس نے اپنے کو دیکھ
ہے - ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں - اقبال کا ایک مصرع ہے
انسان کی عظمت سے متعلق، کبریا را در سجودش دیدہ ام (جاوید نامہ) - ا
ایک اشارے سے اب آگے بڑھ رہا ہوں - اس محبت کے راستے نے جو اشرا
فلاطوں کا ہو یا کسی اور کا ' مسیحی نظریہ' تخلیق کائنات کو بھی مست
کر دیا - اس کی جگہ نظریہ' صدور ، آفتاب سے نور کی وحدت نے لیا ، ج
طرح آفتاب سے روشنی، اسی طرح ذات صفات سے متحد ہے -

عالم از ذات جدا نبود و نبود جز ذات
همچو رازیکہ بود در دل فرزانہ نہاں

اور پھر نثر میں اس کی تشریح غالب ان الفاظ میں کرتے ہیں :

" ہماں ذات مقدس کہ صفات عین اوست و عالم از وے چوں پرتو از مہر جدا نیست در ہر عالم از اعیان ثابتہ تا صور محشورہ از خویش بہ خویش جلوہ گرست "۔

ترجمہ : وہ ذات مقدس کہ صفات اس کی عین ہے اور عالم اس سے اس طرح پیوستہ ہے جس طرح روشنی آفتاب سے ہوتی ہے ، اور ہر عالم میں ممکن سے واقع تک ، اپنے سے اپنے پر جلوہ گر ہے۔

رومی بھی یہی کہتے ہیں :

می گفت در بیاباں رند دھن دریدہ
صوفی خدا ندارد او نیست آفریدہ

کہیں یہ گمان نہ ہو کہ انھوں نے یہ ایک 'رند دھن دریدہ' کی زبان سے یہ کہلایا ہے اس لیے اب ان کی زبان سے سنیے -

چہ تدبیر اے مسلمانان کہ من خودرا نمی دانم
نہ ترسا و یہودیم و نہ گبرم نے مسلمانم
نہ از خاکم نہ از بادم نہ از آبم نہ از آتش
نہ ارکان طبیعیم نہ از افلاک گردانم
نہ از دینے نہ از عقبیٰ نہ از جنت نہ از دوزخ
نہ از آدم نہ از حوا نہ از فردوس رضوانم
مکانم لا مکاں باشد نشانم بے نشاں باشد
نہ تن باشد نہ جاں باشد کہ من از جان جانانم
ھوالاول ھوالآخر ، ھوالظاھر ھوالباطن
بغیر از ھو و یا من ھو دگر چیزے نمی دانم

غالب بھی اسی آواز کو دھراتے ھیں :

دل ھر قطرہ ھے ساز انا البحر
ھم اس کے ھیں ھمارا پوچھنا کیا

لیکن یہ اتحاد انسان اور خدا کے درمیان بھلا اس وقت تک کیونکر قایم ھو سکتا ھے جب کہ منطقی حیثیت سے یہ ثابت نہ ھو کہ انسان بھی سرمدی ھے - وہ بھی ''از نا آغاز روز تا انجام جاوید پیوند'' ھے - زمانۂ حاضر میں وقت کا تصور بدل چکا ھے - یہ آئنسٹائین کی معرفت کا نتیجہ ھے - آج وقت بھی کائنات کا ایک تکوینی جزو ھے - اب مکان کا تصور ابعاد ثلاثہ کا نہیں بلکہ ابعادِ اربعہ کا ھے - جس میں ایک وقت بھی ھے - اس نظریے کے بعد برگساں کے تسلسلاتی (serial) اور غیر تسلسلاتی (آن دایم) وقت کی دوئی ختم ھو چکی ھے ، جس طرح کہ ھستی انقسام پذیر نہیں ھے (ھستی انقسام نپذیرد - غالب بنام رنگین) اسی طرح وقت کی بھی تقسیم نہیں ھے - اس کا نہ تو آغاز ھے اور نہ انجام ھے ، اس کے دونوں سرے بیکراں ھیں ، اسی طرح جس طرح ھستی محض بیکراں ھے - تبھی تو یہ کہا گیا ھے '' لاتسبوالدھر ، اناالدھر'' - وقت حقیقی ھے ، معروضی ھے - پھر بھی اگر تجریدی

حیثیت سے کائنات کو دیکھا جائے تو وہ حرکت مسلسل کے باوجود ''ہے'' '' الآن کما کان '' حرکت کے باعث نہ تو اس سے کچھ گھٹتا ہے اور نہ اس میں کچھ بڑھتا ہے۔ حرکت اور دوام ان دونوں تصورات میں کوی نقیض نہیں۔

''نہ حرکت میں ہوتے ہوئے حرکت میں ہے ، دور ہے تا ہم نزدیک ہے ، سب میں ہے اور سب سے باہر'' (اپنشد)

غالب اپنی اس توحید وجودی میں ہستیٔ محض کی اس تنزیہ کے بھی قایل ہیں '' سب میں ہے اور سب سے باہر ہے '' ۔

هر چند هر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

بہر حال یہاں دیکھنا تو یہ ہے کہ غالب نے اپنی مابعدالطبیعیات میں انسان کی ابدیت کو منطقی حیثیت سے کیونکر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب مہر نیمروز کے دیباچے میں یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ کسی نے حضرت علی سے یہ سوال کیا کہ آدم سے پہلے کون تھا ، آپ نے فرمایا کہ آدم ۔ دوسری بار پھر پوچھا کہ ان سے پہلے ، آپ نے پھر وہی فرمایا کہ آدم ۔ تیسری بار پھر وہی سوال کیا اور وہی جواب پایا ۔ اس پر وہ متعجب ہوا ، لیکن اس بات سے بھی باخبر ہوا کہ اگر وہ تیس ہزار بار وہی سوال کرے گا تو وہ اس کا جواب وہی پائے گا ۔ اس روایت کو بیان کرنے کے بعد وہ یہ حدیث نقل کرتے ہیں ۔ ان اللہ خلق مایتہ الف آدم ۔ غالب کے لیے تو خیر مغرب کے علم کا دروازہ بند تھا ، اور اس وقت تک ڈارون کا نظریہ بھی منصہ شہود پر نہیں آیا تھا ، لیکن علامہ اقبال کی تو مغرب کے علوم تک رسائی تھی ، وہ بھی اپنے خطبے میں انسان کی سرمدیت کو شجرۃالخلد کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں ۔ لیکن دونوں کے نظریے میں فرق بھی ہے ۔ غالب کے یہاں آدم ہمیشہ سے ہے ، علامہ اقبال کے یہاں بہشت سے نکلنے پر جاوداں ہوا ہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

ڈارون کے نظریۂ ارتقائے انسانی میں اور جدید علم الانسان میں ان تصورات کی کہاں گنجایش کہ آدم سے پہلے آدم یعنی آدم ہمیشہ سے ہے۔

لیکن مابعد الطبیعیات کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ وہاں افسانے کو بھی حقیقت کی وضاحت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر یہاں یہ سوال ہوتا کہ انسان کیا ہے، وہ کیوں کر انسان بنا ہے اور کب سے اس روئے زمین پر ہے، تو اس کا جواب علم الانسان دے سکتا ہے، ہر چند کہ وہ کوئی حرف آخر نہ ہوگا، کیوں کہ ابھی تک اس علم میں ارتقائے انسانی کی بہت سے کڑیاں غائب ہیں۔ پھر بھی ہمیں اسی علم پر بھروسا کرنا ہوگا۔ جہاں انسانی علم کی کوئی حد نہیں ہے وہاں یہ بھی صحیح ہے کہ کائنات کا کوئی راز ایسا نہیں ہے جو قابل فہم نہ ہو۔ انسانی جستجو اسی بظاہر ناقابل فہم کو قابل فہم بنانے کی ہے۔ لیکن یہ جستجو مطلق سچائی کی حامل نہیں ہوتی ہے۔ حامد فلاں روز اور فلاں وقت پیدا ہوا، ایک مطلق سچائی ہے، لیکن ایسی مطلق سچائی اشیا کی ماہیت، زندگی کی حقیقت اور کائنات کی حقیقت کے بارے میں کسی بھی تاریخی دور میں ملنی محال ہے، مطلق کے قریب تر ہوتی ہے نہ کہ مطلق ہوتی ہے۔ صحت اور غلطی کے دونوں کونے آپس میں ملتے ہیں، وہ ایک دوسرے میں بدل بھی جاتے ہیں۔ چنانچہ معاملہ زیادہ سے زیادہ سچ اور کم سے کم نا سچ کا ہے، صحت سے قربت اور دوری کا ہے نہ کہ مطلقیت کا۔ بہرحال تو میں کہہ رہا تھا کہ مابعد الطبیعیات کی دنیا میں انسان کیوں ہے، یہ سوال اٹھایا جاتا ہے نہ یہ کہ وہ کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ انسان ہے اور ایسا کیوں نہیں ہے کہ وہ نہیں ہے۔ اس قسم کا مابعدالطبیعیاتی سوال، جواب دینے کے لیے نہیں ہوا کرتا بلکہ انسان کی ہستی کی بے مائگی کو روشنی کے حلقے میں لانے کے لیے ہوتا ہے۔ جب بھی وقت کی کڑیاں ٹوٹنے لگتی ہیں اور فرد بشر سے نبض ہستی چھوٹنے لگتی ہے تو ایک شاعر ہمیشہ اسی قسم کے سوالات اٹھاتا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

یہ سوال غالب کے ذہن میں اس لیے نہیں اٹھا کہ وہ اس کا جواب دینا چاہتے تھے، یا اس کا کوئی جواب ان کے پاس تھا جس سے کہ انھوں نے ہمیں محروم رکھا ہے۔ یہ ایک خالصتاً مابعدالطبیعیاتی سوال ہے جس کا مقصد اس سے زیادہ نہیں کہ زوال انسانیت کی طرف متوجہ کیا جائے اور اس سوال

حیثیت سے کائنات کو دیکھا جائے تو وہ حرکت مسلسل کے باوجود "ہے" "الآن کما کان" حرکت کے باعث نہ تو اس سے کچھ گھٹتا ہے اور نہ اس میں کچھ بڑھتا ہے۔ حرکت اور دوام ان دونوں تصورات میں کوی نقیض نہیں -

"نہ حرکت میں ہوتے ہوئے حرکت میں ہے ، دور ہے تا ہم
نزدیک ہے ، سب میں ہے اور سب سے باہر" (اپنشد)

غالب اپنی اس توحید وجودی میں ہستیٔ محض کی اس تنزیہ کے بھی قایل ہیں "سب میں ہے اور سب سے باہر ہے" -

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

بہر حال یہاں دیکھنا تو یہ ہے کہ غالب نے اپنی مابعدالطبیعیات میں انسان کی ابدیت کو منطقی حیثیت سے کیونکر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب مہر نیمروز کے دیباچے میں یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ کسی نے حضرت علی سے یہ سوال کیا کہ آدم سے پہلے کون تھا ، آپ نے فرمایا کہ آدم - دوسری بار پھر پوچھا کہ ان سے پہلے ، آپ نے پھر وہی فرمایا کہ آدم - تیسری بار پھر وہی سوال کیا اور وہی جواب پایا - اس پر وہ متعجب ہوا ، لیکن اس بات سے بھی باخبر ہوا کہ اگر وہ تیس ہزار بار وہی سوال کرے گا تو وہ اس کا جواب وہی پائے گا - اس روایت کو بیان کرنے کے بعد وہ یہ حدیث نقل کرتے ہیں - ان اللہ خلق مایتہ الف آدم - غالب کے لیے تو خیر مغرب کے علم کا دروازہ بند تھا ، اور اس وقت تک ڈارون کا نظریہ بھی منصہٴ شہود پر نہیں آیا تھا ، لیکن علامہ اقبال کی تو مغرب کے علوم تک رسائی تھی ، وہ بھی اپنے خطبے میں انسان کی سرمدیت کو شجرۃالخلد کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں - لیکن دونوں کے نظریے میں فرق بھی ہے - غالب کے یہاں آدم ہمیشہ سے ہے ، علامہ اقبال کے یہاں بہشت سے نکلنے پر جاوداں ہوا ہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

ڈارون کے نظریۂ ارتقائے انسانی میں اور جدید علم الانسان میں ان تصورات کی کہاں گنجایش کہ آدم سے پہلے آدم یعنی آدم ہمیشہ سے ہے۔

لیکن مابعد الطبیعیات کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ وہاں افسانے کو بھی حقیقت کی وضاحت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر یہاں یہ سوال ہوتا کہ انسان کیا ہے، وہ کیوں کر انسان بنا ہے اور کب سے اس روئے زمین پر ہے، تو اس کا جواب علم الانسان دے سکتا ہے، ہر چند کہ وہ کوئی حرف آخر نہ ہوگا، کیوں کہ ابھی تک اس علم میں ارتقائے انسانی کی بہت سے کڑیاں غائب ہیں۔ پھر بھی ہمیں اسی علم پر بھروسا کرنا ہوگا۔ جہاں انسانی علم کی کوئی حد نہیں ہے وہاں یہ بھی صحیح ہے کہ کائنات کا کوئی راز ایسا نہیں ہے جو قابل فہم نہ ہو۔ انسانی جستجو اسی بظاہر ناقابل فہم کو قابل فہم بنانے کی ہے، لیکن یہ جستجو مطلق سچائی کی حامل نہیں ہوتی ہے۔ حامد فلاں روز اور فلاں وقت پیدا ہوا، ایک مطلق سچائی ہے، لیکن ایسی مطلق سچائی اشیا کی ماہیت، زندگی کی حقیقت اور کائنات کی حقیقت کے بارے میں کسی بھی تاریخی دور میں ملنی محال ہے، مطلق کے قریب تر ہوتی ہے نہ کہ مطلق ہوتی ہے۔ صحت اور غلطی کے دونوں کونے آپس میں ملتے ہیں، وہ ایک دوسرے میں بدل بھی جاتے ہیں۔ چنانچہ معاملہ زیادہ سے زیادہ سچ اور کم سے کم نا سچ کا ہے، صحت سے قربت اور دوری کا ہے نہ کہ مطلقیت کا۔ بہرحال تو میں کہہ رہا تھا کہ مابعد الطبیعیات کی دنیا میں انسان کیوں ہے، یہ سوال اٹھایا جاتا ہے نہ یہ کہ وہ کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ انسان ہے اور ایسا کیوں نہیں ہے کہ وہ نہیں ہے۔ اس قسم کا مابعدالطبیعیاتی سوال، جواب دینے کے لیے نہیں ہوا کرتا بلکہ انسان کی ہستی کی بے مائگی کو روشنی کے حلقے میں لانے کے لیے ہوتا ہے۔ جب بھی وقت کی کڑیاں ٹوٹنے لگتی ہیں اور فرد بشر سے نبض ہستی چھوٹنے لگتی ہے تو ایک شاعر ہمیشہ اسی قسم کے سوالات اٹھاتا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل ؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

یہ سوال غالب کے ذہن میں اس لیے نہیں اٹھا کہ وہ اس کا جواب دینا چاہتے تھے، یا اس کا کوئی جواب ان کے پاس تھا جس سے کہ انھوں نے ہمیں محروم رکھا ہے۔ یہ ایک خالصتاً مابعدالطبیعیاتی سوال ہے جس کا مقصد اس سے زیادہ نہیں کہ زوال انسانیت کی طرف متوجہ کیا جائے اور اس سوال

سے مزید سوالات پیدا کیے جائیں ۔ کیا انسانی وجود ایک حادثہ' اتفاقی ہے ۔ اگر ایسا ہے تو اس کا واجب یا لازمی سے کیا تعلق ہے ، کیونکہ جو لازم ہے وہ اپنے کو اتفاقات کے سلسلے کے ذریعے ظاہر کرتا ہے ، ہر اتفاقی حادثے کے پیچھے لازم پوشیدہ رہتا ہے ۔ اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی وہ لازم یا ہستی' محض کے کسی رشتے کے بغیر ہے تو اس کے اس دعوے کی بنیاد کیونکر ہے ع :
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ۔ وہ اس قدر پستی میں کیوں چلا گیا ۔ اس کی ماورائیت کہاں ہے ؟ یہ سوال غالب نے نہ تو پہلی بار اٹھایا ہے اور نہ آخری بار دہرایا ہے ۔ یہ سقوط آدم کا بار بار ظاہر ہونے والا سوال ہے ۔ یہ سوال سارتر نے فرانس میں دوسری جنگ عظیم میں اس وقت اٹھایا جب آزادی غلامی سے بر سر پیکار تھی ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غلامی جیت رہی تھی ۔ اس نا امیدی لیکن بے جگری کے عالم میں سارتر نے اپنی داخلیت (قوت ارادہ) کو بروے کار لاتے ہوئے یہ فیصلہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری قوم کے لیے کیا کہ ہم وہ ہیں جو کچھ کہ اپنے کو بناتے ہیں ، کوئی ایسا خارجی قانون نہیں ۔ جس کے تابع ہمارا وجود ہے ، ہستی خالصتاً حادثاتی ہے ، اس کا نہ تو کوئی ماضی ہے اور نہ اس کا کوئی مسبب ۔ کوئی جوہر ، کوئی ذات ، کوئی وجود محض ، کوئی عالم گیر نوعی فطرت ، کوئی ٹائپ ، کوئی کیٹگری موجود سے پہلے نہیں ۔ اس بے معنی زندگی میں راہ نجات صرف ایک ہی ہے ، ایک ہی دروازہ کھلا ہوا ہے جو اس بزدلی اور ذلت وخواری کی زندگی سے تجھے باہر نکال سکتا ہے ، وہ راستہ آزادی کا ہے ۔ یہ " عذاب زیست ہے کہ انسان آزاد ہونے پر مجبور ہے " ۔

میں یہاں سارتر کے فلسفہ' آزادی سے بحث نہ کروں گا ، ہر چند کہ اس کے فلسفے کی جان اسی میں ہے کیونکہ یہاں موضوع بحث صرف وجود ہے ۔ سارتر جب یہ کہتا ہے کہ انسانی وجود اتفاقی ، حادثاتی ہے تو وہ یہ بات کچھ غلط نہیں کہتا ہے ، کیونکہ واجب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے کو اتفاقات کے سلسلے میں ظاہر کرتا ہے ۔ سارتر کی یہ دوسری بات بھی صحیح ہے کہ جس طرح عموم خصوص سے باہر نہیں ، اسی طرح جوہر ہستی بھی ہستی سے باہر نہیں ۔ لیکن جب وہ کہتا ہے وجود قانون بستہ نہیں ، اس کا کوئی ماضی نہیں ، کوئی نوعی ٹائپ نہیں ، وہ کچھ سے کچھ ہو سکتا ہے تو اس کے خیال کی صحت معرض شک میں آجاتی ہے ۔ ہستی اس قدر سیال نہیں کہ وہ کچھ سے کچھ بھی

ہوسکتی ہے۔ جو لازمی ہے وہ ابھر کر رہے گی خواہ حادثات اسے پیچھے ہی کی طرف کیوں نہ لے جائیں۔ اسی طرح زندگی کا ایک ماضی حیاتیاتی ہی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ ہم انسان کی زندگی میں حیاتیاتی جسمانی ارتقا محسوس نہیں کرتے، ممکن ہے کچھ تبدیلیاں ہوتی ہوں لیکن ہم محسوس نہیں کرتے۔ اس کے بر عکس اس کی ترقی اس کے سماجی ارتقا میں دیکھتے ہیں۔ یہ سماجی ارتقا ہی اس کی زندگی کا بنیادی قانون ہے۔ انسان کو اس سے باہر نہیں دیکھا جا سکتا۔ چنانچہ انسان کی ایک فطرت جہاں حیاتیاتی سطح پر جبلتوں کی صورت میں ملتی ہے وہاں اس کی ایک سماجی فطرت بھی جو اس کے سماجی اور کائناتی رشتوں سے متعین ہوتی ہے، نظر آتی ہے۔ جہاں جبلتیں پائدار ہیں وہاں اس کا سماجی وجود بدلتا رہتا ہے، اور یہ تبدیلی اس کی جبلت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، اس کے حصول کی صورتوں کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔ انسان کی وہ داخلیت جو مقاصد کو بروے کار لانے سے عبارت ہے، اس کی سماجی زندگی کا عطیہ ہے، جو ارتقا پذیر اور قانون بستہ ہے۔ اس کی آزادی اس قانون سے آزاد ہونے میں نہیں بلکہ اس پر دسترس حاصل کرنے میں ہے۔ جہاں تک زندگی کے نصب العین کا تعلق ہے انسان اپنا کوئی بھی نصب العین وضع کر سکتا ہے، لیکن وہ صرف اسی نصب العین کو حاصل کر سکتا ہے جس کی رونمائی سماجی زندگی کا تضاد کرتا ہے۔ اس ارتقا پذیر سماجی زندگی میں جو لازمی ہے وہ تمام حادثات کے باوجود اپنے کو ظاہر کر کے رہتا ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری ایک فطرت ہے جس کا حصول ہم کرتے ہیں؟ اس کا جواب ہے' اور نہیں دونوں ہی میں ہے۔ ' ہے اور نہیں ' سے کہیں بھی چھٹکارا نہیں۔ انسان فطرت کا صرف موضوع ہی نہیں بلکہ معروض بھی ہے۔ اس کی زندگی کا انحصار ' آب و ہوا ، مٹی اور اس سے پیدا ہونے والی اشیا پر ہے۔ یہ فطرت خارجیہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے وجود پر اثر انداز رہتی ہے، اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، عالم گیر قانون فطرت کے تابع رکھنا چاہتی ہے۔ اس کے برعکس وہ فطرت خارجیہ کو اپنے تصرف میں لاتا ہے، اسے اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، انسان اپنی اس کشمکش ہی میں ترقی کرتا ہے، چنانچہ جہاں وہ فطرت کو اپنے تابع کرتا ہے، اسے انسانی دنیا کا حصہ بناتا ہے؛ اس کی فطرت کو بے نقاب کرتا ہے، وہاں وہ اپنے کو اس عمل سے فطرت سے قریب تر بھی کرنا چاہتا ہے۔ شعوری حیثیت سے اس قانون کی روشنی میں

جو عالمگیر ہے ، جوہر طریق حیات پر منبسط ہے ، انسان اپنے انہیں متضاد پہلو
کی وجہ سے جو ایک وحدت میں ہے ، معما بھی معلوم ہوتا ہے ۔ انسان
بارے میں کوئی حرف آخر کسی زمانے میں بھی نہیں کہا جاسکتا ، کیو
وہ سب سے زیادہ عجیب الخلقت ہے ۔ وہ اپنی فطرت پر ہے بھی اور نہیں
ہے ، وہ بدلتا رہتا ہے ، لیکن یہ تبدیلی ارتقائی قوت ہے ، وہ ساری اقدار جو
اس کی زندگی کا انحصار ہے ، بنیادی ہیں ، وہ ارتقا پذیر ہوتی ہیں ، نیا ا
اور نئی قوت حاصل کرتی ہیں نہ کہ مسترد ہوتی ہیں ۔ مسترد صرف وہ ا
ہوتی ہیں جو حادثاتی صورت کی ہوتی ہیں ، جو ایک مخصوص نظام معاشرت
مخصوص سماجی رشتوں کی حامل ہوتی ہیں ، نہ کہ وہ اقدار جو اس
انسانیت اور اس کی آزادی کی سرحدوں کو وسیع کرتی ہیں ، وہ نئے سے نئے م
اور نئی سے نئی قوت حاصل کرتی جاتی ہیں ۔ آخر کار تمام بنی نوع انسان
یہ مشترکہ جدوجہد کا ہے کی ہے ، انہیں اقدار کو ترقی دینے کی ہے جو ہر
میں اس کی انسانیت کا جوہر رہی ہیں ۔ اگر انسان اپنے وجود کے اس جوہر ک
حامل ہو جو اس کی مشترکہ انسانیت ہے تو پھر اس کا کوئی مستقبل ن
اور نہ اس کی کوئی آزادی ہے ۔ اس کی آزادی اس کی انسانیت سے ہمکنار
وہ ہمیشہ ان دونوں اقدار کی بنیاد کی تلاش میں رہتا ہے ۔ جس طرح روسو ا
مفروضہ حیات ماضی کی طرف اس لیے لوٹا تاکہ وہ نیکی کو اس کی سادہ ت
صورت میں دیکھ سکے اور اپنے اس علم سے حال کی اصلاح کر سکے ، اسی ط
مابعد الطبیعیاتی مفکرین اور شعرا بھی انسان کی ہستی کو ہستی محض سے نس
دے کر اس کی کبریائی اور اس کی فعالیت کو ابھارتے ہیں ۔ اسے زیادہ سے ز
انسان بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ ہمیشہ آئیڈیلسٹ ہوتے ہیں ، لیکن کیا
حقیقت نہیں ہے کہ فلسفیانہ آئیڈیلزم ہی نے پرانے مادی فلسفوں کے فعال پہلو
ابھارا ہے ۔ چنانچہ وہ مابعدالطبیعیاتی شعرا انسان کی سرمدیت یا ابدیت پر اس
زور نہیں دیتے ہیں کہ یہ کوئی متحقق حقیقت ہے ، ایک ناقابل تردید واقعہ
بلکہ اس لیے کہ اس سے انسان کی ذات مستند بنتی ہے ، اس کے مشاہدات
محسوسات ، تخیل اور خیال سب کو استناد ملتا ہے ۔ اس استناد کے بغیر
شاعر ، شاعر وہ سکتا ہے ۔ اس کے محسوسات اس کے لیے کافی ہیں لیکن
ولیم بلیک کی طرح یہ کہنے کا استحقاق نہیں رکھتا :

'' میں نے قطرے میں دجلہ ، ذرے میں آفتاب ، کف دست
میں مکان بے کراں اور ایک لمحے میں زمان بیکراں کو دیکھا ہے '' ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسانیت کو شاعر کی اس چشم تخیل اور اس وجدان کی کیا ضرورت ہے ۔ کیا انسانیت اس علم پر قانع نہیں رہ سکتی جو اسے سائینس سے ملا ہے ۔ جیسا کہ آج کل بعض حضرات ادعا کرتے ہیں کہ ہم اب آرٹ سے سائینس کے کلچر کی دنیا میں آگئے ہیں ، ہمیں شاعری کی سچائی کی نہیں بلکہ سائینس کی سچائی کی ضرورت ہے ۔ اس کا ایک جواب جان اسٹورٹ مل نے انیسویں صدی میں یہ دیا تھا جس سے ہمارے حالی اور شبلی دونوں ہی متاثر تھے ۔ سائینس یہ بتاتی ہے کہ کوئی شے کیوں کر ہے اور کیا ہے ؟ اور شاعری یہ بتاتی ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے ۔ یہ انسان کے جذبات اور محسوسات سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کے جذبات اور محسوسات پر اثر انداز ہوتی ہے ، یہ ہمیں اخلاق کی تعلیم دیتی ہے ، نیکی کی طرف مائل کرتی ہے ، اقدار ہستی سے آگاہ کرتی ہے ، اور پھر اس طرح کی جتنی باتیں آپ بڑھاتے چلے جائیں ، سب اس میں ملیں گی ۔ جان اسٹورٹ مل کا یہ نظریہ کہ شاعری ایک بامقصد جذبہ ہے ، ہمیں کیا ہونا چاہیے ، اس کی تعلیم دیتی ہے ۔ وہ ورڈسورتھ کی شاعری کی حمایت میں تھا ، جسے عقل پرست بنتھمی جس میں اس کا باپ جیمس مل بھی شامل تھا ، جذبے کے علم کو غیر مستند اور بے افادہ ثابت کر کے ، اپنی تنقید کا نشانہ بنائے ہوئے تھے ۔ مل نے ورڈسورتھ کی حمایت کر کے شاعری کی حمایت کی ، چنانچہ اس کے اس خیال کی تردید ابھی تک نہیں ہو سکی کہ شاعری کا تعلق اقدار کی دنیا سے ہے اور یہ ایک مقصدی جذبہ ہے ۔ لیکن اس وقت میرے سامنے مسئلہ اس کے خیال کی حمایت یا مخالفت کا نہیں ، بلکہ رومانی شعرا کی فنی روش کا ہے ۔ کیا شاعری صرف اظہار جذبہ ، اظہار شخصیت ہے یا یہ کہ وہ کسی سچائی کا بھی انکشاف کرتی ہے ، خواہ وہ سچائی جذبے اور محسوسات ہی کی کیوں نہ ہو ۔ اول الذکر صورت میں فن شعر ، شاعر کی شخصیت کا ایک پردہ ساز بن جاتا ہے ، وہ اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لیے اس فن کو اختیار کرتا ہے نہ کہ اس لیے کہ فن نے اسے منتخب کیا ، حسن معنی کی جلوہ گری کے لیے ۔ فرق صرف رویے کا ہے ، جب فن شاعر کی شخصیت کا صرف اظہار ہوتا ہے ، شاعر کی داخلیت اور جذبہ اہم ہو جاتا ہے ، خواہ وہ اس کی سچائی کو بے نقاب کرے یا نہ کرے ، مجھے قبول کرو یا چھوڑو کا مسئلہ بن جاتا ہے ۔ اس کے برعکس آخرالذکر صورت میں شاعر کو اپنی شخصیت کو مقتضائے فن کے تابع کرنا پڑتا ہے جس میں انکشاف حقیقت کو سب سے مقدم حیثیت حاصل

ہے۔ اس روش میں شاعر فن کا پجاری اور منکشف حقیقت ذات ہوتا ہے۔ ج
فن اس درجے پر پہنچتا ہے تو قوت ارادی کی مخالفت جو سامع اور شاعر میں ہو
ہے گھٹ جاتی ہے، کیوں کہ وہ اپنی ارادی شخصیت کو اس میں اہمیت نہیں دیا
اسے پس پشت ڈالتا ہے، اور اپنے تجربات کی اس سچائی اور اندرونی مغز
سامنے لاتا ہے جو جوہر ہستی سے ہمکنار ہونے کے باعث اپنی تصدیق ہر
سے کراتا ہے۔ سامعین کی قوت ارادی تصادم سے مانع رہتی ہے، توجہ اس
صرف ہوتی ہے، دیکھو سچ کس سفاکانہ حیثیت سے مچلا ہوا ہے۔ پردگی
بے پردہ ہوا ہے۔ وہ اس وقت اپنے دشمن کو بھی داد دینے پر مجبور ہ
ہے، کیوں کہ وہ اپنے جوہر ہستی سے انکار نہیں کرسکتا ہے۔ اس کے یہ مع
ہوئے کہ فن ظاہر سے باطن میں اترتا ہے، زندگی کے پاتال سے، طوفانوں
سکون سے زندگی کے گوہر نایاب کو برآمد کرتا ہے، زندگی کا اقرار سر چشمہ
حیات کے ساحل پر کرتا ہے۔ اس وقت ظالم اور کاذب دونوں شرمند
کیا دنیا کا کوئی بھی شاعر جو حقیقی اور سچا ہو، کسی بھی عہد میں ظا
اور باطل کی حمایت کرسکا ہے۔ اور اگر اس نے کبھی ایسا کیا بھی ہے تو
کتنے دنوں فریب زدہ انسانوں کے دل میں زندہ رہا ہے۔ یہ نظریہ
غیر شخصی ہوتا ہے جہاں فن سچ کا آئینہ ہوتا ہے، فن کار کسی مخصوص سچ
نہیں بلکہ زندگی کے سچ کو بے نقاب کرتا ہے۔ کسی مجرد صورت میں نہیں بل
مخصوص اور منفرد صورت میں، اپنے تجربات کے فانوس میں شمع حقیقت کو اجا
کرتا ہے، وہ عموم کو اپنے تجربے کی منفرد صورت میں جلوہ گر کرتا ہے
سائینس کا انکشاف عملی مقصد کے تابع ہوتا ہے، زندگی کو قائم اور باقی رکھ
اور اس کی آرایش کے لیے آسمانوں سے ستاروں کے توڑنے کی طرف مائل ہو
ہے۔ فن کا انکشاف اپنے کو پانے، توجہ ذات کی طرف مائل ہوتا ہے۔

'اللہ اللہ' یہ صدائے تحسین اس وقت بلند ہوتی ہے جب کہ
شعر سے تصدیق وجود ہوتی ہے۔ ذات اور ذات کے درمیان جو ہم آہنگی
اس کا نغمہ بیدار ہو جاتا ہے۔

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

کون یہ بتا سکے گا کہ موسیقی کی ترکیب آواز یا رقص آواز میں

معنی پوشیدہ ہے۔ موسیقی کو مختلف ادوار میں مختلف مقاصد کے تابع کیا گیا ہے۔ شہوت انگیزی سے لے کر جنگ جوئی تک کے مقاصد پورے کئے گیے ہیں، لیکن کیا ان حادثات کے باوجود کوئی موسیقی ایسی نہیں ہے جو تعینات ہستی کے پردے اٹھادے اور آپ کل سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ گردش سیارہ کی بھی ایک موسیقی ہے۔ کیا آپ اسے سنتے ہیں، لیکن موسیقار اسے بھی اپنے ہوش و گوش کا ایک حصہ بناتا ہے۔ ہیگل لکھتا ہے کہ موسیقی کی معنویت روح کی عمیق ترین داخلی آزاد زندگی میں ہے' اور ارسطو کہتا ہے کہ ہمارے ادراک میں کوئی بھی ایسی شے نہیں ہے جو ہمارے حواس سے نہ گزری ہو۔ کیا اس سے نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ دل یا محسوسات کی دنیا ہمارے ذہن ہی کا ایک حصہ ہے، یہ دل و دماغ کی دوئی بے معنی ہے، لیکن انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کیا جا سکتا ہے۔ موسیقی کا بہت کم تعلق ادراک سے ہے۔ یہ زیادہ تر احساس کی شے ہے، گوش دل کی تہذیب کی شے ہے۔ ہر چند کہ شعر کا ایک رشتہ' آہنگ اور ہم آہنگی' صوت الفاظ کے باعث موسیقی سے ہمیشہ قایم ہے، لیکن شاعری موسیقی سے مختلف شے ہے۔ شاعری یونانی لفظ لوگس (لغوی معنی جمع کرنے کے ہیں، مجتمع صورت میں دیکھنا) سخن، منطق زبان (ثانوی معنی) کی شے ہے۔ ہمیں زبان کے اصل کا بھی زیادہ علم نہیں ہے۔ اس علم کے ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ یہ حیوانی زیست کے پہلے سگنلز (Signals) کا جن کا تعلق محسوس اور مخصوص سے ہوتا تھا، دوسرے سگنلز کا نظام ہے۔ اب یہ اشارے خصوص کی نہیں بلکہ عموم کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس میں تعمیم اور تجرید غالب ہے، یہ خیال (Concept) کا حامل ہوتا ہے، اور خیال یا تصور ادراک کا رشتہ ہے۔ جس قدر زیادہ ہم تصور سے تصور کا رشتہ' اشیا کا رشتہ، اسباب کا رشتہ دریافت کرتے جاتے ہیں، ہماری زبان ترقی کرتی جاتی ہے۔ لیکن اس عمل میں زبان مجرد سے مجرد تر بھی بنتی جاتی ہے۔ شاعری جو محسوس علم ہے، جو عموم کو خصوص میں دیکھتی ہے، زبان کی اس ماہیت سے کشمکش میں بھی آتی ہے، شاعر مجرد کو محسوس صورت میں سوچتا ہے اس طرح وہ زبان کو ایک نیا پیکر (Dimension) دیتا ہے۔ یہ محسوس مجر ہوجاتی ہے۔ شاعر کا یہ عمل زبان کے دونوں سروں کو ملانے کا اس طرح کا خارج نہیں ہوتا کہ شاعر خیال کو زبان میں اس طرح ڈالتا ہو جس طرح کہ کسی خالی ظرف میں کوئی شے ڈالی جاتی ہے۔ وہ محسوس طریقے سے سوچتا ہے امیجز کے ذریعے، تشبیہ و استعارہ اور علامتوں کے ذریعے سوچتا ہے۔ زبان خو

کی حقیقت ہے ' الفاظ کے ذریعے ہم اشیا کو مسمول کرتے ہیں ۔ ہم اپنے خیال کا اظہار کسی دوسرے ذریعۂ اظہار سے بھی کر سکتے ہیں ، لیکن بھرپور گفتگو یعنی مجرد اور محسوس سطح پر بہ یک وقت صرف زبان ہی کے ذریعے کی جا سکتی ہے ۔ شاعر زبان کے ذریعے اشیا کی نمایندگی نہیں کرتا ہے ، بلکہ اس کے تصور کو پیش کرتا ہے ، لیکن اسے اس قدر محسوس صورت میں پیش کرتا ہے کہ آپ کو شے اور اس کا رشتہ یا خیال دونوں نظر آتے ہیں ۔ شاعری کا سحر اسی میں ہے کہ وہ ایک مجرد ذریعۂ اظہار کو ایک محسوس ذریعۂ اظہار میں تبدیل کر دیتی ہے ، لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ زبان کوئی اس قسم کا میڈیم نہیں جیسے کہ پتھر ' کہ اس کو تراشنا فن کار کا کام ہو ۔ زبان کو استعمال کرنے کے معنی ہیں ' محسوس سطح پر ایک تصور کو دوسرے تصور سے نسبت دینے سے ، شاعر انہیں اپنے معنوں میں معنی آفریں ہے ۔ کچھ لوگ اسے خیال بندی سے خلط ملط کرتے ہیں ، خیال بندی شاعری نہیں بلکہ شاعری کی نقالی ہے ۔ یہ بچوں کا ایک کھیل ہے ' دیدۂ بینا کا کام نہیں ۔ شاعر کسی بھی شے کی نقل نہیں کرتا ہے اور نہ کوئی شے ایجاد کرتا ہے ، وہ تو صرف چھپے ہوئے کو بے نقاب کرتا ہے ، حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے ، وہ تو آئینے (پہلے آئینہ فولاد کا ہوا کرتا تھا) سے زنگار کو ہٹاتا ہے تا کہ وہ حقیقت کو صحیح طور سے منعکس کر سکے ۔ غالب کا فن شعر صیقل آیینہ ہے نہ کہ مصوری یا نقالی ۔

یک الف بیش نہیں صیقل آیینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

غالب اپنے ایک فارسی خط میں نواب انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں ۔

" آہ از من کہ مرا زبان زدہ و سوختۂ خرمن آفرید ۔ نہ باٸین نیاگان خویش سلطان سنجر دارائے کلاوہ کمری و نہ بفرہنگ فرزانگان پیشیں بو علی آسا علم و ہنری گفتم ، درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم ، ذوق سخن کہ ازل آوردہ بود رہزنی کرد و مرا بداں فریفت کہ آئینۂ زدودن و صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است ۔ سر لشکری و دانشوری خود نیست ، صوفیگری بگزار و بسخن گستری روے آر ۔ نا گزیر ہمچناں کردم و سفینہ در بحر شعر کہ سراب است رواں کردم ، قلم علم شد " ۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی طبیعت میں ایک گونہ تصوف بھی ہے یونکہ کبھی کبھی وہ تصوف کی زبان میں بھی گفتگو کرتے ہیں :

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن بنیادی حیثیت سے وہ اپنی شخصیت اور شاعری دونوں میں ایک اعر ، یا پھر ایک مابعد الطبیعیاتی شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں ' انبساط تل ' ہے ۔ " صوفی گری بگزار ، در سخن گستری روے بر آر " اس ارادے ، گونج ان کی تنقید فن شعر میں بھی ملتی ہے ۔ وہ صوفیوں کے تصور شعر ے خلاف ہیں ۔

نہ از من ز سعدی شنو تا چہ گفت		سخن گفتہ در پردہ اما چہ گفت
رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست		بر عارفاں جز خدا ہیچ نیست
د گو رہروے گوید از زیر دلق		کہ حق ست محسوس و معقول خلق
خیالے در اندیشہ دارد نمود		ہماں غیب غیبست بزم شہود
نشانہاے راز خیال خودیم		نوا ہاے ساز خیال خودیم
خوشت باد غالب بساز آمدن		نوا سنج قانون راز آمدن
تصوف نہ زیبد سخن پیشہ را		سخن پیشہ رند کژ اندیشہ را

صوفی حقیقت کو مجسم صورت میں دیکھنے کا مدعی ہوتا ہے اس لیے دان پر زور دیتا ہے جو برگساں کے الفاظ میں کسی شے کو مجسم صورت ں دیکھنے کا نام ہے ۔ غالب بھی کبھی کبھی وجدان کو استعمال کرتے ئے نظر آتے ہیں لیکن وہ اس کا ادعا نہیں کرتے کہ انہوں نے ہستیٔ مطلق ، رخ زیبا کو دیکھا ہے ۔ ان کے یہاں ادراک ہے نہ کہ مشاہدہ جبکہ اصل شہود و شاہد و مشہود " ایک ہو تو پھر مشاہدہ کے کیا معنی ۔

موسیٰ و خضر تماشائے تجلی بر طور
من نہ در بند جہاتم تنہ تا ہو یا ہو
ظلمت کفر مبیں ، روشنیٔ طبع نگر
چشمۂ آب حیاتم تنہ تا ہو یا ہو

چنانچہ یہ اسی ادراک کا نتیجہ ہے جو وہ یہ کہتے ہیں :

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

یہ تشکک محرومیٔ دید سے ہے ، لیکن جب خرد رہنمائی کرتی ہے تو یہ پردہ اٹھ جاتا ہے ، اس وقت وہ صرف اپنے کو دیکھتا ہے ۔ ' نشانہائے راز خیال خودم ' ۔

خرد را سگالم کہ نیرو دھد — خود او را ز من حیرتی رو دھد
چوں پیدا تو باشی ، نہاں ہم توی — اگر پردہ باشد آں ہم توی
عیار وجود آشکارا کنی — نشانہاے جود آشکارا کنی

وہ خدا شناسی میں خود نمائی اور خود نمائی میں خدا شناسی کا جلوہ کرتا ہے ۔ ع: خود نمائی خدا شناسیہاست ۔ خود نمائی حصول ذات ، تکمیل ذات کا جذبہ ہے ۔ اس کا رخ زندگی کے کسی ایک رخ کی طرف نہیں جیسا کہ کانٹ کے یہاں ہے بلکہ زندگی کے جامع پہلوؤں کی طرف ہے ۔ غالب جس کا دل کہ یک شہر آرزو اور یک اهرمنستان رنگ و ربو تھا ، بھرپور زندگی کا تمنائی تھا ۔ ان تمناؤں میں کوئی بھی اس کی تمنا گناہ نہ تھی ۔ زندگی جو آرزووں اور تمناؤں سے عبارت ہے اور اپنی آفرینش آرزو ھی کے باعث مقدس ہے ، بھلا اس زندگی کی کوئی تمنا کیونکر گناہ ھو سکتی تھی ۔ لیکن زمانے نے انھیں اپنی خواھشات کو پورا کرنے کے ان کے ''اپنے اندازہ بایست'' سے بہت کم مواقع اور ذرایع مہیا کیے ۔ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے ۔ ھر عہد کا ایک خاص معیار حصول ذات کا ھوتا ہے اور اسے امرا اور دولتمند لوگوں کے معیار سے دیکھا جاتا ہے ۔ غالب جس عہد سے تعلق رکھتے تھے ، اس عہد کے امرا کے حصول ذات کا معیار ، غربا کے حصول ذات کا پابند نہ تھا ، بلکہ ان کا تو وجود ھی اس لیے تھا کہ وہ ان کے حصول ذات کا ذریعہ بنیں ۔ تونگری اور مفلسی کا فرق نہ ھوتو جود و سخا اور بخشش کا مظاھرہ کیونکر ھو ، چنانچہ منجملہ عیش وعشرت جود و سخا بھی عیش ھی کا ایک جذبہ تھا ۔ غالب اسی امرا کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو بنیوں اور سرمایہ داروں کی طرح خسیس نہ تھا ، دولت سے دولت پیدا نہ کرتے ، بلکہ صارف تھے ، ان سے بڑا کوئی صارف طبقہ دنیا میں آج تک پیدا ھی نہیں ھوا ہے ۔ امریکہ کے چند یانکی پاشا ان کا مقابلہ کر سکیں

تو کرسکیں ورنہ کوئی اور ان کے مقابلے کا نہ تھا - کیا یہ بدنصیبی نہ تھی کہ پانچ برس کی عمر میں باپ اور نو برس کی عمر میں چچا مر گیا ، جو سترہ سو روپے مہینے کا ملازم اور لاکھ دو لاکھ کی جاگیر کا مالک تھا ، اور وہ اس کے خوں بہا کے صرف ساڑھے باسٹھ روپے آٹھ آنے کے حصہ دار تھے - یہ غالب اپنے طبقے کے معیار زندگی اور زندگی کے ارمانوں کا کب تک ساتھ دے سکتا تھا - تلوار ، جو پہلے قسمت آزمائی کا ذریعہ تھی اور جس کے بل بوتے پر دادا سے لے کر چچا تک سب کچھ بنے تھے ، اب ٹکسال باہر ہو چکی تھی - اس کے لیے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کے تیر شکستہ کو اپنا قلم بنالیں -

چوں رفت سپہبدی زدم جنگ بشعر
شد تیر شکستہ' نیاگاں قلمم

اب ان کی ساری قوت اسی قلم یا فن کی تکمیل پر مرتکز ہوگئی - لیکن ایسا انھوں نے اپنی صلاحیت کو سمجھے بغیر نہ کیا انھوں نے 'خاتمہ' گل رعنا ' کی عبارت میں اپنے اس ظہور استعداد کو بڑے خوبصورت تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے کہ کیونکر ایک پری خواب میں ظاہر ہوئی اور اس نے ان کو فن کی طرف مائل کیا - اور جب صلاحیت خود کسی چیز کی طرف انسان کو مائل کرے تو پھر اس کے حصول میں زحمت نہیں ہوتی - غالباً اپنی صلاحیت کے انکشاف سے فن کی طرف آئے لیکن اس شد و مد کے ساتھ آئے گویا فن نے ان پر رہزنی کی - فن انھیں اپنی دنیا میں لے گیا - وہ اسد اللہ خاں رہنے کے بجائے قلمرو فن کے شہری ہوگئے - ان کی شخصیت متقضائے فن کی تابع ہوگئی - اس میں کشمکش بھی رہی ، لیکن آخر کار فن ان پر رہزنی کرکے رہا - اس نے انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا - غالب ایک لریکل شاعر تھے ، اور جہاں اس قسم کی شاعری ہوتی ہے جس میں شاعر اپنی خواہشات ، آرزوؤں ، تمناؤں ، دکھ درد اور خوشی کا اظہار کرتا ہے ، شخصی عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے - غالب کے یہاں بھی وہ شخصی عنصر موجود ہے اور کیونکر نہ ہو جب کہ شاعر سچ کا انکشاف اپنے محسوسات اور تجربات کی سطح پر کرتا ہے - لیکن جب وہ باشعور ہو جاتا ہے کہ اس کا کام جذبے کی سچائی کو بے نقاب کرنا ہے تو وہ اپنی شخصیت کو فن پر غالب آنے نہیں دیتا ہے - غالب کا فن رومانی شعرا کے فن سے انھیں معنوں میں مختلف ہے - اس کا فن غیر شخصی ہے جو فن کی اصل ماہیت تھی اس سے قریب تر ہے - فن کو تاریخ

میں مختلف مقاصد کے تابع استعمال کیا گیا ہے ۔ کہیں پند و موعظت کا کام لیا گیا ہے تو کہیں تفریح کا ، لیکن فن ہر صورت میں اپنی اصل کی طرف جھکتا رہا ہے ۔ یہ انسان کا پہلا اوریجنل عمل علم تھا ۔ اس نے شاعری ہی سے اشیا کو مسخر کیا ۔ شاعری ہی سے زبان پر مایہ ہوئی ہے ، چنانچہ شاعر ہی زبان بھی خلق کرتا ہے ۔ شعر ایک ہنر تھا ، جادو تھا ' خارج کی دنیا کو داخلی دنیا میں لے کر ، اس کی حقیقت کو بے نقاب کرنے اور اپنی داخلیت کو موثر بنانے کا ۔ لیکن انسان صرف ایک قوت ارادہ ہی تو نہیں' وہ نا امیدی ، مایوسی ، حرماں نصیبی ، بیچارگی اور اندیشۂ موت کے تجربات سے بھی گزرتا ہے ۔ ایسے ہی لمحات میں اسے اپنی روح کی گہرائی کو چھونے اور وجود کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے ، اس وقت یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ بلندی سے پستی میں پہنچ گیا ۔ اور جب اس احساس سے شاعر دو چار ہوتا ہے تو یہ سوال جنم لیتا ہے کہ کیا وجود ایک حادثہ محض اتفاقی ہے یا یہ کہ اس کے پیچھے کوئی حقیقت چھپی ہوئی ہے ، وہ لازمی کا جزو اور دائمی ہے ۔ یہ سوال زندگی میں از سر نو اعتماد پیدا کرنے اور انسان کو عمل کی طرف مائل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے ۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ مغرب سے جو روشنی آئی اس کا اس نے خیر مقدم کیا ، لیکن چونکہ یہ روشنی سیاسی غلبے کے ساتھ آئی ، اور وہ سیاسی غلبہ پوری ان کی تہذیبی دنیا کو مٹا رہا تھا ، اس لیے وہ اس سیاسی غلبے سے اپنی روح کی گہرائی میں متصادم بھی تھے ۔ حالی غالب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا ۔ ایک روز اسی قسم کے ایک واقعے پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ " مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے ، پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے " ۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ آزادہ رو تھے ، لیکن جس سوسایٹی کے وہ فرد تھے اس سوسائٹی کی زندگی اور تہذیب سے ان کا تعلق خاطر بہت شدید تھا ۔ اور یہ اسی جذبے کی کارستانی تھی کہ وہ ایک نئی زندگی ، ایک نئے جہان کی تخلیق کی طرف آمادہ ہوئے ۔ لیکن ان کا نقطۂ نظر اصلاحی نہیں بلکہ انقلابی تھا ۔ وہ دین و دنیا ، جسم و جان ، کسی قسم کی دوئی کے قایل نہ تھے ۔ ان کی نظر میں ہستیٔ محض جس کا دوسرا نام وقت ہے ایک ہے ، کسی انقسام کو قبول نہیں کرتی ، اس کے دونوں سرے بیکراں ہیں ۔ ایک آن ہے ہر چند کہ متحرک ہے ، اس سے کسی

ایسی دنیا کا پیکر تراشنا جو دائمی سکون کا ہو ، جہاں کوئی تغیر نہ ہو۔ شرک فی الوجود تھا ، خواہ وہ دین ہو یا دنیا ہو ۔ وہ غمگین کو لکھتے ہیں :

'' دانم کہ وجود یکے ہست ، و ہرگز انقسام نہ پذیرد ، ہر آینہ اگر دینے یا دنیائے تراشیدہ باشم گرفتار شرک فی الوجود ، کہ اقبح افراد شرک است شدہ باشم ۔ بہ دانست نامہ نگار دین نیز ہمچو دنیا موہوم است و بہ وہم دل نتوان بست '' ۔

بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نظریہ' توحید سے ایک قسم کی منفیت اور بے دلی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آنے کا ۔ بے کسی' ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں ۔ لیکن چونکہ شاعر اپنی ذات کو باطل نہیں کرتا ہے بلکہ اتحاد ذات حاصل کرنے کے بعد اسے خارج کی دنیا سے وہی رشتہ دیتا ہے جو ذات کا رشتہ صفات سے ہے اس لیے وہ اپنے کو ایک جہان نو کی تخلیق میں بالکل آزاد بھی محسوس کرتا ہے ۔ اس جذبے سے اس کی تخلیقی قوتیں زیادہ ابھرتی ہیں اور جو بے اعتباری اپنی ذات سے متعلق اس اتحاد کے قائم کرنے سے پہلے ہوتی ہے وہ جاتی رہتی ہے ۔ فنکار کی آئیڈیلوجی کیا ہے اس کا ثبوت اس کے فن میں ہے نہ کہ اس کی آئیڈیلوجی میں ۔ اگر فن بولتا ہے ، حقیقت کا غماز ہے ، زندگی کی سچائی کو بے نقاب کرتا ہے اور ہر دل میں اس کی آواز گونجتی ہے تو پھر یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ جس آئیڈیلوجی کی عمارت سے اس نے یہ کام لیا ہے وہ ہمارے لیے قابل قبول ہے کہ نہیں ۔ کثرت کو توحید میں پرونے کا ہر شاعر کے یہاں ایک نظام فکر ہوتا ہے ، وہ کہیں مانگے تانگے کا ہوتا ہے تو کہیں خود ساختہ ہوتا ہے جسے وہ خود تخلیق کرتا ہے ۔

کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ وعبادت میکنم

یہ آیڈیلوجی زیادہ سے زیادہ اس کے طریق فکر کو متعین کرتی ہے ، چنانچہ اصل شے دیکھنے کی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے حقیقت پر کیونکر عمل پیرا ہوا ہے ۔ زندگی کے تضاد کو ، حقایق کے تضاد کو بے نقاب کرتا ہے کہ نہیں ، نئے سوالات اٹھاتا ہے کہ نہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ آیڈیلوجی کا عنصر بھی ، فن میں اسی طرح جھلکتا ہے جس طرح شخصیت کا ، لیکن ایک بڑے فنکار کے یہاں جس طرح شخصیت پس پردہ ہوجاتی ہے ، اسی طرح آیڈیلوجی بھی ۔ غالب نے فن کو کسی آیڈیلوجی کے اظہار کے لیے استعمال نہیں کیا ہے کہ وہ ہمارے لیے کوئی مسئلہ ہو ، یہ اس کا فن ہے جو ہمیں مسحور کرتا ہے ۔

[غالب ایک مطالعہ]

فکر غالب پر ایک عہد آفریں کتاب

غالب ـــ ایک مطالعہ

جس میں غالب فہمی اور غالب شناسی کے سلسلے میں ایک نیا
نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے

از

پروفیسر ممتاز حسین

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ ، کراچی

رازداں اپنا

جمیل جالبی

[۱]

جب بھی ہم اپنے گھر کی بیٹھک میں سے گزرتے تو آتے جاتے دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر سے ہمارا آمنا سامنا ضرور ہوتا۔ میر جالب دہلوی کو یہ تصویر لاہور کے کسی مصور نے بنا کر دی تھی۔ ہماری خاندانی روایت کے مطابق یہ تصویر جالب صاحب کو بہت عزیز تھی۔ فراخ پیشانی، کھلی کھلی اجلی آنکھوں میں سوچ کا بھنور، روئی کے گالوں جیسی بھری بھری ڈاڑھی، سیاہ پوستین کی اونچی سی کلاہ پاپاخ، جامہ وار کا پھول دار رنگین چغہ، اوپر کا پتلا سا ہونٹ بالوں میں چھپا ہوا، نیچے کا ہونٹ پھولپن لیے ہوئے نمایاں، چہرے سے شرافت اور لباس سے رئیسی ٹپکتی تھی۔ جھریوں سے بڑھاپے کا پتا چلتا تھا۔ یہ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب کی تصویر تھی۔ جالب صاحب نے جب شعر و ادب کے میدان میں قدم رکھا تو 'غالب' کی رعایت سے اپنا تخلص بھی 'جالب' رکھا۔ ہمارے ایک چچا تھے جو 'دیوان غالب' ہردم اپنے ساتھ رکھتے۔ بات کرتے تو غالب کے اشعار کی زبان میں، زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتے تو غالب کے اشعار سے، رات کو پلنگ پر لیٹ کر گاتے تو غالب کی غزلیں۔ خط لکھتے تو 'خطوط غالب' جیسے اور بات بات میں غالب کے اشعار اور مصرعوں کے حوالے۔ سب چھوٹے بڑے انہیں 'چچا غالب' کہتے تھے اور یہی ان کا نام پڑ گیا تھا۔ اسی طرح بچپن ہی سے غالب ہمارے گھر کی فضا کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ جب پاکستان بنا اور فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکی تو 'چچا غالب' کے یہ الفاظ کہ "میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان

میں نہ رہوں" ہر وقت دہرایا کرتے - پھر ایک دن بے سرو سامانی کے عالم میں ہم پاکستان آگئے - غالب کی وہ تصویر تو ہندوستان میں رہ گئی لیکن 'چچا' دیوان غالب اپنے ساتھ لے آئے - یہ دیوان غالب آج میری میراث ہے -

[۲]

غالب کو مرے اب سو سال ہوگئے ہیں - سو سال کے عرصے میں کئی دنیائیں آباد ہوئیں اور ذہن انسانی نئے نئے انقلابات اور افکار سے بنتا بگڑتا کہیں سے کہیں پہنچ گیا - نئے پرانے ہو کر مٹ گئے - بہت سے مشاہیر وقت کے بے کراں سناٹے میں گم ہوکر تاریخ کی جھولی میں جا گرے اور ہمیشہ کے لیے ذہن انسانی سے محو ہوگئے - لیکن غالب — غالب آج بھی ہماری رگوں میں خون بن کر گردش کر رہا ہے - وہ شخص جو مرنے کے سو سال بعد بھی زندہ رہے، نہ صرف زندہ رہے بلکہ ہمارے مزاج، ہماری زبان، ہمارے شعور و فکر کا حصہ بن کر ہم پر حکمرانی کرتا رہے، اس میں یقیناً ایسی رنگا رنگ خصوصیات یک جا ہوگئی ہوں گی، جو اس کی اتنی طویل زندگی کی ضامن ہوں - غالب کی تخلیقی شخصیت میں سدا بہار حسن و جمال کے ساتھ یکجا ہونے والی ان خصوصیات کو ہم ایک لفظ 'عظیم' سے ظاہر کر سکتے ہیں - عظیم شاعر کہیں صدیوں میں جا کر ایک آدھ بار ظہور میں آتا ہے - جب دانش و حکمت نوائے سروش بن کر شاعری کی زبان میں اظہار پاتی ہے تو عظیم شاعر پیدا ہوتا ہے جس میں نہ صرف اپنے ماضی اور اپنے زمانے کا شعور بلکہ آنے والے زمانوں کا شعور بھی گھل مل کر ایک ایسی اکائی بن جاتا ہے جو ہر دور میں ذہن انسانی میں اعتماد کا صور پھونک کر تخلیقی تسکین بہم پہنچاتا ہے - اس طرح عظیم شاعر کی تعریف کرکے غالب کو تلاش کیا جاسکتا ہے اور غالب کی خصوصیات اجاگر کرکے عظیم شاعر کے معنی دریافت کیے جاسکتے ہیں -

غالب اپنے زمانے کا ایک جزو ہوتے ہوئے بھی اپنے زمانے سے بہت آگے تھا - اسی لیے غالب نے آنے والی نسلوں کی تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے - غالب کی تخلیقی شخصیت میں آنے والے زمانوں کا شعور اس طور پر شامل ہو گیا کہ جب زمانہ قدم قدم چل کر کسی ایک منزل پر پہنچا تو دیکھا کہ نئے روپ، نئے انداز اور نئی تازگی کے ساتھ غالب وہاں پہلے سے موجود ہے - وہ ہم سب سے الگ ہوتے ہوئے بھی ہم سب میں موجود ہے - غالب نے کائنات اور

انسان کی وہ آفاقی اور ابدی صداقتیں دریافت کیں جنھوں نے ذہن انسانی کو وسعت و عظمت عطا کی اور جنھوں نے جذبات کی تہذیب کرکے حسن و لطافت کا ایک نیا معیار دیا ۔ عظیم شاعر حیات و کائنات کے مسائل کو انسانی جذبات و احساسات کو اپنی فکر کے ساتھ اس طور پر ملاکر ایک کردیتا ہے کہ جیسے جیسے زندگی بدلتی ہے اور فکر ، احساس و شعور کی مختلف سطحیں ابھرتی ہیں اس کے شعور کی روشنی ہر دفعہ ذہن انسانی کو آئینہ دکھا کر گونگے افکار و احساسات کو زبان دے دیتی ہے ۔ اسی لیے غالب ہمارا شاعر ہوتے ہوئے بھی صرف ہماری ہی نہیں بلکہ سارے عالم انسانیت کی میراث ہے — غالب نے یہ طور، زبان و بیان کا یہ روپ ، فکر و نظر کی یہ روشنی اس وقت دی جب نئی زندگی کی تلاش میں اردو زبان خود اس ایجاد کے لیے بے قرار تھی ۔

[۲]

غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس کے سلسلے میں فلسفی ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے ۔ شاعر اور فلسفی ہمیشہ دو متضاد ہستیاں سمجھی جاتی رہی ہیں اسی لیے افلاطون نے شاعر کو اپنی ' جمہوریہ ' میں کوئی مقام نہیں دیا ، مگر ارسطو نے جب یہ کہا کہ شاعری تاریخ سے زیادہ فلسفیانہ ہے کیونکہ تاریخ وقتی چیزوں سے سروکار رکھتی ہے جبکہ شاعری آفاقی چیزوں سے ، تو اس کا مقصد یہی تھا کہ شاعر کو بھی فلسفی کے ہم دوش کھڑا کیا جا سکتا ہے ۔ قرون وسطیٰ میں بنیادی طور پر شاعر کا کام مذہب کے اصولوں کی تبلیغ رہا ۔ لیکن شاعری اور فلسفہ کی ہم آہنگی پہلی بار انیسویں صدی میں گوئٹے سے شروع ہوئی ، جہاں فلسفہ شاعری میں اور شاعری فلسفہ میں جذب ہوکر ایک مکمل اکائی بن گئے اور اس کے بعد بڑا شاعر وہی سمجھا گیا جو فلسفی بھی تھا ۔ مشرق میں ہمیشہ شاعری کا تعلق مذہبی روایات کے ساتھ گہرا رہا ہے ۔ اور دانش و حکمت سب مذہبی تصورات میں شامل رہے ہیں ۔ اسی لیے شاعری نے بھی اپنے صنمیات ، رمزیات ، تلمیحات و کنایات اسی روایت سے اخذ کیے ، اور اپنے مزاج میں سمو لیے ۔ فارسی اردو شاعری میں موضوعات ، اظہار اور مزاج پر اسی فکر کی گہری چھاپ ملتی ہے ۔ کبھی ہمارے شعرا نے دین کی حکمت کو دنیا کے تجربات کے ذریعے بیان کیا ۔ کبھی تصوف کے مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا ۔ ولی دکنی سے پہلے کی کم و بیش ساری شاعری مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی ہے اور ولی کے ساتھ ہی تصوف اپنے پورے پھیلاؤ

کے ساتھ اردو شاعری کی روایت میں شامل ہو جاتا ہے ۔ غالب کے دور تک شاعری کی یہ روایت اور تہذیب کا وہ نظام جس نے اس روایت کو اپنی کوکھ سے جنم دیا زندہ و سالم تھا ۔ اسی لیے اس روایت میں شاعری کرنے والا شاعر ذوق ، جس کا طرز احساس اور فکری ادراک اسی روایت کی لکیر پر چل رہا تھا ، اس دور کا سب سے بڑا شاعر تھا اور غالب کی شاعری کا چراغ اس کے آگے نہیں جلتا تھا ۔ غالب کی شاعری اس روایت کے دائرے کو توڑ کر ایک نیا دائرہ بناتی ہے جو اس طرز احساس کا دائرہ ہے جس میں نئی دینا کا رنگ و آہنگ ، فکر و احساس ، شعور و ادراک کروٹیں لے رہا ہے ۔ اسی لیے جب تک روایتی طرز احساس کا نظام زندہ رہا ذوق بڑے شاعر رہے اور جیسے ہی جدید فکر کی روشنی نے معاشرے کو متاثر کر کے بدلنا شروع کیا ، غالب کی شاعری کا سورج نصف‌النہار پر آ کر چمکنے لگا ۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوق اور غالب دو مختلف دائروں اور دو مختلف طرز احساس کے شاعر ہیں ۔ اسی لیے ذوق آج بھی پنواڑی ، کبابی کی دوکان سے لے کر روایتی علما ، واعظوں اور خطیبوں کے ہاں روایت کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے جب کہ ہمارے جدید شعور نے غالب کے شعور سے مل کر اس نئے دائرے کو واضح اور مکمل کر دیا ہے ۔ اب جب بھی جدید زندہ شعور کی تلاش میں اہل فکر نکلیں گے تو سڑک کے ایک سرے پر انھیں غالب اور صرف غالب تماشائے اہل کرم دیکھتے ملیں گے اور جب بھی قدیم روایت کی تلاش ہوگی تو وہاں ذوق گولر کا پھول تلاش کرتے نظر آئیں گے ۔ اسی لیے غالب کے اشعار ایک زندہ تجربہ معلوم ہوتے ہیں اور ذوق کے ہاں اب سرے سے تجربے کا احساس ہی نہیں ہوتا ۔ یہی زندہ اور "متروک" طرز احساس (یا مردہ طرز احساس کہہ لیجیے) کا فرق ہے ۔

غالب کی شاعری میں قدیم روایت ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوجاتی ہے اور یہ فرزند آذر اپنی روایت کا ایک الگ دائرہ بناتا نظر آتا ہے جس میں ہمارا جدید شعور و ادراک ، ہم آپ سب کھڑے ہیں ۔ یہاں فکر کی وہ علوی سطح نظر آتی ہے جس کے ساتھ ہی شاعری فلسفے کے دائرہ میں داخل ہوجاتی ہے ۔ ہمارے ہاں چونکہ اب تک شاعری کی اس نوع کی روایت موجود نہیں تھی ، اس لیے ہم

شاعر کو فلسفی مانتے ہوئے کتراتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ شاعر اور فلسفی دونوں دائمی اور آفاقی حقیقتوں تک پہنچتے ہیں مگر دونوں کے راستے جدا جدا ہوتے ہیں ۔ شاعر کا راستہ تخیل اور شعور کے ادراک کا راستہ ہے ، فلسفی کا دلیل و بحث کا ۔ مثلاً جس امر پر اسپنوزا نے کائنات کے بارے میں بحث کی اسی پر گوئٹے نے بھی روشنی ڈالی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ بدی کے ساتھ جو صفات فلسفی اسپنوزا نے تحلیل کے ذریعہ پیش کی ہیں وہ گوئٹے نے فاؤسٹ میں میفسٹوفلیس کے کردار میں پیش کردی ہیں ۔ اب لے دے کر شاعر کے فلسفی ہونے کا معیار یہ رہا کہ آیا شاعر ان آفاقی بلندیوں تک پہنچا ہے یا نہیں جن تک فلسفی پہنچا ہے ؟ غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جو اس معیار پر پورا اترتا ہے ۔ غالب کے سلسلے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاں چونکہ منظم فکر نہیں ہے اس لیے اسے فلسفی شاعر کہنا غلطی ہے ۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو کسی فلسفی کا کوئی نظام فکر ایسا نہیں ہو سکتا جو تضاد سے پاک ہو اور ہر اعتبار سے مربوط اور ہموار ہو ۔ ہمیں تو بنیادی طور پر شاعر میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس نے ہمارے شعور کو ، ہماری فکر کو کہاں تک آگے بڑھایا ہے اور کن آفاقی اور ابدی صداقتوں کو تجربے کی بھٹی میں کندن بنا کر پیش کیا ہے ۔ اس معیار پر غالب کی شاعری پوری اترتی ہے اور گنجینۂ معنی کے طلسم اس کے اشعار میں بند نظر آتے ہیں ۔ جیسے جیسے ہمارا شعور ترقی کرتا جاتا ہے یہ طلسم بھی کھلتے جاتے ہیں ۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے پہلی بار فکر کو احساس کے ساتھ اس طور پر ملایا کہ اس کے راگ اور رنگ نے آفاقیت کے آہنگ کو اپنے اندر سمیٹ لیا ۔ اس کے ہاں میر کی طرح احساس و جذبہ کے ننھے منے جگنو نہیں چمکتے بلکہ فکر کی حرارت اور شعور و احساس کا ادراک ذوق تماشا بخشتا ہے ۔ غالب کی نظر ایک فلسفی کی نظر ہے اور وہ جن چیزوں کو سامنے لاتا ہے تحیل ، تجربے اور جذبات کے ذریعے (جسے ٹی ایس ایلیٹ فکر کا جذباتی مرادف Emotional equivalent to thought کہتا ہے) ان کی دائمی حقیقت اور گہرائی تک بھی پہنچا دیتا ہے ۔ ہر اس معاملے پر جہاں ہمیں فلسفی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ، غالب کے خیالات ہمیں ملتے ہیں اور بیک وقت فلسفیانہ و شاعرانہ تسکین بہم پہنچاتے ہیں ۔

مشرق میں غالب تقریباً اس زمانے میں زندہ تھے جب کیرک گارڈ اور

نطشے مغرب میں اپنے خیالات سے ذہن انسانی کو متاثر کر رہے تھے - ان لوگوں نے فلسفے کو بے جان پا کر اس میں داخلی پہلو کو خاص اہمیت دی - غالب نے بھی ، ذوق کے برخلاف ، اپنی شاعری میں یہی کام انجام دیا - ان کی شاعری میں وہ تمام فلسفیانہ خیالات موجود ہیں جو بڑے سے بڑے فلسفی کے ہاں ملتے ہیں - وہ ایک طرف مولانا روم اور عرفی کے انداز میں سوچتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف گوئٹے اور براوننگ کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں- اگر ان کے ہاں ایک طرف تصوف کی آئڈیلزم ہے تو دوسری طرف حیات و کائنات کے ذاتی مطالعے کی آئڈیلزم بھی نظر آتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمام کائنات کو ایک علوی درجے سے دیکھ رہے ہیں - یہاں حسن و عشق کا درجہ بھی علوی ہے - یہاں وہ غم کی دلدل میں دھنس کر نہیں رہ جاتے - قنوطیت ان کو ڈھا نہیں دیتی بلکہ ان کی آواز میں بلند حوصلگی اور مردانہ پن کا احساس ہوتا ہے - تمام تذبذب حیات میں ان کی خودی اور خود اعتمادی جلوہ گر نظر آتی ہے - اسی لیے ان کے اشعار مختلف موقعوں پر یاد آکر امید کا سبق دیتے ہیں -

غالب کے ہاں اخلاقیات کا ایک خاص مقام ہے - یہاں وہ زندگی سے بہت قریب اور زندگی پر کامل یقین رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں - شکایت سے بالا تر رہنے کا درس دیتے ہیں - شکایت کرنا چھوٹے نفس کا فعل ہے جس سے ایک طرف ذہانت کی کمی اور دوسری طرف عزم ، صبر اور استقلال کی کمی کا ثبوت ملتا ہے - وہ خدا سے بھی ستم جور ناخدا کی شکایت نہیں کرتے - عزت نفس کا درجہ اتنا بلند ہے کہ سبک سر بن کے سرگرانی کی وجہ پوچھنا بھی پسند نہیں کرتے - وفاداری کو بشرط استواری اصل ایمان قرار دیتے ہیں - رنج و الم کو عارضی چیز بتاتے ہیں اور مردانہ وار اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کی تلقین کرتے ہیں - برائی کو نہ سننے کی تلقین ، خطا پر بخش دینے اور غلط چلنے پر مردانہ وار روک دینے کا سبق دیتے ہیں - سچائی کی تلقین اور ' آزادہ روی ' ان کے اخلاقی فلسفے کا بنیادی مزاج ہے - یہ زندگی کی عام اخلاقیات کی بھی بلند تر سطح ہے اور غالب نے اپنی نظر اور طرز سے اسے ایک ایسی نوعیت دے دی ہے جو انہیں کا حصہ ہے -

غالب کی فکر کا یہ صرف ایک رخ ہے - ان کی شاعری میں فلسفے کی وہ جان و روح ہے جس تک انسان صرف منطق سے نہیں پہنچ سکتا اور جو

صرف و محض نوائے سروش ہی سے حاصل ہو سکتی ہے - غالب حیات وکائنات کا مطالعہ کرتے ہیں اور ساز دو عالم انہیں بھی اقبال کی طرح دل کا آئینہ دکھاتا ہے، اسی لیے ان کے پیش کردہ حقائق نئی نئی حقیقتوں کو سامنے لاتے ہیں - اس سطح پر یہ فکری کام صرف شاعر ہی انجام دے سکتا ہے - اگر پیغمبر بھی ' شاعر ' نہ ہوتے تو وہ بھی حقائق کے ادراک کا اظہار اس طور پر نہ کر پاتے کہ ان کے افکار میں بجلی کی سی چمک اور کوندے کی سی لپک پیدا ہو جاتی - منطقی فلسفہ یک رخی ہوتا ہے - اس میں نہ شک کی گنجاش رہتی ہے اور نہ مختلف معانی کی پہلوداری سمیٹنے کی - یہ کام شاعرانہ الہام ہی کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ برگساں کے الفاظ میں الہام تجربے کے اس مقام پر انگلی رکھ دیتا ہے جو تجربے کی روح کا مرکز ہے - غالب بھی تجربے کی روح کے مرکز پر انگلی رکھ کر اپنی شاعری کو الہامی بنا دیتے ہیں - غالب نے دائمی صداقتوں ، افاقی تجربات اور حیات و کائنات کے متنوع مسائل کی وہ روح نچوڑ لی ہے جو اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک جدید طرز احساس زندہ ہے -

قدیم اردو

یہ کتاب بابائے اردو کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو کے قدیم مصنفین اور کتب سے متعلق ہیں ۔ قدیم اردو کی ادبی اور لسانی خصوصیات کا اندازہ کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں :

* بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان
* حیدرآباد دکن کا ایک شاعر خاندان
* دکنی اردو میں شاهنامے کی داستانیں
* کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ
* شرح تمہید همدانی
* " سب رس " از ملاوجہی
* گجری یا گجراتی زبان
* پرانی اردو میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں
* اردو زبان کا ایک قدیم کتبہ
* مثل خالق باری
* مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہ
* سب رس منظوم

قیمت : پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ کراچی

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

شمیم احمد

غالب ان معدودے چند مثالوں میں سے ایک ہیں جنھیں قدرت کا اتفاق قرار دیے بغیر چارہ نہیں - وہ شعر و ادب کے ان تمام معروف فارمولوں، تجزیوں اور معاشرتی ، نفسیاتی اور تاریخی حقایق کی تعبیروں پر قائم کردہ کلیوں کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں جن سے شعر و ادب کے تنقیدی معیاروں کا بھرم باقی ہے - شاید اسی لیے غالب پر اب تک محققوں کی نظر زیادہ رہی ہے ، ان کی شعری اور فنی خصوصیات ، فکری معنویت اور انفرادی اہلیت پر کسی قابل ذکر ادیب نے کام کرنے کی جرأت نہیں کی ہے اور نہ کوئی قابل ذکر ادبی تحریر اور تنقیدی کتاب ایسی لکھی گئی ہے جس کی بنا پر ہم غالب شناسی کا دعویٰ بجا طور پر کرسکیں ، ایسی تنقید جو دنیا کے بہترین شعرا پر تنقیدی کارناموں کی طرح روشنی ڈال سکے - غالب کے اتنے دھوم دھڑکے کے باوجود اگر ہم سے ایک سوال کرلیا جائے کہ وہ کون سی کتاب ہے جو ہمیں غالب کی فکر ، شخصی عظمت ، فنی انفرادیت اور شعری اہلیت کے بارے میں وہ کچھ بتاتی ہو جو تنقید کا اولین تقاضا ہے تو آپ ایک بھی ایسے کتاب کا نام نہیں لے سکتے جس سے ہمیں غالب کی شعری انفرادیت اور معیار کا اندازہ ہوسکے - یہ کیسی بد نصیبی کی بات ہے کہ آج ۱۰ سال گزر جانے کے بعد بھی ہماری ساری کاوشیں ' یادگار غالب ' کی حدود میں گھوم رہی ہیں - یعنی یا تو غالب کے حالات زندگی ، واقعات ، استاد ، احباب ، شاگرد ، سفر ، مقدمے ، پنشن، خاندان ، مباحثوں، وظیفوں ، مدح خوانی ، انگریز پرستی ، سزا ، لطایف ، تصانیف اور تعلقات پر تحقیق کے انبار لگائے جا رہے ہیں ، دوسری طرف شرحوں کا سلسلہ ہے جو کسی طرح رکنے میں نہیں آتا ، اور ظاہر ہے ان

دونوں کاموں کی داغ بیل حالی نے ہی ڈالی تھی ۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی کتاب تحقیقی اعتبار سے زیادہ مکمل ہو یا کوئی شرح غالب کے مفہوم کو زیادہ جامعیت سے پیش کرتی ہو مگر ادب کے کولھو کا بیل حالی کی اس لیکھ سے ذرا نہیں ہٹتا جس پر ایک بار حالی نے اسے چلا دیا تھا ۔ اگر کسی نے حالی کے اس اولین کارنامے سے ہٹ کر ادب کی راہ میں قدم رکھنا بھی چاہا تو اس نے صرف اتنا کیا کہ دنیا کے بہترین شعرا کے ساتھ غالب کا نام لکھ کر مبہم مگر شاندار توصیفی اصطلاحوں میں انھیں ایک نابغۂ عظیم قرار دے لیا اور کسی نے غالب کے ایک ایک شعر کے مفہوم پر اپنے پسندیدہ حاشیے چڑھا کر مختلف فلسفیوں کے افکار کے انطباق سے غالب کی ہمسری ان سے ثابت کردی یا پھر دنیا کے بہترین شعرا کے بعض پہلوؤں سے کسی طرح ہم آہنگ کردیا ۔ یہی رجحان جب منفی ہوا تو غالب کی شاعری اور اس کی فکر سے زیادہ اس بات پر زور دیا گیا کہ غالب اگر غزل نہ کہتے تو بڑے شاعر ہوتے ، یعنی غالب سے زیادہ صنف اہم قرار پا گئی ، یا یہ ثابت کردیا گیا کہ غالب کے ہاں مربوط فکر چونکہ موجود نہیں ہے ، اس لیے وہ ایک سرے سے بڑے شاعر ہو ہی نہیں سکتے ۔ ان سب باتوں کے باوجود غالب کی شرحوں سے پھر بھی پیچھا نہیں چھوٹا ، گویا حالی والی لیکھ سے قدم کسی طرح نہیں ہٹے ۔

یہ تو تھا علمی کاموں کا احوال — تنقید میں اس سے بھی افسوس ناک صورت حال کا سامنا ہے ۔ یہاں اول تو کسی نے غالب پر کوئی مستقل کتاب ہی نہیں چھوڑی ، اور سارا دار و مدار مضامین پر رہا ، جن کے لکھنے والوں میں ہماری تنقید کے صف اول کے نام شامل ہیں ۔ خیر اس کا شکوہ تو اس لیے بیجا ہے کہ انھوں نے کس موضوع پر کون سی کتاب لکھ دی ہے ، مگر ان مضامین کو پڑھ کر ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے نقاد ادب و شعر سے کتنی دلچسپی رکھتے ہیں ؟

ہماری تنقید کی ستم ظریفی یہ رہی ہے کہ اس میں مختلف رجحانات کو ادب و شعر سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ یعنی مختلف رجحانات کے نقاد اپنے اپنے کلیوں ، مفروضات اور رجحانات کو ادب و شعر کا پیمانہ اس طرح بناتے ہیں کہ اس میں شاعری غیر اہم ہو جاتی ہے اور رجحانات زیادہ اہمیت اختیار کرلیتے ہیں ۔ اس طرح ادب کی تعریف ، ادب سے باہر متعین کی جاتی ہے ۔ ہر گروہ اپنے موقف کی دلیل میں چند اشعار تلاش کر لیتا ہے (خواہ اُن کی

نفی باقی اشعار سے ہو رہی ہو) اور باقی سارا کام اُن مفروضوں کا ہوتا ہے جس کے ذریعے غالب کو اپنے موقف کے لیے زیادہ کامیابی سے استعمال کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے غالب پر لکھی ہوئی تنقیدیں بہت ہی پر لطف اور دل خوش کن لطایف کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ایک گروہ جو معاشرتی حقیقت نگاری کا دعوے دار ہے ، اپنا فرض اس طرح پورا کرتا ہے کہ غالب کے عہد کی معاشرتی تبدیلیوں ، سیاسی حالات ، نئے اور پرانے رجحانات کا تجزیہ کر کے غالب کے خاندانی حالات ، ان کی تربیت اور افتاد طبع پر ان کے خطوط سے روشنی ڈال کر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ غالب کی پیدائش ان معاشرتی تبدیلیوں اور سیاسی خلفشار کا نتیجہ ہے جو اس عہد کا طرۂ امتیاز ہیں ، لیکن یہ نہیں بتاتا کہ غالب کے کلام میں اس معاشرتی حقیقت نگاری کا پتا کیوں نہیں چلتا جس کا وہ نتیجہ تھے اور ان حالات اور واقعات کی جھلک ان کی شاعری میں کیوں نظر نہیں آتی جس کا بقول ان حضرات کے وہ شعور رکھتے تھے اور جس کا یہ عہد نشانہ تھا ۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ انھی حالات و واقعات اور معاشرت میں پیدا ہونے والے دوسرے قابل ذکر شعرا میں غالب جیسی خصوصیات کیوں نہیں پیدا ہو سکیں ۔ اور اگر وہ غالب کی انفرادیت کا نتیجہ تھیں تو پھر انھیں اس مخصوص ماحول کا آوردہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے ؟ — دوسرا ایک بہت بڑا گروہ ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ وہ بنیادی طور پر انفرادی صلاحیت ہی کا منکر ہے اور اس عہد کو اور اس کے ہر مظہر کو تاریخی ارتقا اور جدلیاتی مادیت کا تابع بتاتا ہے۔ اس کا بنیادی تصور چونکہ تاریخی جدلیت ہے ، اس لیے وہ غالب کو اس لمحے کی پیداوار بتاتا ہے جس نے اس عہد کو پیدا کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ غالب کو ایک انقلابی قرار دیتا ہے اور اپنے اس نظریے کی تائید میں غالب کے ایسے دو تین اشعار پیش کرتا ہے ، جس پر بے اختیار ہنسی بھی آتی ہے اور رحم بھی ۔ نمونے کا ایک شعر آپ بھی سن لیجیے ۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اگر غالب نے یہ شعر اسی شعور کے ساتھ کہا تھا جیسا یہ لوگ اس سے منسوب کرتے ہیں تو پھر غالب پر خدا کی رحمت ہے ورنہ ان پر — ان حضرات کے کچھ اور دلائل بھی ہیں جن میں سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ

غالب اس لیے بہت ترقی پسند اور انقلابی ذہن رکھتا تھا کہ اس نے جاگیرداری ماحول کا پروردہ ہونے کے باوجود بادشاہت کے دور میں صنعتی نظام کا سب سے پہلے خیر مقدم کیا تھا ، اور انگریزوں کی لائی ہوئی سوغاتوں کو اپنے نظام پر ترجیح دے کر سرمایہ داری نظام میں داخل ہوگیا تھا - اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ غالب جاگیرداروں کا اس سے زیادہ ثنا خواں رہا جتنا برطانیہ کا ، اور آخر وقت تک ہر اس فریق کی مدح و ثنا میں یکساں مشغول رہا جہاں سے اسے روپیا ملنے کی امید ہوتی تھی - انھی میں سے بعض نقاد غالب کو انھی بنیادوں پر رجعت پسند بھی قرار دیتے ہیں - گویا غالب کو ترقی پسند یا رجعت پسند قرار دے کر یہ لوگ اپنا فرض پورا کر دیتے ہیں ، اور یہ بالکل نہیں بتاتے کہ غالب کو غالب کس چیز نے بنایا تھا ، اور جس تاریخی جدلیت کا غالب نتیجہ تھے مومن اس سے کیسے صاف بچ نکلے ؟ پھر غالب کی اس صفت میں اس کی انفرادی اہلیت اور صلاحیت کا کتنا ' قصور ' تھا - اور یہ اہلیت اور صلاحیت کس درجے کی تھی اور کیسے پیدا ہوئی تھی -؟ کچھ افراد ایسے ہیں جو غالب کو فلسفی قرار دیتے ہیں اور فلسفے کے بعض بنیادی سوالات اور مسائل کی روشنی میں غالب کی فکر کا تجزیہ کرتے ہیں ، اور اپنے مفروضات اور مطالعے کو غالب کے بعض اشارات سے مربوط کر کے اسے اپنے پسندیدہ نظریات اور فلسفے کا موید قرار دے لیتے ہیں ، لیکن یہ ذرا نہیں سوچتے کہ ان اشارات کی شعری قدر و قیمت کیا ہے ؟ بعض افراد نفسیات کو بنیاد بنا کر غالب کی شخصیت میں سے انا کی دریافت کر لیتے ہیں اور اس کو ان کے ماحول ، زمانے ، عہد ، عصر اور اپنی شخصیت سے متصادم قرار دے کر غالب کی شخصی شکست و ریخت کا افسانہ سناتے ہیں - اور اسی انا کو غالب کا المیہ یا طربیہ قرار دیتے ہیں مگر یہ بالکل نہیں بتاتے کہ کیا غالب کی شعری صلاحیت بھی اسی ' انا ' کا نتیجہ ہے ؟ اور اگر کوئی شخص اسی نفسیات اور شخصیت کا حامل ہو تو کیا اس میں بھی شعری صلاحیت کا ہونا لازمی ہوگا اور کیا کوئی شاعر اسی بنا پر اتنا ہی بڑا شاعر لازمی طور پر بن جائے گا جتنا غالب ہے ؟ مجھے تنقید کے ان تمام رویوں اور کارناموں پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور یہ یقیناً شاعر اور عہد شاعر کی افہام و تفہیم کے لیے بہت مفید ذرایع بھی ہوسکتے ہیں ، مگر آپ نے یہ دیکھ لیا کہ یہ سب شاعری سے زیادہ شاعر کی شخصیت اور اس کے ماحول کو اہم قرار دے رہے ہیں - اور ان میں اصلاً کسی نے بھی تنقید کے سب سے بنیادی

تقاضے ، شعری ماہیت ، شعری صلاحیت ، غالب کی شاعری اور انفرادیت کو موضوع یا معیار نہیں بنایا ہے - یہ ساری چیزیں اپنی جگہ بڑی اہم ہیں مگر ان کی حیثیت یقیناً غالب کی شاعری کے سامنے ثانوی ہے - سب سے پہلے ہمیں غالب کی شاعری سے دلچسپی ہونی چاہیے نہ کہ غالب کے ماحول اور اس کی شخصی تعمیر سے - ادب کی اہمیت اور شعر کی ماہیت کا سب سے بڑا جوہر یہ ہوتا ہے کہ کسی تخلیق سے ہم صدیوں کے سفر کے بعد بھی اتناہی محظوظ ہو سکیں جتنا اس تخلیق کا ہم عصر زمانہ ہوا ہوگا -

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

اگر ہمیں یہ نہ بھی معلوم ہو کہ یہ کس کا شعر ہے اور کس زمانے میں کہا گیا ہے تو اس کی اثر آفرینی اور تاثر پذیری میں کوئی فرق نہیں پڑتا - اور اگر یہ معلوم بھی ہو کہ اس کا خالق کون تھا ، کس ماحول کا پروردہ تھا اور کس نفسیات کا حامل تھا تو بھی اس کی معنویت اور اثر میں کسی اضافے یا کمی کا امکان نہیں - تنقید ادب کے لیے سب سے پہلے اسی بنیادی حقیقت کو جاننا چاہیے اور اسی سے واسطہ رکھنا چاہیے - اس کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں شعری معنویت ، ماہیت اور شعری قدر و قیمت کے بارے میں بتائے - یہ چیزیں تو ہم بعد میں بھی معلوم کرلیں گے کہ اس کا مصنف کون تھا اور اس کے ماں باپ کون تھے - یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشیات ، نفسیات ، تاریخ اور فلسفہ ، ادراک حقیقت کے لیے اتنے ہی اہم ذرایع ہیں جتنا ادب ، مگر تنقید کو براہ راست ادراکِ حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے - کیونکہ اس کی بنیاد اس فن یا ذرایع پر ہے جس کی وہ تنقید ہے - اس کا کام براہ راست ادراک حقیقت کا ہو ہی نہیں سکتا ، کیونکہ اس کا اصل کام یہ ہے کہ وہ پہلے ادراک حقیقت کے اس ذریعے یا طریقے اور فن کو پہچانے اور تجزیہ کرے ، اس کا معیار مقرر کرے ، اس کا فنی اور جمالیاتی ادراک کرے - یہ بتائے کہ یہ فن یا ذریعہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اور اس تخلیق کا فنی ، جمالیاتی اور اثر آفرینی کا راز دریافت کرے - اس کے بعد وہ منزل آتی ہے جہاں اس حقیقت کا سوال آتا ہے ، جس کا ادراک وہ فن یا طریقہ کر رہا ہے - ہمارے نقاد اپنے سارے فرایض چھوڑ کر براہ راست حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتے ہیں اور اپنی خطاؤں کا 'ملزم' بیچارے شاعر کو قرار دیتے ہیں -

اس ساری تمہید سے میرا مدعا صرف اتنا ہے کہ ہمیں اپنی تنقید سے غالب کی شاعری کا امتیاز ، شاعر کی انفرادیت اور اس کے کلام کا فنی ادراک تو ہوتا نہیں ، البتہ نقادوں کے فیصلے ضرور معلوم ہو جاتے ہیں ۔

غالب کی شاعری کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ غالب کا شعری جوہر کس درجے کا ہے ۔ اس کی خلاق شخصیت کا سبب کیا ہے اور اس کی اہلیت و صلاحیت کن چیزوں سے مرکب ہے -؟ میں نے مضمون کی ابتدا میں غالب کو انسانی تاریخ کے اتفاقات میں شمار کیا ہے ۔ میری مراد یہ ہے کہ ایسی شخصیت کے ظہور میں آنے سے پہلے عمومی زندگی اور اس کے مظاہر کی تعبیریں ہوتی رہتی ہیں ۔ اس کی تعریفیں کی جاسکتی ہیں ۔ مشترک پیمانے بنائے جاسکتے ہیں ۔ لیکن جب کوئی غیر معمولی شخصیت نمودار ہوتی ہے تو یہ ساری تعبیریں ، تعریفیں اور مشترک پیمانے دھرے رہ جاتے ہیں ۔ ایسی شخصیت سارے مفروضوں کو الٹ کر رکھ دیتی ہے اور ایک نئی حقیقت سامنے آ جاتی ہے ۔ گویا وہ اس زمانے کو اپنا زمانہ بنا لیتی ہے ۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ دنیا کی تاریخ میں جب بھی ایسی شخصیات پیدا ہوئی ہیں (جو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں) انھوں نے خوردہ گیروں کے سارے اندازوں اور مفروضات کو بکھیر کر رکھ دیا ہے اور خود تاریخ کے صفحات پر ایک سوالیہ نشان کی صورت میں آویزاں نظر آتی ہیں ۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی تعبیر تاریخی جدلیت سے کی جا سکتی ہے نہ نفسیاتی حقیقت نگاری سے اور نہ فلسفہ طرازی سے ۔ ہم بڑی حد تک میر کو چھوڑ کر ولی سے ناسخ تک کے اردو ادب کے محرکات ، رجحانات ، نتائج اور رویوں کا کوئی مشترک پیمانہ ضرور بنا سکتے ہیں ، لیکن ایک غالب آ کر اس کو بالکل توڑ دے گا اور کسی طرح اس چوکھٹے میں فٹ نہیں ہوگا ۔ ایسا کیوں کر ہوا ۔ اور یہ شخصیت کیسے پیدا ہوئی ، یہ کائنات کا راز ہے اور جب تک اس راز کا جواب تاریخی جدلیت ، نفسیات اور تصور ارتقا کے علوم نہیں دیں گے ، اُن کی ساری کاوشیں کسی شہسوار کے گزر جانے کے بعد اس کے نقوش قدم سے اس کی سمت ، آثار ، انداز اور منزل مقصود کا تعین کرنے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھ سکتے ۔ مجھے بعض اوقات بڑی حیرت ہوتی ہے کہ جب یہ ماہرین زندگی کا اتنا باریک واضح اور گہرا مشاہدہ رکھتے ہوئے کہ ہر چیز کو ۲ + ۲ = ۴ کی طرح بیان کر سکتے ہیں ، کوئی غیر معمولی شخصیت بننے یا بنانے میں

کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے ؟

اب میں تنقید کی ان چند کاوشوں کا ذکر اور کرنا چاہتا ہوں جو ادب کے دائرے میں رہ کر کی گئی ہیں اور انھی کو غالب پر کل سرمایۂ ادب قرار دیا جا سکتا ہے ۔ ان میں ایک مضمون آفتاب احمد کا ہے ، لیکن مجھے اس پر زیادہ اعتبار اس لیے نہیں ہے کہ آفتاب احمد اس کے بعد اپنی یہ طرز فکر ، ادبی شعور ، اسلوب اور انفرادیت خدا جانے کہاں بہا آئے ہیں ۔ البتہ عسکری صاحب نے اپنے چند مضامین میں غالب کے سلسلے میں کچھ بنیادی اشارے کیے ہیں ۔ ان اشاروں میں انھوں نے یہ بات کہی ہے کہ غالب کا تصور عشق اور تصور آدمیت شاعری کے بنیادی رویوں اور موضوعات کے معیار پر بہت پست ہے ۔ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی کا ایک جملہ ایسی تمام تحریروں پر بہت بھاری ہے اور لکھنے اور سوچنے کے لیے ایک مستقل موضوع ۔ ان کا خیال ہے کہ جس شخص کا تصور محبوب پست ہوگا اس کا تصور خدا بھی پست ہوگا ۔ لیکن عسکری صاحب غالب کے سلسلے میں کافی گمراہ کن نقاد ہیں ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کا مذاق شعر ان کے مزاج کا تابع ہے جو انھوں نے بہت شعوری طور پر تعمیر کیا ہے ، جس میں بلند آہنگ ، پر تیقن، مردانہ آوازیں اور نشاطیہ لب و لہجہ کو کبھی شرف قبولیت حاصل نہیں ہو پاتا اور انھوں نے ہمارے قومی مزاج کے تشخص کو دریافت کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے ، اس میں معنویت اتنی اہم ہوگئی ہے کہ انھیں غالب کے مقابلے پر ذوق زیادہ اہم معلوم ہونے لگے ہیں ۔ میں نے انھیں گمراہ کن نقاد اس لیے کہا ہے کہ چاہے غالب ، شاعری کے بنیادی موضوع عشق اور آدمیت کا جتنا پست تصور رکھتا ہو اور چاہے اس نے ذوق کے مقابلے پر ادراک حقیقت میں کتنا گھپلا کیوں نہ کیا ہو مگر وہ ایک اعلیٰ درجے کی خلاق شعری صلاحیت رکھتا ہے اور اس سلسلے میں اس کا مقابلہ ذوق سے کرنا ممولے کو شہباز سے نسبت دینا ہے ۔ غالب عشق اور آدمیت کا اتنا پست تصور رکھتے ہوئے بھی اتنا بڑا شاعر کیوں ہے ، اس کا جواب عسکری صاحب کو بہر صورت دینا ہے ۔ ورنہ ان کے پورے احترام کے باوجود ان کا شعری اور تنقیدی شعور بھی اتنا ہی مشکوک ہو جائے گا جتنا غالب کو ایک تاریخی دور کا آوردہ قرار دینے والے کا ۔

تنقید میں غالب کی انفرادیت کا تجزیہ کرنے والوں میں اس بات پر کامل اتفاق پایا جاتا ہے کہ ان کے کلام کی سب سے منفرد صفت اور نمایاں

خصوصیت اُن کا فلسفیانہ لب و لہجہ اور تعقل یا فکری طرز اظہار ہے ، جو فارسی الفاظ اور تراکیب کے رمزیہ امتزاج سے پیدا ہوا ہے ۔ اُن کے خیال میں غالب کے کلام کی یہ فلسفیانہ فضا اور فارسی مزاج شعری ہی انہیں اردو شاعری میں ایک مختلف آہنگ اور فضا کا شاعر بناتی ہے ۔ یہ بات بادی النظر میں قرین قیاس معلوم ہوتی ہے ۔ میں آپ کے سامنے غالب کے چند ' نئے اور غیر مطبوعہ ' مصرعے اور اشعار پیش کر رہا ہوں ۔ آیئے یہ دیکھیں کہ غالب کی اس انفرادیت پر یہ مصرعے اور اشعار کہاں تک دلالت کرتے ہیں :

چشم نمناک نے از بسکہ بجھایا اس کو

اس ہستیٔ موہوم میں ہرگز نہ کھلی چشم

نہ ہوا سوزن مژگاں سے رفو چاک جگر

کیا وسعت سینہ جو کرے بال کشائی

ممکن نہیں کہ تار نگہ بن ہو یہ رفو

منظور گر ہے قیس کا احوال دیکھنا

برنگ صورت دیوار ہوں میں کشتۂ حیرت

نہیں برداشت ہرگز طبع کو باد مخالف کی

ہوا ہے آہ شرر بار سے تری ثابت

اس خط سبز کی از بسکہ لکھی ہے تعریف

پردۂ داغ جگر کیا چادر مہتاب ہے

ہوں عاشق دل سوختہ چوں سرو چراغاں

میں موسم خزاں میں گل نو دمیدہ ہوں

لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

نفرین خلق و طعن عزیزاں ، جفائے غیر

ہے خط سبز بتاں حاشیۂ مصحف حسن

دست بردار نہیں خون شہیداں سے ہنوز

آلودگی سے دامن عشاق پاک ہے

زنگ آیینے میں جب آیا صفا نایاب ہے

دامن وصل بھی آلودۂ مایوسی ہے

یار کو خون مرا مثل حنا ہو پامال

کیا سرنوشت میری مفقود ہے قلم سے

کچھ نہ معلوم تھا آلودۂ خوں تھا جب تک

غبار خاطر معشوق کب ہے کشتۂ ناز

میری خاطر عزیز کیا نہ ہوئی

پائیں قفس سے رخصت پرواز ہم اگر

کرے ہے تلخ مری زندگی کو ہشیاری

یاں تک میں ہوا خاطر عالم سے فراموش

گل عندلیب رخصت فصل بہار ہے

غیر کا یاں ذکر ہے تیرا کہاں مذکور ہے

کہاں جاتی ہے خوبی حسن کی خط کے نکلنے سے

طالع کہاں جو تیغ نگہ سے شہید ہوں

رکھ قسیں قدم وادیٔ لیلیٰ میں سمجھ کر

مقدور جب نہ ہوئے تو مجبور کیا کرے

غیر از دوئی کے مانعٔ دیدار کون ہے

رشتہ کو ہے گہر سے جو ربط یک دلی کا

پر ہے عزیز خاطر آسودگاں مجھے

یہ ہے غلط کہ گرسنۂ ناز سیر ہو

انہیں تو داد ہے منظور مجھ کو نالہ کشی

بجا ہے جوشش دل تیری چشم میگوں سے

مت رکھ خیال ہستیٔ نا پائدار پر

یہ انتخاب میں نے بہت مختصر دیا ہے۔ لیکن ان مصرعوں میں آپ کو غالب کا مخصوص لب و لہجہ، طرز فکر، منفرد انداز اور بعض خیالات اور اشعار کی گونج بھی بہت واضح اور صاف طور پر سنائی دے سکتی ہے۔ یہی وہ غالب کا مخصوص شعری مزاج ہے جس کو ان کے نقادوں نے طرز غالب قرار دیا ہے۔ اب وہ چند 'غیر مطبوعہ' اشعار بھی سن لیجیے۔

گواہ سجدۂ عشاق ہے خاک در الفت
نہیں مٹنے کا ہر گز نقش میری جبہ سائی کا

آیا ہے خط نمود میں اس خوش نگاہ کا
شاید اثر ہوا ہے مرے دود آہ کا

برنگ طائر بسمل موے یہ کشتۂ عشق
کسی نے غم نہ کیا خاک و خوں طپیدوں کا

بہا دیا ہے اسے سیل اشک میں اے چشم
ہمارا سر نہ ہوا کاسۂ حباب ہوا

از بسکہ آبلوں سے یہ معمور ہو گیا
دل تو برنگ خوشۂ انگور ہو گیا

دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے
گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا

غبار خاطر آزادگاں ہے خواہش فرش
جو بے ریا ہے تو مت نقش بوریا لینا

گزر ہے ناقۂ لیلیٰ کا شاید خاک مجنوں پر
ہوئی اس دشت میں پھر آج گرد کارواں پیدا

توقع کیا رکھے کوئی کسی سے اس زمانے میں
ہوا ہے دشمن جانی وہ میرا دوستدار آخر

یہ امتحاں نہ کر اے مرے مہرباں عزیز
کوئی جہاں میں تجھ سے نہ رکھے گا جاں عزیز

ہے آرزوئے گریہ مجھے چشم تر ہنوز
نکلا نہیں ہے قطرۂ خون جگر ہنوز

وہ کشتنی ہوں میں کہ مرا یار بعد قتل
ضد سے تو کھولتا نہیں اپنی کمر ہنوز

ہوا ہے وا تری شمشیر سے خط تقدیر
شہید عشق ترے یک قلم ہوئے محفوظ

دریائے عشق میں دل بسمل برنگ موج
مارے ہے دست و پا کہیں پہنچے کنار تک

دیکھے اگر تجھے تو نہ پھر دیکھے روئے گل
جاتی رہے دماغ سے بلبل کے بوئے گل

ناصح نہ ہو پشیماں نے پارہ ہو گریباں
کر سوزن مژہ سے چاک جگر رفو ہو

آپ میں خانۂ زنجیر میں رکھتا ہوں قیام
میری وحشت کا ہوا کب در زنداں مانع

برنگ غنچۂ نشگفتہ ہوں دل افسردہ
ہوا نہ چاک گریباں کیا نہ وا مجھ کو

ہے عندلیب رشک محبت سے یہ بعید
کھو لے نسیم عقدۂ گل تجھ سے وا نہ ہو

عکس بھی کب شب ہجراں کا تماشائی ہے
ایک میں آپ ہوں یا گوشۂ تنہائی ہے

کس طرح سے رہے مری عریاں تنی کا لطف
رنگیں کرے جو زخم دل خونچکاں مجھے

ان اشعار اور مصرعوں میں غالب کا معروف رنگ سخن اور منفرد فارسی آمیز لب و لہجہ بہت واضح ہے اور وہ رنگ بھی قطعاً نہیں ہے جس کی وجہ سے غالب مطعون ہیں، یعنی ابہام اور دقیق فارسی تراکیب جن کی وجہ سے غالب کے کلام کا ایک حصہ چیستان ہو کر رہ جاتا ہے۔ غالب نے جس آب و رنگ کو اردو غزل میں رواج دیا ہے اس کی نمایاں خصوصیات آپ کو مندرجہ بالا اشعار اور مصرعوں میں نظر آسکتی ہیں - لیکن یہ اشعار اور مصرعے غالب کے نہیں ہیں - اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ اشعار اور مصرعے غالب کے بعد کے کسی شاعر یا اُن کے کسی ہم عصر کے بھی نہیں ہیں جو اُن سے متاثر قرار دے دیا جائے، بلکہ دور میر و سودا کے ایک اہم شاعر فغاں کے ہیں جو غالب سے نصف صدی پیشتر یہ اشعار اور مصرعے کہہ چکا تھا - اب آپ ان کو دوبارہ پڑھیے تو اُن میں غالب کے مزاج کے علاوہ ایسے خیالات بھی ملیں گے جو غالب کے یہاں اور زیادہ چمک کر آئے ہیں اور ان سے غالب کے بہت سے شعر ذہن میں از خود اُبھر آئیں گے - یہاں میں ایک جملہ معترضہ کی اجازت چاہوں گا کہ اردو غزل کا کوئی موضوع اور رنگ ایسا نہیں ہے جس کے ابتدائی آثار اردو کے قدیم ادوار میں نہ مل جائیں - اور غالباً اس کا سب سے بڑا ثبوت میں نے آپ کے سامنے پیش کردیا ہے کہ غالب جیسے منفرد شاعر کا لب و لہجہ (جس کو نقاد منفرد مانتے ہی اس بات پر ہیں) بھی آپ کو فغاں کے یہاں اتنے فطری اور تخلیقی انداز میں مل جاتا ہے جو غالب کے بہترین مقلدین کو بھی نصیب نہیں - یہ بات میں نے کوئی برائے تحقیق یہاں بیان نہیں کی ہے بلکہ اس سہارے سے صرف یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا غالب واقعی صرف فلسفیانہ اور فارسی لب و لہجہ اور تراکیب کی وجہ سے منفرد ہے؟ غالباً اب آپ اتنی آسانی سے یہ بات نہیں کہہ سکتے اور مجھے آپ سے یہ توقع ہرگز نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں گے کہ غالب کی انفرادیت ژولیدگی اور ابہام کی صفت سے تعمیر ہوئی ہے کیونکہ پھر اس صورت میں آپ غالب کے بہترین کلام پر خط تنسیخ کھینچ دیں گے -

غالب کے بارے میں اس کے علاوہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں تین چیزوں کو اُن کے کلام اور غالب کی شخصیت کی بنیادی اساس قرار دیا گیا ہے - ایک تخیل، دوسری شوخیٔ فکر اور تیسری ذہانت - لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی غالب کی شاعری کا مترادف قرار نہیں دیا

جا سکتا ۔ یعنی صرف تخییل کے ذریعے یہ شاعری ظہور میں نہیں آسکتی تھی یا صرف شوخی غالب کو غالب نہیں بناسکتی تھی ، نہ محض ذہانت یا تیزی فکر کسی فن کا سبب بن سکتی ہے ۔ مگر مجھے یہ تسلیم ہے کہ غالب کی شاعری میں یہ تینوں عناصر بہت نمایاں نظر آتے ہیں اور ان کی یکجائی سے غالب کی شعری قوت کی تخلیق بھی ہوئی ہے ۔ چنانچہ اسی سبب سے غالب کی شاعری اردو غزل کے بنیادی مزاج یعنی ' جذبے ' سے بالکل مختلف نظر آتی ہے ۔ یہ تینوں چیزیں خالص فکری ہیں اور ان کا تعلق ذہن سے ہے ، اس لیے میں نے کہیں لکھا ہے کہ غالب بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہے ۔ اس کی شاعری میں سب سے نمایاں اس کا خلاق ذہن ہے اور اس کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ فکر کو صرف اشارات اور علامات سے ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے ، جسے ہم سوائے وہبی قوت کے اور کیا قرار دے سکتے ہیں ؟ کیونکہ وہ ذہنی عمل جو محض تخیل اور شوخی فکر سے کام لے سکتا ہو غزل کے مزاج سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا خیال ، جذبے سے ۔ یہ عجیب بات ہے کہ عسکری صاحب نے جس چیز کو غالب کی کمزوری قرار دیا ہے وہی اس کی شہزوری ہے ۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ غالب جذبے کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور اسے استہزائیہ انداز سے پیش کرتے ہیں ، لیکن اردو شاعری میں غالب واحد شاعر ہے جو جذبے کو اپنی ذات سے الگ کر کے دیکھ سکتا تھا ۔ یہ اس کے خلاق ذہن کی قوت ہے جو اسے جذبے سے مغلوب نہیں ہونے دیتی ۔ ہر جذبہ اس کے ذہنی معمل گاہ میں اپنی مضحکہ خیزی کو واضح کردیتا ہے ۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے لے کے دل ، دل ستاں روانہ ہوا

یہ لب و لہجہ یوں ہی نہیں آسکتا ۔ اس میں خوب رویوں کی اتنی تحقیر نہیں ہے ، جتنی اس جذبے کی ہے جس کی اصل کو غالب خوب جانتا ہے ۔ ویسے بھی عشق اور تفکر انمل ، بے جوڑ رہے ہیں ۔ لیکن غالب فلسفی نہیں شاعر ہے ۔ اس لیے غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہر خیال کو احساس بنادیا ہے ۔ گویا فکر کو غزل بنادیا ہے ، یہ کام غزل میں کوئی اور نہیں کر سکتا تھا ۔ غالب کی اس منفرد صلاحیت نے شاعری کی افہام و تفہیم اور معیار میں بڑی دقتیں پیدا کر دی ہیں ۔ کیونکہ غالب کے بعد

معمولی نظم ہم سے ہضم نہیں ہوتی ۔ نظم اپنے دو دائرے بناتی ہے ۔ ایک دائرہ وہ جس میں اعلیٰ تر ذہانت اور فکری بلوغت کی بنیاد پر شاعر ایک نظام فکر تعمیر کرتا ہے جس میں وہ حیات انسانی کے بنیادی مسائل کو ایمائی اور علامتی انداز میں پیش کرتا ہے ، سیاہ و سفید کی کشمکش کو ابھارتا ہے ، نظریات اور خیالات کے ان رخوں اور گوشوں کو نمایاں کرتا ہے جن میں فطرت انسانی کائنات سے نبرد آزما ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ وہ اپنے پیغام عمل سے ایک جہد مسلسل پر آمادہ کرتا ہے اور ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے ، ایسا شاعر قوموں کی زندگی میں ایک آدھ بار پیدا ہوتا ہے ۔ اور دوسرا دائرہ وہ ہے جس میں نظم گو زندگی کے عمومی موضوعات ، انفرادی تجربات اور شخصی زاویۂ نظر اور رویوں کا ارتکاز کرتا ہے ۔ نظم کے پہلے دائرے میں اگر اردو شاعری سے کوئی نام آسکتا تھا تو وہ غالب کا تھا ، مگر اتفاق سے غالب نظم گو نہیں ہے ۔ یہی وہ بات ہے جس کو فراق صاحب نے اپنے بے مثال جملے میں کہا ہے کہ شاعر بڑا میر ہے اور فنکار بڑا غالب ۔ تو اب یہ معلوم ہوا کہ تخیل ، شوخیٔ فکر اور ذہانت کے اس امتزاج کے بعد بھی غالب کی دریافت نایافت رہتی ہے ، کیونکہ یہ صفات غالب کے عمومی اشعار میں بھی بہت نمایاں ہیں ۔ مثلاً دیوان غالب کے کسی مستعمل نسخے میں سے اگر ہم صرف ردیف الف کی پہلی ہی پانچ غزلوں میں سے ایک ایک مشہور شعر لے لیں تو اسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے ۔

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اشعار کا یہ انداز اسی طرح ردیف ی تک چلا جاتا ہے اور ان میں غالب کی متذکرہ تینوں خصوصیات جن کو ادبی اصطلاح میں ندرت خیال ، شوخیٔ اظہار اور نیرنگیٔ فکر سے تعبیر کیا جاتا ہے دیکھی جا سکتی ہیں ۔ لیکن کیا غالب کا تخلیقی جوہر انھی خصوصیات کی وجہ سے اتنا ہمہ گیر محسوس ہوتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ شاعری کی اتنی بڑی سطح نہیں ہے جس کو غالب کی عظمت کا معیار قرار دیا جا سکے ۔ یہ خصوصیات یقیناً بہت غیر معمولی اہمیت کی مالک ہیں لیکن بڑے شاعروں کے یہاں اگر ان تینوں کا امتزاج نہیں ہوگا تو وہ بڑے شاعر نہیں ہو سکتے ۔ اور مجھے اپنے مفروضات اور بڑی شاعری کی خصوصیات کے بیان سے زیادہ اس بات سے دلچسپی ہے کہ میں آپ کے سامنے غالب کو اس طرح سے پیش کر سکوں جس طرح وہ دیوان غالب پڑھتے وقت اپنے قاری کو بے دست و پا کردیتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ غالب کو اس سطح سے بلند کرنے والی اور اس کی تخلیقی عظمت اور انفرادی جوہر کی ناقابل بیان انفرادیت ایسے اشعار سے نمایاں ہوتی ہے جہاں غالب چند آفاقی تجربوں اور اپنے ذہن اور شخصیت کی بے پناہ وسعت ، گہرائی اور اعتماد کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس تجربے کو اظہار کے بہترین پیکر میں لے آتا ہے ۔

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آینہ دایم نقاب میں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا
افسون انتظار تمنا کہیں جسے

دام ہر موج میں ہے، حلقہٴ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ڈھونڈے ہے اس مغنیٴ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہٴ برق فنا مجھے

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٴ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تو اور آرائیش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

ہر قدم دوریٴ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ وہ سطح ہے جہاں غالب ، غالب ہے اور اس کا کوئی مماثل نہیں ۔ اس میں نہ استہزا ہے نہ شوخی نہ صرف فارسی تراکیب اور محض فلسفانہ لہجہ ، نہ فغاں کی گرد ۔ یہی وہ سطح ہے جہاں غالب کا تخلیقی جوہر ایک اتفاق بن جاتا ہے ۔ غالب کی وہ تینوں خصوصیات تخیل ، شوخی اور ذہانت اپنا اعتبار اور گیرائی حاصل ہی اس لیے کرتی ہیں کہ ان قوتوں کے پس منظر میں غالب کی ذہنی سطح کی یہ آفاقیت اور اس کی منفرد تخلیقی عظمت کام کرتی ہے ۔ اس بات کا احساس جتنا غالب کو ہو سکتا تھا اور کسی کو ہونا کیسے ممکن تھا ، چنانچہ آپ دیکھیے کہ غالب اپنی اس انفرادیت اور یگانۂ روزگار فکر کی ماہیت کی طرف کس کس طرح اشارا کرتا ہے اور یہ عام خیال کے مطابق صرف تعلی کا انداز نہیں ہے بلکہ اس میں دلیل اور نظر دونوں شامل ہیں ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

غالب کو اپنی اس غیر معمولی فکری سطح اور یگانہ روزگار تخلیقی صلاحیت کو غزل جیسی صنف میں پیش کرنے میں کیوں کر کامیابی ہو سکی ، یہی غالب کی سب سے بڑی عظمت ہے ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے انسانی

سرشت اور کائناتی صداقتوں پر اتنی گرفت حاصل تھی کہ وہ ان کو علامتوں میں پیش کرسکتا تھا ۔ اسے ایمائیت اور اشاریت کا روپ دے سکتا تھا ۔ یہی غالب کی حد کمال ہے اور شاید غزل کی آبرو کا سب سے بڑی محافظ بھی ، جس میں بنیادی صداقتیں اور شعری صداقتیں ایک ہو جاتی ہیں ۔ غالب ان صداقتوں کی طرف اشارا کرتا چلا جاتا ہے جو انسانی سرشت میں یکسانی اور تسلسل کے ساتھ زندہ اور توانا رہتی ہیں اور وہ ان کی حقیقت کو شعری گرفت میں لے آتا ہے ۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

نہ ہو نگار کو الفت مگر نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے

نہ ہو بہار کو فرصت مگر بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

تماشا کر اے محو آیئنہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے
یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

اب آخر میں ایک بات اس خود ستائی کے بارے میں کہنی ہے کہ ہم
وگ غالب کی عظمت کی دریافت کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں ، حالانکہ غالب
پنے زمانے میں کوئی غیر اہم شاعر نہیں تھے ۔ اس وقت کے تمام اردو شاعروں
یں ذوق و مومن کے بعد غالب کا شمار یا اس عہد کے تین اہم ترین شعرا میں
ن کا گنا جانا ایسی بات نہیں ہے کہ غالب شناسی کو صرف جدید عہد کی دریافت
سمجھ لیا جائے ۔ ہر زمانے کے ذوق ادب میں اتنا فرق ہونا ایک لازمی امر ہے ۔
یر کے مقابلے پر سودا کو ، مصحفی کے مقابلہ پر انشا کو ، آتش کے مقابلے پر
اسخ کو یہی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ رونا تو یہ ہے کہ غالب شناسی کے اتنے
عروں کے باوجود ایک کتاب ایسی نہیں جس کا موضوع صرف غالب کی
ساعری ہو اور جس میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہو کہ غالب کی شعری
عظمت کیا ہے اور وہ کیوں اور کیسے پیدا ہوئی ہے ۔

سب رس

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے - اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب محنت اور تحقیق کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے- شروع میں بابائے اردو کا محققانہ مقدمہ اور آخر میں فرہنگ الفاظ بھی شامل ہیں -

قیمت : پانچ روپے

انجمن ترقی اردو
بابائے اردو روڈ - کراچی

مرزا غالب کی ایک الجھن

ڈاکٹر سہیل بخاری

ادھار کون نہیں لیتا دیتا پر ادھار کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جب ادھار حد سے بڑھ جائے تو لوگ چونک اٹھتے ہیں اور انھیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ غالب کو ادھار لینے کا ایک روگ سا لگ گیا تھا کہ جب تک جیتے رہے ادھار ہی میں ڈوبے رہے اور مرے تو بھی آٹھ سو روپے کے دین دار نکلے جو ان کی بیوی نے رام پور کے نواب سے مانگ کر چکائے۔ مرزا کو شروع سے ۱۸۵۷ء تک انگریزی سرکار سے ساڑھے باسٹھ روپے مہینا کی پنشن ملتی رہی، پر ایسا لگتا ہے کہ اس میں ان کا گزارا نہیں ہو پاتا تھا، کیونکہ ۱۸۵۰ء میں وہ حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش سے بہادر شاہ کی سرکار میں تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر نوکر ہوگئے تھے اور پچاس روپے مہینا تنخواہ پانے لگے تھے۔ اس پر انھوں نے ایک شعر بھی کہا ہے:

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۹ جون ۱۸۵۳ء کو انھوں نے مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھا:

”یہ تمھارا دعاگو اگرچہ اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمھاری ہمت پر سو ہزار آفریں۔ جے پور سے مجھ کو اگر دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دوچار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل

جاتا - یہ پانچ سو تو بھائی تمھاری جان کی قسم متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے، سو وہ میرے صرف میں آویں گے - مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ سو کے باقی رہے گا اور وہ جو سو بابو صاحب سے منگوائے تھے وہ صرف انگریزی سوداگر کے دیے تھے "۔

۲۳ جون کو پھر انہیں لکھتے ہیں :

" بھائی جس دن تم کو خط بھیجا تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پان سو کی ہنڈوی پہنچی - تم سمجھے - بابو صاحب نے پچیس روپے ہردیو سنگھ کے دیے اور مجھ سے مجرا نہ لیے - بہر حال ہنڈوی ۱۲ دن کی میعادی تھی - ۶ دن گزر گئے تھے، ۶ دن باقی تھے - متی کاٹ کر روپے لے لیے - قرض متفرق سب ادا ہوا - بہت سبک دوش ہو گیا - آج میرے پاس ۲۷ روپے نقد بکس میں اور ۴ بوتل شراب اور ۳ شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں " -

۱۸۵۵ء میں رام پور کے نواب یوسف علی خاں ان کے شاگرد ہوئے تو وہاں سے بھی انہیں کچھ مدد ملنے لگی - منشی غلام غوث بے خبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" نواب یوسف علی خاں بہادر، والیٔ رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے - ناظم ان کو تخلص دیا گیا - بیس پچیس غزلیں اصلاح دے کر بھیج دیتا - گاہ گاہ کچھ روپیا ادھر سے آتا رہتا، قلعے کی تنخواہ جاری، انگریزی پنشن کھلا ہوا، ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے " -

اس زمانے میں بھی جب کہ تین تین جگہ سے آمدنی ہوتی تھی، مرزا کے دن شاید ہی اچھے گزرے ہوں کیونکہ ساڑھے باسٹھ اور پچاس روپے سب ملا کر ایک سو بارہ روپے آٹھ آنے مہینا ہوتے تھے - اور نواب صاحب کی رقم گاہ گاہ ہی ملتی تھی - مرزا پیسا بچانا تو جانتے ہی نہیں تھے، جو ملتا تھا وہ خرچ کردیتے تھے، پھر اس کے دو ہی برس پیچھے آزادی کی لڑائی ہو گئی تو بہادر شاہ تخت سے اتر گئے - وہاں کی تنخواہ جاتی رہی اور انگریزی سرکار سے جو پنشن ملتی تھی وہ بہادر شاہ کا ساتھ دینے کے شبہے میں روک لی گئی - اس کے بعد ان کے ہندو دوست اور شاگرد ان کی خدمت کرتے رہے، یہاں تک

کہ جولائی ۱۸۵۹ء سے رام پور کے نواب نے ان کی سو روپے مہینا تنخواہ کردی جو انہیں ہر مہینے ملنے لگی ۔ اس میں ان کی کیا گزر ہوسکتی تھی ۔

مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن کھلی اور تین سال کا اکٹھا روپیا ملا ۔ اس کا حساب ۶ مئی ۱۸۶۱ء کے خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں ، جس سے اس بیچ کے زمانے کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے :

''زر سہ سالہ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوئے ۔ سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں ۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے ۔ سو روپے مجھے مدد خرج ملے تھے وہ کٹ گئے ۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے ۔ رہے دو ہزار روپے ۔ میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرض‌دار قدیم ہوں ۔ اب جو وہ دو ہزار لایا اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے ۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے ۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کروایا ۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے ، پندرہ اور گیارہ ۲۶ سو ہوئے ۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا ۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دے دو ۔ پان سو سات روپے باقی کے تم لے لو ۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے ، نو سو باقی رہے ، آدھے تو لے ، آدھے مجھ کو دے'' ۔

اسی روپے کا حساب مرزا علاوالدین احمد خاں کو بھی لکھا ہے :

''پنشن بے کم وکاست جاری ہوا ۔ زر مجتمعہ سہ سالہ یک مشت مل گیا ۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے''

اس کے بعد مرزا کو سرکاری پنشن اور رام‌پور کی تنخواہ ملا کر ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے ملنے لگے تھے اور رام پور سے انعام الگ ۔ مرزا کی گزر پھر بھی نہیں ہوتی تھی ۔ مہاجنوں سے سود پر روپیا ادھار لیتے رہتے تھے ، یہاں تک کہ جب آخر میں آ کر ان لوگوں نے بہت کڑے تقاضے کیے تو مرزا نے ، جو رام پور کے نواب سے اپنے پوتے حسین علی خاں کی شادی کے لیے روپیا مانگنے کو کئی خط بھیج چکے تھے ، گبھرا کر انہیں لکھا کہ مجھے آٹھ سو روپے ہی بھیج دو ، جس سے میرا ادھار چک جائے اور عزت بچ جائے ۔ میں

حسین علی خاں کے بیاہ کے لیے پھر روپیا نہیں مانگوں گا۔

مرزا کی اس پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ ان کی آمدنی ان کا خرچ پورا نہیں کر پاتی تھی اور خرچ اس ٹھاٹ باٹ کا تھا جو وہ رکھتے تھے اور رکھنا چاہتے تھے۔ وہ گھر سے باہر پینس میں نکلتے تھے اور گھر میں کتنے ہی نوکر چاکر رکھتے تھے جن کا ذکر اپنی کئی چٹھیوں میں کرتے ہیں۔ وہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

" اب خاص اپنا رونا روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے تین چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز یہ باہر۔ مداری کی جورو بچے گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمدنی نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود "۔

ایک اور خط میں علائی کو لکھتے ہیں :

" انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آ گیا، گزارا مشکل ہو گیا "۔

یہ ٹھاٹ رکھنے کے لیے مرزا کو ادھار سے کام چلانا پڑتا تھا۔ پر سوال یہ ہے کہ وہ آمدنی سے اپنا خرچ کیوں نہیں گھٹاتے تھے اس کا حال ان کے اس خط سے کھلتا ہے جو انہوں نے مرزا قربان بیگ کو لکھا ہے :

" میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں، لو غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلم رو سخن جانتا تھا، سقر مقر اور هاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیے نجم الدولہ بہادر، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے، میں ان سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب

اور خاں صاحب ، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں ، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا خاک ۔ بے حیا ، بے غیرت ۔ کوٹھی سے شراب ، گندھی سے گلاب ، بزاز سے کپڑا ، میوہ فروش سے آم ، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے ، یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا ''۔

یہی بات انھوں نے اپنے ایک شعر میں بھی کہی ہے :

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا کی ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ادھار کی ان پریشانیوں میں بھی انھیں اپنے بڑے آدمی ہونے کا برابر دھیان رہتا تھا ۔ اور دھیان کیوں نہ ہوتا جب کہ اپنا بڑاپن اور بڑے پن کا بھرم رکھنے ہی کے لیے وہ یہ سب کھکیڑیں اٹھاتے تھے ۔ اور یہیں اس سوال کا بھی جواب مل جاتا ہے کہ وہ اپنا خرچ کیوں نہیں گھٹاتے تھے جس سے اپنی آمدنی ہی میں پور پڑتی رہتی ۔ مرزا کی پوری زندگی کٹ گئی اور وہ اپنے اونچے گھرانے ، ریاست اور ناموری ہی کے گیت گاتے رہے ۔ ان دنوں میں بھی جب کہ دلی میں سب کو اپنی اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی ، مرزا ایک ہی راگ الاپتے رہے ۔ مولانا حالی نے ' یادگار غالب ' میں جو لکھا ہے کہ مرزا کے دروازے پر لولے لنگڑے اور اپاہج فقیروں کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا ، اس کا کارن بھی یہی تھا کہ وہ ایسے لوگوں کی مدد کر کے ہی اپنے بڑے پن کا بھرم رکھ سکتے تھے ۔

جب دھلی کالج میں فارسی پڑھانے والے کی ایک جگہ بڑھائی گئی تو حکومت ھند کے سکریٹری مسٹر ٹامسن نے مرزا غالب کو بلایا ۔ یہ پالکی پر ان کے ھاں پہنچنے ، پر پالکی سے اس لیے نہیں اترے کہ ٹامسن صاحب آپ انھیں لینے آئیں ۔ جب ٹامسن صاحب کو پتا چلا تو وہ باھر آئے اور مرزا سے کہا کہ ''جب آپ گورنر کے دربار میں آئیں گے تو آپ کی آؤ بھگت اسی طرح کی جائے گی ۔ اس گھڑی آپ نوکری کے لیے آئے ہیں ، اس لیے ویسا برتاؤ نہیں ہو سکتا ''۔ مرزا نے جواب دیا کہ '' گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو ، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی

فرق آئے "۔ صاحب نے جواب دیا کہ " ہم قاعدے سے مجبور ہیں "۔ اس پر غالب یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھ کو اس ملازمت سے معاف رکھا جائے ۔

کچھ لوگ اسے مرزا کی خودداری کہتے ہیں جیسا کہ ان شعروں سے بھی ظاہر ہوتا ہے :

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم پکاریں اور کھلے ، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

پر مکاتیب غالب پڑھ کر اس خودداری کا کہیں کھوج تک نہیں ملتا ۔ انھوں نے رام پور کے نواب سے روپے مانگنے میں ذراسی بھی جھجک نہیں دکھائی ، نہ روپے مانگنے کا کوئی ڈھب ہی چھوڑا ۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مانگتے شرم آتی ہے اور پھر مانگتے بھی جاتے ہیں ۔ کبھی قصیدے کے بہانے اور کبھی کسی اور بہانے سے انعام مانگتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں کہ تنخواہ میں سے یہ رقم کاٹی نہ جائے ۔ اپنے پوتے حسین علی خاں کے بیاہ کے لیے روپیا مانگنے کو لگاتار چھ چٹھیاں لکھیں ، آخر جب ادھار مانگنے والے غالب کی جان کھانے لگے تو گھبرا کے لکھا کہ بلا سے آٹھ سو روپے ہی بھیج دو جس سے میری لاج تو رہ جائے ، میں اب حسین علی خاں کے بیاہ کے لیے روپیا نہیں مانگوں گا ۔

اس کے لیے ان کے کچھ خطوں سے مثالیں لکھتا ہوں ، ذرا مرزا کا لہجہ دیکھیے :

" آپ کے اس تکیہ دار ، روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے ۔ (خط ۱۰/۴۰ ۔ 'مکاتب غالب')

" ماہ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کرتے ہیں ۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی صیغے میں ہوجائے اور اس بوڑھے اپاھج فقیر کو روپیا مل جائے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے "۔ (خط ۱۰۳/۵۹ ۔ 'مکاتیب غالب')

'' دوسری بات یہ ہے کہ سو روپے آپ کی سرکار سے بطریق خیرات اور ۶۲ روپیے ۸ آنے مہینا انگریزی سرکار سے بہ عوض جاگیر پاتا ہوں ۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے '' ۔ (خط ۵۳/۹۶ ۔ ' مکاتیب غالب ')

آخری خط سب سے زیادہ مزے دار ہے جس کے ایک ہی جملے میں اپنے آپ کو فقیر بھی بتایا ہے اور جاگیر دار ہوی جتایا ہے اور یہی مرزا کی الجھن تھی ۔ مرزا کو اپنے اونچے گھرانے پر بہت گھمنڈ تھا ، منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو ایک بار یوں لکھتے ہیں :

'' میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں ۔ دادا میرا ماورا النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا ۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا ۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی ۔ دفتر دیکھا گیا ۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا ۔ ملازمت ہوئی ۔ سات پارچے اور جیغہ ، سرپیچ ، مالائے مروارید ، یہ تین رقم خلعت ملا ۔ زاں بعد جب دلی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا ۔ بعد غدر بہ جرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہوگئے ۔ میری بریت کی درخواست گزری ۔ تحقیقات ہوتی رہی ۔ تین برس کے بعد بند چھٹا ۔ اب خلعت معمولی ملا ۔ غرضکہ یہ خلعت ریاست کا ہے ، عوض خدمت نہیں ، انعامی نہیں ''۔

ایک چٹھی میں اپنی کتاب چھپوانے کے سلسلے میں منشی شیونراین کو یہ ہدایت لکھی ہے :

'' سنو میری جان ۔ نوابی کا مجھ کو خطاب ہے نجم الدولہ اور اطراف و جوانب کے امرا سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں ، بلکہ بعض انگریز بھی ، چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافے پر نواب اسداللہ خاں لکھا ، لیکن یاد رہے نواب کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھتے ، خلاف دستور ہے ، یا نواب اسد اللہ خاں لکھو یا میرزا اسد اللہ خاں لکھو اور بہادر کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے ''۔

ایک چٹھی میں سید غلام حسنین قدر بگرامی کو اپنے مان سمت کے لیے یوں لکھتے ہیں :

" میر صاحب ماجرا یہ ہے کہ میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا ۔ غدر کے بعد پنشن جاری ہوگئی لیکن دربار اور خلعت بند "۔

وہ بار بار لوگوں کو لکھتے ہیں کہ خط پر میرا نام اور دہلی لکھ کر بھیج دیا کرو ، مجھ تک پہنچ جائے گا ۔ خط جس ڈاک خانے سے چلتا ہے وہیں رہ جائے تو رہ جائے دہلی کے ڈاک خانے میں نہیں کھو سکتا ۔ انھوں نے جگہ جگہ یہ جتایا ہے کہ فارسی اور انگریزی کے خط بھی جو انگلستان کے میرے نام آتے ہیں ، دہلی کے پتے پر مل جاتے ہیں جب کہ ان پر محلہ بلی ماروں کا نام بھی نہیں ہوتا ۔ وہ کہتے ہیں کہ نامور آدمیوں کے خط میں لمبے چوڑے پتے کی ضرورت نہیں ہوتی، جس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی نامور آدمی ہوں ۔ وہ ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :

" بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضروری نہیں ۔ میں غریب آدمی ہوں ، مگر فارسی انگریزی خط جو میرے نام کے آتے ہیں تلف نہیں ہوتے "۔

مرزا علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو ، اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئے گا ۔ پچاس برس سے دہلی میں رہتا ہوں ۔ ہزار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں ۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے ۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں ۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام ۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ مسکن بتا ۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی ، اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانا نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتا نہ پائے ۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے، خط کے پہنچنے کا میں ضامن"۔

ان کی یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی
جھتے ہی نہیں تھے، دوسروں کو بتانا بھی چاہتے تھے ۔ ان کی اس الجھن کا
ئی نہ کوئی کارن ہونا چاہیے کیونکہ اونچے اونچے گھرانوں کے لوگ بھی
ھی کبھی مٹ جاتے ہیں اور پھر زمانے سے سمجھوتا کر کے اپنی روکھی
کھی ہی پر دن کاٹنے لگتے ہیں ۔ نہ وہ اپنا بڑاپن کسی کو جتاتے ہیں نہ
زا کی سی شاہ خرچی کرکے ادھار کے دکھوں ہی میں پھنستے ہیں ۔ ان لوگوں
زبان پر اپنے 'بڑےپن' کی بات صرف اس گھڑی آتی ہے جب ان کی ساکھ
آبرو پر چوٹ پڑتی ہو ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا سچ مچ مرزا پر بھی کوئی
ی گھڑی آئی تھی اور کوئی ایسی بپتا پڑی تھی جس نے ان کی خاندانی
ت میں بٹا لگایا ہو ۔ ان کا ایک شعر ہے :

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

کہنے کو تو یہ ایک غزل کا مقطع ہے اور اس میں کہی ہوئی
آبروئی کی بات تفریحی سمجھی جاسکتی ہے ۔ پر ہمیں سچ مچ بے آبروئی کی
، کا ذکر ان کے ایک خط میں بھی ملتا ہے ۔ ۱۸۰۲ء میں مرزا کا تعلق
پور سے قائم ہوا تو مرزا تفتہ نے اس کی تفصیل پوچھی اور لکھا کہ وہاں
ا بھی خیال رہے ۔ اس کے جواب میں ۱۰ دسمبر ۱۸۵۳ء کو وہ تفتہ کو
ے خط میں لکھتے ہیں :

" جےپور کا امر محض اتفاقی ہے ۔ بے قصد و بے ذکر درپیش آیا ہے ۔ ہوس تاکانہ ادھر متوجہ ہوا ہوں ، بوڑھا ہو گیا ہوں ، بہرا ہو گیا ہوں ۔ سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا ، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا ، پورا خلعت پاتا تھا ، اب بدنام ہوگیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے ، کسی ریاست میں دخل نہیں کرسکتا تھا مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں ، کچھ فائدہ اٹھاؤں ، کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کردوں ۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے "۔

مرزا کی اس بدنامی کے واقعے کا حال مولانا عرشی نے 'مکاتیب غالب'
ء لکھا ہے کہ " ۱۸۴۷ء میں فیض الحسن خاں کوتوال دھلی کے ہاتھوں

قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہوئے اور چھ مہینے کی با مشقت قید اور دوسو روپے جرمانے کی سزا پائی ۔ اس واقعے کی جزئیات بے حد افسوس ناک تھیں ۔ کوتوال نے گرفتاری کے وقت اور مجسٹریٹ نے سزا کی تجویز میں ان کی وجاہت و شرافت کا قطعاً لحاظ نہ کیا ۔ پولیس اورعدالت کے اس نامناسب سلوک سے ان کی حس غیرت سخت مجروح ہوئی ، خود اپنی نظر میں شرافت خاندان پر دھبا آ گیا اور اپنے کو روسائے ہندوستان سے ملنے جلنے کے قابل شمار کرنے میں پس و پیش کرنے لگے "۔

اس واقعے سے متعلق مولانا عرشی نے حاشیے میں اخبار " فوائدالناظرین " جلد دوم نمبر ۱۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء کے صفحہ ۸۰ پر لکھی ہوئی عبارت نقل کی ہے ۔ "۲۵ ماہ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی ، چنانچہ کوتوال صاحب یہ خبر پاکر وہاں گئے اور جناب میرزا صاحب کو مع اور قمار بازوں کے گرفتار کر کر کوتوالی میں لے آئے ۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے حق میں کیا حکم دیتے ہیں " اور شاہ نصیر کے ایک شاگرد گھنشیام لال عاصی دہلوی کی عبارت بھی دہرائی ہے :

> " مرزا نوشہ ، شاعر بے بدل دہلی ، رند مشرب ، المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال کو ناحق کی عداوت پیدا ہو گئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرادیا ، جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی :

سر ابجد سے فصلی میں تو سب اظہار طوفاں ہے
اور اٹھارہ سو سنتیالیس میں قید غریباں ہے

' قلق غالب ' نہ کیونکر موش اورگربے کے دل پر ہو
دبی بلی کٹاتی کان چوہوں سے بدنداں ہے

رہائی روز بد سے میرزا نوشہ کی کیوں کر ہو
' زن غمخوار ' واں بن کرگیا فیض الحسن خاں ہے

سر بازو پکڑ کر شحنۂ تقدیر نے عاصی
اسد کو جوتیوں سے گھیر کر ڈالا بہ زنداں ہے

بر وقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقع پرگئے

اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آتی ہیں - اس دھوکے سے اندر داخل ہوگئے اور اندر مکان سے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی، مگر زینے کے اندر جمعیت بہت تھی اور کچھ امدادی برقنداز پہنچ گئے، گرفتار کر کے قید کرادیا - بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے اور عدالت میں برأت کے ساعی ہوئے مگر قید ہو ہی گئے "۔

اس بے آبروئی کا مرزا کو جو دکھ پہنچا اور بدنامی کا ان کے دل پر جو گہرا اثر پڑا، اس نے ان کے ذہن میں عمر بھر کے لیے ایک الجھن پیدا کردی۔ وہ اپنے من کو یہ نہیں سمجھا سکے کہ یہ ایک اتفاقی بات تھی جو ہو گئی کہ کوتوال نے ان سے اپنا بیر یوں نکالا اور اپنا کمینہ پن دکھایا۔ اس اخلاقی دھبے کو دھونے کے لیے مرزا نے یہ کوشش کی کہ کسی ریاست میں استاد یا پیر یا مداح بن کر پہنچوں اور یہ طریقہ بہت مناسب تھا - جے پور کی ریاست سے تعلق پیدا ہونے کا جو موقع آیا، وہ اسی کوشش کا نتیجہ تھا اور جب وہاں بیل منڈھے نہیں چڑھی تو انہوں نے رام پور کی ریاست میں استاد بن کر دخل کیا - پر ایسا لگتا ہے کہ اس سے بھی مرزا کے دل کو تسلی نہیں ہوئی، اس لیے انہوں نے آپ ہی اپنے اونچے گھرانے، اپنی ریاست اور ناموری کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کردیا اور یہ طریقہ غلط تھا کیونکہ اس کے لیے انھیں امیرانہ ٹھاٹ رکھنا ضروری ہوگیا، اور جب ان کی آمدنی نے اس کا ساتھ نہیں دیا تو انہوں نے ادھار لے لے کر کام چلایا اور مرتے دم تک اس کی پریشانیاں بھگتتے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بے عزتی کا یہ نامراد واقعہ ان کے دھیان سے کبھی نہیں نکلا اور ایک روگ بن کر ان کے ذہن سے آخر تک چمٹا رہا۔

قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہوئے اور چھ مہینے کی با مشقت قید اور دوسو روپے جرمانے کی سزا پائی۔ اس واقعے کی جزئیات بے حد افسوس ناک تھیں۔ کوتوال نے گرفتاری کے وقت اور مجسٹریٹ نے سزا کی تجویز میں ان کی وجاهت و شرافت کا قطعاً لحاظ نہ کیا۔ پولیس اور عدالت کے اس نامناسب سلوک سے ان کی حس غیرت سخت مجروح ہوئی، خود اپنی نظر میں شرافت خاندان پر دھبا آ گیا اور اپنے کو رسوائے ہندوستان سے ملنے جلنے کے قابل شمار کرنے میں پس و پیش کرنے لگے"۔

اس واقعے سے متعلق مولانا عرشی نے حاشیے میں اخبار "فوائدالناظرین" جلد دوم نمبر ۱۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء کے صفحہ ۸۰ پر لکھی ہوئی عبارت نقل کی ہے۔ "۲۵ ماہ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی، چنانچہ کوتوال صاحب یہ خبر پاکر وہاں گئے اور جناب میرزا صاحب کو مع اور قمار بازوں کے گرفتار کر کر کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے حق میں کیا حکم دیتے ہیں" اور شاہ نصیر کے ایک شاگرد گھنشیام لال عاصی دہلوی کی عبارت بھی دہرائی ہے:

"مرزا نوشہ، شاعر بے بدل دہلی، رند مشرب، المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال کو ناحق کی عداوت پیدا ہو گئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرادیا، جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی:

سر ابجد سے فصلی میں تو سب اظہار طوفاں ہے
اور اٹھارہ سو سنتالیس میں قید غریباں ہے

'قلق غالب' نہ کیونکر موش اور گربے کے دل پر ہو
دبی بلی کٹاتی کان چوہوں سے بدنداں ہے

رہائی روز بد سے میرزا نوشہ کی کیوں کر ہو
'زن غمحوار' واں بن کر گیا فیض الحسن خاں ہے

سر بازو پکڑ کر شحنۂ تقدیر نے عاصی
اسد کو جوتیوں سے گھیر کر ڈالا بہ زنداں ہے

بر وقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقع پر گئے

اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں - اس دھوکے سے اندر داخل ہوگئے اور اندر مکان سے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی، مگر زینے کے اندر جمعیت بہت تھی اور کچھ امدادی برقنداز پہنچ گئے، گرفتار کر کے قید کرادیا - بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے اور عدالت میں برأت کے ساعی ہوئے مگر قید ہو ہی گئے "۔

اس بے آبروئی کا مرزا کو جو دکھ پہنچا اور بدنامی کا ان کے دل پر جو گہرا اثر پڑا، اس نے ان کے ذہن میں عمر بھر کے لیے ایک الجھن پیدا کردی۔ وہ اپنے من کو یہ نہیں سمجھا سکے کہ یہ ایک اتفاقی بات تھی جو ہو گئی کہ کوتوال نے ان سے اپنا بیر یوں نکالا اور اپنا کمینہ پن دکھایا۔ اس اخلاقی دھبے کو دھونے کے لیے مرزا نے یہ کوشش کی کہ کسی ریاست میں استاد یا پیر یا مداح بن کر پہنچوں اور یہ طریقہ بہت مناسب تھا - جے پور کی ریاست سے تعلق پیدا ہونے کا جو موقع آیا، وہ اسی کوشش کا نتیجہ تھا اور جب وہاں بیل منڈھے نہیں چڑھی تو انھوں نے رام پور کی ریاست میں استاد بن کر دخل کیا - پر ایسا لگتا ہے کہ اس سے بھی مرزا کے دل کو تسلی نہیں ہوئی، اس لیے انھوں نے آپ ہی اپنے اونچے گھرانے، اپنی ریاست اور ناموری کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کردیا اور یہ طریقہ غلط تھا کیونکہ اس کے لیے انھیں امیرانہ ٹھاٹ رکھنا ضروری ہوگیا، اور جب ان کی آمدنی نے اس کا ساتھ نہیں دیا تو انھوں نے ادھار لے لے کر کام چلایا اور مرتے دم تک اس کی پریشانیاں بھگتتے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بے عزتی کا یہ نامراد واقعہ ان کے دھیان سے کبھی نہیں نکلا اور ایک روگ بن کر ان کے ذہن سے آخر تک چمٹا رہا۔

خیالات عزیز

یہ مولوی عزیز مرزا (سابق معتمد آل انڈیا مسلم لیگ و انجمن ترقی اردو ھند) کے علمی ، ادبی ، لسانی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے۔ بعض مضامین یہ ھیں :

- اکبر اعظم
- سکے کی ابتدا اسلام میں
- ایشیائی شاعری کا موضوع کیا ہے؟
- دربار بغداد کی ایک جھلک
- کاغذ کی ابتدا اسلام میں
- خطبۂ صدارت اردو کانفرنس بدایوں

اس مجموعے کو پنڈت دیا نرائن نگم (مدیر 'زمانہ') نے مرتب کیا تھا اور اس پر نواب وقار الملک مرحوم کا دیباچہ ہے۔

قیمت : چار روپے پچاس پیسے

غالب کے اولین تعارف نگار

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مرزا غالب رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ع میں پیدا ہوئے اور ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق فروری ۱۸۶۹ع میں وفات پائی ۔ گویا سنہ ہجری کے لحاظ سے تہتر سال اور سنہ عیسوی کے لحاظ سے بہتر سال زندہ رہے۔ ان کی زندگی میں بھی ان کی سوانح اور شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی وفات سے لے کر ان کی صد سالہ برسی فروری ۱۹۶۹ع کے درمیانی عرصے میں ان کے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب تک اقبال کے سوا اردو کے کسی اور شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا ۔ اس سلسلے میں معاً یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ غالب کے فکر و فن کے متعلق سب سے پہلے کس نے رائے ظاہر کی اور کن لوگوں نے انہیں اول اول پہچانا اور کن لوگوں نے ان کی شخصیت اور کلام کو سب سے پہلے دوسروں سے متعارف کرایا ۔ بعض مقالہ نگاروں کا خیال ہے کہ غالب کا ذکر سب سے پہلے سر سید احمد خاں کی مشہور تصنیف 'آثارالصنادید' مرقومہ ۱۸۴۶ع میں ملتا ہے - (۱) لیکن چونکہ یہ جواب تحقیق و استدلال سے عاری ہے اس لیے ادب کے قارئین مطمئن نہ ہوئے اور غالب کے اولین تعارف نگار کے بارے میں ان کا استفسار آج تک جوں کا توں باقی ہے (۲) -

غالب کے سلسلے میں "ماہ نو" کے مقالہ نگار یا کسی بزرگ کا یہ خیال

۱- 'غالب اور سرسید' مطبوعہ ماہ نو کراچی ، بابت فروری ۱۹۵۱ع

۲- ہماری زبان ، علی گڑھ، بابت ۱۵ - اکتوبر ۱۹۶۸ع جس میں ایک مراسلہ نگار نے پوچھا ہے کہ غالب کا اولین تذکرہ نگار کون ہے -

کہ ان کا ذکر سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں کیا ہے، درست نہیں ہے اور کہنے والے کی بے خبری کا پتا دیتا ہے۔ اس لیے کہ آثار الصنادید مرقومہ ۱۸۴۶ع سے بہت پہلے کئی تذکرہ نگار غالب کا تعارف کرا چکے تھے۔ تذکرہ نگاروں کے تراجم سے قطع نظر کئی اور ایسی باتیں ہیں جو غالب کی شاعرانہ شخصیت و عظمت کے متعلق اولین تعارف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی میر تقی میر کی وہ پیشین گوئی ہے جس کا ذکر مولانا حالی نے اس طور پر کیا ہے:

> "جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اردو کا شعر کہنا شروع کیا تھا، قطع نظر اس سے کہ اس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے، اس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی میر نے جو میرزا کے ہم وطن تھے، ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا"۔ (۱)

غالب کا سال پیدایش ۱۲۱۲ھ اور میر تقی میر کا سال وفات ۱۲۲۵ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت میر تقی میر کی نظر سے غالب کے اشعار گزرے ہوں گے یا انھیں سنائے گئے ہوں گے، اس وقت غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ ۱۳/۱۲ سال رہی ہوگی۔ ظاہر ہے ۱۳/۱۲ سالہ لڑکے کے کلام کے متعلق میر تقی میر جیسے عظیم المرتبت شاعر و تذکرہ نگار کی رائے اس وقت خاصی وقیع خیال کی گئی ہوگی اور ادبی حلقوں میں غالب کو روشناس کرانے میں میر تقی میر کے فقروں نے ضرور مدد دی ہوگی۔ بعض حضرات میر تقی میر کی پیشین گوئی کو قرین قیاس نہیں سمجھتے۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مہر نے اس روایت کی صحت سے انکار کرتے ہوئے بطور استدلال ذیل کے چند سوالات اٹھائے ہیں:

> ۱۔ اس کم عمری میں مرزا کا کلام آگرے سے لکھنؤ پہنچا کیسے اور اسے وہاں کون لے گیا اور اس کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی۔

۱۔ یادگار غالب، ص ۱۳۸، شائع کردہ تاج بک ڈپو، لاہور۔

۲۔ میر اپنی عمر کے آخری دو تین برس مختل الحواس رہے اور چونکہ ان کے یہ ایام بہت وارفتگی حواس اور ہجوم امراض میں گزرے اس لیے وہ کوئی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہیں رہے تھے - (۱)

مالک رام نے مولانا غلام رسول مہر کے استدلال کے سلسلے میں لکھا ہے کہ :

'' یہ استدلال بہت کمزور ہے ، یہ کس نے کہا کہ کلام ضرور آگرے گیا ۔ مرزا کے تعلقات نواب احمد بخش خاں کے خاندان سے معلوم ہی ہیں ، وہ سات برس کی عمر سے دہلی آتے جاتے رہے اور ان ایام میں وہ لازماً نواب صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوں گے ۔ نواب صاحب کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش معروف کے گہرے دوستانہ تعلقات مہر صاحب کو بھی تسلیم ہیں ۔ ناسی نے مرزا کا کلام خود مرزا سے لیا یا معروف سے اور اس کی ندرت و غرابت کے پیش نظر اسے لے جا کے لکھنؤ میں اپنے استاد میر کو دکھایا کہ دیکھیے حضرت ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا ایسے شعر کہتا ہے ۔

''پھر میر لاکھ پریشان حال اور وارفتہ اور بیمار رہے ہوں لیکن اتنے بھی نہیں کہ یہ شعر سننے اور ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہ رہے ہوں ۔ وہ کوئی مفصل تنقیدی مضمون تو لکھ نہیں رہے تھے کہ انھیں اپنے خیالات مجتمع کر کے کافی وقت تک یکسوئی اور اطمینان سے ایک جگہ بیٹھنے کی ضرورت ہوتی ۔ انھوں نے ناسی سے کچھ شعر سنے اور اپنی رائے ایک آدھ فقرے میں ظاہر کردی '' ۔ (۲)

مالک رام کی بات دل کو لگتی ہے ۔ اول اس لیے کہ میر تقی میر کی پیشین گوئی کے سلسلے میں مولانا حالی جیسے نیک نفس اور ثقہ بزرگ کے جھوٹ بولنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ دوسرے اس سبب سے کہ غالب فی‌الواقع

۱۔ ' مرزا غالب اور میر تقی میر ' مطبوعہ ماہ نو کراچی ، بابت فروری ۱۹۵۹ء ، ص ۹ ۔ بحوالہ ' ذکر غالب ' ص ۳۲ ۔

۲۔ ذکر غالب ، ص ۳۴ ، مکتبہ جامعہ دہلی ، تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ع

بہت کم عمری سے شعر کہنے لگے تھے اور ان کے کلام نے بہت جلد اعتبار حاصل کرلیا تھا ۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ :

'' مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ ان کی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا ۔ انہوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے ، گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا '' ۔ (۱)

خود مرزا غالب کا بیان ہے کہ :

'' بارہ برس سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں ۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی ، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے '' ۔ (۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ :

'' در دہ سالگی آثار موزونئ طبع پیدائی گرفت ''۔ (۳)

غالب کے مستند محققین نے بھی غالب کے آغاز شاعری کے بارے میں یہی رائے قائم کی ہے ۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ :

'' وہ مولوی محمد معظم کے مکتب میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کردیا ''۔ (۴)

یہی بات انہوں نے دیوان غالب کے دیباچے میں بھی دہرائی ہے ۔ (۵

۱۔ یادگار غالب ، ص ۱۳۶ ۔

۲۔ خط بنام قدر بلگرامی مرقومہ ۱۸۵۷ء

۳۔ کلیات نثر ، پنج آہنگ ، ص ۲۴۹

۴۔ ذکر غالب ، ص ۴۰

۵۔ مقدمہ دیوان غالب ، مرتبہ مالک رام ، ص ۱۰ ، مطبوعہ آز کتاب گھر دہلی ، طبع دوم ۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی بھی مخالف اقوال و بیانات پر بحث کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ :

''ان میں سے راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دس برس کی عمر سے شعر گو تھے کیونکہ کلیات فارسی کا اظہار جو سب سے قدیم ہے ، یہی ثابت کرتا ہے'' ۔ (۱)

ان حقائق کی روشنی میں بارہ تیرہ سال کی عمر میں غالب کے اشعار کا میر تقی میر کے کانوں تک پہنچ جانا اور میر کا انہیں سن کر ایک دو فقروں میں اپنی رائے کا اظہار کر دینا بعید از قیاس نہیں رہ جاتا ۔

میر کی پیشین گوئی سے قطع نظر ایک جامع تقریظ کی صورت میں غالب کا اولین تعارف سرسید احمد خاں نے نہیں بلکہ نواب ضیاالدین خاں نیر و رخشاں نے کرایا ہے ۔ اس نثری تقریظ میں نواب ضیاالدین احمد خاں نے غالب کو ' سر خیل انجمن نکتہ دانان ' قرار دیتے ہوئے ان کی توصیف میں چند اشعار بھی کہے ہیں جو غالب کے کلام پر اولین تنقیدی خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اشعار یہ ہیں :

سخن را از خیالش ارجمندی معانی را ز فکرش سربلندی
صریر خامہ اش بس دل پذیر است بہشتی عندلیباں را صفیر است
سہیں فرزند نہ آبائے علوی ہمیں شاگرد عقل کل عالی
جہاں را بے دریغ آموزگار است کزیں معنی شناس روزگار است
سراسر دفتر شیوہ بیاناں در ایں فن افتخار ہم زباناں
بہ جولاں گاہ معنی یکہ تازے فلاطوں فطرتے حکمت طرازے
بہ کلکش ریزش گنج معانی جواہر آذری در در فشانی
ز صہبائے سخن سرشار گشتہ ورق از فکر او گلزار گشتہ

یہ تقریظ کئی صفحات میں پھیلی ہوئی ہے اور اتفاق سے خود سر سید

۱- دیباچہ دیوان غالب اردو ، نسخہ عرشی ، ص ۱۳ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ، علی گڑھ ، ۱۹۵۸ء ۔

احمد خاں کی تالیف آثار الصنادید میں بھی شامل ہے (۱) لیکن آثار الصنادید میں شامل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ یہ تقریظ غالب کے سلسلے میں سرسید احمد خاں کے بعد لکھی گئی ہے - ایسا نہیں ہے۔ یہ تقریظ آثار الصنادید سے بہت پہلے وجود میں آچکی تھی اور غالب کے اولین دیوان ریختہ کے لیے لکھی گئی تھی ، یہ اردو دیوان ۱۸۴۱ء میں مطبع سیدالاخبار دہلی سے شائع ہوا تھا - مولانا امتیاز علی خاں عرشی رقم طراز ہیں کہ :

"مرزا صاحب کے دیوان کا پہلا مطبوعہ نسخہ مطبع سیدالاخبار دہلی میں چھپ کر شائع ہوا ، یہ مطبع سر سید مرحوم کے بھائی سید محمد خاں بہادر نے دہلی میں قائم کیا تھا اور سید المطابع یا سیدالاخبار کے نام سے مشہور تھا - شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں اس مطبع سے مرزا صاحب کا دیوان چھپ کر شائع ہوا - صولت لائبریری رام پور میں اس اڈیشن کا ایک نسخہ محفوظ ہے"- (۲)

گویا جس مطبع سے ۱۸۴۷ء / ۱۲۶۳ھ میں سر سید احمد خاں کی آثار الصنادید شائع ہوئی ، اسی سے غالب کا اردو دیوان نواب ضیاالدین احمد خاں کی تقریظ کے ساتھ ۱۸۴۱ء/۱۲۵۷ھ میں شائع ہو چکا تھا - لیکن نواب ضیاالدین خاں کی تقریظ ۱۸۴۱ء سے بھی پہلے کی ہے- یہ تقریظ حقیقتہً اس سے تین سال پہلے دیوان اردو کے قلمی مسودے کے لیے لکھی گئی تھی - مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا بیان ہے کہ یہ تقریظ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں لکھی گئی تھی - (۳)

ان امور کی روشنی میں یہ کہنا کہ غالب کا تعارف سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں کرایا ہے، درست نہیں ہے - ضیاالدین احمد خاں کی تقریظ جو کہ آثار الصنادید میں بھی شامل ہے، سر سید کی تحریر

۱- آثار الصنادید ، ص ۱۰۲ تا ۱۶۵ ، مطبوعہ سید الاخبار دہلی به اهتمام سید عبد الغفور بقا ، ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء -

۲- دیباچه دیوان غالب اردو ، نسخه عرشی ، ص ۹۲ ، ۹۳ -

۳- دیباچه دیوان اردو ، نسخه عرشی ، ص ۹۵

سے بہت پہلے کی ہے - لیکن نواب ضیاالدین خان کی تقریظ بھی تعارف غالب کے سلسلے کی پہلی تحریر نہیں ہے ، اس سے پہلے غالب کا ذکر مع انتخاب کلام کئی تذکروں میں ملتا ہے - اس سلسلے میں تین قدیم تذکرے :

۱- عیارالشعرا ، مولفہ خوب چند ذکا

۲- عمدہ' منتخبہ ، مولفہ اعظم‌الدولہ سرور

۳- گلشن بے خار، مولفہ نواب مصطفی خان شیفتہ

خصوصیت سے قابل ذکر ہیں -

جہاں تک گلشن بے خار کا تعلق ہے ، اسے شیفتہ نے آغاز ۱۲۴۸ھ (جون ۱۸۳۲ء) میں شروع کیا اور اواخر ۱۲۵۰ھ (اپریل ۱۸۳۵ء) میں دو سال کی کوشش کے بعد ختم کیا ہے (۱) - گویا گلشن بے خار سر سید احمد خان کی آثار الصنادید سے پورے گیارہ برس پہلے لکھا گیا ہے- اس میں غالب کے متعلق شیفتہ لکھتے ہیں :

" غالب تخلص ، اسم شریفش اسد اللہ خان المشتہر بہ مرزا نوشہ ، از خاندان فخیم است و از روسای قدیم - سابقاً مستقرالخلافت اکبر آباد از استقرارش سرگرم کبر و ناز بود ، اکنون دارالخلافتہ شاھجہان آباد بدیں نسبت غیرت افزائے صفاھان و شیراز - طوطی' بلند پرواز چمن معانی است و بلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی - پیش بلندی خیالش اوج فلک پستی زمین است و در جنب تہ نشینی غورش سرفرازی قارون کرسی نشین - شاھین فکرش جز بشکار عنقا نہ پردازد و اشہب طبعش جز بعرصہ' فلک نتازد - اگر امروز بتلاش متاع نفیس شتابی جز بدکانش در نیابی- سالہا است‌کہ پا بدائرہ' شاعری نہادہ - در اوائل حال بتقاضائے طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن می‌گفت و دقت آفرینی ھا میکرد، آخر الامر ازاں طریقہ اعراض‌کردہ اندازی دیگر مطبوع ابداع نمودہ ، دیوانش را بعد

۱- دیباچہ دستورالفصاحت ، مرتبہ امتیاز علی خان عرشی ، ص ۴۳ ، مطبوعہ ہندوستانی پریس رام پور، ۱۹۴۳ء

ترتیب و تکمیل دیگر نگریست ، فراوان ابیات ازاں حذف و ساقط کردہ قدر قلیلے انتخاب زدہ ۔ مدتہاست کہ بنظم ریختہ سری ندارد ، در زبان فارسی نیز دستگاهی بلند و مایہ وافر بہم رسانیدہ ۔ پایہ اش از فحول استادان کم نیست ۔ غزلش چوں غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چوں قصیدہٴ عرفی دل پذیر ۔ مضامین شعری را کماھوحقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پے می برد و ایں فضیلتی است کہ مخصوص بعض اهل سخن است ۔ اگر طبع سخن شناس داری باہی لکتہ میرسی ۔ چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر ، خوشا حال شخصی کہ از ہر دو شربی یافتہ و حظی ربودہ ، بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شد ، دیدنش ہر چند گاہ گاہ صورت می بندد اما پیوند معنی مستحکم است ، دیوانش بنظر رسید و ایں ابیات ازاں منتخب گردید " ۔ (۱)

اتنا لکھنے کے بعد شیفتہ نے ۱۸۳ اشعار بطور نمونہ کلام درج کیے ھیں ۔ چونکہ سارے اشعار غالب کے متداول دیوان میں شامل ھیں ، اس لیے ان کا اس جگہ نقل کرنا غیر ضروری معلوم ھوتا ھے ۔ صرف پہلا اور آخری شعر نقل کیا جاتا ھے :

کاو کاو سخت جانی ھائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ھے جوئے شیر کا

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ھم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گلشن بے خار غالب کے سلسلے میں یوں اھمیت رکھتا ھے کہ اس کے ذریعے پہلی بار یہ بات سامنے آئی کہ غالب نے اپنے اردو کلام کا بہت سا حصہ حذف کر کے موجودہ دیوان مرتب کیا تھا ۔ گویا نسخہٴ حمیدیہ کا سراغ سب سے پہلے شیفتہ نے دیا ھے ۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے جو کچھ

---

۱ گلشن بے خار ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ، ص ۱۳۹ تا ۱۴۳ ، مطبع نول کشور لکھنو ، ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ع

لکھا ہے انہیں کے حوالے سے لکھا ہے۔ (۱)

عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعرا میں بھی غالب کا ذکر صراحت سے آیا ہے اور یہ دونوں تذکرے گلشن بے خار سے بھی پہلے لکھے گئے ہیں۔ ہر چند کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے کے ہیں اور ان کی تقدیم و تاخیر کی تاریخوں کا تعین آسان نہیں ہے، پھر بھی بعض قرائن عیار الشعرا کو عمدۂ منتخبہ پر مقدم کر دیتے ہیں۔

عمدہ منتخبہ کے آغاز و اختتام پر بحث کرتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء یا ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء کو آغاز تالیف اور ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء کو اختتام تذکرہ کی تاریخ قرار دینا چاہیے۔ (۲) لیکن مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، جلد اول کے مرتبین نے عمدۂ منتخبہ کی بعض داخلی شہادتوں کی مدد سے لکھا ہے کہ :

> " عمدۂ منتخبہ کی تکمیل ۱۲۲۴ھ میں نہیں ہوئی۔ اسے تذکرے کے ابتدائی مسودے کی تکمیل کا سنہ کہہ سکتے ہیں جس کی نقلیں بھولا ناتھ عاشق کے لکھے ہوئے نسخے سے لی گئیں۔ اس میں اضافے ۷، ۸ سال بعد تک ہوئے "۔(۳)

اس کے معنی یہ ہیں کہ عمدۂ منتخبہ ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۳۱ - ۱۲۲۳ھ کے درمیانی عہد میں لکھا گیا ہے۔ عرشی صاحب نے ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء اور ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۲ء کے درمیان کی تالیف بتایا ہے، لیکن ماخذ کا سراغ نہیں دیا۔(۴)

۱۔ طبقات الشعرا، مولفہ فیلن صاحب وکریم الدین، ص ۳۷۷، مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی، ۱۸۴۸ء

۲۔ مقدمہ عمدۂ منتخبہ، مطبوعہ دہلی یونیورسٹی، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، ۱۹۶۱ء

۳۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو، جلد اول، ص ۱۳۸، مطبوعہ انجمن پریس کراچی، ۱۹۶۰ء

۴۔ دیوان غالب اردو، نسخۂ عرشی، ص ۳۸۳

عیار الشعرا کا عہد تصنیف اشپرنگر نے ۱۲۰۸ اور ۱۲۴۷ ہجری کے درمیان متعین کیا ہے۔ (۱)

عرشی صاحب کی تحقیق ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء میں شروع ہوا اور تقریباً ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔ (۲)

ان تاریخوں کی روشنی میں اگر تذکروں کے آغاز کو ملحوظ رکھیں تو عیار الشعرا کو عمدۂ منتخبہ سے مقدم ماننا پڑتا ہے اور اگر ان کے تکملے کی تاریخیں محسوب کریں تو عمدۂ منتخبہ مقدم اور عیار الشعرا موخر ہو جاتا ہے، لیکن عمدۂ منتخبہ میں ذکا کے متعلق لکھا ہے:

"ذکا تخلص، خوب چند نام، قوم کایت، شاگرد میاں نصیر، جوانے سلیم الطبع، مزاحش بہ صلاحیت راغب 'کلامش نمکین' از چندے طبعش از گفتن شعر انحراف ورزیدہ ـ مشار الیہ ہم تذکرۃ الشعرا تالیف کردہ"۔ (۳)

گویا سرور جس وقت اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے، ذکا کا تذکرہ لکھا جا چکا تھا اور ان کے علم میں آچکا تھا۔ اس اعتبار سے عیار الشعرا کو عمدۂ منتخبہ سے مقدم تسلیم کر لینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں تذکرے غالب کے سلسلے میں خاصے اہم ہیں۔ ان کے ذریعے غالب کے بعض ایسے نایاب اشعار سامنے آتے ہیں جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں۔

خوب چند ذکا اپنے تذکرے میں غالب کے متعلق لکھتے ہیں:

"مرزا اسداللہ خان غالب عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب، ولد مرزا عبداللہ خان عرف مرزا دولہ، نبیرہ مرزا غلام حسین کمیدان، ساکن بلدہ اکبر آباد، شاگرد مولوی معظم، شاعر فارسی و ہندی است ازوست:

نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

۱- یادگار شعرا، ص ۷، مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، ۱۹۴۳ء
۲- دیوان غالب اردو، نسخۂ عرشی، ص ۳۹۲
۳- عمدۂ منتخبہ، ص ۳۰۵

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
چاہوں گر سیر چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

صبا لگا وہ طمانچے طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ ایسا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہرو و فا میرے بعد (۱)

غالب کے سلسلے میں ذکا کے ترجمے کی اہمیت یوں ہے کہ مذکورہ بالا دس اشعار میں سے نمبر ۱ ، ۳ ، ۷ اور ۹ ایسے ہیں جو نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ کسی اور مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں ہیں ۔ نسخے کا مسودہ ۱۲۳۷ھ میں مکمل ہوا تھا (۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں اشعار ۱۲۳۷ھ سے

۱- فوٹو اسٹیٹ ص ۴۸۹ تا ۴۹۰ عیارالشعرا قلمی، مخزونہ انڈیا آفس لندن ، مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی ۔

۲- مقدمہ نسخۂ حمیدیہ ۔

قبل کے ہیں - لیکن عیار الشعرا کے اشعار میں نمبر ۴، ۵ ایسے ہیں جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی نظر نہیں آتے - گویا یہ دونوں شعر صرف ذکا کے تذکرے کے ذریعے ہمارے سامنے آئے ہیں - مولانا امتیاز علی خان عرشی(۱) اور مالک رام (۲) نے البتہ اپنے نسخوں میں یہ دونوں شعر شامل کر لیے ہیں -

کم و بیش یہی اہمیت اعظم الدولہ سرور کے بیان اور انتخاب کلام کی ہے - مرزا غالب کا مکمل ترجمہ یہ ہے :

"اسد تخلص، اسداللہ خان، عرف میرزا نوشہ - اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد - جوان قابل و یار باش و درد مند - همیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ - ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن - غم ہائے عشق مجاز (کذا) تربیت یافتہ غمکدۂ نیاز - در فن سخن سنجی متبع محاورات میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمہ و ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند - بالجملہ موجد طرز خودست و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد - اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ بہ مضامین نازک موزوں گشتہ - روبۂ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد - از نتائج طبع اوست :

شمشیر صاف یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیان اشک
لایا ہے لعل بیش بہا کاروان اشک

آنسو کہوں کہ آہ سوار ہوا کہوں
ایسا عنان گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

۱- دیوان غالب اردو، نسخۂ عرشی، ص ۳۹۵

۲- دیوان غالب، مرتبہ مالک رام، ص ۳۲۳ تا ۳۶۴

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکست توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

مجلس شعلہ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامان صبا جاتا ہوں
ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزر گاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے ہے سبک رو کے نہ رہنے سے رہو
کہ بیک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہوگئی سناں پیدا
دہان زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیاز عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثار برق مشت خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بصحرائے ہوس راہ غلط

گلشن میں بندوبست بہ ضبط دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خون زاہد کو مباح اور مال صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوز دل
درد جدائی اسد اللہ خان نہ پوچھ

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موج ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکل طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

پھر جگر کھو دنے لگا ناخن
آمد فصل لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصد نگاہ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم دلال جنس رسوائی
دل خریدار ذوق خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے

دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشر ستان بے قراری ہے

جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہوں
روز بازار جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

کب سنے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلش غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے لوگ
مگر آشفتہ بیانی میری

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

پھر کھلا ہے در عدالت ناز
گرم بازار فوجداری ہے
پھر ہوا ہے جہاں میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
بے قراری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سن کر جاہل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل (۱)

ان ۵۰ اشعار میں سے پندرہ اشعار نمبر ۱، ۲، ۵ تا ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۲۰ اور ۲۲ ایسے ہیں جو نسخۂ عرشی اور نسخۂ مالک رام کے سوا کسی مطبوعہ دیوان حتی کہ نسخۂ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ہیں۔ گویا اگر یہ اشعار سرور کے ذریعے منظر عام پر نہ آجاتے تو ہم ان سے بے خبر ہوتے۔ ان میں سے اشعار نمبر ۱، ۲، ۵، ۷، ۱۰، ۱۲، ۱۵، ۱۶ اور ۲۲ پہلی بار دیوان غالب اردو نسخۂ عرشی میں شامل کیے گئے ہیں (۲) لیکن چھ اشعار یعنی نمبر ۶، ۸، ۹، ۱۱، ۱۳ اور ۲۰ نسخۂ عرشی میں بھی شامل نہیں ہیں۔ دیوان غالب مرتبہ مالک رام میں البتہ ان میں سے پانچ اشعار شامل کرلیے گئے ہیں (۳) لیکن شعر نمبر ۲۰ اس میں بھی نہیں ہے۔ عمدۂ منتخبہ کے کچھ اشعار ایسے ہیں جو عام مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہیں۔ مثلاً شعر نمبر ۳، ۴، ۱۹ صرف نسخۂ حمیدیہ کی زینت ہیں (۴)۔ عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعرا میں غالب کے جن نایاب اشعا

۱- عمدۂ منتخبہ، ص ۱۱۶ تا ۱۲۰، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی مطبوعہ دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء

۲- دیوان غالب اردو، نسخہ عرشی، ص ۳۰۱- ۳۰۴- ۲۹۷- ۲۹۵- ۳۰۵

۳- دیوان غالب مرتبہ مالک رام، ص ۲۸۵ - ۲۸۶ - ۲۹۳ - ۲۹۴ - ۳۲۲، ۳۲۳، مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۰ء

۴- نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۵۶ - ۱۱۱ - ۹۷، مطبوعہ بھوپال۔

کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ، ہر چند کہ وہ علیگڑھ میگزین (غالب نمبر) ستمبر ۱۹۴۹ء ۱۹۴۸ء مرتبہ مختار الدین احمد آرزو کے ص ۱۰۳ پر بھی شایع ہو چکے ہیں اور مالک رام اور عرشی صاحب نے اس سے یہ اشعار لیے ہیں ، لیکن شعر نمبر ۲۰ میگزین میں بھی نہیں ہے ،گویا اب تک اس کا ماخذ صرف عمدۂ منتخبہ ہے ۔

اعظم الدولہ سرور خوب چند ذکا اور شیفتہ کے یہ تراجم جن کی تفصیل اوپر دی گئی ہے ، سرسید کی کتاب آثارالصنادید سے بہت پہلے کے ہیں ۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی ۔ ان کے علاوہ بھی کئی تذکرے ہیں جن میں غالب کا ذکر آثار الصنادید سے پہلے آچکا ہے ۔ مثلاً گلدستہ نازنیناں کو لیجیے ، یہ کریم الدین کا تذکرہ ہے جو ۱۸۴۴ء میں مکمل ہوا ۔ خود کریم الدین نے دیباچے میں لکھا ہے :

> '' ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ مطابق دسمبر ۱۸۴۴ء میں اتمام ہوا اور ماہ صفر ۱۲۶۱ھ ہجری مطابق ماہ فروری ۱۸۴۵ء میں چھپنا شروع ہو گیا اور نام گلدستہ نازنیناں رکھا گیا '' ۔ (۱)

اس تذکرے میں غالب کا ذکر اس طور پر آیا ہے :

''اسد تخلص ، اسم شریف ان کا نواب اسداللہ خان بہادر ، معروف بمرزا نوشہ ، خاندان فخیم اور روسائے قدیم اکبرآباد نیک بنیاد کے ، مدت سے وارد شاہ جہان آباد خجستہ نہاد کے ہیں ۔ ادیب و لبیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی ان کی کے حضیض جہل کا مبتلا مشہور ، سخن فہم و سخن دان اس پائے پر کہ متنبی و کعب باوجود متنبا اور بلند پایگی کے مانند بچوں گھٹنوں چلنے والوں کے ان کے حضور ۔ اشعار عاشقانہ اور مضامین آزادانہ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری ۔ مرجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک دہ عبارات ظہوری ۔ خوان یغما اس کے سے انوری ایک ادنیٰ زلہ ربا ، خاقانی بجاروب کشی مستعد بسروپا ۔ فیضی سے کیونکر لوگ فیض کو نہ پہنچیں جب کہ وہ اس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا ۔ صاحب دیوان و تصانیف ہیں ۔ مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا ۔ مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصانیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا ۔ اسی سے چند

۱- دیباچہ گلدستہ نازنیناں ، مطبوعہ ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء طبع اول ۔

اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ھذا کے کیے گئے ۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالت صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ھیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص لکھتے ھیں، چنانکہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالب طبع میں آچکا ھے ، اس لیے اب فکر اشعار اردو کا نہیں کرتے "۔ (۱)

یہ تذکرہ دو وجوہ سے غالب کے سلسلے میں اھمیت رکھتا ھے۔ اول اس لیے کہ اس سے پہلے کسی اور تذکرے میں کلام غالب کا اتنا طویل انتخاب نہیں ملتا ۔ کریم الدین نے اس میں غالب کی گیارہ بارہ غزلیں نقل کی ھیں جو سو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ھیں ۔ چونکہ یہ سارے اشعار غالب کے متداول دیوان میں موجود ھیں ، اس لیے ان کے نقل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ دوسری اھمیت یہ ھے کہ اس تذکرے کے ذریعے غالب کی ایک ایسی غزل کا سراغ لگتا ھے جو ان کے کسی مطبوعہ دیوان حتیٰ کہ نسخۂ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ھے۔ غزل یہ ھے :

اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں
ھے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باھر
میں بھی ھوں محرم اسرار کہوں یا نہ کہوں
شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ھستی سے ھوں بیزار ، کہوں یا نہ کہوں
اپنے دل ھی سے میں احوال گرفتاریٔ دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار کہوں یا نہ کہوں
دل کے ھاتوں سے کہ ھے دشمن جانی میرا
ھوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں
میں تو دیوانہ ھوں اور ایک جہاں ھے غماز
گوش ھیں در پس دیوار کہوں یا نہ کہوں

۱۔ گلدستۂ نازنیناں ، کریم الدین ، ص ۲۱۵ تا ۲۲۲ ، مطبع سلطانی دھلی ۱۸۴۵ء ۔

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

الٰہی بخش معروف نے غالب کی اس غزل پر خمسہ کہا ہے اور یہ خمسہ معروف کے ترجمے کے ذیل میں درج کیا گیا ہے (۱)۔ نسخہ عرشی (۲) میں یہ غزل دیوان معروف کے حوالے سے اور نسخہ' مالک رام (۳) میں دیوان معروف و گلدستہ' ناز نینان کے حوالے سے شامل کی گئی ہے ۔ معروف کے مطبوعہ دیوان میں بھی مذکورہ بالا خمسہ موجود ہے (۴) لیکن یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ غزل مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب کی ہے ۔ اول اس لیے کہ معنی اور اسلوب دونوں لحاظ سے غالب کے رنگ سے بالکل الگ ہے ۔ دوسرے یہ کہ مخمس کے سوا اس غزل کی تصدیق کسی اور ماخذ سے نہیں ہوتی ۔ نسخہ' حمیدیہ بھی اس سلسلے میں خاموش ہے ۔ کیا عجب کہ یہ غزل سید الملک نواب اسداللہ خان یا اسد تخلص کے کسی اور شاعر کی ہو ۔ اس خیال کو یوں تقویت پہنچتی ہے کہ اردو میں اسد اور غالب تخلص کے متعدد شعرا گزرے ہیں اور ان کی غزلوں کو غلطی سے مرزا نوشہ اسداللہ خان غالب سے منسوب کردیا گیا ہے ۔ (۵)

گلدستہ' نازنینان کے ساتھ قطب الدین باطن کے تذکرے کا ذکر بھی اس جگہ ضروری ہے ۔ ' گلستان بے خزاں ' کا تاریخی نام ' نغمہ' عندلیب ' ہے جس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۶۴ھ نکلتا ہے ۔ غالباً یہ سال آغاز ہے ۔ حقیقتاً یہ تذکرہ ۱۲۶۵ھ میں مکمل ہوا ہے جیسا کہ خود باطن نے دیباچے میں لکھا ہے ۔ (۶)

۱۔ گلدستہ نازنینان ، ص ۱۹۱ ، مطبع سلطانی دھلی ۱۸۴۵ء

۲۔ دیوان غالب اردو ، نسخہ' عرشی ، ص ۲۹۸ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ھند ، طبع اول ۱۹۵۸ء

۳۔ دیوان غالب اردو ، ص ۲۸۳ ، مطبوعہ آزاد کتاب گھر دھلی

۴۔ دیوان معروف ، ص ۱۶۱ ، مطبع نظامی بدایون ، ۱۹۳۵ء

۵۔ علیگڑھ میگزین ، غالب نمبر ، ص ۹۶ ، مرتبہ مختار الدین احمد آرزو ، بابت ۴۸ - ۱۹۴۹ء

۶۔ نگار پاکستان ، ۱۹۶۴ء ، تذکروں کا تذکرہ نمبر ، ص ۷۷ ، مرتبہ راقم الحروف ۔

یہ تذکرہ' در اصل گلشن بے خار کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ چنانچ
باطن نے اپنے دیباچے میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ پر خاصی لعن طعن کی ہے
شیفتہ سے باطن کی مخاصمت کا اصل سبب یہ تھا کہ شیفتہ نے گلشن بے خا
میں باطن کے استاد نظیر اکبر آبادی کے متعلق لکھ دیا تھا کہ ان کے جو
اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں ، ان اشعار کی بنا پر نظیر شاعرو
میں شمار ہونے کے لائق نہیں - (۱)

باطن نے اپنے تذکرے میں اس کا انتقام لیا اور شیفتہ کے استاد او
مومن حین کو جی کھول کر برا بھلا کہا - شیفتہ نے مومن و آزردہ کی
بڑی تعریفیں کی تھیں - باطن نے دونوں کے کلام میں کیڑے نکالے - چنانچ
اس سلسلے میں غالب بھی ان کے طعن و تعریض کا نشانہ بنے -

باطن کا بیان خاصا دلچسپ ہے اور غالب کے کلام اور شخصیت ؛
جائز و ناجائز ، بہرحال اولین تنقیدی تحریر کی حیثیت رکھتا ہے :

''غالب و اسد تخلص ، اسداللہ خان نام ملقب بمرزا نوشہ - آپ دو تخلص
کرتے ہیں کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں - از لبا
غلام حسین کمیدان - قبل اس سے جد دھلی [آگرہ] میں ان کی سکونت کا مکان
استاد ان با شعور کے مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی شعر
[نظیر] جو بے نظیر روزگار تھے ، جن سے تعلیم پائی - ایام صبا سے ببرکت انفا
متبرکہ ان استادوں کے بمرتبہ علم پہنچے - تب ان کی فکر رسا نے یہ صور
دکھائی - کیوں نہ خوش گو ہوں جن کے ایسے استاد دو ہوں - متانت فحوا
کلام میں لا کلام ، کلام سے بنیاد سخن کو استحکام ، چوانکہ وہ استاد مر گئے
یہ جد دھلی سے ادھر گئے - اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقر
کریں - ہاں خود استاد ہیں ، مرغان مضامین کے صیاد ہیں - ہاں ان کا فرا
حوصلہ ہے ، پھر تبختر کا کیا گلہ ہے - گو فارسی میں متین ہیں ، پر اردو میں
تو ذوق ہی نکتہ چین ہیں - اب بعد وفات ذوق ان کو شاعری میں کمال ہو
کلام ان کا سحر حلال ہو ، مگر زمانہ خالی نہیں کیا اور کسی کی طبیعت عا
نہیں - غالباً جو کسی سے مقابلہ ہو تو حاکمان محکمہ شعر کے روبرو معاملہ ہو
بندے کے والد مرحوم سے کمال ملاقات تھی اور از حد اتحاد کی بات تھی

۱- گلشن بے خار ، ص ۲۳۱ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ، ۱۹۱۰ء

انتخاب زبان میں یکہ دوراں ہیں - جس طرف طبیعت آئی، اسی کی خاک اڑائی - چنانچہ دختر رز سے جو تاک لگائی تو وہ ظرف پیدا کیا کہ مینائے گردوں میں شراب شفق قاضی آفتاب بادب پوش کش لایا اور خمار بازی پر جو دھیان کیا تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ میر بساط اور بکھڑے داؤں کھانے لگے - ایسا کمال پایا ، شعر کم قدر ان کا کبھی کسی کی زبان سے نہ سنا ، نہ اپنی آنکھ سے دیکھا - لفاظی اور جودت زبان فیض ترجمان سے عیاں ہے ، کلام شیریں وصف سرمہ چشم فرہاد میں ، جس نے سنا حلاوت سخن اور گلوگیری سرمہ سے یارائے صفت شعر نہ رہا ، گویا کہ وقت امتحان ہے - کثرت غدوبت سے ہونٹ چپک گئے - سرمے کی خاصیت سے زبان سیہ گو لال ہوئی ، عدو تھک گئے - جو شخص ان کے کلام سے بہرہ ور ہوا ، بے ساختہ آفرین اور سبحان اللہ اس کی زبان پر ہوا - چونکہ یارائے کام و دہان نہیں کہ منزل وصف میں قدم سر کرے ، لہذا راقم لجام توسن سبک تگ کلک سوئے بادیہ مطلب پر کرے - اب یہ دہلی والے ہیں اور بڑے ارادے والے ہیں - شاید قدیم کی نظم و نثر کو خفیف جانتے ہیں - غرور کی راہ چاہیں ، سو فرمائیں ، پر دل میں تو ان کا لوہا مانتے ہیں - دہلی والے صاحب کسی کو اپنے روبرو خاطر میں نہیں لاتے - مارے خودی و تبختر کے جی میں پھولے نہیں سماتے ، پر جب کسی سے مقابلہ ہو تو دم بھر میں فیصلہ ہو -

"ان کو شراب و کباب چاہیے - خلاف شرع کا بے حساب چاہیے - روزے کے نام سے انھیں کیا کام ، نماز کو ان کا ہر دم سلام - اصحاب تذکرہ کی تحریر دیکھی اور ان کی تقریر دیکھی ، کیا غرور ہیں ، اپنے نزدیک کتنے دور ہیں ، یاران ہم صحبت ان سے زیادہ غرور میں چور ہیں ،گویا ان کے یار خوشامد کے مزدور ہیں - دہلی والے صاحبوں کے تذکرے جو عبارت رکھتے ہیں ، متاع خیریت شعرائے ماضی و حال و مصنف کو غارت رکھتے ہیں - ہیں ہیں باطن کدھر گیا - جوش میں بھر گیا - خبر دار ہوشیار ان کے اسد فکر کا نخچیر مضمون پر غلبہ ہے ، خمسہ ان کا شعر کا پنجہ ہے ، دیوان فارسی ضخیم ہے مگر اردو کا دیوان مانند آمد نامہ قلیل و قدیم ہے - اسد فکر نیستان کاغذ میں ڈکارتا ہے - روباہ مضامین کو نا حق جان سے مارتا ہے" (۱)

۱- گلستان بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب ص ۱۷۱ تا ۱۷۳ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء

باطن نے نمونۂ کلام میں ذیل کے چودہ اشعار درج کیے ہیں :

یار غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

جراحت تحفہ الماس ارمغان داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غم خوار جان درد مند آیا

کاوے کاوے سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہوجائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

اسد زندانیٔ تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں
خم دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (۱)

تذکرۂ بہار بے خزاں (مولفہ احمد حسن سحر) میں بھی اسد تخلص کے ساتھ غالب کا ذکر آیا ہے ۔ افسوس کہ اس کے تراجم اس وقت ہماری دسترس سے باہر ہیں ۔ یہ تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے ، اس کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ یہ نسخہ مولوی عبدالحی مولف ' گل رعنا ' کی ملکیت تھا ، جسے ان کے بیٹے مولانا عبدالعلی ندوی نے کتب خانے کو دے دیا تھا ۔ فہرست کتب میں اس کا نمبر ۳۳۴ ہے ۔ اس کے ساتھ مصنف کا دوسرا تذکرہ ' طور معنی ' بھی مجلد ہے ۔ اس تذکرے میں دیے ہوئے ایک قطعۂ تاریخ سے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۶۱ھ نکلتا ہے ۔

مذکورہ بالا تراجم اور مباحث سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آثار الصنادید مولفہ سر سید احمد خان سے بہت پہلے غالب کا ذکر ایک دو جگہ نہیں بلکہ متعدد تذکروں میں آ چکا ہے ۔ چنانچہ غالب کے اولین تعارف نگاروں میں سر سید نہیں بلکہ جیسا کہ اوپر صراحت کی گئی ہے ، علی الترتیب میر تقی میر ، خوب چند ذکا ، اعظم الدولہ سرور ، مصطفی خان شیفتہ ، نواب ضیاالدین احمد خان نیر و رخشاں ، کریم الدین ، قطب الدین باطن اور احمد حسین سحر وغیرہ کے نام آتے ہیں ۔ غالب کے سلسلے میں مختلف تذکرہ نگاروں کے تراجم اور سر سید کے ترجمے کی تاریخوں کی چھان بین کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ اور کئی تراجم سر سید کے ترجمے سے مقدم قرار پائیں ۔

غالب کے بارے میں آثار الصنادید کا ترجمہ اس لحاظ سے البتہ نہایت

۱۔ گلستان بے خزاں معروف بہ " نغمۂ عندلیب' ص ۱۷۳ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ، ۱۲۹۱ھ

وقیع اور اہم ہے کہ یہ انیسویں صدی عیسوی کے ممتاز ترین ادیب اور مرزا غالب کے ایک معاصر دوست کا لکھا ہوا ہے ۔ لیکن افسوس کہ سر سید کا بیان غالب کے سلسلے میں یکسر رسمی ہے اور اس میں غالب کی زندگی یا کلام کے بارے میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کی کسی معاصر تذکرہ نگار سے توقع کی جاتی ہے ۔

غالب اور سبک ہندی

لطیف اللہ

غالب کا ادبی عقیدہ تھا کہ ہندی نژاد فارسی شعرا و نثر نگار ایرانی نژاد شاعروں اور ادیبوں کے ہمسر اور ہم پلا نہیں بن سکتے ۔ ان کے ذہن میں اس کی وجہ یہ تھی کہ اول الذکر صرف زبان دان ہیں جب کہ موخرالذکر اہل زبان ہیں ، ہندیوں نے کتابی فارسی پڑھی ہے اور ایرانیوں کے گوشت پوست میں فارسی زبان رچی بسی ہوئی ہے ، لہذا ہمسری و ہمتائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اپنے بارے میں ان کا خیال تھا کہ فارسی سے ان کی طبیعت کو ایسے ہی تعلق تھا جیسے فولاد میں جوہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے متعدد خطوط میں اس ادبی عقیدے اور فارسی سے مناسبت طبعی کا ذکر کیا ہے۔ ' قاطع برہان ' کی اشاعت کے بعد سے ان کے عقیدے اور دعوے میں زیادہ شدت پیدا ہوگئی تھی ۔ چنانچہ مرزا رحیم بیگ مولف " ساطع برہان " کو تحریر کرتے ہیں :

" اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے ، میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد اور پارسی زبان ہے :

ہر چہ از دست گہہ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

زبان دانی فارسی میری ازلی دست گاہ اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے ۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے ۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوشگو اور معنی یاب ہیں لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ

دعوئ زبان دانی کے باب میں ؟ رہے فرہنگ لکھنے والے ، خدا ان کے پیچ سے نکالے ' اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے ۔ وہ بھی نہ کوئی ہم قدم نہ همراہ ، بلکہ سو بسو پراگندہ و تباہ ۔ رہنما ہو تو راہ بتائے ، استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے ۔ نہ آپ شیرازی نہ استاد اصفہانی ، زہے گردن و خہے دعوئ زبان دانی ''۔

(خطوط غالب از مہر ، ص ٦١٦)

زیر نظر مضمون میں غالب کے اس عقیدے اور دعوے کا مطالعہ کیا گیا ہے کہ وہ کس حد تک ان امور میں حق بجانب تھے اور اگر نہیں تو ان کی فارسی شاعری اور نثر کو بہ اعتبار زبان اور اسلوب کیا مقام دیا جا سکتا ہے ۔

جہاں تک اہل زبان اور زبان دان کے مسئلے کا تعلق ہے ، اس کا ایک پہلو خالص جذباتی نوعیت کا ہے ، جس کی اساس کسی علمی یا اصولی استنباط پر نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اس کی بنا وہ قومی عصبیت ہے جس کا اظہار وطن پرستی اور قوم پرستی کے جذبے کے زیر اثر ہوتا رہتا ہے ۔ چونکہ اس رجحان کی بنیاد استدلال ، معقولیت اور علمی اصول پر نہیں ہوتی ، اس پر بحث کرنا تحصیل حاصل ہے ۔ دوسرا پہلو واقعتہً علمی نوعیت رکھتا ہے اور اس پر علمی انداز میں گفتگو کی جا سکتی ہے ۔

اصولی طور پر یہ امر کسی تکلف و تذبذب کے بغیر تسلیم کیا جاتا ہے کہ کسی خاص ملک کے باشندے اس ملک کی زبان کے رموز و غوامض سے جس قدر آگاہ ہوتے ہیں اور اس زبان کے لغات کا استعمال جس قدر صحت کے ساتھ کرتے ہیں ، دوسرے ملک کے باشندے ان خصوصیات کے حامل نہیں ہوتے ۔ یہی وہ فرق ہے جو اہل زبان اور غیر اہل زبان میں ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل زبان کی تحریر و تقریر میں سادگی ، آمد اور حلاوت ہوتی ہے ۔ زبان کے بارے میں ان کا علم داخلی ہوتا ہے ، خارجی نہیں ہوتا ۔ اس کے برعکس غیر اہل زبان یعنی زبان دان کی تحریر و تقریر میں وہ خصوصیات نہیں ہوتیں جس کے باعث اسے مافی الضمیر بیان کرنے میں لا محالہ تصنع اور تکلف سے کام لینا پڑتا ہے اور زبان کے استعمال میں اس سے اصولی غلطیاں سر زد ہو جاتی ہیں ۔

اس خصوص میں غالب کے عقیدے کی بنیاد اصولی بھی ہے اور جذباتی بھی ۔

جذباتی رجحان میں شدت کا اظہار "قاطع برہان" پر اعتراضات کے بعد بار بار ہوا ہے اور اس رد عمل سے مترشح ہوتا کہ وہ اس مسئلے میں اہل ایران کی قومی عصبیت سے بڑی حد تک متاثر ہوے اور ان ارباب قلم کی ہمنوائی کرتے رہے جنھوں نے برصغیر کے فارسی شعرا اور ادیبوں کو ایرانی شعرا اور ادیبوں سے کم تر خیال کیا ہے - لیکن اصولی غور و فکر کے با وصف انھوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ برصغیر میں فارسی زبان کا چلن زبان اول کی حیثیت سے رہا ہے - صدیوں تک یہاں فارسی زبان میں درس و تدریس، تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا اور اس عرصے میں کوئی قرن ایسا نہیں گزرا جب ایران سے اہل سخن اور ارباب فضل و کمال کا برصغیر میں ورود، مسدود ہوگیا ہو - یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہزاروں خاندان اپنی آبائی زبان اور خاندانی روایات کے ساتھ دیار فارس سے وارد ہند ہوئے اور یہاں کی ادبی اور تہذیبی زندگی پر اثر انداز ہوئے - زندگی کے انھی شعبوں میں فارسی شعر و ادب، فارسی کی تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف کے شعبے بھی شامل ہیں - اگر اس سماجی عمل کی گہرائی اور گیرائی کا مکمل غور و فکر کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو برصغیر میں فارسی زبان کا مسئلہ اس نوعیت کا مسئلہ نہیں رہتا کہ ایک خاص ملک کا باشندہ دوسرے ملک کی زبان کا علم حاصل کرنے کے باوجود زبان دان ہی رہتا ہے - اگر یہ حقیقت صرف اس حد تک ہوتی تو برصغیر کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کا ہیولا قطعی طور پر بدلا ہوا ہوتا، لیکن اصل حقیقت اس صورت حال سے یکسر مختلف ہے -

برصغیر ہند و پاک کی عملی و فکری تاریخ کا یہ بھی ایک روشن پہلو ہے کہ یہاں کے ارباب علم و فضل میں سے بیشتر کی زبان فارسی تھی جو انھیں نسلاً بعد نسل ورثے میں ملی تھی - ان کی مجلسی زندگی میں تحریر و تقریر کی زبان بھی یہی تھی - اردو کی حقیقی نشو و ارتقا سے قبل فارسی ہی زبان اول کی حیثیت سے رائج تھی - یہاں کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم بھی وہی تھا جو صدیوں تک خراسان اور فارس کے مکاتب میں رائج رہا - ان حالات کے پیش نظر برصغیر میں فارسی زبان کا صحیح ذوق و وجدان پیدا ہوجانا ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے محالات عقلی میں شامل کیا جائے - اس اعتبار سے ہندی نژاد فارسی شعرا اور ادیبوں کے باب میں غالب کا یکسر منفی نقطۂ نظر زیادہ غور و فکر پر مبنی نہیں ہے - اصول کی حد تک اس خصوص

میں ایک نوع کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

ملک الشعرا محمد تقی بہار نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے ، وہ فرماتے ہیں :

'' بنا بریں در دهلی دربار بزرگ تر می شد که باید آن را دربار ثانی ایران نامید بلکه دربار اصلی ایران چه رواج فارسی زبان و ادبیات و علوم ، در دربار دهلی زیاده از دربار اصفهان بوده است و ظاهراً که در دربار اصفهان پادشاه و خاصان درگاه بزبان ترکی صحبت می فرموده اند ۔ ولی در دربار دهلی شاه دربار و حرم سرائیان همه به فارسی گفتگو می کرده اند و در آن عهد زبان فارسی در هند زبان علمی و زبان مترقی و دلیل شرافت و فضل محسوب می شد و دربار اصفهان هرگز زبان فارسی این اهمیت را پیدا نه کرد ''۔

(سبک شناسی ، جلد سوم ، ص ۲۵۷)

ملک الشعرا بہار کی یہ رائے واضح اور ہر قسم کے ابہام سے معرا ہے ۔ اس قطعی رائے کے پیش نظر پاک و ہند میں فارسی زبان کی حیثیت سے متعلق بہت سے پہلو واضح ہوجاتے ہیں ۔ ہر چند کہ بہار نے پاک و ہند کے اہل علم و دانش کو زبان فارسی کا عیار کامل قرار نہیں دیا ہے ، تاہم بین السطور میں اس ذوق و وجدان کا حال معلوم ہوجاتا ہے جو پاک و ہند کے ارباب علم میں پیدا ہوگیا تھا ۔ اور اگر ذوق و وجدان زبان کے باب میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے تو غالب کا یہ ادبی عقیدہ کہ ہندی نژاد شعرا و نثر نگار (بہ استثنائے خسرو) پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں ، تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی تفہیم کے لیے معقول وجوہ درکار ہوں گی ۔

غالب نے یہ کہہ کر کہ ,, بندہ ہندی مولد اور پارسی زبان ہے ،، بہت بڑا دعوا کیا ہے اور اگرچہ انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اپنی نظم و نثر کے متعدد شاہکار پیش کیے ہیں یا ہیں ہمہ اہل زبان نے خواہ وہ عصر رفتہ میں پیدا ہوئے ہوں یا عصر حاضر میں موجود ہوں ، ان کے '' ہندی مولد اور پارسی زبان '' ہونے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے ۔ یہ نا پرسیٔ ہنر غالب ہی پر موقوف نہیں بلکہ اہل زبان کی نظر میں برصغیر کے کسی بھی سخن ور اور ادیب کو جائے اعتبار حاصل نہ ہوسکی ۔ البتہ عہد حاضر میں تجدید روابط کے بعد دانشوران ایران نے اقبال کے فکر و فن کی ضرور پذیرائی کی

ہے لیکن خسرو ، فیضی ، بیدل ، مظہر جان جاناں اور غالب نمایاں طور پر تحسین کے مرحلے میں نہیں آئے ہیں ۔ مولانا شبلی نعمانی نے ' شعرالعجم ' میں امیر خسرو سے متعلق ایک ایرانی شاعر عبید کا شعر نقل کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر کے یگانۂ روزگار اہل کمال عرض ہنر کے باب میں کس قدر سوختہ اختر تھے :

غلط افتاد خسرو راز خامی کہ سکباپخت در دیگ نظامی

حالانکہ ملا عبدالرحمان جامی نے ' بہارستان ' میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا - (شعرالعجم ، حصہ دوم ، ص ۱۲۸ ، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ، ۱۹۴۷ء)

اس عصبیت کی تازہ ترین مثال دیوان امیر خسرو میں ہے جو حال ہی میں ایران سے شایع ہوا ہے اور جس میں فاضل مقالہ نگار نے '' یکے از بزرگ ترین شعرائے فارسی '' کے بجائے '' یکے از بزرگ ترین شعرائے فارسی ہند '' لکھا ہے۔

فیضی اپنی شاعرانہ استعداد اور خلاقانہ صلاحیت کے اعتبار سے فارسی شعرا میں اہم مقام رکھتا ہے ۔ اس کے قصائد و غزلیات حکیمانہ مضامین کے ساتھ ساتھ اپنا ایک خاص آہنگ اور لب و لہجہ رکھتے ہیں لیکن جلا لائے طبا طبائی نے عہد شاہجہانی کے مشہور ادبی نزاع سے متعلق فیضی کا جو خاکہ اڑایا ہے ، وہ اس تعصب کو قطعی طور پر نمایاں کردیتا ہے جو اہل زبان کو غیر اہل زبان سے ہوتا ہے ۔ یہ خط جلالائے طباطبائی نے شیدا سیکروی کو تحریر کیا ہے جس نے حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے کلام پر بعض اعتراضات کیے تھے ۔ غالب نے اردو خطوط میں دو جگہ (مرزا رحیم بیگ اور چودھری عبدالغفور سرور کے نام) اس خط کا حوالہ دیا ہے۔

طباطبائی کے خط سے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

'' اے مدعی ! پارےاین قدردریافت خود باید داشت کہ بر گفتۂ خرد منداں دلیرانہ گرفت کردن بے خردی است ۔ و در سخن بزرگاں بے تامل سخن کردن کودک منشی و خردی ۔ سامری گردیدن کلیم کلاماں سروش سرشت کہ ید بیضا از جیب دوات و آستین قلم بر می آرند ، دلیل گو سالگی است ۔

'' این لہجہ دری از زبان پارسی ست ۔ از افواہ پارسی داناں

باید آموخت و چراغ سخن دانی از مشکواۃ اندیشہ' اینان باید افروخت - از مطالعہ فرہنگ ھا تنہا فارسی زبان نہ توان شد - و از تتبع دواوین قدما از پیش قدمان ایں وادی نہ توان گشت - ظاھرا دریں معنی پیروی' یکے از سیاہ باطنان بوالفضول ایں تیرہ مغاک نمودہ ، بہ زبان دھی و سر بزرگی' دنیا با استادان سخن و امام الائمہ ایں فن مولانا عرفی شیرازی می گفتہ کہ ' ملا ما پارسی زبان از انوری و خاقانی آموختہ ایم و شما از پیر زالان مسکین ' و ندانستہ کہ انوری و خاقانی نیز از اینان سخن آموزی کردہ اند ' -

(دربار ملی ، مرتبہ شیخ اکرام ، ص ۲۸۵ - ۲۸۴)

اصولی طور پر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان سے متعلق فیصلوں میں اہل زبان کو معیار تسلیم کیا جائے گا اور ان کا فرمودہ مستند بھی ھوگا لیکن فیصلے کی صحت اس امر پر موقوف ھوگی کہ حکم متعصبانہ جذبات کی گرفت سے آزاد ھو اور یک طرفہ فیصلہ کرنے میں بے باک نہ ھو -

اس امر کے قرائن موجود ھیں کہ ایران کے دانشوروں اور سخنوروں نے پاک و ھند کے فارسی شعرا اور نثر نگاروں کو وہ مقام نہیں دیا جس کے در حقیقت وہ مستحق تھے ، اور یہ انداز نظر اس حد تک بڑھتا گیا کہ دیار ھند کی فارسی نظم و نثر ایران کی فارسی نظم و نثر سے علاحدہ سمجھی گئی اور اسے ایسے خانے میں رکھا گیا جہاں تحسین کی نگاہ اور پسندیدگی کی نظر ڈالی ھی نہ جا سکے - حضرت امیر خسرو اور فیضی سے متعلق دو مثالیں نظر سے گزر چکی ھیں ، خود غالب کے باب میں ایک شیرازی صاحب کا جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے سفر حج میں ھمسفر تھے اور جنھیں نواب موصوف نے غالب کا فارسی دیوان مطالعے کے لیے دیا تھا ، یہ خیال تھا :

" دریں خرافات اوقات ضائع نہ کنیم - ما نمی دانیم کہ در کدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است "- (۱)

جیسا کہ عرض کیا گیا ابتدا ھی سے اس مسئلے میں نمایاں تعصب کارفرما رھا ھے اور اسی سبب سے بر صغیر کی فارسی نظم و نثر کے طرز اسلوب کو ' سبک ھندی ' کہا جانے لگا - ملک الشعرا بہار اور ڈاکٹر رضا زادہ شفق

۱- محمد حسین آزاد ، حیات اور تصانیف ، ڈاکٹر اسلم فرخی ، ص ۳۰۴

نے سبک ہندی کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ، وہ من و عن پیش کی جاتی ہیں ۔ بہار نثر ہائے ہندی کے زیر عنوان لکھتے ہیں :

" این بوده حالت نثر در ایران و بعینه همین بود حالت نثر در هندوستان ۔ جز این که فضلا و علمائے هندی در اظهار فضیلت زیاد تر از منشیان و نویسندگان ایران می کوشیده اند ۔ در مناشیر و مکاتیبے که رجال هند به رجال ایران نوشته اند و در سفینه ها یافت می شود معلوم است که نویسندۂ مقیم هند بیشتر می خواهد ، اظهار فضل کند و کمتر مطلب بیان کردنی دارد ۔ یا اگر دارد بجائے این که حرفے خود را نویسد از در و دیوار صحبت داشته و کلماتے مناسب فضل فروشی خود بدست آورده است نه مناسب مطلبے که باید نویسد ۔ همین حالت را در شعر هندی می بینیم و به جز صائب که گاہے از واقعات سخن می گوید باقی شعرا مخصوصاً متاخران از قبیل بیدل و غنی مقصد شان آوردن عباراتے است که با صنعت و مضمون جو بیاید نه با مقصودے که دارند و غالباً مقصودے هم نه داشته اند " ۔

(سبک شناسی ، جلد سوم ، ص ۲۰۹)

ڈاکٹر رضا زادہ شفق تحریر فرماتے ہیں :

" سبک غیر طبیعی دورۂ مغول در زمان صفویه به نهایت انحطاط رسید ۔ استعمال ترکیبات غریب و کلمات نامانوس و جناس ہائے تو در تو و نکته گوئی ها مرعج و نازک کاری و مضمون آفرینی و معانی پیچیده باریک بیشتر رائج گشت ۔ مخصوصاً شعرائے مقیم هند در این طرز افراط کردند و در نتیجه سبک متکلف مضمون پرست مصنوعی بمیان آمد که آں را برخے سبک هندی می نامند ۔ ولے سبک هندی در مقابل این افراط هنر نمائی هم کرد و اکثر مضامین پیچیده مصنوعی مبالغه دارند ۔ مانند بیتے که در ذیل می آید ، ایجاد نمود مضامین لطیف دل نوازے هم نظیر مثال ہائے که در ذکر صائب و معاصرینش دریں کتاب آروده شد بوجود آورد ۔ مثلاً در این بیت که نمونه ایست از سبک مذکور ۔

شمع را بر سر نمی دانم هوائے روئے کیست
بوئے گل می آید از دود پر پروانه هم

محبوب به قدرے گل اندام است که تنها ہوائے او در سر شمع آں را بطورے معطر می کند که دود پر پروانه که در آتش آں سوخته بوئے گل می آید ۔ انصافاً در ایں بیت باوجود ایں که مضمون لطیفیست در نازک کاری و باریک اندیشی اغراق و مبالغه پیش از حد به کار رفته یا ایں حال چناں که اشارت رفت لطائف و ہنر نمائی شاعراں ایں سبک را نباید از نظر دور داشت " ۔

(تاریخ ادبیات ایران ، ص ۳۸۵)

ان طویل اقتباسات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اسلوب اور طرز ادا کے بارے میں ہے ۔ زبان سے متعلق ان میں کوئی وضاحت یا اشارہ تک نہیں ہے ۔ اسلوب اور طرز ادا کے باب میں اگر غور کیا جائے تو جن معائب کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی شاعران ہند کے پیدا کردہ نہیں ہیں ۔ نثر ہائے منشیانه یا مثالیه اور خیال بند شاعری کی بدعت ایران سے ہندوستان پہنچی اور اہل ہند نے جیسا کہ بہار اور شفق نے خیال ظاہر کیا ہے ، اس میں افراط نہیں کیا بلکہ اس اسلوب خاص کے جملہ امکانات اجاگر کیے۔ اب یہ علاحدہ بات ہے کہ جس اسلوب کی ابتدا ایران میں ہوئی وہ اپنی ساخت میں غیر طبیعی یا مصنوعی تھا ۔ پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ سعدی ، حافظ اور خسرو ایک ہی طرز کے سخن ور تھے۔ بابا فغانی ، عرفی ، نظیری اور فیضی کا اسلوب شعر جدا جدا نہ تھا ۔ ملا نورالدین ظہوری ، طغرا مشہدی ، ابوالفضل اور بیدل کی انشا کی خصوصیات اصلیت کے اعتبار سے یکساں ہیں (غالب سے متعلق بحث آگے آئے گی) کلیم ہمدانی ، طالب آملی ، صائب تبریزی ، جلال اسیر، شوکت بخاری ، غنی کاشمیری ، ناصر علی سرہندی ، غنیمت کنجاہی ، عبدالقادر بیدل ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ ایک ہی طرز و انداز کے عادی تھے ۔ تاریخ ادبیات فارسی کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں ہے کہ سعدی ، حافظ ، بابا فغانی ، عرفی ، نظیری ، ظہوری ، طغرا مشہدی ، کلیم ، طالب اور صائب سب کے سب خاک ایران سے اٹھے تھے ۔ ان کے شیوۂ سخن و انشا کو ہندیوں نے نہ صرف اپنایا تھا بلکہ اس میں امکانی حد تک اضافے بھی کیے تھے ۔ ان اہل سخن کے عہد میں جو طرز ادا مقبول ہوئی وہی ایران اور بر صغیر میں رائج رہی ۔ ان حائق کے پیش نظر ' سبک ہندی' کی تخصیص منصفانه اور معقول نہیں ہے ، بلکه اصل مسئله فارسی نظم و

نثر کے مختلف اسالیب بیان کا ہے ۔

نثر ہائے منشیانہ میں تصنع ، مضمون آفرینی ، نازک کاری اور فضل فروشی کا مسئلہ تاریخی اور تہذیبی نوعیت کا ہے ، اسے محض سبک ہندی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔

تاریخ ادبیات میں یہ امر مسلمات متعارفہ سے ہے کہ دور اول میں نظم و نثر میں سادگی ، اصلیت اور بے ساختہ پن ہوتا ہے ، جذبات و خیالات کامل خلوص اور صداقت کے ساتھ معرض اظہار میں آتے ہیں اور یہی خصوصیت متقدمین کا طرہ امتیاز ہوتی ہے ، اس کے بعد متوسطین کے دور میں ابلاغ و اظہار کے سانچے بدلتے ہیں ۔ اگلے جن مضامین کو باندہ گئے ہیں ، متوسطین انھی مضامین میں جدتیں پیدا کر کے اپنے دور کی خصوصیات متشکل کرتے ہیں ۔ اس دور میں زبان ابتدائی حالت سے ترقی کر کے اپنے اندر وسعت پیدا کرتی ہے اور ہر قسم کے مضمون کو نئی نئی صورتوں سے پیش کرنے کے امکانات ظاہر کرتی ہے ، متوسطین کے دور کی نمایاں خصوصیت ندرت اظہار اور جدت بیان ہوتی ہے جو متاخرین کے عہد میں درجہ دوم کے شعرا اور ادیبوں کے ہاں مضحکہ خیز انداز اختیار کرلیتی ہے ۔ اس بظاہر ناہموار پہلو کی وجہ بھی یہی ہے کہ متاخرین کے دور میں کہی ہوئی باتوں میں جدتیں پیدا کرنا سخت مشکل ہو جاتا ہے جسے وہ تکلف اور تصنع کے زور سے پورا کرتے ہیں اور یہ حالت بھی دوامی نہیں ہوتی ۔ بعد کے آنے والے ادیب و شاعر زبان اور اسالیب میں انقلاب لاتے ہیں اور اسے ہر لمحہ بدلتے ہوئے سماج کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں ۔ فارسی ، اردو اور ہندی ادب ان تمام مراحل سے گزر چکے ہیں اور اب زندگی کے تقاضوں کو خوش اسلوبی سے پورا کر رہے ہیں ۔ اگر ملک الشعرا بہار اور ڈاکٹر رضا زادہ اس نقطہ نظر سے ہندوستان میں فارسی ادب کے مسئلے پر غور کرتے تو شاید ان کا نتیجہ فکر بدلا ہوا ہوتا ۔

علاوہ ازیں دانشوران مذکور کے نتیجہ فکر کو بعینہ تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سبک منشیانہ میں افراط کا سبب ہندیوں کی بے راہ روی نہیں ہے ، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ عہد صفویہ میں فارسی زبان کا مستقبل ایران کی بجائے برصغیر سے وابستہ ہو گیا تھا ۔ خود بہار کے قول کے مطابق صفوی شاہان ایران اور ان کے عمائد دربار ترکی زبان کے دلدادہ تھے ۔ اس کے برعکس زبان فارسی شاہان ہند اور امرا کی مجالس کی

زینت بن گئی تھی۔ اس لیے ایران کے شعرا اور ادیب دیار ہند کا رخ کرنے پر مجبور ہوئے جہاں ان کی خاطر خواہ قدر دانی اور سر پرستی ہوئی ۔ کبھی ان کے منہ کو بیش بہا زر و جواہر سے بھرا گیا اورکبھی ایک قصیدے کے صلے میں شاعر کو روپوں میں تلوا کر سارے روپے انعام کردیے گئے ۔ اگر ظہوری ، عرفی ، نظیری ، طالب اور کلیم کی ایسی ہی قدر و منزلت ایران میں کی گئی ہوتی تو ظاہر ہے نہ وہ اتنا رنج سفر اٹھاتے نہ خاک ہند کا پیوند بنتے ۔ ایسی صورت میں ان کے اسالیب بیان خاک ایران کی ادبیات ہی کا حصہ رہتے ۔ ان حالات کے بعد برصغیر میں فارسی نظم و نثر کی جو صورت ہوتی وہ خالصاً بر صغیر کے فارسی ادب کا نمونہ کہلاتی ۔

غالب کے سلسلے میں یہ طویل بحث اس لیے ناگزیر تھی کہ ان کا تمام سرمایۂ نظم و نثر اسی زبان میں ہے جو شاہان ایران اور مغولان ہند کے درباری شاعروں اور ادیبوں کے اظہار فن کا ذریعہ تھی ۔ انھوں نے ان تمام اسالیب میں طبع آزمائی کی جو سعدی اور حافظ کے عہد سے عرفی ، نظیری اور صائب کے دور تک معروف و مقبول سمجھے گئے ۔ اس ذوق و وجدان کے توازن کو انھوں نے ملکۂ فطری اور عطیہ خاص من جانب اللہ کہا ہے ۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ غالب کو ' فارسی نویسان ہندی ' سے جو کد اور اختلاف تھا اس کا سبب بھی یہی تھا کہ ان میں سے بیشتر حضرات فارسی زبان کے مزاج اور خمیر سے گہری واقفیت نہ رکھتے تھے اور ان سے فارسی روزمرہ اور محاوروں کی غلطیاں سرزد ہوجاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ غالب جیسے مزاج کا شاعر اور ادیب اس بے تکے پن کا کیسے روا دار ہوسکتا تھا ، البتہ غالب کے حد سے بڑھے ہوئے منفی رویے کو معقول اور مناسب نہیں کہا جاسکتا ، ورنہ جہاں جہاں انھوں نے معقول انداز اختیارکیا ہے اور علمی سطح پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے ، وہاں ان کی ذہانت اور عرفان فن کی داد دینی پڑتی ہے ۔ اس خصوص میں غالب نے اپنے شاگردوں ، دوستوں اور استفسار کرنے والوں کو بہت سے خطوط لکھے ہیں ۔ اس مقام پر ان کا اعادہ طوالت مضمون کے باعث نظر انداز کیا جاتا ہے ، تاہم اگر کوئی صاحب اس بحث کے تکملے کے لیے ان تحریروں کو دیکھنا چاہیں تو غلام حسنین قدر بلگرامی ، صاحب عالم مارہروی اور چودھری عبد الغفور سرور کے نام خطوط ملاحظہ فرما سکتے ہیں ، جن میں غالب نے فارسی نویسان ہندی بالخصوص قتیل کی زبان

اور شیوے کے بارے میں غلطیوں کی نشاندھی کی ہے اور لغت نگاروں کے قیاس کی ' ہندی کی چندی ' بیان کی ہے ۔

اس امر کا اعادہ بھی ضروری نہیں ہے کہ غالب فارسی زبان و ادب کا ستھرا اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے طبیعت بھی معنی یاب پائی تھی ۔ وہ عمدہ نثر لکھنے اور اچھا شعر کہنے کی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے ۔ عمدہ نثر اور اچھے شعر سے مراد وہ نظم و نثر ہے جو اپنے عہد کے فنی معیار کے مطابق ہوں ، جنھیں پڑھنے کے بعد قاری کو حیات و کائنات کے بارے میں بصیرت حاصل ہو اور جس کے اظہار میں شاعر و ادیب کی ذات ' شخصیت اور اس کا منفرد انداز فکر نمایاں ہو ۔ غالب اپنے فن اور اسلوب کا گہرا ادراک رکھتے تھے اور انھیں اپنے فن کے اظہار پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ۔ زیادہ تفصیل تو غیر ضروری ہوگی ، صرف چند مثالوں سے غالب کی فارسی نظم و نثر کے لب و لہجہ اور اسلوب کا اندازہ ہوسکتا ہے ۔ اس مطالعے کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ چند ایرانی اور ہندی نژاد شاعروں اور نثر نگاروں کے کلام سے اقتباس اور اشعار درج کیے جائیں ، اس کے بعد غالب کا نمونۂ کلام پیش کیا جائے اور معانی و بیان کی بحث سے قطع نظر ، لب و لہجہ اور آہنگ سے متعلق اظہار خیال کیا جائے ۔ یہ اس لیے کہ اس جانچ کے بعد غالب کے ادعا کا فیصلہ ہوسکتا ہے ۔ پہلے نثر کے نمونے ملاحظہ ہوں :

ملا نورالدین ظہوری ، دیباچہ کتاب نورس :

'' سرود سرایان عشرت کدهٔ قال ، که به نورس سرابستان حال ، کار کام و زبان ساخته ، به شهد ثنائے صانعی عذب البیان اند ، که چاشنیٔ نغمه هائے شیریں در وگ و پے نے دوانیده و خوانفسان چمن نشاط که بسط بساط انبساط پرداخته ، به زلال حمد خالقی رطب اللسان اند ، که گل ترانه هائے تر از شاخسار صوت و صدا دمانیده ، محمل شوق حجازیانش به صدائے تال هندیاں رنده بند ، و زخم جگر عراقیانش به نمک تار عنبور ترکاں در شکر خند ۔ جلاجل اوراق درختاں به هوائے او ترانه ریز و بلبلاں منقار بلبلاں به نوائے او نغمه خیز ''۔ (دربار ملی ، ص ۲۲۰)

طغرا مشهدی ، تخت طاؤس ، رساله جلوسیه :

'' حبذا تختے که چوں زرگر قضا به جواهر کاربش دست برده ۔

فیروزہٗ جوہری پسند نہ چرخ را مصالح یک پایہٗ آن شمردہ۔ اگر موج گوہرش بہ طوفان نوح قطرہٗ آشنائی داشت ، از بیگانگی تنزل آب او را بہ خاک یکساں نمی گزاشت ، طائران ایں گلشن جواہر ، چوں بال و پر افشانی کشایند در صحن ہوائے بارگاہ ارم ذات العماد طرح نمایند۔ آفتاب کہ درہمہ جا بہ کیمیاگری انگشت نماگشتہ است عمرش دو طلاسازیٗ ایں تخت آسماں پایہ گزاشتہ است۔ اگر ماہ جہاں بیں را پائے بوسیٗ ایں سریر معلیٰ دست داد ، نیلمش را بہ جہت اوج روشنی چوں مردمک بر چشم می نہاد "۔

(دربار ملی ، ۸۷ - ۲۷۷)

فیضی ، مکتوبات بہ مولانا عبدالحق محدث :

" خط محبت نمط ، مسرت پیرائے خاطر مستہام شد و رائح آشنائی بہ مشام وداد آمد۔ چہ بہ خدمت اخوت پناہ اتقیا کہ بہ فضائل کسبی و کمالات وہبی متجلی اند نسبت ارتباط صوری و معنوی در درجہ علیا واقع است۔ و ازیں خط سر کمال جوہر ذاتی و صفاتی فطری ظہور یافت۔ و از ورقات اشعار احتظاظ روئے نمود ، مناسبت تمام یافت۔

مسافران طریقت ز من جدا مشوید
کہ دور بینم و چشمم بہ منزل افتاد است

چور یگ بادیہ گم باد آں کہ قافلہ را
نشان منزل مقصود دور دور دہد

" بہ مرغان بستان معنی ہمداستان بودن لازم است۔ گرد ایں راہ خال رخسارہٗ طالبان ایں منزل باد۔ استفسار از احوال برادر گرامی نمودہ اند۔ بصحت و حضور و عشرت و سرور از بزم نشینان نواب مستطاب سپہ سالارے امیرالامرائے خان خاناں اند۔ عجب کہ جاذبہٗ محبت ایشاں نمی‌کشند البتہ خود را بہ رسانند و کامیاب نعم ظاہری و باطنی شوند "۔

(دربار ملی ، ص ۱۷۸)

مرزا محمد حسن قتیل ، رقعات قتیل ، بنام خواجہ امامی :

"منشی صاحب والا قدر سلکم‌اللہ تعالیٰ۔ عجب مسودہ نوشتہ اید

کہ ملا ظہوری باید کہ درس آن از خدمت صاحب استفادہ نماید ۔ بہ شرط فرصت در یک روز تمامش را می توانم دید و اصلاح کرد ۔ لیکن دریں روز ہا کہ ضیق فرصت ست ، دو سہ روز خواہد کشید ۔ مختصر آن کہ غزل عمومیؓ شما می رسد ۔ باید رسانید و دو غزل نو کہ دی روز چاویدہ ام بہ خدمت فرستادہ شد ۔ نقل آن بردارید و ایں کاغذ را نگاہ دارید و ہر کاغذ جداگانہ ایں دو غزل و سہ غزل دیگر کہ پیشتر بہ خدمت رسیدہ است نوشتہ بگزارید ۔ من از دست مرزا جی نجات یافتہ نزد شما می آیم و ایں کاغذ و آن کاغذ ہر دو را خواہم گرفت ۔ و جناب برائے شما وقت شام شیر فالودہ درست کردہ اند ۔ شاید دو گھڑی پیش از شام برسد'' ۔

(رقعات قتیل ، ص ۳۴ ، مطبوعہ نول کشور ، ۱۸۸۷ء)

غالب ، مہر نمیروز :

'' اگر چناں کہ بہ دوران توام ، بہ روزگار فرزانہ جمشید بودمے ، جمشید روزگار را آفریں گفتمے ۔ و اگر بداں ساں کہ ثنا خوان شہر یارم ، فرخ فریدوں را ستودمے فریدوں چرخ و ستارہ را گرد سرگشتمے ۔ دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت و ژند آورد اگر من بدیں دم آذر فشاں جا داشتمے آذر از بیم من زبانہ نزدمے ۔ و از دلفریبیؓ بیان من کس بہ شنیدن ژند لہ پرداختےمن بدیں فرخی بخت کہ چوں تو خداوندگار فرمائے دارم ہر قدر برخویشتن بنازم جا دار و سرت گردم تو نیز بدیں گرمیؓ ہنگامہ بناز کہ ہم چو غالب آتشیں نوائے داری ۔ اگر بہ اندازہؓ ہنر داد التفات می دہی جائے مردمک دیدہ بہ من باز گزار و دو دل بروئے من بکشائے ۔ گویند در عہد جہانبانی حضرت صاحبقران ثانی بہ فرمان آن خسرو دریا دل کلیم را صدرہ بہ سیم و زر و لعل وگوہر سفتہ اند من آن خوا ہم کہ دہدہ و واں را دستوری دہی تا از کشش نرنجند و یک بار گفتار مرا با کلام کلیم بہ سنجند''۔

(مہر نمیروز ، ص ۱٦ - ۱۵ ، لاہور ۱۹۹۳ء)

اس تقابلی مطالعے میں دو ایرانی اور غالب سمیت تین ہندی نژاد

انشا پر داز شامل ہیں - اس ' بزم مقابلہ ' میں ان ادیبوں کے علاوہ دیگر اہل کمال بھی شریک ہو سکتے تھے لیکن انھیں محض اس خیال سے چھوڑ دیا گیا کہ غالب کے ادعا سے متعلق اس محدود شمولیت سے وہی مدد لی جاسکتی ہے جو غیر مشمول حضرات کے شامل کرنے سے لی جاسکتی تھی -

مذکورہ نثری اقتباسات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہوری اور طغرا مشہدی کا نثری اسلوب اپنے لب و لہجہ اور آہنگ کے اعتبار سے ولولہ انگیز اور عصری تہذیب کے رجحانات اور ادبی ذوق کی غمازی کرتا ہے - ایک خاص قسم کی صنعت کاری اور پیچیدگیٔ خیال کے باوجود یہ اسلوب اپنی ادبی قدرو قیمت رکھتا ہے - با ایں ہمہ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ظہوری اور طغرا کا فن ذہنی انبساط کے علاوہ قلبی کیفیات کا آئینہ دار نہیں ہے - لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ یہ دونوں انشا پرداز اہل زبان ہیں اور اس لیے ان کے لب و لہجہ کے معیاری ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا - فیضی کی نثر اپنے توازن اور اعتدال کے با وصف اس کی پر وقار اور عالمانہ شخصیت کو نمایاں کرتی ہے - اس کے لب و لہجہ میں سنجیدگی اور متانت کا ادراک کیا جاسکتا ہے - فیضی کے اسلوب میں نثر منشیانہ کی وہ قباحتیں بھی محسوس نہیں ہوتیں جو ارباب نقد و نظر کو تنقیص پر آمادہ کریں - فیضی ہندی نژاد ہونے کے باوجود فارسی زبان کے مزاج سے آشنا معلوم ہوتا ہے - قتیل کی نثر ٹھیٹھ ہندیت کی عکاس ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خیالات اردو زبان سے فارسی زبان میں تبدیل کیے گئے ہیں ، قتیل کی نثر میں وہ فطری روانی اور نغمگی بھی محسوس نہیں ہوتی جو شخصی اسلوب اور لب و لہجہ کی آئینہ دار ہوتی ہے - یہ نثر انتہائی بے رنگ ، بے کیف اور خیال کی رعنائی سے معرا ہے -

غالب کی نثر میں اُن تمام روایات کا عکس نظر آتا ہے جو بر صغیر میں ظہوری کے عصر سے خاص رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کو ورثے میں ملیں - ان کی نثر میں مختلف اسالیب کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ انفرادی رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا ہے - ان کا لہجہ اہل زبان کے لہجے کی مانند فطری ہے اور اس مشق و ریاض کی غمازی کرتا ہے جس کے بغیر فن کار کو عظمت دوام حاصل نہیں ہوتی - غالب کی نثر فارسی زبان کے مزاج سے کلی طور پر ہم آہنگ ہے اور ان کی

آزاد فکر کی نشاندھی کرتی ھے ۔ ان کے لب و لہجہ سے ان کی جاذب نظر شخصیت کا اظہار ھوتا ھے ۔ ان کی آواز بلند ، باوقار اور توانائی کا احساس دیتی ھے ۔ یہ غالب کا ذاتی آھنگ و اسلوب ھے جو عہد مغلیہ کی تہذیبی زندگی اور ادبی روایات کا امین ھوتے ھوئے نئے تجربوں کی جانب راہ نمائی کرتا ھے ۔ یہ عظمت فن جہاں تک عہد مغلیہ کا تعلق ھے غالب کے علاوہ ھندی نژاد نثر نگاروں میں کسی کے ھاں نظر نہیں آتی ۔ اس حد تک غالب کا دعویٰ حقیقت پر مبنی ھے ۔

آخر میں عہد مغلیہ کے چند فارسی شعرا کا نمونۂ کلام تقابلی مطالعے کی غرض سے پیش کیا جاتا ھے ۔

جمال‌الدین عرفی شیرازی :

کوئے عشق است همه دانه و دام است اینجا
جلوهٔ مردم آزاد حرام است اینجا

هر که بگزشت دریں کوئے به بند افتاد است
طائر بے قفس و دام کدام است اینجا

در حرم ذکر بت دیر نشیں خاص من است
لله الحمد که ایں زمزمه عام است اینجا

بیا اے شوق و دست رغبتم سوئے گریباں بر
که بے تابانه پیراهن دریدن آرزو دارم

بیا اے عشق و رسوائے جهانم کن که یک چندے
نصیحت هائے بیدرداں شنیدن آرزو دارم

حرم پویاں درے را می پرستند — فقیهاں دفترے را می پرستند
گروهے زشت خویند اهل دانش — که زیب وزیورے را می پرستند
برافگن پرده تا معلوم گردد — که یاراں دیگرے را می پرستند

ابوالفیض فیضی :

هوائے عشق مرا تازه در دل افتاد است
نظر کنید که دریا به ساحل افتاد است

مسافران طریقت زمن جدا مشوید
کہ دور بینم و چشمم بہ منزل افتاد است
نگاہ ہمت فیضی بہ سوئے صید کجست
کہ صد ہزار همانیم بسمل افتاد است

اے ہم نفسان محفل ما رفتید ولے نہ از دل ما
ما دست ز غم نہادہ بر سر غم ہائے فشرد در گل ما

ایں چہ مستی ست کہ بے بادہ و جام است اینجا
بادہ کز جام بنوشند حرام است اینجا
اے کہ از بادہء عشق خبر می پرسی
پائے بردار کہ کونین دو گام است اینجا
زاھدا منتظر چشمہء کوثر منشیں
کہ بہ یک جرعہء مے کار تمام است اینجا

محمد حسین نظیری نیشاپوری :

از کف نمی دھد دل آسان ربودہ را
دیدیم زور بازوئے نا آزمودہ را
من در پئے رھائی و او ھر دم از فریب
بر سر گرہ زند گرہ ناکشودہ را
تامنفعل ز رنجش بے جا نہ بینمش
می آورم اعتراف گناہ نہ بودہ را

کجا ز عشوہء آں چشم نیم باز رھیم
کہ فتنہ خاستہ از خواب و پائے ماخفت است
شب امید بہ از صبح عید می گزرد
کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفت است

چہ خوش است از دو یکدل سر حرف باز کردن
سخن گزشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

گہے از نیاز پنہاں نظرے بہ مہر دیدن
گہے از عتاب ظاہر نگہے بہ ناز کردن
تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بہ ما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

مرزا عبدالقادر بیدل :

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سروسمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ
پئے نافہ ہائے رمیدہ بو مپسند زحمت جستجو
بہ خیال حلقۂ زلف او گرہے خور و بہ ختن درآ
نفست اگر نہ فسوں دھد بہ تعلق ہوس جسد
زہے دامن تو کہ می کشد کہ دریں رباط کہن درآ

بہ گلشنے کہ نکاھت فشاند دامن ناز
چو لالہ دیدۂ نرگس ز سرمہ لبریز است
ز فیض چاک دل انداز نالۂ داریم
چو غنچہ تنگ مشو مرغ ما سحر خیز است

مرزا محمد حسن قتیل :

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت
خود سوئے ما نہ دید و حیا را بہانہ ساخت
دستے بدوش غیر نہاد از رہ کرم
مارا چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت
رفتم بہ مسجدے پئے نظارۂ رخش
دستے بہ رخ کشید و دعا را بہانہ ساخت

غم عشق تو پایانے نہ دارد چہ درد است ایں کہ درمانے نہ دارد

جنوں را گو کہ سوئے ما نیاید — کسے اینجا گریبانے نہ دارد
اثر در گریۂ مجنوں مجوئید — کہ لیلیٰ چشم گریانے نہ دارد

غالب :

بہ وادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت ست
بہ سینہ می سپرم راہ گر چہ پا خفت ست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت ست
دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد
کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفت ست

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامید نیم
ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر

بہ جنگ باج ستانان شاخساری را
تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم
بہ صلح بال فشانان صبح گاہی را
ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم
بہ من وصال تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

مذکور الصدر شعرا کے کلام پر اظہار خیال سے قطع نظر کرتے ہوئے غالب کے فارسی کلام سے متعلق وہی باتیں کہی جاسکتی ہیں جو ان کی نثر کے اسلوب کے بارے میں کہی گئی ہیں۔ غالب کا فارسی کلام اپنے آہنگ اور اسلوب کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اسلوب کی سب سے

نمایاں خصوصیت الفاظ کا صحیح اور بر محل انتخاب ہے۔ غالب ایسے الفاظ منتخب کرتے ہیں جو ترنم ، نغمگی اور موسیقیت سے لبریز ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ اس اعتبار سے غالب کا لب و لہجہ بناوٹی اور مصنوعی معلوم نہیں ہوتا۔

با ایں ہمہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب کا مولد و منشا بھی وہی ہندوستان ہے جس میں ناصر علی، غنیمت ، واقف اور قتیل پیدا ہوئے لیکن غالب نے جس انداز سے فارسی زبان کے ذوق اور مزاج سے آگاہی کا ثبوت مہیا کیا ہے، یہ حضرات اس انداز سے ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس قبیل کے ہندی شعرا پر غالب کا اعتراض غلط معلوم نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ غالب ، سعدی و حافظ کی سی اہمیت اور منزلت کے شاعر نہیں ہیں لیکن انہیں فارسی شعرا کی اس صف میں ضرور جگہ دی جاسکتی ہے جہاں بابا فغانی ، عرفی ، نظیری اور ظہوری نظر آتے ہیں۔ یہ استحقاق تو خود انھوں نے بھی ظاہر کیا ہے:

نہ گویم تازہ دارم شیوۂ جادو بیانان را
ولے در خویش بینم کارگر جادوئے آنان را

غالب کا الحاقی کلام ــ ایک داستان

جلیل قدوائی

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک
(حالی)

غالباً ۱۹۲۳ع کا واقعہ ہے، میں علی گڑھ میں ایف اے کی جماعت کا طالب علم تھا ـ میرے عزیز دوست خواجہ مسعود علی ذوقی (۱) اور میں چھٹیوں میں عموماً ایک ساتھ سفر کرتے تھے ـ میں راستے میں اناؤ اپنے سابق وطن یا کانپور جہاں میرے اعزا رہتے تھے ، ٹھہر جاتا اور وہ آگے براہ لکھنؤ اپنے مستقر گونڈہ چلے جاتے ـ کبھی وہ کچھ دن میرے همراہ ٹھہر کر گونڈہ جاتے ، کبھی ہم دونوں اپنے اپنے مستقروں پر کچھ دن قیام کرکے لکھنؤ میں جمع ہو جاتے ـ اسی زمانے میں انھوں نے مجھے وصل بلگرامی مرحوم سے ملایا (۲)

۱- اپنے زمانے کے بے حد ذہین طالب علموں اور ترقی پذیر افسانہ نگاروں اور شاعروں میں تھے ـ غزل سے زیادہ نظم سے دل چسپی رکھتے تھے ـ اب منقار زیر پر ہیں ـ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے ، پھر یونیورسٹی ٹریننگ کالج میں رہے ـ اب وہیں شعبۂ اردو میں استاد ہیں ـ

۲- ویسے غالباً ۱۶ - ۱۹۱۵ء میں جب میں گیارہ برس کا تھا اور ہردوئی (اودھ) کے ہائی اسکول میں چوتھی یا پانچویں جماعت کا طالب علم تھا ، انہیں مولوی نورالحسن نیر ، وکیل (بعدہٗ صاحب نوراللغات) کے ہاں جہاں میں
(جاری)

جو کچھ دن پہلے گورکھپور میں مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم (۱) کے حسن سلوک سے فیض یاب ہو کر لکھنؤ آئے تھے اور انھوں نے نظیر آباد میں ایک خوش قطع، دو منزلہ مکان کرایہ پر لے کر اپنا ماہنامہ ' مرقع ' نکالنا شروع کیا تھا۔

کوئی پچاس برس کا سن، لانبا قد، گول سرخ و سفید چہرہ (جس پر خشخشی سے قدرے زیادہ بڑی، گول، کھچڑی داڑھی تھی)، ہونٹ ہمہ وقت مسکراہٹ کے سبب خاصے کھلے ہوئے (جن کے اندر پان کھانے کے باوجود سفید چمکدار بتیسی نمایاں رہتی تھی)، موٹا مگر ڈھیلا بدن، چوڑی مہریوں کا سفید پاجامہ، بغیر بنیان کے سفید ہی ڈھیلا ڈھالا کرتہ (جس کے اندر ان کا سرخ بدن جھلکتا تھا) اور شیروانی نہ پہنے ہونے کی صورت میں وہ ہاتھ ڈال کر

(جاری)

اپنے ایک عزیز مولوی یاسین علی مرحوم کے ساتھ جو ان دنوں میری تعلیم کے نگران تھے اور وھانٹ گنج میں نیر صاحب کے ہم محلہ تھے جایا کرتا تھا، دو ایک بار دیکھ چکا تھا ۔ اس وقت وصل صاحب کیا کرتے تھے، یہ یاد نہیں آتا ۔ نیر صاحب ہردوئی کی ایک آنہ فنڈ کمیٹی (برائے فلاح مساجد) کے صدر یا معتمد تھے اور سالانہ جلسوں میں وصل صاحب کو اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ وہ جلسے بھی کیا شاندار ہوتے تھے جن میں علاوہ دوسرے مشاہیر علما کے مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی یادگار تقریریں ہوتی تھیں ۔ موصوف ضعیف تھے اور ڈائس پر آرام کرسی رکھ دی جاتی تھی، اسی پر لیٹے لیٹے تقریر فرماتے تھے۔

۱۔ رئیس اعظم گورکھپور، بیگم سروری عرفان اللہ اور میرے مرحوم دوست معین الحق، ایڈوکیٹ کے خسر، جن کی علم دوستی اور دریا دلی کا ثبوت وہ شان دار اور گران بہا کتب خانہ ہے جو موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نذر کردیا ۔ حضرت ریاض خیر آبادی کو مہاراجہ سر محمد علی محمد خان آف محمود آباد کی سر پرستی کے علاوہ مولوی صاحب کی بھی اس حد تک قدردانی حاصل تھی کہ ان کے اس مطلع پر آپ نے مبلغ دو ہزار روپے عطا کیے تھے۔

شکل معشوق کی، انداز ہیں دیوانوں کے
کل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے !

بدن کھجاتے اور باتیں کرتے رہتے تھے) ، ڈھیلی شیروانی ، ترکی ٹوپی ، ذہانت کم مگر عام سمجھ بلا کی ، مزاج میں متانت سے زیادہ ٹھٹھول، جلد جلد باتیں کرنے کا انداز ، شعر گوئی واجبی مگر شعرا کے لیے ہمیشہ کشادہ آغوش ، خاطر مدارات میں طاق ، مجلس آرا وغیرہ وغیرہ ۔ یہ تھے وصل بلگرامی مرحوم!

پہلی ملاقات کے بعد ہی آن سے بے تکلفی کے تعلقات قایم ہو گئے ۔ آن کی ذات دوسروں کو خواہ مخواہ اپنی طرف کھینچتی تھی ۔ دیر آشنائی آنھیں چھو نہیں گئی تھی ۔ چنانچہ کبھی میں تنہا ، کبھی میں اور ذوقی دونوں آن کے ہاں جانے اور ٹھہرنے لگے ۔ پھر ان سے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ ہمارے خانگی معاملات میں دخیل ہونے لگے ۔ رسالہ ' مرقع ' تو نکالتے ہی تھے ، خاص بات یہ تھی کہ ان کے ہاں وقتاً فوقتاً اچھے اچھے شعرا اور اہل علم آتے اور ٹھہرتے رہتے تھے اور مقامی شعرا تو تقریباً ہر شام کو جمع ہوتے اور سخن آرائی کا سلسلہ رات گئے تک رہتا ۔ وصل صاحب کا دستر خوان وسیع تھا۔ ہر کھانے پر آن کے مہمان اور وقتی طور پر آئے ہوئے آٹھ دس احباب ضرور ہوتے اور ناشتہ اور چائے وغیرہ کا تو کوئی حساب نہ تھا ۔ قابل ذکر مہمانوں میں کبھی کبھی رام پور سے ہوش بلگرامی آتے تھے ۔ ایک بار علی گڑھ سے واپسی پر اصغر صاحب بھی مہمان رہے مگر غالباً دو ہی ایک روز (۱) ریاض صاحب (۲) کو بھی وہاں مہمان دیکھا ۔ عزیز ، صفی (مگر ایک ساتھ نہیں) ،

۱۔ اسی قیام کے دوران اثر صاحب نے اصغر صاحب کے اس شعر کی انھیں یوں داد دی تھی " آپ نے غالب کو غالب ہی کی زمین میں شکست دی ہے " ۔

میں ہوں ازل سے گرم رو عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

اور اسی صحبت میں اثر صاحب نے ' مرقع ' میں ' نشاط روح ' پر اپنے تحسینی مضمون شائع کرنے کا پروگرام بنایا جس پر عمل بھی کیا ، اگرچہ اس شعر کی داد اس مضمون میں میرے بیان کردہ الفاظ کے مطابق نہیں ہے ۔ بعد میں بعض اثرات کے تحت مخالفانہ تبصرہ بھی لکھا ۔

۲۔ حضرت ریاض خیرآبادی ۔

(جاری)

اثر (لکھنو میں ہوئے تو) ، صفدر مرزا پوری ، اسید امیٹھوی، سراج، امین سلونوی، حکیم آشفتہ ، آسی وغیرہ شام کے آنے والوں میں تھے، خصوصاً موخرالذکر جو مطبع منشی نول کشور میں ملازم تھے اور اپنا کام ختم کرکے اپنے بعض شاگردوں یا عقیدت مندوں کے ہمراہ وہاں سے سیدھے وصل صاحب کے ہاں آجاتے ۔

ایک بار شام کی نشست میں آسی صاحب کا کلام سننے کے بعد کسی نے اُن سے اچانک کچھ اس قسم سوال کا کیا " کہیے آسی صاحب ، غالب کا غیر مطبوعہ کلام کچھ ہوا " ؟ میں نے یہ سمجھا کہ مروجہ دیوان غالب کے بعد جو کلام دستیاب ہوچکا ہے ، موصوف اس پر کچھ کام کر رہے ہوں گے یا مزید غیر مطبوعہ کلام کی تلاش میں ہوں گے ، اس کے بارے میں پوچھا جارہا ہے ۔ مگر جس آسانی ، برجستگی نیز سنجیدگی اور تبسم کے ملے جلے انداز میں جواب دیا گیا اس نے مجھ پر معاملے کی حقیقت کچھ کچھ واضح کردی ۔

(جاری)

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

خیر ، نطق نے میری زبان کے بوسے لیے ہوں یا نہ لیے ہوں ، نطق حضرت ریاض کا منہ چومتا تھا ۔ نثر ہو یا نظم ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے ۔ بات کرنے کا ' آہستہ خرام بلکہ مخرام ' جیسا نرم ، دھیما ، رازدارانہ لہجہ ، شستہ و رفتہ کوثر سے دھلی ہوئی زبان ، لبوں پر تبسم ، پان کی پیک باچھوں تک آئی ہوئی ، بڑھاپے میں بھی سرخ و سفید نورانی چہرہ ، سفید بھک نورانی ڈاڑھی ، نور کی آواز ۔ ان کا مطلع یاد آ گیا :

کہاں وہ نور کی صورت ، وہ نور کی آواز
ریاض کون سنائے غزل یہ گا کے مجھے

اپنے بعض اشعار کا پس منظر کچھ ایسے دل آویز انداز سے بیان کرتے کہ داستان کا لطف آتا اور سننے والا ، مہدی افادی کے الفاظ میں یہ سمجھتا ' گویا میری جوانی کے قصے ہیں ' ۔ ان دنوں اپنے دیوان ' ریاض رضواں ' کی ، جس کی داستان قاضی تلمذ حسین مرحوم نے کیا خوب رقم کی ہے ، ترتیب و اشاعت میں مشاورت کے سلسلے میں مقیم تھے ۔

آسی صاحب نے اس طور پر جواب دیا "جی کیوں نہیں؟ پچھلے دنوں تھوڑا بہت ہوا ہے وہ پیش کرتا ہوں"۔ یہ کہا اور ایک آدھ غزل یا اشعار ایسے سنائے جن پر بلا شبہ غالب کے فن کی چھوٹ پڑتی معلوم ہوتی تھی۔ میری نوجوانی کے زمانے میں بعض احباب غالب کی تقلید میں مزاحاً بے معنی، مغلق قسم کے اشعار ضرور کہتے تھے مگر غالب کے رنگ میں سنجیدگی کے ساتھ کہے ہوئے اور بامعنی اشعار سننے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ میں شبے میں پڑ گیا مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سبھی حاضرین نے اس کو وقت گزاری اور تفنن طبع کے طور پر ایک لطیفہ سمجھا اور بس۔

اس کے بعد دو ایک بار پھر لکھنؤ جانا ہوا۔ وصل صاحب کے ہاں قیام یقینی تھا اور آسی صاحب سے ملاقاتیں اس سے بھی زیادہ یقینی، جن میں ان سے غالب کا غیر مطبوعہ کلام بھی ضرور سنا جاتا۔ حالت یہ ہوگئی تھی کہ ادھر آسی صاحب داخل ہوئے ادھر ان کے نیازمندوں نے (جن میں اب راقم بھی شامل ہوچکا تھا) بے تاب ہوکر فرمایش کی "آسی صاحب! کچھ غالب کا غیر مطبوعہ کلام"؟ اور انھوں نے حسب معمول، بلا کسی رسمی تکلف کے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ سنانا شروع کر دیا۔

۱۹۲۰ء کے وسط میں پھر لکھنؤ گیا۔ ذوقی کو ساتھ لیا۔ اس سال دسمبر میں ہماری یونی ورسٹی کی تاریخی جوبلی منائی جانے والی تھی اور اس موقعے پر بشیر صدیقی صاحب (۱) کو اور مجھے بہ حیثیت ایڈیٹر و جائنٹ ایڈیٹر علی گڑھ میگزین جوبلی نمبر (۲) شائع کرنا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کے اس

۱- رشید صدیقی صاحب کے برادر نسبتی، بعد میں شبلی کالج اعظم گڑھ کے پرنسپل ہوگئے تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آئے اور بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کراچی کے سکریٹری ہوئے۔ اب عرصے سے پنشن لے کر کراچی میں گوشہ گیر بلکہ صحیح معنوں میں 'پناہ گیر' ہیں:

هیچ آفت نه رسد گوشهٔ تنهائی را

۲- یادگار چیز تھی، اب نایاب ہے، میرے پاس بھی نہیں۔ اس میں علامہ اقبال کی وہ تصویر شامل تھی جس میں شاعر مشرق نظریہ تکوین اضافت کا

(جاری)

سفر کا مقصد وہاں کے شعرا و اہل قلم سے اُن کے نمونہ ہائے کمالات ' تصاویر ، دیگر نوادر وغیرہ حاصل کرنا تھا اور اس کام میں خاصی کامیابی ہوئی ۔ اس مرتبہ بھی حسب معمول وصل صاحب کے ہاں قیام ہوا ۔ آسی صاحب سے ملاقات ہوئی اور غالب کا غیر مطبوعہ کلام سنا گیا ۔ اس بار آسی صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ چکنے چوپڑے ، مانگ پٹی سے آراستہ ، منہ میں پان کی گلوری کے باوجود گالوں میں گڑھے ، دبلے پتلے اور لانبے ، لانبی ہی نکیلی مونچھیں ، ستا ہوا چہرہ ، چمک دار آنکھیں جن میں کاجل کی باریک تحریر ، قدرے میلا سفید چوڑی دار پاجامہ ، مٹیالے رنگ کی شیروانی ، ہاتھ میں بس بٹیر کی کسر تھی ، مسکراتے ہوئے ملے بلکہ ملائے گئے ۔ معلوم ہوا ڈاکٹر عظمت الٰہی ہیں ، طلا فروشی کرتے ہیں (۱) اور ' میگزین ' کے جوبلی نمبر میں اپنے کاروبار کا اشتہار شائع کرانا چاہتے ہیں! حضرت نے پچاس روپے بھی پیش کیے مگر ظاہر ہے ہم نے فی الفور مغدوری کا اظہار کیا ۔ ان سے عرض کیا " جناب ! آپ میگزین میں اپنا اشتہار شائع کرانا چاہتے ہیں یا ہمیں یونی ورسٹی سے نکلوانا چاہتے ہیں " ؟

ایک مدت کے بعد جب میں طالب علمی کا زمانہ ختم کرکے زندگی کی مکروہات میں پھنس گیا ، وہ زمین رہی نہ وہ آسمان ، میرا علی گڑھ کا قیام ترک ہوا ، لکھنؤ آنا جانا ختم ہوا اور دہلی ، شملہ ، لاہور وغیرہ میرے مستقر رہنے لگے تو انھیں ڈاکٹر عظمت الٰہی کی ایک خاندانی بیاض کے حوالے سے

(جاری)

مطالعہ فرما رہے ہیں ۔ چھوٹی تصویر تھی مگر سب سے پہلی ۔ اس کی بڑی تصویریں بعد میں شائع ہوئیں ۔ علامہ نے میری درخواست پر سجاد حیدر یلدرم مرحوم کے ذریعے ، جنھوں نے سفارش کی تھی ، اس نمبر کے لیے اپنی تصویر خاص طو پر بھیجی تھی ، مع خط اور ایک فارسی غزل کے ۔ ان دونوں چیزوں اور تصویر کے بلاک ایک ہی صفحہ پر شائع ہوئے تھے ۔ خط میں راقم کا شکریہ بھی ادا کیا گیا تھا ۔ غزل کا مطلع تھا :

نہ یابی در جہاں یارے کہ داند دل نوازی را
بہ خود گم شو ، نگہدار آبروئے عشق بازی را

۱۔ طلا یا اسی قبیل کے کسی چکر میں ماخوذ ہوئے ، سزا پائی اور اسی حالت میں موت واقع ہوئی ۔ خدا غریق رحمت کرے ۔

سی صاحب کی دریافت کے طور پر نیاز صاحب (۱) نے ' نگار ' میں غالب کا غیر مطبوعہ کلام شایع کیا ۔ بعد میں کچھ اور چیزیں شامل کر کے آسی صاحب نے اسے کلام غالب کا ایک مستقل حصہ بنا دیا ۔ پھر ایک طویل عرصہ گزر گیا اور تقسیم ہند کے بعد جناب عرشی رام پوری نے بھی اپنے مرتبہ ' دیوان غالب ' میں یاد گار نالہ کے ذیل میں آسی کے حوالے سے اس تمام کلام کو شامل کرلیا ۔ اس کے معتبر ہونے میں ضرور شبہہ ظاہر کیا مگر کن اسباب کی بنا پر ، یہ انھوں نے نہیں لکھا ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے دنوں تک ایک ایسے اہم علمی واقعے کے بارے میں میں نے ' کتمان حقیقت ' سے کیوں کام لیا اور ادبی دنیا میں یہ دھاندلی ہوتی رہی اور میں اپنے ہونٹوں پر مہر سکوت لگائے کیوں بیٹھا رہا ؟ مگر معاملہ صرف اتنا نہیں ہے ۔ اس سلسلے میں مجھے سے تفصیل اپنے ذاتی حالات و واقعات بتانے ہوں گے ، مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس مضمون میں پہلے ہی اصل موضوع کے علاوہ بہت سی ضمنی اگرچہ خاصی ضروری اور معلومات افزا باتیں جمع ہوگئی ہیں ۔ مختصراً صورت حال یوں ہے کہ بعض نہایت سنگین اسباب اور زندگی کی نا انصافیوں اور محرومیوں کی وجہ سے میں عرصے تک اردو شعر و ادب سے بیزار رہا حتی کہ کوئی سولہ سترہ برس تک میں نے اردو کی باقاعدہ خدمت

۱- ' مرقع ' کے شباب ہی کے زمانے میں ' نگار ' کو بھوپال سے لکھنؤ لے آئے تھے بلکہ ابتدائی ایام دفتر ' مرقع ' اور وصل صاحب ہی کے ہاں گزارے تھے ۔ کچھ دن یہ مسئلہ بھی زیر غور رہا کہ دونوں رسالے ایک ہی انتظام کے تحت آجائیں ، مگر جہاں تک یاد ہے صرف طباعتی امور کی حد تک ' نگار ' وصل صاحب کی زیر نگرانی رہا وہ بھی چند ماہ تک ، جس کے بعد نیاز صاحب ان سے کلیتاً علاحدہ ہوگئے ۔ پھر آہستہ آہستہ ' نگار ' جمنے اور ترقی کرنے لگا اور ' مرقع ' نے دم توڑ دیا ۔ لکھنؤ میں وصل صاحب کا جیسا شاندار آغاز ہوا تھا ، اُن کا انجام اتنا ہی حسرت ناک ہوا ۔ کاروبار ختم ہوگیا ، احباب نے ساتھ چھوڑ دیا اور قیصر باغ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیکسی و تنہائی کی حالت میں کمر اور پشت کے ایک نہایت گہرے زخم کی بدولت ، جو سردی سے بچنے کے لیے چارپائی کے نیچے رکھی ایک دہکتی ہوئی انگیٹھی کی وجہ سے پڑ گیا تھا ، ختم ہوگئے ۔

سے کنارہ کشی اختیار کر لی ۔ ان ناموافق حالات نے پاکستان کے قیام کے کچھ عرصے بعد پلٹا کھایا ، چنانچہ جب ہی سے مجھے ادب کی طرف واپس آنے کی توفیق ہوئی ، اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کہ قلم زنگ آلود ہو گیا تھا اور اس کی روشنائی خشک ہو چکی تھی ۔

اگر میں نے اب تک یہ واقعہ کسی ' مقالے ' کی شکل میں قلم بند نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اسے اپنے نہاں خانۂ دل ہی میں مقید رکھا ۔ اس دوران میں جن جن اہل قلم سے بات چیت ہوئی میں نے اُن سے اس کا تذکرہ کیا ۔ محبی مالک رام نے اسکندریہ سے اس کے بارے میں تحریری طور پر دریافت کیا تو میں نے انھیں بے کم و کاست صورت حال سے مطلع کردیا ۔ جناب عرشی سے بھی اس مسئلے پر خط و کتابت ہوئی ، اگرچہ سوء اتفاق سے اُن کے تاریخی نسخے کی اشاعت کے بعد ۔ نادم سیتاپوری صاحب پاکستان آئے تو ان سے اس موضوع پر بات چیت ہوئی اور بعد میں انھیں اس واقعے کا حال لکھ کر بھی بھیج دیا ۔ آج کل حامد اللہ افسر کا کراچی میں قیام ہے ۔ ان سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی ۔ انھوں نے نہ صرف اس واقعے کی مکمل تائید کی بلکہ ڈاکٹر عظمت اللہی کے مقدمے اور موت کا قصہ انھی سے معلوم ہوا ۔ اصل میں میرے علاوہ اُس دور کے متعدد اشخاص کو بشمول ذوقی جن کا ابتدائے مضمون میں ذکر کیا گیا ، یہ واقعہ معلوم ہے مگر تعجب ہے کہ کسی اور اہل قلم نے بھی اس کے بارے میں اب تک کچھ نہیں لکھا ۔

۱۹۶۰ء میں اپنے مخدوم سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کی مشاورت سے بابائے اردو کی مجوزہ نود سالہ جوبلی کے موقع پر ان کی خدمت میں اپنی طرف سے پیش کرنے کے لیے میں نے غالب کا نئی ترتیب کے ساتھ ایک انتخاب شائع کیا ۔ اس کا تاریخی نام ' کلام غالب ۔ نسخۂ قدوائی ' اور ذیلی فقرہ ' پیش کشی جشن نود سالہ بابائے اردو' ہاشمی صاحب ہی کے عطا کردہ ہیں ، جن سے علی الترتیب ۱۹۶۰ء اور ۱۳۸۰ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں ۔ یہ انتخاب سارے کا سارا ان کی نظر سے گزرا ہوا بلکہ ان کا منظور کردہ ہے ۔ انتخاب کی غایت اصلی یہ تھی کہ شاعر کو اعلیٰ تحقیقی اور علمی حلقوں ہی میں محدود رہنے دیے جانے کی بجائے عام قاری حضرات میں بھی زیادہ سے زیادہ مقبول بنایا جائے تا کہ جہاں تک ممکن ہو ہر چھوٹا بڑا ، پڑھا لکھا شخص غالب سے مستفید اور لطف اندوز

ہو سکے ۔ اسی لیے انتخاب بنیادی طور پر صرف اردو کلام ، وہ بھی شاعری کی مقبول عام صنف غزل تک محدود رکھا گیا ۔ اس کے دیباچے میں بھی 'غیر مطبوعہ کلام غالب' سے اپنی واقفیت کے بارے میں اشارتاً کچھ عرض کردیا تھا ۔

اس وقت ہمارے سامنے یہ بڑا سوال تھا کہ چوں کہ غالب کے تمام اردو غزلیہ کلام کو سامنے رکھ کر انتخاب کرنا تھا ، غیر مطبوعہ غزلیات کے اس حصے کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے ۔ ہم نے بہت غور کیا اور ہماری متفقہ رائے یہ ہوئی کہ اس کلام پر بھی ضرور نظر ڈال لی جائے مگر چونکہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد میرے لیے ایک ایک شعر کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ یہ معتبر ہے اور وہ غیر معتبر ، بالخصوص جب کہ میرے سنے ہوئے کلام کے علاوہ اور کلام بھی آسی سے منسوب ہو چکا تھا ، اصول یہ طے ہوا کہ جو میرا سنا ہوا کلام یاد آئے اسے ترک کرکے باقی کے سلسلے میں آسی اور نیاز کو شبہ کا فائدہ دے کر اس کلام سے بھی انتخاب کرلیا جائے ، چنانچہ یہی کیا گیا ۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ سو فیصد معقول طریق کار نہ تھا مگر اس کے سوا چارۂ کار بھی کیا تھا ؟

عرشی صاحب کو بہ حیثیت مجموعی یہ انتخاب پسند آیا ۔ مگر غیر مطبوعہ کلام کے انتخاب کے سلسلے میں ، شاید اس لیے کہ اس سے پہلے میں انھیں آسی سے منسوب کلام کو غیر معتبر بتا چکا تھا ، جب انھیں اس اصول سے مطلع کیا گیا تو ان کی خاطر خواہ تشفی نہیں ہوئی ۔ میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اس احتساب میں موصوف نے میرے ساتھ قدرے سختی روا رکھی ہے ، اس لیے کہ خود اپنے مرتبہ دیوان غالب میں اس امر کا اقرار کرتے ہوئے بھی کہ انھیں بعض اشعار کے بارے میں الحاق کا شبہ ہے ، انھوں نے ایسے سارے اشعار شامل کرلیے ہیں ۔

اصطلاحات علمیہ

انجمن ترقی اردو نے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کثیر تعداد میں وضع کی ہیں اور ہر علم کی اصطلاحات علاحدہ طور پر کتابی شکل میں میں شائع جارہی ہیں - ان فرہنگوں میں انگریزی اصطلاحات کے مقابل اردو مترادفات دیے گئے ہیں - اصطلاحات کے جمع کرنے کے لیے متعلقہ علوم اور زبان کے ماہرین پر مشتمل کمیٹیاں بنائی گئیں جنھوں نے بابائے اردو مرحوم کی نگرانی میں اس کام کو مکمل کیا - اب تک حسب ذیل فرہنگیں شائع کی جا چکی ہیں :

فرہنگ اصطلاحات بنکاری	قیمت : چار روپے ۵۰ پیسے
فرہنگ اصطلاحات فلکیات	: ایک روپیہ پچاس پیسے
فرہنگ اصطلاحات کیمیا	: دو روپے پچیس پیسے
فرہنگ اصطلاحات جغرافیہ	: ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی

غالب کے سفارش نامے

مسلم ضیائی

ملنے کو تو حالی بھی غالب سے ملتے تھے اور مجروح بھی ، غالب کے مرنے پر حالی نے بھی استاد کا مرثیہ کہا اور مجروح نے بھی ۔ دونوں نے ایک ہی صنف یعنی ترجیع بند میں اپنے جذبات کا اظہار کیا لیکن دونوں ترجیع بندوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں وہی فرق ہے جو غالب اور مجروح میں ہے ۔

بات یہ ہے کہ فن کار ہمیشہ اپنے فن میں اپنی افتاد طبع اور رنگ طبیعت کا نادانستہ طور پر اظہار کردیتا ہے لیکن افتاد طبع میں فطرت اور تربیت دونوں شامل ہیں ۔ اس لیے ہر فن پارے سے فن کار کے علم، تجربے اور ماحول کے اثرات کا بھی اظہار ہوتا ہے ۔

غالب کے خطوط کثیر بھی ہیں اور متنوع بھی ۔ وہ اسی قدر پہلو دار ہیں جس قدر غالب کی شاعری یا شخصیت ۔ ان کے خطوط میں علمی بحثیں بھی ہیں ، خوش طبعی بھی ہے ، زندگی کی داستان بھی ہے اور ان کے دور کی سماجی تاریخ بھی ۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہزار چشم اور ہزار خیال انسان تھے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قلمرو سخن میں لاکھوں نگاہیں ان کی طرف اٹھی ہوئی اور ان کی تحریروں کی منتظر رہتی تھیں ۔ حیدرآباد دکن کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ غالب کا خط کسی کے پاس آتا تو غالب دوست وہاں کی مکہ مسجد میں جمع ہوتے اور وہ خط سب کو سنا کر ایک اور غالب دوست کے پاس مدراس بھیج دیا جاتا تھا ۔ ان کے بعض خطوں کی عبارتوں سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انوارالدولہ شفق ، صاحب عالم مارہروی اور مہدی مجروح کے ہاں بھی کچھ اسی قسم کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں اور ان کے احباب دلی سے آنے والی ڈاک کے منتظر رہتے تھے ۔

وہ اپنے دور کے ممتاز لوگوں میں سے تھے - مغل دربار کے ملازم ہونے کی حیثیت سے انھیں پچاس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ ان کی عزت بھی پچاس روپے کے برابر تھی۔ ان کا رتبہ آسمان کے برابر ہی نہیں اس سے بھی بلند تھا - شاہی ملازم کی حیثیت سے نہیں ، نجم الدولہ، دبیرالملک ، نظام جنگ کہلانے سے نہیں بلکہ ان کے علم ، ان کی شاعری ، ان کی مکتوب نگاری ان کی شائستگی اور انسان دوستی کے باعث -

جاگیرداری دور کے معاشرے سے لے کر اس وقت تک انسان محض اپنی قابلیت کی بنا پر ذرا مشکل ہی سے اپنے معاشی مرتبے پر پہنچا ہے کیونکہ ہماری معاشی زندگی میں اب تک کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی اور انسان سود و زیاں کے چکر میں گرفتار رہا ہے۔ مری بیار و مربہ بخور کی مثل مدتوں سے چلی آرہی ہے اور آج بھی اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ، یعنی سفارشیں اج بھی پروانۂ حصول معاش ہیں -

غالب نے جاگیرداری دور کی بدترین افراتفری کو شاہ عالم ، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے عہدوں میں دیکھا ۔ مغل سلطنت کی تباہی نے معاشی زندگی میں سخت ابتری پھیلا دی تھی ۔ بے روزگاری عام تھی - ایسے زمانے میں روزگار حاصل کرنے کے لیے ممتاز آدمیوں کی تحریروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ تحریریں عموما خطوط ہی کی شکل میں ہوتی ہیں -

غالب سے پہلے عموماً فارسی میں خط لکھے جاتے تھے۔ ان میں بہت زیادہ صناعی اور لفظی بازی گری ہوتی تھی ۔ انتہا یہ کہ تعزیت نامے بھی ان سے بری نہ تھے - غالب نے ابتدا ہی سے غالباً انگریزی خطوط سن کر اور ان کی روش دیکھ کر خطوط نگاری کے لیے چند اصول متعین کرلیے تھے - چنانچہ ۱۸۲۶ء میں انھوں نے علی بخش رنجور کے لیے پنج آہنگ کے آغاز میں لکھا کہ جب میں خط لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس کے مرتبے کے لحاظ سے مخاطب کرکے بیان مدعا پر آجاتا ہوں ۔ القاب و آداب اور خیریت کی اطلاع دینا بے ضرورت سمجھتا ہوں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں کتنی ساحری کی جاسکتی ہے اور سخن گستری کی کتنی گنجایش ہے -

آج کی پیچیدہ دنیا میں تعلقات بھی پیچیدہ ہوگئے ہیں اور مسائل بھی ، چنانچہ بعض اوقات کسی عزیز یا دوست کو ایک طرف سفارش نامہ ہاتھ سے لکھ کر یا ٹائپ کرا کے دیا جاتا ہے اور دوسری طرف اس شخص کے مرسل الیہ

کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی ٹیلیفون بھی کردیا جاتا ہے کہ اس شخص کو، جسے تمھارے پاس بھیجا جارہا ہے، کسی بہانے ٹال دو اور اس جگہ پر میرے بیٹے (داماد، بھتیجے یا بھانجے، جیسا موقع ہو) کا تقرر کردو۔

غالب کے زمانے کا معاشرہ نہ اتنا پیچیدہ تھا اور نہ ایسا کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص مروتاً یا اخلاقاً سفارش کر کے اس کے خلاف کہتا بھی تو غالب کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ بے غرض اور انسان دوست ایسا نہیں کرتے۔ حالی ؔ غالب کے کردار کے گواہ ہیں اور حالی کی شرافت پر ایمان لا کر ان کی راست گفتاری کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔

غالب چونکہ اپنے دور کے ممتاز آدمی تھے، اس لیے لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے مدد چاہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے لیے دوسرے معاملات کی مانند سفارش کے لیے بھی چند اصول مقرر کر رکھے تھے اور وہ ہر شخص کی سفارش نہ کرتے تھے۔ سب سے پہلے ان کے سامنے یہ بات رہتی تھی کہ جس شخص کی سفارش کر رہے ہیں، وہ سفارش کا مستحق بھی ہے یا نہیں، اس کے ساتھ ہی انہیں اس بات کا بھی خیال رہتا تھا کہ جس شخص سے سفارش کی جا رہی ہے، وہ اس سفارش کے مطابق کرے گا بھی یا نہیں۔

اگر حاجت مند اور متعلقہ شخص دونوں سے ان کے مراسم ہوتے تو خاموشی اختیار کرتے، راست نہ لکھتے اور کسی دوسرے شخص سے مراسلت کے ذریعے حالات معلوم کرتے رہتے، لیکن ان کی ہمدردیاں ہمیشہ حاجت مند کے ساتھ رہتیں، راست گفتگو ہوتی تو حاجت مند کی تائید کرتے تھے۔

مثال کے طور پر قربان علی بیگ سالک اور شمشاد علی بیگ رضوان، دونوں بھائیوں سے غالب بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہتے اور ان کی بہتری چاہتے تھے، چنانچہ رضوان کو ایک خط میں فرزند دل بند لکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان شرفا کی حالت نہایت خستہ و خراب ہوگئی تھی۔ سالک اور رضوان دونوں بے روزگار تھے اور پریشان، اس لیے ایک خط میں علائی کو لکھتے ہیں:

"کل شمشاد علی بیگ ناقل تھے کہ مجھ سے علی حسین کہتے

تھے کہ نواب صاحب (امین الدین احمد خاں) فرماتے ہیں ، لوہارو چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے ، میں نے کہا کہ میں دال روٹی چاہتا ہوں مگر پیٹ بھر کے" ۔ غالب کہتا ہے کہ اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ سالک سے سلوک منظور نہیں ۔ تنہا ہوائے شمشاد د سراست ۔

رموز مملکت خویش خسرواں دارنند
گدائے گوشہ نشینی ، تو حافظا مخروش"

دیکھیے اس مخروش میں کس قدر خروش ہے ۔ کتنی آرزو ہے کہ دونوں بھائی (سالک و رضوان) روزگار سے لگ جائیں ۔ امین الدین احمد خاں غالب کے برادر نسبتی ہیں اور لوہارو کے نواب ، لیکن غالب انھیں راست نہیں لکھتے ، اس خیال سے کہ کہیں بات رد نہ ہو جائے ، کہیں ان کی ہیٹی نہ ہو جائے ۔ چنانچہ ایک اور خط علائی کو لکھا :

" مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا ہے اور آیندہ جوکچھ لکھو گے ، میری طرف سے وہی جواب ہوگا جو آگے لکھ چکا ہوں ، یعنی میں تماشائی محض رہوں گا ۔ اگر بھائی صاحب (امین الدین احمد خاں) مجھ سے ذکر کریں گے تو بھی نہ کہوں گا "۔

اور جب رضوان لوہارو پہنچ گئے تو انھی علائی کو غالب نے لکھا :

"جان غالب ، مگر جسم سے نکلی ہوئی جان ۔ قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے ، خدا کا احسان ، مرزا قربان علی بیگ تمھاری کشش سے مجذوب کیوں بنتے ، وہ تو خود سالک ہیں ۔ مگر ہاں ، یہ صاحب زادۂ سعادت مند رضوان ! سو اس کے آپ مالک ہیں ، نواب صاحب کا ہم مطبخ اور آپ کا ہم مائدہ ہونا بہتر ہوگا ۔ کاش تم یہ لکھتے کہ مشاہرہ کیا مقرر ہوا ۔

اثنا عشری ایک تم ہو ، سو تمھیں اختیار ہے ، البتہ عشرۂ مبشرہ کی اولیت پر مدار ہے ۔ باپ تمھارا خلاف قاعدہ اہل سنت و جماعت عشرہ میں سے ثلثہ کو کم کرتا تھا ۔ رضوان نے نہ مانا ، وہ کیونکر مانتا ، وہ ثلثہ کا دم بھرتا تھا .... رضوان کو دعا

پہنچے ، نواب صاحب کی عنایات اور مولانا علائی کی صحبت مبارک ہو ۔

یہ بڑا دلچسپ خط ہے ۔ میرے دوست قدرت نقوی نے اثنا عشری سے شیعہ مراد لیا ہے (۱) لیکن یہاں معاملہ صرف تنخواہ کا تھا ۔ علائی ، رضوان کو بارہ روپے دلوانا چاہتے تھے ۔ امین‌الدین احمد خاں سات روپے دینا چاہتے تھے (عشرہ سے ثلثہ کم) اور رضوان دس روپے کے طالب تھے ۔ اس کی وضاحت ، علائی کے نام ایک اور خط سے ہو جاتی ہے ، جس میں لکھتے ہیں :

'' بچارے مرزا (رضوان) کا معاملہ علی حسین خاں بہادر کی معرفت طے ہوگیا ۔ یہاں پندرہ کا سوال ، وہاں دس میں سے تین کم کرنے کا خیال ...... مرزا قانع و متوکل ہیں ۔ نہ پندرہ مانگتے ہیں نہ دس ۔ اللہ بس ماسوا ہوس ''۔

اب ذرا مرزا علی حسین خاں سے متعلق ایک سفارش نامہ ملاحظہ ہو۔ ان کا تعلق دلی کے ایک ذی مرتبت خاندان سے تھا اور نواب امین‌الدین خاں کے متوسل تھے ۔ بیوی کی بیماری اور شاید کچھ خاندانی جھگڑوں کے باعث رخصت لے کر لوہارو سے دلی آئے اور جلد واپس نہ جاسکے ، اس لیے علائی نے بار بار غالب کو خط لکھے ، جن میں علی حسین خاں کے واپس نہ آنے کی شکایت کی گئی تھی ۔ مرزا علی حسین خاں ، غالب سے جا کر ملے اور حالات سنائے تو غالب نے علائی کو ان کے بارے میں لکھا :

'' مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے ، میں نے خطوط مرسلہ تمھارے یک مشت ان کو دیے ۔ اب تمھارے پاس بھیجنے کا ان کو اختیار ہے ۔ علی حسین خاں سے آنے کی حقیقت اور یہاں اقامت کی مدت پوچھی گئی ۔ جواب پایا کہ ایک مہینے اور دس دن کی رخصت لے کر آیا ہوں ۔ بی بی بیمار ہے ۔ اس کا استعلاج منظور ہے ۔

میری جان بھی علی حسین کے کام آئے تو دریغ نہ کروں ۔ بھلا یہ

۱- ماہ نو ، فروری ۱۹۶۲ء

مبالغہ سہی بلکہ بے شک تبلیغ و غلو ہے لیکن قریب قریب اس کے یعنی جو چیز امکان سے باہر ہو۔ مگر سوچو کہ آئین غم خواری و اندوہ گساری کیا ہوگا۔

مرزا بد وضع و بد روش نہیں کہ پند و بند کا محتاج ہو۔ رہے امور خانگی یعنی بی بی اور اس کے آبا و اخوان کے معاملے، ان میں نہ تم کو دخل نہ مجھ کو مداخلت، تم علی حسین خاں کو اس پیوند پر کیا چھیڑتے ہو، اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا دادا کتنا بڑا آدمی تھا! اور اس کی سسرال ایک ہے - یہ ذریعہ فخر ہے اس کو اور اس کے طفیل سے تم کو بلکہ تھوڑی سی نازش اگر مجھ ننگ اقربا کے حصے میں بھی آجائے تو کچھ بعید نہیں"۔

دیکھا آپ نے کہ غالب نے ایک شریف اور پریشان حال شخص کی جس کے بزرگوں سے ان کے مراسم تھے، کس طرح تائید سفارش اور ہمدردی کی ہے اور کس طرح اس کی پریشان حالی کے زمانے میں علائی سے چاہا ہے کہ اسے اس پریشانی کے وقت میں نہ چھیڑیں اور اس وقت تک انتظار کریں کہ وہ شخص جو 'بد وضع' بھی نہیں اور بد روش بھی نہیں، معاملات سے فراغت پا کر اپنی خدمت پر رجوع ہو جائے۔

- - -

علائی کے چچیرے بھائی اور ضیاالدین احمد خاں نیر کے بیٹے، شہاب الدین احمد خاں ثاقب تھے، گویا غالب کے پوتے - ۱۸۶۱ء کا زمانہ تھا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے اثرات چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ لوگ تلاش روزگار میں مارے مارے پھر رہے تھے - ان میں سے ایک سید حسن علی، غالب کے پاس بھی پہنچے اور غالب نے ثاقب کو سفارش نامہ لکھا۔

"نور چشم شہاب الدین کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ یہ جو رقعہ لے کر پہنچتے ہیں، ان کا نام حسن علی ہے اور یہ سید ہیں، دوا سازی میں یگانہ، رکاب داری میں یکتا۔ جان محمد ان کا باپ ملازم سرکار شاہی تھا - اب ان کا چچا، میر فتح علی پندرہ روپے کا الور میں نوکر ہے۔ بہرحال کہا گیا کہ پانچ روپے مہینا ملے گا اور لوہارو جانا ہوگا۔

انکار کیا کہ پانچ روپے میں کیا کھاؤں گا! یہاں زن و فرزند کو کیا بھیجواؤں گا؟ جواب دیا کہ سرکار بڑی ہے۔ اگر

تمھارا کام پسند آئے گا تو اضافہ ہو جائے گا ۔ اب وہ کہتا ہے کہ خیر توقع پر یہ قلیل مشاہرہ قبول کرتا ہوں مگر دونوں وقت روٹی سرکار سے پاؤں ۔ بغیر اس کے کسی طرح جا نہیں سکتا ۔

سنو میاں ! حق بجانب اس غریب کے ہے ۔ روٹی بغیر بات نہیں بنتی ۔ یقین ہے تم رہوٹ نرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم کا آجائے گا ۔ یہ قصہ فیصل ہوا ۔ اب وہ کہتا ہے کہ دو ماہ مجھے پیشگی دو تا کہ کپڑا لتا بنواؤں اور کچھ گھر دے جاؤں ، راہ میں روٹی اور سواری سرکار سے پاؤں ۔ تو یہاں بھی حق بجانب سائل کے جانتا ہوں مگر کچھ کہہ نہیں سکتا ، خیر ، تم یہ میرا رقعہ اپنے نام کا علائی مولائی کو بھیج دو "۔

غالب نے یہ سفارش نامہ شہاب الدین احمد خاں کو حسن علی رکابدار کے ساتھ اس کی ملازمت کے لیے بھیجا ۔ پہلے اس کا سماجی مرتبہ بتایا کہ یہ سید ہیں ، پھر اس کی لیاقت کا حال بتایا کہ دواسازی میں یگانہ اور رکابداری میں یکتا ہیں ۔ پھر باپ اور چچا کے معاشی درجے کا ذکر کر کے تحواہ کا تعین کیا اور اس کے بعد تنخواہ کے ساتھ کھانا ، گھر کے انتظامات کے سلسلے میں کچھ پیشگی رقم اور آخر میں جانے کا کرایہ لکھا ، اور ان سب معاملات میں حق بجانب سائل قرار دیتے ہوئے اپنی مجبوری بھی ظاہر کردی کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ یہ ملے گا یا نہیں ۔ اور چونکہ خود کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے اس لیے یہ بھی لکھ دیا کہ تم یہ رقعہ علائی کو بھیج دو تا کہ مصلحت کے مطابق میری سفارش اور علی حسن رکابدار کے مسئلے پر غور کر کے فیصلہ کریں ۔

لالہ چھج مل سے غالب کے دیرینہ تعلقات تھے ۔ ساتھ بیٹھتے اور کھیلتے تھے ۔ ممکن ہے ناو نوش کا سلسلہ بھی رہتا ہو ۔ ان کے دونوں بیٹوں ، جواہر سنگھ جوہر اور ہیرا سنگھ کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے ۔ اس زمانے میں بڑے اور چھوٹے بھائیوں کے بارے میں یہ مثل مشہور تھی کہ ' سگ باش برادر خورد مباش ' کیونکہ بڑے بھائی باپ کے برابر تصور کیے جاتے تھے ۔ بات بات پر چھوٹے بھائی کی سرزنش ہوتی ، جو ان کے احکام بجا لانے پر مجبور کیے جاتے تھے ۔ جواہر سنگھ نے ہیرا سنگھ سے کچھ قطعے منگوائے اور پندرہ

روپے بھیج دے کہ ان میں خریدلو ۔ ھیرا سنگھ نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور پچیس تیس روپے اور صرف کر کے قطعے خریدے ۔ اس عرصے میں شاید جواہر سنگھ نے غالب کو ھیرا سنگھ کی شکایت لکھ بھیجی کہ وہ مطلوبہ قطعے حاصل کر کے بھیجنے میں بے پروائی برت رہا ہے ۔ اس پر غالب نے جواب دیا :

" قطعے جو تم کو مطلوب تھے ، ان کے حصول میں جو کوشش ھیرا سنگھ نے کی ہے ، میں تم سے کہہ نہیں سکتا ۔ نری کوشش نہیں ، روپیا صرف کیا ۔ پندرہ روپے جو تم نے بھیجے تھے وہ اور پچیس تیس روپے اور صرف کیے ۔ پانچ پانچ اور چا چار اور دو دو روپے کے قطعے مول لیے اور بنوائے ۔ خرید میں روپے جدا دیے اور بنوانے میں روپے جدا لگائے ، دوڑتا پھرا ۔ حکیم صاحب کے پاس کئی بار جا کر حضور والا کا قطعہ لایا ، اب دوڑ رہا ہے ولی عہد بہادر کے دستخطی قطعے کے واسطے ، یقین ہے کہ دو چار دن میں وہ بھی ہاتھ آئے اور بعد اس قطعے کے ہاتھ آنے کے وہ سب کو یک جا کر کے تمھارے پاس بھیج دے گا ۔ مدد میں بھی اس کی کر رہا ہوں لیکن اس نے بڑی مشقت کی ۔ آفریں صد آفریں ۔ پندرہ روپے میں سے ایک روپیا اپنے صرف میں نہیں لایا اور ماں کو عاجز کر کے اس سے بہت روپے لیے ۔ جب سب قطعے تمھارے پاس پہنچیں گے ، اس کا حسن خدمت تم پر ظاہر ہوگا " ۔

غالب نے اس خط میں چھوٹے بھائی کے حسن کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی محنت اور دوڑ دھوپ کی تعریف ہی نہیں کی بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور کس طرح بادشاہ کا اپنا دستخطی قطعہ لایا اور کس طرح ولی عہد کا دستخطی قطعہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ ساتھ ہی ان قطعات کی قیمتیں بھی بتادیں اور جو زائد صرفہ ہوا ہے وہ بھی جتا دیا ، جس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ جواہر سنگھ وہ رقم روانہ کردیں جو زائد صرف ہوئی ہے ۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دھلی کے اھل علم تتر بتر ہوگئے ۔ ان میں حکیموں کا ایک خاندان پٹیالے پہنچا ۔ ان میں حکیم غلام مرتضی خاں اور ان کے صاحبزادے حکیم غلام رضا خاں بھی تھے ۔ غالب نے ' نور چشم اقبال نشان حکیم غلام رضا خاں ' کو اردوئے معلی کا حق اشاعت بخشش دیا تھا ۔

موجودہ سفارش نامہ حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے نام ایک ہندو ملاقاتی کے لیے ۱۸۶۵ء میں لکھا تھا :

"خان صاحب جمیل المناقب حکیم غلام مرتضیٰ خاں صاحب کو غالب درد مند کا سلام پہنچے - خوب یاد کیجیے کہ میں نے کسی امر میں آپ کو تکلیف نہیں دی - اب ایک عنایت کا سائل ہوں - حامل هذالمکتوب ، پنڈت جے نرائن ، میرا یہ خط لے کر حاضر ہوتے ہیں - ان کے بزرگ نواب احمد بخش خاں کی سرکار میں مناصب عالیہ اور عہدہ ہائے جلیلہ رکھتے تھے ، اب موقع آیا ہے کہ جستجوئے نوکری میں پٹیالے آتے ہیں -

آپ کو میرے سر کی قسم ، جہاں تک ہوسکے ، سعی کر کے ان کو موافق ان کی عزت کے کوئی منصب ، کوئی عہدہ دلوا دو گے تو میں یہ جانوں گا کہ تم نے مجھ کو نوکر رکھوایا ہے ، بڑا احسان مند ہوں گا "-

اس خط سے مرسل اور مرسل الیہ دونوں کے تعلقات کا علم ہوتے ہوئے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو اپنے پرانے واقف کاروں کا کس قدر خیال رہتا تھا - نواب احمد بخش خاں کے ہاں ملازمت کے تعلق سے غالب ، پنڈت جے نرائن سے واقف تھے - ان کی پریشاں روزگاری دیکھ کر انھوں نے حکیم صاحب کو پہلی بار زحمت دینے کا ذکر کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بار بار کی سفارش واجب التعظیم رہ جاتی ہے، واجب التعمیل نہیں رہتی - مقصد یہ تھا کہ ان کی سفارش کو نظر انداز نہ کیا جائے اور کسی نہ کسی طرح سائل کو روزگار سے لگا دیا جائے -

آخر میں معاملے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے مرسل الیہ کو اپنے سر کی قسم بھی دلا دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ ان کو ملازمت دلوانا گویا مجھے ملازمت دلوا کر مجھ پر احسان کرنا ہے -

---

آگرے میں منشی نبی بخش حقیر غالب کے دوست اور غالب شناس تھے - سکندرہ کے رہنے والے ، صاحب عالم مارہروی کے شاگرد حکیم الٰہی بخش نے غالب سے ملازمت کے لیے سفارش چاہی تو غالب نے حقیر کو لکھا :

"... ایک خط حکیم الٰہی بخش صاحب کو دیتا ہوں ۔ یہ صاحب شرفائے سکندرہ میں سے ہیں اور دوست اور شاگرد اس کے ہیں جس کا میں بغیر دیکھے عاشق ہوں یعنی جناب صاحب عالم مارہروی سلمہ اللہ تعالے ۔

یہ ان کا خط میرے نام لائے تھے ۔ کئی مہینے یہاں رہے اور حکیم امام الدین خاں صاحب سے مفرح القلوب پڑھی ۔ بہت خوب اور مہذب آدمی ہیں ، حسن طبع بھی رکھتے ہیں ۔ یہاں ان کی نوکری کا کہیں اسلوب نہ ہوا اور زمانے نے مساعدت نہ کی ۔ اب یہ اپنے گھر جاتے ہیں کول میں پہنچ کر آپ سے ملیں گے ۔ ان کی توقیر کیجیے گا اور ان کو اپنا دوست دیرینہ تصور فرمایئے گا اور اس کا خیال آپ کو رہے کہ اس ضلع میں ٹھیکیدار اور مال گزار بہت ہیں ، اگر کسی کی خواہش طبیب کی ہو تو ان کو اس سے بخوبی ملوا دیجیے گا اور اس باب میں جلدی نہیں ہے ، خیال رہے "۔

غالب اپنے خطوں میں غیر ضروری باتیں نہیں لکھتے اور اپنے مطلب کو کم سے کم الفاظ میں لیکن جامع طور پر لکھ دیتے ہیں ۔ ان کے خطوط سے نہ صرف مرسل الیہم سے ان کے حقیقی تعلقات کا پتا لگتا ہے بلکہ اسی سلسلے میں دوسرے دوستوں سے بھی تعلقات کا علم ہو جاتا ہے ۔ متعلقہ شخص کی لیاقت اور کردار کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے نیز اس کے معاشی حالات کا بھی ۔ مثلاً اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کے معاشی حالات ایسے خراب نہ تھے کہ ان کے لیے فوری طور پر ملازمت کا انتظام کیا جاتا ، اس لیے آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ ' اس باب میں ایسی جلدی نہیں ، ہے خیال رہے '۔

انھی کو ایک اور خط میں یاد دہانی کرتے ہیں کہ " حکیم الٰہی بخش آپ کے پاس پہنچے ہیں ۔ بہت نیک بخت اور معقول آدمی ہیں ۔ ان کی پرورش کا خیال رہے اور شیخ رحمت اللہ صاحب جو آگے آپ کی بدولت کامیاب رہے ، اگر وہاں ہوں تو ان کا بھی خیال رہے ...... اگر وہاں نہ ہوں تو ان کا حال مجھ کو لکھیے " ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو ان لوگوں کا ، جن کی سفارش کرتے تھے ، کس قدر خیال رہتا تھا ۔

ان کے مقابلے میں شیخ وزیرالدین کے بارے میں لکھا کہ "شیخ وزیرالدین بہت تباہ اور خراب ہے۔ اس کا دادا بہت معزز آدمی تھا اور میرا بڑا دوست تھا۔ یہ تمہارا بھی نیازمند ہے۔ حتی الوسع خیال دوڑاؤ اور گنجائش نکالو۔ اگر کہیں نوکری قرار پا جائے تو گویا مجھ پر احسان ہوگا ... عرضی شیخ کی پہنچتی ہے۔ اس کا مناسب جواب لکھیے اور کوشش کیجیے"۔

اس خط میں بعض دوسرے مطالب لکھنے کے بعد لکھا کہ "ایک بار میری سن لو، پھر غزل پڑھو۔ شیخ وزیرالدین بیمار ہوکر کرانچی ڈاک سے کول کو روانہ ہوا ہے۔ میں اگرچہ خدمت گزار خلق ہوں پر ان کی کچھ خدمت بجا نہ لا سکا اور ان سے شرمندہ رہا۔ تم ان کی دل جوئی کرنا۔ آدمی ان کے گھر بھجوانا اور ان کی خبر پوچھنا اور بھائی اگر ہو سکے تو کسو کے یا اپنے علاقے میں مختار کاری، سررشتہ کی عرایض نویسی، کچھ نہ کچھ ان کے واسطے کر دینا۔ ضرور۔ ضرور۔ لو! اب غزل پڑھو"۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ وزیر الدین کے دادا بہت معزز آدمی اور غالب کے دوست تھے۔ اس وقت ان کی حالت بہت سقیم تھی۔ غالب کے پاس اکثر لوگ مدد اور سفارش کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو خدمت گزار خلق سمجھتے اور ہر شخص کی مدد کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ اس خط میں انھوں نے بار بار شیخ وزیرالدین کی طرف اپنے دوست حقیر کو توجہ دلائی ہے تاکہ وہ حالات کی اہمیت سمجھ کر جلد سے جلد شیخ وزیرالدین کی ملازمت کا انتظام کریں۔

انھی نبی بخش حقیر کو ایک خط میں مطلع کرتے ہیں:

"مرزا نجف علی خاں مرحوم تمہارے دوست ہوں گے۔ وہ یہاں مر گئے۔ ان کے فرزند ارجمند مرزا یوسف علی خاں کو میں اپنے فرزند کی جگہ جانتا ہوں اور ان کی سعادت مندیاں اور خوبیاں کیا بیان کروں کہ میں ان کا عاشق ہوں۔ وہ اب کول کو گئے ہیں۔ تم کو لازم ہے کہ ان کے وہاں جاؤ اور فاتحہ پڑھو اور ان کا حال ان کی زبانی سنو۔ وہ صاحبزادے ناز پروردہ، گرم و سرد زمانہ ندیدہ ہیں۔ دو ایک حویلیاں ان کے والد ماجد کی وہاں ہیں۔ خدا جانے وہ کیا کریں گے۔ آپ کو ان کی مربی گیری کرنی چاہیے

مگر وہ پنج شنبے کو روانہ ہونے (پہنچنے ؟) والے ہیں ۔ آج دو شنبے کو یہ خط میں تم کو بھیجتا ہوں ۔ یقین ہے کہ کل پہنچے گا ۔ بمجرد اس کے پہنچنے کے آپ ان سے ملیے گا ، ماتم زدہ کا بلانا مناسب نہیں ۔ آپ کو بہ تقریب تعزیت جانا چاہیے ، یہ خط جو آپ کے نام ہے ، ان کو پڑھا دیجیے" ۔

اس خط سے جو کسی ملازمت کے لیے نہیں ، بلکہ محض ہمدردی کی بنا پر لکھا گیا ، معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو اپنے دوستوں اور ان کی اولاد کا کس قدر خیال رہتا تھا ۔ مرزا یوسف علی خاں کے والد منشی نبی بخش حقیر اور غالب ، دونوں کے دوست تھے ۔ غالب نے ان کے انتقال کی خبر ، حقیر کو دیتے ہوئے بتایا کہ مرزا یوسف نوجوان ہیں ، حالات زمانہ سے نا واقف ۔ ساتھ ہی آگرے میں ان کی حویلیوں کا ذکر کرتے ہوئے اشارہ کردیا کہ ایسا نہ ہو اوجوان یوسف ، انھیں اونے پونے بیچ دیں ۔ اس لیے لکھ دیا کہ تم ان کے دوست کی حیثیت سے ان کے مربی بن جاؤ ، تاکہ نقصان نہ اٹھائیں ۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ ایسا نہ ہو نبی بخش اپنے آپ کو بزرگ سمجھ کر مرزا یوسف کے پاس جانے کے بجائے انھیں اپنے پاس طلب کریں ۔ اس لیے لکھ دیا کہ ماتم زدہ کا بلانا مناسب نہیں ، آپ کو بہ تقریب تعزیت جانا چاہیے ۔ خط پڑھوا دینے سے مقصد یہ تھا کہ یوسف مرزا حقیقت حال سے واقف ہو جائیں اور نبی بخش حقیر کو غالب کی جگہ جان کر اپنا مربی و سرپرست سمجھیں اور ان کے حسب ہدایت کام کریں ۔

میر غلام حسنین قدر بلگرامی ، اپنے دور کے فضلا میں سے تھے لیکن بیروزگار تھے اور پریشان حال ، غالب اس سے واقف تھے ، ان کا دل اپنے شاگرد کی پریشانی پر کڑھتا تھا ، سوچتے تھے کہ کیا کروں اور کس طرح اپنے شاگرد کو اس کی پریشانیوں سے نجات دلاؤں ۔ اسی زمانے میں منشی نولکشور سے غالب کے تعلقات پیدا ہو چکے تھے ۔ وہ دلی آکر غالب سے ملے اور ان کی کتابیں چھاپ رہے تھے ۔ غالب کو نولکشور کی فارغ البالی اور قدر کی لیاقت کا خیال آیا ، اس لیے انھوں نے لکھا ۔

"صاحب ! تم بہت دن سے بیکار ہو ۔ ایک جگہ مساعدت روزگار کی صورت ہے ۔ بے تکلف یہ رقعہ مہری لے کر لکھنؤ چلے جاؤ ۔

مطبع اودھ اخبار میں میرے شفیق دلی ، یعنی منشی نولکشور صاحب سے ملو اور یہ رقعہ انھیں پڑھوادو ۔ اپنی نظم و نثر اُن کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم اُن پر ظاہر کرو ۔ اگر وہ اپنی مرضی کے موافق تم کو کار گزار سمجھیں گے تو مطبع کا کام تمھارے سپرد کردیں گے ۔ مشاہرہ خاطر خواہ تم کو مقرر ہو جائے گا ۔ معزز و مکرم رہوگے ۔ زندگی کا لطف اٹھاؤ گے لیکن شرط یہ ہے کہ جلد چلے جاؤ ۔ لکھنؤ تم سے نزدیک ہے ۔ اتنی راہ قطع کرنا کچھ دشوار نہیں ، اگر نوکر نہ ہوجاؤ گے پھر چلے آنا ۔ بخت ازمائی ہے''۔

غالب اپنے دوسرے اوصاف کے علاوہ نہایت موقع شناس آدمی تھے ۔ اس خط میں انھوں نے راست نولکشور کی بجائے قدر کو مخاطب کرکے اپنے ' شفیق دلی منشی نولکشور ' سے جلد جا کر ملنے کے لیے لکھا ، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ نولکشور کے پاس وہ کام ہورہا ہے جو قدر کے مزاج کے مطابق تھا ، یعنی علمی کام ۔ دوسرے یہ کہ غالب کے تعلقات چونکہ منشی نولکشور سے خوشگوار تھے ، اس لیے انھیں یقین تھا کہ وہ غالب کے بھیجے ہوئے شخص کو ٹالیں گے نہیں ۔ تیسری بات یہ تھی کہ انھیں قدر بلگرامی کی علمی لیاقت پر اعتماد تھا ۔ چوتھی بات یہ کہ وہ چاہتے تھے کہ قدر کو خاطر خواہ مشاہرہ ملے ۔ اسی لیے انھوں نے لکھا کہ منشی نولکشور سے مل کر یہ رقعہ انھیں پڑھوادو ۔ اپنی نظم و نثر ان کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم ان پر ظاہر کرو ۔ آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ اگر نوکری نہ ملے فکر نہ کرنا ۔ اس کوشش کو بخت آزمائی سمجھنا اور مایوس نہ ہونا ۔ ملازم ہوجاؤ تو بہتر ہے ۔ نہ ہو تو کوئی نقصان نہیں ۔ بلگرام سے لکھنؤ کچھ دور بھی نہیں ، صرف تھوڑا سا کرایہ صرف ہوگا لیکن کامیابی کی توقع ہے ، اس لیے جانا ہی بہتر ہے ۔

منشی امیر احمد امیر مینائی ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے ۔ غالب سے عمر میں ۳۲ سال چھوٹے اور اسیر کے شاگرد تھے ، ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھنؤ میں اپنی شعر گوئی سے عزت اور ناموری حاصل کرچکے تھے ۔ رام پور اس وقت دہلی اور لکھنؤ سے نکلے ہوئے شاعروں کا مرجع اور مرکز تھا ۔ اس لیے امیر بھی وھیں پہنچ گئے اور انھوں نے منشی شیو نرائن کے پندرہ روزہ رسالے ' معیار الشعرا '

میں چھپنے کے لیے غزلیں بھیجیں لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ جس پر شیو نرائن نے 'معیار الشعرا' میں لکھا :

'' امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں ۔ ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ، ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے ''۔

امیر مینائی کو غالب اورشیو نرائن کے تعلقات کا علم تھا ، دستنبو کا پہلا اڈیشن انہی کے مطبع ، مفید خلایق سے شایع ہوچکا تھا ۔ اس لیے انھوں نے اپنی غزلیں غالب کے پاس اشاعت کے لیے بھیجیں ۔ وہ 'معیار الشعرا' میں امیر سے متعلق شیو نرائن کا نوٹ پڑھ چکے تھے ، اس لیے انھوں نے فوراً شیو نرائن کو لکھا : (۱۲ جون ۱۸۵۹ء)۔

'' اب تم یہ بتاؤ کہ رئیس رام پور کے ہاں بھی تمھارا اخبار یا 'معیار الشعرا' جاتا ہے یا نہیں ۔ اب کے تمھارے 'معیار الشعرا' میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں ، ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ، ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے ''۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں ، لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں ، میں ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں ۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو ۔ یعنی یہ غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا نام اور حال وہ ہو میں اوپر لکھ آیا ہوں ، اس کو اب 'معیار الشعرا' میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چہار ورقہ رام پور ان کے پاس بھیج دو اور سرنامے پر لکھو : در رامپور ، بر در دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد صاحب امیر تخلص برسد''۔

اس خط سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے باعث ۱۸۵۹ء میں بھی 'معیار الشعرا' جیسے گل دستوں میں ، شاعر کے بارے میں تفصیلات معلوم کیے بغیر ، غزلیں بھی چھاپتے ہوئے ڈرتے تھے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ امیر مینائی نے 'معیار الشعرا' میں چھپنے کے لیے راست غزلیں بھیجی تھیں اور جب شیو نرائن نے شایع کرنے کی بجائے متذکرہ نوٹ لکھا تو

امیر مینائی نے اپنی غزلیں ، غالب کے پاس بھیجیں کہ وہ شیو نرائن کو اپنی طرف سے بھیج کر ، شایع کرادیں ۔

تیسری بات یہ کہ امیر مینائی غالباً نواب رام پور کے محل ہی کے کسی حصے میں رہتے تھے ، علاحدہ قیام نہ تھا ۔ اگرچہ نواب کی قیام گاہ کا پتا لکھنے سے یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ شیو نرائن کا گل دستہ شعر یعنی 'معیار الشعرا' بھی نواب کی نظر سے گزرے اور امیر کا کلام بھی ، جس سے ممکن ہے دونوں کو فائدہ پہنچ سکے ۔

آخر میں ایک اور سفارش نامہ ملاحظہ ہو ۔ اس میں حکیم مرزا جان خلف الصدق حکیم آغا جان کی سفارش کی گئی ہے ۔ یہ وہی حکیم آغا جان ہیں جن کا تخلص عیش تھا اور جنھوں نے ایک طرحی مشاعرے میں غالب کو مخاطب کرتے ہوئے پڑھا تھا :

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

عیش نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے چند روز بعد انتقال کیا ۔ اس زمانے میں دلی کے اہل علم مارے مارے پھرنے لگے ۔ ان میں عیش کے بیٹے حکیم مرزا جان بھی تھے ۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں غالب کے محبوب شاگرد منشی جواہر سنگھ جو ہر بلب گڑھ کے تحصیلدار ہو گئے تھے ۔ اس زمانے میں کسی دیسی باشندے کے لیے تحصیلداری بہت بڑا عہدہ تھی ۔ حکیم مرزا جان وہاں صیغۂ طبابت میں ملازم تھے ، اس لیے غالب نے جواہر سنگھ کو لکھا :

"برخوردار کامگار ، سعادت و اقبال نشان منشی جواہر سنگھ کو بلب گڑھ کی تحصیلداری مبارک ہو ۔ پہلی سے نوح آئے اور نوح سے بلب گڑھ گئے ۔ اب بلب گڑھ سے دلی آؤ گے ۔ ان شاء اللہ ۔

سنو صاحب ! حکیم میرزا جان خلف الصدق حکیم آغا جان صاحب کے ، تمھارے علاقۂ تحصیل داری میں بصیغۂ طبابت ملازم

سرکار انگریزی ہیں ، ان کے والد ماجد میرے پچاس پچپن برس کے دوست ہیں ، ان کو اپنے بھائی کے برابر جانتا ہوں ۔ اس صورت میں حکیم مرزا جان میرے بھتیجے اور تمھارے بھائی ہوئے ۔

لازم ہے کہ ان سے یک دل و یک رنگ رہو اور ان کے مددگار بنے رہو ۔ سرکار سے یہ عہدہ بصیغۂ دوام ہے ۔ تم کو کوئی نئی بات پیش کرنی ہوگی ۔ صرف اسی امر میں کوشش رہے کہ صورت اچھی بنی رہے ۔ سرکار کے خاطر نشان رہے کہ حکیم میرزا جان ہوشیار اور کارگزار آدمی ہے " ۔

غالب کے اس سفارش نامے میں کسی نئی جگہ پر تقرر کے لیے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ جواہر سنگھ کو ایک بیٹے کے مانند ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ایک دیرینہ دوست کے بیٹے کو اپنے بھائی کی طرح سمجھیں ؛ یک دل و یک رنگ رہیں اور حسب موقع ان کی تائید کرتے رہیں تاکہ وہ اپنی ملازمت پر قائم رہیں اور سازشیوں کی شرارتوں سے بچ کر اپنی مفوضہ خدمات انجام دے سکیں ۔

غالب کے یہ سفارش نامے بھی ان کے دوسرے خطوط کی طرح ان کے مزاج ، ان کے علم ، ان کی ہمدردی ، انسانیت اور دوست نوازی کی غمازی کرتے اور ان کی بلند شخصیت کو بے حجاب کرتے ہیں ۔

غالب و مجروح کی مکاتبت

سید معین الرحمان

میر مہدی حسین مجروح دہلوی (۱۸۳۳ء-۱۹۰۳ء) غالب کے عزیز شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے - ۱۸۹۹ء میں ان کا دیوان ' مظہر معانی ' کے تاریخی نام سے شائع ہوا - میر مہدی مجروح '' غالب کے تلمذ پر فخر کرنے والوں میں لائق ترین گنے جاتے تھے''- (۱) ۱۸۸۰ء میں نواب ضیاء الدین احمد خان نیر و رخشاں کے انتقال پر دلی میں ایک یادگار مشاعرہ ہوا - اس میں حالی ، داغ ، مجروح اور دوسرے بہت سے اکابر شعرا نے شرکت کی - حالی نے اس مشاعرے میں مجروح کو داد دیتے ہوئے سامعین سے یوں خطاب فرمایا تھا :

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

مجروح محض قادر الکلام شاعر ہی نہ تھے ، نثر میں بھی استادانہ قدرت رکھتے تھے- مالک رام لکھتے ہیں کہ مجروح نے :

'' دو نثری رسالے بھی یادگار چھوڑے - ایک حضرت رسول کریم کے معجزات کے بیان میں ' انوارالاعجاز ' اور دوسرا ائمہ کے بیان میں ' ہدیۃ الائمہ ' - دونوں اب کمیاب ہیں - ایک تذکرہ ' طلسم راز ' بھی لکھا تھا ، یہ بھی اب نایاب ہے - اس پر غالب

۱- سرشیخ عبدالقادر ' مخزن ' لاہور ' مئی ۱۹۰۳ء ' ص ۵۵ -

نے جو تقریظ فارسی میں لکھی تھی ، وہ ان کی کلیات نثر میں موجود ہے "۔

[تلامذہ غالب ، طبع اول ، ص ۲۰۳]

ان نثری یادگاروں کے علاوہ ' تاریخ گنج غرائب ' (۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء) بھی مجروح سے منسوب ہے ۔ اس کا ایک خطی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے ۔ اردوے معلیٰ کا دیباچہ بھی مجروح کا لکھا ہوا ہے ۔ غالب نے اپنے ایک سے زیادہ خطوں میں مجروح کے اردو عبارت لکھنے کے ڈھنگ کی داد دی ہے اور اس پر رشک کیا ہے اور یہ بہت بڑی سند ہے اس بات کی کہ مجروح کو نثر میں خاص مہارت حاصل تھی ۔

اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں مجروح کے نام غالب کے پچاس کے لگ بھگ خط شامل ہیں اور ابھی بہت سے خط ایسے ہوں گے جو سامنے نہیں آئے ۔ خود غالب کے نام (۱) مجروح کے خطوں کا ایک بڑا ذخیرہ خوبیٔ قسمت سے محفوظ لیکن اشاعت کا منتظر ہے ۔ چودہ برس ہوئے آفاق حسین آفاق دہلوی نے اپنے ایک مضمون میں ' مکتوبات غالب و مجروح ' کے اس ذخیرے کی نشان دہی کی تھی (۲) ۔ مولوی مہیش پرشاد (۳) اور فاضل زیدی (۴) بھی مختلف مواقع پر مجروح کے متفرق مکاتیب شائع کر چکے

۱- غالب کے نام خطوں کی تلاش ایک دل چسپ موضوع ہے ۔ اسی طرح کا ایک مجموعہ ' بنام غالب ' اکبر علی خاں نے آٹھ دس برس کی محنت سے ترتیب دیا ہے ۔ غالب کے مکتوب الیہم کے کئی سو خطوط جو غالب کے نام لکھے گئے ، اس مجموعے میں شریک کیے گئے ہیں ۔ ان میں سے بہت سے خط ایسے ہیں جن کا علم غالب دوستوں کو نہیں اور جن سے خود غالب کے خطوط کے مفاہیم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔ جن لوگوں کے خطوط اس میں شامل ہیں ان میں مجروح ، بے خبر، شیفتہ ، تفتہ ، بے صبر ، ناطق مکرانی ، ذکا حیدرآبادی وغیرہ کے نام آتے ہیں ۔ یہ مجموعہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے شائع ہو رہا ہے ۔

۲- ماہ نو کراچی ، فروری ۱۹۵۵ ء

۳- اردو ادب علی گڑھ ، جنوری - اپریل ۱۹۵۱ء

۴- طوفان ، نواب شاہ ، فروری ۱۹۵۲ء

ہیں ۔ اس موقع پر اسی سلسلے کی ایک نادر کڑی کے طور پر " غالب و مجروح کی مکاتبت " پیش کی جاتی ہے ۔ اس عنوان سے یہ مکاتیب آج سے پچپن برس پہلے مولوی عبدالحق مرحوم کی مختصر تمہید کے ساتھ رسالہ ' الناظر ' لکھنؤ بابت یکم مئی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئے تھے اور اب بالعموم نظر سے اوجھل تھے ۔ ان خطوں کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ نامۂ غالب	:	ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء
جواب مجروح	:	مارچ ۱۸۵۹ع
۲۔ نامۂ غالب	:	۲۷ - مارچ ۱۸۵۹ء
جواب مجروح	:	اپریل ۱۸۵۹ء
۳۔ نامۂ مجروح	:	جون ، جولائی ۱۸۵۹ء
جواب غالب	:	۶ - جولائی ۱۸۵۹ء
۴۔ نامۂ غالب	:	۲ - دسمبر ۱۸۵۹ء
جواب مجروح	:	دسمبر ۱۸۵۹ء
جواب الجواب از غالب	:	۱۴ - دسمبر ۱۸۵۹ء
۵۔ نامۂ غالب	:	۱۸۶۱ء
جواب مجروح	:	مئی ۱۸۶۱ء
جواب الجواب از غالب	:	۲۳ - مئی ۱۸۶۱ء

میں نے غالب کے ان خطوں کا ' خطوط غالب ' مرتبہ مالک رام (مطبوعہ علی گڑھ ۶۳ - ۱۹۶۲ء) سے مقابلہ کیا تو کہیں کہیں متن میں فرق پایا ۔ بعض صورتوں میں ان خطوں میں فقرے کے فقرے زیادہ ہیں ، ایک آدھ موقع پر یہاں غالب کے خط پر تاریخ و سنہ درج ہے لیکن ' خطوط غالب ' میں موجود نہیں اور یہ ان خطوں کی بڑی وجہ اہمیت ہے ۔ اس طرح کے سارے قابل ذکر اختلافات حواشی میں ظاہر کر دیے گئے ہیں ۔ ' الناظر ' میں یہ خط بغیر کسی ترتیب کے درج تھے ۔ میں نے اس ترتیب کو بجنسہ قائم نہیں رکھا ۔ اب یہ خط سلسلہ وار مع جوابات درج کیے گئے ہیں ۔

مولوی عبدالحق کی تمہیدی عبارت: (۱)

" میرن صاحب (۲) مرحوم نے جنھوں نے مرزا غالب کی آنکھیں دیکھی تھیں اور مرزا غالب بھی اُن سے بہت محبت کرتے تھے جیسا کہ اُن کے واقعات [رقعات ؟] سے ظاہر ہے ، میرے لیے چند رقعے جناب مرزا صاحب کے مع میر مہدی مجروح (۳) مرحوم کے جوابات کے نقل بھیجے تھے - بیچارے میرن صاحب تو اپنے گھر سدھارے مگر اُن کی یہ یادگار میرے پاس رہ گئی - اگرچہ ان میں سے بعض رقعے چھپ چکے ہیں مگر میر مہدی مجروح کے رقعات کے ساتھ ان کا لطف دوبالا معلوم ہوگا - نیز اس زمانے کی حالت ، باہمی تعلقات و محبت اور اُن کے خیالات کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا -

اب نہ وہ لوگ ہیں اور نہ وہ محبت و اخلاص ، البتہ اُن کی باتیں یاد

۱- الناظر لکھنؤ ، جلد ۱۰ ، نمبر ۵۹ ، یکم مئی ۱۹۱۴ء ص، ۱ - ۱۰

۲- میرن صاحب کے تعارف کے لیے رجوع کیجیے ،مضمون مولوی عبدالحق :

(i) اُردو ، اورنگ آباد ، جولائی ۱۹۳۶ء ، ص ۳۷۰ - ۳۸۴

(ii) چند ہم عصر ، طبع کراچی ۱۹۵۹ء ، ص ۲۰۷ - ۲۲۴

۳- میر مہدی مجروح کے حالات کے لیے رجوع کیجیے :

۱- گل رعنا ، حکیم سید عبدالحی ، طبع ثانی اعظم گڑھ ۱۳۵۳ھ ، ص ۴۳۱ تا ۴۳۶ - ۲- تاریخ ادب اُردو، سکسینہ، مترجمہ عسکری ، طبع لکھنؤ ۱۹۵۲ء، ص ۳۴۰ ، ۳۴۱ - ۳- تلامذۂ غالب ، مالک رام ، طبع اول ۱۹۵۷ء، ص ۲۵۲ تا ۲۵۵ - ۴- مضمون : سر شیخ عبدالقادر ، مخزن لاہور ، مئی ۱۹۰۳ء ، ص ۴۵ تا ۵۶ - ۵- حسرت موہانی ، اُردوے معلیٰ ، علی گڑھ جولائی ۱۹۰۳ء ، ص ۵۴ تا ۷۴ - ۶- وجاہت علی صدیقی جھنجھانوی ، مخزن لاہور ، مئی ۱۹۰۷ء، ص ۵۹ تا ۶۵ - ۷- سید محمد فاروق ، العصر لکھنؤ ، جون ۱۹۱۳ء، ص ۱۸۶ تا ۱۹۰ - ۸- محمد یحییٰ تنہا ، زمانہ کانپور ، ستمبر ۱۹۳۰ء - ۹- قضا جالندھری ، عالمگیر لاہور، اکتوبر ۱۹۳۷ء - ۱۰- فرحت شاہ جہاں پوری ، صحیفہ لاہور اگست ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۰ تا ۲۲۱ - ۱۱- فاضل زیدی ، پگڈنڈی امرتسر ، مارچ ۱۹۶۰ء -

رہ گئیں - شاید آپ کے ناظرین انھیں پڑھ کر مزا لیں اور دیکھیں کہ جس کے زور قلم اور قوت تخیل سے نہ صرف اردو کو بلکہ خود صنف شعر کو ناز ہے ، معمولی سے معمولی باتوں میں بھی ایک بات پیدا کرتا ہے اور اپنے ملنے والوں سے کس محبت اور پیار سے پیش آتا ہے - یہی چھوٹی چھوٹی باتیں اور معمولی معمولی چیزیں ہیں جن سے انسان کے اصل کیریکٹر کا پتا لگتا ہے "-

عبد الحق (۱)

۱- غالب ، تصانیف و نگارشات غالب یا تصانیف متعلق بہ غالب کے بارے میں مولوی عبدالحق مرحوم کے بعض بیانات کے سلسلے میں دیکھیے :

۱- رپورٹ انجمن ترقی آردو، بابت جنوری ، مارچ ۱۹۱۴ء در ضمیمہ الناظر ، لکھنؤ مئی ۱۹۱۴ء - ۲- ایضاً ، بابت اپریل ۱۹۱۴ء در ضمیمہ الناظر لکھنؤ جون ۱۹۱۴ء ، بہ بعد صفحہ ۴۵ - ۳- آردو ، اورنگ آباد، جنوری ۱۹۲۱ء ص ۹ - ۴- آردو ، اکتوبر ۱۹۲۱ء، ص ۶۳۹ - ۵- اردو ، جنوری ۱۹۲۳ء ص ۱۴۸، ۱۴۹ - ۶- آردو ، اپریل ۱۹۲۴ء، ص ۳۵۹ تا ۳۶۳- ۷- آردو ، جولائی ۱۹۲۴ء، ص ۵۰۱ تا ۵۰۴ - ۸- آردو ، اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۳۷۹ - ۹- آردو ، جولائی ۱۹۲۸ء، ص ۳۲۷ تا ۳۲۹ - ۱۰- آردو، جنوری ۱۹۲۹ء، ص ۱۶۳ تا ۱۶۷- ۱۱ - آردو ، اپریل ۱۹۲۹ء، ص ۱۷۹ - ۱۲- آردو ، جولائی ۱۹۲۹ء- ص ۵۸۱، ۵۸۲ -۱۳- آردو ، اکتوبر ۱۹۲۹ء، ص ۷۹۳، ۷۹۴ - ۱۴- آردو ، جنوری ۱۹۳۳ء، ص ۲۲۸ تا ۲۳۰ - ۱۵- آردو ، جنوری ۱۹۳۴ء، ص ۱۹۴، ۱۹۵- ۱۶- آردو ، اکتوبر ۱۹۳۵ء، ص ۴۱۴ - ۱۷- آردو ، ۱۹۳۶ء، ص ۷۰۱ تا ۷۰۵- ۱۸ - آردو ، جنوری ۱۹۴۰ء، ص ۱۵۸ تا ۱۶۰ - ۱۹ - آردو ، اپریل ۱۹۴۲ء، ص ۱۵۱ ، ۱۵۲ - ۲۰- آردو ، اپریل ۱۹۴۳ء، ص ۱۴۲ تا ۱۷۰ - ۲۱- آردو ، اکتوبر ۱۹۴۴ء، ص ۵۵۸ ، ۵۵۹ - ۲۲ - سرنامہ ، نادرات غالب (آفاق) ، طبع اول ، کراچی ۱۹۴۹ء، ص ۴۰۳ - ۲۳- آردو ، کراچی ، اپریل ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۸ تا ۱۶۰ - ۲۴ - آردو ، جولائی ۱۹۵۰ء، ص ۴۰۷- ۲۵- آردو، جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۴۱۴، ۴۱۵- ۲۶- آردو ، جنوری اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۲۲۵ تا ۲۲۷- مقدمات عبدالحق (مرتبہ عبادت بریلوی)، لاہور ۱۹۶۴ء ، ص ۴۰۲ ، ۴۰۳ - ۲۸- قومی زبان ، کراچی ، فروری ۱۹۶۷ء، ص ۷ تا ۹-

نامۂ غالب : (۱)

میر مہدی ! جیتے رہو - آفرین ، صد ہزار آفرین (۲) - اردو عبارت لکھنے کا کیا (۳) اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا - سنو دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے - یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی ، سو ایک ظالم ، پانی پتی ، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا - میں نے اس کو بحل کیا ، اللہ برکت دے میری (۴) پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کماحقہ سمجھ لو - والمرحوم الطاف خفیہ - ایک طرز خاص پر تحریک ہوئی - سر رشتہ کی پابندی ضرور ہے (۵) نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں

۱- رسالہ الناظر لکھنؤ ، جلد ۱۰ ، نمبر ۵۹ ، یکم مئی ۱۹۱۴ (= الناظر) میں غالب و مجروح کے خطوں پر نمبر شمار ، مسلسل درج ہے - الناظر میں با اعتبار ترتیب یہ تیسرا خط ہے -

۲- مجروح کے جس خط کی عبارت کی داد دی گئی ہے اور جس کے طرز تحریر پر غالب نے رشک کیا ہے ، افسوس کہ وہ ادب پارہ منظر عام پر نہیں آیا - اسی خط کے بارے میں حالی نے لکھا ہے : " اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں ، کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلۂ مذکور میں کئی سال مقیم رہے ، مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے نا واقف ہیں ، وہ غلطی سے اس کے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں - اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے ، میری نسبت نہیں لکھا ، اسی قدر ان کو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں از راہ کسر نفسی کے لکھتا ہوں "- (یادگار غالب ، ص ۷۸ - ۱۷۷ طبع کانپور ، ۱۸۹۷ء)

۳- خطوط غالب ، مالک رام ، علی گڑھ ، ۱۹۶۲ء (= خم) میں 'کیا ' ندارد -

۴- خم : میرے -

۵- خم : " سر رشتہ کی پابندی ضرور ہے " ندارد -

شخص کی پنشن کے کل چڑھے ہوئے روپے (۱) یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بماہ روپیہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر ، اپنی منظوری لکھ کر ، ہمارے پاس بھیج دو ، تا کہ ہم حکم منظوری دے کر تمھارے پاس بھیج دیں - یہاں (۲) اس کی تعمیل فورا (۳) بطرز مناسب ہوگئی - کم و بیش دو مہینے میں روپیہ سب مل جائے گا -

اور ہاں ، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو - میں نے کہا : " صاحب ، یہ کیسی بات کہ اوروں کو برس برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیہ دلواتے ہو "- فرمایا کہ " تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا ، اوروں کو یہ بات شاید (۴) برسوں میں میسر آئے گی "- میں چپ ہو رہا -

آج دو شنبہ ، یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے - دو پہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپیہ منگالوں - ہر بار ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے - حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو - اب دیکھیے یہ دو حاکم ، یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں -

حاکم پنجاب کو گورنر بہادر کا یہ بھی حکم (۵) ہے کہ ' دستنبو ' منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے - چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب (۶) مجھ سے بھی کہہ کر مانگی اور میں نے دے (۷) دی - اب دیکھوں ، حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے -

اس وقت تمھارا ایک خط ، اور یوسف میرزا کا ایک خط آیا - مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا - اب میں

۱- خم : روپے کے -　　۲- خم : سو یہاں -

۳- خم : ' فوراً ' ندارد [حاشیہ ع = تعمیل فوراً]

۴- خم : ' شاید ' ندارد -

۵- خم : پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے ... -

۶- خم : کتاب یہی کہہ کر -　　۷- خم : 'دے' ندارد -

روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میرن صاحب، میر سرفراز حسین (۱)، میر نصیرالدین کو دعا - ۱۲ - غالب -

[دو شنبہ، یکم شعبان (۱۲۷۵ھ)، ہفتم مارچ (۱۸۵۹ء)] (۲) -

جواب مجروح : (۳)

قبلہ و کعبہ آداب بجا لاتا ہوں۔ بھلا حضرت یہ آپ کیا فرماتے ہیں آپ کے طرز پر لکھ سکوں۔ توبہ استغفراللہ — چہ نسبت خاک را با عالم پاک مہر عالم افروز کے سامنے ذرۂ ناچیز کی کیا نمود اور بحر بیکراں کے روبرو قطرہ تنک ظرف کا کیا وجود۔ یہ دعویٰ میاں ظہوری کریں۔ یہ اندیشہ نظیری کو آوے۔ میں بیچارہ کس حساب میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات منبع کمالات کو اس فن میں یکتا پیدا کیا ہے۔ ہاں، اگر دو چار برس قدموں میں پڑا رہوں اور فضل و کمال کی طرح دروازے پر حاضر رہوں تو البتہ کچھ راہ پا جاؤں۔ سو یہ چرخ تفرقہ پرداز کب کسی کو اپنی مراد پر پہنچاتا ہے او کب چاہتا ہے کہ دو آدمی حسب دلخواہ ایک جگہ مل بیٹھیں -

کچھ ان دنوں میں آپ ہی آپ جی گھبراتا ہے اور شوق قدم بوسی یہ ولولہ افگن ہے کہ چل اور خاک قدم کو صندل پیشانی کر۔ اگر حضرت، یہی صورت ہے تو دو چار دن میں حاضر ہوتا ہوں اور اختصاص قدم بوسی پاتا ہوں زیادہ حد ادب -

مہر مہدی (۴)

۱- خم: میر سرفراز حسین مقدم، میرن صاحب مؤخر -

۲- خط پر تاریخ سنہ وغیرہ درج نہیں، لیکن خط میں کتاب 'دستنبو' کا ذکر آیا ہے جو پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپی۔ دن، ماہ اور تاریخ تذکرہ خط کے متن میں آ گیا ہے -

۳- الناظر میں باعتبار ترتیب چوتھا خط۔

۴- میر مہدی مجروح کے اس خط پر بھی تاریخ درج نہیں۔ غالب نے پچھلے خط [ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء] میں مجروح کی انشا پردازی کی داد دیتے ہوئے، اپنے خاص اپنا طرز بتایا تھا۔ مجروح نے اس کے حوالے سے جواباً انکسار کا اظہار کیا ہے، گویا مجروح کا یہ خط، نامۂ غالب مورخہ ہفتم مارچ ۱۸۵۹ ہی کے جواب میں ہے۔ اسی سے اس کا زمانۂ تحریر قیاس کیا جا سکتا ہے -

نامہ' غالب : (۱)

سید ۔ خدا کی پناہ ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آیا ہے (۲) کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے ۔ ایک غریب سید مظلوم کے چہرہ' نورانی پر مہاسا نکلا ہے ، تم کو سرمایہ' آرائش گفتار پہنچا (۳) ہے ۔ میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو ۔

بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے ۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے ۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی ۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی ۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے ۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے ، پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں ۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے ۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے ۔

مجھ پر اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی ، اور کیسی بڑی خوشی دی ہے ! تم کو یاد ہوگا کہ ایک ' دستنبو ' نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر اور دوسری گورنر جرنل (کذا) بہادر کلکتہ (۴) کی نذر بھیجی تھیں ۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا ۔ وہ ہی کاغذ افشانی ، وہی القاب قدیم ، کتاب کی تعریف ، عبارت کی تحسین ، مہربانی کے کلمات ۔ کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا ۔

پنشن کے ملنے کا بھی حکم آجکل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے

۱۔ الناظر میں باعتبار ترتیب آٹھواں خط ۔

۲۔ مجروح کا وہ خط ، یعنی جس کے جواب میں غالب انھیں یہ لکھ رہے ہیں کہ " سید ، خدا کی پناہ ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آیا ہے ... " دیدنی ہوگا ' افسوس کہ منظر عام پر نہیں آیا ۔

۳۔ خم : ' ہم پہنچا ' ۔

۴۔ خم: " ... اور دوسری گورنر جرنل بہادر کلکتہ کی نذر بھیجی تھیں " ندارد ۔

کہ گورنر جرنل (کذا) بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے ۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں ۔ میر سرفراز حسین (۱) کو دعا کہہ دینا (۲) ۔ غالب ۔

[۲۷ ۔ مارچ ۱۸۵۹ء] (۳)

جواب مجروح : (۴)

قبلہ و کعبہ ۔ کیا آپ نے میرن صاحب کو سچا بنایا ہے کہ مہاسا نکلے ' د ۔ بوڑھے منہ ، مہاسے ، لوگ آئے تماشے ۔ وہ ماشرا مادہ تھا کہ ان کے چہرے پر آ گیا تھا ۔ یہاں کے حکیموں نے تو جواب ہی دے دیا تھا کہ یہ دو چار دن کے مہمان ہیں ، مگر اللہ نے اچھا کیا کہ حکیم میر اشرف علی آئے ہوئے تھے ، انھوں نے دو فصدیں کھلوائیں ، ضمادات رادع کا استعمال کیا ، جب کچھ آدمیوں کی صورت میں آئے ہیں ۔ آپ نے یہ ہنسی سمجھی ہوگی جو فرماتے ہیں کہ تم کو سرمایہ آرائش گفتار بہم پہنچا ۔ لیجیے حضرت ، اب تو وہ اچھے ہو گئے ، چلتے پھرتے ہیں — اور حضرت گورنر جنرل بہادر کی سلسلہ جنبانی کا حال جو تحریر فرمایا ہے ، اس سے دل کو مسرت و فرحت بے اندازہ حاصل ہوئی ۔

اب اللہ یہ امید برلائے کہ اب کے خط میں یہ خبر آپ تحریر فرمائیں کہ روپیہ پنشن کا تو آ کر خرچ برچ میں آ گیا اور عطیہ ملکہ معظمہ بھی صبح و شام آنے والا ہے ۔ زیادہ حد ادب ۔ میرن صاحب و میر نصیر الدین آداب عرض کرتے ہیں ۔ میر مہدی (۵)

۱۔ خم : میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین ۔

۲۔ اضافہ در خم : اور یہ خط دکھا دینا ۔

۳۔ تاریخ ۲۷ ۔ مارچ کا ذکر متن میں آگیا ہے ، سال : ۱۸۵۹ء

۴۔ الناظر میں باعتبار ترتیب نواں خط ۔

۵۔ مہدی مجروح خط پر تاریخ درج کرنے کے عادی ہی معلوم نہیں ہوتے ۔ ان کے خطوط کی تاریخوں کا تعین غالب کے خطوں کی روشنی ہی میں ہو پاتا ہے ۔ یہ خط ، غالب کے خط مورخہ ۲۷ ۔ مارچ ۱۸۵۹ء کے جواب میں ہے ، اس لیے ظاہر ہے اس تاریخ کے بعد کی کسی قریبی تاریخ کا ہوگا ۔

نامہ مجروح (۱) :

قبلہ و کعبہ سلامت ۔ بعد گزارش آداب ، عرض رسا ہوں ۔ حضرت ، ایام بے شمشیر ، کمان بے تیر ، چشم بے تنویر ، نغمۂ بے تحریر ، قالب بے جان ، یعنی آپ کا بے خط کا عنوان پہنچا ۔ جس قدر لفافہ سر بستہ دیکھ کر دل کھلا تھا اتنا ہی کھول کر دل بند ہوا ۔ ادھر ٹٹولا ، اُدھر ٹٹولا ، کچھ نہیں ۔ خط اصلاحی کو اُلٹا پلٹا ، شاید کہیں ایک دو سطریں لکھیں (کذا) ہوں ، وہ بھی ندارد ۔ یا اللہ یہ کیسا خط ، کہ خط ہے اور خط نہیں ۔ معلوم ہوا کہ یہ ظاہری کا لفافہ ہے اندر کچھ نہیں اور یہ صورت حامل معنی نہیں ۔

میرن صاحب کہتے ہیں جناب میرزا صاحب کا خط دکھاؤ ۔ میر اشرف علی کہتے ہیں مطلب سناؤ ۔ جن کو اُردو کا شوق ہے ، اُن سے کہتا ہوں ، فارسی خط ہے کیا مزا اُٹھاؤ گے ، جو فارسی کے خواہاں ہیں اُن سے کہتا ہوں اُردو ہے ، دیکھ کے کیا نفع پاؤ گے ۔ واہ واہ حضرت ، خوب ہنسی کی ۔

اب یہ فرمائیے کہ آپ نے واقعی میں خط نہیں لکھا یا لفافے میں رکھنا فراموش کیا ۔ شق اول ، آپ کے الطاف بزرگانہ سے بعید ہے کہ اتنی مدت کے بعد میرا عریضہ جائے اور آپ سا شخص ، اُس کے جواب میں دریغ فرمائے اور شق ثانی میں اُمیدوار و منتظر ورود نوازش نامہ سمجھیے اور جلد ارسال کیجیے۔ زیادہ اور کیا سمع خراشی کروں ۔ فدوی میر مہدی مجروح ۔ (۲)

جواب غالب : (۳)

برخوردار کامگار میر مہدی ۔ قطعہ تم نے دیکھا ؟ سچ سچ میرا حلیہ

۱۔ الناظر میں باعتبار ترتیب یہ دسواں خط ہے ۔ ماہ نو کراچی ، شمارہ فروری ۱۹۵۵ء میں سید آفاق حسین آفاق دہلوی نے مجروح کے اسی خط کا قلمی عکس شائع کرایا ہے ۔ یہ متن قلمی عکس کے مطابق پیش کیا جارہا ہے ۔

۲۔ مجروح کے اس خط کے جواب میں غالب نے چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء کو خط لکھا (یہ آگے آتا ہے) ۔ مجروح کا یہ خط گویا اواخر جون یا اوائل جولائی ۱۸۵۹ء کا مکتوبہ ہے ۔

۳۔ الناظر میں باعتبار ترتیب گیارھواں خط ۔

ہے۔ واہ ، اب کیا شاعری رہ گئی ہے ! جس وقت وہاں (۱) بھیجنے کے واسطے لکھا ، ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں ۔ لڑکوں نے ستایا کہ دادا جان ، چ کھانا تیار ہے ، ہمیں بھوک لگی ہے ۔ تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے میں نے کہا ، اب خط (۲) کیوں لکھوں ۔ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر ٹکٹ لگا ، سرنامہ لکھ ، کلیان کے حوالے کر ، گھر میں چلا گیا ۔ اور ہاں ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بنا ہے ۔ سو ، وہی ہوا تم نے جلے (۳) پھپھولے پھوڑے ۔ لو ، اب بتاؤ ، خط لکھنے بیٹھا ہوں ، کیا لکھوں ۔ یہاں کا حال ، زبانی میرن صاحب کی (۴) سن لیا ہوگا ۔ بے اصل (۵) باتیں ہیں ۔ پنشن کا مقدمہ کلکتہ میں نواب گورنر جنرل (کذا) بہادر کے پیش نظر ، یہاں کے حاکم نے اگر ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی ، میرا اس میں کیا ضرر۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو ایک آدمی آگئے ۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا ۔ میں نے بکس بند کیا ، باہر تختوں پر آبیٹھا ۔ شام ہوئی ، چراغ روشن ہوا ۔ منشی میر (٦) احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پہ بیٹھے ہیں ۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیرالدین آیا ۔ ایک کوزا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ ۔ اس کے سر پر ایک ٹوکرا اس پر گھانس ہری بچھی ہوئی ۔ میں نے کہا ۔ اہا ہا ہا سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد (۷) بھیجی ہے ۔ بارے ، معلوم ہو کہ وہ نہیں ہے ، یہ کچھ اور ہے ۔ فیض خاص نہیں ، (۸) لطف عام ہے یعنی (۹) شراب نہیں ، آم ہے ۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے ، بلکہ نعم البدل ہے ۔

۱- خم : جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں... ۔
۲- خم : کہ اب ، کیوں... ۔
۳- خم : ' جلے ' ندارد ۔ ۴- خم : کے ۔
۵- خم : مگر وہ جو کچھ تم نے سنا ہوگا بے اصل... ۔
٦- خم : ' سید ' بجائے ' میر ' ۔
۷- خم : ' رسید ' بجائے ' رسد ' ۔
۸-۹ خم : ' نہیں ' اور ' یعنی ' ندارد ۔

ایک ایک آم کو ، ایک ایک سر بمہر گلاس سمجھا ، لکور (۱) سے بھرا ہوا ۔ مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے ! میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی تھے ، پندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ گئے ، تا آن کی برائی اوروں میں سرایت نہ کرے ، ٹوکرے میں سے پھینک دیے ۔ میں نے کہا بھائی یہ کیا کم ہیں ؟ مگر میں تمھاری تکلیف و تکلف سے خوش نہیں ہوا ، تمھارے پاس روپیہ کہاں جو تم نے آم خریدے ۔ خانہ آباد ، دولت زیادہ ۔

لکور کے معنی تم نہ سمجھے ہو گے ۔ (۲) ایک انگریزی شراب ہوتی ہے ۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا ۔ دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے ۔ ہاں فرہنگ سروری میں ہوں تو ہوں ۔ مجتہدالعصر کو (۳) اور حکیم میر اشرف علی کو دعا کہہ دینا (۴) میرن صاحب پوچھیں تو کہنا تمھیں کچھ نہیں لکھا ۔ مرقومہ چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء ۔(۵)
غالب ۔

نامہ غالب : (۶)

بھائی ، کیا پوچھتے ہو ؟ کیا لکھوں ؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے (۷) ۔ قلعہ ، چاندنی چوک ، ہر روز (۸) مجمع بازار مسجد

۱۔ یعنی Liquor

۲۔ خم : "... کے معنی تم نہ سمجھے ہو گے" ندارد ۔

۳۔ خم : ' کو ' ندارد ۔

۴۔ خم : "... میر اشرف علی کو کہ وہ آن کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپے کو لے گئے ہیں ، میری دعا کہہ دینا "۔ میرن صاحب کا ذکر ندارد ۔

۵۔ خم : تاریخ ندارد ۔ اس طرح الناظر کے اس خط کی اہمیت مسلم ہو جاتی ہے کہ اس کی مدد سے غالب کے ایک خط کی تاریخ معلوم ہوتی ہے ۔

۶۔ الناظر میں ترتیب کے اعتبار سے پہلا خط ۔

۷۔ خم : ' ہے ' کی جگہ ' تھی ' ۔

۸۔ خم : 'روزہ' بجائے ' روز '

جامع کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو، دلی کہاں ؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے دربار میں سات سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادرگڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو ــ چار معدوم محض ہیں، (۱) جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئیں (۲) تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔ (۳) دربار عام والے، مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خان (۴)، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خان، (۵) بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ (۶) تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم :

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا
آسمان سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

۱۔ خم: 'ہیں' ندارد۔

۲۔ خم: "... ہانسی حصار کا کمشنر ان دونوں کو یہاں لے آیا"۔

۳۔ خم : 'دربار' سے پہلے 'بس - رہے'۔

۴۔ نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ و حسرتی (۱۸۰۶ء - ۱۸۶۹ء) غالب کے مخلص دوست، ممدوح اور تلمیذ۔ رک: تلامذۂ غالب، مالک رام ۱۹۵۷ء، ص ۱۷۷ تا ۱۹۱۔

۵۔ مفتی صدر الدین خان آزردہ (۱۷۸۹ء - ۱۸۶۸ء) مفتی اعظم، صدر الصدور دہلی۔ "ہندوستان نے اس جامعیت کے بہت کم شخص پیدا کیے ہیں"۔ [تلامذۂ غالب، ص ۸۵]

۶۔ غالب کو دربار کا حق بعہد لارڈ ولیم بنٹنک (۱۸۲۸ء میں) اور خلعت کا اعزاز لارڈ الن برا کے عہد (۱۸۴۴ - ۱۸۴۲ء) میں حاصل ہوا۔ [مالک رام، ذکر غالب، طبع چہارم ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۲]

تم آتے ہو ، چلے آؤ ۔ جان نثار خان کے چھتے کی سڑک ، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ ۔ بلاقی (۱) بیگم کے کوچے کا ڈھینا ، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ ، چلے جاؤ ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا ، حکیم الملک میر اشرف علی کو دعا ، قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا ، یوسف ہند میر افضل علی کو دعا ۔(۲)

غالب

جواب مجروح : (۳)

قبلہ و کعبہ ۔ آداب بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں ۔ حضرت اتوار نہیں ہوتا نہ ہو ، پھول والوں کی سیر موقوف ہو گئی ، بلا سے ۔ گزری نہیں جمتی ، چاندنی چوک کی وہ گرمیٔ بازار نہ رہی ، نہ سہی ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے ، دلی کی ہستی تو آپ کی ذات پر منحصر ہے ۔ جب آپ کو دیکھ لیا سب کو دیکھ لیا ۔ اگر غم ہے تو اس کا ہے اور گردش روزگار سے شکوہ ہے تو یہ ہے کہ آپ کی قدم بوسی سے محروم رکھا اور ملاقات ہر روزہ سے مایوس کیا ۔ نہ کسی کی صحبت خوش آئے ، نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہے ۔

ہر روز وہی ہنگامے پیش نظر رہتے ہیں اور وہی یاران جلسہ آنکھوں میں پھرتے ہیں ۔ ادھر یوسف میرزا غل مچاتے ہیں ، ادھر سے یار عزیز چلے آتے ہیں ۔ کسی کونے میں اسد برج کھڑے ہیں ، کسی گوشے میں میاں موش خاموش بیٹھے ہیں ۔ برهما کے پتر کچھ الجھ الجھ کے سبق پڑھ رہے ہیں ۔ ادھر ادھر کے لوگ آئے ہوئے اطراف و جوانب کی خبر کہہ رہے ہیں ۔ میر احمد حسین میکش (۴) شوخی و ثناعت میں ابریز گفتگوے بین بین میں سرگرم ، کسی کے چھیڑنے کے لیے نئی نئی تمہیدیں اٹھاتے ہیں ، کسی کو صاحب و قبلہ کہہ کے پاس بٹھاتے ہیں ۔

۱۔ خم : ' بولاقی ' ۔　　۲۔ خم میں وقت ، یوم اور تاریخ موجود : " مرقومہ ، صبح جمعہ ، ۶ جمادی الاول ، ۲ دسمبر سال حال [۱۲۷۶ ھ ، ۱۸۵۹ء]

۳۔ الناظر میں باعتبار ترتیب دوسرا خط ۔

۴۔ غالب کے شاگرد رشید ۔ ' فتح دہلی ' کے بعد ۱۸۵۸ء میں پھانسی کی سزا پائی ۔

کیوں حضرت وہ بھی کیا زمانہ تھا اور کیا خوب بسر ہوتی تھی ۔ ہر روز ہنسنے بولنے کا ہنگامہ گرم ، نہ کوئی اندیشہ نہ کوئی غم ۔ اب ان مزوں کا یہ بدلہ ہے کہ ہر ایک کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں اور ہر ایک کی جدائی میں بن آئے مرے ہیں ۔ نہ یہ امید کہ پھر ایک جگہ مل بیٹھیں گے نہ یہ توقع کہ پھر ان صورتوں کو دیکھیں گے ۔ اب سیر و تماشا کی آرزو کسے ، اور وہ دل و دماغ کجا ۔ ایسا زمانے نے خاک میں ہمیں ملایا کہ پھر ہنسنے بولنے کی امید ہو :

تیرے بیخود جو ہیں سو کیا جیتیں ایسے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں

خدا شاہد ہے کہ پہروں اسی فکر میں پڑا رہتا ہوں کہ پھر بھی وہ دن ہوگا کہ ایک جگہ چار ہم صورت اکھٹے ہوں ، کہ یہ چند روز حیات کے ، اگر بفراغت نہیں تو بغم ہی بسر ہوں ، مگر کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی ۔ اللہ مسبب الاسباب ہے ، اگر کوئی سبب نکالے تو کیا عجب ہے ۔

خیر حضرت یہ رونا تو تمام عمر کا ہے ۔ اب عرض یہ ہے کہ نواب گورنر آنے والے ہیں ، کچھ آپ کے مقدمے کی سلسلہ جنبانی ہوئی ؟ پنشن ملنے کی صورت نکلی ؟ یہ عقدۂ لاینحل بھی کبھی حل ہوگا یا میری خاطر کی طرح منعقد رہے گا ۔ میر اشرف علی اور میر نصیر الدین اپنے اپنے القابوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور تسلیم بصد تعظیم بجا لاتے ہیں ، سوائے میرن صاحب کے ۔ انھوں نے اپنے خطاب سے بہت آنکھ بھوں چڑھائی اور کہا کہ جناب میرزا صاحب قبلہ بھی الھیں پرانی تشابیہ مستعملہ کا استعمال رکھتے ہیں ، جس کی سیکڑوں نے اپنے دوست آشناؤں کو نسبت دی ہے ، پھر میری خصوصیت کیا ہے — اور اس پر بھی لرا یوسف ہند ، اگر یوسف زمانہ یا یوسف کشور لکھتے تو بھی مضائقہ نہ تھا ۔ فقط زیادہ حد ادب ۔ فدوی ، سید مہدی مجروح ۔ (۱) از دھلی ۔ (۲)

۱۔ مجروح کے خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ، غالب کے جواب منقولہ بالا کی روشنی میں اسے ۲۔ دسمبر کے بعد اور ۱۳۔ دسمبر ۱۸۵۹ء سے چند روز پہلے کا خیال کرنا چاہیے ۔

۲۔ ' از دھلی ' محل نظر ہے ۔ ' پانی پت ' چاہیے ، جہاں مجروح انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد برائے چندے جا رہے تھے ۔

نامہ غالب: (۱)

میر مہدی:

صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے، وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیٔ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب، ہائے غضب!!

میاں، تم پنسن، پنسن، کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پنسن کہاں! ڈپٹی کمشنر، صاحب کمشنر، لفٹننٹ گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو، تو اس کا مرافعہ گورمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنسن کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل لفٹننٹ گورنر کے ہاں کیا ہے، دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔ بہر حال جو کچھ ہوگا، تم کو لکھا جائے گا۔

اجی، وہ یوسف ہند نہ سہی، یوسف دہر سہی، یوسف عصر سہی، یوسف ہفت کشور سہی — ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہ ساڑھے سات روپیہ مہینا بھیجے جاؤں گا۔ اب اس کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپی جان بھوکی مرتی ہیں، خرچ جلد بھیجو، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہر حال میرن صاحب کو یہ حال پڑھوا دینا۔

۱- مجروح کے خط کے جواب میں، غالب نے جو خط لکھا وہ الناظر میں نقل نہیں ہوا۔ یہاں خم صفحہ ۳۱۱ و بعد کے حوالے سے درج کیا جاتا ہے۔ مجروح کے خط کے ساتھ، غالب کا یہ جواب دو گونہ لطف دیتا ہے:

بے مے نکند در کف من خامہ روانی
سرد است ہوا، آتش بے دود! کجائی؟

میر سر فراز حسین کو دعا ، میر نصیر الدین کو دعا ، حکیم اشرف علی کو دعا ، یوسف ہفت کشور ' کو دعا - سہ شنبہ ، ۱۳- دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء -

نامہ : غالب (۱)

جان غالب -- تمھارا خط پہنچا - غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے (۲) -

ہر اک سے پوچھتا ہوں ، وہ کہاں ہے (۳)

مصرعہ بدل دینے سے یہ شعر کس رتبے کا ہوگیا ہے - اے میر مہدی ، تجھے یہ کہتے (۴) شرم نہیں آتی -

میاں یہ اہل دھلی کی زبان ہے

اہل دھلی یا (۵) ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں - ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے (۶) - لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا - ریاست تو جاتی رہی ، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں -

سنو (۷) خس کی ٹٹی ، پروا ہوا ، اب کہاں ، وہ لطف تو اسی مکان میں

۱- الناظر میں باعتبار ترتیب چھٹا خط -

۲- مجروح کے دیوان ' مظہر معانی ' طبع اول سرافراز پرس دھلی (ص ۱۶۷ ، ۱۶۸) میں سترہ اشعار کی یہ غزل موجود ہے -

۳- شعر یہ ہے :

نہیں لیتا ہوں فرط رشک سے نام
ہر اک سے پوچھتا ہوں ، وہ کہاں ہے

۴- خم : ' یہ کہتے ' ندارد -

۵- خم : '' ارے ، اب اہل دھلی '' -

۶- استاد کی اس تنبیہ پر مجروح نے شعر بدل کر مقطع کو یوں بنا دیا :

سخن گو ، یوں تو اک عالم ہے مجروح
مرے استاد کی پر کیا زبان ہے !

۷- خم : ' سنو ' ندارد -

تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہرحال میگزرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے۔ خیر، کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہوکر کنووں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو میرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب (۱) کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک ایک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھونی (۲) واڑہ، رام‌جی داس گنج (۳)، سعادت خان کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔

قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا، اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہوجائے گا — اللہ اللہ، دلی نہ رہی اور دلی والے تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا اردو کہاں؟

دلی، واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کمپ ہے، چھاونی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ نہر، رہے نام اللہ کا (۴)۔ الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الگزنڈر ہڈرلی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہراً ان کی مصاحبت نہیں، ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیرالدین اور میرن صاحب (۵) کو دعا۔ ۱۸۶۱ء۔

۱۔ خم: "اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے .."۔

۲۔ خم: دھوبی۔

۳۔ خم: رام جی گنج۔

۴۔ خم: "رہے نام اللہ کا" ندارد۔

۵۔ خم: میرن صاحب مقدم، نصیرالدین مؤخر۔

جواب مجروح : (۱)

قبلہ و کعبہ — آداب بجا لاتا ہوں ۔ بھلا حضرت مجھے کیوں شرم آئے، اگر شرم آئے تو رجب علی سرور کو آئے، جس نے وہ لاف و گزاف کیا ہے کہ جیسا لکھنؤ ہے ویسا کوئی شہر ہی نہیں ۔ ان سے کہا چاہیے کہ ارے مرد خدا، خدا سے ڈر ۔ لکھنؤ کس بادشاہ کا دارالخلافہ رہا ہے، کون سی تاریخ میں وہاں کے لوگوں کی خوش بیانی کا حال لکھا ہوا ہے؟ ماہیت تو اس کی یہ ہی ہے نا کہ مضافات صوبہ' اودھ میں کا ایک شہر ہے ۔ یہ دلی سے کیوں کر مقابلہ کرے گا کہ اگر پانچ سو برس کی تصنیفات دیکھو گے، اس میں سے بہی لکھا پاؤ گے ۔

حضرت دہلی کنف عدل و داد جنت عدن ست کہ آباد باد

اس پر یہ غرہ کہ جو یہاں کی زبان ہے، وہ کہیں کی نہیں ۔ باوجودیکہ تفاخراً یہ شعر ناسخ نے لکھا ہے :

سن چکے ہیں خوب اردوے معلیٰ کی زبان
سالہا صحبت رہی ہے ہم کو ناسخ، میر سے

اور یہ بات ظاہر ہے کہ میر، دلی کے تھے ۔ مگر افسوس کہ ان کے پیرو اس بات پر خیال نہیں کرتے ۔

اے حضرت، میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کو وہاں کی کون سی ایسی بات پسند آئی کہ ایسی طرف داری فرمائی ۔ قطع نظر زبان سے' تراش و خراش لباس بھی وہاں کی نرالی ہے ۔ واہ ری دلی، تیرے قربان، کیا حد اوسط پر سب کا عمل تھا کہ سب چیز افراط و تفریط سے مائل بحد وسط تھی ۔ کیوں نہ ہو، خیر الامور اوسطہا پر سب کا عمل تھا ۔

بھلا حضرت، یہ کیا آپ فرماتے ہیں کہ وہاں سب طرح کے اہل کمال موجود ہیں ۔ بھلا دلی سے بھی زیادہ کہیں اہل کمال ہوں گے ۔ میاں امیر کے برابر لکھنؤ میں کون سا خوش نویس تھا؟ حضرت غالب کی سی نظم و نثر کس کی؟ امام الدین خان سا حکیم، مولانا صدر الدین خان سا عالم، محمد اعظم

۱- الناظر میں ترتیب کے اعتبار سے ساتواں خط ۔

سا مصور ، بدرالدین خان سا مہر کند کہاں ہے۔ دستنبو کی طرح نواب گورنر بہادر نے کس کی تصنیف طلب کی ۔ بدرالدین خان کے مانند ملکہ معظمہ کی مہر کھدنے لکھنؤ میں کون سے مہر کند کے پاس آئی ۔ خانم کے بازار کے وہ کاریگر جنھوں نے انگریزی اسباب بدل ڈالا اور نہ کسی کو معلوم ہوا ، یہ لوگ کہاں ؟ ۔ گو دلی اب اجڑ گئی اور سارا شہر برباد ہوگیا ، مگر اس شہر سے جس کی تعریف میں پہلے ہی میر حسن ، صاحب مثنوی یہ فرما گئے ہیں ، بہتر ہی ہے ۔

ز بس یہ شہر ہے پہاڑ پہ بستا　　　کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسمان پر گھر ہوا میں　　　کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
سیہ گل سے گلی یوں تر رہے ہے　　　بغل جس طرح حبشی کی بہے ہے

اگر دلی کی شہریت اور خوش قطعی کی تعریف کروں تو ایک کتاب بن جائے، خط سمجھ کر موقوف کیا ۔ فقط (۱)

میر مہدی مجروح

جواب الجواب از غالب : (۲)

او میاں سید زادہ آزادہ ، دلی کے عاشق دلدادہ ، ڈھنے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے ، حسد سے لکھنؤ کے برا کہنے والے ۔ نہ دل میں مہر و آزرم(۳) نہ آنکھ میں حیا و شرم ۔ نظام الدین ممنون کہاں ! ذوق کہاں ! مومن خان کہاں ! ایک آزردہ سو خاموش ، دوسرا غالب وہ بیخود و مدھوش، نہ سخنوری رہی نہ سخندانی ، کس برتے پر تتا پانی ۔ ہائے دلی ، وائے دلی ، بھاڑ میں جائے دلی ۔

۱- غالب کے اگلے پچھلے خطوں کی روشنی میں اس خط کو مئی ۱۸۶۱ء کا خیال کرنا چاہیے ۔

۲- الناظر میں باعتبار ترتیب پانچواں خط ۔

۳- خم : ' آزرم ' بجائے ' آرزو ' ۔

سنو صاحب ' پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خان ، ولد سردار خان ، ولد دلاور خان اور نانا اس احمدحسین خان کے ، غلام حسین خان ، ولد مصاحب خان ۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح و مفصل لکھو ۔ قوم کیا ہے ، معاش کیا ہے ، طریق کیا ہے ، لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے ' طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے ۔ بھائی ، خوب چھان کر لکھ اور جلد لکھ ۔ پنج شنبہ ۲۳- مئی ۱۸۶۱ء -

غالب

غالب اور اس کا ماحول

ڈاکٹر وحید قریشی

غالب کی ' انا ' شعری تصورات ، عشقیہ روایات اور عام زندگی کے مظاہر میں نمودار ہوتی ہے ۔ ان کی اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ تیس برس کی عمر تک مکمل ہو چکا تھا اور اس کے بعد اس میں قلیل اضافہ ہوا ۔ مرزا کی فارسی شاعری کا آغاز پچیس برس کی عمر کے قریب ہوا لیکن اس میں کا غالب حصہ قیام کلکتہ کے بعد کی یادگار ہے ۔ اردو کلام کو عنفوان شباب کا اور فارسی شاعری کو بعد کے ادوار کا حاصل سمجھنا چاہیے ۔ فارسی شاعری میں ان کے مزاج کی ہمواری اور استواری کے نشان زیادہ ملتے ہیں ۔ ابتدائی اردو کلام میں ان تماثیل اور استعارات و تشبیہات کی کثرت ہے جو بیدل اور صائب ، ناصر علی ، جلال ، اسیر وغیرہ کا سرمایۂ خاص ہیں ۔ آیینہ ، طوطی ، آسما ، سیلاب ، پنبہ ، پروانہ ، شمع ، لگن ، سرو چراغاں ، شعلہ و آتش ان کی فکری متاع کے اظہار کے خارجی پیرائے ہیں ۔ غالب سے قبل کا ادبی ماحول دراصل زندگی اور اس کے اظہار کے مخصوص سانچوں کا دور ہے ۔ جب تحریک شعری ایک پیچیدہ فکری نظام سے متصادم اور مرتے ہوئے معاشرے کی افتاد سے نبرد آزما اور خارج از ذات وہمی اور حسی تشبیہوں کے تار و پود کو بنانے سنوارنے میں مصروف تھی ، ایسے میں کہ خارجی زندگی مثبت عمل سے محروم ہو رہی تھی ، عمل و حرکت کا واحد وسیلہ غیر ذات کا ادراک اور معاشرے کے تصوراتی اور مثالی نمونے کے بیان تک محدود ہوکر رہ گیا تھا ۔ بیدل کے مابعدالطبیعاتی تصورات ، غنی کاشمیری کے اخلاقی درس اور صائب کی مقولہ سازی کی تہ میں خارجی زندگی کی بے پناہ یورش سے بچ نکلنے کا رجحان قوی ہے ۔ یہ اخلاقی درس و تدریس ، سعی و عمل کو یا تو فرد کی روحانی ترقی پر صرف کرنے کے کام آرہی تھی یا پھر زندگی کی خارجی بے عملی کو داخلی عمل کے

واسطے سے پہچاننے کی مجبوری قرار دی جا سکتی ہے ۔ ان شعرا میں بیدل زیادہ بیدار شعور کا مالک ہے لیکن بیدل کا زندگی کے جمود کو عمل اور حرکت کے پیمانوں میں پیش کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ در اصل ایک ایسے آدرشی معاشرے کی نشان دہی کر رہا ہے جس کا رشتہ خارج سے بہت کمزور ہو چکا ہے ۔ معاشرتی زندگی کی یہ تصویر در حقیقت خارج میں اپنا وجود کھو چکی ہے ، اس کا عمل اور اس کی قوت نمو کا دائرہ کار محض در و دیوار کا تحرک اور اس کا اضطراب فقط سیلاب کا اضطراب ہے ۔ سیلاب و آسیا کے استعارے انسانی زندگی کو کائنات سے الگ کرکے انسان کو مجبوری و بے چارگی کے ساحل پر لا کھڑا کرتے ہیں ۔ طوطی و آئینہ زندگی کی متصوفانہ توجیہ کے علاوہ حیرت و حیرانی کا استعارہ ہے ۔ یہ حیرت اور یہ حیرانی روحانی ارتقا کا اشارہ ہی نہیں ، خارجی زندگی کی حیرت و حیرانی کا ایک داخلی جواز بھی ہے ۔ اس خوفناک صورت حال کو بیدل جیسے حساس اور بیدار شاعر نے جب اپنی گرفت میں لیا تو اس کی تصویر کاری حقیقی زندگی کا بدل ہو کر رہ گئی ۔ انسان کی قوت تسخیر حقیقی زندگی میں قابل عمل نہ تھی ، تخیلی زندگی میں اس کے لیے متحرک تصاویر و تماثلات کا مرکز بن گئی ۔ حیرت و حیرانی کی یہ حالت انسان کو گرد و پیش پر نگاہ ڈالنے پر مجبور کرتی ہے تو اس کے کام وہ ذخیرۂ الفاظ آتا ہے جس کا تعلق انسانی نظر کے ساتھ ہے ۔ دیدہ و نگاہ کی کافر سامانیوں کے وسیلے سے متحرک تصاویر (Motor Imagery) شاعر کی کارگاہ خیال میں نمودار ہوتی ہیں ۔ غالب کے ہاں بھی دید ، دیدہ ، عید نظارہ ، جلوۂ گل ، دیدۂ یعقوب ، چشم حسود ، نگاہ آفتاب ، بہار نظارہ کی کثرت اسی فکری سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں ۔ انسان اپنی ذات کو خارجی عوامل کے وسیلے سے پہچانتا ہے ، غالب نے بھی جس مخصوص ماحول میں ایغو (Ego) کی تشکیل کی ، اس میں ان شعری روایات کا حصہ بھی ہے جو غالب کے زمانے سے قبل کی ادبی فضا میں زندہ تھیں اور جن میں خود غالب نے پرورش پائی ۔ غالب زندگی کی حرکت اور عمل کو بیداری کی سطح سے دیکھتا ہے جس میں شعری تمثالات (Images) کا تحرک خارجی زندگی کی بے عملی کی تلافی کرتا ہے ۔ غالب کی یہ تلافی خارجی حالات کے خلاف شدید مقاومت کا داخلی بیان ہے :

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیٔ عیش مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

عمل اور حرکت سے متعلق ذخیرۂ الفاظ کی کثرت غالب کی 'انا' کو مثبت راستوں پر بھی گام زن کرتی ہے۔

مرزا کی ابتدائی زندگی ایک یتیم بچے کی زندگی ہے جو کبھی چچا کے ہاں پرورش پاتا ہے، کبھی نانا کے دسترخوان کا زلہ ربا ہے، کبھی سسرال کا دست نگر ہے۔ اپنی ذات کی حفاظت کے لیے نئے حصار تعمیر کرنے کی ضرورت بہر حال ہر انسان کو پڑتی ہے۔ غالب کی 'انا' اپنے حقیقی زمانے سے نکل کر ماضی کی طرف رجوع کرتی ہے تو اجداد کی عظمت کا احساس انھیں کچھ زیادہ ہی شدت پر مجبور کرتا ہے۔ وہ جس متوسط طبقے میں پیدا ہوئے، اس کے لیے ان کی پنشن کافی تھی، لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے۔ عمر بھر انھیں اپنے اجداد بعید کی عظمت، خاندان کی قدیم دولت، زمین کی از دست رفتہ وقعت اور شان و شوکت کا بہت پاس رہا۔ اس دھندے میں ان کی اپنی مالی حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ آخر عمر تک وہ معاشرے میں اپنی اصلی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس سے ان کی زندگی اور ان کی آرزو کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ یہی ان کی بدنصیبی کا سبب بھی ہے اور اسی میں ان کی عظمت کا راز بھی مخفی ہے۔

آرزو کو بلند سے بلند تر مقام پر فائز کرتے ہوئے مثبت حالت میں غالب اپنی 'انا' کے لیے اعتماد کی دولت، طنز و مزاح کی چاشنی اور نشاطیہ کیفیات کی جلوہ گری کو اپنی نفسی توانائی کے لیے ایک حفاظتی والو (Safety Valve) کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ اس مثبت روش نے ان کی شاعری میں خلوص و اعتماد، زندگی پر گہری نظر ڈالنے اور تجربات کی نوعیت متعین کرنے، کٹھن حالات میں زندگی کو بسر کرنے کا شعور، اپنے تجربات کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی سکت آ گئی:

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

غالب کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے حسب نسب نے بہت حصہ لیا ہے ۔ ان کے اجداد ترک تھے۔ بیدل کے اجداد بھی ترک تھے، امیر خسرو بھی ترک تھے ، ابو ظفر بہادر شاہ کے آبا و اجداد بھی ترک ۔ غالب کی اس پسند کے دوسرے عوامل بھی یقیناً ہوں گے لیکن غالب کو ان شخصیتوں سے ایک لگاؤ تھا ۔ دیگر شخصی اور غیر شخصی عوامل کے علاوہ ان کی پسند کا رخ متعین کرنے میں اس مناسبت کو بھی دخل معلوم ہوتا ہے ۔ وہ پاک و ہند کے فارسی شاعروں میں صرف خسرو کو سند مانتے ہیں ، آخر کیوں؟ وہ ہندی نژاد شاعروں میں سے بیدل کی طرز کو اپناتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں ، آخر کس لیے؟ وہ بادشاہوں کی تعریف کو بھٹی گری جانتے ہیں ، لیکن ابو ظفر بہادر شاہ کی تاریخ نویسی کی خدمت کو محض سرکاری نوکری کے طور پر نہیں بجا لاتے بلکہ اس کے وسیلے سے ترکوں کے نظریہ' تاریخ کو بیان کرتے ہیں اور اپنے

نسلی تعصب کے بھرپور اظہار سے بھی نہیں باز آتے (۱) - مہر نیم روز صرف مغلیہ تاریخ ہی نہیں ترکوں کے علم الانساب کی دستاویز اور غالب کے تعصب نسلی کی واضح شہادت بھی ہے - غالب کے ان اثرات کو قبول کرنے میں دوسرے عناصر کو بھی دخل ہوگا لیکن اپنے مزاج سے ہم آہنگی کے لیے انھوں نے ان اثرات کا ایک داخلی رشتہ اپنی ذات سے بھی استوار کیا - نسلی برتری پر فخر و ناز غالب کے مزاج کا خاصہ ہے -

محمد شاہی عہد میں غالب کے دادا دلی میں وارد ہوئے- وہ ترکی جانتے تھے لیکن اس کے بعد محمد شاہ فرمان روائے عہد کی طرح اس خاندان پر بھی ترکی تمام ہوگئی - فارسی زبان اور مقامی روایات نے خاندان کی تربیت کی- غالب تک آتے آتے آبائی وراثت کا تھوڑا حصہ باقی رہا تھا - غالب کی تربیت جس معاشرے میں ہوئی وہ آگرے اور دلی کی فضا ہے ، اس میں ابھی فارسی کی ساکھ باقی تھی - غالب نے اسی فضا میں آنکھ کھولی اور فارسی اور اردو کے علمی و ادبی سرمائے سے استفادہ کیا - اس زمانے میں فارسی ادب میں دو مکتبہ ہائے خیال موجود تھے - ھندی ایرانی نزاع نے مقامی اور ایرانی کا امتیاز قائم کیا - غالب کے حلقۂ احباب میں نواب حسام الدین حیدر کا گھرانا اثر انداز معلوم ہوتا ہے ، شاید اسی خانوادے کے زیر اثر غالب اپنے آبائی فرقے کو چھوڑ کر شیعیت کی طرف راغب ہوئے - غالب مقامی سے زیادہ ایرانی عناصر کے والہ و شیدا تھے - ان کے شعری نظریات پر اس نقطۂ نظر کا نمایاں اثر ہے- ایران پرستی کلکتے میں جا کر اور بھی تیز ہوئی ، جب وہاں ہندی دبستان کے شیدائی غالب کے فارسی کلام پر معترض ہوگئے - غالب کی انا نے اس کا انتقام یوں لیا کہ آیندہ کے لیے اردو کو تقریباً ترک کرکے فارسی شاعری میں عمر کا بیشتر زمانہ صرف کر دیا - وہ اردو کی بجائے فارسی پر ناز کرتے ہیں :

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

انھیں فرزند آذر کہلانے پر بھی فخر ہے اور دین بزرگان سے گریز ان کے نزدیک ایک اعلیٰ قدر ہے :

۱- اردوے معلیٰ ، غالب نمبر ، فروری ۱۹۶۰ء ، حصہ اول ، ص ۴۷ تا ۵۶ ، مقالہ بعنوان " غالب اور مغل شاہان دھلی کا تاریخی نظریہ " از ڈاکٹر محمد اشرف -

با من میاویز اے پدر، فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دین بزرگاں خوش نکرد

ایران کی طرف رغبت کا یہ مسلک صرف مذھبی عقاید کی حد تک نہیں غالب نے اسے زندگی کے جملہ پہلوؤں پر حاوی کر رکھا ھے۔ اردو اور فارسی کلام میں آگ اور اس کے متعلقات کی یہ کثرت غالب کے فکری نظام میں بہت دور تک جاتی ھوئی نظر آتی ھے۔ شمع، شعلہ، زبانہ، لالہ، خون، ناخن خون شہیداں، بسمل، دست حنا، سرخ رنگ سے یہ لگاؤ غالب کی زندگی کے بعض جذباتی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ھے:

ھوائے سیر گل آیینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

اسد بسمل ھے کس انداز کا قاتل سے کہتا ھے
کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ھوا ھوگا
قیامت ھے سرشک آلودہ ھونا تیری مژگاں کا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رھے ھو وہ اگر شرار ھوتا

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ھے طعن
غیر سمجھا ھے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

ھوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ھوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ھوتا

اھل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ھیں

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع
شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

بزم ترا شمع و گل خستگیٔ بو تراب   ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

بیخود بوقت ذبح تپیدن گناہ من   دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست

عجب نشاط سے جلاد کے، چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو
جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

غالب کے ہاں بعض الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں - رنگوں میں ان کی Fixation سرخ، سبز اور سیاہ رنگ کے ساتھ ہے۔ ان میں سرخ و سیاہ کو بہت اہمیت ہے۔ خون اور اس کے متعلقات کا غالب کی جنسی زندگی سے کیا رشتہ ہے؟ ان کی جنسی زندگی کی تفصیلات معلوم نہیں، اس لیے ان علامتی الفاظ کے جنسی سیاق و سباق سے قطع نظر شہدائے کربلا کی شہادت اور اپنی مظلومی کے درمیان معنوی رشتے کی تلاش و جستجو غالب کو سرخ رنگ سے وابستہ رکھتی ہے۔ غالب کی خود رحمی کی یہ ایک رفیع صورت ہے جس میں وہ اپنی زندگی کے معمولی واقعات کو واقعات کربلا سے مماثل کر دکھاتے ہیں۔ شہادت، خون شہیداں، بسمل کے تلازمات غالب کے داخلی کرب کا وہ اظہار ہے جس کی جھلکیاں ہمیں لکھنوی دبستان کے شعرا کی غزلوں میں ملتی ہیں۔ لیکن غالب کی سرخ رنگ سے چسپیدگی اس کے علاوہ بھی توجہ طلب نکات رکھتی ہے۔ ان کے ہاں سرخ رنگ کا ایک رشتہ سیاہ رنگ کے ساتھ بھی ہے، وہ سرخ کو سیاہ میں تبدیل ہوتے دیکھتے ہیں - سرخی کا انجام روشنی نہیں تاریکی ہے۔ لہو کا شہادت تک، بسمل کا مرگ تک، حنا کا داغ تک، گل لالہ کی چمک دمک کا داغ لالہ سے، روشنی کا دھوئیں سے ربط اور خون کا تاریکی سے ایک سلسلہ قائم ہے:

ہزاروں دل دیے جوش جنون عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

یک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

شمع کی لو غالب کو اس لیے اچھی لگتی ہے کہ وہ بالآخر بجھ جاتی ہے یا جل جاتی ہے۔ بجھنا اور جل کر رہ جانا غالب کے نزدیک ہر زندہ شے کا مقسوم اور ہر التہاب کا انجام ہے:

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

بوے گل ، نالۂ دل ، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں ؟
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے(۱)

محبوب کے سراپا میں بھی انھی رنگوں کی آمیزش غالب کے لیے دلجمعی کا سامان ہے۔ ان کی ' انا ' اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اپنے کلام میں محبوب کے پیکر سے انسانی اور گوشت پوست کا تعلق رکھتے ہوئے بھی اس کی پوری تصویر قاری کو کبھی نہیں دکھاتے ۔ کبھی کبھی تو محبوب غالب

۱۔ نفسیاتی طور پر تاریکی رحم مادر کی علامت بھی ہے۔ قفس اور کنج قفس کے تلازمات بھی غالب کے ہاں زندگی اور زندگی کے اس تعلق کا اشارہ ہیں:

فشار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

بیضہ آسا تنگ بال و پر یہ ہے کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

اس تاریکی کا رشتہ غالب کی نفسیاتی چسپیدگی (Fixation) سے بھی ہے۔ کیا غالب کے ہاں یہ علامت محبوب کی زلف سے غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ ہے یا خون ہی کی ایک حالت متغیرہ سے لگاؤ کا نتیجہ ہے ؟ یا محبوب کی سیاہ رنگت سے اس کے بارے میں قطعیت سے اس وقت تک کچھ کہنا ممکن نہیں جب تک غالب کی زندگی کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل نہ ہوجائیں۔ رحم مادر ، خون اور تاریکی کا باہمی تعلق جس صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے ، زیر نظر مقالے میں اسی کو ممکنہ صورت حال قرار دیا گیا ہے۔

کی ذات کی Projection کا روپ دھار لیتا ہے ۔ یہ محبوب خارجی وجود رکھتا ہے ، اس کے جسمانی پہلو اور حرکات و سکنات غالب کو مرغوب ہیں ۔ اس کے خرام ناز ، اس کے اعضا ، اس کی نزاکت اور حیاداری ، اس کا چہرہ ، اس کے گال ، اس کی زلفیں ، اس کی آنکھیں غالب کو پسند ہیں ۔ وہ اس کے شباب کی دل آویزی کے بھی قدر دان ہیں ، لیکن کلام غالب کی مدد سے اگر آپ غالب کے محبوب کی تصویر بنانا چاہیں تو وہ از حد دھندلی اور مبہم ہوگی (۱) ۔ غالب عشق و محبت میں اپنی ذات کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔ وہ محبوب کے سراپا سے زیادہ اس کے بارے میں تعمیمی رویے کو اہم جانتے ہیں ۔ محبوب کے احساسات کو بیان کرنے کی بجائے محبوب کو محض اپنے داخلی کوائف کے سمبل کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔ ان کی ' انا ' آپ اپنی رقیب بھی ہو جاتی ہے :

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

وا کردیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اسی سیاہی کی وجہ سے غالب کو نامہ بر اور نامہ وغیرہ سے بھی تعلق خاطر ہے :

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے : نقد غالب ، مقالہ بعنوان ''غالب کا تصور حسن و عشق '' از حمید احمد خان، ص ۷۶ تا ۱۱۸ -

سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

غالب کا محبوب اس کے جذبات و ہیجانات کا عکس ہے۔ اس عکس میں غالب اپنا چہرہ دیکھتے رہتے ہیں - ایسے میں وہ صرف وہی نقش ابھارتے ہیں جو ان کے ذاتی میلانات سے مطابقت رکھتے ہیں - انھیں سرخ رنگ پسند ہے - یہ سرخ رنگ اپنی رو بہ تغیر صورت میں سیاہ رنگ میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے -

غالب محبوب میں بھی سرخ و سیاہ کی فراوانی تلاش کرتے ہیں - خون بسمل ، پنجۂ مرجان اور شرار و سنگ بھی علامتی حیثیت رکھتے ہیں - فرد کی جذباتی زندگی سے ایک سے زیادہ رشتے علامت کا بنیادی وصف ہے - یہاں بھی ان علامات کے کئی رخ ہو سکتے ہیں - لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ان کا ایک غیر محسوس رشتہ متضاد رنگ یعنی سیاہی سے بھی ہے - خون بسمل کا شہادت سے ، موت کا قبر سے ، لالے کا داغ سے ، دل کا داغ دل اور سویدائے دل سے ، نرگس کا چشم سے مردمک چشم کی مناسبت سے ، خوشی کا غم سے ، نشاط کا رنج سے ایک ایسا رابطہ ہے کہ غالب اکثر دونوں حالتوں کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہیں - غالب کی ایران پرستی ثنویت کے جس پیچاک میں اسیر ہے - اس کا لازمی رشتہ تقابل اور تضاد کی اس دھوپ چھاؤں کے ساتھ ہے - غالب سرخ رنگ کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ اس میں سیاہ رنگ میں تحلیل ہو جانے کی صلاحیت ہے - اس لحاظ سے سرخ و سیاہ کا یہ باہمی ربط جنسی زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے - روشنی انھیں عزیز ہے کہ وہ تاریکی سے دست و گریباں ہے - جنسی روابط کا مرکز سرخی سے سیاہی کی طرف ایک علامتی سفر ہے اور غالب کا کلام ان کی زندگی کے اس پہلو کا عکاس ہے :

رخسار یار کی جو کھلی جلوہ گستری زلف سیاہ بھی شب مہتاب ہوگئی
موج تبسم لب آسودۂ مسی موسے لیے تو تیغ سیہ تاب ہوگئی

ان جنسی علامتوں کا تعلق غالب کے تہذیبی افق سے بھی ہے - ان کے ہاں یہ علامات اپنے تضاد کی وجہ سے بھی پرکشش ہیں - ایران دوستی ان کے تصورات کی متضاد کیفیتوں کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے - غالب کے

۱

تصورات حسن و عشق بھی روایتی راستوں سے ہٹ کر ' انا ' کے داخلی مسائل سے ہم آہنگ ہیں ۔ فارسی اور اردو کے مروجہ تصورات حسن کو خیر باد کہہ کر غالب محبوب میں سرخ و سیاہ کے ڈانڈے یوں بھی ملاتے ہیں کہ ان کا محبوب روایتی محبوب کی بجائے ایک ستم پیشہ ڈومنی ہو جاتا ہے ۔ کیا غالب کے ہاں محبوب کا رنگ ان کے نفسی رجحانات کا مرکزی نقطہ ہے ؟ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن بظاہر حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے :

رچ گیا جوش صفائے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ ، اے ظالم سیہ فامی تری

غالب کا تصور محبوب سیاہی اور تاریکی سے کسب حسن کرتا ہے ۔ غالب کو محبوب کی زلفیں اس لیے عزیز ہیں کہ وہ سیاہ رنگ کی ہیں ۔ مژگاں بھی سیاہ ہیں ، آنکھ کی پتلی سیاہ ہے ، سایہ بھی سیاہ ہے ، چشم دنبالہ دار بھی اپنی سیاہی کی وجہ سے پسندیدہ ہے ، اس لیے محبوب کے سراپا کی جو معمولی سی جھلک کلام غالب میں ملتی ہے ، اس میں تاریکی اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے :

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلہ آواز ہے

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

غالب، تصور محبوب روایت سے نہیں اپنی خارجی زندگی اور داخلی نفسی کوائف سے حاصل کرتا ہے ۔ اس طرح اس کی انا کو صحت مند راستہ مل گیا ۔

غالب روایتی تصورات حسن و عشق کا مخالف ہے ۔ وہ عشقیہ تصورات کو بھی اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک ذاتی تجربے کی مدد سے اس کے حسن و قبح کا جائزہ نہیں لے لیتا ۔ وہ بنے بنائے شعری تصورات کا مخالف ہے ۔ غالب کی قوت مقاومت کا میدان خاصا وسیع ہے :

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　　اب کسے رہنما کرے کوئی

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفی' منصور نہیں

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

شنیدہ ام کہ بہ آتش نسوخت ابراھیم
بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

تماشائے گلشن ، تمنائے چیدن   بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم

حیف کہ من بخون تپم وز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری آہ بہ سینہ بنگری

دیتے ہیں جنت حیات دھر کے بدلے   نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

ماحول سے مسلسل بر سر پیکار رہ کر غالب نے اپنی ' انا ' کو یوں مستحکم کر لیا کہ آرزوؤں اور امنگوں کی سطح گرد و پیش کی میسر شدہ آسایشوں سے بہت بلند اور ارفع ہو گئی :

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

نہ بندھے تشنگی' شوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مری ہستی فضائے حسرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

بیاو جوش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
دہد دانہ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

اپنے ماحول سے آمادۂ جنگ رہنے کی وجہ سے غالب کی زندگی مسلسل کشمکش، مسلسل اضطراب اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ اس سے ان کی ایغو (Ego) کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی آبیاری ہوتی رہی۔ کچھ رجحان سقیم ہیں اور کچھ صحت مند۔

غالب ۱۸۲۶ء میں کلکتے گئے - ان کی ابتدائی دہلوی زندگی معاشی آسودگی میں بسر ہوئی تھی - جاگیردارانہ نظام کی مہیا کردہ آسایشیں اور لہو و لعب کے وہ سارے حیلے جو جسمانی اور ذہنی تسکین کے لیے فرد کو اس کے معاشرے سے ہم کنار کرنے کا باعث ہو سکتے ہیں، غالب کو بھی میسر تھے - عیش و عشرت میں جوانی کو بسر کرکے غالب نے اپنے لیے امارت اور فارغ البالی کا جو نمونہ تراش لیا تھا، وہ انہیں عمر بھر ایک آسیب کی طرح پریشان کرتا رہا - نواب احمد بخش خان کی گوشہ نشینی (۱۸۲۶ء) اور خانگی معاملات کی پیچیدگی نے غالب کو زندگی کی جدوجہد کے دوراہے پر لا کھڑا کیا - ان میں بزور اپنا حق طلب کرنے کا احساس بیدار ہوا اور اس فعال قوت نے ان کے ہاں ذہنی اور عملی دونوں لحاظ سے ایک طوفانی سرگرمی کا آغاز کر دیا - وہ قانونی چارہ جوئی کے لیے کلکتہ روانہ ہوئے - اس سے قبل وہ جذباتی آشوب سے دو چار ہو چکے تھے - ایسے میں کلام میں بے چارگی، بے بسی، خود رحمی اور غم کی فضا جھلکنے لگی تھی - ۱۸۲۶ء کے گرد و پیش کی غزلوں میں حالات کے سامنے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اعتراف اور ناکامیوں پر آنسو بہانے کا طریق زیادہ جاذب ہے:

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

غم کی تلخی کو اس انداز میں قبولنے کے لمحات بھی غالب پر اپنا اثر چھوڑ گئے جب پنشن کے مقدمے میں ناکام ہوئے اور انہیں قرض کے ایک مقدمے میں خانہ نشینی پر مجبور ہونا پڑا - اس طرح کا شدید دور آخری عمر میں بھی آیا تھا جب انہیں ۱۸۵۷ء کے بعد طرح طرح کے مالی مصائب کا سامنا کرنا پڑا - قاطع برہان کے قضیے میں الجھنا پڑا اور قرض خواہوں کے ہاتھوں سخت عذاب کا سامنا ہوا -

ان تین ادوار میں غالب کی شخصیت انہیں بے بسی اور بے چارگی کے حصار میں مقید کر دیتی ہے اور وہ اپنے کلام میں گریہ و شیون کا سا انداز اختیار کرتے ہیں، لیکن عام طور پر ان کی 'انا' انہیں مثبت انداز میں

مقاومت کا حوصلہ بخشتی ہے ۔ اپنی ذات سے اس طرح کی نفرت کا احساس صرف وقتی ہے :

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت میں اوقات سے ہے

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ایسے میں بعض اوقات غالب اپنے غم کو دوسرے کا غم قرار دے کر تسکین کا موقع ڈھونڈتے ہیں :

شورش باطن سے یاں تک مجھ کو غفلت ہے کہ وہ
شیون دل یک سرود خانۂ ہمسایہ ہے

لیکن بالعموم غالب کی قوت مدافعت حالات سے ٹکرانے اور برسر پیکار ہونے ہی میں مسرت محسوس کرتی ہے ۔ وہ عموماً زندگی سے مفاہمت کی بجائے مقابلے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ عمل ، حرکت اور حرارت انہیں زندگی کا حاصل معلوم ہوتی ہے ۔ وہ حیات میں حرکت و تموج کے خواہاں ہیں ۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

گرد باد رہ بے تابی ہوں صرصر شوق ہے بانی میری

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے ۔ کیا غالب کی ' انا ' مجموعی اعتبار سے انہیں حزن و یاس کے سمندر میں غرق کر دیتی ہے یا وہ زندگی کی ہر مثبت قدر کی نفی کرتے ہوئے زندگی کے بارے میں ایک معاندانہ رویہ رکھتے ہیں ۔ غالب کی زندگی سیدھے خط سے عبارت نہیں ، اس میں مد و جزر ہیں ۔ غالب اپنے اردو اور فارسی اشعار میں عقلی سطح کو جذباتی سطح پر فوقیت دیتے ہیں ۔ اس لیے ان کے ہاں زندگی کو تعقل کی مدد سے سمجھنے کا شعور پایا

جاتا ہے۔ یہ ہوش مندی غالب کو مایوسی کی انتہاہ گہرائی میں گم نہیں ہونے دیتی۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو ایک با شعور شخص کی طرح دیکھتے ہیں، اس سے ان کے تجزیات میں گہرائی اور ان کے نقطۂ نظر میں ہوش و خرد کا رنگ زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن میری دانست میں عقل کی یہ کارگزاری کسی ٹھوس فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ نہیں۔ غالب بنیادی طور پر جذباتی شخص ہیں۔ ان کی عقلی سطح در اصل ان کی زندگی کی جذباتی افتاد ہی کی ایک منقلب صورت ہے۔ میرا قیاس یہ ہے کہ غالب زندگی کو جذبات کے راستے سے دیکھتے ہیں اور اس کی فلسفیانہ تعبیر اور تشریح بعد میں کرتے ہیں ، اس لیے ان کے ہاں جذبات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ عقلی فیصلے بھی مختلف ادوار میں مختلف طرح بیان ہوئے ہیں۔ آپ اسے ان کی فکر کا تضاد کہیے یا ان کی متحرک زندگی کا سیماب یا لاوا۔ وہ کسی منطقی فیصلے کو زندگی کا آخری فیصلہ نہیں جانتے۔ جب حالات کے دباؤ سے ان کی انا کو صدمہ پہنچتا ہے تو وہ بھی زندگی کو آنی و فانی مانتے ہیں اور اپنے غم کو کبھی غفلت کے رویے سے ، کبھی فرار سے، کبھی تسلیم و رضا سے ، کبھی نفرت و حقارت یا طنزو ظرافت سے ، قاری پر چھا جاتے ہیں۔ وہ در اصل کیفیات (Moods) کے شاعر ہیں۔ ان کی جذباتی زندگی جوانی کی ابتدائی منزلوں میں جذبات کی تہذیب کی طرف متوجہ ہوئی اور ان کے ابتدائی بے دلانہ کلام میں زندگی کو قبول کرکے اس سے کام لینے کا جذبہ قوی نظر آتا ہے۔ لیکن یہ حالت پھر تغیر سے دو چار ہوگئی۔ اسی جوانی کے ایک حصے میں انہیں حالات سے مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ اب ' انا ' کو صدمہ پہنچا۔ اس زمانے کی غزلوں میں غم کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔ یہ دور ان کی مالی حالت کی ابتری کے علاوہ ان کی جذباتی ابتری کا دور بھی ہے۔ کچھ مدت کے لیے ' انا ' غیر صحت مند راستے پر ذرا دور تک چل نکلی۔ اب انہیں دلی کا ہر باشندہ اپنا دشمن نظر آنے لگا۔ کلکتے سے واپسی کے بعد ۱۸۳۰ء تک ان کی جذباتی توانائی پارہ پارہ رہی:

" در عرض ایں سہ سال رسم و راہ اعیان دھلی برگشتہ و نام مہر و وفا در نہاد یاران نماندہ ... گران مایگان و صاحب دلان در زوایائے خمول خزیدہ و سفلگان و سیفہان رونق عرصۂ دار و گیر گردیدہ "۔ (۱)

۱۔ مکتوب بنام مولوی سراج الدین ، مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء ، متفرقات غالب ، ص ۲۔

" چه گویم از بخت خود چقدر گله مندم و از هجوم اندوه چه مایه نژندم ـ خلقے سر آزار من دارد و عالمے تشنهٔ خون من است "۔ (۱)

" حقا که مهرو آزرم در نهاد مردم دهلی نیست " (۲)

"دهلویان حسد پیشه چون مرا مخلص صادق الولائے مولوی دانستند ، رنگ آن ریختند که در هر روزے دو بار سه بار پراگنده گوشے نزد من آید و آنچه خواهد از پیش خود بتراشد و بیان نماید" ـ (۳)

" منت خدائے را که نامرادی و ناکامی بر من آسان است اما برخے از خندهٔ عوام و ملامت خواص آزار می کشم "۔ (۴)

" ملول بودن از کلکته چه غضب است والله که دهلی شائستگی آن ندارد که آزادهٔ در وے خاک نشیں تواند بود ـ خاص و عام این بقعه بے سبب آزار و مرد و زن این تیره بوم مردم خوار ، بخاطر دارد که چون این داوری بپایان رسد به بهانهٔ ازیں شهر بر آیم و کلکته را در یابم"۔ (۵)

"تا کجا شکیب ورزم و خود را به هیچ شادمان دارم از در و دیوار شاهجهان آباد بلا می بارد "۔ (۶)

یہ خط ۱۸۲۹ء سے لے کر ۱۸۳۰ء کے درمیان مختلف اوقات میں لکھے گئے ۔ اس دور میں پنشن کے مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف ہوا ، قرض کے ایک مقدمے میں گوشہ نشین ہوئے ، ولیم فریزر کا قتل ہوا اور غالب ایک محسن سے محروم ہوئے ۔ غالب کے حالات میں سارے دلی والے ملوث نہ تھے ۔ ان کی نرگسیت مریضانہ راستے پر مصروف سفر ہو چلی تھی لیکن انا نے انہیں پھر سعی و کوشش کے راستے پر ڈال دیا اور ۱۸۵۷ء تک وہ اس مریضانہ

۱۔ مکتوب بنام مولوی سراج الدین ، متفرقات غالب ، ص ۳۵ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۵۰ ۔
۳۔ ایضاً ، ص ۴۵ ۔
۴۔ ایضاً ، ص ۶۲ ، مکتوب بنام مرزا احمد بیگ خان ۔
۵۔ مکتوب بنام مرزا احمد بیگ ، متفرقات غالب ، ص ۶۶ ۔
۶۔ مکتوب بنام مرزا علی بخش ، مجموعہ نثر غالب ، ص ۳۳ ۔

صورت حال سے بچ گئے۔ یہی زمانہ ان کی فارسی شاعری اور نثر نویسی کے عروج کا ہے۔ اس دور میں غالب نے فارسی شاعری پر زیادہ توجہ کی اور یہ کلام ان کی شخصیت کو زیادہ مربوط اور ان کی جذباتی زندگی کو زیادہ استوار پیش کرتا ہے۔ غالب پھر صحت مندی سے روشناس ہو گئے۔

اس مستحکم اور پر وقار جذباتی زندگی میں آخری طوفان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے پیدا کیا۔ غالب کی نجی زندگی بھی کچھ زیادہ کامیاب معلوم نہیں ہوتی۔ بے اولادی کا احساس انہیں شدت سے رہا۔ اور آخر عمر میں اس کا احساس زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ کلکتے سے واپسی تک وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ اپنی انا کے استحکام سے وہ ان ذاتی محرومیوں کا مقابلہ طنزیہ و مزاحیہ پیرائے سے کرتے رہے۔ ان کی شوخی اور شوخ بیانی شعری سرمائے کا نادر حصہ ہے۔ آرزو کی شدت، جدوجہد کی کثرت، مقاصد کی بلند آہنگی، غالب ان وسائل سے اپنی توانائی کو بحال کیے ہوئے تھے:

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

لیکن ۱۸۵۷ء میں ان پر گزرنے والے صدمات نے انا کو ایک بار پھر سقیم راستوں پر ڈال دیا۔ برہان قاطع کے سلسلے میں غالب کی جوابی کارروائیاں صحت مند انسان کے مزاج کو پیش نہیں کرتیں۔ اعصاب کی کمزوری کے ساتھ شخصیت کا تار و پود بھی بکھرنا شروع ہو گیا۔ اس زمانے میں قرض خواہوں کے ہاتھوں بھی غالب پریشانی میں گرفتار رہے۔ قربان علی بیگ سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

'' یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے ' جنت آرامگاہ ' اور ' عرش نشین ' خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، ' سقر مقر '

اور ' هاویہ زاویہ ' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں هاتھ ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں ۔ اجی حضرت نواب صاحب ، نواب صاحب کیسے ، اوغلان صاحب ، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں ۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے ؟ کچھ تو اکسو ۔ کچھ تو تو بولو ۔ بولے کیا بے حیا ، بے غیرت ، کوٹھی سے شراب ، گندھی سے گلاب ، بزاز سے کپڑا ، میوہ فروش سے آم ، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا ۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا "۔ (۱)

یہ لب و لہجہ اپنی شخصیت کی شکست و ریخت کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پیدا ہوا ہے۔

غالب کی شخصیت ایک ٹیڑھی لکیر ہے جس میں جذباتی مد و جذر نے رنگا رنگی اور تنوع پیدا کر رکھا ہے ۔ اس کے پیچھے کسی مستقل اور مرتب نظام فکر کی جستجو ممکن نہیں ۔ وہ شاعر پہلے ہیں ' فلسفی یا کچھ اور بعد کو ہیں ۔

لارڈ لیک کے قبضہ دھلی (۱۸۰۳ء) سے پہلے غالب پیدا ہوئے تھے ۔ انھوں نے شاہ عالم ثانی ، اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ کا دور دیکھا ۔ وہ جس معاشرے کے فرد تھے ۔ اس میں پرانا تہذیبی ڈھانچا ختم ہو رہا تھا ۔ اقدار کی شکست کا عمل شروع ہو چکا تھا ۔ نئے معاشرے نے پرانے معاشرے کی جگہ ابھی نہیں لی تھی ۔ نئی اقدار جن کا چلن ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا ، ابھی محض سایہ ریز تھیں ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی پالیسی نے نئے متوسط طبقے کے وجود میں آنے کے فطری عمل کو روک رکھا تھا ۔ شہری زندگی اور صنعتی کاروبار کو ختم کرکے پاک و هند کو زرعی معیشت کی طرف لے جانے کی شعوری کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ سیاسی اور اقتصادی نظام کے ساتھ ساتھ تہذیبی عمارت کا شیرازہ بھی بکھرتا چلا گیا ۔ قدیم نظام معیشت کے خاتمے کے ساتھ قدیم اقدار پر زد پڑی ۔ روحانی تقاضوں کی جگہ ابھی مادی مقتضیات نے نہیں لی تھی ۔ ایک خلا کی کیفیت تھی ۔ نئے علوم اور نئے سائنسی انکشافات کو معاشرتی زندگی میں کسی حد تک محسوس کیا جا رہا تھا لیکن

۱۔ محاسن خطوط غالب ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ص ۔ ۱۱۰

زندگی اور نظریات زندگی کے درمیان فاصلے بڑھ چکے تھے ۔ عقیدے اور عمل میں تباین کی حالت تھی ۔ اقدار کی مثالی صورتیں صرف ذھنوں میں تھیں ، عملی زندگی ان سے محروم ھو چکی تھی ۔ مختلف عوامل کا یہ تصادم غالب کے سامنے تھا ۔ حساس اور با شعور انسان کی طرح انھوں نے اسے دیکھا ۔ زندگی کے تضاد نے ان کی شوخی اور شوخ بیانی کے لیے مواد فراھم کیا ۔ کبھی کبھی وہ اس تضاد کو بہت نمایاں شکل میں بھی دیکھتے ھیں :

فرصت اگرت دست دھد مغتنم انگار ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
ز نہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

بے عملی اور جمود کی جگہ غالب کی شاعری حرکت اور عمل کی نقیب ھے ۔

نئی زندگی کے تقاضے اور اس کی خارجی شکل ابھی پوری طرح سامنے نہیں آئی تھی ۔ غالب کے ھاں زندگی کی مثبت قدروں کا احساس خفی ھے ۔ ان کی معین صورتیں نہیں ھیں ۔ یہ صورتیں آگے چل کر سر سید احمد خاں اور حالی کی تحریروں میں پہلی بار نکھر کر سامنے آتی ھیں ، جب شعر و ادب کا تعلق زندگی کے گہرے شعور کے ساتھ استوار ھوگیا ۔ غالب کے زمانے تک یہ منزل نہیں آئی تھی ۔

غالب کا رویہ انفعالی رجحانات کے خلاف ایک احتجاج تو ھے ، بغاوت نہیں ۔ اس کی شعری فضا وھی معاشرتی زندگی ھے جو ذوق اور شاہ نصیر کی زندگی تھی ۔ بس اتنا ھے کہ غالب نے منفی رجحانات کی تائید سے اپنی شاعری کا چمن نہیں سجایا ۔ اس نے ذاتی تجربے کی اھمیت کو شدت سے محسوس کیا اور اپنے عقیدے پر عمل پیرا ھوکر اردو ادب کو زندہ اور پائیدار طرز احساس عطا کیا ۔ یہ طرز احساس آج بھی اردو شاعری کے لیے سرمایۂ افتخار ھے ۔

بوستان خرد

غالب کی ایک غیر معروف شرح

ڈاکٹر عبدالغنی

مولانا الطاف حسین حالی کی 'یادگار غالب' کو کئی لحاظ سے اولیت کا مقام حاصل ہے۔ یہ مرزا غالب کی سیرت بھی ہے، ان کے کلام پر تنقید بھی ہے اور ان کے کلام کی شرح بھی۔ کلام غالب کی خصوصیات کو مولانا حالی نے اپنی اس یادگار تصنیف میں اس عمدگی سے ذہن نشین کرایا ہے کہ کیا کہنا۔ اس کا سال طباعت ۱۸۹۷ء ہے۔ یعنی میرزا غالب کی وفات کے اٹھائیس سال بعد یہ بے نظیر علمی و ادبی کارنامہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ لیکن یادگار غالب کو کلام غالب کی پہلی شرح نہیں کیا جا سکتا، کیوں اس سے پہلے مولوی عبدالعلی والہ پروفیسر نظام کالج حیدرآباد کی 'وثوق صراحت' ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں مکمل ہو چکی تھی، اس کا نام تاریخی ہے، یہ ۱۳۱۲ھ میں چھپی تھی۔ یہ صرف اشارات پر مشتمل ہے۔ طلبہ کے استفادے کے لیے لکھی گئی تھی مگر اشارات ایسے مختصر اور بعض اوقات اس قدر عالمانہ ہیں کہ ان کی مزید شرح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شرح طباطبائی سب سے زیادہ مفصل ہے۔ اہل علم اسے وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں طبع ہوئی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ شرح مولانا حسرت موہانی کی ہے، اسی لیے کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ آج ہم کلام غالب کی ایک اور شرح کو نیازمندان غالب سے متعارف کرانا چاہتے ہیں۔

اس شرح کی طرف اشارہ تلامذۂ غالب میں مالک رام نے بھی کیا ہے، لیکن انھوں نے اس کا نام نہیں لکھا۔ صرف یہ کہہ دیا ہے کہ خواجہ قمرالدین

خان عرف خواجہ مرزا خان مرحوم دہلوی نے دیوان غالب کی ایک شرح بھی لکھی تھی جو نہیں چھپی، لیکن یہ ذکر زمانہ حال سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کام کرتی ہیں، اس شرح کے متعلق سب سے پہلے مرزا رفیق بیگ نبیرہ خواجہ قمرالدین خان راقم نے 'اردو' بابت جولائی سنہ ۱۹۲۲ء میں ذیل کی سطور لکھیں :

" راقم نے غالب کے دیوان کی شرح لکھی تھی اور مسودہ صاف کرکے حیدرآباد اپنے ساتھ لائے تھے۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر سے جو رشتے میں راقم کے بھتیجے ہوتے ہیں، اتفاقاً ذکر آیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور راقم سے کہا کہ وہ مسودہ مجھے دے دیجیے، میں اس کو چھپواتا ہوں۔ راقم نے مسودہ ان کے حوالے کردیا اور واپس جے پور چلے گئے۔ اس کے بعد کئی سال تک اپنی زندگی میں نواب صاحب پر تقاضے کیے اور راقم کے انتقال کے بعد ان کے فرزند خواجہ امیرالدین خان صاحب آثم نے بھی جو اوصاف میں اپنے والد کے قدم بقدم تھے (افسوس کہ سنہ ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا) بہت کوشش کی، لیکن وہ شرح نواب صاحب کے پاس سے غالباً کہیں گم ہوگئی۔ اس شرح کا پہلا مسودہ جو بہت کٹا پھٹا ہے، اب نکلا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ بالکل کرم خوردہ ہے اور اس قابل نہیں کہ شایع کیا جا سکے۔ البتہ راقم کا تحریر کردہ نسب نامہ غالب دستیاب ہوا ہے جو اس شرح کا دیباچہ ہے اور اب رسالہ اردو میں طبع ہوتا ہے"۔

اس بیان میں شرح کا نام درج نہیں کیا گیا۔ راقم کا سال وفات سنہ ۱۹۱۰ء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا نبیرہ ان کی وفات کے بارہ سال بعد ان کی لکھی ہوئی شرح غالب کا ذکر کر رہا ہے۔ اور یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں اس شرح کے اصل مسودے کا ذکر کیا جارہا ہے، جس سے صاف کرکے ایک اور نسخہ تیار کیا گیا تھا جو مصنف نے اپنے بھتیجے نواب ذوالقدر جنگ بہادر کو حیدرآباد (دکن) میں دیا تھا۔ اس نسخے کا بعد میں ذکر آئے گا۔ اس کرم خوردہ اصل مسودے کے متعلق ایڈیٹر 'اردو' لکھتے ہیں :

" شرح کے متعلق جس کا ایک بوسیدہ مسودہ دستیاب ہوگیا ہے، امید ہے کہ رسالہ اردو میں آیندہ ہم تفصیل سے کچھ لکھ سکیں گے"۔

جولائی ۱۹۲۲ء کے بعد 'اردو' کے جس قدر پرچے ہمیں ملے ہیں، ان میں ایڈیٹر اردو نے اس شرح کے متعلق کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ ممکن ہے اس کے بعد انھوں نے اس شرح کی بابت کچھ بھی نہ لکھا ہو یا اگر لکھا تھا تو ہمیں ان کی وہ موعودہ تفصیل نہیں مل سکی۔ نہ اس بات کا کھوج کہیں سے لگ سکا ہے کہ وہ بوسیدہ مسودہ اب کہاں ہے، آیا اسے محفوظ کرلیا گیا تھا یا ضایع ہو چکا ہے۔

اس شرح کا ذکر بعد میں رسالہ اسلامک کلچر (Islamic Culture) بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے صفحات ۴۰۱، ۴۰۲ پر ہوا، جہاں حیدرآباد دکن کے ثقافتی مشاغل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پہلے تو اس امر کا ذکر ہوا ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء کے رسالہ 'اردو' میں ایک شرح غالب کے متعلق مرزا رفیق بیگ نے کچھ لکھا ہے۔ اس کے بعد انگریزی میں وہ معلومات درج کردی گئی ہیں جو ہم نے یہاں اقتباس کے طور پر دے دی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہاں تک کارپردازان مجلہ 'اسلامک کلچر' کو علم ہے یہ شرح ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ یہ معلومات بہم پہنچانے کے بعد اس شرح کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے۔ اس لیے یہاں اس کا ہوبہو درج کردینا از بس ضروری ہے:

> A copy of it (150 pages) is safely lodged in the Yafai Collection. In its introduction (Muqad - dama) there is a discussion on the ancestry of Ghalib. One also finds a difference between this note and the one published in the Urdu Quarterly. The name of the Sharh is Bostan - i - Khirad dated 1323 A. H. It is written in a peculiar style and the commentator gives us an insight into the working of the poet's mind when he composed verses .

یہاں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا شرح اس وقت کہاں موجود ہے، اس کا کیا نام ہے۔ نسخے کی تسوید کب ہوئی اور شرح کی کیا اہمیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ وہی نسخہ ہے جو نواب ذوالقدر جنگ بہادر کے حوالے کیا گیا تھا۔ اصل مسودے کے ساتھ جو نسب نامہ غالب تھا وہ جولائی

۱۹۲۲ء کے اردو میں ملتا ہے، یہاں بتایا گیا ہے کہ اس محفوظ نسخہ' شرح کا مقدمہ اس سے کچھ اختلاف رکھتا ہے۔ اس بات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شرح کا یہ نسخہ اصل مسودے کی نسبت زیادہ کامل ہے۔ رسالہ اسلامک کلچر کے اس بیان کے بعد مزید اندراجات بھی ہیں لیکن انھیں زیر بحث لانے سے پہلے ہم اس شرح کے مصنف کے متعلق کچھ بتا دینا ضروری تصور کرتے ہیں۔

مالک رام اپنی تالیف تلامذہ' غالب میں ہمیں بتاتے ہیں کہ اس شرح کے مصنف یعنی خواجہ قمرالدین خان راقم کی شادی میرزا غالب کے بھانجے میرزا عاشق بیگ کی صاحبزادی منگی بیگم سے ہوئی تھی۔ اب آگے چلیے۔ خود میرزا غالب خواجہ قمرالدین راقم کے والد خواجہ بدرالدین خان عرف خواجہ امان کے متعلق ' اردوئے معلیٰ ' میں رقم طراز ہیں :

'' میرا برادر زادہ سعادت تو امان خواجہ بدرالدین خان عرف خواجہ امان ''۔

اب ' برادر زادہ ' کی توضیح کے لیے ہم مولانا غلام رسول مہر کی گراں قدر تصنیف ' غالب ' سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس میں انھوں نے صفحہ ۲۵ پر جیون بیگ کمیدان کا شجرہ' نسب دیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ جیون بیگ کمیدان کے لڑکے اکبر بیگ کی شادی میرزا غالب کی بہن چھوٹی خانم سے ہوئی تھی اور جیون بیگ کی ایک دختر کی شادی خواجہ حاجی خان سے ہوئی تھی۔ اس نسبت سے خواجہ حاجی میرزا غالب کے بھائی ٹھہرے۔ اس شادی سے خواجہ حاجی خان کے دو لڑکے پیدا ہوئے ، ان میں سے ایک کا نام بدرالدین خان عرف خواجہ امان تھا ، اسی لیے بدرالدین کو میرزا غالب اپنا برادر زادہ کہتے تھے۔ اور اس بنا پر خواجہ قمرالدین راقم ابن خواجہ بدرالدین خان میرزا غالب کے پوتے ہوئے۔ اس لیے یہ شرح غالب یعنی بوستان خرد میرزا غالب کے اپنے پوتے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس نقطہ' نگاہ سے بھی اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ خواجہ راقم خود بھی شاعر تھے۔ تلامذہ' غالب میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اور پھر ان کی تاریخ ولادت ۱۸۳۲ء ہے۔ انھوں نے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے تیر اندازی سیکھی اور کچھ عرصہ میرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ظفر کے دامن سے بھی وابستہ رہے۔ بعد میں مہاراجہ جے پور کے بیٹے کے اتالیق بنے ، گویا جہاں خواجہ راقم بڑے پایے کے آدمی تھے وہاں میرزا غالب کے قریبی اعزا میں سے بھی تھے۔ وہ ۳۷ سال کے تھے جب میرزا غالب فوت ہوئے ،

اس طرح ایک طویل عرصے تک میرزا غالب کو وہ قریب سے دیکھتے رہے ۔ میرزا کے بھانجے کی صاحبزادی سے شادی کے باعث قرابت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ۔ اس لیے ایسے قریبی رشتہ دار کی لکھی ہوئی شرح غالب کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے ۔ رسالہ اسلامک کلچر کے فاضل ایڈیٹر لکھتے ہیں کہ اس شرح کے مطالعے سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ شعر کہتے ہوئے میرزا غالب کے شعور کی کیا کیفیت ہوا کرتی تھی ۔

قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ ہم نے میرزا غالب اور خواجہ راقم کی رشتہ داری کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا ہے ، اس کی بنیاد ان معلومات پر ہے جو یا تو خود میرزا غالب نے ہم پہنچائی ہیں یا ان کے نامور سیرت نگاروں مالک رام اور مولانا غلام رسول مہر کی تحریرات سے حاصل کی گئی ہیں ۔ اگر ہم اس شرح کے مقدمے کو بھی زیر نظر رکھیں تو وہاں اس بات کا دعویٰ بھی موجود ہے کہ خواجہ قمرالدین راقم کا میرزا غالب سے جدی رشتہ تھا ، میرزا غالب کے مورث اعلیٰ ترسم خان کا ایک بھائی رستم خان تھا اس کی اولاد سے خواجہ قمرالدین راقم ہیں ، لیکن اس رشتے کو تسلیم کرنے میں اهل علم اس لیے متامل ہوتے ہیں کہ خواجہ قمرالدین راقم کے دادا خواجہ حاجی خان کو میرزا غالب نے مقدمہ پنشن میں اپنے خاندان کا ایک ملازم بتایا تھا ۔ میرزا غالب کی پنشن کا جھگڑا اسی خواجہ حاجی خان کی وجہ سے پیدا ہوا تھا ۔ لیکن ہم اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ خواجہ حاجی خان عجیب ملازم تھا کہ ' افراسیاب ' کی اولاد سے میرزا غالب کی بہن چھوٹی خانم جس اکبر بیگ سے بیاہی گئی ، اسی اکبر بیگ کی ہمشیرہ کی شادی اسی ' ملازم ' سے ہوئی اور پھر اسی ' ملازم ' کا پوتا قمرالدین راقم میرزا غالب کے بھانجے میرزا عاشور بیگ کی صاحبزادی سنگی بیگم سے شادی کرتا ہے ۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قمرالدین راقم نے مقدمہ شرح میں یہ جو کہا ہے کہ میرزا غالب نے پنشن کا مقدمہ لوگوں کے بہکانے سے شروع کیا تھا ، اتنا بے بنیاد نہیں ۔ خواجہ حاجی خان بھی ایک با وقار امیر نظر آتا ہے اور اس نے وقار یہاں ہندوستان میں آکر حاصل نہیں کیا تھا بلکہ بخارا اور بدخشاں کی طرف رہتے ہوئے بھی وہ با وقار تھا ۔ کیونکہ جس جیون بیگ کمیدان نے اپنی لڑکی کا نکاح خواجہ حاجی خان سے کیا تھا وہ بھی میرزا غالب کے دادا قوقان بیگ اور خواجہ حاجی خان کے ساتھ اسی طرف سے آیا تھا۔ اگر جیون بیگ اس کے حسب نسب سے مطمئن نہ ہوتا تو دختر کا رشتہ دینے پر

ہرگز آمادہ نہ ہوتا۔ جیون بیگ کمیدان، خواجہ حاجی خان اور میرزا غالب کے خاندان والوں کے باہمی رشتے ناتے ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب کم از کم ایک دوسرے کے ہم پایہ تھے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں تو یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ جس طرح خواجہ قمرالدین راقم نے دعویٰ کیا ہے، عین ممکن ہے خواجہ حاجی خان میرزا غالب کا جدی رشتہ دار ہو۔ جناب مالک رام کو اس بات سے اتفاق نہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے رسالہ' اردو بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء میں اس دعوے کی تائید کی تھی، لیکن جناب مالک رام اس کو پر تسلیم نہیں کرتے کہ ایک تو مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان میں واقعات اور سنین کی فاش غلطیاں ہیں، دوسرے خواجہ قمرالدین راقم ان کے ماموں ہیں۔ اگر حالات یہی کچھ ہوتے تو ہم بھی جناب مالک رام سے متفق ہو جاتے لیکن مندرجہ بالا تمام کوائف کے ہوتے ہوئے ہم سخت متامل ہیں میرزا غالب کا یہ بیان بالکل بے جان ہے کہ خواجہ حاجی خان ان کے خاندان کا ایک ملازم تھا۔ جب میرزا غالب اس قسم کے بیانات دیتے ہیں تو ہمیں دوسرے فریق کی بات پر مجبوراً غور کرنا پڑتا ہے، اسی لیے ہماری نگاہ میں میرزا قمرالدین راقم کی شرح غالب بوستان خرد کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے اس کے مطالعے سے ایسی معلومات حاصل ہونے کی توقع ہے جن کی وجہ سے غالبیات میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

اب ' بوستان خرد ' کے مطالب کی طرف آئیے۔ جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہوتا ہے اس کا ایک اہم باب تو اس کا مقدمہ ہے، جس میں میرزا غالب کے نسب نامے کا ذکر ہے۔ مندرجہ بالا حالات و کوائف کے ہوتے ہوئے اس سلسلے میں مزید تحقیقات ضروری ہے۔ قضیہ' پنشن جو میرزا غالب کی زندگی کا المیہ بن کر رہ گیا تھا ان تحقیقات کی روشنی میں ہمارے لیے زیادہ قابل فہم ہو جائے گا۔ اس شرح کی بدولت میرزا غالب کی زندگی کے متعلق مزید حقائق کے دریافت ہونے کی بھی امید کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر میرزا غالب کے مندرجہ' ذیل شعر :

کس سے محرومی' قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

کی شرح کرتے ہوئے خواجہ راقم لکھتے ہیں :

"یہ شعر قصہ طلب ہے جس کو کوئی نہیں جانتا کہ شاعر کیا کہتا ہے اور مقصود کیا ہے - یعنی غالب مغفور نے اپنے برادر زادوں خواجہ شمس الدین خان اور خواجہ بدرالدین خان پدر و عم راقم سے جاگیر لینی چاہی ، کئی برس جھگڑا طے نہ ہوا - حضرت کلکتہ گئے وہاں سے ناکام آئے - انجام کار جاگیر ضبط ہوگئی اور اس کی نقدی سرکار انگریزی نے خاندان میں نام بنام تقسیم کردی - اسی زمانہ تہیدستی اور پریشان حالی کا حال بیان کیا گیا ہے - واقعی خاندان میں تا انفصال مقدمہ بہت محتاجی رہی ہے کہ مغفور اسی محتاجی میں پراگندہ حواس رہے - یہاں تک کہ جینے سے بیزار ہوئے ، کتنے ہی دن پینے کو شراب نہ ملی، آخر اس غم میں ایک دن شام کو صندوقچہ سے سنکیا کی ڈلی نکالی اور کھا گئے . اس کے اوپر ایک گلاس برانڈی شراب کا پی لیا اور پلنگ پر دراز ہوگئے - رات بھر حقہ پیتے رہے اور نشے کی حالت میں اجل کی راہ دیکھا کیے ، اب آتی ہے ، اب آتی ہے ، مگر اجل خود اس دلیری سے دبک گئی - حضرت صبح کو چاق و توانا اٹھ کھڑے ہوئے - صرف کان بہرے ہوگئے ، جان سلامت رہی- بس اس شعر میں یہ ہی تلمیح ہے "- (۱)

اس شعر کی یہ تشریح پڑھیے اور غور کیجیے کہ اسے کس قدر اہمیت دینی چاہیے - یہ تو غالب کا ہر سیرت نگار تسلیم کرتا ہے کہ پنشن کا جھگڑا میرزا غالب کے اعصاب پر سوار ہوگیا تھا اور میرزا کلکتہ سے سخت مایوس اور غمزدہ لوٹے تھے - لیکن یہ زہر کھانے والا معاملہ بالکل نئی بات ہے- اسے تسلیم کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں - ایک تو وہ دعویٰ ہے جو میرزا غالب کو اپنی عالی حوصلگی کے متعلق تھا ، کہتے ہیں :

ز من جو در بد نکو زیستن		جگر خوردن و تازہ رو زیستن

دوسرے خواجہ راقم نے جس شعر کی شرح کی ہے وہ دیوان غالب اردو مرتبہ مولانا عرشی کے مطابق نسخہ بھوپال میں موجود ہے- اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شعر ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء سے پہلے کہا گیا تھا جب میرزا غالب کی عمر پچیس سال سے کم تھی اور قضیہ پنشن بعد کی بات ہے- میرزا غالب کو

۱- رسالہ ' اردو ' بابت جولائی ۱۹۲۲ء

پوری طرح مایوسی اُس وقت ہوئی جب ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو انھیں لکھا گیا کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل پنشن کے موجودہ انتظام میں ردو بدل کرنے پر تیار نہیں ۔ اگرچہ انھوں نے ولایت میں بھی اس کے متعلق اپیل کی جس کا فیصلہ ان کے خلاف ۱۸۴۲ء کے شروع میں ہوا لیکن ان کا دعویٰ دراصل ۱۸۳۱ء میں ہی خارج ہو گیا تھا ۔ اس لیے اگر زہر کھانے کا واقعہ درست (۱) ہے تو یہ ۱۸۳۱ء کے ایام میں ہو سکتا ہے ۔ جب وہ مکمل طور پر مایوس ہو گئے تھے اور یہ بھی سوچنا شروع کر دیا تھا کہ کسی والیٔ ریاست کی ملازمت کرلیں ۔ اس کا تعلق مندرجہ بالا شعر سے نہیں جو میرزا غالب نے ۱۸۲۱ء سے پہلے کہا تھا ۔

دوسری طرف خواجہ راقم کے بیان کو داستان طرازی قرار دینا بھی مشکل ہے ۔ اگر خواجہ راقم اس شعر اور زہر کے واقعے کا تعلق قائم نہیں کر سکے تو خود میرزا غالب کا بھی حال ہے ۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ واقعات ذہن میں ایک تاثر سا چھوڑ جاتے ہیں لیکن بعد میں ان کی کڑیاں باقی حالات سے ملانا محال ہو جاتا ہے ۔ میرزا غالب فرماتے ہیں کہ ان کے دادا قوقان بیگ شاہ عالم کے زمانے میں وارد ہند ہوئے تھے ۔ حالانکہ یہ غلط ہے اور اب اس بیان کی یہ تعبیر کی جاتی ہے کہ میرزا غالب نے شاہ عالم کی شاہزادگی کے زمانے کو ان کی بادشاہت کا زمانہ تصور کر لیا ہے ۔ خواجہ

۱- اگر یہ واقعہ غلط نہیں تو ہمارا خیال ہے کہ اس کی صدائے باز گشت مندرجہ ذیل شعر میں سنائی دیتی ہے :

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

یہ شعر نسخۂ رامپور میں موجود ہے جو ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء میں مرتب ہوا تھا ۔ اس واقعے کے بعد گھر والوں نے اہتمام کر لیا ہوگا کہ زہر میرزا غالب کو دستیاب نہ ہو سکے اور بعد میں جوں جوں وقت گزرتا گیا ہوگا میرزا مقدمۂ پنشن میں ناکامی کے اثرات کا بلند ہمتی سے مقابلہ کرتے رہے ہوں گے ۔ اس کا اظہار انھوں نے مثنوی ابر گہر بار کے مغنی نامہ میں کیا ہے ۔ یہ مثنوی بعد کی تصنیف ہے ۔

راقم کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی تعبیر کی جاسکتی ہے کہ زہر کا واقعہ درست تو ہے مگر اس کا تعلق اس شعر سے نہیں، علاوہ بریں پنشن کا جھگڑا ختم ہونے کے بعد خواجہ راقم کے والد کو میرزا غالب نے برادر زادہ کہنا شروع کردیا تھا ۔ آپس میں صلح ہو گئی تھی ، باہمی رشتہ جس قدر قریب رکھتا تھا ، وہ سطور بالا سے ظاہر ہے ۔ نیز خواجہ راقم کو میرزا غالب کی شاعرانہ عظمت پر ناز تھا ۔ میرزا کی شاگردی پر فخر تھا اور میرزا کی یادگار ہونے کا ادعا تھا ، کہتے ہیں :

یادگاروں میں اسد کی ہے یہ بندہ راقم
کیا ہوا بزم سخن میں نہیں شہرت میری

ظاہر ہے میرزا غالب کی عظمت کو خواجہ راقم اپنی بڑائی سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص زہر کا واقعہ کیوں کر گڑھ سکتا ہے ۔ خواجہ راقم نادان نہیں تھا کہ جس شاعر کے نام پر اپنے فخر کی بنیاد قائم کرتا ہے، اس طرح داستان طرازی کر کے اسی کو بدنام کرے۔ خواجہ صاحب کی سیرت کا جوہر در علم ہو سکا ہے، اس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دروغ گوئی اور الزام تراشی پر مائل نہیں ہو سکتے تھے ۔

اس بحث کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ جب میرزا غالب کی سیرت کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حیثیت سے ان کی زندگی کو بے داغ نہیں کہا جاسکتا ۔ وہ عطار، رومی اور جامی کی طرح کے شاعر نہیں جن کی سیرت چاند کی چاندنی سے بھی زیادہ پاکیزہ تھی اور نہ میرزا غالب کو اسی بات پر اصرار ہے کہ لوگ انہیں اس معیار پر جانچیں ۔ وہ تو برملا کہتے ہیں :

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام   آشکارا دم ز عصیاں می زنم

آدم زادہ ہونے کی حیثیت سے اپنے عیوب کو وہ عام انسانی کمزوری قرار دیتے ہیں ۔ اگر کسی ایسے لمحے جب خاندانی اور ذاتی وقار کو انھوں نے ختم ہوتے دیکھا اور حالات کے مقابلے میں انھوں نے اپنے آپ کو بے بس پایا اور اس کمزوری کے بھی مرتکب ہوگئے تو ہم اسے بھی ان کی آدم زادگی پر محمول کریں گے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بڑے بڑے مقتدر اور محترم لوگ ایسی کمزوری کے مرتکب ہوئے ہیں ، اس واقعے سے میرزا غالب کی شاعرانہ

عظمت میں فرق نہیں پڑتا ۔ ان کی بداعت تحویل آسی حسن وجمال کے ساتھ موجود رہے گی جس کے ساتھ وہ اب ہے اور ہم ان کو بدستور دنیائے ادب کے ایسے نابغوں میں شمار کرتے رہیں گے جن پر ساری نوع انسانی کو ناز ہے ۔

بہرحال ان صفحات میں میرزا غالب کی ایک غیر معروف و نامعلوم شرح 'بوستان خرد' کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کی اہمیت ظاہر ہے، اس سے جہاں نئی معلومات حاصل ہوں گی وہاں نئے مباحث کے دروازے بھی کھلیں گے جناب مالک رام لکھتے ہیں کہ اس شرح کا مسودہ غالباً ضایع ہو چکا ہے، لیکن وہ تو مجموعۂ رافعی میں محفوظ ہے۔ اگر بھارت میں رہنے والے محبان غالب اسے حاصل کر کے طبع کرا دیں تو کم از کم وہ ذہنی الجھن ضرور کوئی استوار راہ اختیار کر سکتی ہے ، جو رسالہ اردو اور مجلہ اسلامک کلچر کے محولہ بالا شماروں نے پیدا کردی ہے۔

غالب اور تفتہ

سید مرتضیٰ حسین فاضل

غالب کے سینکڑوں شاگرد ہیں مگر غالب کو جس قدر عارف پر ناز ہے کسی پر نہیں ، وہ عارف کو کبھی 'شمع دودماں' کہتے ہیں کبھی 'غم گسار مزاج داں' ۔ 'جان من' بھی کہا ہے اور 'گنج شایگان من' بھی :

جائے دارد کہ خویش را نازم کہ فلاں ز پیروان من ست
جاوداں باش اے کہ در گیتی سخنت عمر جاودان من ست
اے کہ میراث خوار من باشی اندر 'اردو' کہ آن زبان من ست
از معانی ز مبدء فیاض باد آن نو ہر چہ آن من ست

لیکن عارف جوان ہی مر گئے اور غالب نے وہ درد بھری غزل لکھی جسے مرثیہ کہنا بجا ہے :

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں ، اب رہو تنہا کوئی دن اور

عارف کے بعد شیفتہ اور میر مہدی مجروح سے محبت ہے ، خاص کر اردو خطوں میں جو پیار مجروح کے یہاں نظر آتا ہے اس کی مثال نہیں ۔ معلوم ہوتا ہے مجروح شاگرد ہی نہیں ان کے عزیز ترین اور بے تکلف دوست بھی ہیں جنہیں رتبہ فرزندی حاصل ہے ۔ مجروح کے نام بہ کثرت خطوط کی اشاعت نے غالب کے فن کی خوبیاں اجاگر کی ہیں اور غالب کی جذباتی تصویر کشی بھی کی ہے ۔ غالب کے نام لیوا بزرگوں میں مجروح آخری دور میں اپنی غزل کے ساتھ

ساتھ غالب کی شاگردی کے سبب بڑے احترام کی نظر سے دیکھے گئے ، جس کے وہ مستحق بھی تھے -

ہر گوپال تفتہ ، مرزا کے قدیم ترین شاگرد اور مرزا کے بہت بعد تک جینے والوں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ غالب نے انھیں لالہ دیوالی سنگھ ثم مرزا محمد حسن قتیل کے جواب میں مرزا ہر گوپال تفتہ بنایا تھا - اور لکھتے تھے ' کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ ' یا :

میرزا تفتہ ، کہ پیوستہ بہ دل جا دارد

ہر کجا ہست ، خدا یا ! بہ سلامت دارش

یہ تفتہ صرف فارسی کے شاعر تھے ، موصوف نے چار ضخیم دیوان لکھے ، قصیدے اور قطعے وغیرہ مستزاد - بڑے پرگو ، بڑے زود نویس ، بے حد خوش فہم اور اپنی فارسی نویسی پر نازاں تھے - ایک ایک نشست میں سو سو شعر کہہ ڈالتے اور ایک ایک زمین میں ہزار شعر لکھنا کھیل جانتے تھے۔ کبھی جلال اسیر کا جواب لکھنے پر آئے تو دیوان تیار کرلیا ، نظیری و عرفی ، کلیم و ظہوری ، غرض ہر شاعر کی طرح میں کہا اورخوب کہا۔ مرزا ان کی زود گوئی سے گھبراتے تھے ، مگر نازبرداری میں دریغ نہ کرتے تھے - جوانی کے شاگرد اور برابر کی عمر کے دوست تھے -

رندی اور نوابی میں بھی غالب کے مقلد تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کم و بیش چالیس برس تک مرزا غالب سے اصلاح لی اور زندگی بھر غالب کو کلام دکھایا کیے۔ مرزا کے شاگردوں میں تلمذ کے لحاظ سے تفتہ کا رشتہ سب سے زیادہ طویل نظر آتا ہے۔ ہمیں غالب و تفتہ کے مراسلات سب کے سب تو نہیں ملے مگر ایک سو بائیس کے قریب اردو اور ایک فارسی خط بھی کم نہیں - تعجب ہے کہ ان خطوں میں کوئی ایسا اشارہ نہیں جو ان دونوں کے راہ و رسم کی ابتدا بتائے ، کوئی ایسا نکتہ نہیں جو شاگردی کی تاریخ سجھائے - اردو ، فارسی اشعار میں تفتہ کا ذکر نہیں - ہاں خطوں میں محبت و بے تکلفی کے صدہا پہلو ملتے ہیں - اس کے برعکس تفتہ کے کلام میں غالب سے محبت و ارادت پر جو مواد ملتا ہے وہ کہیں اور نہیں ہے۔ ان کے اشعار متعدد اشارے کرتے ہیں اور کئی سوالوں کا جواب دیتے ہیں - اتفاق سے غالب پر کام کرنے والوں نے ابھی ان نکتوں کی چھان بین نہیں کی -

مالک رام نے تفتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا ہے کہ : "واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا"۔ رامی تخلص رکھا اور فارسی میں مشق کرکے ترقی کر گئے ۔ " جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو انھوں نے تخلص بدل کر تفتہ ، اور مرزا کا خطاب دے کر مرزا تفتہ بنا دیا "۔

مہر صاحب نے یہ سوال اٹھایا اور کسی حد تک تاریخ تلمذ بتانے کی کوشش بھی فرمائی ، موصوف نے تحریر فرمایا :

" غالب سے تلمذ کا سلسلہ کب شروع ہوا ؟ اس بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے ۔ فارسی خطوں میں تفتہ کے نام ایک خط ہے جو فروری ۱۸۴۸ء میں لکھا گیا ، یعنی اس سے پیشتر تفتہ شاگرد بن چکے تھے " ۔

(خطوط غالب)

مہر صاحب نے جس فارسی خط کی طرف اشارہ کیا ہے وہ غالب کے پنج آہنگ ، طبع دھلی و لکھنؤ میں موجود ہے مگر تمام اڈیشنوں میں دو باتیں صاف صاف درج ہیں :

الف ۔ " دیروز کہ آدینہ دوازدھم ربیع الاول و نہم فروری بود "۔

ب ۔ " شنبہ ۱۰۔ فروری سنہ ۱۸۴۹ء " ۔

تقویم کی رو سے بھی یہ مطابقت درست ہے (جنتری پنجاہ سالہ ، مرتبہ مولوی صفی الدین ، طبع حیدرآباد دکن ، سنہ ۱۳۱۵ھ) ۔ بظاہر اس خط سے زیادہ پرانے خط ' اردوے معلیٰ ' اور ' خطوط غالب ' مرتبہ مہیش پرشاد میں موجود ہیں ۔ جن میں سے ایک مئی سنہ ۱۸۴۸ء کا قطعی حیثیت رکھتا ہے ۔ مگر ان خطوں میں جب کوئی اشارہ یا قرینہ موجود نہیں تو تفتہ کے کلام کو ٹٹولنا چاہیے ۔ دیوان دوم اور سنبلستان اور ترجیع بند بر وفات غالب کے علاوہ مجھے اور کوئی مبسوط چیز ایسی نہیں ملی جسے میں اس وقت بحث میں پیش کرتا ۔ ان تین ماخذوں میں بظاہر ایسے حوالے ہیں جو تفتہ و غالب کے تعلقات کی ایک مدت معین کرتے ہیں اور اس کی مدد سے تاریخ بھی نکالی جا سکتی ۔ مثلاً ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۷ء کے مطبوعہ دیوان میں کہتے ہیں :

بسر پنجاہ و هشت اندر سخن شد

یعنی اٹھاون سال سے شعر و شاعری میں لگا ہوا ہوں - اب اگر ہم ۱۲۷۲ھ سے اٹھاون نکال لیں تو ۱۲۱۴ باقی بچتے ہیں - سری رام اور مالک رام صاحبان نے یہی سنہ ولادت لکھا ہے - ظاہر کہ تفتہ نے پیدا ہوتے ہی شعر نہیں لکھے - مگر جس گھر میں پیدا ہوئے وہاں کا ماحول ایسا تھا کہ گھٹی میں شاعری پلانا کہا جا سکتا ہے - اس م ع کے بعد مطبع اور دیوان کی تعریف کرتے ہوئے اپنے تعارف میں ا واہ ایران سے دل چسپی کا ذکر کیا ہے - ایرانی شاعروں کے دیوان پڑھنے کی ، ے ہے - سنائی سے محتشم تک مشاہیر شعرا سے استفادے کا اعتراف تہ ، کے فکر و فن کی مدح کی ہے اور پینتالیس سال کی مشق کا دعویٰ ؎ ہے - ضاحت سے بتایا کہ بیس سال سے مرزا کے شاگرد ہیں - اس طویل مقطعے ے خیدا ہے ند ضروری اشعار یہ ہیں :

بہر حال خوں تفتہ بسیار خورد ز دیوان ایرانیاں بہرہ برد
چہ ایرانیاں ، نام آں ہا شنو کہ بردند از جملہ عالم گرو
ظہوری، کہ از خود نظیر خود است سنائی ، خودش در ضمیر خود ست
سخن سنج عرفی ، کہ چوں او کسے نہ سنجد سخن ، گو خورد خوں بسے
دگر نکتہ ور طالب آملی بہ گیتی سمر طالب آملی
اسیر ، آں کہ بود است مرزا جلال جلال کلامش بروں از خیال
حزیں ، آں مشیخت ماب جہاں کہ عالی دماغیش نبود نہاں
بجز میلی و وحشی و محتشم وگر چند خوش گو کہ دانی تو ہم
چہ حاجت کہ آرم بلب نام شاں می عیش تا حشر در جام شاں
ازیں جملہ ، برتر یکے اہل دل خوش آزاد مردے بحق مشتغل
اسد نام ، غالب تخلص ہمی ز آگہ دلی ہا نہ غافل دمی
لقب میرزا نوشہ ، او را دگر وزیں نام در دہر مشہور تر
بود مرشد تفتہ ، از بست سال نہ رفت از دل و دیدہ در ہیچ حال
رقم ہرچہ زد ، اول او را نمود ازاں پس بہ اہل جہاں وا نمود
نمود ایں خضر گوئی از التفات بہ گم کردہ رہ ، راہ آب حیات
صفاتش فزوں از بیان ست و بس نہ من ، صد چو من بے زبان ست و بس

سخن مختصر ایں کہ چوں تفتہ یافت چنیں راہ و دنبال اینان شتافت
دگر کرد محنت چل و پنج سال بہ تحصیل ایں نے بہ تحصیل مال

اگر یہ اشعار ۱۸۰۰ء میں لکھے ہیں تو ۱۸۳۰ء کے قریب غالب سے شاگردی کا سلسلہ قائم ہوا ۔ اور پینتالیس برس کی شاعری کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۸۱۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں ۔ سنہ اٹھارہ سو دس میں تفتہ کی عمر تقریباً گیارہ بارہ سال تھی ۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۱۷۹۹ یا ۱۸۰۰ء میں ولادت ، ۱۸۱۰ - ۱۱ء میں شاعری کی ابتدا ، ۱۸۳۰ء کے قریب غالب کی شاگردی اختیار کی ۔

تفتہ نے وفات غالب پر جو ترجیع بند لکھا ہے اس میں ایک شعر سے تلمذ پر روشنی پڑتی ہے جو یہ ہے :

در من و او ، بہ یاری بحتیم تا چہل سال ماند صحبت ہا

یعنی تفتہ اور غالب کی ملاقات و صحبت کو ۱۸۶۹ء کی فروری میں چالیس سال ہوگئے تھے ۔ موٹے حساب سے اڑسٹھ سے چالیس کم کیے جائیں تو اٹھائیس باقی بچتے ہیں ۔ لیکن ۱۸۲۸ء میں مرزا غالب سے رشتہ تلمذ استوار ہونا قرین قیاس نہیں ، یہ سال غالب کی بے وطنی کا سال ہے ۔ وہ اگست ۱۸۲۶ء سے پہلے بےحد پریشان تھے ، پنشن کے لیے آخری تدبیر سوچ چکے تھے ، انتظام سفر کلکتہ کے لیے کمر بستہ ہو رہے تھے ، اگست کے قریب انہوں نے دہلی سے کوچ کیا اور قریب قریب تین برس کی طویل غیر حاضری کے بعد ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی آئے ۔ حالات بہت زیادہ بگڑ گئے تھے ، لہذا یہ سال پورا افراتفری ہی میں گزرا ہوگا ۔ ممکن ہے ۱۸۳۰ - ۳۲ء میں تفتہ سے رابطہ قائم ہوا ہو ۔ اگر یہ صورت مان لی جائے تو دونوں شعروں میں اندازہ و خیال پر بنیاد رکھنا ہوگی ، یعنی پہلا شعر ۵۰۰ - ۰ء کے درمیان لکھا گیا :

بود مرشد تفتہ از بست سال نہ رفت از دل و دیدہ در ہیچ حال

سنہ ۳۰ء سے ۳۵ء تک کی مدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔

دوسرا شعر ۱۸۶۹ء میں لکھا :

در من و او بہ یاری بختیم تا چہل سال ماند صحبت ہا

یعنی سنہ ۲۹ - ۱۸۲۸ء کا زمانہ تھا جب تفتہ نے اصلاح شروع کی -

میرے خیال میں محتاط اندازہ یہ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۲۵ء کے لگ بھگ کا زمانہ وہ ہے جب غالب و تفتہ میں سلسلۂ استادی و شاگردی قائم ہوا - باوجودے کہ غالب دہلی میں تھے اور تفتہ آگرہ و الور و سکندرہ راؤ میں ، لیکن محبت و خلوص میں فاصلہ نظر نہیں آتا - غالب کے اردو خط تفتہ سے محبت کا آئینہ ہیں اور تفتہ کے فارسی اشعار عشق غالب کی تصویر - دیوان کے آغاز میں غالب کی مدح کے چند شعر آپ نے ملاحظہ فرمائے - اس کے بعد تفتہ نے اشعار گلستاں کی تضمین لکھنا شروع کی (۱) ، یہ کتاب در حقیقت پیتمبر سنگھ کے لیے لکھنا چاہتے تھے مگر وہ لڑکا بارہ سال کی عمر میں داغ جدائی دے گیا - ہونہار بچہ ، گلستان بوستان پڑھتا تھا اور اپنے حیرت انگیز حافظہ و قابلیت سے تفتہ کا محبوب بیٹا تھا ، اس کی موت نے تفتہ کو بے حد متاثر کیا ، اس تاثر کی یادگار تضمین گلستاں ہے ، وہ کہتے ہیں :

سخن رانم ز پیتمبر در آں جا   در افشانم ز چشم تر در آں جا
بہ گریم در سخن افزایم آبی   نویسم بعد ازاں نادر کتابی

نیت یہ تھی کہ آواگون کے پھیر میں لڑکا دوبارہ زندہ ہو اور ان کی شاعری دیکھے :

شود تا زندہ پیتمبر دگر بار   دھد ، داد مسیحائیم ہر بار

یہ ضخیم کتاب دو مہینے میں تیار ہو گئی :

غرض در ھفت یا در ھشت ھفتہ   رقم ایں نسخہ زد ، بے مایہ تفتہ

کتاب مکمل ہوئی تو اسے غالب اور ان کے متبنیٰ باقر علی خاں کے نام معنون کر دیا :

۱- ' ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ' مجلس ترقی ادب لاہور ، صفحہ ۲۲۱ پر تضمین گلستاں کو " انشائیہ " کتاب لکھا گیا ہے -

تضمین گلستاں کا ایک اشتہار پولیس گزٹ مجریہ پنج شنبہ ۱۹- اگست ۱۸۵۹ء ، نمبر ۵ جلد ۲ میں چھپا تھا ، اور ایک روپیہ آٹھ آنے قیمت بتائی گئی تھی -

نوشتم هر چه بپسندید هر یک … دگر از چشم حق بیں دید، هر یک
خصوصاً میرزائے، نکته زاے … چمن طبعے، گل رنگیں ادائے
نیستان سخن را طرفه شیرے … اسد، یعنی به هر میداں دلیرے
قصائد، زو چناں کش دید باید … گل از باغ غزل ها چید باید
رباعی، آں که شورش چار سو هست … وگر باور نه داری، روبرو هست
مپرس، از قطعه‌اش، گردد زباں قطع … اگر گویم، بهشت آمد، به آں قطع
ز نثر او، ظهوری را جگر خوں … ابوالفضل است اندر خاک مدفوں
دگر انداز اخلاقش، که گوید … هماں داند که در راهش به پوید
هرانچه از وے بود، قربان یاراں … به جان وی، دعائے می گساراں
وگر از سیم و زر کاصلا نه دارد … وگر دارد، چو ابر از کیسه بارد
نه باشد صرفه اش هرگز در اسراف … اگرچه حرفها باشد بر اسراف
سخن این ست و بس من هیچ نبوم … بر آں نکته رس من هیچ نبوم
بود تا میرزا غالب ز من شاد … خراب من سراسر باشد آباد
فدائے میرزا غالب، دل و جاں … گدائے میرزا غالب، دل و جاں
چه غالب، هم نوائے قیصر و جم … چه غالب، میرزائے قیصر و جم
به اهل فارس غالب، غالب ما … به از عرفی و طالب، غالب ما
دری از درج توراں، چشم بددور … مگو از سایه، کاینجا سر بسر نور
دگر از هند گفتن، روسیاهی ست … گواه تفته، از مه تا به ماهی ست
چه گویم، تا چه رحمت کرد بر من … وگرنه کو جناب او، کجا من
رسد نازش چها، بر فرق دانم … رسانید از زمیں بر آسمانم
بود هر ذره او آفتابی … درش را خوانده ام، روشن کتابی
اگر صد دفتر از مدحش نگارم … یکے باشد یکے، از صد هزارم
الهی برسر من سایه اش باد … ز هر پایه، فزوں تر پایه اش باد
بماند تا ابد باقر علی خاں … که از پوران او، پورست خوش آں

کنند عمر خضر ، حق روزی او بود با خیر ، خیر اندوزی او
چسان در شکر گوہانش در آیم کجا از عہدہ شکرش بر آیم

(تضمین گلستان ، طبع نول کشور پریس ، کانپور ۱۸۷۳ء ، ص ۹ - ۸

قلم برداشتہ لکھنے کا یہ ملکہ تفتہ کو پختہ نہ کر سکا ، غالب کو بسیار گوئی نا پسند بھی رہی۔ اسی وجہ سے مرزا نے ان کے پہلے دیوان بعد کسی کتاب پر تقریظ بھی نہیں لکھی - بلکہ سنبلستان چھپی تو یہ کہا

" سنبلستان کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے اور خدا تمھاری آ؛ کا نگہبان رہے "۔ (اردوے معلیٰ ، طبع مجلس ، ص ۱۸۴)

اس کے باوجود تفتہ کی ناراضگی کا خیال رہا ، کسی عالم میں بھی ہو۔ اصلاح ضرور دی - ایک مرتبہ تفتہ نے کوئی ایسا خط لکھا ، جس سے یہ ظا ہوتا تھا کہ آپ ذوق شعر کی وجہ سے اصلاح دیتے ہیں ، تو جھلا کر پیاری بات کہی :

" لاحول ولا قوۃ ، کس ملعون نے بہ سبب ذوق شعر ، اشعار اصلاح منظور رکھی ؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار " -

اس تمہید کے بعد وہ قیامت کا جملہ اور غضب کی بات یہ ہے :

" میں نے تو بہ طریق قہر درویش بہ جان درویش لکھا تھا - جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے ، میرا تمھارے سا وہ معاملہ ہے " -

اور یہ معاملہ اس طرح نباہ ہو گیا کہ اس کی مثالیں کم ملیں گ تفتہ کو مرزا کے مرنے پر جو غم ہوا ہے ، اس کی داستان وہ ترجیع بند ہے " ماتم اسداللہ خان مرحوم " میں قلم بند کیا تھا ، تین سو چھیاسی شعرو میں تفتہ نے دل کھول کے فریاد کی ہے اور سچے دل سے کہا ہے :

یک دل است و ہزار غم چہ کنم نہ کند رحم مرگ ہم ، چہ کنم

تفتہ نے کم و بیش پچاس ہزار شعر تو کہے ہوں گے - مدتوں غز لکھی ، پھر مثنوی اور قصیدہ ، رباعی اور قطعہ جیسے اصناف سخن کی طر مڑے تو دفتر بھر دیے ، بڑی بڑی غزلوں میں سے کچھ شعر ضیافت طبع کے لہ حاضر ہیں :

جلال اسیر کی غزل ہے :

کے دل ، کلید راز بہ دست زباں سپرد
بحر گہر ، بہ موج کجا می تواں سپرد

تفتہ نے تین غزلیں جواب میں لکھی ہیں، ان کے چونتیس شعروں میں سے دو شعر یہ ہیں :

هجران او دگر بہ کہ زیں ساں فغاں سپرد
گوئی بمن کلید در آسماں سپرد

آورد تفتہ را بہ در بو ظفر سپہر
گوئی ظہیر را بہ قزل ارسلاں سپرد

عرفی کے جواب میں دو غزلیں ہیں :

مائیم و ناامیدی و تنہا گریستن رنگیں بود حکایت ما ہا گریستن

بستن بروے خود در و تنہا گریستن بے خون دل حلال مبادا گریستن

بہ کوثر غوطہ ها زد ، هر کہ اندر خوں تپید ایں جا
محبت کر بلائے هست ، باید شد شہید ایں جا

ذرا ان شعروں کی زبان اور انداز دیکھیے :

چہ باشد آدمی و چوں تواند آرمید ایں جا
تو گوئی عمر آخر شد ، نفس را تا کشید ایں جا

رہ عقبیٰ اگر جوئی ، پئے دنیا مرو چندیں
تواں کر آرمید ایں جا ، تواں از خود رسید ایں جا

ایک غزل میں فرماتے ہیں :

ایں قدر باهم تغافل خوب نیست تا کجا آری بہ جاں ، آیینہ را
خود نہ گویم ایں کہ دارم دل چناں سینہ صافی ها عیاں آیینہ را

از خدا دیگر چہ ای صیاد ، می خواهیم ما
خانۂ صیاد خویش آباد می خواهیم ما

آخر میں یہ شعر بھی دیکھیے :

رهاند از چنیں بے دانشی هایت خدا ، اے دل
بدامش افتی و دیگر طمع داری رهائی را

حسرت هلاک بے کسی آں ، کہ بر درت
با جان خستہ آمد و با چشم تر گزشت

اے تماشا گاہ ایں دل روے تو
عالمے در دل تماشا کردہ ایم

تفتہ نے چوراسی برس کی عمر پائی اور استاد کے دس برس بعد ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء (۱۰ رمضان ۱۲۹۶ھ) میں رحلت کی ۔

مطالعہ غالب اور اثر لکھنوی

نثار احمد فاروقی

نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم اس دور میں دبستان لکھنؤ کی آبرو تھے۔ پرگو اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ محاورات و مصطلحات پر ان کی عالمانہ نظر تھی۔ انھوں نے نظم و نثر میں مختلف اصناف اور موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ تنقید ادب و شعر کے موضوع پر ان کی مطبوعہ کتابوں میں 'اثر کے تنقیدی مضامین'، 'چھان بین' 'مطالعہ غالب' اور 'انیس کی مرثیہ نگاری' خاص وقعت و اہمیت رکھتی ہیں۔ فی الوقت ہمارا موضوع سخن حضرت اثر کی ناقدانہ حیثیت سے بحث کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب 'مطالعہ غالب' سے متعلق ان کی کچھ وضاحتیں پیش کرنا ہے، اس لیے غیر ضروری تمہید کو ترک کیا جاتا ہے۔

'مطالعہ غالب' ایک مختصر سی کتاب ہے جو پہلی بار ۱۹۵۲ء میں دانش محل لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں حضرت اثر لکھنوی نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں غالب کے چیدہ چیدہ اشعار کی وضاحتیں پیش کی ہیں اور شارحین متقدمین سے اختلاف کرتے ہوئے وہ معانی بیان کیے ہیں جو حضرت اثر کے خیال میں زیادہ قابل قبول ہیں۔ اس مختصر کتابچے کی اہمیت سہ گونہ ہے۔ پہلی تو یہ کہ حضرت اثر جس نسل سے تعلق رکھتے تھے، اس میں غالب اتنا مقبول نہ تھا جتنا آج ہے، اور نظم طبا طبائی کی شرح چھپنے سے پہلے تو لکھنؤ والے بالعموم غالب کو 'مہمل گو' سمجھتے تھے۔ ان کے مذاق سخن کی تربیت ناسخ، آتش، جلال، امیر، وزیر، رند، سحر، رشک، اسیر، مضطر وغیرہ کے رنگ کلام سے ہوئی تھی۔ دبستان دہلی کے شعرا میں میر، سودا اور درد تو خیر ابوالآباء تھے، عہد متوسطین میں شاہ نصیر اور ذوق

کی قافیہ پیمائیاں اہل لکھنؤ کو زیادہ متاثر کرتی تھیں ۔ اس لیے جب کبھی ایسا تفصیلی مطالعہ کیا جائے گا جس سے یہ ظاہر ہوسکے کہ غالب کی شاعری کا رد عمل اور اس کی پذیرائی یا تفہیم کن مدارج سے گزری ہے اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا کس طرح ہوا ہے تو دبستان لکھنؤ کا رد عمل اور غالب فہمی کی طرف رجعت کے سلسلے میں نظم طباطبائی کی شرح کے بعد دوسری مفید کتاب ' مطالعہ غالب ' ہی ہوگی ۔ حضرت اثر نے خود مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ :

> '' مجھ میں تنقید کا ذوق میرے چچا صاحب مرحوم نواب دلاور حسین خان نے پیدا کیا ۔ وہ میری دادی کے بھائی کے فرزند تھے ۔ اس زمانے میں جس کو اب ساٹھ برس ہوئے ہوں گے ، غالب کی کوئی شرح شائع نہیں ہوئی تھی اور مہمل کو سمجھا جاتا تھا ۔ چچا صاحب مرحوم اس کے اشعار کے وہ وہ معنی بیان کرتے تھے کہ باید و شاید ''۔ (مکتوب ۲۸ جون ۱۹۵۳ء)

دوسری اہمیت یہ ہے کہ حضرت اثر کی میر پرستی ضرب المثل کی طرح مشہور ہوگئی اور بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ وہ میر و غالب کا موازنہ کرتے ہوئے میر کی طرف داری کرتے ہیں ۔ اثر صاحب کی تحریروں میں ایسے متعدد مواقع آئے ہیں جہاں سخن گسترانہ پیرائے میں سہی ، انھوں نے میر و غالب کے ہم معنی اشعار کا موازنہ کیا ہے لیکن میر کا تفوق ثابت کرنے کے لیے کبھی ہٹ دھرمی یا غیر مناسب جنبہ داری کا مظاہرہ نہیں کیا ۔ اس کتاب میں جیسی دقت نظر اور ژرف بینی سے انھوں نے کلام غالب کے محاسن اجاگر کیے ہیں ، اس سے ایک طرف تو ان کی سخن فہمی اور نگاہ کی تہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے ، دوسری طرف غالب کی شاعری پر ان کی جچی تلی رائے بھی معلوم ہو جاتی ہے ۔ اور تیسری اہمیت یہ ہے کہ بعض اشعار میں انھوں نے واقعی ایسے پہلو تلاش کیے ہیں جن پر کسی شارح کی نگاہ نہیں پہنچی تھی ۔

میں نے حضرت اثر کی کتاب ' مطالعہٗ غالب ' پڑھ کر ہی پہلا خط ان کی خدمت میں بھیجا تھا جس کا انھوں نے بڑی شفقت اور محبت اور عالی ظرفی سے جواب لکھا ۔ اس کے بعد یہ سلسلہٗ مراسلت ان کے زمانہٗ رحلت تک جاری رہا ۔ ان کے خطوط جو میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں ، ہر لحاظ سے قابل قدر

ہیں ، توفیق ایزدی شامل رہی تو انھیں مقدمہ و حواشی کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ یہاں صرف ان خطوط کے اقتباسات پیش کرتا ہوں جو ' مطالعہ غالب ' کے سلسلے میں لکھے گئے تا کہ ان وضاحتوں کی روشنی میں ' مطالعہ غالب ' کے بعض مطالب اور بھی روشن ہو جائیں -

[۱]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۸ - ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرم بندہ ، سلام شوق

خط ملا - آپ کے استفسارات سے ناراض ہوتا کیسا ' خوشی ہوئی - ایسے مباحث میں اگر ذاتی پرخاش یا عناد کو راہ نہ ہو تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ آپ کا خط خلوص کا آینہ دار ہے - آمدم بر سر مطلب :

۱- کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

حالی کے بیان کردہ مطالب پر دوبارہ غور کیجیے :

(الف) جس دشت میں ہم ہیں ، اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے ، یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے (اور اتنا اضافہ کرنے کی اجازت دیجیے کہ میرے) علی الرغم انھوں نے دشت کی ویرانی کو گھر کی ویرانی پر ترجیح دی ، دشت سے خائف ہونا اس کا غماز ہے -

(ب) ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی ، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے - (کم سے کم گھر اور دشت مساوی درجے میں ویران ہیں ، گھر کی ویرانی کی دشت کی ویرانی پر افضلیت ثابت نہیں ہوئی اور اس کے بغیر شعر بلند نہیں ہوتا) -

ان مطالب پر میرا پہلا اعتراض یہ ہے کہ گھر کو چھوڑ کر دشت گردی اختیار کرنے کی توجیہ مفقود ہے - میں نے اس کی وجہ بیان کی : ،، وحشت میں ایسے مقام کی تلاش ہوئی جو گھر سے زیادہ ویران ہو ، لہذا دشت کا رخ کیا ، وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں، اس سے زیادہ تو خود میرا گھر ویران ہے،، (اور گھر کی طرف مراجعت کی) - بعد ازاں میں نے یہ استدلال کیا ہے : ' ویرانی سی ویرانی ' کے پیشتر لفظ

' کوئی ' نہ ہوتا تو شدید ویرانی کا مفہوم ادا ہوتا ۔ لفظ کوئی کے اضافے نے ویرانی دشت کی تنکیر یا تنقیص کردی ۔ حاصل کلام ، مطلب وہی نکلا جو آپ نے بیان کیا ہے ، یعنی غالب نے اپنے گھر کی ویرانی کا نقشا کھینچا ہے اور دشت کے بالمقابل (جو ویرانی کے لیے ضرب المثل ہے) اپنے گھر کو زیادہ ویران ثابت کیا ہے ۔

۲۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

آپ کا فرمانا بالکل درست ہے کہ جگر تشنہ (یا تشنہ جگر) اور تشنہ ہم معنی ہیں ۔ مگر میں عرض کروں گا کہ ہر جگہ نہیں، مثلاً ' تشنۂ خوں ' کے بجائے ' تشنہ جگر خوں ' یا ' جگر تشنۂ خون ' لانا غلط ہوگا ۔ تشنہ یا تشنہ جگر (جگر تشنہ ترکیب مقلوب) کے مجازی معنی کثرت سے آرزو مند ہوتا ہیں ۔ غالب نے صرف جگر تشنہ کو نہیں بلکہ جگر تشنۂ فریاد کو دل کی صفت قرار دیا ہے ۔ جس کے معنی میری ناچیز رائے میں اس کے سوا نہیں ہو سکتے کہ '' دل بذریعہ فریاد جگر کے خون ہونے کے در پے ہوا ''۔

۳۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس شعر پر آپ کا اعتراض آپ کی دقت نظر پر دلالت کرتا ہے ، میں نے اس شعر کو کبھی وقعت نہیں دی مگر مجھے اعتراف ہے کہ جو اعتراض آپ نے وارد کیا ہے ، کبھی نہیں سوجھا (۱) ۔ شعر میں کوئی نکتہ نہ پہلے پنہاں معلوم ہوا نہ اب معلوم ہوتا ہے ، شاید ہے بھی نہیں ، صرف متناسب الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں ۔

مجھے سعادت علی امروہوی کے متعلق اتنی تحقیق بھی نہیں جتنی آپ کو ہے (۲) ۔ والسلام اثر

۱۔ میں نے شاید یہ لکھا تھا کہ لفظ ' لڑکپن ' کا استعمال درست نہیں ، یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جس میں اتنی مآل اندیشی اور عاقبت بینی نہیں ہوتی جو شاعر کا مقصود ہے ۔

۲۔ سید سعادت علی سعادت امروہوی جن کا حوالہ ' ذکر میر ' میں ملتا ہے اور میر نے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے مجھے ریختہ موزوں کرنے کی ترغیب دی ۔ میں نے سعادت کے حالات اور کلام مختلف تذکروں سے فراہم کر کے ایک مضمون لکھا تھا جو دلی کالج میگزین کے میر نمبر میں شامل ہے ۔

[۲]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۱۹ - ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی ، تسلیم - عنایت نامہ مل گیا ۔ بہت بہت شکریہ ۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

میں نے آپ کے بیان کردہ مطلب پر غور کیا - میں بادب عرض کروں گا کہ میری شرح کا یہ جملہ اب بھی تشنۂ جواب ہے : '' فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ہو سکتی ہے'' ؟ آپ کا فرمانا ہے کہ '' دل فریاد کی شدید پیاس محسوس کر رہا ہے اور مجھے اپنا دیدۂ تر یاد آرہا ہے ، وہ اس کی پیاس بجھائے '' - فریاد کی شدید پیاس ہوئی فریاد کی شدید خواہش ، اس کی تسکین رونے سے کیوں کر ہو سکتی ہے ؟ فریاد کی خواہش فریاد کرنے سے پوری ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی امر مانع نہیں - مزید برآں کسی کی یاد آنا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس وقت موجود نہیں - دیدۂ تر کا یاد آنا یہ ہوا کہ آنکھیں ہیں مگر آنسو نایاب ہیں - لفظ پھر سے اس طرف اشارہ ہے کہ آنکھیں پہلے ہی اتنا رو چکی ہیں کہ آنسو خشک ہو گئے ، اب آنسوؤں کا قحط ہے -

میری شرح میں آپ کے اس اعتراض کا جواب موجود ہے کہ '' دل جگر کے خون ہونے پر آمادہ ہوگا تو دیدۂ تر کیا کریں گے'' ؟ آنکھیں بجائے اشکوں کے جگر کا خون روئیں گی - شرح کے الفاظ یہ ہیں :

'' دل جو بیتاب گریہ تھا ، مصر ہوا کہ آنکھ میں آنسو نہیں تو فریاد کر کے جگر کا خون کرو اور اس خون کے آنسو رؤو - میری تشنگیٔ شوق کی تسکین بہر صورت ہونا چاہیے '' -

کیا غلط ہوگا اگر عرض کروں کہ میری شرح کا آخری جملہ کہ '' فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ہو سکتی ہے'' ہنوز تشنۂ جواب ہے ؟ اور آپ کی مزید توجہ کا محتاج - یقین مانیے کہ یہ میری ہٹ دھرمی نہیں ہے بلکہ آپ کے فرمودات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد عرض کر رہا ہوں -

مجھے مسرت ہے کہ آپ میری پیش کردہ شرح اشعار غالب کا غائر مطالعہ فرما رہے ہیں اور اپنی مجموعی رائے سے مطلع کریں گے - آپ ان شاء اللہ

دیکھیں گے کہ اپنے تسامحات سے آگاہ ہونے پر ان کا فراخ دل سے اعتراف کروں گا ...　　نیاز مند　　اثر

[۳]

کشمیری محلہ، لکھنؤ

۲۳ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی، تسلیم ۔ گرامی نامہ وصول ہوا :

۱- ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

آپ کے دونوں بیان کردہ مطالب میں لبوں کو خوشامد طلب فرض کیا گیا ہے ۔ یہ امر مستبعد ہے ۔ لب خوشامدی ہو سکتے ہیں، خوشامد طلب نہیں ہو سکتے جس کا مطلب ہے خواہاں یا متوقع ہونا ۔ لبوں کو گفتار سے تو ربط ہے مگر سخن سے طالب خوشامد کیوں کر رہیں گے ؟ سخن کا لبوں سے آزردہ ہونا، باہمی رشتہ منقطع ہو جاتا ہے جس کا مآل خاموشی ہے ۔ چونکہ بت خاموش رہتے ہیں لہٰذا ان کی بزم اور ان کے تتبع میں سخن بھی لبوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے، روٹھ جاتا ہے ۔

حسرت و میر کے اشعار کا مفہوم غالب سے بالکل مختلف ہے ۔ (۱)

میر کہتے ہیں نہ معشوق کا سامنا بھی ہوتا تو کیا ہوتا، منہ سے بات بھی نہ نکلتی ۔ اس کا سبب رعب حسن ہو یا محویت دیدار یا افراط شوق یا شدت اضطراب یا ان سب کا مجموعی اثر ۔

حسرت کہتے ہیں کہ بربنائے احتیاط اظہار مدعا نہ ہوا، (مبادا معشوق ناراض ہو یا عشق کی تذلیل کرے، مضحکہ اڑائے اور کہے یہ 'منہ اور خشکہ' !) ۔

۱- میں نے یہ لکھا تھا کہ شعر میں 'خوشامد طلب' صفت لبوں کی معلوم ہوتی ہے، یعنی جب بزم بتاں میں پہنچے تو لب و سخن ایک دوسرے سے بچھڑے ہو گئے اور سخن بار بار لب تک آنا چاہتا ہے، مگر لب اسے قبول نہیں کرتے (گویا بولا نہیں جاتا) ۔ حضرت اثر کا فرمانا تھا کہ 'بتاں' کی صفت ہے ۔ میں اس معاملے میں ابھی تک متامل ہوں ۔

گستاخی ضرور ہے مگر مفہوم سے ملتے جلتے اپنے چند شعر پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں :

کبھی اظہار مدعا نہ ہوا عشق غیرت سے لب کشا نہ ہوا

جب کہا اس نے مدعا کہیے سوچتے رہ گئے کہ کیا کہیے

نظریں اٹھیں اور اٹھ کے جھکیں تمکنت کے ساتھ
گویا یہی جواب تھا میرے سوال کا

وہ غور بات بات پہ وہ شک بھری نظر
یا رب نہ مجھ سے صاف ہو دل بدگمان کا

اس کا کہنا کہ جو کہنا ہے کہو جلد ، یہاں
بات کا طول کسی طرح گھٹائے نہ بنے

۲- میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

ورنہ کا لفظ بھرتی کا نہیں ہے بلکہ مخاطب کے خیال کی تردید کرتا ہے : " اے غافل (رموز معرفت سے بیگانہ) تو سمجھتا ہے کہ میں معدوم ہوں - نہیں ، میں اس سے بھی بالاتر منزل میں ہوں ، جہاں وجود و عدم کا فرق اور تضاد مٹ گیا ہے - غالب کا شعر فلسفیانہ ہے ، اس کو مجازی عشق کے معاملات سے منسوب کرنا شاید درست نہ ہو - اس میں غافل سے مراد معشوق نہیں ہے ، لہذا معشوق کا آہوں کی بے اثری پر طعنے دینے کی بھی گنجایش نہیں بلکہ ایسا شخص مخاطب ہے جو وجود و عدم کے صحیح مفہوم سے نا آشنا ہے -

جرات گفتار پر معافی کا خواستگار ہوں -

آپ (۱) کو یہ وہم کیوں کر ہوگیا کہ آپ بد خط ہیں ، آپ کے خط

۱- حضرت اثر کا خط بہت پاکیزہ اور صاف تھا ، معہذا اس میں یکسانی اور یکرنگی تھی ، اس اعتبار سے میرا خط یقیناً اچھا نہ تھا۔ ان جملوں کو غیر متعلق سمجھ کر حذف کرنا چاھتا تھا لیکن طرز بیان کی جامعیت اور استدلال میں جو لطف ہے اس میں دوسروں کو شریک نہ کرنا خود غرضی معلوم ہوئی -

میں تو پختگی کے باوصف صفائی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صاحب علم و فضل ہوتے ہوئے بھی ملائیت سے کوسوں دور ہیں۔ ملائیت بیشتر نفاست سے دور ہوتی ہے، یہی حال کم علمی کا بھی ہوتا ہے۔

نیاز مند

اثر

[۳]

کشمیری محلہ، لکھنؤ

۲۵ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی، تسلیم۔ عنایت نامے کا بہت بہت شکریہ۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

میں اب تک یہ سمجھتا تھا کہ مفہوم داد خواہی کے لیے شور و غل مچانے، دہائی دینے تک محدود ہے، اسی سے میری مطبوعہ شرح کا آخری جملہ یہ تھا کہ " فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ہوسکتی ہے "۔ اگر فریاد میں گریہ و زاری بھی شامل ہے تو آپ کے بیان کردہ مطلب کی صحت میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ مگر اطمینان کر لیجیے۔ میں اس باب میں آپ سے متفق نہیں اور — مزید بحث کا بھی دم نہیں (۱)۔

شاید میں اپنے پچھلے عریضے میں سہواً یہ لکھ گیا کہ " دل خون جگر کو آنسو بنا کر بہانے پر مصر ہوا تا کہ اس کی تشنگیٔ فریاد فرو ہو سکے "۔ (یہ عبارت آپ کے خط سے نقل کی ہے، میرے پاس مسودہ محفوظ نہیں)۔ میرا منشا ابتدا سے یہ رہا ہے کہ دل فریاد کا نہیں بلکہ رونے کا مقتضی ہوا۔ مگر میں پہلے ہی اتنا رو چکا تھا کہ آنکھوں میں قحط اشک تھا، یہ حالت دیکھ کر دل مصر ہوا کہ (نایابیٔ اشک پر) فریاد کرکے جگر کا خون کرو اور اسی خون کے آنسو رؤو۔ میری تشنگیٔ شوق (گریہ) کی تسکین بہر صورت ہونا چاہیے۔ اگر ' جگر تشنۂ فریاد ' سے یہ مراد ہے کہ دل فریاد کی شدید پیاس محسوس کرنے لگا تو بھی آپ کا بیان کردہ مطلب درست ہے۔ خصوصاً

۱۔ اس جملے سے مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید حضرت اثر میرے کسی جملے سے ناراض ہوگئے۔ آیندہ خط نمبر ۶ میں اسی شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے۔

جب دیدۂ تر کا یاد آنا بر بنائے نایابی ٔ اشک نہیں ہے بلکہ برائے تجدید گریہ ہے اور اس میں خشکی ٔ اشک کا مفہوم مضمر نہیں ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں ' جگر تشنۂ فریاد ' کو ایک لفظ تصور نہیں کرتا ، غالباً مجھ سے پھر ہنگام تحریر عریضۂ سابق لغزش ہوئی ورنہ مطبوعہ شرح میں یہ جملہ موجود ہے : '' جگر تشنۂ فریاد ترکیب مرکب ہے ''۔ فرق ہمارے مابین اس ترکیب کے مفہوم پر ہے ۔ آپ اس سے دل کی شدید پیاس مراد لیتے ہیں اور میں دل کا بذریعۂ فریاد خون کرنے کا مطلب نکالتا ہوں ۔ خلاصہ یہ کہ اگر فریاد میں گریہ شامل ہے اور دیدۂ تر کے یاد آنے میں خشکی ٔ اشک کی طرف لفظ ' پھر ' سے اشارہ نہیں ہے تو آپ کی شرح صرف صحیح نہیں بلکہ صاف اور میری شرح کی طرح پیچ در پیچ نہیں ہے ۔

یہ گتھی یوں بھی سلجھ سکتی ہے کہ کچھ آپ سمجھیں ، کچھ میں سمجھوں ۔ آپ یہ مان لیں کہ دیدۂ تر کا یاد آنا یہ ہے کہ آنکھ میں آنسو نہیں مگر رونے کی شدید خواہش ہے ۔ میں یہ مان لوں کہ اس نایابی ٔ اشک پر دل شدت عطش سے فریاد کرنے لگا یعنی ' جگر تشنۂ فریاد ' کے وہی معنی ہیں جو آپ نے لیے ، فریاد کی خواہش یا پیاس ۔ کہیے یہ شرائط صلح آپ کو منظور ہیں ؟

... مومن کا جو شعر آپ نے نقل کیا ہے ، میں نے کبھی اس کی شرح کی تھی : '' مومن آج کل کے مولویانہ مذاق سخن رکھنے والوں میں اس شعر کی بنا پر بہت بدنام ہے ۔

لے شب وصل غیر بھی کاٹی　　تو مجھے آزمائے گا کب تک

یہ لوگ نہیں سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ شعر کا حاصل کیا ہے ۔ کوئی بے غیرت سی بے غیرت بازاری عورت بھی اپنے چاہنے والے سے نہ کہے گی کہ آج شب وصل غیر ہے چلتے بنیے ۔ یہ صرف معشوق کی شوخی ہے کہ مومن کے آزمانے کو ایک جھوٹی اور فرضی بات کہتا ہے ۔ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اگر اس کو در اصل مجھ سے محبت ہے تو سخت سے سخت آزمایش میں بھی پورا اترے گا اور اس سے زیادہ سخت آزمایش کیا ہوگی کہ وصل غیر کی طرف اشارہ کروں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے اور مومن دوسرے دن کہتا ہے کہ : لے شب وصل غیر بھی کاٹی !

دوسرے مصرع میں لفظ ' آزمانے ' سے جتا دیتا ہے کہ وصل غیر محض افسانہ تھا، میرے آزمانے کو ایک حیلہ تراشا گیا تھا : ہوا ہے نہ تو اور نہ ہوگا کسی کا ۔ مگر ذرا باتوں باتوں میں کبھی غیر سے بھی کہہ دے کہ آج مومن کی شب وصل ہے ، پھر دیکھ اس کا کیا حال ہوتا ہے ، اگر امتحان میں ثابت قدم نکلے تو خط غلامی لکھتا ہوں ۔ '' (۱)

بہت سمع خراشی کی ، امیدوار عفو ہوں۔ اثر

[۵]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ ۔

۲۹ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی ، تسلیم

۲۶ ماہ حال کا گرامی نامہ ملا ۔ جس خط کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا جواب ارسال کر چکا ہوں ، امید کہ مل گیا ہوگا ۔

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

بتاں بصیغۂ جمع اکثر شاعروں نے استعمال کیا ہے ۔ اس سے عموماً یہ مراد ہوتی ہے کہ جس خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے ، وہ سب معشوقوں (بتوں) میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے ۔ مثلاً میر کے یہ اشعار :

لطف اگر یہ ہے بتاں صندل پیشانی کا
حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا

غالب کے شعر میں 'بزم بتاں' سے یہ مطلب نکلا کہ ہر بت (معشوق) کی بزم میں یہ عام دستور ہے کہ سخن لبوں سے آزردہ رہتا ہے (لب آشنائے گفتار نہیں ہوتے) سخن کا لبوں سے آزردہ ہونا یہ ہے کہ سخن میں اور لبوں میں رابطہ نہیں رہتا ۔ علاوہ بریں بعض مواقع پر کثرت کا اطلاق مجموعے کے ہر فرد پر ہوتا ہے ۔ جمع سے واحد مراد لی جاتی ہے ۔ کسی خط میں عرض

۱- میرا خیال ہے کہ مومن کے اس شعر کی ایسی شرح اور کسی نے بیان نہیں کی ، اور یہ یقیناً قابل قبول ہے ۔

کر چکا ہوں کہ خوشامد طلبوں سے بجائے معشوق کے لبوں سے مراد لینا میری طبیعت قبول نہیں کرتی ، لہذا Let us agree to differ -

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

آپ فرماتے ہیں کہ رموز معرفت کے آشنا (سالک و مجذوب) کو آہ آتشیں سے کیا علاقہ ۔ تصوف کا دار مدار عشق پر ہے ۔ (عشق حقیقی ، بندے کا عشق خدا سے) ۔ جب تک رنج مہجوری ہے ، آہ و زاری ہے ۔ غالب اس شخص کو جو حقیقت سے نا آشنا ہے اور ان کے ترک آہ و نالہ کو مایوسی اور بے تاثیری پر محول کرتا ہے ، مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اب میں اس منزل فنا میں ہوں جو عدم سے بھی ماورا ہے ۔ فنا کی ہوس بھی فنا ہوگئی ۔ جب منزل عدم میں تھا تو احساس دوری تھا اور آہ آہ کرتا تھا اور آہ میں اتنی تاثیر تھی کہ عنقا کے بال و پر جل جاتے تھے ۔ عدم کی منزل سے بالاتر ہو جانے کے بعد جب تفریق فنا و بقا مٹ گئی تو اب آہ کی کیا ضرورت رہی ۔ میں نہ تو سالک ہوں نہ مجذوب ، البتہ مسائل تصوف سے آگاہی کا شغف ہی نہیں رہا ہے بلکہ (باوجود شیعہ ہونے کے) اکثر حضرات صوفیائے کرام کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا ہے اور ان سے متمتع ہونے کے علاوہ کتب تصوف کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اس کے 'مقامات' کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ۔ فنا و بقا کے متعلق صرف علامہ ہجویری (۱) علیہ الرحمہ کا قول نقل کرنا کافی ہوگا : " میری کل ہوا و ہوس کے گم ہوجانے سے میری فنا کی ہوس بھی فنا ہوگئی (یہ نیت اور حرص بھی کہ مرکر بہشت پاؤں ، میرے دل سے جاتی رہی) ۔ اب جملہ امور میں میری دلی خواہش صرف تیری نیت رہ گئی ہے ۔ یعنی جب آدمی اپنے اوصاف بشریت سے فنا ہو جاتا ہے (شہوات و لذات کو

۱- یہ حضرت شیخ علی الہجویری داتا گنج بخش لاہوری علیہ الرحمہ کی مشہور کتاب " کشف المحجوب " کا اقتباس ہے ۔ تصوف کے مسائل کی اس بحث کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خیال رہے کہ اس زمانے میں (۱۹۰۳ء) میرا رجحان تصوف کے خلاف تھا اور یہ بعض ایسی کتابیں پڑھنے کا اثر تھا جو تصوف کے خلاف لکھی گئی ہیں ۔ لیکن آج (۱۹۶۹ء) میں صوفیائے کرام اور تصوف اسلامی کے بارے میں دوسری ہی رائے رکھتا ہوں (فاروقی) ۔

ترک کردیتا ہے تو وہ پھر بقا کے معنی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ جب بندہ اپنی صفتوں کے وجود کی حالت میں صفتوں کی آفتوں سے خالی ہو جاتا ہے تو وہ اپنی مراد کی فنا کے ساتھ اپنے مقصود کی بقا میں باقی ہو جاتا ہے، قرب و بعد کچھ نہیں رہتا ... "

میر کے متصوفانہ اشعار اور بعض دیگر خصوصیات شاعری پر ایک مختصر رسالہ ترتیب دیا ہے جو ان شاء اللہ عنقریب شائع ہوگا اور حاضر خدمت کروں گا۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ

اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

کیا ہے ؟ استفہام انکاری ہے، یعنی جگر سوختہ کا کوئی نشان نہیں، خاکستر تک باقی نہیں ۔ 'اے' کلمۂ خطاب ہے، میں نے اس کے یہی معنی لیے ہیں نہ کہ ' جز ' ۔ نالہ جگر کو جلا سکتا ہے، جگر کا نشان کیوں کر بن جائے گا، قصور معاف آپ کے بیان کردہ معنی میں ' کیا ہے ' کا مفہوم آجاگر نہیں ہوتا ۔ نالہ سے اثر بھی ہے اور جگر کو جلا بھی دیتا ہے، اس تضاد پر غور فرمائیے ۔

آپ کو میرے اشعار پسند آئے : کلاہ گوشۂ دھقاں بآفتاب رسید ۔ اب کی چند متصوفانہ اشعار حاضر ہیں بزرگی بعقل است نہ بسال'۔ کاش آپ سے ' نا اہل ' اور ' نا لائق ' حضرات اردو میں بکثرت پیدا پیدا ہو جائیں ۔

مومن اپنے رنگ میں منفرد ہے ۔ اس کی شاعری چند موضوعات میں گھری ہوئی ہے ۔ تصوف ہے نہ فلسفہ ۔ خالص مجازی عشق کے معاملات و واردات ۔ تاہم کلام میں بلاغت ہے، تنوع ہے، دل کشی ہے ۔ غالب اس کا لوہا مانتے تھے اور مشہور ہے کہ اپنا پورا دیوان اس شعر کے معاوضے میں دینے کو تیار تھے :

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جتنی خوبصورت فارسی ترکیبیں مومن کے یہاں ہیں اور جس سلیقے سے استعمال ہوئی ہیں، غالب کے یہاں ہرگز نہیں ۔ شاید میں پہلا شخص ہوں جس نے کلام مومن کی ایک خصوصیت دریافت کی اور اس کی طرف توجہ دلائی ۔ اس طرف میرا دھیان خود اُس کے اس مقطع سے گیا :

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک 'معنی بند' ' مضمون یاب ' اپنا سا

حسن اتفاق سے آپ کے استفسار سے پیشتر اُس کا ایک ایسا شعر مع شرح پچھلے عریضے میں درج کر چکا ہوں ۔ نگار کے مومن نمبر میں ایک مضمون میرا بھی شامل ہے ۔ غالباً سنہ ۱۹۲۸ء کی بات ہے ۔ افسوس کہ وہ مضمون میرے پاس محفوظ نہیں ۔ غالب کی شاعرانہ عظمت سے نہ مجھے کبھی انکار تھا نہ اب ہے ۔ مگر میر کی سی ہمہ گیری دل آویزی اور اثر اندازی ، اُسی کے ساتھ انفرادی نیکھا پن کسی شاعر میں نہیں ۔

غالب کے 'موازنہ' ظہوری وغیرہ میں جن صاحب کی طرف اشارہ ہے وہ پروفیسر بیخود موہانی مرحوم ہیں ۔ اُن کے اقوال اُن کی کتاب ' سرمایہ' تحقیق ' سے اخذ کیے گئے ہیں .... نیاز آگیں اثر

[۶]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ
۳۰ ستمبر ۱۹۵۳ء
مکرمی ، تسلیم

۲۸ ستمبر کا نوازش نامہ مل گیا (آپ ۲۸ نومبر لکھ گئے !)

واللہ میں آپ سے ناراض نہیں ہوا ، نہ آپ کی تحریر کا کوئی جملہ خلاف مزاج ہوا ۔ البتہ ' دیدہ' تر ' کی بحث سے اُکتا ضرور گیا تھا ۔ ممکن ہے کہ میرے الفاظ نے اس کی غمازی کی ہو ۔ اگر میں آپ کی رائے کی قدر نہ کرتا ہوتا اور وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھتا تو آپ سے استدعا نہ کرتا کہ میرا مضمون جو حامیان فراق کے جواب میں ہے ، پڑھ کر اپنی رائے سے مطلع فرمائیے تاکہ مجھے مزید غور کا موقع ملے ۔ ابھی فراق موافقت میں جو مضمون لکھا گیا ہے اس کی ایک قسط باقی ہے ، وہ دیکھ کر اپنا جواب مکمل کرنے کے بعد حاضر خدمت کروں گا ۔ کتابوں کے بھیجنے کا عن قریب انتظام کروں گا ، ایک کتاب کا میرے پاس فاضل نسخہ نہیں ، ناشر سے منگا کر بھیجوں گا ۔

آپ کے پچھلے خط کا جواب روانہ کر چکا ہوں ۔ یقین ہے کہ مل گیا ہو ۔ وعدہ کیجیے کہ آپ آیندہ میرے خط کے الفاظ سے آزردگی کا پہلو نہ نکالیں گے ، ورنہ میری تحریر کی آزادی سلب ہو جائے گی اور ہر جملے پر سوچنا پڑے گا کہ اس میں آزردگی کا پہلو تو نہیں نکلتا ۔ ' مطالعہ غالب ' کے متعدیے

میں جہاں جہاں آپ کو اختلاف ہو ضرور تحریر فرمایے اور یہ بھی لکھیے کہ اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا اس سے آپ کا اطمینان ہوا کہ نہیں : اختلافی امور میں عبدالشکور صاحب (۱) کو حکم بنائیے ۔ کیا عبدالشکور صاحب وہی بزرگ ہیں جو ایک زمانے میں ڈربن کالج (جنوبی افریقہ) میں پروفیسر تھے اور ان کا ایک مضمون عرصہ ہوا کہ رسالہ زمانہ کانپور میں شائع ہوا تھا اور مضمون کے آغاز میں میرا یہ شعر درج کیا تھا :

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں ملگجے پھول ترے بستر کے

اور اس کو حقیت سے تعبیر کیا تھا ۔ اگر میرا قیاس صحیح ہو تو میری طرف سے اثر نوازی کا شکریہ ادا کر دیجیے ۔ اس کا مطلع بھی بے ساختہ نکل گیا تھا ۔

جان کو روگ ہیں دنیا بھر کے ہم تو پچھتائے محبت کر کے

لیاز مند ، اثر

[۷]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۰ اکتوبر ۶۳ء

مکرمی ، تسلیم ۔

یکم اکتوبر کا گرامی نامہ ملا ۔ بہت بہت شکریہ ۔

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

آپ نے میرے اس شبہے کو رفع نہیں کیا کہ لب ' خوشامدی ' ہوسکتے ہیں ' خوشامد طلب ' نہیں ہو سکتے ۔ یہ امر تو بدیہی ہے کہ آرزدگی سخن لبوں سے ہے ۔ مگر یہاں آزردگی سے مراد خفا ہونا نہیں بلکہ اتحاد عمل قطع ہو جانا ہے ۔ سخن لبوں سے نا آشنا ہو گیا ہے ۔ باہم مغائرت ہو گئی ہے ۔ دوسرے مصرع میں ' ہم ' سے مراد عاشق ہے اور خوشامد طلب ہونٹ نہیں بت ہیں ، وہ بھی ایسے خوشامد طلب کہ خموشی کو انتہائے خوشامد سمجھتے ہیں ، کیونکہ بت ہیں (لفظ بت کے ایک معنی خاموش بھی ہیں) میں نے بہت کوشش کی مگر اپ کا ہم نوا نہ ہو سکا ۔ مجبوری ہے ۔

۱۔ عبد الشکور صاحب ، مصنف ' تنقیدی سرمایہ ' و ' حسرت موہانی ' و غیرہ ۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بار ہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

آپ کے بیان کردہ مطلب کے متعلق تصوف کے ضمن میں عرض کروں گا۔ یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ معشوق کو لفظ ' غافل ' سے مخاطب کرتے میں نے کسی شعر میں نہیں دیکھا۔ معشوق کو غافل ، تغافل شعار ، تغافل پیشہ وغیرہ کہتے ہیں مگر اس سے خطاب بہ لفظ غافل (مثل ظالم ، کافر وغیرہ) میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔ کیا آپ اپنے قول کی سند میں کوئی شعر پیش کر سکتے ہیں جس میں معشوق سے تخاطب لفظ غافل کے ساتھ ہو ؟

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

نالے نے قمری کو جلا کر کف خاکستر کر دیا۔ بلبل کو قفس رنگ بنا دیا۔ غالب کا جگر جلا دیا۔ پھر بھی غالب نالے کی بے اثری کے شاکی ہیں ؟ جگر سوختہ ہو گیا تو پھر نشان چھوڑنا کیسا ؟ میری مطبوعہ شرح دوبارہ ملاحظہ فرمایئے۔ جلنے کے بعد صرف کثیف اجزا باقی رہ جاتے ہیں۔ قمری اور بلبل کا کچھ نہ کچھ نشان باقی رہا۔ جگر ایسا جلا کہ کوئی نشان نہ رہا۔ یعنی غالب کے عشق میں کوئی جزو کثیف نہیں تھا۔ آپ کی شرح سے قمری اور بلبل کے عشق پر انسان کے عشق کی افضلیت کا پہلو نہیں نکلتا۔ ' کیا ہے ' سے ' نہیں ہے ' مراد لینے سے یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب اشعار مبہم ہوں گے تو اختلاف آرا ناگزیر ہے۔

لے شب وصل غیر بھی کاٹی		تو مجھے آزمائے گا کب تک

... صاحب کی خدمت میں مجھے بھی نیاز حاصل ہے ، گو سرسری۔ اگر شعر کا وہی مطلب ہے جو انہوں نے بیان کیا تو وائے بر غیرت عشق جو معشوق کے وصل غیر سے راضی اور خوشنود ہے۔ یہ امتحان عشق کی بے حیائی کا ہوا یا غیرت کا ؟

حضرت (۱) بابا فرید گنج بخش یعنی علامہ علی الهجویری علیہ الرحمہ آپ

۱- حضرت اثر نے دو ناموں کو مخلوط کردیا ہے۔ شیخ علی الهجویری کا لقب داتا گنج بخش ہے اور حضرت بابا فرید ، گنج شکر کہلاتے ہیں۔ میں نے غالباً یہ لکھا ہوگا کہ موخر الذکر میرے مورث اعلیٰ تھے۔

کے جد اعلیٰ تھے مگر قصور معاف تصوف کو یونانی فلسفے سے قریب تر کہنے سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ نے ان کی نادرہ روزگار تصنیف 'کشف المحجوب' کا مطالعہ نہیں کیا ۔ یہ تصوف پر ایسی مستند اور معیاری کتاب ہے کہ اکثر مغربی زمانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے ۔ انھوں نے یونانیوں (سوفسطائی) کے فلسفہ حیات کی سخت مذمت کی ہے اور مردود قرار دیا ہے ۔ کشف المحجوب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو شمار اسلام کے خلاف ہو ۔ کتاب میں فنا و بقا پر سیر حاصل بحث ہے ۔ چند اقتباسات حاضر ہیں :

'' فنا اور بقا کے علم کا قاعدہ اخلاص اور وحدانیت پر ہے ۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ کفر و زندقہ ہے ۔ جو فنا کو خدا کی ذات میں فنا ہو جانا یا بقا کو خدا کی ذات سے متحد ہوکر باقی رهنا جانتا ہے، وہ غلطی پر ہے ... حادث قدیم اور قدیم حادث نہیں ہو سکتا ۔ ہماری بقا بھی ہماری صفت ہے اور ہماری فنا بھی ہماری صفت ہے ... فنا سے مراد غیر کے ذکر کی فنا ہے اور بقا سے مراد خدا کے ذکر کی بقا ہے ۔ جو اپنی مراد سے فانی ہے، وہ خدا کی مراد سے باقی ہے'' ۔

جب سرتاج انبیا ہمارے رسول کریم صلعم کو منزل تمکین و جمال (معراج) میں بھی ' قاب قوسین او ادنیٰ ' کا احساس رہا تو اور کسی کا ذکر کیا ۔ میں نے انھیں امور کو مد نظر رکھتے ہوئے غالب کے علی الرغم (عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا) کہا :

بحر سے مل کے بھی رہا ایک حجاب درمیاں
قطرہ فنا تو ہوگیا ترک بدن نہ ہو سکا

یا :　قطرہ کنار بحر میں محو نمود و بود ہے
دیکھیے کیا نتیجہ ہو سرکشیٔ حباب کا

یا :　ڈوب کر بحر میں بھی اپنی خودی ترک نہ کر
کہ یونہی قطرۂ ناچیز گہر ہوتا ہے

یا :　آسودۂ فنا نہ ہو جان امیدوار　　آلودہ پیرہن ابھی گرد سفر میں ہے

یا :　منزل قرب میں پہنچ کر بھی　　کچھ سکوت اور کچھ حجاب رہا

ذات مطلق سے کامل اتحاد (موکشں یا نروان) ہندو فلسفہ ہے ، تصوف سے (اسلامی تصوف سے) اسے کوئی علاقہ نہیں ۔ وہ نظریۂ شہود ہے جس نے تصوف میں تفرقہ ڈالا اور جس کے بانی شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) ہیں جن کا انتقال سنہ ۱۰۳۴ھ میں ہوا ۔ حضرت علامہ ہجویری کا وصال سنہ ۴۶۴ھ میں ہوا ۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ تصوف کے دلق پارسائی میں رخنے پڑتے گئے ، یہ بحث طویل ہے اور خط میں تفصیل کی گنجایش نہیں ۔

تصوف میں مسئلۂ وحدت الوجود کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے والے شیخ الاکبر حضرت محی الدین ابن العربی ہیں ۔ یہ اندلس کے رہنے والے تھے ۔ ان کا مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے ۔ یہ (غالباً غرناطہ کے) ایک امیر کبیر کی لڑکی پر جس کا نام ناظم تھا ، عاشق ہوگئے ۔ فریفتگی کا یہ عالم تھا کہ جوش سرور و مستی میں اُس کے حسن کی تعریف میں عشقیہ اشعار بر سر کوچہ و بازار پڑھتے پھرتے تھے ۔ لوگوں نے ملامت کی کہ ایک با عصمت و نا کتخدا لڑکی کو بدنام کرتے ہو ۔ انھوں نے فرمایا کہ عشق گناہ نہیں اور عشق کے سوا مجھے اس لڑکی سے کوئی سروکار نہیں ۔ لوگ ان کی جان کے درپے ہوگئے اور مجبوراً ترک وطن کرنا پڑا ۔ مکہ معظمہ پہنچ کر انھوں نے اپنی مشہور عالم کتابیں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ تصنیف کیں ۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ ڈانٹے کی Divine Comedy کے اکثر مقامات فتوحات مکیہ سے مستعار ہیں ۔ میں نے ابن العربی کی ایک عشقیہ نظم کا انگریزی سے ترجمہ کیا ہے ۔ عربی میں خدا جانے کس قیامت کا زور ہوگا ۔ ترجمہ آپ کے ملاحظے کے لیے حاضر ہے ...

نیاز مند   اثر

[۸]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۲۹ نومبر ۴۵ء

پیارے نثار ۔ ۲۶ نومبر کا خط ملا ، مسرت ہوئی ۔ میر اسی قابل ہے کہ اس کا امعان نظر سے مطالعہ کیا جائے (۱) اور نشاط روح و

---

۱ ۔ اس بحث کے بعد ہی میں نے میر کا مطالعہ امعان نظر سے کیا اور اب مجھے اعتراف ہے کہ میر کی عظمت کو میں نے اس وقت اچھی طرح نہیں سمجھا تھا ۔ میر کے سلسلے میں حضرت اثر کے اور خطوط بھی ہیں جو یہاں غیر متعلق سمجھ کر نظر انداز کردیے گئے ہیں ۔

دماغ کا وسیلہ بنایا جائے - میں نے اس کا یہ شعر ایک مرتبہ رات بھر گنگنایا ہے - تصویر ایک مادی پیکر کی ہے مگر ایک ایسے مادی پیکر کی ، گویا ایک تابندہ ستارہ مجسم ہوگیا - سنو اور اپنے تاثرات بیان کرو :

لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

غالب کا یہ شاہ پارہ بھی نہایت قابل قدر ہے :

نیند اس کی ہے ، دماغ اس کا ہے ، راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

اس میں سکون ہے ، میر کے شعر میں تڑپ ہے - (۱)

غالب کو اپنے اور میر کے درمیان حد فاصل بنا کر اپنا بھی ایک شعر سنانے کو دل چاہتا ہے ، نہ معلوم پہلے تمہیں لکھ چکا ہوں کہ نہیں :

اس کا عالم ؟ اس کا عالم ! تم نے دیکھا ہے کبھی
وہ ستارہ جو ' سحر افشاں ' سراپا ہوگیا

میر کے بعض اشعار پر اپنے تاثرات قلم بند کردو ، یہی مضمون ہوجائے گا - اس پر کتنا ھی لکھتے چلے جاؤ ، معلوم ہوگا کہ کچھ نہیں لکھا .....

تمہارا اثر

[۹]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۱۴ جنوری ۱۹۵۴ء

پیارے بھائی فاروقی - ۱۲ جنوری کا محبت نامہ ملا - میں نے آپ کی اصلاح بطیب خاطر قبول کرلی -

اور مصرع کو بیاض میں درست کرلیا :

محبت میں اب یوں بسر ہو رہی ہے
بجائے : محبت میں یوں بھی بسر ہو رہی ہے

۱- دونوں اشعار پر کتنا جامع تبصرہ ہے - یہ حضرت اثر ھی کا انداز ہے -

بہت بہت شکریہ - (۱)

زندگی ہے تو ۹ مارچ کو یا اس کے چند روز بعد دہلی کا قصد کروں گا ...
اب میں سمجھا کہ شاعری میں آفاقیت سے آپ کی مراد کیا ہے - بلا مبالغہ میر کے سینکڑوں اشعار پیش کروں گا - فی الحال غالب کا نقل کردہ یہ مطلع لیجیے جو حسن اتفاق ہے (آپ یقیناً سوء اتفاق کہیں گے) میر کے ایک مطلع کا دست نگر ہے -

غالب : بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میر : ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا
دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

غالب نے شیخ علی حزیں کے ایک مطلع میں ایک ردیف کو بیکار قرار دیا تھا - آن کے مطلع میں خبر سے دونوں ردیفیں بیکار ہیں - " دنیا بازیچۂ اطفال ہے، روز و شب تماشا ہوتا ہے" - مطلب پورا ہی نہیں ہوگیا بلکہ ' مرے آگے ' کا ٹکڑا قول کی آفاقیت میں حارج تھا، وہ نکل گیا - میر کا مطلع ان تمام اسقام سے پاک ہے - غور کرنے کے بعد اپنی رائے سے مطلع کیجیے -

غالب کا دوسرا شعر ہے :

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

شعر کی خوبی میں کوئی شک نہیں - میر کا مقطع سنیے :

جب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر
جیب جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

۱- اس سے حضرت اثر کی عالی نظری اور بلند ہمتی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک دبستان نشیں، کم سواد کی ' اصلاح ' کو بہ طیب خاطر قبول کرلیا - آن کی محبت اور شفقت نے مجھے اتنا ہی گستاخ کردیا تھا -

غالب کے شعر کا حاصل یہ ہے کہ کشاکش ہائے ہستی سے آزادی ممکن نہیں ۔ موج ہاتھ پاؤں مارتی ہے تو زنجیر اور زیادہ الجھتی ہے اور وہ زنجیر خود موج کی روانی یا سعی ہے (میرے نزدیک سعی آزادی سے جہد آزادی کہنا کہیں بہتر ہوتا ۔ سعی محض کوشش ہے اور جہد کوشش بسیار یا تگ و دو ہے ۔ خیر اسے جملہ معترضہ تصور کیجیے) ۔ میر کہتا ہے کہ خود جان وابستۂ زنجیر ہے ، لہذا ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ نہیں ہوسکتا ۔ ہر حال میں ناموس عشق کی نگہداشت لازم ہے ۔ آزادی تو اس وقت تک تھی کہ ' طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا ' ۔ (پورا شعر میر کا یہ ہے :

صد گلستاں تہ یک بال تھے اس کے جب تک
طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا)

آپ کا نقل کردہ تیسرا شعر غالب کا یہ ہے :

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

اس کی شرح ' چھان بین ' یا ' تنقیدی مضامین ' میں کر چکا ہوں ۔ میر کا شعر مقابلے میں سنیے :

ہاں جیسے شمع بزم اقامت نہ کر خیال
ہم 'دل کباب' پردے میں سرگرم راہ ہیں

وہی بظاہر اقامت مگر در پردہ طے منزل جو غالب کے شعر کا خلاصہ ہے ، وہی میر کے شعر کا ہے ۔ وہاں تکلف اور تصنع کے ساتھ شکوہ الفاظ ہے ' یہاں حقیقت کے ساتھ دست بدست ندرت ادا ہے ۔ آپ غالب کے اشعار لکھتے جائیے ' میں جواب میں میر کے اشعار پیش کرتا جاؤں گا ۔ فیصلے کا انحصار آپ ہی پر رہے گا۔ ان شاء اللہ آپ آفافیت کے معاملے میں بھی میری طرح میر کے قائل ہو جائیں گے ۔ اس کے بعد میر کے فاضل اشعار جن میں آفافیت ہے ، درج کر کے آپ سے استدعا کروں گا کہ ان کے جواب میں غالب کے اشعار ڈھونڈھیے ۔ اقبال اور میر کا کوئی موازنہ نہیں ، ایک قومی یا ملی شاعر ، ایک غزل گو ۔ ...

آپ کا اثر

[۱۰]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۲۰ جنوری ۱۹۵۴ء

پیارے بھائی فاروقی - ۱۸ جنوری کا خط کل شام کو ملا ....
جان برادر ، میر اور غالب کا موازنہ ہمیں کسی منزل تک پہنچاتا نظر نہیں آتا ، بلکہ نا گوار صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے ۔ میر کہتا ہے :

دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

آپ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ جب غور سے دیکھا تو وہ تماشا بھی کچھ عجب تماشا ہے ۔ حالانکہ جو کچھ غالب نے ' بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے ' میں کہا میر نے ' دنیا عجب تماشا ' ہے میں کہہ دیا ۔ عجب تماشا میں حیرت ہے ، استعجاب ہے ، تغیرات کے اہم ہونے کی طرف اشارہ ہے ۔ بازیچہ اطفال کہنے سے دنیا محض بچوں کا بے معنی گھروندا ہو کر رہ گئی ۔ ' مرے آگے ' کے ٹکڑے نے قائل کے علاوہ ہر شخص کو بھلا کسی استثنا کے طفل مکتب بنا دیا ، جو غالب کے سامنے اپنے طفلانہ کرتب دکھا رہا ہے ۔ بحث آفاقیت یا عالمگیر حقائق سے شروع ہوئی تھی مگر رفعت و جزالت و مضمون آفرینی میں گھر گئی ۔ آپ میر کی بزرگی کے بھی قائل ہیں مگر اس کے کلام میں مفکر کا دل نہیں جھلکتا ۔ کیا آج تک کوئی ایسا صاحب عظمت و بلند مرتبت شاعر ہوا ہے جو مفکر نہ ہو ؟ کیا جو شاعر مفکر نہ ہو وہ ایسے شعر کہہ سکتا ہے :

بہر فردوس ہو آدم کو الم کاہے کو
وقف اولاد ہے وہ باغ تو غم کاہے کو

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

ہمت اپنی ہی تھی یہ میر کہ جوں مرغ خیال
اک پرافشانی میں گزرے سر عالم سے بھی

دل نے ہم کو مثال آیینہ ایک عالم کا روشناس کیا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ہنسے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرم روش ہیں کچھ اس بدگماں کے لوگ

ہر قطعہ پر چمن کے ٹک غور سے نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں
گرداب کیسا ، موج کہاں ہے ، حباب کیا

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ہم جانتے تھے تازہ بنائے جہاں کو لیک
یہ منزل خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح

یہ دو ہی صورتیں ہیں ، یا منعکس ہے عالم
یا عالم آینہ ہے اس یار خود نما کا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا
صد گلستاں تہ یک بال تھے اس کے جب تک
طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا

غم فراق ہے دنبالہ گرد عیش وصال
فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے

ہر جزر و مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش
کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ ہے یہ جوش

اس آفتاب حسن کے ہم داغ شرم ہیں
اتنے ظہور پر بھی جو منھ کو چھپا رہے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

یہ توہم کا کارخانہ ہے
ہاں وہی ہے جو اعتبار کیا

آینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لبا لب
راز نہان حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
میں نقش پا کی طرح پایمال اپنا ہوں
اگرچہ نشہ ہوں سب میں خم جہاں میں میر
برنگ مے عرق انفعال اپنا ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ راز نہاں ہوں

وہم جس کو محیط سمجھا ہے
دیکھیے تو سراب ہے وہ بھی

اور نہ معلوم کیا کیا ۔ رواروی میں جو اشعار یاد آئے درج کردیے ۔ کلام غالب کی طرح کلام میر کا بالاستیعاب مطالعہ کیجیے ، پھر کوئی رائے قائم کیجیے ۔

دہلی آنے کی ایک صورت نکل آئی ہے ۔ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے Board of Scientific Terminology کا ممبر ہوں ۔ اس کا جلسہ ۲۰ اور ۲٦ فروری کو ہونے والا ہے ۔ میں کئی جلسوں میں شریک نہیں ہوا ۔ اب شریک ہوں گا اور آپ سے ملاقات ہوگی ۔ انشاءاللہ ۔

مصحفی کا ایک قلمی دیوان میرے پاس ہے (۱) اور جہاں تک علم ہے غیر مطبوعہ ہے۔ آپ کے ملاحظے کے لیے لیتا آؤں گا۔ رسالہ تحریک دہلی میں کچھ دن ہوئے ایک مضمون بھیج چکا ہوں، عجب اتفاق ہے کہ اس میں مصحفی کے بھی بعض اشعار پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ شائع ہو تو دیجیے ......

آپ کا، اثر

[۱۱]

کشمیری محلہ، لکھنؤ

۲ دسمبر ۱۹۵۵ء

پیارے نثار احمد۔ تمہارا خط باعث مسرت ہوا ...

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالب نے اپنی رایگاں بندگی کو نمرود کی خدائی سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح نمرود نے گلزار ارم سجایا مگر اس سے فیض یاب نہ ہو سکا بلکہ اس کی تعمیر اس کی موت اور محرومی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اسی طرح بندگی اور طاعت میرے کام نہ آئی۔ سوالیہ طرز کلام نے یہ بلیغ اشارہ کیا کہ شاید میری بندگی میں نمرود کے دعویٰ الوہیت کی طرح غرور خود پسندی و خود نمائی شامل تھا (وہ نادانستہ سہی)۔

بہ قدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں ہوں خمیازہ ساحل کا

علی سر ہندی کا شعر ہے:

تو چوں ساقی شوی درد تنک ظرفی نمی ماند
بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلہا

۱- میں نے ۱۹۵۳ء میں مصحفی کا کلام ایڈٹ کرنے اور اس کی زندگی و شاعری پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ کتاب کا مسودہ تیار ہے اور اس کا پہلا باب ۱۹۵۸ء میں رسالہ برہان دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ کلیات کی ترتیب سے بھی خدا کے فضل و کرم سے فراغت ہوگئی اور اس کے پہلے دو حصے علمی مجلس دہلی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کر دیے ہیں۔ باقی جلدیں زیر طبع ہیں۔ پورا منصوبہ غالباً ۱۷ جلدوں میں مکمل ہوگا۔

اس میں خاص بات یہ ہے کہ ساقی کی ایک نگاہ تنگ ظرف کو بھی عالی ظرف بنا دیتی ہے ۔ اس کو ایک برجستہ مثال سے ثابت کیا ہے :

بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلہا

غالب کے شعر میں یہ نکتہ نہیں ۔ باقی وہی ہے جو علی سرهندی نے کہا ۔ اُن کا دعوی ہے کہ اے ساقی میں جس طرح پینے میں عالی ظرف تھا ، کتنی ہی چڑھا جاؤں بدمست نہیں ہوتا تھا ، ایسا ہی خوددار ہنگام تشنہ کامی بھی ہوں ۔ (شارحین نے ' بھی ' کی اہمیت کو نظر انداز کردیا اور بہک گئے) ۔ جب میرے ذوق مے کشی کی انتہا نہیں تھی ، اب خمار تشنہ کامی کی تھاہ نہیں ۔ جس حد کا ذوق مے کشی تھا ، اسی حد پر خمار تشنہ کامی بھی ہے ۔ یہ جملہ محذوف چھوڑ دیا ہے کہ اگر یقین نہ ہو تو پلا کے دیکھ لے ، تیری دریا دلی کے ساتھ ساتھ میری تشنگی بڑھتی جائے گی ۔ ساحل دریا کے ساتھ ساتھ رهتا ہے مگر خشک ۔ اسی سے ساحل کی تشنہ لبی مسلمات شاعری میں سے ہے ۔

غور کرو اور لکھو کہ علی سرهندی اور غالب کے شعر میں تمھیں کون زیادہ پر مغز معلوم ہوتا ہے ۔ ...   تمھارا ، اثر

غالب کی صد سالہ برسی پر انجمن ترقی اردو کی ایک پیشکش

غالب نامہ آور

غالب کی شخصیت اور شاعری سے متعلق مضامین کا مجموعہ

سہ ماہی " اردو " میں گزشتہ نصف صدی میں غالب کے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں ، اس مجموعے میں ان مقالوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ اس میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق ، ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری ، ڈاکٹر محمد اشرف ، آل احمد سرور ، ہاشمی فرید آبادی ، مالک رام ، ڈاکٹر اختر اورینوی ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور بہت سے دوسرے اہل علم کے مقالات شامل ہیں ۔

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی

غالب کی جمالیات

محمد علی صدیقی

غالب اسلامی برصغیر کے اس پر آشوب عہد میں تھے جب ٹیلیگراف، انفیلڈ اور دخانی جہازوں نے طاقت کا پانسہ یکسر مغرب کے حق میں پلٹ دیا تھا۔ مغلوں کی حکومت تو ۱۸۰۱ء میں اسی وقت دم توڑ چکی تھی جب جنرل لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہوئی تھیں اور لال قلعے کے مکین مادھو لال سندھیا کے زیر نگیں تھے۔ ویسے بھی آیندہ چند برسوں میں مغل بادشاہ کو صرف دو لاکھ سالانہ کا وظیفہ خوار بن کر رہنا تھا۔

غالب صرف ایک عہد کے خاتم ہی نہیں بلکہ وہ ایک بالکل نئے عہد کے ایسے نقیب بن کر آئے جو اپنی تہذیبی کس مپرسی پر کڑھنا بھی جانتا ہو اور مغرب کے سلسلے میں نتائجی Pragmatic رویہ رکھنے کا جبر بھی سہتا ہو، وہ شخص جسے ہم صحیح معنوں میں عجمی و عربی تہذیب کا نمایندہ کہیں اور جو ایرانیوں کی طرح پورے ہندوستان میں صرف امیر خسرو ہی کو واحد فارسی شاعر مانے اور خود کو فارسی لب و لہجہ میں اس طرح ڈوبا ہوا محسوس کرے جیسے لوہے میں جوہر، فارسی سے وہ اردو کی طرف یوں ہی متوجہ نہ ہوسکا تھا۔

غالب تو غالباً وہ آخری آدمی ہوتے جو اپنے اردو اشعار سے داد طلبی چاہتے، وہ تو اردو شعر بھی اس لیے کہہ لیتے تھے کہ اردو بہر حال مغلیہ زوال کے ساتھ ساتھ دربار میں در آئی تھی اور جب سے شاہ عالم نے اردو شاعری شروع کردی تھی، محلات شاہی میں بھی اردو ہی مستعمل تھی۔ لیکن غالب کا خاندان ہندوستان میں شاہ عالم ہی کے زمانے میں آیا اور وہ بڑی حد تک نو وارد تھا۔ اسی لیے مغلوں کے یہاں صدیوں کے بعد جو تہذیبی خلط ملط

رونما ہوا تھا ، وہ غالب کے لیے ابھی اس قدر طے شدہ مسئلہ نہیں تھا ۔ اس لیے انہیں اس پر بھی فخر ہے کہ ان کا استاد ملا عبدالصمد ہرمزد تھا جو پہلے زرتشت کا پیرو تھا ، غالب نے انہیں سے منطق و فلسفہ پڑھا تھا ۔ اپنے استاد کے بارے میں غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ " سامان پنجم کی نسل میں سے تھے ، معہذا منطق و فلسفے میں مولوی فضل حق مرحوم کی نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھے" ۔ انہیں غالب نے جاماسپ عہد اور بزرچمہر دوراں کہا ہے ۔ ایک ایسے سماج میں جس کا عجمی و عربی ڈھانچہ میر تقی میر کے زمانے ھی میں متزلزل ہو چکا ھو اور اٹھارویں صدی کے آخر تک جنوب سے بڑھتے ہوئے انگریز بنگال ، بہار ، اڑیسہ اور مشرقی یو پی تک چھا چکے ہوں ، روھیلوں کی طاقت کو ختم کر دیا گیا ھو اور انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں سندھ ، بلوچستان ، پنجاب اور سرحد کا الحاق مکمل ہوچکا ھو ، اب امید کی کرن کہاں سے پھوٹے ۔ غدر سے ایک سال قبل اودھ کی اس حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا جس کے سربراہ کو ۱۸۱۹ء میں بادشاہت کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا ۔

غالب کے سامنے ایک طویل ڈرامے کا آخری سین کھیلا جاتا تھا اور اور مرد بیمار کی آخری ہچکی ظہور میں آنے والی تھی ، لیکن غالب عنفوان شباب ھی سے واقف تھے کہ ۱۸۱۸ء میں مرھٹوں کے استیصال کے بعد اب صرف انگریز ھی سب سے بڑی طاقت ھیں ، اور جب وہ اپنے خطوط اور دیگر نگارشات میں انگریزوں کا ذکر کرتے ھیں تو یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں رھتی :

شاهد و مے ز میاں رفته و شادم به سخن
کشته ام بید دراں باغ که ویراں شده است

بلکہ بعض اوقات تو یہ شبہ ہونے لگتا ھے کہ مغربی تہذیب کی بالا دستی ان کے ذھن پر مرتسم ہونے لگی اور ۱۸۳۱ء میں لارڈ میکالے کی سفارشات کے نتیجے میں فارسی کا اردو کے حق میں معزول کیا جانا تو بہت ھی واضح اشارہ تھا ، غالب کو مندرجہ ذیل اشعار :

نیست نقصاں یک دو جز است از سواد ریخته
کاں دژم برگے زنخلستان فرھنگ من است

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

کی روشنی میں اپنے فارسی مجموعے کو الہامی صحیفہ سمجھنا سمجھ میں آتا ہے۔

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

لیکن کچھ ہی دن بعد وہ مندرجہ ذیل شعر کہنے پر مجبور ہو گئے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالب کی اس نتائجی (Pragmatic) فکر نے انھیں ایک جمالیاتی نقطۂ نظر بھی دیا۔ جمالیاتی نقطۂ نظر در حقیقت ادیب کا وہ واضح یا غیر واضح سیاسی و فکری ایقان ہوتا ہے جو فن میں در آتا ہے۔ جمالیات یا ذوقیات سے مراد ذوق کی نشو و نما نہیں، جس طرح ترقی پسندوں کی جمالیات ادب برائے زندگی کی کوکھ سے پھوٹتی ہے اور رجعت پسندوں کی ادب برائے ادب کے چسکے سے، یا ان دو متضاد نظریوں کے درمیان نیم مذہبی و نیم روشن خیال (Formed Content) کے نظریے سے۔ ہم تکنی بندھی زبان میں کیوں گفتگو کریں بلکہ سیدھے سادے طریقے سے یہ کہیں کہ ہر فن پارہ اپنے خالق کی فکر کا عکس ہوتا ہے:

خوشست باد غالب بساز آمدن
نوا سنج قانون راز آمدن

اور اگر فن اور ذہن دو مختلف چیزیں ہو سکتی ہوں تو یہ الگ بات ہے لیکن غالب کی فکر تصوف اور معروضی نتائجیت کے درمیان آویزش کا ایک نراف ہے، ایسا اس لیے ہے کہ مسلم ہندوستان کی فکر پر تو تصوف کا غلاف چڑھ چکا تھا اور اس دنیا کو وہم، خیال، التباس اور باطل سمجھنے کی فکری انفعالیت نے جینے کا حوصلہ چھین لیا تھا۔ اس دنیا کو مسافر خانہ سمجھتے سمجھتے جو فکر پروان چڑھی ہو وہ جیتی جاگتی حقیقتوں کا کس طرح مقابلہ کرتی، یا تو وہ بہادر شاہ ظفر کی طرح:

دنیا دارو دنیا چھوڑو دنیا میں بدنامی ہے
اس دنیا کے ترک کیے سے ہوتی نیک انجامی ہے

کی فکر میں رنگتے ہوئے ملتا یا پھر حسرت تعمیر کا سہارا لیتا اور یہ ایک سچ صوفی کے لیے نشہ ھرن کرنے کے مصداق ھوتا ہے ۔ غالب کی مثال اس شخص کی سی ہے جو تصوف کے بالائے زمین قہوہ خانے میں بھی چسکی لگا آتا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحے سے ظاہر و موجود دنیا کی کا کل سنوارنے کی سعی کرتا ہے ایک ایسی سعی جو زرخیز مٹی میں گلاب اگائے اور ویران باغ میں کانٹے بھی ایک تھکے ہوئے آدمی کی طرح وہ اس دنیا کو باطل سمجھ کر کبھی کبھی کد کاوش سے بھاگنا چاہتے ہیں ، لیکن ہر جگہ ان کی زمینیت اور عقل پسند آڑے آجاتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ وہ سلطان سنجر اور بو علی سینا دونو کے شکار تھے۔ اشراق و عقل دونوں ہی کسی تاریخی مبارزہ کے ناظر تھے اور بہ میں اشراق کے مقابلے میں عقل ہی کو اپنا رہبر بنا چکے تھے ۔ یہ اور بات کہ جب وہ تصوف کے سکون پرور اور جستجو بیزار رنگ میں بے پناہ تنوطیہ اور علاحدگی پسندی کی طرف بھاگتے تھے تو ایسے اشعار بھی کہتے تھے :

رھیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ھو
ہم سخن کوئی نہ ھو اور ہم زباں کوئی نہ ھو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہم سایہ نہ ھو اور پاسباں کوئی نہ ھو

اور کہیں وہ مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سایوں کو ایک ایسی راہ سے تشبیہ دیتے ھیں جس سے خلاصی کی امید اگلی نسلوں کے حصے میں آئے گی مغربی تہذیب اپنی زبان کی بے ساختگی ، اپنے احساس وقت ، سائنس کی اوائل رومان پسندی اور قانون دیوانی و فوجداری کے پیچھے بھرپور طاقت لائی تھی قانون کا احترام پچھلی ڈیڑھ سو سالہ ھندوستانی تاریخ میں مفقود سے مفقود ہوتا چلا جا رہا تھا ۔ نادر شاہی یلغار ، مرہٹوں کی چھاپہ مار جنگیں ، پانی پت کی تیسری لڑائی ، اودھ اور روھیلکھنڈ کی کشمکش میں دھلی سے دور در علاقوں کے لیے ڈاک کا نظام تو کیا، خود دھلی کے مضافات میں بھی ناپید ھو رہ گیا تھا ۔ اس لیے غالب جب ڈاک کے نظام کو تہذیب کی اساس سمجھتے ھیں اور غدر کی تباہ حالیوں میں سے سب سے زیادہ ڈاک کے نظام کو درھم برہم دیکھ کر کھولتے ھیں تو ھمیں بدیہی تہذیب کے بارے میں پہلا اثباتی رد عمل ملتا ہے ۔ غالب نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے ہی انگریزوں کی بالادستی کو اس

طرح تسلیم کر لیا تھا جس طرح کچھ حضرات نے اس ہنگامے کے بعد ۔ غالب انگریزوں کے خلاف بغاوت کو خودکشی کے مترادف سمجھتے تھے ۔ بغاوت اپنی جگہ نیک جذبہ سہی لیکن اس زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے غالب کو زیادہ حقیقت پسند کہا جاسکتا ہے ۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جو بہادر شاہ کو صحیح معنوں میں ایک فعال طاقت سمجھ سکتے تھے ، غالب کو ان کے ایک خط کی روشنی میں دیکھیے جو انھوں نے قاضی عبدالجمیل کو لکھا ہے :

''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا ۔ قلعے میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں، وہاں کے مصرعہ' طرحی کو کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا ۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور خود یہ صحبت چند روزہ ہے ، اس کو دوام کہاں ۔ کیا معلوم ہے اب نہ ہو ، اب کی ہو تو آیندہ نہ ہو ۔ (۱)

غالب ان لوگوں میں سے قطعاً نہیں ہیں جو سنہ ستاون کے ہنگامے کے دوران اپنے اپنے شہروں سے انگریزوں کو نکال کر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ جنگ جیت لی گئی ہے ۔ قربانی کے جذبے کے ساتھ اگر کوئی تنظیم نہیں ہے تو نتیجے دور رس اور دیرپا نہیں رہ پاتے ۔ غالب ٹیلیگراف کو بدیسی حکمرانوں کی سب سے بڑی طاقت جانتے تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ کلکتہ کی ایک فوجی بیرک میں پورے شمالی ہندوستان کی جنگ آزادی کی مٹ منٹ کی خبریں پہنچ رہی ہیں اور جنوب مغرب کے محفوظ علاقوں سے شمال و مشرق کی طرف کوچ کا نقارہ بج رہا ہے :

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

اور اسی لیے غالب اپنے خطوط میں جگہ جگہ اپنے زمانے کی بے ثباتی اور اپنے طاقت ور تہذیبی حریف کو بدیہی حقیقت کے طور پر مانتے ہوئے ملتے ہیں ۔ وہ اپنے طاقت ور حریف کا مقابلہ تصوف کی اس غیر حقیقت پسندانہ عافیت کوشی سے نہیں کرتے جو حال میں موجود دنیا سے احتراز کی صورت میں مضمر ہے ۔ بلکہ وہ زمان و مکان کی قید میں گرفتار اور اسی پرسراب (مایا والی) دنیا میں اپنے مسائل کا حل ڈھونڈھتے ہیں ۔ اگر غالب کی مذہبی شاعری کو

۱۔ ادبی خطوط غالب ، مرتبہ مرزا عسکری ، ص ۱۲۶ ۔

جو ان کی فارسی کلیات میں کثرت سے ملتی ہے، ہم پر تکلف سمجھ کر آگے بڑھ جائیں تو غالب کافی قابل فہم ہو جاتے ہیں۔

اس پس منظر میں ہم اگر غالب کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں غالب کے اشعار میں ایک خاص قسم کی متصوفانہ قنوطیت اور موت کی خواہش پر مردم غلبہ آور حقیقت پسندی سے واسطہ پڑتا ہے۔ غالب کی جمالیاتی اقدار سچ کو سچ ماننے پر اصرار کرتی ہیں، چاہے وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔ میر مرہٹوں کے فتنوں کے گردباد کے اس پار دیکھنے پر مصر نہیں ہیں، لیکن غالب برقی تار کی موجودگی میں گھوڑوں کے ذریعے ترسیل کے نظام کو ہیچ گردانتے ہیں اور یہی وہ شعور ہے جو انہیں اپنے زمانے کے شعرا میں جدید تر بنا دیتا ہے۔ پس غالب ایک ایسے معاشرے کا ادراک رکھتے تھے جو ہمیں آج دو تین نسلوں بعد حاصل ہوا ہے۔ اس لیے بعض اوقات وہ اپنی لفظی اور سریع الفہمی سے چڑھ اٹھتے ہیں اور یہ وہ چڑھ ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو ہم ان کی پگڑی اچھالتے کیونکہ ذہانت اور خاص کر ' غالبانہ ' ذہانت بہت جلد دشمن پیدا کر لیتی ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ان کی موت نے ہم سے ان کی معجزنما ذہانت کا لوہا منوالیا اور اب غالب پرستی اس حد تک بھی ریاضت کی طالب نہیں جتنی کہ تجریدی آرٹ کے شوقین اپنی آہ اور واہ کے نظام کو مرعوب کرنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس میں غالب کا تصور بہت کم ہے، اُن کی شاعری کی ہمہ گیری کا بہت زیادہ۔ غالب اب مسلمات کے ذیل میں آتے ہیں، انہیں نہ پڑھنے والا آدمی بھی نادانستہ طور پر ان کے بارے میں اتنا لکھ پڑھ اور سن چکا ہوتا ہے کہ غالب کے بارے میں صاحب الرائے ہونے کے شرف سے ہاتھ نہیں دھو سکتا۔

غالب نے انیسویں صدی کے اول نصف صدی کے ہندوستان میں فن کی سطح پر وہی کام کیا ہے جو امریکن فلسفی pierce نے پیورٹن زدہ امریکہ کو مذہب کے مقابل سائنس اور نشاط انگیزی کے چیلنج سے نمٹنے کے لیے کیا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ غالب اس فلسفیانہ فکر کے داعی تھے جس کا pierce ناظم و مدون تھا۔ ان دونوں میں مماثلت واجبی سی ہی سہی لیکن pierce بھی امریکہ کی سماجی تاریخ کے دوراہے پر اسی طرح کھڑا ہوا ملتا ہے جس طرح غالب۔ غالب کی موت کے وقت وہ امریکی رسالوں میں فلسفیانہ بحثیں چھوڑ چکا تھا تھا۔ ادوار اور تاریخی محرکات کا فرق سر آنکھوں پر لیکن غالب کے سامنے بھی یہ سوال تھا کہ برطانوی قانون کے سامنے آئین اکبری کی

عملی منفعت کیا ہے۔ غالب نے آئین اکبری کے نسخے پر تقریظ لکھتے ہوئے جن شکوک کا اظہار کیا تھا، کچھ ہی سال بعد سرسید اس سلسلے میں بہت آگے نکل گئے اور انھوں نے پوری اسلامی فکر ہی کو معرض خطر میں ڈال دیا۔ ۱۸۷۲ء میں مسلمانان ہند کی ترقی تعلیمی سے متعلق ایک کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا:

> '' وقت اور اس کی روح، سائنسی علوم اور ان کے نتائج، سب تبدیل ہوگئے ہیں۔ قدیم اسلامی کتابیں اسلام کے پیروؤں کو حریت فکر اور سادگی کی تعلیم نہیں دیتیں اور نا ہی وہ عمومی طور پر حصول حق میں ان کی معاونت کرتی ہیں۔ اس کے برخلاف وہ دھوکا دیتی ہیں اور لوگوں سے معنی پوشی کرتی ہیں اور اس کمزوری کو اس طرح پورا کرتی ہیں کہ وہ چیزوں کے بیان میں غلط بیانی اور غیرمتعلق اصطلاحات کو پرشکوہ الفاظ میں پیش کرتی ہیں۔ یہ کتابیں غلامی کے احساس کو نافذ کر دیتی ہیں اور لوگوں کو غرور، تکبر غلط اعتمادی و خود فریبی میں مبتلا کرتی ہیں اور اپنے قارئین کو ان کے ساتھی انسانوں سے نفرت کرنا سکھاتی ہیں۔ ان میں ہمدردی کا دور دور تک بھی کوئی شائبہ نہیں۔ ان میں غلو ہے۔ یہ کتابیں ماضی کی تاریخ کو مبہم اور حقایق کو داستانوں اور قصوں کی شکل دے دیتی ہیں ''۔ (۱)

مجھے یقین ہے کہ غالب سرسید کے مقابلے میں اپنے تہذیبی سرمائے کی بابت اتنی سرد مہری نہیں دکھا سکتے تھے۔ وہ تو صرف اس سرمائے کی غیر اطلاقی نوعیت سے نبرد آزما تھے اور آخر میں انھوں نے ہار مان لی تھی۔ برطانوی قانون کو آئین اکبری کے مقابلے میں ترجیح دے دی گئی تھی۔ کون چاہتا ہے کہ جو تہذیب ان کی گھٹی میں پڑی ہو ناسازگار حالات کی کڑی دھوپ میں اسے ناکافی سمجھنے پر مجبور ہونا پڑے، ایسا سمجھنے سے آدمی کسی قدر بجھ جاتا ہے۔ غالب بھی ایسے ہی کرب سے گزرے تھے:

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

---

(1) Evolution of Indo - Pakistan, Select Documents, P 179.

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

غرض کہ غالب کے لیے '' غدر'' ۱۸۰۱ء ہی میں ہو چکا تھا۔ ان کے زمانے میں شاہ عبدالعزیز نے دھلی کالج میں مسلمان بچوں کی انگریزی میں تعلیم کو ۱۸۲۴ء میں جائز قرار دے دیا تھا ۔ ان کے بادشاہ کے سکے ۱۸۳۵ء ہی میں چلنے بند ہوگئے تھے ۔ جبھی تو وہ کہتے تھے :

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل

اور اسی لیے '' غدر'' جس طرح عوام کے لیے ایک تلخ حقیقت کے روپ میں ۱۸۵۷ء میں برپا ہوا ، غالب کے گھر میں صف ماتم نہ جانے کب سے بچھ چکی تھی اور کب کا چہلم ہو چکا تھا۔ اس روشنی میں اگر ان کی کتاب ' دستنبو ' کو پڑھا جائے تو زیادہ چڑچڑاہٹ پیدا نہیں ہوتی ۔

غالب کی فکر کو اگر تفصیل سے دیکھنا ہے اور جہاں وہ بین السطور رہنے کے تکلف سے مبرا و منزا ہو جاتے ہیں ، وہ کلیات فارسی کی مثنویاں ہیں ۔ مثلاً کلیات فارسی کی مثنوی دہم جو آئین اکبری مصححہ سید احمد خاں کی تقریظ کے طور پر ہے ، اس میں وہ کھل کر مغلوں کے زوال پذیر سماج سے نالاں ہیں اور ان کے قانون کو ' آئین ریا ' تک کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے سر سید

احمد خان کو آئین اکبری کی تدوین نو کی کوشش کے سلسلے میں کس قدر لتاڑا ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار ہی سے ہو سکتا ہے :

ویں کہ در تصحیح آئیں رای اوست	ننگ و عار همت والای اوست
من کہ آئین ریا را دشمنم	در وفا اندازہ دان خود منم
با بد آئیناں نمانم در سخن	کس نہ داند انچہ دانم در سخن

اور اگر دستنبو کو کچھ حضرات مجبوری محض کہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں تو اسی مثنوی کے مندرجہ ذیل اشعار سے کیا مترشح ہوتا ہے جو انھوں نے اس سر سید احمد خان کے لیے لکھے ہیں جو انگریزی سرکار کے مراد آباد میں صد الصدور ہیں اور اسباب بغاوت ہند کے مولف ہیں :

صاحبان انگلستان را نگر	شیوہ و انداز اینان را نگر
تا چہ آئیں ها پدید آوردہ اند	انچہ هرگز کس ندید آوردہ اند
حق ابی قوم است آئیں داشتن	کس نیارد ملک بہ زیں داشتن

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ غالب انگریزی سامراج کو مدافعت سے بلند و بالا حقیقت سمجھتے تھے - ان کا سماجی شعور قومیت کی اس ہوا سے کہاں منسلک و متحد ہو سکا تھا جو ان کے چند دوستوں کے لیے بالکل ممکن تھا ' اور یہ ہوا پورے یورپ اور خود مشرق وسطیٰ میں چل رہی تھی - غالب کا مثالی سماج تو وہی تھا جس میں داد و دانش باہم پیوستہ ہوں - اس لیے جب وہ اپنی معاصر تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں سوائے خلفشار ذہنی اور تاراجی سلطنت کے کچھ نظر نہیں آتا - چاروں طرف دھول اڑ رہی ہے اور : چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے ' کے مصداق مکمل بغاوت یا مکمل اطاعت ہی ان کے لیے دو راستے تھے اور انھوں نے دوسرے راستے کا انتخاب کر لیا تھا اور اب وہ اس کے لیے اپنی شکست خوردگی کے احساس کو مٹانے کے لیے عقلی توجیہیں ڈھونڈ رہے تھے - چنانچہ اب اسی مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

داد و دانش را بهم پیوستہ اند	هند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کز سنگ بیروں آورند	ایں هنر منداں ز خس چوں آورند

تا چہ افسوں خواندہ اند ایناں بر آب　　دود کشتی را ہمی راند در آب

نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند　　حرف چوں طائر بپرواز آورند

مندرجہ بالا اشعار میں آپ غالب کو برطانوی آئین کا ثنا خواں دیکھ رہے ہیں اور پھر بجلی، دخانی کشتی، گراموفون ریکارڈ اور ٹیلیگراف جیسے دریافتوں اور ایجادوں کے مدح خواں دیکھتے ہیں اور انھیں مظاہر کو حکمرانی کے لیے بطور اسناد سمجھتے ہیں۔

یہ کسی حد تک غالب کی وہ سیاسی جمالیات ہے جو انھیں کسی صورت حال کے رد و قبول کے لیے کچھ مظاہر و اشیا کی موجودگی سے تجزیہ کی طرف لے جاتی ہے اور وہ اپنی پسند و نا پسند کے بڑے دائروں میں ہمیں سیاسی و سماجی فیصلے کرتے ہوئے ملتے ہیں تو ہم ان فیصلوں کو ان کے ذوق سمجھ کر (جو چہار مقالہ میں مندرج چوتھی حس بھی ہے) صرف ذات کی حد تک رکھتے ہیں اور انھیں ایک ایسا جبر نہیں ٹھہراتے جس کا زہر ذہین افراد بسرو چشم پی لیتے ہیں۔

غالب کی جمالیات ان حالات میں پوشیدہ ہے جن سے وہ گزرے جمالیات، خوشبو، حسن، موسم کی نیرنگیاں، شراب پرتگیزی وغیرہ اس شعر میں نہ دیکھی جائیں:

ہموارہ ذوق مستی و لہو و سرور و سور

پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

اس لیے کہ یہ تو غالب کا رویہ ہے اور رویہ فکر کا عکس ہوتا ہے، فکر نہیں ہوتا۔ ہم فکر کو ان بڑے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں جو بڑے اذہان سے موسوم کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب بلا کے حسن پرست تھے۔ تحریر میں ارژنگ مانی اور تصویر میں پری پیکر بہزاد کی طرف لپکنا تو کایستھوں کا شیوہ بھی بن چکا تھا، لیکن غالب اور گہرائی میں جا کر: بوئے جوئے مولیاں آید ہمی، اور حافظ و سعدی کی سر زمین کی علمی و فکری فضا میں رچے بسے تھے اور ان کے یہاں اشارے اور کنائے بھی ساسانی دور کے آجایا کرتے تھے۔ اپنے استاد کو جاماسپ اور بزرجمہر کے حوالوں سے سمجھنے والا ذہن، زرتشتی اور مجوسی فکر کے خیر و شر کی تکرار اور الوہیت کو بھی عقل کی سان پر سمجھنے والا دماغ تو رکھتا ہی تھا، حالانکہ وہ

اس خطے سے تعلق رکھتے تھے جو جیحون و سیحون کی وادی کا تھا لیکن زرتشی اثرات نے جس ایرانیت کو جنم دیا تھا اس میں وہ خطے بھی شامل تھے۔

غالب کا جمالیاتی وجود ان کے رد عمل کے سلسلوں میں دیکھا جائے جو انھیں نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے پر اکساتا ہے - وہ انگریزی اثرات کو دیکھ کر وہی چیخ بلند کرتے ہیں جو عربوں کے مفتوح ایران نے بلند کی تھی اور پھر اس موڑ پر آجاتے ہیں جہاں عربوں سے مقابلہ انھی کی زبان اور بودو باش اپنا کر کیا جا سکتا ہے - میں اُن حضرات کے لیے جو جمالیات سے مراد صرف حسن پرستی لیتے ہیں ، یہ عرض کروں گا کہ غالب بلا کے حسن پرست تھے اور انھوں نے اپنے اشعار میں حسن کی جس ندرت جوئی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا عکس عبدالرحمن چغتائی کے مرقعوں میں کسی حد تک آ گیا ہے۔ عجمی فنون لطیفہ سے غالب کا گہرا ربط تھا اور حسن کو Transient دیکھ کر جو تاسف انھیں ہوتا تھا ، وہ غالباً عشق کی دوامی کیفیت سے پورا ہو جاتا تھا جسے وہ کائنات کی غایت سمجھتے تھے ، لیکن غالب کے یہاں عشق زیادہ تر مجازی اصطلاح کے طور پر آتا ہے :

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

اور اگر ہم اسے حافظ کے اس شعر کی روشنی میں دیکھیں :

سعی سپہر و دور قمر را چہ اختیار
درگردش اند بر حسب اختیار دوست

اور پھر ان دو اشعار کے فوراً بعد یہ شعر پڑھیں :

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد		عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنی تمام تر زمینیت کے باوجود بھی برکلے کے فلسفے سے کس قدر متاثر تھے - برکلے کا فلسفہ ممکن ہے کہ اُن تک ملتے جلتے عجمی و عربی فلسفے کی باز گشتوں کے ذریعے آیا ہو - کیونکہ برکلے کے یہاں کافی حد تک شیخ الاشراق اور عراقی کی فکر کا توارد ہے - غالب کے قریبی انگریز دوستوں کا حلقہ بھی مشرقی علوم سے بہت متاثر تھا - ہزلی اسٹیورٹ ریڈ ، ریٹگن اور ولیم فریزر سے غالب ، اردو فارسی ادب اور مغربی فکر ہی پر گفتگو کرتے ہوں گے -

غالب کی حسن پرستی انہیں باطنی اور ظاہری کثافتوں کی آرائشوں سے دور رکھنا چاہتی ہے اور یہ حکم ہم ان سب حضرات پر لگا سکتے ہیں جو ایک خاص فکری پس منظر سے رد و قبول کی منزل سے گزرتے ہوں ۔ ایک عام آدمی کی حسن پرستی اور ایک صاحب فکر کی حسن پرستی میں سب سے بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ ذہین آدمی اپنی حسن پرستی کے با وصف اپنی آرا میں ایک خاص قسم کا ارتباط اور تعمیم پیدا کر لیتا ہے ۔ وہ اپنے تجربے کو اگر سبھی کا تجربہ بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو کم از کم اپنے تجربے کو ایک خاص قسم کی قابل ادراک ذہنی رو ضرور بنا دیتا ہے ۔ لیکن خالص فلسفیانہ اصطلاح کی روشنی میں حسن کا تغیراتی کردار اور عشق کی لازوال سعادت ایک ذہنی رویہ ہے جو اس بڑے دائرے سے تعلق رکھتا ہے جو انہیں اپنے مخصوص سماجی ڈھانچے کی زبوں حالی سے بھی ملا ۔ مغلیہ حکومت ان کے سن بلوغ کو پہنچتے ہی ختم ہو چکی تھی ۔ مرہٹوں اور سید احمد شہید کی تحریک کے زور کو توڑنے کے بعد اب انگریزوں کے لیے کوئی بیرونی خطرہ بھی نہیں رہا تھا ، کیونکہ افغانستان اور ایران میں اب وہ دم خم کہاں رہا تھا کہ وہ دوبارہ سندھ پار کر سکیں ۔ روس کی جانب سے بھی اب خطرہ اس لیے نہیں تھا کہ وسطی ایشیا میں روسی فتوحات کا سلسلہ ۱۸۶۰ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے ۔

پس غالب کسی بیرونی امداد کے منتظر بھی نہیں تھے ۔ اس لیے ان کی شکست خوردگی مکمل تھی ۔ ان کے لیے انگریزی سامراج ایک ایسی حقیقت تھا جس سے متصادم ہونا ہلاکت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا ۔ لیکن غالب نے ان شکستوں اور مضرتوں میں بھی پناہ کے گوشے تلاش کر لیے تھے اور وہ کافی صحت مند انداز کے ساتھ ردعمل دے رہے تھے :

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آیینۂ باد بہاری کا

غالب کے یہاں عقل پرستی جہاں خود ان کی اپنی ذہنی روایت نے پیدا کی ، وہیں بیرونی استعمار کی ٹیکنکی علامتیں اور خاص طور پر ٹیلیگراف کو بھی بہت دخل ہے ۔ یہ علامتیں بہت سے توہمات کو باطل کرنے کے لیے کافی تھیں اور عقل کو لازمی ضرورت بنانے پر دال ۔ غالب کی فکر میں ایک خاص قسم کی نتائجیت Pragmatism کا پیدا ہو جانا ایک ضروری امر تھا ۔ غالب کے یہاں تشکیک سے جو دائرہ بنا وہ سر سید کے یہاں بھرپور عقل پسندی اور اقبال کے یہاں اس پوری تحریک کے ردعمل کی صورت میں غیر عقلیت پسندی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے ۔ لیکن اس پورے فکری سلسلے کے دھانے پر غالب اپنی پرتگیزی دو آتشہ کو ساتھ لیے نظر آتے ہیں ۔

ہمیں غالب کو برصغیر کی تاریخ اور اپنی ہی فکری روایت میں رہ کر مطالعہ کرنا چاہیے ۔ ہمیں فوراً ہی نظر آتا ہے کہ غالب نے جس معاشرے میں جنم لیا تھا وہ عقیدہ پرستی کے بھیانک جمود میں گرفتار تھا اور اس صورت‌حال کے خاتمے کے لیے کسی اندرونی انقلاب یا کسی طاقت ور خارجی محرک کی ضرورت تھی ۔ اندرون معاشرہ تو ژولیدگی کا سرطان پھیل ہی رہا تھا اور کافی وقت گزرنے پر معلوم ہوا کہ ہزاروں میل دور سے آئے ہوئے تاجروں نے ہندوستان کی مارکیٹ کے ساتھ ساتھ ہندوستان پر بھی قبضہ کر لیا ہے ۔ فتح کی کنجی مشین ہے ۔ مشینی انقلاب اور اب اس مشینی انقلاب کے جلو میں وہ طاقتیں ابھریں گی جو مشین کی کوکھ سے پھوٹتی ہیں ۔ اس کے لیے تعلیم کے مروجہ طریقے میں تبدیلی اور زندگی گزارنے کے لیے بنیادی نقطۂ نظر میں تبدیلی لانی ضروری تھی ۔ غالب جدید مسلم ہند میں اس تبدیلی کے

غالباً پہلے خواہاں تھے - نہیں دوسرے پہلے شاہ عبد العزیز رحمہ
جنہوں نے سر سید سے پچاس سال پہلے یہ فتویٰ صادر کر دیا تھا کہ د
کالج میں مسلمان بچے انگریزی تعلیم حاصل کریں - لیکن ادب و فکر
میدان سے غالب کی آواز پہلی آواز تھی اور آن کی سیاسی جمالہ
کیا تھی :

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غالب کی صحیح تاریخ پیدایش

مذکورہ عنوان سے جو مقالہ زیر نظر شمارے میں شامل ہے، اس کے صفحہ ۱۰ کی سطر ۱۶ ، ۱۷ میں ایک جملہ اس صورت میں طبع ہوا ہے : ''حوت میں اوج اور سنبلہ میں حضیض واقع ہے''- یہ سہو طباعت ہے، اسے یوں پڑھا جائے : ''سنبلہ میں اوج اور حوت میں حضیض واقع ہے'' - (ادارہ)

کچھ تلامذہ غالب کے بارے میں

کاب علی خاں فائق

مالک رام کی تالیف ' تلامذہ غالب ' غالب کے شاگردوں کے سلسلے میں بہت اہم ہے ، لیکن ہر مصنف اور مولف کا کام حرف آخر نہیں ہوتا ہے ، اس لیے فاضل مولف کی نظر سے بعض شاگرد اوجھل رہ گئے ، اور بعض شاگردوں کے مکمل حالات فراہم نہ ہو سکے ۔ کچھ شاعروں کو غلط فہمی کے باعث بہ زمرۂ شاگردان داخل کتاب کر لیا گیا ۔ یہ سرسری جائزہ اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ فاضل مولف آیندہ اڈیشن میں امور ذیل پر غور فرما سکیں ۔

مالک رام نے سید محمد سلطان تخلص عاقل کو تلامذۂ غالب میں شمار کیا ہے ۔ ساتھ ہی شاگردی کے بارے میں شبہ بھی ظاہر کیا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

"غالب ۱۵- فروری سنہ ۱۸۶۹ء (۲- ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ ھ) کو فوت ہوئے ہیں ، گویا اس وقت عاقل کی عمر عزیز پندرہ برس سے زیادہ نہیں تھی - اتنی کم عمری میں انھوں نے غالب سے کیا استفادہ کیا ہوگا ۔ ممکن ہے چند ابتدائی غزلیں دکھائی ہوں ، اگرچہ مرزا کی آخری ایام کی تندرستی کے پیش نظر یہ بھی محل نظر ہے" - [تلامذۂ غالب ، ص ۲۲۷] -

اس صورت حال کے پیش نظر عاقل کو تلامذۂ غالب میں شمار کرنا تعجب خیز ہے ۔ یادگار ضیغم کے مولف کے بیان سے قطعاً غالب کی شاگردی ظاہر نہیں ہوتی ۔ عبداللہ خاں ضیغم کا بیان ہے کہ :

" عاقل تخلص ، سید محمد سلطان نام ، یہ دھلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی اور ہر قسم کے علم کی طرف توجہ کی ، کچھ روزوں مرزا

اسداللہ خاں غالبؔ مرحوم دہلوی کی صحبت میں حاضر ہوتے رہے اور فن شعر کی طرف رغبت بڑھی۔ اسی اثنا میں بنارس آئے ... بنارس آتے ہی میر وزیر حسین مرحوم پھکیت سفید پوش کی دختر کے ساتھ شادی ہوگئی ، وہ ان کے خالو بھی ہوتے تھے ۔ جوکہ دہلی ہی سے طبیعت میں مذاق سخن تھا ، ان شعر کی طرف زیادہ توجہ کی اور صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ اب خود استاد ہیں ۔ حیدرآباد دکن میں ایک مطبع جاری کر کے ' اخبار آصفی ' شائع کر رکھا ہے ، اکثر امرا اس ریاست میں ان کے شاگرد ہیں ۔ طبیعت میں شوخی اور چستی بھری ہوئی ہے ۔ عمر قریب چھتیس برس کے ہے "۔

[یادگار ضیغم ، عبداللہ خاں ضیغم ، ص ۲۲۸]

ضیغم نے عاقل کے حالات اس کی زندگی میں لکھے ہیں ، اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عاقل کے حالات سے با خبر ہے ۔ عاقل اس وقت حیدرآباد دکن میں مقیم تھا اور ضیغم نے تذکرہ وہیں لکھا ہے ۔ اگر عاقل نے غالب سے اصلاح لی ہوتی تو ضیغم اس کا ذکر تفصیلاً بیان کرتا ۔ غالب کی خدمت میں حاضر ہونے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس نے مشورۂ سخن کیا ہو ۔ قربان علی بیگ سالک کے ہمسائے میں غالب رہتے تھے ۔ سالک کے غالب سے خصوصی تعلقات تھے ، وہ ان کے شاگرد بھی تھے ۔ ان کا بھائی شمشاد علی بیگ رضوان بھی غالب کا شاگرد تھا ۔ جب سالک ملازم ہوکر الور چلے گئے تو ان کے بیٹے مرزا محمد کا آنا جانا غالب کے یہاں رہتا تھا ۔ اس کا ذکر غالب کے ایک خط میں ملتا ہے ، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مرزا محمد نے غالب سے بچپن میں اصلاح حاصل کی ہوگی ، کسی طرح درست نہ ہوگا ۔ عاقل کا لڑکپن میں غالب کے یہاں آنا جانا بھی خصوصی تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے ، شاگردی کا ثبوت نہیں ۔ غالب سے اصلاح لینا چنداں مشکل نہ تھا ۔ وہ ان کے یہاں آور و رفت رکھتا تھا اور غالب سے اس قدر قربت رکھتے ہوئے کسی وقت بھی اپنے کلام پر اصلاح لے سکتا تھا ۔ بہت سے شعرا کے حالات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بارہ سال کی عمر میں شعر گوئی کا ذوق پیدا ہونا اور اصلاح لینا اس عہد کا دستور تھا ۔ داغ اور ظہیر دہلوی وغیرہ نے ذوق سے اسی عمر میں اصلاح لی ہے ۔ ۱۸۶۰ء یا ۱۸۶۶ء میں عاقل کے لیے شعر کہنا اور اصلاح لینا آسان تھا ، لیکن جب عاقل نے شاگردی کا دعویٰ نہیں کیا ہے تو اسے کس طرح زمرۂ شاگردان غالب میں داخل کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح مالک رام صاحب کا عاقل کو تلامذۂ غالب میں داخل کرنا خود ان کے قیاسات کی تردید ہے اور شواہد کے بھی خلاف ہے ۔

اس مثال کے خلاف مالک رام نے بنواری لال شعلہ کا ذکر بال مکند بے صبر کے شاگرد کی حیثیت سے کیا ہے ، اور تلامذۂ غالب میں اسے داخل نہیں کیا ہے ۔ اُن کا بیان ہے :

" بے صبر ، منشی بال مکند سکندر آبادی ، ان کے بہت شاگرد تھے جن میں بنواری لال شعلہ زیادہ مشہور ہوئے "۔

[تلامذہ غالب ، ص ۵۴ ، ۵۵]

مولف یادگار ضیغم نے شعلہ کو بال مکند بے صبر اور غالب کا شاگرد ظاہر کیا ہے ۔ مالک رام کے پیش نظر تذکرۂ یادگار ضیغم ہے ، انہوں نے ضیغم کے بیان کی نہ تائید کی ہے نہ تردید ، غالباً سہواً ضیغم کا بیان وہ نہیں دیکھ سکے ۔ ان کی نظر میں برق سیتاپوری مولف ' تذکرۂ بہار سخن ' کا بیان رہا۔ برق نے غالب کی شاگردی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ بشاش مولف تذکرۂ ' شعرائے ہنود ' نے غالب کی شاگردی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں مولف تذکرۂ ضیغم کا بیان زیادہ معتبر ہے ، وہ تحریر کرتا ہے :

" شعلہ تخلص ، بنواری لال نام ابن منشی موتی لال مرحوم ، وطن اصلی فیروز حصار (کذا) ملک پنجاب ہے۔ ولادت ان کی مقام سہارن پور میں ہوئی ، اب چودہ برس سے علی گڑھ میں وکالت کرتے ہیں ۔ عمر قریب اڑتیس برس کے ہے ۔ ابتدائے عمر سے شاعری کا شوق ہے ۔ پہلے منشی بالمکن [کذا] سے تلمذ تھا ، بعدہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی مغفور کے شاگرد ہوئے ۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی ، ایک رسالۂ شطرنج ان کی تصنیف سے ہے ۔ یہ کلام ہے :

ہجر میں اور بھی مشکل ہے اکلنا دم کا
میں اسی بات پہ مرتا تھا کہ آساں ہوگا

اک قدم چل کے دو عالم کو کروگے پامال
پاؤں رکھو گے جہاں گنج شہیداں ہوگا

شعلہ چھٹتا ہے کہیں شوق سخن تا دم زیست
رشتۂ عمر سے شیرازۂ دیوان ہوگا "

[یادگار ضیغم ، عبداللہ خاں ضیغم ، ص ۱۹۶ - ۱۹۵]

ضیغم نے معاصرین کے حالات بہت کاوش سے جمع کیے تھے ، تصانیف کا حوالہ اور شاگردی کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ شعلہ کے تحریر کردہ حالات بجنسہ داخل تذکرہ کر لیے گئے ہیں ۔ اس طرح یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ شعلہ نے آغاز شاعری میں منشی بال مکند بے صبر سے مشورہ کیا اور اس کے بعد غالب کے تلامذہ میں داخل ہوگیا ۔ ' بہار سخن ' کے مولف نے شعلہ کا سال ولادت ۱۸۴۵ء اور سال وفات ۱۹۰۳ء (رام نومی کے دن) لکھا ہے ۔ اس طرح غالب کی وفات کے وقت ۱۸۶۹ء میں وہ چوبیس سالہ جوان تھا اور غالب سے مشق سخن اگر سولہ سال کی عمر میں بھی کی ہو تو سال اصلاح ۱۸۶۰ء متعین ہوتا ہے ۔

محمد عاشق حسین خاں عاشق اکبر آبادی کا حال مالک رام نے ' سخن شعرا ' سے لکھا ہے ۔ اس تذکرے میں عاشق کا ایک شعر دیا گیا ہے ۔ حالات کے ذیل میں ولدیت محمد مشتاق حسین خاں اور سکونت آگرہ لکھی ہے ۔ نساخ نے بارہ برس کی محنت کے بعد ۱۲۸۱ھ میں اپنا تذکرہ مرتب کیا تھا اور ۱۲۹۱ھ (اکتوبر ۱۸۷۴ء) میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے یہ تذکرہ چھپا تھا ۔ اس سے عاشق کے حالات واضح ہوتے ہیں ۔ میرے پیش نظر گلدستہ ' خیال یار ' آگرہ فروری سنہ ۱۸۹۱ء مرتبۂ میر نثار علی کا اقتباس ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ عاشق ۱۸۹۱ء میں زندہ تھا اور ریاست اودے پور میں تھانے دار کی حیثیت سے ملازم تھا ۔ ذیل میں غزل اور عبارت مندرجۂ گلدستہ ' خیال یار ' پیش کی جاتی ہے :

" عاشق ، عاشق حسین خاں شاگرد غالب مرحوم ، تھانہ دار قصبہ بھوڑا (کذا) علاقہ اودے پور :

اتنا دلچسپ نہ جنت کا گلستاں نکلا
جی بہلانے کا محل کوچۂ جاناں نکلا
دیتی تکلیف بہت تیرگیٔ راہ عدم
داغ دل اپنا چراغ تہ داماں نکلا
ایک دل داغ ہزاروں یہ تری قدرت ہے
غنچہ سمجھا جسے یارب وہ گلستاں نکلا

کب ملا حسن میں تیرے لب و دنداں کا جواب
ماہ نو تاروں میں انگشت بدنداں نکلا
درد انگیز ہے واماندگیٔ اہل جہاں
جس کو راحت کا محل سمجھے تھے زنداں نکلا
ہاتھ میں زور جنوں مایۂ سودا سر میں
تیرے کوچے سے نہ میں بے سروساماں نکلا
ملتفت گر نہ ہوا یار کا شکوہ کیا ہے
یار آمادۂ صد پرسش پنہاں نکلا
منتوں کی میں کشاکش سے چھٹا شکر خدا
عشق تیرا بت کافر جز ایماں نکلا
نور خورشید سے عاشق ہے ضیا تاروں میں
چربہ غالب کے سخن کا ترا دیواں نکلا "

اب چند ایسے شاگرد پیش کیے جاتے ہیں جن کا ذکر 'تلامذۂ غالب ' میں نہیں ہے۔

افضل علی ابر تخلص ، بلند شہر کے مدرسے میں ہیڈ مولوی تھے ۔ اردو میں شیفتہ سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور فارسی میں غالب سے اصلاح لیا کرتے تھے ۔ مولف ' یادگار ضیغم ' نے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

" ابر تخلص ، افضل علی نام ابن میر اکبر علی ، جد امجد ان کے موضع سیکری تحصیل جان سٹھ ضلع مظفر نگر میں رہتے تھے ۔ یہ مدت سے بلند شہر میں سکونت پذیر ہیں اور ہیڈ مولوی مدرسۂ بلند شہر ہیں ، عربی و فارسی میں تو لائق ہیں ، ریاضی میں خط نسخ اپنے ہم عصروں پر کھینچا ہے ۔ عمر اڑتالیس برس کی ہے ۔ فارسی میں اسد اللہ خاں غالب مرحوم دہلوی کے شاگرد ہیں ۔ اردو میں مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم دہلوی سے جو مومن خاں کے ارشد تلامذہ سے تھے ، تلمذ ہے ۔ شوق شاعری ابتدائے عمر سے تا حال مساوی ہے "۔
[یادگار ضیغم ، صفحہ ۳۵]

محمد دلاور علی ثاقب تخلص کو بھی ضیغم نے شاگرد غالب لکھا ہے ۔ ان کا ذکر بھی سہواً مالک رام سے رہ گیا ہے ، ضیغم کا بیان ہے :

'' ثاقب ، محمد دلاور علی نام ، سادات عظام سے ہیں ۔ وطن اصلی ھاپوڑ ہے ۔ فی الحال ریاست الور میں بہ عہدۂ تحصیل داری ملازم ہیں ۔ شطرنج خوب کھیلتے ہیں ، پتنگ خوب لڑاتے ہیں ۔ فن شعر میں غالب مرحوم اور ہر گوپال تفتہ سکندر آبادی کے شاگرد ہیں ۔ فارسی اکثر کہتے ہیں ، اردو کے اشعار ہاتھ نہ آئے '' ۔

[تذکرہ یاد گار ضیغم ، صفحات ۹۳ ، ۹۴]

فتح محمد تائب لکھنؤ سے ایک دہ روزہ اخبار ' انوار الاخبار ' کے نام سے نکالا کرتے تھے ۔ اس کا ضمیمہ ' گلدستۂ شعرا ' کے نام سے چھپتا تھا ۔ یکم نومبر ۱۸۷۲ء کے پرچے کا اقتباس میرے پیش نظر ہے ۔ انوارالاخبار جلد ۳، گلدستہ شعرا نمبر ۳۰ میں غالب کے ایک شاگرد کا کلام چھپا ہے ۔ سلطان ٹیپو کی نسل سے ایک صاحب نواب محمد حسین علی سلطان ، نسیم تخلص کرتے تھے ۔ ان کا کلام شامل گلدستہ ہے ۔ حالات کی سطر یہ ہے :

'' نواب محمد حسین علی سلطان متخلص بہ نسیم ، جاگیر دار ، نبیرۂ ٹیپوسلطان ، شاگرد غالب دھلوی از مدراس '' ۔

میرے منتخب دو شعر یہ ہیں :

پیام بر کا ہے رشتہ کسی پیمبر سے
ہے جبرئیل کو رشتہ ترے کبوتر سے
وہ آدمی ہے تو ، دیکھیں جو تیری صورت کو
بلائیں لیں گے پری زاد پاؤں تک سر سے

گلدستۂ 'داغ جگر' کے نام سے مئی ۱۸۸۸ء میں محمد افتخارعلی تخلص جگر شاگرد داغ نے ضلع سیتاپور سے ایک گلدستہ نکالا تھا ۔ اس کے تیسرے شمارے میں (جو ۲ نومبر ۱۸۸۸ء کو مطبع صبح صادق سیتاپور میں چھپا تھا) منشی تہورعلی شاگرد غالب کی غزل چھپی تھی ۔ اس غزل کے تین شعر میری بیاض میں درج ہیں ۔ گلدستے میں صرف اسی قدر حوالہ درج ہے :

'' تہور ، منشی تہور علی سابق منیجر گلدستۂ عطارد قنوج ، شاگرد غالب'' ۔

تین شعر یہ ہیں :

گھر نہ کیوں غیرت گلشن ہو سراسر اپنا
آ کے مہمان ہوا وہ سرو سمن بر اپنا

خوف محشر کا نہ مے پینے سے دکھلا زاہد
ہے مددگار وہاں ساقیٔ کوثر اپنا

میں تہ بام ہوں وہ بام پہ جلوہ افگن
میں ہوں بالائے زمیں ، چرخ پہ اختر اپنا

راقم الحروف نے بھی ۱۹۳۹ء میں غالب کے ایک نام نہاد شاگرد سے رام پور میں ملاقات کی تھی- ۱۹۳۸ء میں میری تحریک سے عتیق الرحمٰن خاں کلیم (مرحوم) شاگرد امیر اللہ تسلیم نے انتخاب یادگار (مولفہ منشی امیر احمد امیر مینائی) کا تتمہ لکھنا شروع کیا - کچھ تذکرے میں نے فراہم کیے نیز جو مواد میں اسی سلسلے میں جمع کرچکا تھا ، وہ کلیم کے حوالے کردیا - قائم چاندپوری مولد ، رامپوری مدفن ، کے حالات کے تجسس میں کلیم مراد آباد گئے - وہاں حکیم مسیح الزماں مغلوب مرادآبادی سے ملاقات ہوئی - مغلوب کی بہو قائم کی نسل سے تھی - مغلوب نے بتایا کہ وہ رام پور میں رہ چکے ہیں ، اس لیے کلیم نے ان کے حالات اور اشعار لکھ لیے - مغلوب سے کہا کہ آپ رام پور آئیں - مغلوب رام پور آئے اور میں نے کلیم کے یہاں مغلوب کو دیکھا - خمیدہ کمر ، منحنی الجثہ اور بہت ضعیف تھے - عمر سو کے قریب بتائی - میں نے پوچھا کس عمر میں آپ نے غالب کی شاگردی اختیار کی تھی ، جواب دیا کہ میں بارہ سال کا ہوں گا ، مجھے شاعری کا شوق ہوا تو دہلی پہنچا - پہلے مومن خاں کے یہاں پہنچا ، وہ مکان پر نہیں تھے - پھر پتا پوچھ کر غالب کے یہاں گیا ، غالب نے مجھے بلا لیا اور شفقت سے پیش آئے اور میرے شوق کو دیکھ کر شاگرد کر لیا -

میں نے مغلوب کے بیان کو اس وقت باور نہیں کیا تھا ، اس لیے کہ ۱۲۶۸ھ مومن خاں کا سال وفات ہے اور مومن خاں کی حیات میں دہلی جانے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کم سے کم ۱۲۵۰ھ کے قریب مغلوب دہلی پہنچے ہوں -

کلیم کا تذکرہ " رباض نامداراں " مکمل ہوچکا تھا لیکن ان کے انتقال باعث طبع نہ ہوسکا ۔ مغلوب کے تفصیلی حالات کلیم نے لکھے تھے۔ اگر مغ بیان کا اختلال حواس پر مبنی نہ ہو اور تخلص کی معنویت پر لحاظ کیا جائے غالب کے ایک اور شاگرد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

سبد باغ دو در

۱۲۸۳ھ

مصنفه

میرزا اسد الله خان غالب

تعارف ، تلخیص ، حواشی

امتیاز علی عرشی

فہرست

تعارف

میرزا غالب نے کلیات نظم فارسی کی طباعت کے بعد 'سبد چین' کے نام سے اپنے وہ شعر اکھٹے کیے تھے ، جو یا تو سہواً کلیات میں درج نہ ہو سکے ، یا اس کی طباعت کے بعد کہے تھے - خیال یہ تھا کہ یہ تتمہ ان کی آخری فارسی تالیف ہے - مگر سید وزیر الحسن عابدی صاحب کو 'باغ دو در' کے نام سے ایک ایسا مجموعہ دستیاب ہوا جو غالب کی کلیات نظم و نثر دونوں کا تتمہ کہا جا سکتا ہے -

موصوف الذکر نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ رسالہ 'آج کل' ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء) میں تحریر فرمایا ہے :

> " میرے پاس اس مجموعے کا اصل نسخہ ہے جس کی کتابت ، طباعت کی غرض سے مصنف (غالب) کی زندگی میں سنہ ۱۲۸۳ھ میں شروع ہوئی تھی اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد ۷ ربیع الآخر ۱۲۸۷ھ کو ختم ہوئی - مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی - 'سبد باغ دو در' غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغاز کتابت کا سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے - جیسا کہ خاتمے کی عبارت میں درج ہے ، کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کی فرمائش پر لکھا تھا - یہ منشی ہیرا سنگھ حوض قاضی کے قریب گندی گلی میں رہتے تھے - اس نسخے میں بعض اشارات سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گزرا تھا " -

اس عبارت کے ایک حصے کی بنیاد دیباچے کے اس جملے پر ہے کہ :
" از انجا کہ سبد باغ دو در یک هزار و دو صد و هشتاد و سه عدد دارد -

و از روی حسن اتفاق با آغاز نگارش این صحیفہ مطابق افتاد ، این نام لطفِ دیگر دارد '' ۔

بقیہ معلومات اس خاتمۂ کاتب پر مبنی ہیں :

'' آفریدگار مہر و ماہ را سپاس کہ دریں زمان فرخندہ توامان کتاب فیض انتساب سبد چین از تصنیف جناب والا شان شہنشاہ قلمرو سخن گستری ، یکہ تاز عرصۂ معنی پروری ، علامۂ عصر ، بانی مبانی نظم و نثر ، رشک عرفی و طالب، نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں غالب رحمتہ اللہ علیہ ، حسب فرمایش منشی ہیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دہلی واقع کوچۂ گندھی گلی کہ یکی از شاگردان حضرت مصنف اند بخط بد نمط احقر العباد عنایت علی بتاریخ ہفتم جولائی ۱۸۷۰ء روز پنجشنبہ صورت اختتام پزیرفت '' ۔

مجھے یہاں دو تین باتیں عرض کرنا ہیں ، پہلی یہ کہ ' سبد چین ' باغ دو در ' سے پہلے کی تالیف معلوم ہوتی ہے ، کیونکہ باغ کے دیباچے میں اس کا ذکر ہے ۔ مرزا صاحب نے فرمایا ہے حصۂ نظم (سبد چین) کی ترتیب کے بعد بعض دوست حصۂ نثر کا مواد لائے ۔

دوسری یہ کہ ۱۲۸۳ھ کتابت کے آغاز کی نہیں ، بلکہ تالیف کے آغاز کی تاریخ ہے ۔ کیونکہ یہ کتاب اتنی بڑی نہیں کہ اس کے لکھنے میں ایک سال ۳ مہینے اور ۲۲ دن صرف ہوتے ۔ میری رائے میں باغ کے زیر نظر مخطوطے کی کتابت کا آغاز و انجام دونوں میرزا صاحب کی وفات کے بعد ہو ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ' سبد چین ' ۱۲۸۳ سے پہلے کی تالیف ہے ، اس لیے کہ یہ سنہ تو ' سبد باغ دو در ' سے برآمد ہوتا ہے جو بعد کو اختیار کیا گیا ہے ۔

تیسری بات یہ کہ کتاب کے آغاز میں ایک بادامی ورق چسپاں ہے ، اس پر معمولی بلکہ برے اور کچے خط میں لکھا ہے :

'' ایزد کارساز را سپاس کہ این کتاب مستطاب بقیۂ دیوان فارسی موسوم بہ سبد چین و بعد اضافۂ مطالب دیگر نثر دیباچہ و تقریظ و مکاتیبات و یافتن خطاب ' سبد باغ دو در ' از تصنیف

جناب معلی القاب، زبدہ کملای اہل کمال، سخن سنج بے مثل و بے مثال، رشک عرفی و فخر طالب، جناب نجم الدولہ دبیرالملک مرزا اسد اللہ خاں غالب رحمتہ اللہ علیہ مشہور بہ مرزا نوشہ، حسب فرمایش منشی ہیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دہلی واقعہ کوچہ گندھی ڈلی بخط فقیر حقیر عنایت علی بتاریخ ...... ۱۸۷۳ء صورت اختتام پزیرفت "۔

اس تحریر کے اوپر لکھا ہے " خاتمہ از سرخی"۔ اس تحریر نیز تاریخ کی جگہ سادہ چھوڑنے اور صرف سنہ لکھ دینے سے میں قیاس کرتا ہوں کہ ہیرا سنگھ نے اس کاتب سے ۱۸۷۳ء میں پیش نظر نسخے کی نقل کرائی تھی اور مندرجہ بالا عبارت اپنے قلم سے لکھ دی تھی تا کہ خاتمے میں سادی کی جگہ اسے درج کیا جائے۔

اس کتاب کا کاغذ ولایتی نیلا ہے۔ جدولیں سنہری ہیں، اندرونی دو شنجرفی اور بیرونی لاجوردی۔ باریک بھی لاجوردی ہے۔ اشعار کو باہم جدا کرنے والی لکیریں شنجرفی ہیں۔ متن کتاب سیاہ بخط نستعلیق اور عنوانات اور نظم میں تخلص شنجرفی ہیں، جگہ جگہ خطی اصلاحوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقابلہ بھی کیا گیا ہے مگر پھر بھی اغلاط کتابت کہیں کہیں موجود ہیں۔ مخطوطے میں کئی جگہ 'لا ـ الی' علامت حذف پائی جاتی ہے، جس کی نشان دہی حواشی میں کردی گئی ہے۔ بظاہر ہیرا سنگھ نے دوسری نقل میں علامت زدہ عبارتوں کو حذف کر دینے کے لیے کاتب کی ہدایت کے طور پر یہ علامت لکھ دی ہے۔ حصہ مکاتیب کے آغاز میں بھی ایک جگہ لکھا ہے " ازیں جا باید نوشت " یہ بھی ناقل کے لیے ہدایت ہے۔ ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ میرزا صاحب کے اصل نسخے سے زیر نظر نسخہ نقل ہوا ہو اور یہ ساری ہدایات خود میرزا صاحب کی ہوں مگر موجودہ نسخے میں یہ بالیقین میرزا صاحب کے قلم کی نہیں ہیں۔

اوراق مکتوبہ کی تعداد ۹۹ ہے۔ فی صفحہ ۱۰ سطریں ہیں اور ناپ فل سکیپ ہے۔ ترکیبی موجود ہیں۔ ورق ۱۱ ب کے حاشیے پر ۶ شعر اور ۲ الف کے حاشیے پر ۶ شعر کل ۱۲ شعر اس قطعے کے بڑھائے گئے ہیں:

ہر شب بقدح ریختنی بادہ گلفام

اور اس پر ۳ کا ہندسہ ڈالا ہے اور ۱۲ الف کے آخر میں یہ دو قطعے اس طرح تھے -

پہلا : دوبارہٴ اسم و سال مولود سعید

اور　　دوسرا : اندازہٴ اسم و سال مولود

ان میں سے دوسرے پر ہندسہ (۱) اور پہلے پر (۲) ڈالا گیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ پہلا، اندازہ الخ اور دوسرا، درباره الخ اور تیسرا، ہر شب الخ ہونا چاہیے -

موجودہ ترتیب میں اس کتاب کی تلخیص پیش کردی گئی ہے، بایں صورت کہ 'باغ دو در' کا وہ کلام جو سبد چین کی اشاعت اول (ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ) مطبوعہ مطبع محمدی دہلی اور اسی کتاب کی اشاعت دوم (۱۹۳۸ء) مرتبہ جناب مالک رام، شایع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی میں شامل ہو چکا تھا، اس کا صرف پہلا شعر حوالے کے لیے لے لیا گیا ہے اور دونوں اشاعتوں میں بحوالہ نظم کے اندراج کا حوالہ صفحہ نمبر اور تمام اشعار میں جو اختلاف یا سہو تھا، حواشی میں ظاہر کردیا گیا ہے - حواشی میں سبد ۱ سے اشاعت اول اور سبد ۲ سے اشاعت دوم مراد ہے -

لہذا ان حواشی سے فائدہ اٹھانے کے لیے سبد چین کی مذکورہ دونوں اشاعتیں یا کم از کم دوسری اشاعت سامنے ہونا چاہیے - ان دونوں اشاعتوں کے علاوہ بھی اگر وہ کسی مزید قابل ذکر جگہ شایع ہوا ہے تو اس کا سہو و اختلاف بھی درج کردیا ہے، مثلاً باغ دو در کے قطعہ نمبری ۲۲ کا پہلا شعر :

گفتم بخرد بخلوت انس　　کای شمع و چراغ ہفت ایوان

نقل کر کے حاشیے میں لکھا گیا :

" سبد ۱ ص ۳۰ و سبد ۲ ص ۶۴ و انشای نور چشم ص ۴۸ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۹ھ " -

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قطعہ مندرجہ بالا حوالوں کے مذکورہ صفحات پر درج ہوا ہے -

پھر حاشیے میں لکھا گیا ہے " باغ میں شعر ۵ کے اندر ' زانسو ' بدون یا ہے اور انشای نور چشم میں شعر ۲۳ کے اندر 'خواہش' کی جگہ 'مشکل' ہے اور

آخری شعر میں 'توقیع' کے عوض 'تعجیل' ہے اور سبد ۲ میں آخری شعر کے اندر 'عطا و بذل احسان' ہے'':

اس قطعے کا شعر نمبر ی ۵ یہ ہے:

این هر دو رسید و نیست پیدا   زانسوی اثری بهیچ عنوان

اور شعر نمبر ی ۲۳ یہ ہے:

من نیز طلب کنم برایش   این خواهش اگرچه نیست آسان

نیز آخری شعر یہ ہے:

توفیق جواب نامهٔ خویش   توقیع عطا و بذل و احسان

ان اشعار کے پیش نظر ہونے کے بعد متعلقہ حاشیے کو سمجھنا دشوار نہ ہوگا۔

باغ دودر کی زیر نظر تلخیص کے حواشی مکمل حصۂ نظم کو محیط ہیں۔ حصۂ نثر کے اختلاف نسخ و اغلاط کی نشاندھی اس وجہ سے چھوڑ دی گئی ہے کہ یہ تحریریں مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں جن کا فراہم کرنا قارئین کے لیے دشوار ہے۔

باغ کا آخری حصہ مکاتیب پر مشتمل ہے جو بیشتر غیر معروف ہیں، البتہ چند خطوط مطبوعہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ تمام خطوط حقیر عرشی کی مرتبہ آہنگ پنجم میں مع توضیحی حواشی کے شامل ہوں گے۔ آہنگ پنجم کی مذکورہ ترتیب میں غالب کے تقریباً پانچ سو خطوط جو تاحال دریافت ہوسکے ہیں، پیش کیے جا رہے ہیں۔ لیکن اس غرض سے کہ باغ کی کیفیت بڑی حد تک قارئین کے سامنے رہے، اس میں شریک خطوط کے مکتوب الیہم کے نام اور مکاتیب کا آغاز و انجام بھی نقل کردیا گیا ہے۔

باغ دو در کی زیارت مجھے صدیق مکرم ڈاکٹر اظہر علی صاحب استاد تاریخ سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی کے توسط سے ہوئی۔ میں موصوف کا نیز مالک کتاب جناب سید وزیر الحسن عابدی صاحب کا ممنون و متشکور ہوں کہ مجھے اس نادر کتاب کو استعمال کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

کتاب خانۂ عالیہ، رام پور   امتیاز علی عرشی

پس نوشت :

سبد باغ دو در کی تلخیص و حواشی نگاری کا کام کیے اتنی مدت گزر چکی ہے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ یہ کام میں نے کیا تھا ۔ چونکہ مالک کتاب عابدی صاحب اسے شایع کرنا چاہتے تھے ، اس لیے میں نے اشاعت روک دی تھی ۔ اب جو عزیز مکرم مشفق خواجہ صاحب سلمہ کی فرمائش رسالہ' اردو کے غالب نمبر کے لیے آئی اور پے بہ پے درپے تقاضے آئے تو اکبر سلمہ کو اس کا مسودہ یاد آیا ۔ انھوں نے میرے پرانے کاغذات سے اسے تلاش کیا اور اب غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے ۔ کئی سال ہوئے خود جناب عابدی نے بھی اس کتاب کا متن اورینٹل کالج میگزین میں شایع کر دیا ہے ۔ اس طرح میرے حواشی کو سمجھنے کے لیے سہولت پیدا ہو گئی ہے ۔ اب ڈاکٹر صاحب کے شایع کردہ متن کو بھی سبد چین طبع اول و دوم کے ساتھ پیش نظر رکھا جائے ۔ افسوس یہ ہے کہ میری حالیہ علالت نے اس امر کا موقع نہ دیا کہ مطبوعہ باغ دو در کے حوالے درج کیے جاسکتے ۔

بسم الله الرحمن الرحیم

دیباچه

دو در دارد این باغ آراسته
دروبند از هر دو برخاسته

بنامیزد 'سبد چین' میوه را گویند که پایان موسم بر شاخسار ماند، و چون آن را بچینند، شاخسار سراسر بی بار ماند ـ

هر آینه آنچه پس از انطباع کلیات فارسی گفته شد، یا آنچه هنگام فراهم آوردن نگارش دست بهم نداده بود، اینک در اوراق جداگانه ضبط کرده شد، و این را 'سبد چین' نامیده آمد ـ

دانم که فراهم آوردن ده هزار بیت کلیات چه کشود که ازین ابیات که در شمار بهزار نتواند رسید، خواهد کشود ـ ناسور کهن را از تراوش گزیر نیست - تا باید زیست، سخن باید گفت ـ ناچار تا زنده ام، این مجموعهٔ مقالات پریشان انتها نخواهد پزیرفت ـ چنانکه در علم و عمل ناتمام میگزرم؛ این نیز ناتمام خواهد ماند ـ

چون زنجیرهٔ نظم گران پزیرفت، ناگاه یاران نثری چند درآوردند ـ آن را نیز درین مجموعه گنجانیدم و 'باغ دو در' نامیدم ـ از آنجا که 'سبد باغ دو در' یک هزار و دو صد و هشتاد و سه عدد دارد، واز روی حسن

اتفاق با آغاز نگارش این صحیفہ مطابق افتاد، این نام لطفی دیگر دارد۔ فقط۔ (۱)

۱۔ اس دیباچے کا سر بیت اور 'نامور کہن را' سے آخر تک کی عبارت خاص اس کتاب کے لیے لکھی گئی ہے۔ پہلا پیرا وہی ہے جو 'سبد چین' کے لیے لکھا گیا تھا اور مطبع محمدی دہلی کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہے۔ دوسرے پیرے میں پہلے جملے کے خاتمے کے بعد سے شروع کر کے آخر تک عبارت یوں ہے: " و آنچہ یاران از دیرین مسودات داشتند و من ازان خبر نداشتم و اینک بمن رساندند، در اوراق جداگانہ ضبط کردہ شد، و آن را 'سبد چین' نام نہادہ آمد "۔ چوتھے پیراگراف کے ابتدائی جملے کے الفاظ میں معمولی تغیر کیا گیا ہے، یعنی: " دانم کہ فراہم آوردن کلیات کہ دہ ہزار بیت دارد، چہ کشود کہ ازیں ابیات کہ در شمار بہزار بیت نتواند رسید، خواہد کشود "۔ اور اس کے بعد یہ عبارت ہے جو باغ کے دیباچے میں محذوف ہے: "'تفرقہ' اقسام شعر و تقدیم و تاخیر و قید ردیف و سال بر نتافتہ ام۔ آنچہ گفتہ ام و از دیگران یافتہ ام، نگاشتہ ام۔ و اکنون نامور کہن را تراوش نماند، کلک از کف فرو گزاشتہ ام۔ سپس اگر سخنی در اندیشہ خواہد گزشت، روشناس صفحہ نخواہد شد، یارب، گسستن پیوند جان و تن بر من آسان باد، و دران دم جز حمد تو و نعت محمد علیہ السلام در دل و بر زبان مگزراد "۔

اس عبارت کے بدلے میں جو کچھ یہاں لکھا گیا ہے، وہ گویا عملی تجربے کے بعد سابق کی تردید ہے۔

پانچواں پیرا خاص 'باغ دو در' کے لیے لکھا گیا ہے، اور اس میں کتاب کا نام اور تاریخ تالیف کا ذکر ہے۔

قطعات

۱- قطعه (۲ بیت)

غالب این رنگین کتاب ' گلشن بے خار ' نام
روکش جنات تجری تحتہاالانہار ہست (۱)

۲- قطعه (۴ بیت)

احترام‌الدوله فرمان داد تا دل کشا گرمابه انجام یافت (۲)

۳- قطعه (۵ بیت)

در هزار و دو صد و شصت‌وشش از دنیا گزشت
بانوی شاه اود مریم مکانی نام او (۳)

۴- قطعه (۱۰ بیت)

سپهر مرتبه ، ای ویسرای کشور هند
کز التفات تو دل بشگفد چوگل ز نسیم (۴)

۵- قطعه (۱۲ بیت)

بزم نواب جم حشم محمود بوستانیست پر ز نعمت و ناز (۵)

۱- سبد ۱ ص ۲۴ و سبد ۲ ص ۳۵ و خاتمه گلشن بےخار ص ۳۶۵ طبع اول ۱۸۳۷ء و پنج آهنگ ص ۱۶۶ طبع ۱۸۵۳ء -

۲- سبد ۱ ص ۲۵ و سبد ۲ ص ۳۵ - ۳- ایضاً -

۴- مثنوی ابرگهربار : ۳۸ ، اکمل المطابع دهلی ۱۲۸۰ه و سبد ۱ ص ۲۵ و سبد ۲ ص ۳۶ -

۵- ایضاً ص ۲۶ و ایضاً ص ۳۷ -

۶- قطعه (۳ بیت)

فلک مرتبت منٹ گمری بهادر   که در سروری میکنی بادشاهی (۱)

۷- قطعه (۹ بیت)

در آخر دسمبر و آغاز جنوری   سال نوست و روز کلان روزگار را (۲)

۸- قطعه (۱۲ بیت)

نوروز و مهرگان نبود در طریق ما
اما شگفته روئی گلهای تر خوش است (۳)

۹- قطعه (۵ بیت)

دگر در سرستم که از روی مستی   شرابی به ساقی کوثر فرستم (۴)

۱۰- قطعه (۲ بیت)

جان عزیز است ، و اهل عزت را   عزت از جان عزیز تر باشد (۵)

۱۱- قطعه (۳ بیت)

ترا ، ای آفتاب عالم افروز   پس از نو روز سال نو مبارک (۶)

۱۲- قطعه (۴ بیت)

میر سعادت علی کرد در اجمیر طرح
مسجد و چاهی که هست چشمهٔ آب بقا (۷)

۱- ابر گہر بار : ۳۸ ، حاشیه و سبد ۱ ص ۲۶ و سبد ۲ ص ۳۸ -
۲- سبد ۱ ص ۲۷ و سبد ۲ ص ۳۹ -
۳- ایضاً -
۴- سبد ۱ ص ۲۸ و سبد ۲ ص ۴۰ -
۵- ایضا و سبد ۲ ص ۴۱ -
۶- ایضا -
۷- ابرگہر بار : ۳۹ - ایضاً - 'باغ' میں ''بدل اجر آن '' اور سبد ۱ میں '' بذل '' ہے -

۱۳- قطعہ (۴ بیت)

با خرد گفتم ، شہ فرزانہ فتح الملک را
خود چہ گویم ؟ گفت ، فخر دودۂ آدم بگو (۱)

۱۴- قطعہ (۲ بیت)

نہادہ بنا احسن اللہ خان   سر رہ بدانسان در داکسنا (۲)

۱۵- قطعہ (۲ بیت)

تاریخ وفات ذوق ، غالب   با خاطر دردمند ماوس (۳)

۱۶- قطعہ (۲ بیت)

با خرد گفتم ار تو فرمائی   شویم از دل خیال بادۂ ناب (۴)

۱۷- قطعہ (۳ بیت)

دیر کہ در روز حشر چوں تو بیفتی
بر سر دوزخ نہند تسرہ نہنبن (۵)

۱۸- قطعہ (۲ بیت)

من ز مقدم فرزند میرزا باقر   سروش تہنیت زبدۂ مطالب گفت (۶)

۱۹- قطعہ (۹ بیت)

صبحدم با ابوالبشر گفتم   پارۂ زر بدہ کہ زر داری (۷)

۱- ایضا و سبد ۲ ص ۳۲ -

۲- ایضا -

۳- سبد ۱ ص ۲۹ و ایضا - ۲ سبد میں '' دردمند و مایوس '' ہے -

۴- سبد ۱ ص ۲۹ و سبد ۲ ص ۳۳ -

۵- سبد ۱ ص ۲۹ و سبد ۲ ص ۳۳ - سبد ۱ میں پہلے شعر کے اندر ' نہیں ' ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے -

۶- ایضاً -

۷- ایضاً و سبد ۲ ص ۳۴ -

۲۰- قطعه (٥ بیت)

خواندی بنو بہار مرا جانب چمن
زیں برگہای سبز چہ گرد آورم نوا (۱)

۲۱- قطعه (۹ بیت)

روزی ز رہ ستم ظریفی　　بر لاشۂ جعفر چہارم (۲)

۲۲- قطعه (۲۷ بیت)

گفتم بحرد بخلوت المی　　کای شمع و چراغ هفت ایوان

۲۳- قطعه (۱۰ بیت)

هزار و دو صد و هشتاد و دو شمار کنید　　بحسب ضابطه از هجرت رسول الله (

۲۴- قطعه (۲ بیت)

خجسته جشن دبستان نشینی بیگم　　بفیض همت نواب و یمن اقبالش (

۱- ایضاً -

۲- سبد ۱ ص ۳۰ و سبد ۲ ص ٥۴ -

۳- ایضا و سبد ۲ ص ٦۴ - و انشای نور چشم ص ۸۴ ، مطبع نغا
کانپور سنہ ۱۲۸۹ھ -
باغ میں شعر ٥ کے اندر ' زانسو ' بدون یا ہے - اور انشای نور چ
میں شعر ۲۳ کے اندر ' خواهش ' کی جگہ ' مشکل ' ہے ، ا
آخری شعر میں ' توقیع ' کے عوض ' تعجیل ' ہے - سبد ۱ م
آخری شعر کے اندر ' بذل و احسان ' ہے -

۴- سبد ۱ ص ۳۱ و سبد ۲ ص ۴۸ - شعر ۷ میں سبد ۱ و ۲ م
' درناگاه ' ہے - شعر ۱۰ کے پہلے مصرعے کا آخری لفظ سبد کے دونوں نسخو
کی طرح باغ میں بھی ' ہگریز ' تھا مگر تصحیح کے وقت اسے چھیل
'' ہگزر '' بنایا گیا ہے ، جو موزوں تر ہے -

٥- سبد ۱ ص ۳۲ و سبد ۲ ص ۴۸ -

۲۵- قطعہ (۳ بیت)

چو نواب از بہر اجلاس کونسل به کلکته از رام پور آورد رخ (۱)

۲۶- قطعہ (۳۱ بیت)

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ
در خصوص گنمکوی پارس انشا کرده است (۲)

۲۷- قطعہ (۶ بیت)

نمایش کہی در خور شان خویش بر آراست نواب عالی جناب (۳)

۲۸- قطعہ (۲ بیت)

بحق باده چنیں حکم داده حاکم وقت
که نی برند ز شہر و نیاورند بشہر (۴)

۲۹- قطعہ (۲ بیت)

امروز شنیده ام که از مہر تقصیر پسر معاف کردی (۵)

۱- سبد ۱ ص ۳۲ و سبد ۲ ص ۴۹ و مکاتیب غالب ص ۸۶ طبع اول -

۲- ایضاً و سبد ۲ ص ۳۳ - و مکاتیب غالب ص ۱۷ طبع اول -
میرزا صاحب نے سب سے پہلے اسے یک رخہ اشتہار کی طرح چھاپ کر شایع کیا تھا - اس کے بعد سبد ۱ میں چھپا - بعد ازاں جواب اور جواب الجواب وغیرہ کے ساتھ "شمشیر تیز تر" کے شروع میں ۱۸۶۸ء میں چھاپا گیا - نیز ملاحظہ ہو مکاتیب غالب طبع اول ص ۱۷ - شعر ۱۰ میں "باغ" کے اندر "فرسود و در وی" ہے -

۳- سبد ۱ ص ۳۷ و سبد ۲ ص ۵۱ و مکاتیب غالب ص ۹۳ طبع اول - سبد ۱ میں "خدایا پسند و الخ" نہیں ہے -

۴- سبد ۱ ص ۳۷ و سبد ۲ ص ۵۲ - ان میں "حکم داد" ہے -

۵- ایضا - چوتھے مصرعے میں ان دونوں کے اندر "تنم" کی جگہ "نکنم" چھپ گیا ہے -

۳۰ - قطعہ (۱۵ بیت)

از دوست بہر بندہ زہی شیشہ ہای می
از بندہ سوی دوست بہر شیشہ یک سلام (۱)

۳۱ - قطعہ (۱۷ بیت)

پس از ادای سپاس خدای عز و جل		ثنای حضرت نواب میکنم انشا

۳۲ - قطعہ (۳ بیت)

الا ای شناسندہ' هندسہ		نباید کہ موجود فہمی مرا (

۳۳ - قطعہ (۳ بیت)

مفلس ، اگرش مال نباشد ، چہ کم است این
کز هیچ کس اندیشہ' آزار ندارد (۴)

۳۴ - قطعہ

کرنیل جارج ولیم هملٹن (۵)		فرخندہ حاکم ، فرزانہ داو

۱- ایضاً - سبد ۱ میں پہلے مصرعے میں ' زہی ' کی جگہ ' زہی ' ہے سبد ۲ کے حاشیے میں رسالہ' رومان لاہور کے فروری سنہ ۴۳ء کے پرچے کے حوالے سے ، جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ یہ قطعہ میرزا صاحب نے الگزنڈر اسکنر نام ان کے ایک منظوم خط کے جواب میں لکھا تھا ، اس قطعے کے لیے سبد ص ۳ ۵ و ۴ ۵ کا حاشیہ دیکھیے - سبد ۲ میں شعر ۳ کے اندر ' آن شراب کی جگہ ' این شراب ' چھپ گیا ہے - اسی طرح سبد ۲ ، شعر ۱۰ میں ' پوٹ وین ' کی جگہ ' پوٹ وائن ' لکھا گیا ہے -

۲- سبد ۱ ص ۳۹ و سبد ۲ ص ۵۵ -

۳- سبد ۱ ص ۳۹ و سبد ۲ ص ۵۶ - باغ میں شعر ۲ و ۳ میں ' یا کی جگہ ' با ' اور شعر ۳ میں ' بشارات ' کے عوض ' اشارات ' ہے -

۴- سبد ۱ ص ۲۰ و سبد ۲ ص ۵۶ - دوسرے شعر میں ' بردار د بدو کے معنی آٹھائی گیرا ، اور ' کیسہ بر ' کے معنی گنٹھ کٹا ہیں -

۵- میرزا صاحب نے لفظ ' جارج ' کی رای ساکن کو عام ہندوستانی لہجے کے مطابق بالفتح نظم کیا ہے - اس سے بدیسی الفاظ کے دیسی بگڑے تلفظ کی بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے -

صبح طرب را مہر درخشاں شام شرف را ماہ منور
در باغ دانش ، سر سبز گلشن در بحر بینش ، یک دانہ گوہر
صیت کمالش بر ہفت گردوں ذکر جمیلش در ہفت کشور
یا رب ، بگیتی با فر و شوکت پیوستہ بادا ایں داد گستر (۱)

۳۵- قطعہ

کرم پیشہ ڈپٹی کمشنر بہادر (۲) کہ نقش نگین دل ماست نامش
دراں بزم ہمچوں منی را چہ یارا کہ خم گشتہ گردوں ز بہر سلامش

۳۶- قطعہ

گویند : رای چھج مل (۳) شیریں کلام مرد
دیرینہ دوست رفت ازیں تنگ نا ، دریغ !
گفتم : کسی ز سال وفاتش نشاں دھد
غالب شنید و گفت ' چہ گویم : " بسا دریغ " ۱۲۷۷ھ

۳۷- قطعہ

گویند : رفت ذوق ز دنیا ، ستم نبرد
کاں گوہر گراں بہ تہ خشت و گل نہند (۴)

۱- یہ اور اگلے تین قطعے سبد میں نہیں ہیں -

۲- اپنے موجودہ وسائل کے پیش نظر میرے لیے ان ڈپٹی کمشنر صاحب کی شخصیت کا تعین دشوار ہے - لیکن یہ گمان غالب ہے کہ اس سے مراد اوبرائن صاحب ہوں ، جن کے سامنے میرزا صاحب کا دعوی ازالہ حیثیت عرفی بنام مولوی امین الدین مولف قاطع القاطع پیش ہوا تھا -

۳- رائے چھج مل ، منشی جواہر سنگھ جوہر ، شاگرد غالب کے والد تھے - ان کے نام غالب کے کئی فارسی خط شائع ہو چکے ہیں - جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ان سے بڑی پرانی دوستی تھی - چھج مل کا سنہ وفات پہلی بار ' باغ دودر ' کے اس قطعے سے معلوم ہوا ہے -

۴- اس قطعے کے پہلے تین مصرعوں پر عربی حرف نفی ' لا ' اور

[جاری]

تاریخ فوت شیخ بود ' ذوق جنتی ' ۱۲۶۹ھ
بر قول من رواست کہ احباب دل نہند

۳۸- قطعہ (۲ بیت)

فتح سید غلام بابا خان
خود نشان دوام اقبالست (۱)

۳۹- قطعہ

سہ تن ز پیمبران مرسل
گشتند بقرب حق مشرف
عیسیٰ ز صلیب و موسیٰ از طور
ختم الرسل از براق و رفرف (۲)

۴۰- قطعہ

تا بود چار عید در عالم
بر تو ، یا رب ، خجستہ باد و ھجیر
عید شوال و عید ذی الحجہ
عید بابا شجاع و عید غدیر (۳)

[جاری]

چوتھے مصرعے کے آخری کلمے کے اوپر عربی حرف جر ' الی ' لکھ دیا گیا ھے جو اس کی علامت ھے کہ یہ سارا قطعہ کالعدم قرار دے دیا گیا ۔ ذوق کا ایک قطعہ تاریخ وفات اس سے پہلے گزر چکا ھے۔ معلوم ھوتا ھے کہ غالب کو یہ دوسرا قطعہ پسند نہ تھا ، اس لیے ' باغ ' میں درج کرانے کے بعد پھر قلم زد کرا دیا ۔ مادہ تاریخ ' ذوق جنتی ' سے ۱۲۶۹ھ نکلتے ھیں ۔

۱- اردوئے معلیٰ ، ص ۱۱ ، طبع اول ۱۸۶۹ء ۔ سبد ۲ ص ۵۷ ۔

۲- قطعات ۳۹ تا ۴۲ سبد میں نہیں ھیں ۔

۳- ان چاروں عیدوں میں سے دو عام اسلامی عیدیں اور دوسری دو صرف اھل تشیع کے ساتھ خاص ھیں ۔

۴۱- قطعہ

کرد چوں ناظر وحیدالدیں ز دنیا انتقال
گفتم ، آیا بر کدام آئیں بود سال وفات ؟
گفت غالب کز سر زاری اگر نامش برند
خود ہمیں '' ناظر وحیدالدیں '' بود سال وفات (۱)

۱۲۸۱ھ = ۷ + ۱۲۷۴

۴۲- قطعہ

طراز انجمن طوبیٰ میرزا یوسف (۲)
قرار یافت دریں مہ بحکم رب ودود
دو شنبہ بست و دویم روز از مہ شعبان
دمی کہ مہر نہد سوی قبلہ سر بسجود
کرم کنند و فزایند زیب بزم نشاط
بہ فر فرخ فرخندگی فزای ورود

[جاری]

۱- اس قطعے پر بھی ' لا ' اور ' الی ' لکھ کر کالعدم قرار دے دیا ہے - مادہ تاریخ ' ناظر وحیدالدین ' سے ۱۲۷۴ھ نکلتے ہیں - اس میں ' زاری ' کے ۷ عدد جمع کردیے جائیں تو ۱۲۸۹ء ہو جاتے ہیں ، جو سال وفات ہے -

۲- یہ قطعہ میرزا صاحب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف خان کی شادی کا دعوت نامہ ہے - ان کی شادی کا سنہ معلوم نہ ہو سکا - از روے حساب ۱۲۲۷ھ ، ۱۲۳۲ھ ، ۱۲۳۰ھ ، یہ تین سال ایسے ہیں کہ ان میں شعبان کی ۲۲ تاریخ دو شنبے کو واقع ہوئی تھی - ان میں سے پہلے سنہ میں یوسف خان ۱۳ برس کے ، دوسرے میں ۱۸ برس کے اور تیسرے میں ۲۶ برس کے ہوتے ہیں - اگر یہ رسم ملحوظ رہے کہ ان کے خاندان میں ۱۳ ، ۱۴ برس کی عمر میں شادی ہوتی تھی ، جیسا کہ خود غالب کا واقعہ ہے ، تو پہلا ورنہ دوسرا سنہ تقریبی سال نکاح قرار پا سکتا ہے -

بسر برند شب 'اینجا کہ تامقیدہ' صبح　　ہمیں نظارہ' رقص است و استماع سرود
سپیدہ دم کہ ز فیض شمول نکہت گل　　دم نسیم سحر مشکبار خواہد بود
شوند جانب کاشانہ' عروس روان　　بہ شادمانی بخت مبارک و مسعود
سپس بہمرہی جمع وقت برگشتن　　سپاس بندہ نوازی ہمی توان افزود

۴۳- قطعہ (۲ بیت)

اندازہ' اسم و سال مولود　　معلوم کن از خجستہ فرزند (

۴۴ - قطعہ

در بارہ' اسم و سال مولود سعید
وقت است ز غالب سخنور توضیح
' ارشاد حسین خاں ' سنین ہجریست
۱۲۸۵ھ
بنگر کہ ' خجستہ رخ ' بود سال مسیح (۲)
۱۸۶۸ء

۴۵ - قطعہ

ہر شب بقدح ریختمی بادہ' گلفام
آری ، ز دو سی سال مرا قاعدہ این بود
شش روز شد اینک کہ بمے دسترسم نیست
شد (۳) غمزدہ تر دل کہ ازیں پیش حزیں بود

۱- اردوی معلیٰ ، ص ۲۳۷ طبع اول اور مجلد ۲ ص ۹۵ میں پہ
مصرع اس طرح ہے : ' غالب حال سنین ہجری '

۲- یہ دونوں قطعات (۴۴ و ۴۵) بھی مجلد میں نہیں ہیں - یہ قطعہ
بھی مثل قطعہ ما قبل نواب سید ابراہیم علی خاں بہادر کے فرزند کا سال ولادت
بتاتا ہے - لیکن کسی وجہ سے میرزا صاحب نے نواب صاحب کے نام کے خط میں
جو اردوی معلیٰ ، ص ۲۳۷ پر موجود اور قطعہ نمبری ۴۳ پر مشتمل ہے ، اس
قطعے کا ذکر نہیں کیا ہے -

۳- باغ : شدہ -

امشب چه سرایم که شب اول گور است
شش روز به بیتابی و تلواسه جبیں بود
ناگاه در آں وقت که در قطع ره عمر
از من دو قدم تا بدم باز پسیں بود
یک ره دو تن از شرب میم منع نوشتند
و آں منع نه از بغض ، بل از غیرت دیں بود
هر چند بداں منع ، من از مے نگزشتم
اما دم گیرای عزیزاں بکمیں بود
دانی که چه شد ؟ چوں زر سوداگر صهبا
کش داد و ستد با من ویرانه نشیں بود
بگزشت ز اندازهٔ بایست ، بمن گفت
' دیگر ندهم باده که معمول نه ایں بود '
با کاسهٔ خالی چه کند کیسهٔ خالی
تا خواسته در خواسته دل صبر گزیں بود
گر زر بدی ، از جای دگر مے طلبیدم
کو نقد دراں دست که پشتش بزمیں بود
در غرهٔ شعباں چو ز من باده گرفتند
خود " غالب پژمرده " نشانی ز سنیں بود (۱)

۱۲۹۱ - ۶ = ۱۲۸۵ھ

۱- " غالب پژمرده " کے ۱۲۹۱ عدد ہوتے ہیں - ان میں ۶ منہا کر دیے جائیں تو ۱۲۸۵ رہ جاتے ہیں جو اس حادثے کا سنہ ہے - غالب کے سوانح نگاروں نے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا ہے - میرزا صاحب نے پانچویں شعر میں جن دو صاحبوں کو لکھا ہے کہ انہوں نے مجھے شراب سے روکنے کی تحریری کوشش کی تھی ، ان میں سے ایک غالباً مولانا حالی تھے ، کیونکہ انہوں نے خود یادگار غالب میں اسی قبیل کی اپنی ایک کوشش کا ذکر کیا ہے -

رو ، شش بدر آر از مہ شعباں کہ دریںجا
مقصود من از تخرجہ البتہ ہمیں بود

۴۶ - ترکیب بند (۸۴ بیت)

خواہم از بند بزنداں سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد ، فغاں ساز کنم (۱)

۴۷ - ترجیع بند (۳۰ بیت)

ورود سرور سلطاں نشاں مبارکباد
بہ شہر مقدم نوشیرواں مبارکباد (۲)

۴۸ - مثنوی (۹ بیت)

دریں سال نواب عالی جناب
بروی زمیں غیرت آفتاب (۳)

۱- سبد ۱ ص ۱۴ و سبد ۲ ص ۲۴ - سبد ۱ میں بند ۶ کے پہلے شعر میں ' زہرہ ' تنگم ' چھپ گیا ہے ، اور آخری بند کے شعر ۵ کے پہلے مصرعے میں ' سود بیند ' اور دوسرے مصرعے میں ' جفا قالب ' ہے - سبد ۲ ص ۲۶ شعر ۳ کے آغاز میں ' خست تن ' بکسرہ' اضافت چھپا ہے جو درست نہیں کیونکہ ' خست ' یہاں فعل ماضی کا صیغہ واحد غائب ہے ، اور فعل مضاف نہیں ہوا کرتا - اسی طرح سبد ۲ ص ۲۸ کے آخری شعر میں ' از بعد ' غلط ہے ، درست ' ار بعد ' ہے جو ' اگر بعد ' کا مخفف ہے - صفحہ ۲۹ کے شعر ۳ میں ' خشنود ' کی جگہ ' خوشنود ' بھی میرزا صاحب کے املا کے خلاف ہے ، چنانچہ سبدا ص ۱۸ میں بے واو ہی چھپا ہے - نیز ص ۳۰ کے شعر اول کے پہلے مصرعے میں ' بند رقم ' باضافت درست نہیں -

۲- سبد ا ص ۱۹ و سبد ۲ ص ۳۱ - موخرالذکر میں بند ۲ کے آخری شعر میں ' آویز نغمہ ' باضافت غلط چھپ گیا ہے -

۳- سبدا ص ۳۶ و سبد ۲ ص ۳۴ - سبد ا میں ' روم روس ' بدون واو عطف غلط چھپا ہے -

۳۹ - مثنوی

وفا جوہرا (۱) ، از تو غم دور باد
دلت سرخوش بادۂ سور باد

رسید از تو الفت فزا نامۂ
رواں تازہ کن دلکشا نامۂ

نخواہم کہ در عرصۂ روزگار
نشیند ترا بر دل از غم غبار

ز رنجوری من مخور غم کہ من
ندارم غم ہستی خویشتن

نہ جان از منست و نہ جسم آن من
خود از مردن من چہ نقصان من ؟

حدیثی است شایستہ و سودمند
ز شایستگی بودہ دانا پسند

گر از من نباشی نکونی شنو
ازاں کس کہ فرزند اوئی شنو

چنیں دادہ فرماں کہ در ساز راہ
نباشی بحیلت گری عذر خواہ

عزیزاں رہرو گرامی کسند
بشادی دراں ناحیت ، رسند

بشادی بدیں جمع انباز گرد
چہ گردند اینان ، توہم باز گرد

الا تا نسنجی کہ ایں زاں بہ است
چنیں خواستہ است آں کہ فرمانده است

مشو سخت کوش و مشو سخت گیر
دریں آمدن باش فرماں پزیر

بحکم پدر چوں گزیدی سفر
بگرد از سفر ہم بحکم پدر

دریں رفتن و آمدن شاد باش
بہ تبعیت از طعنہ آزاد باش

۱- یہ منشی جواہر سنگھ جوہر کی طرف اشارہ ہے ، اور یہ مثنوی منظوم خط ہے ، جو رائے چھج مل کے التماس پر میرزا صاحب نے جوہر کو لکھا تھا - مقصد یہ تھا کہ جوہر اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں آکر شرکت کریں - غالباً وہ کسی بات پر والدین سے روٹھے ہوئے تھے ، اور باپ کو ڈر تھا کہ میرے بلاوے پر نہ آئیں گے ، اس لیے میرزا صاحب سے یہ سفارشی خط لکھوایا تھا - میرزا صاحب نے جوہر کے نام جو خط ۲۰ فروری سنہ ۱۸۴۹ء کو لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شادی اس تاریخ سے پہلے ہو چکی تھی ، مگر ہنوز برات امروہے سے واپس نہیں آئی تھی - اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ یہ منظوم خط آخر ۱۸۴۸ء یا آغاز ۱۸۴۹ء کا ہے -

زهجر تو مادر بتاب اندر است — گدازان چو شکر به آب اندر ا
پدر نیز مشتاق دیدار تست — بصد گونه خواهش طلب گار تہ
ترا خواهد ، از بس که خواهد ترا — نخواهد گر او، بس که خواهد ت
بیاو دو خونیں جگر را به بین — بمادر اشین و پدر را به
دگر من چراغ سحرگاهیم — قدم نه براه ، هواخواه
بیا ، تا به بینی که چون می تپم — چسان دیده تا دل بخون می ت
بیا ، تا تنم غرق خون بنگری — درون مرا از برون بنگر
بیا ، تا به بینی که از روزگار — کنونم بجائی رسید است
که می نوشم از خستگی ، نز ورع — بجای می ناب ، ماء القر
بیا و بیا و بیا و بیا — سر آمد سخن ، والدعا ، والد
بخوان ، چون بخوانی ورق را تمام — ز نیر سلام و ز عارف سلا

قصائد

۱ - قصیدہ (۳۱ بیت)

بیا کہ مدح خداوند دادگر گویم
از آنچہ گفتم ازیں پیش بیشتر گویم (۱)

۲ - قصیدہ (۴۸ بیت)

وقت آنست کہ خورشید فروزاں ہیکل
گردد آیندہ گر آیندہ بفرگاہ حمل (۲)

۱- ابرگہر بار: ۳۵، اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۰ھ سبد ۱ ص ۳ و سبد ۲ ص ۷ سبد ۱ شعر ۱۳ میں ' ہمزد و مژدہ دہی ' غلط چھپا ہے - سبد ۲ ص ۸ شعر ۱۲ میں ' براہ حدیث ' اضافت کے ساتھ درست نہیں ہے - اس طرح سبد ۲ ص ۹ شعر ۵ میں ' طراز دعا ' ہونا چاہیے۔ سبد ۱ میں اس شعر کے اندر ' اینت ' کی جگہ ' اینست ' چھپ گیا ہے - یہ قصیدہ لارڈ الگن بہادر ویسرائے ہند کی مدح میں ہے۔

۲- ابر گہر بار : ۳۶ ' سبد ۱ ص ۴ و سبد ۲ ص ۹ - سبد ۱ شعر ۴ میں ' گداز ' کی جگہ ' گراز ' چھپا ہے - اسی طرح شعر ۵ میں ' سیقل ' لکھ گیا ہے - سبد ۲ ص ۱۰ کے شعر ۶ میں ' کام ذوق ' باضافت درست نہیں ہے - سبد ۱ ص ۵ کے شعر ۷ میں ' کو ' کی جگہ ' کہر ' ہے - یہی لفظ ' باغ ' میں بھی تھا مگر تصحیح کے وقت اسے چھیل کر درست کردیا گیا ہے - سبد ۱ ص ۵ کے شعر ۸ میں ' راہ بہ شور ' غلط چھپ گیا

[جاری]

۳ - قصیدہ (۳۶ بیت)

تعظیم غسل صحت نواب کم مگیر زاں عید کاں مضاف بود جانب غدیر (۱)

۴ - قصیدہ (۳۵ بیت)

تجلی کہ ز موسیٰ ربود ہوش بطور بشکل کلب علی خاں دگر نمود ظہور (۲)

[جاری]

ہے ' ماہ بہ ثور ' ہونا چاہیے ۔ اور شعر ۱۱ میں ' در نامیہ ' میں ' در ' زائد ہے ۔ سبد ۲ ص ۱۱ کے شعر ۳ میں ' آعنگ ' بکسرۂ توصیفی ہونا چاہیے ، اور چوتھے شعر میں '' زمزمہ '' کی ہمزہ نہ ہونا چاہیے ۔ سبد ۱ ص ۵ شعر ۷ میں قافیہ غلطی سے ' احول ' کی جگہ ' احوال ' چھپ گیا ہے ۔ یہ قصیدہ لارڈ جان لارنس بہادر وبسرائے ہند کی مدح میں ہے ۔

۱- سبد ۱ ص ۹ بعنوان قطعہ و سبد ۲ ص ۱۵ و مکاتیب غالب ص ۳۰ حاشیہ طبع اول و انتخاب یادگار ص ۲۵ ۔ نواب سے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم تخلص مراد ہیں ۔ جن کے غسل صحت کی مبارکباد میں یہ قصیدہ لکھا گیا تھا ۔ انتخاب یادگار میں اس کے صرف ۶ شعر نقل کیے گئے ہیں ۔ سبد ۲ ص ۱۵ شعر ۶ میں ' حمام حوض ' ہے ۔ لیکن ' حمام خوض ' ہونا چاہیے جو سبد ۱ اور باغ میں ہے ۔ سبد ۲ ص ۱۶ شعر ۳ میں ' ایام روشناس ' اور ' عمود عصا ' کو بدون کسرہ ہونا چاہیے ۔ سبد ۱ ص ۹ شعر ۱۳ و سبد ۲ ص ۱۶ شعر ۸ میں ' درد میر ' ہے ، لیکن باغ میں ' درد و میر ' ہے اور یہی صحیح بھی ہے ۔ سبد ۱ ص ۹ شعر ۱۸ میں قافیہ غلطی سے ' ایسر ' چھپ گیا ہے ۔ ' امیر ' ہونا چاہیے ۔ سبد ۱ ص ۱۰ شعر ۳ میں ' رز خم ' اور شعر ۶ کا قافیہ ' غذیر ' غلط چھپ گیا ہے ۔ یہ علی الترتیب ' ززخم ' اور ' غدیر ' ہونا چاہیں ۔ سبد ۲ ص ۱۷ شعر ۱۲ میں ' ثنا می کنم ' ہونا چاہیے ۔

۲- سبد ۱ ص ۷ و سبد ۲ ص ۱۳ و مکاتیب غالب ص ۵۰ طبع اول حاشیہ ۔ سبد ۲ ص ۱۳ شعر ۷ میں ' حروف سطور ' ہونا چاہیے ، جب کہ ' حروف طور ' چھپ گیا ہے ۔ سبد ۱ ص ۸ شعر ۱۳ میں ' تہی ' کتابت سے رہ گیا ہے ۔ سبد ۱ ص ۸ شعر ۱۵ میں ' خشکی ' بجائے ' خستگی ' لکھ گیا ہے ۔ اور مصرع ۲ میں ' است ' غائب ہے ۔ اور شعر ۱۷ میں ' آئین ' کی ' آھن ' اور ' نے ' کی جگہ ' لے ' چھپ گیا ہے ۔

٥- قصیدہ (۱٥ بیت)

زہی دو چشم تو در معرض سیہ کاری
چو بختیارک و بختک بمردم آزاری (۱)

٦- قصیدہ (۳۰ بیت)

تا چہ نیرنگ است ایں کاندر جہاں آوردہ اند
نوبہاری طرفہ در فصل خزاں آوردہ اند (۲)

۷- قصیدہ

حیدرآباد دکن روضۂ رضواں شدہ است
ساز و برگ طرب و عیش فراواں شدہ است

۱- سبد ۱ ص ۱۰ و سبد ۲ ص ۱۸ و مکاتیب غالب ص ٥۹ طبع اول۔ اغ اور سبد ۱ ص ۱۱ شعر ۱۱ میں ' آنجوب ' ہے - نیز شعر ۱۲ میں ' غیبی ' ی جگہ ' غشی ' ہے۔ اور شعر ۱۴ میں " ارمانیس " ہے - اور شعر ۱٥ میں نبود ' ہے - سبد ۲ ص ۱۹ شعر آخر میں ' آب گہر ' کی جگہ ' آب کہر ' کتابت کی غلطی ہے ، اور ص ۲۰ شعر ۱ میں 'در کشودہ ' کی جگہ ' در کشمد ' ے۔ سبد ۱ ص ۱۲ شعر ۳ میں ' ندام دام ' بدال ہے ، اور اسی طرح باغ یں بھی ہے ، مگر یہ ہے غلط۔ صحیح وام (بواو) بمعنی قرض ہے ۔ مکاتیب الب طبع اول ص ٥۹ و سبد ۲ ص ۲۰ شعر ۲ میں ' لقا ' کی جگہ ' بما ' بھپ گیا ہے۔ باغ اور سبد ۱ ص ۱۲ شعر ٥ میں ' آدم ادباری ' ہے - اور عر ۱۴ میں ' قندز ' ہے - یہ قصیدہ نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہے اور رزا صاحب نے اپنے مکتوب بنام ممدوح مورخہ ۲۱ اگست ۱۸٦٥ء کے ساتھ بجا تھا ، ملاحظہ ہو مکاتیب غالب متن ص ۲۴ طبع چہارم -

۲- سبد ۱ ص ۱۳ و سبد ۲ ص ۲۱ - سبد ۱ شعر ۴ میں ' گز ' چھپ گیا ہے - سبد ۲ ص ۲۲ شعر ۹ میں ' آوردہ ' کی جگہ ' آوردد ' ہونا چاہیے ۔ سی طرح شعر ٦ میں ' انگلنڈ ' مناسب ہے جو سبد ۱ میں پایا جاتا ہے۔ سبد ۱ ں ۱۴ شعر ۱۱ میں ' ہم زوری ' غلط ہے - یہ قصیدہ نواب کلب علی ان بہادر والی رامپور کی تعریف اور تہنیت میں لکھا ہے ، جب کہ گورنمنٹ ی طرف سے دسمبر سنہ ۱۸٦٥ء میں انہیں خلعت مسند نشینی عطا ہوا تھا ۔ لاحظہ ہو مکاتیب غالب دیباچہ ص ۱۲۰ و ۱۲۱ و متن ص ۳۴ طبع چہارم -

والی شہر کہ جاوید بماناد بدہر
بود وی آصف و امروز سلیمان شدہ است

افضل الدولہ (۱) بہادر کہ ز فر رخ او
بارگہ مطلع خورشید درخشان شدہ است

آں کہ در عہد وی از کثرت ایثار و عطا
خلق را یافتن کام دل آسان شدہ است

مردہ را زندہ کند جنبش کلکش ، گوئی
کلک او موجۂ سر چشمۂ حیوان شدہ است

فر و فرہنگ فریدوں کہ نہاں داشت سپہر
اینک از پردہ دگر بار نمایاں شدہ است

یہ دکن آی و بہ بیں ریزش دست کرمش
کہ زمیں ز آب گہر غرقۂ طوفاں شدہ است

تا شود روشنیٔ چشم خلایق افزوں
گرد در رہگزرش کحل صفاہاں شدہ است

نہ ہمیں نیک بود نظم امور دنیا
کار دیں نیز دریں وقت بساماں شدہ است

۱- افضل الدولہ بہادر سے آصف جاہ پنجم نواب میر تہنیت علی خان بہادر مراد ہیں ، جو ۲۴ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۹ مئی سنہ ۱۸۵۷ء کو تخت نشین ہوئے ۔ نہایت پرہیزگار ، خدا ترس ، درویش دوست ، سخی ، اور علم و ہنر کے سر پرست تھے ۔ ۱۲ سال ایک ماہ ۲۰ دن کی حکومت کے بعد ۴۲ سال کی عمر میں ۱۳ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۶ فروری ۱۸۶۹ء کو جمعے کے دن انتقال کیا ۔ نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف جاہ ششم آپ کے اکلوتے فرزند آپ کے جانشین ہوئے ۔ ملاحظہ ہو ' افضل الدولہ ' از سید مراد علی طالع ، طبع حیدرآباد ، سنہ ۱۹۴۳ء ۔

غالب کے سوانح نگاروں کو ابھی تک اس کا علم نہیں ہے کہ غالب نے نواب افضل الدولہ بہادر سے بھی مداحی کا علاقہ پیدا کیا تھا ۔ اس حیثیت سے یہ قصیدہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔

نفس امارہ کہ خود کافر و کافر گر بود
از لہیب شہ دیندار مسلمان شدہ است
می تراشند ز اعضای بتاں اجزا را
کفر در راستہ بازیچۂ طفلاں شدہ است
رفت توقیع بآتش کہ نسوزد جاندار
هیزم و خار و خسش راتبۂ خوان شدہ است
لاجرم از رہ اخلاص پر پروانہ
شمع را از ضرر باد نگہباں شدہ است
روزگاریست گراں مایہ و فرخ کہ جہاں
هم بداں گونہ کہ بایست همانساں شدہ است
شاہ فرخندہ فرا ، خسرو والا گہرا
چشم بد دور کہ آدم بتو نازاں شدہ است
قدر آدم بدلش از تو چناں جای گرفت
کہ عزازیل ز انکار پشیماں شدہ است
سنگ فرساست چناں نعل سمندت کہ براہ
هر کجا آمدہ ، کہسار بیاباں شدہ است
ابر ، رخشی است کہ در زیر تو جولاں دارد
برق ، تیغی است کہ دردست تو عریاں شدہ است
رند (۱) روشن نفسی هست ز آل سلجوق
این کہ بر مائدۂ فیض تو مہماں شدہ است

(۱) ' رند روشن نفس ' سے اپنی ذات مراد لی ہے۔ سلجوقی بادشاہ بھی ترک نسل کے تھے ، اور میرزا صاحب بھی اسی قوم کے نام لیوا تھے ، اس لیے اپنے آپ کو ' آل سلجوق ' کہا ہے ، ورنہ کوئی ایسا رشتہ ان کے اور سلجوق کے درمیان نہ تھا ، جس کے باعث وہ اپنے آپ کو اس کی اولاد کہہ سکتے ۔

تو چناں داں کہ غریبی ز دیار دهلی
به دکن نامده از دور ثنا خواں شده است

تیغ تیز است ثنا گوی تو ، لیکن دانی
جوهر تیغ ته مورچه پنهاں شده است

نیست جز گرد و غبار آنچه بهر سو نگرم
خواب در دیدهٔ من بس که پریشاں شده است

غنچهٔ هست دل من ز شگفتن نومید
خوں شود سینه ازاں غنچه که پیکاں شده است

بدم گرم خودم زنده و بیدل زانم
که دل از فرط ریاضت خورش جاں شده است

غالب غمزده درویش و تو درویش نواز
بحلش باد ، اگر طالب احساں شده است

صله گر می نفرستی ، بستایش بنواز
کایں کلامی است که داغ دل حساں شده است (۱)

سخن این است که قطع نظر از حسن کلام
وایه جوئی به سخن سلسله جنباں شده است

چشم بر لطف و کرم دوختهٔ را دریاب
که ز کاهش بدنش صورت مژگاں شده است

ایں کهن پیر ، به آوازهٔ شیئاً لله
گدیه گر بر در آں قبلهٔ گیهاں شده است

در ثنای تو چه گفتم ، که گر آیم بدعا
ایں بدل می سپرم ، گر بزباں آں شده است

باد جاوید گلستان ترا فصل بهار
ای که از فیض تو آفاق گلستاں شده است (۲)

۱- حضرت حسان بن ثابت رض مراد هیں، جو مداح رسول ص تھے -

۲- یه قصیده سبد میں شامل نهیں ہے-

غزلیات

۱ - غزل (۹ بیت)

ای خداوند خردمند جهان داور دانا (۱)
وی به نیروی خرد بر همه کردار توانا

۲ - غزل (۸ بیت)

جز دفع غم ز باده نبود است کام ما
گوئی چراغ روز سیاهست جام ما (۲)

۳ - غزل (۱۶ بیت)

منع ز صهبا چرا ؟ باده روان پرور است (۳)
خوف زعصیان عبث ، خواجه شفاعت‌گر است

۱- سبدا ص ۲۰ و سبد ۲ ص ۶۶ و مکاتیب غالب ص ۶۹ طبع اول - شعر ۲ میں مکاتیب کے اندر ' بزیبائی ' ہے -

۲- سبدا ص ۲۱ و سبد ۲ ص ۶۶ - مطبوعہ میں یہ شعر زائد ہے :

مقصود مازدهر هر آئینه دوستی است
یارب که هیچ دوست مبادا بکام ما

۳- سبدا ص ۲۱ و سبد ۲ ص ۶۷ - اس غزل کے شعر ۵ کا دوسرا مصرع یوں پڑھا جائے گا : " ورنه بود گل ، ز گل مهمل گل خوشتر است " اور مطلب یہ ہے کہ اگر موسم برشگال میں گل یعنی کیچڑ نہ ہو ، تو گل کا بگڑا ہوا لفظ گل یعنی پھول اور بھی زیادہ بھلا لگتا ہے - سبد ۱ و ۲ میں شعر ۱۱ کے اندر مصرع ۱ میں ' برو ' بصیغہ امر ہے ، حالانکہ ہونا چاہیے ' برد ' فعل مضارع از مصدر بردن -

۴ - غزل (۱۰ بیت)

خوشم که چرخ بکوی توام ز پا انداخت (۱)
که هم ز بن پی من خلد را بنا انداخت

۵ - غزل (۱۰ بیت)

هم ' انا الله ' خوان درختی را بگفتار آورد (۲)
هم ' انا الحق ' گوی مردی را سردار آورد

۶ - غزل

عجب که مژده دهان رو بسوی ما آرند (۳)
کدام مژده ، که آرند ، و از کجا آرند
ز دوستان نبود خوشنما درین هنگام
که دایه بهر گدای شکسته پا آرند
ز غم چنان شده ام مضمحل که اعدا را
سزد که گنج گهر بهر رونما آرند
نه روی خواستن از حق بود جز آنان را
که بنده وار همی طاعتش بجا آرند
نه بیرضای خدا کارها روان گردد
سپهر و انجم اگر ساز مدعا آرند
نماند ساز مرا هیچ نغمه ، همنفسان
جز آن که بر شکنندش ، چو در نوا آرند
نخست عمر دگر خواهد از خدا غالب
اگر نوید پذیرائی دعا آرند

۱- سبد ۱ ص ۳۸ و سبد ۲ ص ۷۱ -
۲- سبد ۱ ص ۲۲ و سبد ۲ ص ۶۸ -
۳- یه غزل سبد میں نہیں ہے

۷ - غزل (۱۳ بیت)

بمقصدی کہ مرآں را رہ خدا گویند
برو ، برو کہ ازاں سو ' بیا ، بیا ، گویند (۱)

۸ - غزل (۹ بیت)

درد ناساز است و درماں نیز ہم
دھر بی پروا و یزداں نیز ہم (۲)

۹ - غزل (۱۰ بیت)

آسمان بلند را میرم ابر کحلی پرند را میرم (۳)

۱۰- غزل (۱۱ بیت)

ھلہ ، من عاشق ذاتم ، تنہ نا ھا یا ھو
ناظر حسن صفاتم ، تنہ نا ھا یا ھو (۴)

۱۱- غزل (۷ بیت)

از جسم بجاں نقاب تا کے این گنج دریں خراب تا کے (۵)

۱- یہ غزل مبد ۱ میں نہیں تھی- یادگار غالب ص ۴۵ طبع نامی پریس ۱۸۹۷ء میں پہلی بار شایع ھوئی جس سے نقل کر کے مبد ۲ ص ۷۲ میں اھی درج کردی گئی - مبد ۲ ص ۷۳ کے شعر ۴ میں ' باغ ' کے اندر ' وجود زما ' ہے نیز اس شعر کے مصرع دوم اور مقطع میں ' گونی ' غلط چھپا ھے ' گوی ' ھونا چاھیے جو باغ میں ھے-

۲- مبد ۱ ص ۲۲ و مبد ۲ ص ۶۹ - مبد ۱ شعر ۴ میں ' خمیر ' کی جگہ ' خمر ' چھپ گیا ھے -

۳- مبد ۱ ص ۴۰ و مبد ۲ ص ۷۲ -

۴- مبد ۱ ص ۲۴ و ایضاً ص ۶۹ - مبد ۱ شعر ۲ میں ' موسی و خضر ' ھے- مبد ۲ شعر ۳ میں ' میلاد وفاتم ' غلط چھپ گیا ھے- ' میلاد و وفاتم ' ھونا چاھیے -

۵- مبد ۱ ص ۲۳ و مبد ۲ ص ۷۰ -

فردیات(۱)

۱- نازم آں فتنہ ، الخ
۲- ورود سرور سلطان، الخ
۳- اینک هزار و هشتصد ، الخ
۴- نواب نامدار بدهلی، الخ
۵- مرحبا ویسرای، الخ
۶- بیا کہ دادہ بدهلی ، الخ
۷- زهی لاڑد لارنس ، الخ (۲)
۸- ملکہ آں کہ بریں ، الخ (۳)
۹- زهی ز شملہ، الخ
۱۰- مرحبا لشکر نواب ، الخ
۱۱- در تن مردم ایں ، الخ

۱- یہ عنوان میں نے قرار دیا ہے۔ خود باغ میں ہر شعر سے پہل لفظ ' فرد ' لکھا گیا ہے۔ سبد ۱ ص ۴۲ اور سبد ۲ ص ۴۷ میں یہ سب ش موجود هیں۔ صرف شعر ۲ و ۱۲ سبد ۲ میں نہیں ، جس کی وجہ غالباً یہ کہ یہ دونوں شعر ترجیع بند کے هیں ، پھر تکرار سے کیا فائدہ ۔

۲- سبد ۲ میں ' لارڈ ' لکھا گیا ہے، جو میرزا صاحب کے املا خلاف ہے، وہ همیشہ اسے ' لاڑد ' لکھا کرتے تھے ۔

۳- سبد ۲ میں ' چرخ سربرش ' سہواً چھپ گیا ہے۔ بدون اضافہ هونا چاهیے ۔

۱۲- ذریعہ' شرف و عز ، الخ

۱۳- عیاں بود ز ، الخ

۱۴- دو روز دیر کن ، الخ (۱)

۱۵- عبودیت نکند ، الخ (۲)

۱۶- بو کہ بہنجار نو زخمہ ز تار آوری
کن فہکون دگر بر سر کار آوری (۳)

۱- سبد ۲ میں ' وایہ ' کی جگہ ' وایہ' ' ہونا چاہیے -

۲- سبد ۱ میں مصرع ۲ میں ' دعای ' غلط چھپ گیا ہے -

۳- یہ شعر سبد ۲ میں نہیں ہے -

خمسه

بر غزل مولانا قدسی قدس‌الله سره

کیستم تا بخروش آوردم بی ادبی (۱)
قدسیان پیش تو در موقف حاجت طلبی
رفته از خویش بدین زمزمهٔ زیر لبی
مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چه عجب خوش لقبی

اے که روے تو دهد روشنی ایمانم
کافرم کافر، اگر مهر منیرش خوانم
صورت خویش کشید است مصور دانم
من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
الله، الله، چه جمالست بدین بوالعجبی

اے گل تازه که زیب چمنی آدم را
باعث رابطهٔ جان و تنی آدم را
کردہ دریوزهٔ فیض تو غنی آدم را
نسبتی نیست بذات تو بنی آدم را

۱- یه خمسه سید ۱ و ۲ دونوں میں نہیں ہے۔ خود باغ کے ا بھی اسے ' لا - الیٰ ' لکھ کر خارج قرار دیا ہے ۔ مگر عرصہ ہوا کہ ا غزل پر دوسرے بہت سے خمسوں کے ساتھ ایک مجموعے ' حدیث قدسی ' چھپ کر شایع ہو چکا ہے ۔

بر تر از عالم و آدم، تو چه عالی نسبی

اے ایت را بسوے خلق ز خالق پیغام
روح را لطف کلام تو کند شیریں کام
ابر فیضی که بود از اثر رحمت عام
نخل بستان مدینه ز تو سر سبز مدام
زاں شده شهرهٔ آفاق بشیریں رطبی

خواست چوں ایزد دانا که بساطی از نور
گسترد در همه آفاق چه نزدیک چه دور
حکم اصدار تو در ارض و سما یافت صدور
ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظهور
زاں سبب آمده قرآں بزبان عربی

وصف رخش تو اگر در دل ادراک گزشت
نه همین است که از دائرهٔ خاک گزشت
همچو آں شعله که گرم از خس و خاشاک گزشت
شب معراج عروج تو ز افلاک گزشت
بمقامیکه رسیدی نرسد هیچ نبی

چه کنم چاره که پیوند خجالت گسلم
من که جز چشمهٔ حیواں نبود آب و گلم
من که چوں مهر درخشاں بدمد نور دلم
نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکه نسبت بسگ کوی تو شد بی ادبی

دل ز غم مرده و غم برده ز ما صبر و ثبات
غمگساری کن و بنمای بما راه نجات
داد سوز جگر ما که دهد نیل و فرات
ما همه تشنه لبانیم و توئی آب حیات
رحم فرما که ز حد میگزرد تشنه لبی

غالب غمزده را نیست دریں غمزدگی
جز بامید ولای تو تمنای ۱۳۱
ز تب و تاب دل سوخته غافل نشوی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمده سوے تو قدسی پی درمان طلبی

رباعیات (۱)

۱- بخشید به ثاقب سخنور یزدان

۲- امروز که روز عید و نوروز بود

۳- نازم به نشاط این چنین برگشتن (۲)

۴- خواندیم سخنهای محبت بسیار

۵- ای روی تو همچو مهر گیتی افروز

۶- ای آنکه بمهر نام شاه رخ است

۷- ای داده بباد عمر در لهو و فسوس (۳)

۸- جائی که ستاره شوخ چشمی ورزد

۹- در کالبد شعر روان باز آمد

۱۰- از دهر دلم وایه مهر در می جست

۱۱- زنسان که همیشه در روانی مائیم

۱- یہ عنوان میں نے قرار دیدیا ہے - باغ میں اس کی جگہ ہر رباعی سے پہلے لفظ 'رباعی' لکھا ہوا ہے۔ نیز یہ سب رباعیاں ابر گہربار اور مسبد ۱ و ۲ میں بھی موجود ہیں، بجز ان کے، جو میں نے اوپر پوری نقل کی ہیں -

۲- مسبد ۲ مصرع ۳ کے اندر بجائے 'این' کے سہواً 'اند رین' چھپ گیا ہے۔

۳- باغ میں اس رباعی پر 'لا - الحاق' لکھ کر خارج قرار دیدیا ہے۔

۱۲- مگویند جہانیان دو رویند، مگوی (۱)

۱۳- ہر روز تنم ز سایہ لرزان گردد (۲)

۱۴- ای پایہ بلند ساز والا جاہی

۱۵- نام اب و جد و ہم نگیرند این قوم
فیض از دم مادران پزیرند این قوم
از مادر و از مادر مادر گویند
کس در کس، امیر ابن امیر اند این قوم (۳)

۱۶- یارب، تو کجائی کہ بما زر ندہی

۱۷- آن کیست کہ جسم ملک را جاں باشد (۴)

۱۸- در دیدۂ آن کہ محو رنج و یاس است
خاک است، اگر لعل و گر الماس است
آن دل کہ ز دہر بود آزاد، کنون
در بند محبت نراین داس است

۱۹- ہر چند خرد ز تاب می پست شود
وز ضعف خرد، وہم قوی دست شود
ہر کس کہ خرد دارد، ازین جوہر ناب
آن مایہ چرا خورد کہ بدمست شود

۱- سبد ۲ میں 'مگوی' کو 'مگو' چھاپا گیا ہے۔

۲- سبد ۲ میں مصرع ۳ 'خواہم کہ ز لطف' کی جگہ بدون 'کہ' چھپ گیا ہے۔

۳- یہ رباعی سبد ۲ میں نہیں پائی جاتی، اس لیے یہاں مکمل نقل کی جاتی ہے۔

۴- یہ رباعی مکاتیب غالب: ۹۶ طبع اول نیز بعد کی اشاعتوں میں شامل ہے۔

۲۰- حق دادہ بہ سید از پی انعامش
فرخ پسری کہ واجب است اکرامش
تاریخ ولادتش بود بی کم و بیش
' ارشاد حسین خان ' کہ باشد نامش (۱)
۱۲۸۵ھ

۱- باغ میں اس رباعی پر بھی ' لا ۔ الیٰ ' لکھ کر خارج قرار دے دیا ہے ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی ' ارشاد حسین خان ' کی ولادت کا قطعہ تاریخ میرزا صاحب کہہ چکے تھے، جو قطعات میں ۴۴ ویں نمبر پر درج ہو چکا ہے ۔ اس کے مقابلے میں یہ رباعی قدرے پست تھی ، اس بنا پر اس کا خارج کر دینا مناسب معلوم ہوا ۔

منثورات (۱)

۱- عبارتی که در رامپور رقم فرموده اند:

"زبان کلام وابسته به افتتاح باب کلام" الخ (۲)

۲- عبارتی که در تهنیت جشن در رامپور رقم کرده اند:

"جهان خدای را سپاس و جهانیان را نوید" الخ (۳)

۳- عبارت در صنعت مقطع الحروف در رامپور رقم کرده به نواب کلب علی خان بهادر در داده اند:

"داور دارا در، آن زور آور ازدر" الخ (۴)

۴- دیباچهٔ قاطع برهان: "یزدان دانش بخش داد پسند می ستایم" الخ (۵)

۱- یہ عنوان میں نے قرار دیا ہے۔ اصل نسخے میں بغیر کسی علامت کے نثریں شروع کردی گئی ہیں۔

۲- کلیات نثر: ۹۰، مطبع نولکشور ۱۸۷۱ء میں بغیر تمہیدی عبارت کے چھپ چکی ہے۔ اصل میں اس پر اور نمبر ۳ و ۴ پر "لا، الی" بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کلیات نثر میں شائع ہوچکی ہیں۔

۳- یہ بھی کلیات مذکور کے ص ۹۱ پر بے تمہید شائع ہوچکی ہے۔

۴- ایضاً: ۱۱، بدون تمہید۔

۵- دیباچہ قاطع برہان، مطبع نولکشور ۱۲۷۸ھ کے ص ۳۷۲ میں ملاحظہ ہو۔

۵- دیباچۂ ثانی جلد: "اللہ اللہ ۔ غالب خاکسار هرزه‌درا را از آسمان بزمین فرستادند" الخ (۱)

۶- تقریظ قاطع برہان: "از من بمن سلام و هم از من بمن پیام" الخ (۲)

۷- دیباچۂ مثنوی ابر گہربار: "خامه‌مزد سخن در سپاسگزاری مبدء فیاض است" الخ (۳)

۸- تقریظ مثنوی ابر گہربار: "در انجام این نظم نظامی نشام" الخ (۴)

۹- تقریظ سفرنگ دساتیر تصنیف مولوی نجف علی صاحب: "الله الله شماد سال کو، ده سال ازان میان بشمار دانش اندوزی" الخ (۵)

۱۰- تقریظی که بر کتاب دری کشا تصنیف مولوی نجف علی صاحب نگاشته اند: "یزدان روان بخرد فروز" الخ (۶)

۱۱- تقریظ تذکرۂ اردو تالیف مولوی محمد مشہور علی صاحب: "خدایا چه گویم که شاهی تراست" الخ (۷)

۱- یہ دیباچہ درفش کاویانی، مطبع اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۲ھ کے ص ۴ تا ۷ پر دیباچۂ اول کے بعد چھپا ہے۔

۲- یہ تقریظ نسخۂ مذکور کے ص ۹۷ پر چھپی ہے۔

۳، ۴- یہ دیباچہ مثنوی مذکور، اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۰ھ کے ص ۲ تا ۴ پر، اور اس کی تقریظ اسی ایڈیشن کے ص ۳۰ پر چھپی ہے۔

۵- یہ تقریظ سفرنگ، مطبع سراجی ۱۲۸۰ھ کے ص ۱۱۳ سے ۱۱۴ تک چھپی ہے۔

۶- یہ تقریظ دری کشا، اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۰ھ کے آخری صفحے (نمبری ۶۶) پر چھپی ہے۔

۷- اس تقریظ پر اصل میں 'لا - الی' کا نشان بنا ہوا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ میرزا صاحب اسے کلیات نثر میں شائع کرا چکے تھے - ملاحظہ ہو کلیات ص ۴۹ - اس تذکرۂ اردو کے متعلق کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ شائع ہوا یا نہیں - اگر کسی اہل ذوق کو کچھ معلوم ہو تو بغرض افادۂ عام شائع فرمائیں -

خطوط

[۱] بنام منشی جواہر سنگھ

۱- امروز خونگرمی مہر رگی را ، الخ (۱)

۲- ایضاً : چشم و چراغ دودہ مردمی ، الخ

۳- ایضاً : جان من نامہ شما دیر است ، الخ

۴- ایضاً : بنام جواہر سنگھ جوہر سعادت و اقبال نشانا ، هم بخت خود را آفرین گویم ، الخ (۲)

۵- ایضاً : سعادت و اقبال نشان رای جواہر سنگھ جوہر از عمر و دولت برخوردار باشند ، الخ

۶- ایضاً : سعادت و اقبال نشان رای جواہر سنگھ را چرخ یاور و بخت فرمانبر باد ، الخ

۷- ایضاً : جان من و جانان من ، روزی بود کہ نامہ بمن رسید، الخ

۸- ایضاً : اقبال نشانا ، نامہ نگاشتہ دواز دهم فروری رسید ، الخ

۹- ایضاً : سعادت نشانا ، نامہ رقمزدہ بستم فروری و نامہ نگاشتہ ۲۵ فروری ہی هم رسید ، الخ

۱- حصہ مکاتیب کا آغاز منشی جواہر سنگھ جوہر کے خطوط سے ہوتا ہے مگر آغاز کے تین خط پنج آہنگ میں شامل ہو چکے تھے، اس سے ان تینوں پر علامت حذف 'لا - الیٰ' پائی جاتی ہے۔

۲- الھیں کے نام چوتھے خط کے حاشیے پر لکھا ہے 'ازیں جا باید نوشت' یعنی ناقل چوتھے خط سے نقل شروع کرے ، پہلے کے تینوں خط حذف کردے -

۱۰- ایضاً : سعادت و اقبال نشانا حانا ، نامۂ شما و منشور عطوفت مولانا در نورد آں بمن رسید ، الخ

۱۱- ایضاً : اقبال نشانا ، مسرت افزا نامہ نگاشتہ ۱۲ دسمبر بورود خویش خوشنودم کرد ، الخ

۱۲- ایضاً : لوردیدہ و سرور سینۂ غالب منشی جواہر سنگھ از عمر و دولت برخواند ، الخ

۱۳- ایضا : سعادت و اقبال نشانا منشی جواہر سنگھ از عمر و دولت برخوردار باشند ، الخ

۱۴- ایضاً : جان من ما در آن ہنگام سرگرانی از اندازہ گزشت ، الخ

۱۵- ایضا : از امد اللہ دعا خوانند ، الخ

۱۶- ایضا : ذانحذو سعادت آثار اقبال نشان منشی جواہر سنگھ جوہر دعا خوانند ، الخ

[۲] بنام رای چھج مل کھتری

مہاراج با چوں منی کہ جز محبت کیش دیگر ندارم ، الخ

[۳] در سفارش منشی جواہر سنگھ بہ محمد فضل اللہ خان دیوان راج الور

مخلص نواز ، غمزدگان را بمہر اندوہ گدازا ، الخ

[۴] بنام منشی نبی بخش مرحوم

صبح است و پردہ ہای ایوان فروہشتہ ، الخ

[۵] نامہ بنام نواب علاء الدین احمد خان بہادر

۱- جانشین غالب را از غالب دعا ، الخ

۲- ایضاً : دانشہای سزا و اندیشہ ہای رسا را بہ فرگاہ تنگبار والا یزدان بار ندادہ اند ، الخ (۱)

۱- یہ فارسی جانشینی کی سند ہے جو مرزا صاحب نے علائی کو عطا کی تھی - خود مرزا صاحب کے ہاتھ کی لکھی اس تحریر کا عکس مولانا مہر نے اپنی کتاب 'غالب' کی اشاعت اول میں چھاپ دیا ہے - ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۵ ان تمام خطوط پر بھی علامت 'لا - الیا' ، پائی جاتی ہے اس لیے کہ یہ سب پنج آہنگ میں شامل ہو چکے ہیں -

[٦] خط بنام جان جاکوب صاحب

فرخندہ خوی سرورا، الخ

[۷] از اسداللہ گم کردہ راہ معروض بخدمت میر ولایت علی صاحب المخاطب بمشرف الدولہ بہادر

نفرین خدای بر من، الخ

[۸] بنام دوتن از فرزانگان پنجاب

آن یکی سپہر مردمی را مہر، الخ

[۹] بنام آغا محمد حسین ناخدای شیرازی

نظم نجلیند صدیقہ تحقیق، الخ

[۱۰] بنام مولوی رجب علی خان

۱- سپاسی کزان نامہ نامی شود، الخ

۲- بنام مولوی رجب علی خان بہادر ارسطو جاھا، سکندر ساھا، الخ

[۱۱] عرض داشت بنام نامی نواب مختار الملک نائب والی حیدرآباد

بعز عرض حضرت فلک رفعت، الخ

[۱۲] عرضداشت باسم سامی اشرف شاہزادگان میسوریہ

رباعی - سبحان اللہ شان اعلیٰ حضرت -

[۱۳] خطوط بنام خطوط تفضل حسین خانصاحب مرحوم

۱- حضرت سلامت، رافت نامہ کہ از جے پور، الخ

۲- ایضاً: بحدمت وافر المسرت حضرت اخوان پناھی، الخ

۳- ایضاً: قبلہ جان و دل سلامت، الخ

۴- ایضاً: داغم ز سوز غم کہ خجل داردم ز خلق، الخ

۵- ایضاً: یا رب این فردوسی نسیم، الخ

٦- ایضاً: روان پرور صاحبا، الخ

۷- ایضاً: ای بفروغ فرھنگ و فرخی، الخ

[۱۴] خطوط بنام منشی ہر گوپال تفتہ

۱- مشفق من لالہ ہرگوپال تفتہ از جانب اسد اللہ، الخ

۲- ایضاً: والا جاھا خاقانی دستگاھا، الخ

۳- ایضاً : مخلص نوازا ، دیر است که ، الخ
۴- ایضاً : خامه دو زبان ، الخ
۵- ایضاً : هان وهان ، الخ
۶- ایضاً : جان من ، نامهٔ شما که بنام منشی هرگوبند سنگھ ، الخ
۷- ایضاً : اگر جان بے وفا نبودی ، الخ
۸- ایضاً : جان من اوراق اشعار ، الخ
۹- ایضاً : صاحب من ، الخ
۱۰- ایضا : فرزانه سهرووز آزرم گستر را ، الخ
۱۱- بنام منشی هرگوپال تفته ، غالب از خود رفته ، الخ

[۱۵] خط بنام جانی بانکے لال وکیل راج بھرتپور

یزداں که دریا آفرید ، الخ

[۱۶] بنام میر احمد حسین المتخلص به میکش

۱- برخوردار اقبال نشان میر احمد حسین ، الخ
۲- ایضا : عزیز تر از جان ، الخ
۳- ایضا : نور دیدهٔ غالب ، الخ
۴- ایضا : اقبال نشانا ، الخ
۵- ایضاً : دل و جان من فدای تو باد ، الخ
۶- ایضا : سعادت نشانا ، الخ
۷- ایضا : جانا فرهنگ دانا ، الخ
۸- ایضا : اقبال نشانا ، بحساب متعارفه رسمیه ، الخ
۹- ایضاً : نامهٔ شما رسید ، الخ
۱۰- ایضاً : صاحب من ، الخ
۱۱- ایضاً : با آن که هیچ مطلب ، الخ
۱۲- ایضاً : جانا سعادت نشانا ، الخ

۱۳- ' ایضاً : سعادت نشان بشنوید ، الخ

[۱۷] نامہ بنام نامی قطب الدولہ بہادر

۱- بہ همایون خدمت جناب ، الخ

۲- نامہ بنام نامی نواب ایضاً : بخدمت و افرالمسرت ، الخ

[۱۸] نامہ بنام نامی شاہ صاحب

اگرچہ نیک نیم ، الخ

[۱۹] نامہ بنام نامی نوروز علی خاں بہادر

عالی جاها ، الخ

[۲۰] بنام دوستی

خامہ کہ گویای خموش است ، الخ

[۲۱] نامہ بنام منشی احمد صاحب

شفیقی خلیلی ، الخ (۱)

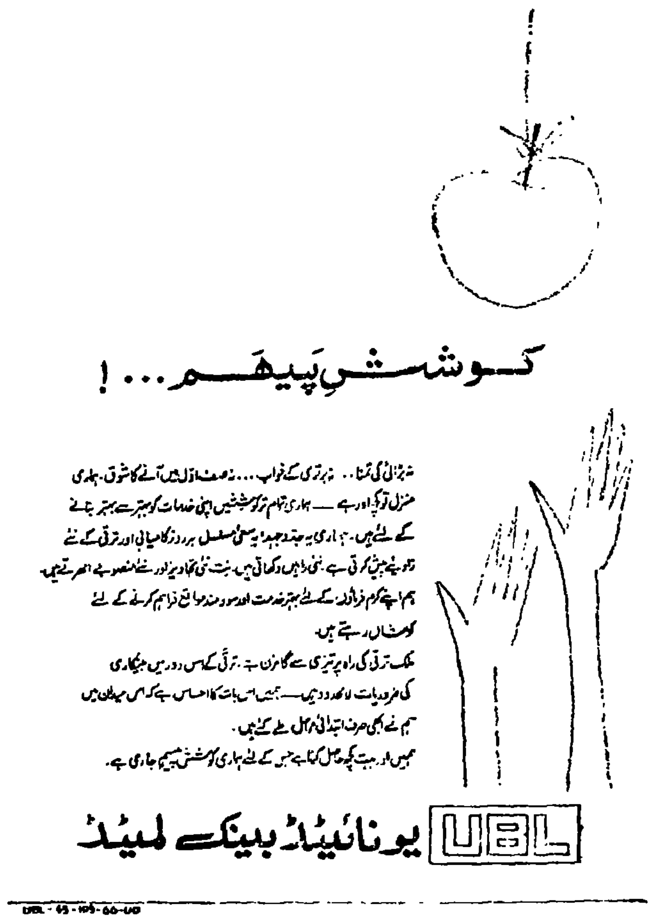
[۲۲] بنام منشی هیرا سنگھ صاحب

سعادت و اقبال نشان منشی هیرا سنگھ صاحب ، الخ

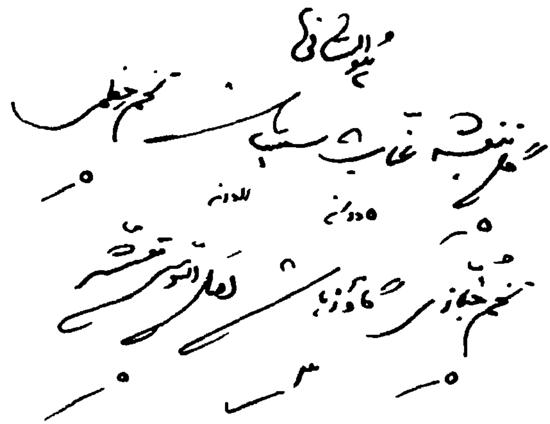
[۲۳] ترقیمہ (۲)

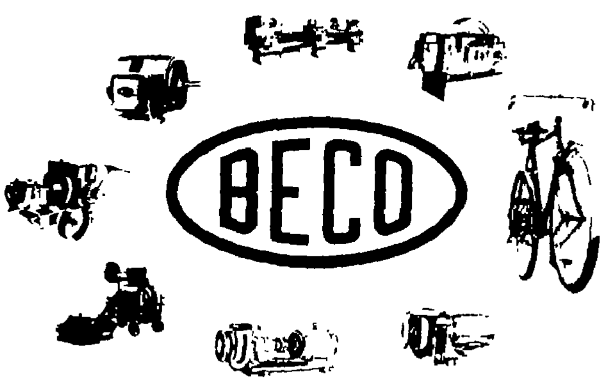
۱- اس خط پر بھی مخطوطے میں 'لا - الی' علامت حذف موجود ہے مگر اس هدایت کی وجہ کیا ہے، نہیں کہا جاسکتا - اس لیے کہ یہ خط پنج آہنگ میں موجود نہیں ہے-

۲- ترقیمے کی عبارت تعارف میں نقل ہو چکی ہے-


کوشش پیہم...!
نہ بڑائی کی تمنا... نہ برتری کے خواب... نہ صفِ اول میں آنے کا شوق۔ ہماری منزل تو کچھ اور ہے — ہماری تمام تر کوششیں اپنی خدمات کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ہیں۔ ہماری یہ جدوجہد یہ سعیٔ مسلسل ہر روز کامیابی اور ترقی کے نئے زاویے پیش کرتی ہے۔ نئی راہیں دکھاتی ہیں۔ نت نئی تجاویز اور نئے منصوبے ابھرتے ہیں۔ ہم اپنے کرم فرماؤں کے لئے بہتر خدمت اور سودمند مواقع فراہم کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔
ملک ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ ترقی کے اس دور میں بینکاری کی ضروریات لامحدود ہیں — ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ اس میدان میں ہم نے ابھی صرف ابتدائی مراحل طے کئے ہیں۔
ہمیں اور بہت کچھ حاصل کرنا ہے جس کے لئے ہماری کوشش پیہم جاری ہے۔
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
UBL






BECO


چراغ لیکے کہاں
سامنے ہوا کے چلے؟
زندگی میں طوفاں بھی آتے ہیں،
خوشیاں بھی۔ جب بڑھاپا آپہنچے گا اور
آپ کمانے کے لائق نہ رہیں گے تو پھر یہ
پھر کہاں، وقت ہمیشہ ساز گار نہیں۔ خیر اندیشی
کا تقاضہ ہے کہ آپ بیمہ کرا کے اپنی اور
اپنے بال بچوں کی حفاظت کریں۔
خیبر انشورنس آپ کی ضروریات
کے مطابق مختلف اور مفید منصوبے
پیش کرتی ہے جو خوش آئند مستقبل کے
ضامن اور سکون و مسرت کا پیش خیمہ ہیں۔
خیبر انشورنس آپ کے مستقبل کی محافظ ہے
خیبر انشورنس کمپنی لمیٹڈ
میکلوڈ روڈ، کراچی — شاخیں پاکستان کے ہر حصہ میں موجود ہیں
KHAIR

انجمن کی چند زیرِ طبع کتابیں

○ مقاماتِ ناصری	میرزا صرعلی مرحوم - مرتبہ: انصار ناصری
○ اردو کی منظوم داستانیں	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
○ لغاتِ کبیر (حصہ اول)	بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم
○ اردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند
○ دیوانِ قاسم دکنی	مرتبہ: سخاوت مرزا
○ ہمیشہ بہار	مصنفہ: کشن چند اخلاص مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی
○ انتخابِ جدید (نیا ایڈیشن)	آل احمد سرور - عزیز احمد
○ قطعۂ منتخب	مصنفہ: عبدالغفور نساخ مرتبہ: ڈاکٹر انصار اللہ نظر

غالب کی صد سالہ برسی پر
انجمن کی مطبوعات

فلسفۂ کلامِ غالب	ڈاکٹر شوکت سبزواری	بارہ روپے
غالب، ایک مطالعہ	پروفیسر ممتاز حسین	سات روپے
مہر نیمروز (اردو ترجمہ)	پروفیسر سید عبدالرشید فاضل	بارہ روپے
ہنگامۂ دلِ آشوب	مرتبہ سید قدرت نقوی	سات روپے
غالب نام آور	سہ ماہی "اردو" میں غالب سے متعلق شائع شدہ مضامین کا انتخاب	پندرہ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

قومی زبان

شمارۂ خصوصی بیادِ غالب

قیمت: ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

I. 45 1969 No. 1

THE QUARTERLY

Urdu

GHALIB CENTENARY
SPECIAL ISSUE

Published By

THE ANJUMAN TARAQQI-E-URDU

BABA-E-URDU ROAD, KARACHI-1

(PAKISTAN)

Rs 8.00 Per Copy

علم

ز خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فره‌مند

و در نژاد همی — به سترگان قوم پیوند

جماعهٔ اتراک — در تمامی زمانه ده چند

ما کشاورزیست — مرزبان زادهٔ سمرقند

سخن گزارده — خود چه گوییم تا چه و چند

را کمینه شاگردیم — عقل کل را بهینه فرزند

به برق هم نفسیم — هم به بخشش به ابر مانند

پست فیروزیم — به معاشیکه نیست خرسند

بر خویشتن همی گرییم

بر روزگار می خندیم

اردو

سہ ماہی



سہ ماہی

اُردو

شمارہ خصوصی بیاد غالب

(حصہ دوم)

جلد - ۴۵ شمارہ - ۲

اپریل ، مئی ، جون

۱۹۶۹ء

انجمن ترقّی اُردو بابائے اُردو روڈ

کراچی-۱

مجلس ادارت

اس شمارے کے مصنفین

ڈاکٹر ریاض الحسن	کراچی
ڈاکٹر محمود الٰہی	گورکھپور
بشیر احمد ڈار	ڈائریکٹر ، اقبال اکیڈمی ، کراچی
ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	استاد شعبۂ اردو ، اورینٹل کالج ، پنجاب یونی ورسٹی ، لاہور
ڈاکٹر اے ڈی ارشد	پروفیسر اسلامیہ کالج ، لاہور
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	وسکانسن (امریکہ)
ڈاکٹر حسینی شاھد	حیدر آباد دکن
جمیل جالبی	کراچی
سلیم احمد	کراچی
ڈاکٹر ابو محمد سحر	بھوپال
ڈاکٹر سید حامد حسین	بھوپال
میرزا ادیب	ریڈیو پاکستان ، کراچی
راجیندر ناتھ شیدا	دھلی
سید قدرت نقوی	ملتان
سید محمد حسین رضوی	ایگزیکٹو انجینیر ، ایم ای ایس ، حکومت پاکستان ، کراچی
محمد ایوب قادری	استاد شعبۂ اردو ، اردو کالج ، کراچی
اکبر علی خاں	رضا لائبریری ، رام پور
محمد اکرام چغتائی	مرکزی مجلس ترقی اردو ، لاہور
صمدانی نقوی	کراچی

فہرست مضامین

[۱]

•

[۲]

[۳]

اس شمارے کا سرورق

سرورق پر غالب کی جو تصویر طبع کی گئی ہے ، یہ پہلی مرتبہ سہ ماہی ''اردو'' کے اپریل ۱۹۲۹ء کے شمارے میں بابائے اردو مرحوم نے شائع کی تھی - اصل تصویر لال قلعہ دہلی کے عجائب گھر میں ہے - یہاں اس کا عکس اصل رنگوں میں مولانا خیر بہوروی (لکھنؤ) کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے - (ادارہ)

ادارۂ تحریر : جمیل الدین عالی - مشفق خواجہ

طابع : انجمن پریس ، شو مارکیٹ ، لارنس روڈ ، کراچی

ناشر : انجمن ترقی اردو پاکستان ، بابائے اردو روڈ ، کراچی

قیمت فی پرچہ : تین روپے پچاس پیسے

قیمت سالانہ : چودہ روپے

موجودہ شمارے کی قیمت پانچ روپے

تورانی کون تھے؟

ڈاکٹر ریاض الحسن

ایرانیوں کے بارے میں تو ہم کو خاصی معلومات ہیں - جب سے ایران میں میدیا کی حکومت قائم ہوئی اور اس کے بعد سائرس (Cyrus) نے اخیمینی سلطنت کی بنیاد ڈالی، اس وقت سے ایران کی تاریخ کے بہت کچھ واقعات نہ صرف عام ہو چکے ہیں بلکہ اب تک تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے اور ہر سال کچھ نہ کچھ نئی معلومات علمائے تاریخ کے ذریعے حاصل ہوتی رہتی ہیں -

قدیم تاریخ میں بعض جنگیں بہت مشہور ہوئی ہیں ، مثلاً ہندوستان میں مہابھارت کی جنگ مشہور ہے - قدیم یونان میں ٹرائے (Troy) کی جنگ نے خاصی شہرت پائی - اور اسی طرح قدیم ایران میں ایرانیوں اور تورانیوں کی جنگ ہے جو سالہا سال تک جاری رہی اور جس کو فردوسی کے شاهنامے نے لازوال بنادیا ہے -

لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تورانی کون تھے اور ان کا کون سا ملک تھا ؟ ابھی کچھ زمانے پہلے تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ تورانی قدیم ترکی قبایل سے تعلق رکھتے تھے جو ایران کی شمالی مشرقی سرحد پر آباد تھے اور ان سے ایران کی مدتوں جنگ ہوتی رہی ، مگر اب نئی تحقیق کچھ اور کہتی ہے -

آیے ہم پہلے شاهنامے سے رجوع کریں اور دیکھیں کہ وہ کیا کہتا ہے - شاهنامے میں توران ایک علاحدہ ملک دکھایا گیا ہے جو کہیں شمال کی طرف ایرانی سرحد کے پار واقع ہوا ہے - تورانیوں کا مشہور بادشاہ افراسیاب

ہے جو بڑا جنگجو ہے اور اس کے پہلوان ایرانی پہلوانوں کے مقابلے میں لڑنے آتے ہیں ۔ لیکن ایک بات یہاں قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ جب دو ایرانی اور تورانی پہلوان آپس میں نبرد آزما ہوتے ہیں تو وہ دعوت مبارزت فارسی زبان میں دیتے ہیں ۔ فردوسی نے کہیں کالیداس کی طرح کسی اور زبان کا ذکر نہیں کیا ۔ کالیداس نے اپنے مشہور ڈرامے " شکنتلا " میں جب دربار میں راجا اور پنڈتوں کے درمیان مکالمہ پیش کیا ہے تو اس کی زبان سنسکرت بتائی ہے مگر جب ایک دیہاتی یا ایک عامی پیش ہوتا ہے تو وہ پراکرت بولتا ہے جو اس وقت کی عامی زبان تھی ۔ کالیداس نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ جس طبقے کی جو زبان ہے ڈرامے میں وہی ادا کی جائے ۔

برخلاف اس کے فردوسی یہ تو ضرور بتاتا ہے کہ تورانی ایرانیوں سے مختلف تھے مگر ان کی مختلف زبان کا کوئی ذکر نہیں کرتا اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کرتا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ کسی دوسری زبان کا ذکر کرتا تو اس کے اصل قصے میں ایرانیوں کی شدید دلچسپی اسی مقام پر کم ہو جاتی کیونکہ شاید وہ اس زبان کو نہ سمجھ سکتے ۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ جب اس نے تورانی پہلوانوں کا کہیں کہیں مفصل ذکر کیا ہے، وہ ان کی زبان کا کہیں اشارہ تک نہیں کرتا ۔ دونوں طرف کے پہلوان صرف فارسی بولتے ہیں ۔

اب ایک تورانی اور ایرانی کا مکالمہ سنیے ۔ توران کے بادشاہ افراسیاب کی لڑکی منیزہ ایک ایرانی پہلوان بیژن کو دل دے بیٹھی ۔ باپ کو خبر ہوئی تو اس نے بیژن کو پکڑوالیا اور اس کو کنویں میں قید کردیا ۔ منیزہ در پردہ بیژن کی خبر گیری کرتی ہے ۔ جب ایک مدت تک بیژن ایران سے غائب رہا تو رستم ایک تاجر کا بھیس بدل کر اور کچھ سامان تجارت لے کر توران گیا تا کہ بیژن کا پتا چلائے ۔ جب منیزہ کو معلوم ہوا کہ کوئی بیژن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے ایران سے آیا ہے تو وہ رستم کے پاس گئی اور بیژن کا ذکر کرنے لگی ۔ اس پر رستم نے اس سے بے رخی برتی تا کہ رستم کی سوداگری کا راز فاش نہ ہوجائے ، رستم کی بے رخی اور غیر ہمدردانہ رویہ دیکھ کر منیزہ رستم سے یوں کہتی ہے :

به رستم نگه کرد و بگریست زار		ز خواری بیارید خون در کنار
بدو گفت کاے مہتر پر خرد		ز تو سرد گفتن نه اندر خورد

سخن گر نہ گوئی مرا غم ز پیش — کہ من خود دلے دارم از درد ریش

اس کے بعد وہ ایران کے طور طریقوں کا ذکر کرتی ہے کہ وہ اجنبیوں سے کس طرح کا سلوک کرتے ہیں :

چنیں باشد آئین ایران مگر — کہ درویش را کس نہ گیرد خبر
زدی بانگ بر من چو جنگ آوران — نہ ترسی تو از داور داوران
منیزہ منم ، دخت افراسیاب — برہنہ ندیدہ تنم آفتاب
کنوں دیدہ پر خون و دل پر ز درد — ازیں در بداں در دو رخسارہ زرد
برائے یکے بیژن شور بخت — فتادم زتاج و فتادم ز تخت

اب دیکھیے یہاں منیزہ نے سراسر فارسی زبان استعمال کی ہے اور کہیں بھی اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ منیزہ کی مادری زبان اگر فارسی سے مختلف تھی تو وہ کیا تھی -

اب ذرا تحقیق جدید کی طرف آیے اور دیکھیے اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ سائرس (۵۳۰ - ۵۵۹ قبل مسیح) اخیمینی خاندان کا پہلا بادشاہ تھا جس نے ایرانی سلطنت کو بہت فروغ دیا ۔ اس کے سامنے دو سیاسی مقاصد تھے - یعنی مغرب اور مشرق میں ایرانی حکومت کو مضبوط کرنا اور اس کی حدود بڑھانا - اب پروفیسر گرشمان (R. Ghirshman) کی رائے سنیے - پروفیسر موصوف فرانسیسی ہیں اور ایران کی تحقیقات کے سلسلے میں ان کا نام سر فہرست آتا ہے ۔ وہ علم آثار قدیمہ کے ماہر ہیں اور تہران میں قومی عجائب خانے کے افسر اعلا رہ چکے ہیں - اپنی تصنیف " ایران " (۱) میں انھوں نے لکھا ہے کہ :

> " مغرب میں سائرس کا مقصد بحیرہ روم (یعنی میڈیٹرینین) کے ساحلی علاقوں پر مع اس کی بندرگاہوں کے قبضہ کرنا تھا - ان بندرگاہوں پر وہ تجارتی راستے آ کر ختم ہوتے تھے جو مشرق میں ایران سے ہوکر گزرتے تھے اور اس طرح اس کا مقصد ایشیائے کوچک

۱- R. Ghirshman: Iran, Pelican Archaeological Series, Middlesex, 1954, P. 129.

پر قبضہ کرنا تھا ، جہاں ایڈیا کی زرخیز زمینوں کے علاوہ یونانیوں کے بحری مرکز بھی تھے ۔ مشرق میں اس کا مقصد ایران کے لیے تحفظ پیدا کرنا تھا ۔ ایران میں ایک مہذب ریاست کے قیام نے ایرانی تہذیبوں کو اپنے اندر جذب کر کے مہذب دنیا کی سرحدوں کو مشرق کی طرف بہت آگے بڑھا دیا تھا اور یہ سرحد سیحون اور جیحون تک پہنچ گئی تھی جہاں ابھی تک بیرونی ایران (Outer Iran) کے قبایل حرکت میں تھے '' ۔

یہ بیرونی ایران کیا ہے اور اس کی سرحد کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں تک پہنچتی ہے ۔ اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں ایران کا اثر ایرانی سرحد سے بہت آگے بڑھ گیا تھا ۔ مثلاً اصل ایران تو وہی ہے جو کم و بیش آج بھی ایران کی سرحد ہے ، البتہ اس کا ثقافتی اثر مغرب میں ایشائے کوچک اور مصر و شام تک پھیلا ہوا تھا ، اور مشرق میں موجودہ افغانستان اس اثر میں شامل تھا ۔ یہاں محمود غزنوی کا ذکر نہیں کروں گا کیونکہ یہ تو بہت بعد کا زمانہ ہے ، لیکن زمانۂ قبل مسیح میں بھی ایران کا اثر افغانستان اور آج کے مغربی پاکستان تک پھیلا ہوا تھا ۔ شمال میں وسط ایشیا میں جیحون اور سیحون تک اس اثر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مگر براہ راست سیاسی سرحد کم و بیش موجودہ سرحد کے قریب قریب تھی ۔ اس زمانے کے سوا جب سیاسی سرحد ایشائے کوچک اور یمن تک پھیلی ہوئی تھی ، آج بلخ و بخارا ایران سے باہر ہیں مگر قدیم زمانے میں ان پر ایرانی اثر نمایاں نظر آتا ہے ۔

ایران کے شمال اور شمال مشرق کا وہ علاقہ جس میں موجودہ ترکستان ، چینی ترکستان اور افغانستان کا شمالی حصہ شامل ہے ، اہل ایران اس خطے کو توران کہتے تھے ۔ اب یہاں ایک اور فرانسیسی محقق کی رائے سنیے ۔ کوئی سترہ سال ہوئے پیرس سے ایک کتاب La Civilisation Iranienne (ایرانی تہذیب) شایع ہوئی ۔ اس میں مختلف علما اور محققین کے مضامین ایرانی تاریخ اور ایرانی تہذیب پر شایع ہوئے ہیں ۔ اس کا دیباچہ فرانس کے مشہور مستشرق پروفیسر رینے گروسے (Rene Grousset) کا لکھا ہوا ہے ، یہ صاحب فرانسیسی اکادیمی کے رکن بھی ہیں ۔ انھوں نے ایک باب ' بیرونی ایران ' پر لکھا ہے ۔ اس میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ '' یہ سارا علاقہ (جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) جس کو ایرانی توران کے نام سے پکارتے ہیں در اصل یہ ' بیرونی ایران ' کا علاقہ ہے اور اس علاقے کی آبادی زمانۂ قدیم

میں اہل سیتھیا ، اہل سرمات (Sarmatian) اور ساس (Sace) پر مشتمل تھی اور یہ لوگ ایران کی ایک بولی بولتے تھے ۔ یہ لوگ اپنے آبا و اجداد کے طریقے پر نیم مہذب اور صحرا نورد تھے" (۱) ۔ آگے چل کر پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ " ایک مدت تک لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ توران یعنی جنوبی روس کا علاقہ اور دونوں ترکستان (یعنی روسی اور چینی ترکستان) میں ترک منگولی نسل کے لوگ آباد تھے ۔ لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ اس کا (یعنی توران کا) مطلب بیرونی ایران سے تھا ۔ اس سے مراد وہ قبایل تھے جنھوں نے نینوا اور بابل کی مادی تہذیب کا مقابلہ اسی طرح کیا تھا جیسا کہ انھوں نے زرتشت کی مذہبی تحریک کا کیا تھا" ۔ (۲) یہ لوگ ترک وطن کرکے شمالی علاقوں میں چلے گئے تھے ۔

اس ' بیرونی ایران ، کا تاریخی دور کون سا تھا ؟ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس کا دور آٹھویں صدی قبل مسیح تھا جو سیتھیا کی نسل کے لوگوں کے عروج کا زمانہ تھا ۔ اس زمانے میں صحرا نورد قبایل شمالی ایران کی سرحد پر برابر نقل مکان کرتے رہتے تھے ۔ اس طرح ایران کی آبادی گویا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی ۔ ایک تو وہ آبادی تھی جو ایرانی سرحد کے اندر شہروں میں آباد ہو کر مہذب زندگی گزارتی تھی ۔ دوسری وہ آبادی تھی جو ایرانی سرحد سے دور شمال کی طرف متحرک آبادی تھی جو ہمیشہ جانوروں کے چارے کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ برابر سفر کرتی رہتی تھی ۔ اس آبادی کا علاقہ بیرونی ایران تھا ۔ یہ آبادی جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے ایرانی زبان کی ایک بولی بولتی تھی ۔ فرانس کے مشہور سیاح موسیو پال پیلو (Paul Pelliot) اور مشہور برطانوی سیاح سر آرل اسٹائن (Sir Aurel Stein) نے کاشغر اور ختن کے علاقے میں اس صدی کے شروع میں بعض ایسے مخطوطات کا پتا چلایا تھا جن کی زبان آج مٹ گئی ہے ۔ یہ در اصل مشرقی ایران کی زبان تھی جو در اصل ایرانی زبان کی ایک بولی تھی ۔ اور یہ زبان دسویں صدی عیسوی تک رائج تھی (۳) ۔ توران کے لوگ یہی بولی بولتے تھے ۔

(i) La Civilisation Iranienne - P. 327, By Prof. Rene Grousset Payot, Paris 1952.

۲- ایضاً ۔ ص ۳۲۹ - ۳۳۰

۳- ایضاً ۔ ص ۳۰۰

اس بات کی ایک تیسری دلیل یہ بھی ہے کہ تورانیوں سے مراد ترکی قبایل نہیں ہیں ، یعنی جس زمانے میں ایران اور توران کی جنگیں ہو رہی تھیں ترکی قبایل اس زمانے میں چین کی سرحد پر منگولیا کے علاقے میں گلہ بانی کرتے اور جانوروں کا شکار کر کے یا پھر کھیتی کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے ۔ اس وقت تاریخ میں بھی کہیں ان کا نام نہیں ملتا ۔ صرف دوسری صدی قبل مسیح میں ان کا ذکر چینی مخطوطات میں توکیو (Tukieu) کے نام سے پایا جاتا ہے ۔ اس کے کوئی آٹھ سو برس بعد یعنی چھٹی صدی عیسوی میں ترکی قبایل نے منگولیا سے نکل کر وسط ایشیا میں اپنی ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی ، اور جو علاقہ آج ترکستان یا وسط ایشیا کے نام سے موسوم ہے اس پر قابض ہو گئے ، مگر توران یا تورانیوں کو ترکوں یا ترکی قبایل سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا ۔

غالبیات سے چند نوادر

اکبر علی خاں

مرزا غالب کے بارے میں کتابوں اور رسائل کی خصوصی اشاعتوں اور مضامین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء کی یادگار تقریبات کے موقع پر ہند و پاک دونوں سے اس سارے مواد کے اشاریے تیار ہو رہے ہیں۔ ان اشاریوں کی اشاعت کے بعد غالب پر کام کرنے والوں کو بڑی سہولت حاصل ہو جائے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ مرتبین نے اپنے اشاریوں میں کتابوں، مضامین اور مصنفین و مولفین کے تذکرے کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے یا نہیں کہ اشاریے میں درج حوالے کس لائبریری یا ذاتی ذخیرے میں محفوظ ہیں۔ اگر یہ نہیں بتایا گیا تو اشاریے کی افادیت بہت کم ہو جائے گی۔ 'اردوئے معلی' دھلی غالب نمبر دوم میں ایک اشاریہ غالب کے عنوان سے شایع ہوا اس میں یہ کمی محسوس ہوئی تو میں نے خواجہ احمد فاروقی صاحب کو لکھا کہ آپ آیندہ اس کو کتابی صورت میں شایع فرمائیں تو یہ ضرور بتائیں کہ محولہ مواد کہاں اور کس ذخیرے میں کس نمبر پر ہے۔ انھوں نے اس مشورے کو پسند کیا اور اب سنا ہے کہ وہ اس امر کا اہتمام کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اشاریے کا ایک اندراج یہ ہوگا :

شرح دیوان غالب از خواجہ قمرالدین راقم ، قلمی

لیکن اس اندراج کی افادیت جبھی ہوگی کہ پڑھنے والے کے علم میں یہ بھی ہو کہ یہ قلمی کتاب کہاں ہے تا کہ ضرورت کے وقت استفادے کا امکان بھی رہے۔ اسی قسم کی ایک دشواری سے غالب پر مختلف کتابوں اور مضامین کو پڑھتے وقت مجھے بھی سابقہ پڑا ، یعنی یہ کہ صاحب

کتاب نے اپنے "نقطہ" نظر سے کسی اطلاع کو استعمال کیا لیکن اس طرح کہ مجھے تمام و کمال صاحب کتاب کا محتاج رہنا پڑا - ایک مثال پیش کرتا ہوں - لالہ سری رام نے اپنے تذکرے "خمخانہ" جاوید کی جلد اول کے ص ۱۰۰ پر حافظ عبدالرحمن احسان دھلوی کے بارے میں لکھا ہے :

" انہوں ایک مرتبہ تنخواہ رک جانے کی شکایت میں ایک طویل قطعہ موزوں فرما کر حضور شاہی میں گزرانا تھا جس کی وہی زمین ہے جو مرزا غالب کے اس مشہور قطعے کی :

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

اس قطعے میں حضرت احسان نے کہاروں ، بنیے اور بنینی کی گفتگو بڑی لطیف اور معنی خیز بیان کی ہے - عجب نہیں جو مرزا غالب کو اس زمین کا خیال احسان ہی کے قطعے سے پیدا ہوا ہو"۔

لطف یہ ہے کہ لالہ سری رام نے مذکورہ قطعے کا ایک مصرع تک نقل نہیں کیا حالانکہ وہ خود اس قطعے کے لطیف اور معنی خیز ہونے کو سراہ چکے تھے ، نیز غالب کی اہمیت سے بھی واقف تھے - چونکہ اطلاع دلچسپ تھی اس لیے مجھے احسان کے قطعے کی جستجو ہو گئی - سب سے پہلے میں نے رضا لائبریری کے مخطوطہ" دیوان احسان کو دیکھا مگر مجھے بڑی مایوسی ہوئی ، اس لیے کہ اس نسخے میں یہ قطعہ موجود نہ تھا -

چند ماہ قبل جناب حکیم چند نیر نے لالہ سری رام کے ذخیرہ" کتب کی فہرست اردو ادب میں بالاقساط شایع کی - یہ ذخیرہ اب بنارس یونیورسٹی میں ہے - اس فہرست میں دیوان احسان نظر پڑا تو مجھے قوی امید ہوئی کہ مطلوبہ قطعہ اس دیوان میں ضرور ملے گا ، اس لیے کہ اسی نسخے کے پیش نظر لالہ سری رام نے خمخانہ" جاوید میں مذکورہ حوالہ فراہم کیا ہو گا - میں نے نیر صاحب کو زحمت دی ، موصوف نے کرم فرماتے ہوئے نقل سے مجھے نوازا -

احسان کے قطعے کو پڑھنے کے بعد بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے سامنے یہ قطعہ رہا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نقاش ثانی کا نقش ، نقاش اول سے کہیں بڑھ کر ہے - غالب دوسروں کے میدان میں جب بھی داخل ہوتا ہے آن بان سے اور اپنا لوھا منواتا ہوا - غالب دلی کل غالب -

غالب اور احسان دونوں کے قطعوں کے مخاطب بہادر شاہ ظفر ہیں۔ چنانچہ احسان کے مندرجہ ذیل شعر سے اس کی تائید ہوتی ہے :

جو تخلص کو تیرے ورد کرے
نہ شکست اس کو ہو کبھو زنہار

یہ مکمل قطعہ آیندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اس قسم کا مواد بہت بڑی تعداد میں ہے جس کے حوالے کتابوں اور مضامین میں مل جاتے ہیں مگر مکمل شکل میں ان کا پتا چلانا کارے دارد کا حکم رکھتا ہے۔ چونکہ آج تک بھی اردو کتابوں کے مصنفین حوالے کے قائل نہیں ہیں، اس لیے بعض اوقات مستعملہ روایات پر اعتبار کرنا جہاں محتاط طبیعت کے لیے دشوار ہوتا ہے وہیں ان کی اصل تک رسائی بھی مشکل ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ماخذ علم میں آجانے کے بعد بھی اس کے نادر اور کمیاب ہونے کی وجہ سے اصل سے استفادہ ممکن نہیں ہوتا۔

ان تمام دشواریوں کو سامنے رکھ کر میں نے ۱۹۶۰ء میں غالبیہ کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ غالب سے متعلق سارا بنیادی اور خام مواد یکجا کتابی شکل میں مرتب کر دیا جائے تا کہ محققین اور ناقدین تلاش کی زحمت سے بچ جائیں۔ اس بنیادی مواد کو میں نے کئی ابواب میں تقسیم کیا ہے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ آغاز کار میں اس کی وسعت کا مجھے اندازہ نہیں تھا، جوں جوں وقت گزرتا گیا ایک سے ایک اہم حوالہ ملتا گیا اور کتاب کئی سو صفحات تک پہنچ گئی۔ انشاءاللہ یہ کتاب شایع ہو گی تو صاحبان ذوق کو غالب سے متعلق بیش بہا ذخیرہ معلومات مل جائے گا جس کی روشنی میں غالب کے محققین اور ناقدین کی آرا اور نتائج کو پرکھنے میں بھی مدد ملے گی۔

میں نے حتی الوسع موضوع کے تمام گوشوں کی چھان بین کی ہے مگر مجھے اندازہ ہے کہ اب بھی ایسا مواد موجود ہو گا جس تک میری رسائی نہیں ہو سکی ہے۔

درمیان میں میرا ایک فائل ضایع ہو جانے سے بہت سی تحریریں ایک بار مجھ سے پھر رو پوش ہو گئیں۔ ایک آدھ حوالہ میرے کرم فرماؤں سے ایسا بھی ملا جس کا ماخذ انھیں یاد نہیں تھا۔ مثلاً غالب کے قیام لکھنؤ کے بارے میں محب مکرم نیر مسعود رضوی صاحب نے مجھے لکھا کہ غالب کی

لکھنؤ میں ایک جفار سے ملاقات ہوئی۔ امتحاناً غالب نے ایک مصرع دل ہی دل میں کہہ کر اس کے اعداد جفار کو بتائے اور مصر ع ثانی کی فرمائش کی ، جفار نے علم جفر کی مدد سے دوسرا مصرع بہم پہنچا دیا ، وہ دونوں مصرعے کچھ اس طرح ہیں :

وہ ہیں مشاق ستم اور میں ہوں مشتاق کرم
طینت ان کی اور ہے میری طبیعت اور ہے

باوجود ذہن پر زور دینے کے نبر صاحب کو یاد نہیں آتا کہ یہ واقعہ کس رسالے میں انہوں نے دیکھا تھا۔

بہر حال ابواب کی تفسیم درج کرتا ہوں ، اس درخواست کے ساتھ کہ اسے بامعان نظر ملاحظہ فرمایا جائے اور جو کچھ بھی ان کے ذیل میں آتا ہو وہ مرحمت فرما کر مجھے متشکر و ممنون بنایا جائے ۔ جیسا کہ آیندہ اوراق میں میں نے ان کرم فرماؤں کے حوالے دیے ہیں جن کے لطف سے مجھے پیش کردہ مواد ملا ہے ۔ اسی طرح میں آیندہ بھی جو صاحب میری رہنمائی فرمائیں گے ، ان کے عطیے ان کے حوالے اور شکریے کے ساتھ غالبیہ میں درج کروں گا ۔ ابواب یہ ہوں گے۔

پہلا باب : تذکروں میں غالب کا ذکر (جس طرح آیندہ اوراق میں گارساں دتاسی کے تذکرے کا اقتباس آرہا ہے) ۔

دوسرا باب : ملاقاتیوں کے بیانات (یہ باب میں ماہنامہ ''نگار'' رام پور میں شایع کر چکا ہوں) ۔

تیسرا باب : غالب کے ہم عصر اخبارات میں غالب سے متعلق اندراجات ، یہ باب '' نقوش'' لاہور کے غالب نمبر میں شایع ہو چکا ہے۔ ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔

چوتھا باب : غالب کے ملاقاتیوں سے انٹرویو (پروفیسر حمید احمد خاں کے مرتب کردہ انٹرویو معظم زمانی بیگم اور خضر مرزا سے)

پانچواں باب : غالب کی زندگی میں لکھے ہوئے ان کے ہم عصروں اور شاگردوں کے ایسے اشعار جن میں غالب کا ذکر ہوا ہے ، اس باب میں شامل ہوں گے ۔ مثلاً امام بخش صہبائی

کا یہ شعر :

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

یا میاں داد خاں سیاح کا یہ شعر :

ظل کرم ہے حضرت غالب کا بس مجھے
سر پر نہیں ہے سایۂ بال ہما نہ ہو

غالب سے متعلق قطعات جیسے آیندہ اوراق میں عارف کا قطعۂ معذرت آرہا ہے یا غالب کے بہرے ہونے پر صاحب عالم مارہروی کا قطعۂ تاریخ یا غالب کے مرنے کی غلط خبر اڑ جانے پر تاریخی قطعات ۔

اس باب میں غالب کی مدح میں قصائد بھی آئیں گے ، ان میں کا ایک قصیدہ جو عارف کا لکھا ہوا ہے آیندہ اوراق میں ملاحظہ فرمایے ۔

چھٹا باب : غالب کی کتابوں پر دیباچے اور تقاریظ اور قطعات تاریخ طبع وغیرہ ۔

ساتواں باب : غالب کی وفات پر قطعے اور مرثیے ۔

آٹھواں باب : غالب کی وفات پر مضامین ۔

نواں باب : معاصرین غالب کے ایسے خطوط جن میں غالب کا ذکر آیا ہے یا جو خود غالب ہی کو لکھے گئے ہیں ۔ (غالب کے نام خطوط علاحدہ کتابی شکل میں ' بنام غالب ' کے عنوان سے چھاپے جا رہے ہیں) ۔ آیندہ اوراق میں مفتی محمد عباس کے خطوط ملاحظہ فرمایے ۔

دسواں باب : متفرقات ۔ اس باب میں ایسی روایات درج ہوں گی جو غالب کے معاصرین سے بے واسطہ یا بالواسطہ پہنچی ہیں ۔ مثلاً امیر مینائی کے حوالے سے جلیل مانک پوری نے لکھا ہے کہ غالب سے ان کے قیام رام پور میں کسی

بہشتی نے اپنی بیٹی کے جہیز کے لیے امداد چاہی تھی اور غالب نے رام پور سے ملنے والے رخصتانے سے اس کی مدد کی ۔ اگرچہ یہ بیان امیر مینائی کے قلم سے نہیں ہے مگر جلیل مانک پوری معتبر راوی اور امیر مینائی کے عزیز شاگرد ہیں ، اس لیے اس روایت کی صحت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا ۔

[۱]

حافظ عبدالرحمان کے جس قطعے کا ذکر تمہید میں کرچکا ہوں ملاحظہ فرمایے ۔ دیوان احسان میں اس کا وہی عنوان ہے جو یہاں درج کیا جا رہا ہے ۔ قطعہ ایک غزل پر ختم ہوتا ہے جس کا قطعے کے نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں ، اس لیے صرف مطلع نقل کر کے باقی اشعار ترک کردیے گئے ہیں ۔

قطعۂ ریختہ برائے حضور والا

اے ملک ، اے پناہ جملہ ملوک اے فلک مرتبت ، ملک کردار
تجھ سے آباد ہے جہان آباد اے جہان کرم ، جہان وقار
کر تو سپہر فلک سے منہ موڑے تیرے پاؤں پہ وہ رکھے دستار
جو نخاص کو تیرے ورد رکھے اہ شکست آس کو ہو کبھو زنہار
میری طبع غیور کچھ مطلب نہ کسی سے رکھے کم و بسیار
عرض احوال بادشاہوں سے بادشاہا ، نہیں ہے لیکن عار
قطب صاحب نہے قبل ازیں جو حضور بزیارت برائے سیر و شکار
یاں شکار اپنی ہوگئی تنخواہ سیر پر ہے یہ گل کھلا یک بار
کہا جس لالہ سے کہ ' لا تنخواہ ' وہی لالہ ہوا گلے کا ہار
لالہ جیو ایسے ہو گئے لے لوٹ پوست کھینچو تو وہ نہ دیں زنہار
بلکہ دھمکائیں آلٹے وہ مجھ کو کہ رھیلہ ہے یاں کا اب مختار
سردیٔ اہل علم ہے یکسر لوٹ کی اب ہے گرمیٔ بازار
اور مختار کا تھا یہ احوال نہ تو اقرار تھا ، نہ کچھ انکار

اب تو اس کا پتا نہیں ملتا
ایک تنخواہ کا کیا تھا قرار

بادشاها ، پناہ ملت و ملک
باعث مقصد صغار و کبار

میری تنخواہ کم بہت ہے مجھے
آج دس بیس اور کل ہیں ہزار

جب دو ماهه ہے لٹ گیا میرا
میرے نوکر ہیں مجھ سے ہی بیزار

صبح کو میں کہوں کہ آنا تم
شام کو آویں گھر سے خدمتگار

آتے ہی کہویں کھچڑی دلواؤ
بھوک کے مارے نکلے ہے آچار

جب کہ پینس کو لے کے چلتے ہیں
ہیں جو زرغل سے چار پانچ کہار

ان کا معمول ہے کہ دوڑتے وقت
منہ سے بورتے ہیں اپنے کچھ ہنکار

اپنی ہوں ہوں تو ساری بھول گئے
یہی کہتے ہیں وہ پکار پکار

'' وقنا ربنا عذاب الجوع
وقنا ربنا عذاب النار ''

جب یہ صورت بنی تو بنیے سے
قرض کے واسطے کہا ناچار

کہ غریبوں کو بانٹ دوں تنخواہ
بنیا راضی ہوا بصد تکرار

اتنے میں بول اٹھی بنینی یہ
'' کیوں گنواتا ہے اپنا تو گھر بار

کیسا مورکھ ہے تیری عقل گئی
قرض دینے کو تو ہوا تیار

اس کی تنخواہ ہے حویلی میں
اے ابھوتے اسے نہ دے تو ادھار''

میرے شاہا ہیں تجھ سے دو مطلب
بار مجرا و دولت دیدار

سو کہاروں بغیر ہے مشکل
سو کہاروں بغیر ہے دشوار

ان کو تنخواہ دوں کہاں سے میں
آپ جب اس طرح کا ہوں نا چار

دل سے احسان سے ہے تجھے رغبت
دل احسان ہے تیرا شکر گزار

تیرے احسان جو نہ دیکھ سکیں
ان بخیلوں کو ہو خدا کی مار

نام احسان رہے نہ دفتر میں
چاہتے ہیں کئی یہ بد اطوار

اور میں کیا کہوں غریب نواز
میں غریب اور یہ غریب آزار

بحر یہ اور ردیف و قافیہ اور
اب غزل کے پڑھوں کئی اشعار

اتنے ہی بس سنائی جانے کی
تجھ کو خو ہے مرے کڑھانے کی

[۲]

مرزا غالب نے عارف کے مرثیے میں ایک شعر لکھا ہے :

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

دیوان عارف کے مخطوطہ' رام پور میں ایک قطعہ مع تین شعروں کے اور ایک تمہیدی قطعے کے شامل ہے جس کے مخاطب غالب ہیں اور جس سے اس شعر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے چند شعروں کا تقابل کرنے کی زحمت میں نے جناب حکیم چند نیر کو دی تھی ، ان کا شکر گزار ہوں ۔ اس قطعے کے علاوہ بھی کئی شعروں میں غالب کا ذکر آیا ہے نیز ایک مکمل قصیدہ بھی در مدح غالب شامل ہے۔ دیوان میں یہی کچھ غالب سے متعلق ملتا ہے ۔ یہ بھی عرض کردوں کہ دیوان کا بہت بڑا حصہ مدح ائمہ پر مشتمل ہے لیکن ایک قصیدہ خلیفہ' دوم حضرت عمر کی منقبت میں بھی ہے ۔ میرا خیال ہے عارف میں شیعی عقائد غالب کے زیر اثر پیدا ہوئے ہوں گے ، ورنہ عارف سنی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔

دیوان عارف میں کئی ہزار اشعار ہیں ، ان میں کہیں غالب کا فیضان نظر نہیں آتا ۔ نہایت خشک اور بے مزا کلام ہے ۔ بس ایک شعر ایسا ہے جو غالب کے تربیت یافتہ کو کہنا چاہیے تھا اور وہ یہ ہے۔

سخت شرمائے ، میں اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں
چھیڑنا تھا تو کوئی شکوہ' بیجا کرتا

اگر میں یہ کہوں کہ یہی ایک شعر دیوان عارف کا مکمل انتخاب ہے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا ۔

تمہیدی قطعہ

[یہ اک] بدیہہ قطعہ جو کرتا ہوں میں رقم
آوے پسند حضرت غالب تو واہ واہ
آتے ہیں اس طرح کے لطیفے جو فکر میں
یہ رنگ میری طبع کا ہوتا ہے گاہ گاہ

روپا ہے جس نے اپنا لگایا ہے دل کہیں
پھر کیا ہے اور گر نہیں واقع میں چاہ چاہ

قطعۂ معذرت بجناب غالب

قبلۂ جان و دل ، ترا فدوی
تجھ کو کہوے برا یہ طاقت ہے

اسد اللہ نام ہے تیرا
اس بزرگی کی کچھ نہایت ہے

ورد نام بزرگ کا تیرے
اس میں کچھ شک نہیں عبادت ہے

حق نے سب پر کیا تجھے غالب
تجھ سے روکش ہو کس کی طاقت ہے

مجھ کو زیبا ہے جتنا ناز کروں
مجھ پہ جب یہ تری عنایت ہے

نظر منشیٔ فلک کی مجھے
کچھ نہ پروا ہے کچھ نہ حاجت ہے

عرض کرتا ہوں شکوۂ حساد
گرچہ میری خلاف عادت ہے

وہ سبب میں بیان کرتا ہوں
ان کی جس وجہ یہ شرارت ہے

فیض صحبت سے تیری ، تیرا غلام
جو بہ دل قائل امامت ہے

سنی اس زمرۂ خوارج میں
ہدف ناوک ملامت ہے

نیر و محو ہیں مرے دشمن
آسماں کی انھیں نیابت ہے

بات ان کی لگے ہے پتھر سی
دل میں ان کے زبس قساوت ہے

ان کی کیا کیا صفت کروں تحریر
ایک آفت ہے اک قیامت ہے

ایک جلتا ہے رشک سے دائم
بسکہ عزت اسے نہایت ہے

دوسرا محو کینہ جوئی ہے
یہ ہمیشہ سے اس کی عادت ہے

زور کرتے ہیں ناتوانوں پر
زور ہے گر یہی شجاعت ہے

ہیں یہ سارے جہان کے جھوٹے
قول میں ان کے کب صداقت ہے

(ص ۶۷۰ - ۶۷۱)

متفرق اشعار

بلبل باغ معانی کیوں نہ ہو عارف نظر
دیکھتے ہیں حضرت غالب کا دیواں روز و شب (ص ۳۳۲)

نازم بطبع خویش کہ ایں مطلع مرا
بر چشم روح عرفی جادو بیان نہاد
" از کف قلم دبیر فلک بر کراں نہاد
چوں خامہ در کفم اسداللہ خاں نہاد " (ص ۳۰۶)

عارف لبوں پہ حضرت غالب کے دھیان ہے
اوروں کی ، شاد ہوتے نہیں ، واہ واہ پر (ص ۳۶۲)

حضرت غالب کی شاگردی کا ادنا ہے یہ فیض
عقل اول کے جو عارف ہوگئے استاد ہم (ص ۴۱۰)

عارف ہوئے ہیں حضرت غالب کے خوشہ چیں
کیوں کر نہ ایک رکن ہوں ملک سخن میں ہم (ص ۴۱۶)

پایا نہ کوئی حضرت غالب کا ہم زباں
عارف ہم اس تلاش میں ایراں تلک گئے (ص ۵۰۷)

قصیدہ در مدح غالب

مداد سے رہے تاریک تر جہان سخن
جو طبع تیری نہ ہو مہر آسمان سخن
سوائے تیرے بھلا اس میں کون ہے یوسف
جو فرض کیجیے عالم میں کاروان سخن
لگے نہ بیلک مضموں نشان معنی پر
جو دست فکر میں تیرے نہو کمان سخن
لکھا جو دائرہ وہ ہو گیا بہ شکل درم
قلم ہے تیری مگر دست زر فشان سخن

ز بسکہ منہ سے لگایا ہے تو نے ڈرتا ہوں
کہ کھل گئی ہے غضب ان دنوں زبان سخن

کلام حق کے مقابل کہیں نہ ہو جاوے
بڑھی ہے حد سے سوا اب شکوہ و شان سخن

سخن ورا تری طبع بلند کی دولت
ہنسے ہے عرش کی پستی پہ آستان سخن

ہزار جزو میں اک حرف کی لکھے تشریح
ازل سے ذات تری ہے وہ رازدان سخن

عجب ہے مجھ کو نہ کیوں مہد میں ہوا گویا
سرشت میں ہے زباں تیری تو امان سخن

نکال تو نے لیے سب لآلی معنی
رہا ہے نام کو اک بحر بیکران سخن

جلو میں اس کے چلے نفس ناطقہ دایم
زبان لال کو سونپے جو تو عنان سخن

جو آنکھ ہو تو کرے سیر تیرے دیواں کی
جہاں میں جس نے نہ دیکھا ہو گلستان سخن

سنا ہے تیرے لیے جب کیا بروز ازل
دبیر چرخ نے آراستہ مکان سخن

طناب فکر تری جب تلک نہ ہاتھ آئی
نہ ایستادہ ہوا اس سے سائبان سخن

نمک کلام کا تیرے نہ ہو تو کچھ بھی نہیں
بھرا ہو لاکھ اگر نعمتوں سے خوان سخن

کتابہ در جنت ہے تیری ہر تحریر
ترے ہی ہاتھ میں ہے ارتفاع شان سخن

نہ چشم شاهد معنی هو سرمہ گیں کیوں کر
ترے سبب سے ہے آرایش جہان سخن

فسوں ہے یہ تری مشاطہ٭ طبیعت کا
دوات و خامہ هوے میل و سرمہ دان سخن

سخن ورا ترے رد و قبول سے ہے مراد
سوائے اس کے نہیں نفع اور زیان سخن

دعا دوام سخن کی نہ کس طرح مانگوں
ادا شناس کہیں تجھ کو جب کہ جان سخن

وہ اس میں مغز جو تھا تو نے سب نکال لیا
یہ جھاڑتے هیں عبث لوگ استخوان سخن

فلک پہ بھی ایسے بڈھلا کے هووے شرمندہ
ترا جو ذهن رسا هووے میہمان سخن

جو اختیار کرے تو سکوت احیاناً
جہاں میں رهوے نہ پھر نام کو نشان سخن

ورق ورق ترے دیواں کا رشک گلشن ہے
هوا ہے خامہ ترا جب سے باغبان سخن

بناں تری دم تحریر مل کے غنچہ بنیں
قلم ہے شاخ تر گلبن جنان سخن

ترا وہ غور ہے تحت الثریٰ کی لائے خبر
چھپا کے گوهر معنی رکھے جو کان سخن

همیں نہ اس کا ذرا مدعا کھلا عارف
دراز کی ہے یہ کیوں تو نے داستان سخن

وہ کون شخص ہے هم بھی تو اس کا نام سنیں
کہ جس کے تحت و تصرف میں ہے جہان سخن

مگر کہیں اسد اللہ خان غالب ہے
سوائے اس کے نہیں کوئی مہربان سخن
کسی کا اب کوئی مضمون چرا نہیں سکتا
ہوا وہ جب سے جہاں میں نگاہبان سخن
کسی کی بات کوئی کاٹ دیوے کیا ہے مجال
ہوا ہو روز ازل سے وہ جب ضمان سخن
متاع روئے دکاں ہے کلام جوہر کل
وہ اس کے پاس ہے سرمایہ دکان سخن
وہ اس کی ہستیٔ افکار ہے غلط فہمو
جو اپنے زعم میں ٹھہراؤ لا مکان سخن
نہیں ہے شک کہ ہے اس کی زبان پر عاشق
ہزار بار کیا ہم نے امتحان سخن
نہیں ہے اس میں مگر شیوۂ ستمگری
علو شان سے ہے گو کہ آسمان سخن
دبیر چرخ نے کی اس کی جب ثنا ترقیم
قلم کو اس کے لکھا سرو بوستان سخن

ق :

ہوا ہے بند عدو جانتے ہو کس باعث
کہ بات اس نے جو کی اس کے درمیان سخن
موثر اس کی جو شیرینیٔ کلام ہوئی
لبوں کے ساتھ ہوا بند خود دہان سخن
ہمیشہ آب سے تر رہوے تیری تیغ زبان
رہے جہان میں جس روز تک بیان سخن
شرف ہے کان بلاغت کو تیرے گوہر سے
ترے ہی واسطے مخصوص ہے مکان سخن

بجز فضائے معانی کہاں ہو استادہ
بنا ہے تیرے لیے یہ جو سائبان سخن
جلیں حسود ترے ، گرمیٔ مضامیں سے
زبان خلق پہ جب تک ہے داستان سخن
(ص ۱۰۶ تا ۱۰۹)

[۳]

اس سے پہلے آپ احسان کا ایک قطعہ ملاحظہ فرما چکے ہیں جس کا اتباع غالب نے کیا تھا ۔ اب ایک مثنوی ملاحظہ ہو جس میں غالب کا اتباع کیا گیا ہے ۔ رسالۂ دہلی سوسائٹی کے شمارۂ دوم ۱۸۶۶ء میں علاءالدین احمد خاں علائی کا ایک مضمون " تاریخ اردو زبان " شایع ہوا ہے ۔ اس میں ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں :

" ... افضل المتاخرین و اکمل المتقدمین اوستاذی و عمی میرزا اسداللہ خاں غالب اور نواب ضیاالدین احمد خاں نیر رخشاں اور عزیزی و اخی ثاقب محنور و سالک و رضوان سامہم اللہ تعالی ، صہبائی و آزردہ و مومن و شیفتہ و سوز و عارف و ذوق و اشکی و حسرت و رشکی و محو و حیا و کوکب وغیرہم یہ بڑے نامی سخن سنجان زبان اردو اور شیریں کلامان ریختہ ہیں ۔ ... اگرچہ اہل لکھنؤ نے اپنی زبان کی آراستگی پر کوشش اچھی کی اور بہت پاکیزہ شیوہ و رنگ پر نثر ہائے اردو لطیف لکھتے ہیں مگر اس شہر میں اب بھی اچھے لوگ باقی اور آن کی عبارات اردو پاکیزہ و دلچسپ ہیں ۔ بایں ہمہ یہ ایک شیوۂ خاص مذاق انگیز جو حضرت اوستاذی و عمی مولانا غالب نے نکالا ہے ، یہ کسی کو نصیب نہیں ۔ حق یوں کہ طرح بنائے ریختہ حضرت ہی نے ڈالی اور خود ہی موجد اور خود ہی مکمل اس کے ہیں ..... "

اس مضمون میں جس کی تاریخ تحریر پنجم مئی روز دو شنبہ ۱۸۶۶ء ہے غالب کی مثنوی الیہ کو نمونہ بنا کر علائی نے زبان اردو کی توصیف میں ایک مثنوی لکھی ہے اور خوب لکھی ہے ۔ مکمل مثنوی نقل کی جاتی ہے ۔

مثنوی در توصیف زبان اردو

ہاں دل نغمہ سنج زمزمہ ساز　　کیوں نہ کھولے در خزینۂ راز
بارے اردو کا کچھ بیاں ہوجائے　　خامہ طوطی خوش زباں ہوجائے

ہے در درجک بیان اردو　　زیور شاهد زبان اردو
ہے زباں ایک اور چار مزے　　اس کی ہر بات میں ہزار مزے
یوں تو ہر قوم کی زباں ہے خوب　　اس کا اس رنگ میں بیاں ہے خوب
پر یہ ترکیب دلپسند کہاں　　لفظ و معنیٔ ارجمند کہاں
دلربا اس کے بذلہ‌ہائے عجیب　　جانفزا اس کے نکتہ‌ہائے غریب
معنی و لفظ اس کے جاں پرور　　حسن ترکیب خود جہاں پرور
میں کہوں کیا کہ یہ زباں کیا ہے　　لطف کیا ، وسعت بیاں کیا ہے
آسمانی زباں سے ملتی ہے　　رتبے میں آسماں سے ملتی ہے
لیک مانے نہ دہمہ ور اس کو　　آسمانی کہوں اگر اس کو
ملکوتی کی یہ زباں کب ہے　　اس کا یہ شیوۂ بیاں کب ہے
خاصہ یہ اردوے جہاں آباد　　مستمع کی ہو جس سے جاں آباد
آسماں پر اگر فرشتہ جائے　　یہ زباں میں مزے کہاں سے لائے
لاکھ عالی ہو ہم سے شان ملک　　ایسی ستھری کہاں زبان ملک
ہم بنے خاص اس زباں کے لیے　　نہ بنی یہ زباں جہاں کے لیے
یا خدا تا رہے زمین و زماں　　تا رہے ہند کا زمیں پہ نشاں
اہل دہلی کی یہ زباں رہے　　حسن تقریر اور بیان رہے
لطف حکام عہد سے یہ زباں　　رونق تازہ پاوے اے منان

(ص ۶۸)

[۴]

کارساں دتاسی کی ' تاریخ ادبیات هندی و هندوستانی ' تاریخ کے ساتھ ساتھ اردو شعرا کا تذکرہ بھی ہے - اردو میں اس کے حوالے جہاں تہاں مل جاتے ہیں مگر ابھی تک غالب کے بارے میں مکمل اندراجات سامنے نہیں آئے - میری درخواست پر جناب ڈاکٹر سید حمیداللہ صاحب (پیرس) نے درج ذیل ترجمہ غالب عنایت فرمایا ہے - اس میں کئی جگہ حواشی کی ضرورت محسوس ہوئی مگر فی‌الحال طوالت کے خوف سے اصل کے ترجمے ہی پر اکتفا کیا گیا ہے - ' غالبیہ ' میں ان پر حواشی بھی ہوں گے جن میں دتاسی کی اغلاط کی نشان دہی کی جائے گی -

" (ص ۴۷۵) غالب نمبر ۲ - نجم الدولہ دبیرالملک اسداللہ خاں بہادر دهلوی ، المعروف بہ مرزا نوشہ ، فرزند عبداللہ بیگ خاں سمرقندی ، ایک مشہور ترک خاندان سے تعلق تھا جو گستاسپ کی اولاد سے سمجھا جاتا ہے۔ ولادت آگرے میں ۱۲۱۲ھ /۸-۱۷۹۷ء میں ، رہائش دھلی میں - اس زمانے میں جب شیفتہ اپنا تذکرہ لکھ رہا تھا ، آخری مغل بادشاہ کا شاعر دربار [تھا]۔ شیفتہ عام طور پر اسلوب میں سادگی پسند تھا (۴۷۶) لیکن اس [غالب] کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز القاب استعمال کرتا ہے اور اسے شیراز و اصفہان کے بہترین شاعروں کا مثیل سمجھتا ہے - کریم بھی اتنی ہی مبالغہ آرائی کرتا اور کہتا ہے کہ وہ اسے عرب متنبی وکعب ، اور ایران کے انوری و خاقانی پر ترجیح دیتا ہے -

''غالب نے مرزا عبدالقادر بیدل سے درس لیا، چنانچہ غالب شروع میں اس کے اسلوب کی نقل کرتا رہا ، پھر اپنے خصوصی اسلوب کو اختیار کیا - اس کا ایک هندوستانی دیوان ہے جس میں اس نے ایک انتخاب دھلی میں ۱۸۶۳ء میں شایع کیا - آٹھ صفحی تقطیع ، ۱۶۹ صفحے ، ۱۷۹۰ بیتیں ، عنوان کتاب : دیوان مہر نوشہ - اخبار عالم ، میرٹھ مورخہ ۲۵ جولائی ۱۸۶۷ء کے مطابق اس کا ایک ایڈیشن آگرے میں بھی چھپا - لکھنؤ میں ۱۸۶۴ء میں تحت عنوان دیوان غالب اس میں اکیس سطری ۱۰۴ صفحے هیں ، کالپوری ایڈیشن ۱۸۶۳ء آٹھ صفحی تقطیع ۱۰۴ صفحے - اس نے خاص کر فارسی میں نظمیں لکھی هیں - اس کے فارسی دیوان میں کوئی دس هزار اشعار هیں - اسے منشی نورالدین نے ۱۸۴۷ء میں چھاپا - نولکشور لکھنؤ نے کلیات کو چھاپا ہے جس میں فارسی بیتیں هیں : مثنوی ، غزل ، بے نظیر ، نیز عرفی کے قصائد -

''کریم الدین نے اردو اشعار کا انتخاب دس صفحوں میں دیا ہے - اس کا تخلص اسد رہا ہے ، سرور اور کریم الدین کے تذکروں میں اس کا اسی نام کے تحت ذکر ہے - اس میں هندوستانی رواج کے تحت اس کا فارسی تخلص الگ رہا ہے اُردو تخلص الگ - چونکہ اس نے آغاز فارسی سے کیا اس لیے اولاً اسد تخلص رہا ، پھر غالب - سرور نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ وہ ریختہ نظموں میں (ص ۴۷۷) فارسی محاوروں کو اُردو لباس پہناتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کے اُردو اشعار اردو سے زیادہ فارسیت لیے هوئے هیں -

" مہری ہی طرح اشپرنگر نے بھی دو اسداللہ خاں غالب کا ذکر کیا ہے۔ ایک زیر بحث مرزا نوشہ ، جس کا ذکر وہ شیفتہ کے بعد کرتا ہے ، دوسرے نواب اسداللہ خاں غالب دھلوی المخاطب سیدالملک قیوم جنگ (۱) ۔ اس آخرالذکر کا ہم اوپر ذکر چکے ہیں ۔

" اسداللہ غالب کی وفات ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۹ء میں ۷۳ سال کی عمر میں ہوئی (۲) ۔ اس کے بہت سے شاگرد ہوئے ہیں جو اس کے بعد عرصے تک زندہ رہے ۔ مشہور ترین شاگردوں میں سے ایک محمد مردان علی رعنا ہے ۔

"غالب کی کوئی غزل مل جانا ھندوستانی اخباروں کے لیے خوان یغما ہوا کرتا تھا ۔ مدراس کے اخبار صبح صادق مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۶۰ء میں مجھے ایسی ایک غزل ملی ہے جس کا قافیہ پالو ہے ۔

" آنجہانی میجر فلر نے مجھے غالب کی ایک تالیف درفش کاویانی دکھائی تھی ۔ اس میں ادبی بحثیں ، برہان قاطع میں سے مشکل الفاظ پر بحث ہے ۔ برہان قاطع وہی کتاب ہے (۳۷۰) جو قاطع برہان سے بھی موسوم ہے ، اس میں اس کتاب کے نام کی طرف تلمیح ہے جس کی تنقید کی گئی ہے ۔ وہ لکھنؤ میں ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ ء میں چھپی ہے ۔ تقطیع ۱۸ صفحے ۔

"اودھ اخبار مورخہ ۱۶ مارچ ۱۸۶۹ء میں اس کی وفات پر جو نوٹ چھپا ہے اس کے اقتباسات ذیل میں درج ہیں :

" دھلی کی رونق کے زمانے میں جو مشہور اہل قلم گزرے ہیں وہ سب وفات پاچکے ہیں ۔ ایک بچ رہا تھا وہ بھی چل بسا ، اب ان میں سے ایک بھی باقی نہیں رہا ۔ میرا اشارہ شیر لیشکر فصاحت ، بلبل زبان شیرین فارسی

۱- تذکروں میں التباس ہے ، مکرم الدولہ نامی ایک اور غالب کا ہم آگے ذکر کریں گے ۔ ایک تذکرہ نگار نے اسے بھی طالب جنگ کا نام دیا ہے ۔

۲- اس کی تاریخ وفات سرکاری اخبار ، لاہور ، مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء میں منشی وزیر سنگھ پروفیسر دھلی کالج نے دی ہے ۔ ایک اور اس کے پوتے خداداد بیگ شوق نے اودھ اخبار مورخہ ۲۳ فروری میں ۔ ایک تیسری منشی اوصاف علی نے جو غالب کا شاگرد تھا ، اسی اخبار میں ۴ مئی کو دی ہے ۔

اسد اللہ خاں غالب کی طرف ہے جو مرزا نوشہ کے نام سے مشہور تھے، وہ اس جہان فانی سے عالم باقی کی طرف روانہ ہوگئے۔ مگر ان کا نام زمین پر برقرار رہے گا۔

"ہندستان میں کوئی لکھا پڑھا شخص ایسا نہیں جو اس کی قلمی پیداوار سے واقف نہ ہو اور اسے با کمال نہ مانتا ہو۔ ایسے شخص کے حالات فائدے سے خالی نہیں۔ ہم غالب کی خود نوشت سوانح عمری کا خلاصہ درج کریں گے جو اس کی ایک فارسی کتاب میں ملتی ہے:

"میرا شجرہ نسب ترکستان کے بادشاہ افراسیاب سے جا ملتا ہے، افراسیاب کا چراغ حکومت کیانیوں نے گل کیا اور اس کے اقربا جنگلوں پہاڑوں میں بھاگ گئے لیکن اچھی تلوار کا بل دور نہیں ہوتا۔ چنانچہ عسکری صلاحیتوں کے باعث یہ لوگ گزر اوقات حاصل کرتے رہے۔ کئی صدیوں بعد مکرر ان کی قسمت جاگی، اور تلوار نے انہیں تاج دلایا۔ کیونکہ انہیں لوگوں نے سلجوقی حکومت قائم کی۔ مگر کچھ عرصہ بعد اس کو بھی زوال آیا۔ اس پر ہمارے خاندان کے لوگ سمرقند جابسے (۹۷۳) جہاں اور بھی شرفا تھے۔ پھر کوئی سوا سو سال پہلے ہمارا جد امجد ہندوستان آیا۔ شرافت خاندان اور صلاحیت شخصی دونوں کے باعث اسے پرگنہ پہپو کی حکومت ملی۔ میرا باپ میدان جنگ میں مارا گیا جب کہ میں کم عمر تھا۔

"غالب کی ولادت ۱۲۱۲ھ/۸-۱۷۹۷ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم چچا سے ملی جو sougson کے پرگنے کا گورنر تھا۔ مگر وہ بھی جلد چل بسا اور اس کی جاگیر سرکار نے واپس لے لی۔ غالب کے اجداد نے کئی لاکھ کی جائداد آگرے میں چھوڑی تھی مگر انقلاب زمانہ سے غالب تہی دست ہوگیا۔ آخر بڑی مشکلوں کے بعد سرکار سے ساٹھ روپے (۱۰۰۰ فرانک) کا وظیفہ ماہوار بطور امیر مقرر ہوا کیونکہ یہ شاہی زمانہ تھا۔ وہ بچپن ہی سے بہت ذہین تھے لیکن تعلیم جیسے چاہیے نہیں ہوئی تھی۔ وہ کچھ لکھتا تو تفریح طبع کے لیے ہوتا، فرض منصبی کے طور پر نہیں، میلان شاعری کی طرف تھا اور بڑی صلاحیت تھی، اس لیے فارسی کی طرف مڑا اور واقعی اس نے کمال دکھایا۔ خیالات واقعی بلند اور لطیف تھے۔

"اردو ہمارے ملک کی زبان ہے۔ یہ اس لیے بھی صحیح ہے کہ فارسی کا

رواج بند کر دیا گیا ہے ۔ مگر غالب نے پھر بھی فارسی کو پسند کیا ۔ اس کے باوجود اس کی اعلیٰ نسبی اور قابلیت ذاتی کے باعث حکومت نے اسے مرتے دم تک ایک وظیفہ مقرر کردیا تھا اور وہ اس کا اعزاز و اکرام کرتی رہی ۔ بہت سے راجہ اور نواب بھی اس کی عزت کرتے رہے ۔

''اس کی تالیفات بہ کثرت ہیں ۔ ان میں سے اہم سات ہیں: (۱) فارسی دیوان جس میں کوئی دس ہزار بیتیں ہیں ۔ (۲) مہر نیمروز ، نثر میں خانوادۂ تیمور کی تاریخ از ابتدا تا اختتام ، عصر ہمایوں ، آئین اکبری کی نہج پر ہے ، اگرچہ وہ مختصر ہے لیکن اس میں ایچ پائی جاتی ہے (۳۸۰) (۳) دست بو ، ستاون ڈائری ، اس میں کوئی عربی لفظ نہیں برتا گیا ہے ، دساتیر کے اسلوب پر ۔ (۴) پنج آہنگ ، اس میں چند خط ، چند پیش لفظ ، یا کلمۃ الختام ہیں ، نثر میں ہے ۔ چند محاوروں اور اصطلاحوں کے معنی بھی بتائے ہیں ۔ فارسی کے کچھ قاعدے بھی لکھے ہیں ۔ یہ بہت مفید اور پڑھنے میں دلچسپ ہے ۔ (۵) قاطع برہان ، جو برہان کی تردید میں ہے ۔ یہ برہان قاطع کے نام کو الٹ کر لکھا ہے ۔ نظرثانی کے بعد غالب نے اسے درفش کاویانی سے موسوم کیا ۔ اس میں برہان قاطع کی غلطیاں بتائی گئی ہیں ۔ مگر بعض لوگ تعصب سے اس کے خلاف رہے (۶) ، دیوان ریختہ ، مختصر ہے مگر عربی مثل ہے ماقلّ و دلّ ہی قابل ترجیح چیز ہے ۔ (۷) اکمل المطابع نے غالب کے سارے رقعے جمع کر کے اردوی معلیٰ کے نام سے چھاپے ہیں ۔ یہ کتاب بہت مفید ہوگی مگر ابھی تک شایع نہیں ہوئی ہے'' ۔

''ان کے علاوہ غالب نے کئی مختصر مثنویاں اور بہت سے رسالے لکھے ہیں جن کی تفصیل طویل ہوگی ۔ مرتے دم تک اس کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلی جس میں لطف نہ ہو ۔ اس کے جملے محاورے لوگ اس طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح کھانے میں نمک ۔

'' اس ولادت ۱۲۱۲ھ / ۸-۱۷۹۷ء اور وفات ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء کے باعث اس نے ۷۳ سال عمر پائی ۔ آخری سانس تک سارے حواس ٹھیک تھے صرف (۳۸۱) سماعت گھٹ گئی تھی جس کے باعث لوگ لکھا کرتے تھے ۔

''اس نوٹ کے بعد اودھ اخبار میں کئی فارسی اردو تاریخیں جو اس کی وفات پر نکالی گئیں درج کی ہیں ۔ ایک میں انیس بیتیں ہیں جو مرزا قربان

علی بیگ خاں سالک نے لکھی ہے۔

" اس کے بعد کے دن اودھ اخبار مورخہ ۲۲ مارچ میں غالب پر ایک اور مضمون ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

غالب کی یادگار قائم کرنی چاہیے

اس سے زیادہ کوئی بات صحیح نہ ہوگی کہ رخصت ہونے والا ممتاز شخص ہندوستان کا خاتم الشعرا تھا۔ حقیقی شاعری اس کے ساتھ گویا ختم ہو گئی۔ اس کے کمال نے ہندوستان کو ریجھ لیا تھا۔ ایسے باکمال شخص کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی یادگار قائم کرنی چاہیے۔ سب سے زیادہ یہ فریضہ اس کے شاگردوں کا ہے۔ اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ وہ اس بارے میں جلد کوئی تجویز پیش کر کے استاد نوازی کا ثبوت دیں۔ میری ناچیز رائے میں دہلی کے مشاہیر کی ایک خصوصی کمیٹی بنانی چاہیے جو متفقہ طور سے کوئی قطعی تجویز منظور کرے۔ پھر اس پر جو صرفہ آئے گا اس کی اطلاع دی جائے اور چندہ کر کے اسے پورا کیا جائے، اپنی حد تک میں ایک علمی یادگار کی تائید میں ہوں یعنی ایک کتاب شایع کی جائے جس میں اردو اور فارسی میں اولاً غالب کی سوانح عمری ہو جو صحیح اور دلچسپ حالات پر مشتمل ہو۔ پھر اس کے سارے شاگردوں کے مرثیے ہوں گے، نظم میں بھی نثر میں بھی (ریختہ و مرثیہ جو اس کی وفات پر اس کے شاگرد لکھیں) پھر ہر شاگرد کی مختصر سوانح عمری بھی ہوگی۔ کتاب کے ۲ دو حصے ہوں، ایک اردو میں ایک فارسی میں۔ مگر ہر چیز صرف غالب کے شاگردوں کے قلم سے ہونی چاہیے۔ (۳۸۲) اگر محبان غالب بھی کچھ لکھنا چاہیں تو اسے بطور ضمیمہ شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس میں غالب کی ایک تصویر بھی ہو۔ غالب کے شاگردوں کی مکمل فہرست بھی ہو۔ ہر شاگرد اور ہر مضمون نگار کو ایک ایک نسخہ بھیجا جائے اور باقی فروخت کیے جائیں۔

اگر میری تجویز پسند ہو تو غالب کے شاگرد اپنے استاد کی پبلک طور پر قدردانی کا ثبوت دیں گے اور غالب کے دیوان ہی کی طرح یہ یادگار رسالہ بھی یادگار رہے گا۔

اگر اس کی جگہ مجوزہ کمیٹی کوئی اور اس ہندوستان کے ایک مفقود شدہ شاگرد کی یادگار سے پسند کرے تو وہی مناسب ہوگا۔

دستخط محمد مردان علی رعنا، شاگرد غالب

[۵]

''سوانح اسلاف، مصنفہ محمد عزیز اللہ شاہ عزیز معروف بہ منشی ولایت علی خاں ولایت، سنہ ۱۳۲۱ھ میں لکھی گئی اور بعض مضامین کے اضافے کے ساتھ سنہ ۱۳۴۶ھ میں ادبی پریس لکھنؤ میں چھپی۔ 'خواب و خیال دنیا' اس کا تاریخی نام ہے۔ مصنف کتاب کے بزرگ کئی پشتوں سے فن انشا میں نام آور ہوتے چلے آئے تھے۔ منشی فیض محمد فائز آصف الدولہ کے وزیر حیدر بیگ خاں کے پیش دست تھے۔ ان کے بیٹے منشی رونق علی خاں رونق سعادت، علی خاں کے عہد میں ملازم ہوئے اور غازی الدین حیدر کے عہد میں میر منشی ہو گئے اور امرا میں شمار ہونے لگے۔ ان کے بیٹے منشی ثابت علی خاں، نصیرالدین حیدر کے عہد میں امیرالانشا ہوئے۔ ان کے بیٹے منشی یحییٰ علی خاں، محمد علی شاہ کے عہد میں اخبار گشتی کے داروغہ مقرر ہوئے۔ امیرانہ شان سے رہتے تھے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں بھی ان کا یہی عہدہ رہا۔ واجد علی شاہ نے ان کی ذاتی تنخواہ مقرر کی۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد وہ صفی پور میں رہنے لگے۔ ان کے بیٹے منشی ولایت علی خاں ولایت شاہ خادم صفی محمدی صفی پوری کے مرید اور سجادہ نشین ہو گئے۔ سنہ ۱۲۸۶ھ میں ان کے مرشد نے ان کو فقیر کرکے عزیز اللہ شاہ نام رکھا، اس وقت سے انھوں نے اپنا تخلص عزیز کردیا، مگر کبھی کبھی ولایت بھی تخلص کرتے تھے۔ نظم و نثر کی چھوٹی بڑی ۳۷ کتابیں آن کی تصنیف سے ہیں جو تقریباً سب شایع ہو چکی ہیں۔

اس کتاب سے اقتباسات اور مصنف کے بارے میں معلومات مخدوم محترم جناب سید مسعود حسن رضوی لکھنؤ کا عطیہ ہیں:

غالب دہلوی سے اصلاح لینے کا حال

چند روز کے بعد معاش کی سرگردانی میں سندیلے پہنچا۔ جیسے اوپر گزر چکا، چودھری حشمت علی مرحوم کے یہاں مولوی لیاقت حسین، چودھری محمد عظیم، چودھری نصرت علی، چودھری رضا علی وغیرہم کو پڑھاتے تھے۔ نثر و نظم کے سبب سے مجھ پر مہربان ہوئے اور اصلاح دی کہ دہلی میں اسداللہ خاں غالب فارسی کے استاد ہیں۔ ان سے رسم کتابت جاری کرنا چاہیے کہ اصلاح کلام قبول کریں۔ مجھ کو تنگی معاش سے کچھ یاد نہ تھا۔ ان کے کہنے سے پرانا حال یاد آیا۔ وہ یہ ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد میں جب میں نو دس برس کا تھا سید احمد حسین میکش تخلص جوان خوبصورت غالب کے شاگرد لکھنؤ میں

آنے تھے اور جناب والد ماجد مغفور اور مرحوم منشی احمد علی سے اور ان سے نہایت رابطہ تھا اور اکثر یہیں بیٹھے رہتے تھے اور غالب نے یہ قطعہ اپنے دیوان میں لکھا ہے ۔ قطعہ :

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم ۔۔۔ شان عجب و شوکت دیگر داریم
در میکدہ ہیریم کہ میکش ازماست ۔۔۔ در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

اور عم مرحوم منشی احمد علی نے ان کی چار غزلیں ایک بیاض پر لکھ لی تھیں ۔ ان میں سے ایک مطلع یہ ہے :

جاں بسکہ بجاں ز یارب آید ۔۔۔ ناچار بپرسشں لب آید

جب یہ سب باتیں یاد آئیں ، ان کے پتے سے غالب کو خط لکھا اور انہوں نے قبول کیا اور لکھا کہ میکش کو گوروں نے مار ڈالا اور تاسف ظاہر کیا ، پھر تین سال یا کچھ زیادہ میں اپنا کلام بھیجتا رہا ۔ اس میں کی چند غزلیں دیوان ولایت میں ہیں ، الا میں نے اب نظر ثانی سے سب کو اپنی مرضی کے موافق کر لیا ہے اور اصلاح والے اشعار بدستور ہیں ۔ اور پنج رقعہ بھی بھیجا تھا اس میں کہیں ایک حرف نہیں بنایا اور مکرر لکھا کہ اس میں کہیں بنانے کی گنجایش نہیں ۔ اور انہیں دنوں میں یہ خبط ہوا کہ 'فسانہ عجائب' کو تمام و کمال فارسی میں نظم کیا اور اس کو بھی بھیجا ۔ غالب نے عذر لکھا کہ " یہ کتاب بڑی ہے اور عمر ۶۲ برس کی ہے آنکھیں کام نہیں دیتیں اور دل و دماغ دونوں ضعیف ہیں ۔ میں نے لکھا کہ اگر آپ نہ بنائیں گے تو میں چاک کر ڈالوں گا ۔ پھر یہی کیا اور ان کو لکھا کہ آپ ہی چاک کر ڈالیے ۔ مگر انہوں نے چاک نہیں کیا اپنے ایک شاگرد کو دے دیا ۔ پھر واللہ اعلم کیا انجام ہوا ۔ اور جب انہوں نے عذر لکھا میں نے زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ جانا اور غور و فکر سے کہنے لگا ۔ اور سنہ بارہ سو اسی کے بعد آپ ہی اپنے کلام کا معترض بن گیا ۔ پہلا دیوان فارسی بالکل چاک کر ڈالا ۔ اس میں کی ایک غزل دیوان ولایت میں ہے وہ بھی پوری نہیں ۔ (ص ۱۱۶ - ۱۱۸)

استاذی غالب دہلوی کا خط

خانصاحب عنایت مظہر سلامت ۔ آپ کا مہربانی نامہ آیا ۔ اوراق پنج رقعہ نظر نروز ہوئے ۔ خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں ۔ نگارش تمہاری پنج

رقعہ' سابق کی تحریر سے لفظاً و معناً بڑھ کر ہے۔ اس میں یہ معانی نازک اور الفاظ آبدار کہاں۔ مگر ایک امر سے میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ یہ نثر ظہوری کی نہیں ہے۔ ارادت خاں متخلص بہ واضح عالمگیری سرداروں میں ایک شخص تھا، مینا بازار اور پنج رقعہ اس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ توالی کثرت (۱) کی طرز ایجاد کی ہوئی اس کی ہے۔ موجد سے مقلد بہتر نکلا یعنی تم نے خوب لکھا۔ ع

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

جہاں آپ نے فقیر کا مطلع لکھا ہے وہاں آپ بہ عرف میرے معروف (۲) ہوئے ہیں۔ متوقع ہوں کہ یا میرا شعر نکال ڈالو یا عرف کی جگہ تخلص لکھ دو۔ نجات کا طالب غالب

(ص ۱۲۲ - ۱۲۳)

[۶]

تجلیات ' مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کی تالیف ہے اس کا تاریخی نام تاریخ عباس (۱۳۴۳ھ)، ضخامت ۴۸۸ صفحات حصہ' اول اور ۲۲۷ صفحات حصہ' دوم ہے۔ تاریخ طباعت معلوم نہیں ہو سکی۔ اس کتاب میں غالب کے معاصر اور مکتوب الیہ مفتی محمد عباس کے احوال و آثار سے بحث کی گئی ہے اس کتاب کو چھپے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر یہ نادرات میں آگئی ہے اور بہت کم لائبریریوں میں ملتی ہے۔ اس کا ایک نسخہ مخدومی مسعود صاحب مدظلہ کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ موصوف نے از راہ شفقت مجھے اس سے اقتباسات اور مفتی عباس کے بارے میں معلومات عنایت فرمائیں۔

شمس العلما مفتی سید محمد عباس شوستری کا آبائی وطن ایران کا شہر شوستر تھا۔ اُن کے دادا عہد نواب آصف الدولہ میں شوستر سے لکھنؤ آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ مفتی صاحب لکھنؤ میں سلخ ربیع الاول سنہ ۱۲۲۴ھ کو پیدا ہوئے۔ خورشید کمال و ادب، تاریخ ولادت ہے۔ لکھنؤ کے قابل ترین شیعہ اور سنی عالموں سے تمام رائج الوقت علوم کی تعلیم حاصل کی۔ حیرت خیز رسائی ذہن، قوت حافظہ اور کثرت مطالعہ کی بدولت چودہ

۱۔ نقل مطابق اصل۔

۲۔ نقل مطابق اصل۔

سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے ۔ مطالعہ عمر بھر جاری رہا ۔ وہ عربی و اسلامی علوم کے جید عالم اور عدیم المثال ادیب و شاعر تھے ۔ ان کے فضل و کمال کا شہرہ ہندوستان سے نکل کر ایران و عراق تک پہنچ گیا تھا۔ ان کا ذہن جتنا تیز تھا قلم اتنا ہی رواں تھا ۔ عربی ہو یا فارسی ، نثر ہو یا نظم ، کتنے ہی دقیق علمی مسائل ہوں قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے اور اس میں ادبیت کی وہ شان ہوتی تھی جو کسی اور کے یہاں غور و فکر کے بعد بھی بہ مشکل پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کی بدیہہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ ایک بزرگ نے مفتی صاحب سے کہا کہ آپ جو ہر کس و نا کس کی ولادت و وفات اور معمولی واقعات کی تاریخیں کہا کرتے ہیں یہ بات آپ کے شایان شان نہیں ہے اور آپ کے وقت کا بے کار مصرف ہے ۔ جواب میں فرمایا کہ لوگ مجھ سے اصرار کرتے ہیں ، جتنی دیر ان کے اصرار اور میرے انکار میں گزرے اتنے عرصے میں اگر میں تاریخ نظم کردوں تو میرا کیا نقصان ہے ۔ عربی و فارسی نثر و نظم میں ان کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد تین سو کے قریب ہے ۔ مصنف تجلیات نے مختلف علوم میں ان کی ایک سو باسٹھ کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ مفتی صاحب نے اسی برس کی عمر میں ۲۵- رجب سنہ ۱۳۰۶ھ کو انتقال کیا ۔

غالب اور مفتی صاحب

۱۲۷۹ھ میں مرزا اسد اللہ غالب اور جناب مفتی صاحب مرحوم سے خط و کتابت شروع ہوئی ، چنانچہ ان کی کشکول میں سے ان مکاتیب کو پایا جن میں مرزا غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط چسپاں تھے ۔ اس مقام پر میں ان خطوط کو نقل کرتا ہوں اور اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ غالب مرحوم نے اپنی کتاب قاطع برہان مفتی صاحب قبلہ کے پاس روانہ کی جس کے لفافے کی عبارت یہ تھی ۔

" در کان پور بمکان نواب باقر علی خاں صاحب موصول و بخدمت خدام مخدومی جناب مفتی میر عباس صاحب زاد مجدہ' مقبول و درباره' بخشیدن اطلاع رسیدن ارمغان عنایت مبذول باد ۔ (۱)

۱- مرزا غالب کی کتاب جب جناب مفتی صاحب قبلہ کی خدمت

[جاری]

مرسلہ چہارم اگست ۱۸۶۲ء ، اسٹامپ پیڈ غالب اسد اللہ "

کتاب ملاحظہ فرمانے کے بعد مفتی صاحب نے جو خط مرزا غالب کے نام لکھا وہ یہ ہے :

یا اسد اللہ الغالب و مظہر العجائب ۔ پس از اقدام برائے اتحاف تحفہ سلام کہ نثار اقدام خدام توالد چہ ملائیکہ چوں در نجف در صدف شرف پرورده و در تلالو انوار از تکمہ زر تار آفتاب نصف النہار گوے سبقت برده ملتمس آنکہ تحریر شکریہ ہدیہ بہیہ مثل مدح و ثنائے آں عطیہ از حیز بیان و بنان این ہیچ دران بیرون است سبحان اللہ فکریم کراستایم و بکے گرایم بستائش قاطع برہان کہ در انقلاب زمان نام و نشان برہان قاطع را برہم زده و زیر و زبر کرده ۔ یاسپاس گزاری آن خسرو خاور شیرین بیانی و ناظم قلم رو سخن دانی کہ امروز در شعر و شاعری نظیری نہ دارد و کسے در برابرش ظہوری نیارد ، ہر گاہ در انجمن اہل سخن ذکرش برآید فرہاد فردوسی فرامش است و اگر شہرستان نظم و نثر کوس لمن الملک زند زمانہ سراپا گوش ۔

[جاری]

میں وصول ہوئی ، نواب نورالدولہ لیث الملک محمد احسن خاں بہادر محکم جنگ معروف نواب نادر مرزا صاحب نے اس وصول کی تاریخ نظم کی تھی اور وہ یہ ہے:

نظم

چوں غالب شاعر مکرم استاد سخن وران عالم
آں غیرت صائب و نظیری رشک عرفی و ظہوری
سحبان زمان در فصاحت حسان عصر در بلاغت
در حضرت عالم محقق آں فاضل کامل مدقق
کز جملہ بعلم بیش باشد علامۂ عصر خویش باشد
سید عباس اسم پاکش و ز نور سرشتہ جسم پاکش
تصنیف لطیف ارمغاں کرد تحقیق خودش درو عیاں کرد
آمد بمیاں چو ذکر تاریخ رفتیم صفا بفکر تاریخ
از لجۂ فکر گوہرے ناب شد تخرجہ از مغان نایاب

در فن معانی ید بیضا داود		در سحر بیانی لب عیسی دارد
گر شیوه منشیان دیگر جادوست		او از قلمش عصاے موسی دارد

نواب مستطاب معین الدولہ انتظام الملک سید باقر علی خان بہادر ظفر جنگ نکتہ رسے است یکتا و مسیحا نفسے است بے ہمتا بریں شعر :

از من بمن سلام و هم از من بمن پیام
رنج دلی مباد پیام و سلام ما

وجد کردند و مکرر خواندند و فقیر از تاریخ ختم کہ مہر غالب باشد محو شدم کہ چہ قدر بے تکلف و پر تکلف است و تاریخ وصول ایں ھدیہ از ھمیں مادہ باین صورت برآوردم -

غالب آن مہر سپہر نظم و نثر		ہم صفیر صائبا و طالبا
تحفہ با مہر از مہرش رسید		شد رقم تاریخ مہر غالبا

حررہ اضعف الناس السید محمد عباس فی تکثر الاشغال و توزع البال علی سبیل الاستعجال - والحمد اللہ المستعال والصلوٰۃ علی محمد و آلہ خیر آل -

---

اس خط کے جواب اور شکریے میں مرزا غالب نے یہ خط روانہ کیا :

قبلہ حضرت کا نوازشنامہ آیا ، میں نے اس کو حرز بازو بنایا - آپ کی تحسین میرے واسطے سرمایۂ عز و افتخار ہے لیکن فقیر امیدوار ہے کہ یہ دفتر بے معنی نہ سراسری بلکہ سرا سر دیکھنا چاہیے - پیش نظر دھرا رہے ، وقت فرصت اکثر دیکھا جائے - میں نے جو یہ نسخہ وہاں بھجوایا ہے گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے - نہ ہٹ دھرم ہوں نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے - دیباچہ و خاتمہ و متن میں جا بجا جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے حقیقت کی داد جدا جدا چاہتا ہوں طرز عبارت کی داد جدا چاہتا ہوں - نگارش لطافت سے خالی نہ ہو گی گزارش ظرافت سے خالی نہ ہو گی - علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن بچپن سے محو سخن گزاری ہوں مبدء فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے - ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے - فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں مطابق اہل پارس کی منطق کے بھی فرہ ایزدی لایا ہوں - مناسبت خداداد تربیت استاد حسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا فارسی کے غوامض جاننے لگا - بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا - قاطع برہان کا لکھنا کیا ہے گویا

پاسی کڑی میں اپال آیا لکھنا کیا تھا کہ سہام ملازمت کا ہدف ہوا۔ ہے ہے یہ تنک مایہ معارض اکابر سلف ہوا ، ایک صاحب فرماتے ہیں کہ قاطع برہان کی ترکیب غلط ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ حضرت برہان قاطع اور قاطع برہان کی ایک نمط ہے۔ برہان قاطع نے کیا لٹھا نینو نین سکھ قطع کیا جو آپ نے اس کو قاطع لقب دیا ۔ برہان جب تک غیر کے برہان کو قطع نہ کرے گی کیوں کر برہان قاطع نام ہوگا ۔ برہان قاطع کی صحت میں جس قدر تقریر کیجیے گا وہ قاطع برہان کی صحت کے ثبوت میں کام آئے گی ۔ قطعہ' تاریخ کا کیا کہنا ہے گویا کتاب معشوق ، اور یہ قطعہ اس کا گہنا ہے۔ جناب نواب صاحب کا نیاز مند اور بندہ فرماں بردار ہوں ۔ بعد عرض سلام کے پسند آنے کا شکر گزار ہوں ۔ آپ کے علم و فہم و ادراک کی جو تعریف کی جائے وہ حق ہے۔ لیکن میرے شعر کی ستایش صرف خریداری دکان بے رونق ہے۔

انصاف کا طالب ، غالب

شنبہ ۱۹ صفرالمظفر ۱۲۸۹ھ

جواب از مفتی صاحب قبلہ

جناب والا سلمہ اللہ تعالیٰ ، مکتوب مرغوب کو دیکھ کر مسرور ہوا ، قلق خاطر دور ہوا ، لیکن کانپور میں بسبب ترددات سفر جواب کی نوبت نہ آئی اور لکھنؤ میں ملاقات احباب سے فرصت نہ پائی ۔ کیا عرض کروں میں بہت ناتواں ہوں ۔ مشت استخواں ہوں ۔ رنجوں میں گرفتار ہوں ۔ رحمت الٰہی کا امیدوار ہوں ۔ اگر کچھ بھی دل و دماغ میں قوت پاتا اور فی الجملہ درس و تدریس اور تحریر جواب مسائل سے فرصت پاتا ، اس رسالے کو از اول تا آخر دیکھ کر جو ذہن ناقص میں گزرتا مفصل عرض کرتا ۔ ماشا' اللہ آپ کی نظم و نثر سے دل مزے اٹھاتا ہے ۔ جو صاحب ذوق ہے ، لذت پاتا ہے۔ اس نگارش نے کتاب دکنی کو نظر سے گرا دیا ۔ حسن خط سبزان دکن بھلا دیا ۔ اللہ رے شوخی' کلام کہ چشم غزالان ختن کو حیرت ہے اور یہ لطافت و ظرافت کہ ادائے بتان طناز کو کیا نسبت ہے۔ سہام ملام کا جو آپ نے شکوہ فرمایا ہے، حال اس کا یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے ، حضرت موسیٰ نے درگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ خدایا تیرا دم بھرتا ہوں ، دو دعائیں کرتا ہوں ۔ جنت مجھ کو عطا کر اور خلق کی زبان سے رہا کر ۔ ارشاد ہوا دعائے اول قبول ہے تو جنتی ہے رسول ہے ۔ لیکن دوسرا جو سوال ہے اس کا یہ حال ہے کہ ہم نے اپنے واسطے

بھی نہیں گیا ۔ غرض خلق کا حلق بند نہیں ۔ وہ لوگ کم ہیں جو مردہ پسند نہیں ۔ قاطع برہان خوب نام ہے ۔ اس میں کیا جائے کلام ہے ۔ معنی صاف ہیں ۔ معترض نا انصاف ہیں ۔ لطف یہ ہے کہ خود نام سے پیدا ہے کہ اس نے برہان قاطع کو الٹا ہے ۔ مگر ان دونوں باتوں کا ایک نمط پر ہونا جائے تامل و غور ہے ۔ ظاہرا اس کا مطلب اور ہے اور آپ کا مقصد اور ہے ۔ قطع کے معنی کاٹنے کے اور یقین کے بھی آئے ہیں ۔ اس نے غالبا معنی ثانی مراد لیے ہیں اور آپ معنی اول استعمال میں لائے ہیں ۔ بہر صورت برہان کی طرف ظاہرا قاطع کی اضافت ہے اور اس ترکیب میں سرا سر لطافت ہے ۔ اس میں کچھ شک و ریب نہیں کہ ابہام میں حسن ہے کچھ ...... نہیں ۔ لیکن تقصیر معاف :

طرافت نے آفت کو برپا کیا
درستی نہ کرنی تھی یہ کیا کیا

خیر گزشتہ را صلوات ، والسلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ ۔

مکتوب مرزا غالب بنام سلطان العلما

خدا وند نعمت ، آیۂ رحمت سلامت ۔ تسلیم و کورنش و ذریعۂ نیازے که پیش ازین بپاسخ همایون توقیع روان داشته ام بعز قبول قرین باد ۔ درین هنگام در شهر دو دانش مند باهم در آویخته اند ، یکے می سراید که آفریدگار همتاے حضرت خاتم الانبیا علیه و آله السلام می تواند آفرید و این یکے می فرماید که ممتنع ذاتی و محال ذاتی است بنده چون همیں عقیدت دارد نظمے در گیرنده بدین مدعا سر انجام داده است هر آئینه چشم دارد که سواد به نور نظر اصلاح روشن شود ۔ زیاده حد ادب ۔

از غالب نگاشته بست و یکم جماد الاولی ۱۲۷۳ھ

اے که می گوئی توانا کردگار — چون محمد دیگرے آرد بکار
با خداوند دو گیتی آفریں — ممتنع نبود ظهوری این چنیں
نغز گفتی نغز تر باید شنفت — آنکه پندارے که هست اندر نهفت
گر چه نغز دودۂ آدم بود — هم بقدر خاتمیت کم بود
صورت آرائش عالم نگر — یک مه و یک مهر و یک خاتم نگر
این که می گویم جواے بیش نیست — مهر و مه زاں جلوه تاے بیش نیست
آنکه مهر و ماه و اختر آفرید — می تواند مهر دیگر آفرید

گر دو مہر از سوے خاور آورد
کور باد آن کو نہ باور آورد

قدرت حق بیش ازین ہم بودہ است
ہر چہ اندیشی کم از کم بودہ است

لیک در یک عالم از روے یقین
خود نمی گنجد دو ختم المرسلین

یک جہان تا ہست یک خاتم بس است
قدرت حق را نہ یک عالم بس است

از دل ہر ذرہ آرد عالمے
تا بود ہر عالمے را خاتمے

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود

در یکے عالم دو خاتم را مجوے
صد ہزاران عالم و خاتم بگوے

کثرت ابداع عالم خوب تر
یا بیک عالم دو خاتم خوب تر

غالب این اندیشہ نپذیرم ہمی
خردہ ہم بر خویش می گیرم ہمی

اے کہ ختم المرسلینش خواندۂ
دانم از روے یقینش خواندۂ

این الف لامے کہ استغراق راست
حکم ناطق معنی اطلاق راست

منشأ ایجاد ہر عالم یکے است
گر دو صد عالم بود خاتم یکے است

خود ہمی گوئی کہ نورش اول است
از ہمہ عالم ظہورش اول است

اولیت را بود شانے تمام
کے بہر فردے پذیرد انقسام

جوہر کل بر نتابد تثنیہ
در محمد رہ نیابد تثنیہ

تا نہ ورزی اندر امکان ریو رنگ
حیز امکان بود بر مثل تنگ

میم امکان اندر احمد سر زیست
چون ز امکان بگزری دانی کہ چیست

صانع عالم چنین کرد اختیار
کش بعالم مثل نبود زینہار

وین نہ عجز است اختیار است اے فقیہ
خواجہ بے ہمتا بود لاریب فیہ

ہر کرا با سایۂ ننہد خدا
ہمچو او اِی نقش کے بندد خدا

ہم گہر مہر منیرش چون بود
سایہ چون نبود نظیرش چون بود

منفرد اندر کمال ذاتی است
لاجرم مثلش محال ذاتی است

زین عقیدت بر نہ گردم والسلام
نامہ را در می نوردم والسلام

تحریر تاریخ ۴ جمادی الثانی ۱۲۷۳ھ

اس خط کا جواب حسب ارشاد سلطان العلما جناب مفتی صاحب نے حسب ذیل تحریر فرمایا :

بعد اہدائے سلام با اکرام کہ طغرائے دیباچہ کلام و طومائے دارالسلام اسلام است مشہود خاطر عاطر باد صحیفہ مرسلہ مشتمل بر مسئلہ و متضمن اشعار آبدار کہ مرسلہ بند اجیاد اذہان و افکار و رونق شکن بازار لالی شاہوار بود رسید ۔ الحق کہ داد سخن دادہ اند و نافہ مشک ختن کشادہ سلاست بیانی با لطائف معانی باہم آمیختہ و مباحث علمیہ با مضامین شعر یک قالب ریختہ در قلمرو سخن و نظم و انتظام تمام کہ از قدیم الایام معلوم بود ، الحال توغل و مداخلت در معقول و منقول زیادہ باعث سرور شد و نوراً علیٰ نور لکن این مسئلہ از علم کلام است و خوص دریں فن بر غیر خواص حرام و اقتحام در شبہات مظنہ اشتباہ و غلط است و از چیزے کہ شارع مقدس بآن تکلیف نداده سکوت احوط بہرحال بالاجمال اعتقاد باید کرد کہ قدرت الہیہ وسیع است و بر جمیع ممکنات و مقدورات و ایجاد مثل جناب رسالتمآب فی نفسہ ممتنع ذاتی نیست اگرچہ باعتبار خصائص عرضیہ مثل افضلیت و اولیت و خاتمیت و اکملیت کہ نظر بآیہ کریمہ "و لکن رسول‌اللہ و خاتم‌النبیین" و حدیث "اول ماخلق‌اللہ نوری" و احادیث کثیرہ دیگر مقرون بالیقین است بلکہ از جملہ ضروریات دین ایجاد مثل دمامائے آں جناب بمنزلہ ممتنع می باشد و لکن تقدس و تنزہ ذاتی از شریک مختص بجناب احدیت است نہ از صفات بشریت و لہذا در حق خود می فرماید ولم یکن لہ کفواً احد و بجناب رسالتمآب خطاب فرمودہ کہ قل انما انا بشر مثلکم بکاتبہ ز درت ممکنہ را لاف سرمدی نہ رسد ۔ بعز و شان خدائے کس از خودی نرسد نہ ہر زیادت لفظ از زیادت معنی است بقدرت احدی قدر احمدی نرسد و غالب کہ مفاد نظم غالب ہمیں مطالب است والسلام خیر اختتام ۔

مثنوی 'خطاب فاصل' میں چند اشعار ھیں جن میں غالب مرحوم کا ذکر ھے ، وہ یہاں ذکر کیا جاتا ھے ۔

حالیا دیگرے ز قوم ذلیل — رو نوشت است بر کلام خلیل
گرچہ روے سخن بغالب بود — لازمش دفع آں مثالب بود
لیک غالب صلاح خویش ندید — در تسنن فلاح خویش ندید

زانکہ بود است او ز اہل کمال		نہ ز نصاب بود نے ارذال
رو نہ بالطبع مرد جہلی بود		تابع حکم شاہ دہلی بود
نامہ اولیں کہ او گفتہ		نیست آنہم بقیں کہ او گفتہ
بطریقش کلام می ماند		راز پوشیدہ را خدا داند
ظاہرا بودہ است اصل سخن		یا ز نوشاہ یا ز شاہ کہن

غالب کی صد سالہ برسی پر انجمن ترقی اردو

کی

ایک پیش کش

ہنگامۂ دل آشوب

مرتبہ

سید قدرت نقوی

تنقید قاطع برہان کے سلسلے میں منظوم و منثور مضامین کا مجموعہ
متعلقہ شخصیات اور مسائل پر توضیحی حواشی کے ساتھ

قیمت : سات روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ ، کراچی - ۱

اوجِ قبول

(غالب کا منجمانہ کلام)

سید محمد حسین رضوی

اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے میں ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کردینا چاہتا ہوں - آجکل کے پیشہ ور نجومیوں کی حالت زار اور کم علمی کو دیکھ کر اکثر لوگوں کے دلوں میں علم نجوم کی طرف سے بڑی بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور وہ لوگ علم نجوم کو نہایت حقیر اور سطحی چیز سمجھنے لگے ہیں - علم نجوم کا نام سنتے ہی اُن کے تصور میں شہر کی سڑکوں کے کناروں پر بیٹھے ہوئے کم علم اور تباہ حال نجومیوں اور دست شناسوں کی شکلیں پھر نے لگتی ہیں - لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم نجوم بھی علم ہئیت اور علم طب کی طرح ایک مستقل اور وسیع علم ہے ، اور قدیم زمانے میں اس علم کو حاصل کرنا بھی باعث افتخار سمجھا جاتا تھا - چونکہ اس علم کو کماحقہ سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے ، اسی لیے اس علم کو جاننے والے دنیا میں معدودے چند ہی ہوتے ہیں - ایسے ہی معدودے چند لوگوں میں مرزا اسداللہ خاں غالب کو بھی شمار کرنا چاہیے -

غالب کے کلام میں ہر ہر مقام پر علم ہئیت و نجوم کے اتنے جواہر پارے بکھرے پڑے ہیں کہ اُن کو سمیٹنا آسان نہیں ہے - خصوصاً اُن کا فارسی کلام تو ان ستاروں سے اس قدر جگمگا رہا ہے کہ جس طرف نظر پڑتی ہے اُسی جگہ جم کر رہ جاتی ہے - غالب کے کلام کو غور سے دیکھنے پر یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ علم ہئیت و نجوم میں منتہی تھے - خصوصاً علم نجوم میں تو وہ اس قدر گہری نظر رکھتے تھے کہ اُن کے

بیان کردہ احکام نجوم تمام اعلا پائے کے منجمین کے لیے ہمیشہ مشعل را بنے رہیں گے - انھوں نے جتنی پیش گوئیاں کی ہیں وہ بعد میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی ہیں - مثلاً انھوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں اپنے زائچے کے سیاروں کے مقامات کی مدد سے اپنے متعلق یہ پیش گوئی کی تھی کہ

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

یعنی " چونکہ میرے زائچے میں میرا سیارہ چوتھے خانے میں ہے جو خانہ عدم کہلاتا ہے اور اس خانے میں اس سیارے کو اوج قبول بھی حاصل ہوا ہے ، اس لیے دنیا میں میری شاعری کی شہرت تو ضرور ہوگی لیکن میرے مرنے کے بعد ہوگی "۔ ان کی یہ پیش گوئی کس قدر صحیح ثابت ہوئی ہے ، یہ اظہر من الشمس ہے۔ آج سو سال بعد ان کی صد سالہ برسی دنیا کے ہر حصے میں منائی جا رہی ہے حالانکہ ان کی زندگی میں ان کی شاعری کی خاطر خواہ قدر و منزلت نہ ہوسکی۔

اس پیش گوئی کی منجمانہ وضاحت اور غالب کے مزید منجمانہ کلام کی تشریح اس مضمون میں مناسب مقام پر کی جائے گی جس سے پڑھنے والوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ غالب نے کس قدر استادانہ انداز میں احکام نجوم کا استنباط کیا ہے - غالب کو اپنی " نجوم دانی " پر خود بھی مکمل اعتماد تھا جس کا اظہار انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے - انھوں نے ایک شعر میں صاف طور پر اس کا دعویٰ اس طرح کیا ہے۔

ہم چومن شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دہر قلم مدعی و نکتہ گواست

یعنی " میرا قلم اس بات کا دعویٰ کرتا ہے اور اس دعوے کی دلیل میں اعلیٰ اعلیٰ نکتے بھی بیان کرتا ہے کہ دنیا میں مجھ جیسا شاعر ، صوفی ، نجومی اور حکیم کوئی دوسرا نہیں ہے "۔ غالب کا یہ دعویٰ محض شاعرانہ تعلی نہیں ، بلکہ حقیقت کا اظہار ہے - غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ " آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف ، کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیٔ طبع کے اور یہاں کیا رکھا ہے "۔ یہ محض ان کی کسر نفسی تھی کہ علم نجوم میں اتنی وسیع دسترس ہوتے ہوئے بھی اپنے

نقشہ خواص بروج

ترتیب	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
برج	حمل	ثور	جوزا	سرطان	اسد	سنبلہ	میزان	عقرب	قوس	جدی	دلو	حوت
شکل	مینڈھا	سانڈ	جوڑا	کیکڑا	شیر	لڑکی	ترازو	بچھو	کمان	مگرمچھ	گھڑا	مچھلی
خاصیت	منقلب	ثابت	ذوجسدین	منقلب	ثابت	ذوجسدین	منقلب	ثابت	ذوجسدین	منقلب	ثابت	ذوجسدین
عنصر	آتشی	خاکی	بادی	آبی	آتشی	خاکی	بادی	آبی	آتشی	خاکی	بادی	آبی
اثرات	نحس	سعد	نحس	سعد	نحس	سعد	نحس	سعد	نحس	سعد	نحس	سعد
مالک	مریخ	زہرہ	عطارد	قمر	شمس	عطارد	زہرہ	مریخ	مشتری	زحل	زحل	مشتری
شمس کا قیام	۲۱ مارچ سے ۲۰ اپریل تک	۲۱ اپریل سے ۲۰ مئی تک	۲۱ مئی سے ۲۰ جون تک	۲۱ جون سے ۲۰ جولائی تک	۲۲ جولائی سے ۲۱ اگست تک	۲۳ اگست سے ۲۲ ستمبر تک	۲۳ ستمبر سے ۲۲ اکتوبر تک	۲۳ اکتوبر سے ۲۲ نومبر تک	۲۳ نومبر سے ۲۰ دسمبر تک	۲۱ دسمبر سے ۱۹ جنوری تک	۲۰ جنوری سے ۱۸ فروری تک	۱۹ فروری سے ۲۰ مارچ تک
فارسی ماہ	فروردین	اردیبہشت	خرداد	تیر	مرداد	شہریور	مہر	آبان	آذر	دے	بہمن	اسفند

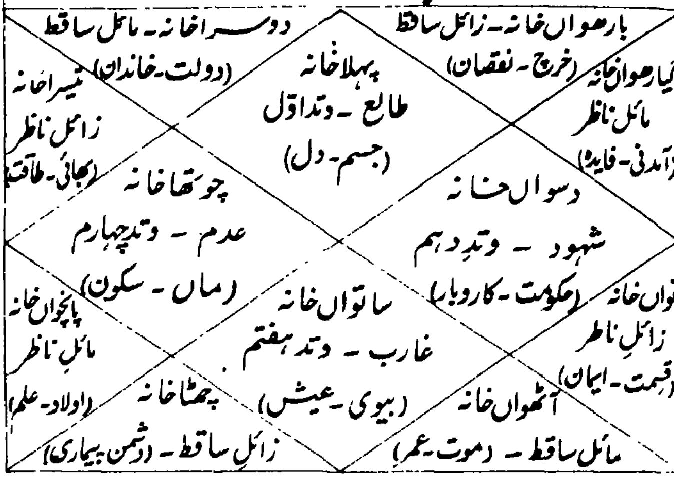
نقشہ انظار سیارگان

نام نظر	تسدیس	تربیع	تثلیث	تنصیف
مقام نظر	تیسرے برج پر	چوتھے برج پر	پانچویں برج پر	ساتویں برج پر
نظام نظر	نصف دوستی	نصف دشمنی	مکمل دوستی	مکمل دشمنی
انجام نظر	سعد	نحس	بہت زیادہ سعد	بہت زیادہ نحس

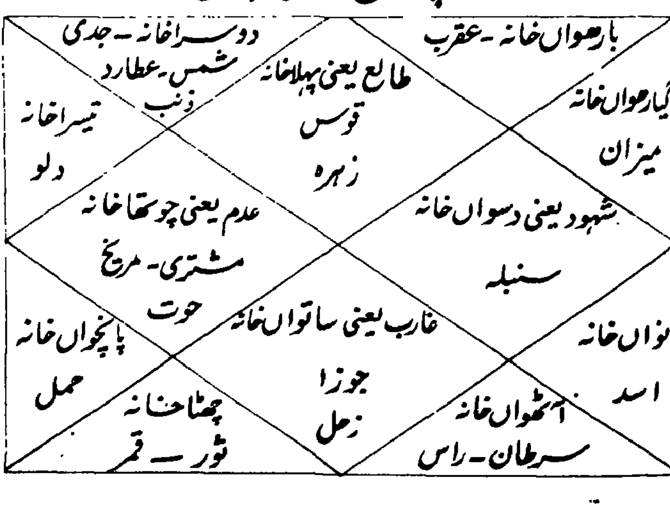
نقشہ خواص سیارگان

ترتیب	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
نام	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل
دیگرنام	آفتاب	ماہتاب	بہرام	تیر	برجیس	ناہید	کیوا
اثرات	نحس	سعد	نحس اصغر	سعد	سعد اکبر	سعد اصغر	نحس اک
بیت	اسد	سرطان	حمل و عقرب	جوزا و سنبلہ	قوس و حوت	ثور و میزان	جدی و د
وبال	دلو	جدی	میزان و ثور	قوس و حوت	جوزا و سنبلہ	عقرب و حمل	سرطان و ا
شرف	حمل	ثور	جدی	سنبلہ	سرطان	حوت	میزان
ہبوط	میزان	عقرب	سرطان	حوت	جدی	سنبلہ	حمل
اوج	جوزا	—	اسد	میزان	سنبلہ	جوزا	قوس
حضیض	قوس	—	دلو	حمل	حوت	قوس	جوزا
جنس	مذکر	مؤنث	مذکر	مذکر	مذکر	مؤنث	مذکر
عنصر	آتشی	آبی	آتشی	خاکی و بادی	بادی	بادی و آبی	خاکی
فلک	چہارم	اول	پنجم	دوم	ششم	سوم	ہفتم
ایام ہفتہ	یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
عمر	میانہ	طفلی	جوانی	کودکی	کہولت	برنائی	پیری
حیثیت	بادشاہ	وزیر	سپہ سالار	مشیر	قاضی	رقاصہ	دربان
خطاب	خسرو انجم	پیک طرب	جلاد فلک	دبیر فلک	زاہد فلک	معشوقہ فلک	دہقان فل
متعلقات	تخت و تاج	خلعت فاخرہ	خنجر و کلاہ و کمر	لوح و قلم کتاب	طیلسان	ساز و پشواز	گرز
خصوصیت	حکمرانی	خوشحالی	خونریزی	علم دوستی	بردباری	شوخی	بلذری

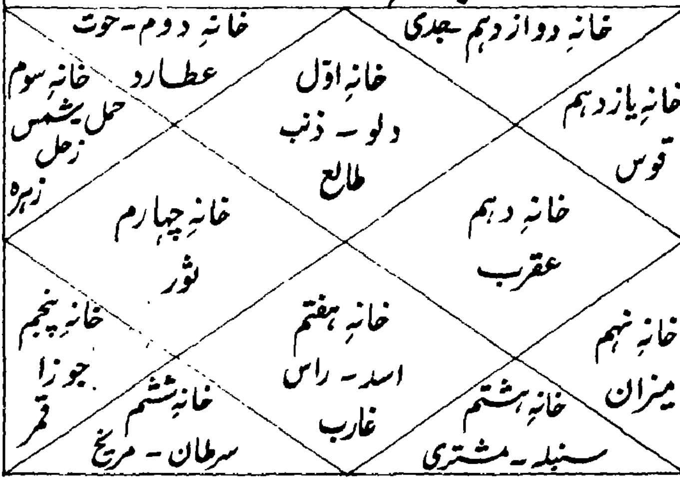
زائچہ کی شکل اور تفصیل



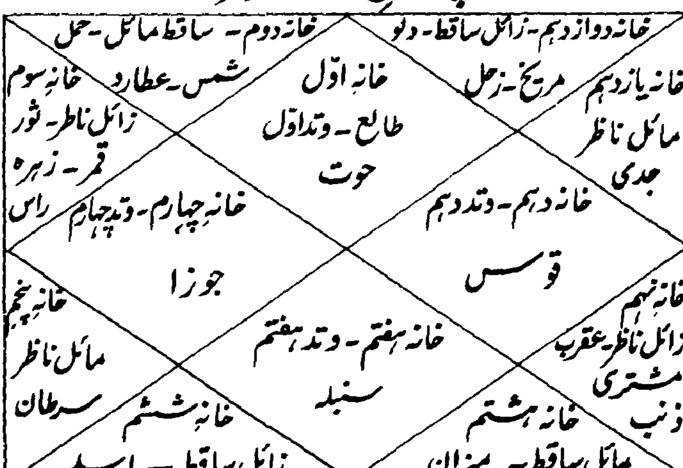
زائچہ طالع غالب (حقیقی)



زائچہ طالعِ نوروز (حقیقی)



زائچہ طالعِ ممدوح (فرضی)



علم کو معمولی سمجھتے تھے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے منجمانہ کلام کا ایک ایک شعر علم نجوم کے اسرار کا ایک ایک دفتر ہے ۔ اگر کوئی ناواقف شخص غالب کے اس قسم کے عاجزانہ انداز تحریر کو حقیقت پر مبنی سمجھ کر یہ فیصلہ کر لے کہ " غالب کو علم نجوم سے بہت معمولی سی واقفیت تھی" تو یہ سراسر ظلم ہوگا ۔

غالب کے منجمانہ کلام کو اُس کی نوعیت کے اعتبار سے مندرجہ ذیل پانچ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

۱۔ مکمل تقویم سیارگان برائے احکام زائچہ حقیقی : اس قسم کے کلام میں غالب نے خاص خاص ساعات کے لیے تمام سیاروں کے صحیح مقامات معلوم کر کے مکمل طور پر حقیقی زائچے بنائے ہیں اور اُن سیاروں کے اچھے یا برے اثرات کا ذکر نہایت عالمانہ اور شاعرانہ انداز میں کیا ہے ۔

۲۔ مکمل تقویم سیارگان برائے احکام زائچہ فرضی : اس قسم کے کلام میں غالب نے اپنے ممدوح کے لیے ایک مثالی اور فرضی زائچہ خود ایجاد کیا ہے اور اس زائچے کی فرضی ساعت کے لیے سیاروں کی مکمل تقویم بیان کر کے اُس کے طالع کی سعادت کا ذکر کیا ہے ۔

۳۔ جزوی تقویم سیارگان برائے تعین ساعات و ثمرات : اس قسم کے کلام میں غالب نے مختلف ساعتوں کے تعین کے لیے صرف ایک یا دو سیاروں کے مقامات کا حساب لگا کر اُن کا ذکر ضمنی طور پر کیا ہے اور باقی سیاروں کے ذکر کو چھوڑ دیا ہے ۔ بعض جگہ اس قسم کی جزوی تقویم سیارگان کے نیک و بد اثرات کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کی بنیاد پر آئندہ کے لیے پیش گوئیاں بھی کی ہیں ۔

۴۔ تذکرات ثوابت و سیار برائے ترتیب و تمثیل و تمزیج : اس قسم کے کلام میں غالب نے ستاروں اور سیاروں کا ذکر ان کی ہیئت و ترتیب کے لحاظ سے بڑے مؤثر اور اعلیٰ انداز میں کیا ہے ۔ بعض جگہ اُن ثوابت و سیار کو شاعرانہ تمثیل و ترتیب ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تمزیج سیارگان کا بھی خیال رکھا گیا ہے یعنی مختلف سیاروں کے مجموعی اثرات کو مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے ۔

۵۔ اصطلاحات ہیئت و نجوم برائے تلمیحات و تشبیہات و استعارات :

اس قسم کے کلام میں غالب نے سیاروں اور ستاروں کے منجمانہ خواص کا سہارا لے کر بڑی اچھی تلمیحات وضع کی ہیں اور ان کی مدد سے بڑی نادر تشبیہات اور اچھوتے استعارات پیدا کیے ہیں ۔

اس سے پہلے کہ غالب کے منجمانہ کلام پر کوئی تبصرہ کیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علم نجوم کی چند ابتدائی باتوں کو نہایت آسان اور مختصر الفاظ میں بیان کر دیا جائے تا کہ غالب کے کلام کو سمجھنے میں آسانی ہو ۔ اگر ہم آسمان پر نظر ڈالیں تو ہم دو دو قسم کے ستارے چمکتے نظر آئیں گے ۔ جو ستارے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ سیارے کہلاتے ہیں اور جو ایک ہی جگہ قایم رہتے ہیں وہ ثوابت کہلاتے ہیں ۔ سیاروں کے نام بالترتیب یہ ہیں ۔ ۱- شمس -۲- قمر ۳- مریخ -۴- عطارد -۵- مشتری -۶- زہرہ -۷- زحل ۔ ہر سیارے کا ایک فلک ہے جس پر وہ گردش کرتا ہے ۔ لہذا سیارے بھی سات ہیں اور ان کے افلاک بھی سات ہیں ۔ ان افلاک سے اوپر آٹھواں فلک ہے جس پر ثوابت قایم ہیں ۔ اس سے بھی اوپر نواں فلک ہے جسے فلک الافلاک کہتے ہیں جو تمام افلاک کو اپنے اندر لے کر گردش کرتا ہے ۔ ان سات سیاروں میں سے شمس اور قمر ہمیشہ سیدھی رفتار سے چلتے رہتے ہیں اور ان دونوں کو نیرین کہتے ہیں ۔ باقی پانچ سیارے کبھی سیدھی رفتار سے چلتے ہیں اور کبھی الٹی رفتار سے چلتے ہیں ۔ اس لیے ان کو خمسۂ متحیرہ کہتے ہیں ۔ ان سات سیاروں کے علاوہ آسمان پر دو فرضی نقطے بھی ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابل رہتے ہیں اور ہمیشہ الٹی رفتار سے چلتے رہتے ہیں ۔ ان دونوں کو بھی سیاروں کی مانند سمجھ لیا گیا ہے اور ان کا نام راس اور ذنب رکھ لیا گیا ہے ۔ راس کو ایک اژدہے کا سر اور ذنب کو اس کی دم فرض کر لیا گیا ہے ۔ اہل یونان راس کو سعد سمجھتے ہیں لیکن اگر راس کسی نحس سیارے کے ساتھ ہوتا ہے تو نحس اثر دکھاتا ہے ۔ عطارد بھی سعد ہے لیکن اگر نحس سیارے کے ساتھ ہوتا ہے تو نحس ہو جاتا ہے ۔ ذنب کو نحس سمجھا جاتا ہے ۔ شمس ، مریخ اور زحل بھی نحس ہیں ۔ قمر ، زہرہ اور مشتری سعد ہیں ۔ اہل ہند راس کو راہو اور ذنب کو کیتو کہتے ہیں اور دونوں کو نحس سمجھتے ہیں ۔ غالب نے اہل یونان کا تتبع کیا ہے ، اہل ہند کا تتبع نہیں کیا ہے ۔

ثوابت کے درمیان شمس ، قمر اور دیگر سیارے جس آسمانی دائرے پر

چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ، اس دائرے کو مدار شمسی کہتے ہیں ، جو ۳٦۰ درجوں کے برابر ہوتا ہے ۔ اس مدار شمسی کو برابر کے بارہ حصوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے اور ہر حصے کو برج کہتے ہیں جو ۳۰ درجوں کے برابر ہوتا ہے ۔ ان بارہ بروج کے نام بالترتیب یہ ہیں : ۱۔ حمل ۲۔ ثور ۳۔ جوزا ۴۔ سرطان ۵۔ اسد ٦۔ سنبلہ ۷۔ میزان ۸۔ عقرب ۹۔ قوس ۱۰۔ جدی ۱۱۔ دلو ۱۲۔ حوت ۔ جب بارھواں برج ختم ہو جاتا ہے تو اس سے اگلا برج یعنی برج حمل شروع ہو جاتا ہے ۔ ان بروج میں شمس کے قیام کی جو تاریخیں متعلقہ نقشے میں دی گئی ہیں ان میں ایک آدھ دن کا فرق پڑ سکتا ہے (اس مضمون کے اخر میں نقشہ خواص بروج ملاحظہ کیجئیے) ان بروج کے نام اور خواص ان شکلوں کے مطابق مقرر کئے گئے ہیں جو ان کے ثوابت کی مجموعی حیثیت کے مطابق نظر آتی ہیں ۔ اگر کوئی سیارہ کسی برج میں ہو تو وہ اس برج سے تیسرے برج کو نظر تسدیس سے دیکھتا ہے ، چوتھے برج کو نظر تربیع سے دیکھتا ہے ، پانچویں برج کو نظر تثلیث سے دیکھتا ہے ، اور ساتویں برج کو نظر تنصیف یعنی نظر مقابلہ سے دیکھتا ہے ۔ ان نظروں کے نیک و بد اثرات متعلقہ نقشے میں دکھائے گئے ہیں ۔ بارہ بروج اور سات سیاروں کے خواص ظاہر کرنے کے لیے بھی علاحدہ علاحدہ نقشے دیے گئے ہیں ۔ (اس مضمون کے آخر میں ان نقشوں کو ملاحظہ فرمائیے)

ہر سیارہ ایک یا دو برج کا مالک ہوتا ہے اور وہ برج اس سیارے کا بیت کہلاتا ہے ، جہاں پہنچ کر وہ سیارہ طاقت حاصل کرتا ہے ۔ اسی طرح جب وہ سیارہ اپنے برج شرف میں پہنچتا ہے تو نہایت سعد ہو جاتا ہے اور جب برج اوج میں پہنچتا ہے تو بلند ہمت ہو جاتا ہے ۔ وبال ، ہبوط اور حضیض میں پہنچ کر سیارہ بالترتیب کمزور ، نحس اور کم ہمت ہو جاتا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ سیارے کو سب سے زیادہ نیک اثر برج شرف میں حاصل ہوتا ہے اور سب سے زیادہ بد اثر برج ہبوط میں حاصل ہوتا ہے ۔ قمر کا اوج و حضیض بہت جلد جلد تبدیل ہوتا ہے ، اس لیے کسی خاص ساعت کے لیے حساب لگا کر معلوم کرنا پڑتا ہے ۔ باقی سیاروں کے اوج و حضیض بہت ہی آہستہ آہستہ تبدیل ہوتے ہیں ۔ تمام سیاروں کے بیت و وبال و شرف و ہبوط کبھی تبدیل نہیں ہوتے ۔ اوج و حضیض کو بھی صدیوں اور قرنوں تک ایک ہی برج میں قایم مانا جا سکتا ہے ۔

مندرجہ بالا بروج و سیارگان کے علاوہ بعض دیگر ثوابت بھی اپنے منجمانہ خواص میں بہت مشہور ہیں - مثلاً ایک ستارہ سہیل ہے جو مکہ معظمہ سے جنوب کی طرف یعنی یمن کی طرف طلوع ہوتا ہے ، اس لیے اسے ستارۂ یمانی بھی کہتے ہیں - جب یہ ستارہ طلوع ہوتا ہے تو برسات کا موسم ختم ہو جاتا ہے اور بارشیں بالکل بند ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہاں کے حشرات الارض ، جنھیں ولدالزنا بھی کہتے ہیں ، خود بخود فنا ہو جاتے ہیں - اسی سہیل کی روشنی میں چمڑے کو پھیلا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے اور وہ خوشبودار چمڑا نطع ادیم یا صرف ادیم کہلانے لگتا ہے -

علم نجوم میں طالع کو بڑی اہمیت حاصل ہے ، اس لیے اس اصطلاح کو بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے - جب کوئی برج کسی خاص ساعت میں کسی مخصوص مقام پر افق مشرق میں طلوع ہوتا ہے تو اس برج کو طالع کہتے ہیں - جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو کسی مستند جنتری یا زیچ سے طالع کا حساب لگایا جا سکتا ہے ، اور طالع معلوم ہو جانے کے بعد اس کی بنیاد پر اس ساعت کا زائچہ بنایا جا سکتا ہے - زائچہ بنانے کے لیے مندرجہ ذیل بارہ خانوں کا ایک نقشہ بناتے ہیں اور اس نقشے کے پہلے خانے میں طالع کو درج کرتے ہیں - پھر اگلے خانہ میں یعنی نقشے کے دوسرے خانے میں طالع سے اگلا برج لکھتے ہیں اور اسی طرح بالترتیب تمام خانوں میں بارہ بروج کے نام لکھ دیتے ہیں - اس کے بعد حساب لگا کر معلوم کیا جاتا ہے کہ اس وقت کون سا سیارہ کس برج میں تھا - جو سیارہ جس برج میں ہوتا ہے ، اسے اسی برج کے خانے میں لکھ دیا جاتا ہے - اس طرح زائچہ مکمل ہو جاتا ہے - زائچے کا خانۂ اول طالع کہلاتا ہے ، خانۂ دہم شہود کہلاتا ہے ، خانۂ ہفتم غارب کہلاتا ہے اور خانہ چہارم عدم کہلاتا ہے - یہ چاروں خانے بڑے اہم سمجھے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو وتد کہتے ہیں - اسی طرح دوسرے ، پانچویں ، آٹھویں اور گیارھویں خانے کو مائل کہتے ہیں - تیسرے ، چھٹے ، نویں ، اور بارھویں خانے کو زائل کہتے ہیں - جس خانے کی نظر طالع پر (تسدیس ، تربیع ، تثلیث ، یا تنصیف) ہوتی ہے وہ خانہ ناظر کہلاتا ہے اور جس خانے کی کوئی نظر طالع پر نہیں ہوتی وہ ساقط کہلاتا ہے - وتد میں سیارے کو پوری طاقت حاصل ہوتی ہے ، مائل میں طاقت کم ہو جاتی ہے اور زائل میں سیارہ بہت ہی کمزور ہو جاتا ہے - زائچے کا ہر خانہ زندگی کے کسی نہ کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہے -
(زائچہ کی شکل اور تفصیل اس مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمایے)

کسی مولود کے زائچے کے جس خانے میں سعد سیارہ ہوتا ہے یا جس خانے پر سعد سیارہ کی سعد نظر ہوتی ہے اس خانے سے تعلق رکھنے والے شعبۂ زندگی پر اچھا اثر پڑتا ہے ۔ نحس سیارہ اس کے بر عکس اثر ڈالتا ہے ۔ ہر مخصوص ساعت کے لیے زائچے کی مجموعی حالت جداگانہ ہوتی ہے اور جس قسم کا زائچہ ایک ساعت پر بن جاتا ہے بالکل ویسا ہی زائچہ صدیوں میں بھی دوبارہ نہیں بنتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی مولود کا زائچہ معلوم ہو جائے تو اس کے سیاروں کے مقامات کی مدد سے یہ حساب لگایا جا سکتا ہے کہ یہ زائچہ کس ساعت کا ہے ۔ غالب کے زمانے میں سارے زائچے بحساب اہل یونان بنائے جاتے تھے جو اہل ہند کے زائچوں سے مختلف ہوتے تھے ۔ غالب نے بھی اہل یونان ہی کا تتبع کیا ہے ۔ سنہ ہجری کی تاریخ اور سنہ عیسوی کی تاریخ میں مطابقت معلوم کرنے کے لیے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے جو تقویم ہجری و عیسوی شائع ہوئی ہے وہ محض اوسط حساب سے مرتب کی گئی ہے اور اس میں طاق مہینوں کو ۳۰ دن کا مانا گیا ہے اور جفت مہینوں کو ۲۹ دن کا مانا گیا ہے ، لیکن سال کبیسہ میں ذی‌الحجہ بھی ۳۰ دن کا مانا جاتا ہے ۔ اگر حقیقی رویت ہلال کے مطابق تاریخ ہجری اور تاریخ عیسوی میں مطابقت معلوم کرنی ہو تو اس کے لیے علم ہئیت کے پیچیدہ حسابات سے مدد لینی چاہیے ۔ زیج الغ بیک میں صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانچ مہینے متواتر یکے بعد دیگرے تیس تیس دن کے ہو سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ تین مہینے متواتر یکے بعد دیگرے انتیس انتیس دن کے ہو سکتے ہیں ۔ اس لحاظ سے اوسط ہجری تاریخ اور حقیقی رویت ہلال کے مطابق ہجری تاریخ کے درمیان زیادہ سے زیادہ دو دن کا فرق پڑ سکتا ہے اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو زیادہ سے زیادہ تین دن کا فرق بھی پڑ سکتا ہے ۔ ایسی حالت میں ایام ہفتہ کو صحیح مان کر اس کے مطابق عیسوی تاریخ سے مطابقت کرنی چاہیے ۔ اس تمہید کے بعد اب ہم نفس مضمون کی طرف آتے ہیں ۔ اس مضمون میں غالب کے منجمانہ کلام کا صرف تھوڑا سا حصہ محض نمونے کے طور پر دیا جائے گا ۔

۱- مکمل تقویم سیارگان برائے احکام زائچہ حقیقی :

غالب کے کلیات فارسی میں دو حقیقی زائچوں کی مکمل تقویم اور ان کے مختصر احکام کا بیان ملتا ہے ۔ پہلا زائچہ تو خود غالب ہی کا ہے جو ان کی پیدائش کے وقت کسی ماہر فن منجم نے بنایا تھا اور دوسرا زائچہ

تحویل آفتاب 'در برج حمل کی ساعت کا ہے جو ۱۸۵۰ء میں جشن نو روز کے موقع پر خود غالب نے بنایا تھا ۔ غالب نے اپنے زائچے کا ذکر قصیدہ نہم کی تشبیب میں بڑے اچھوتے انداز میں کیا ہے ۔ یہ قصیدہ غالب نے سیدالشہدا جناب امام حسین علیہ السلام کی شان میں کہا ہے اور اس کی تشبیب میں اپنے زائچے کے سیاروں کے نحس اثرات کا ذکر کر کے پھر گریز کا پہلو اس طرح پیدا کیا ہے کہ آسمان سے مخاطب ہوکر کہا ہے کہ "اے فلک ! تیری کیا ہستی ہے ، میرے طالع کی کیا حقیقت ہے اور سیاروں کے اثرات کی کیا اہمیت ہے ۔ مجھے تو خود میرے مولا حسین نے جس حال میں رکھنا مناسب سمجھا ہے اسی حال میں رکھا ہے ۔ اب میں اپنے دوست یعنی امام حسین سے تو اپنی اس نامرادی کا شکوہ کر نہیں سکتا ، اس لیے بالواسطہ طور پر تیری اور تیرے ستاروں کی نحوست کی شکایت کر رہا ہوں ۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ تیری ڈالی ہوئی بلائیں میرے لیے تاب سہیل کی مانند مفید ثابت ہوئی ہیں جن کے اثر سے معمولی سی کھال بھی نہایت خوشبودار چمڑے کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے" ۔ اس قصیدے کی تشبیب اور گریز کے ضروری اشعار ذیل میں دیے جارہے ہیں جن میں غالب نے تمزیج سیارگان کا حق ادا کردیا ہے :

مگر مرا دل کافر بود شب میلاد
کہ ظلمتش دہد ازگور اہل عصیاں یاد

قضا نگارش اسرار شکل زائچہ را
کند ز دود دل دردمند اخذ مداد

مگوی زائچہ کایں نسخہ ایست از اسقام
مگوی زائچہ کایں جامعیست از اضداد

خود اصل طالع من جزوے از کمانستے
کزوست ناوک غم را ہزار گونہ کشاد

خرام زہرہ بطالع اگرچہ دادہ نشاں
ہم از لطافت طبع و ہم از صفائے نہاد

وائے ازاں کہ غریب است زہرہ اندر قوس
نشستہ بر رخ نقد قبول گرد کساد

تو گوئی از اثر انتقام هاروت است
که سر به طالع من چرخ زهره را جا داد

به صفر جدی ذنب را اشارهٔ باشد
بخاک و حلقه دام و کمین که صیاد

چه دام روح روان را گدازش پر و بال
چه صفر رنج و الم را فزائش اعداد

ز مهر و پیکر تیر آشکار گشته بجدی
فروغ اخگر رخشنده و کفی ز رماد

بحوت در شده هم مشتری و هم مریخ
یکی کفیل صلاح و یکی دلیل فساد

یکی بهیئت پیرے که ناگه از غوغا
بکنج صومعه وامانده باشد از اوراد

یکی بصورت ترکے که از پئے یغما
ستیزه جوئے در آید بخانهٔ زهاد

قمر به ثور که کاشانهٔ ششم باشد
چو نور خویش کند دستگاه خصم زیاد

سیاه گشته دو پیکر ز سیلی کیوان
چنانکه از اثر خاک تیره گردد باد

بدین دو نحس نگر تا چه شکل مستقبل
کشیده اند ز تربیع خویش در اوتاد

بچارمین کده بهرام پنجمین پایه
به هفتمین زده کیوان هفتمین بنیاد

کند چو ترک ستمگر به کشتن استعجال
کند چو هندو رهزن ببردن استبداد

ز حوت ہیبت طوفان نوح پردہ کشا
عیاں ز صورت جوزا نہیب صرصر عاد
تو و خدا کہ دریں کشمکش کہ من باشم
چگونہ چوں دگراں زیستن تواں بمراد
تو اے ستارہ ندانی کہ رنجم از آزار
تو اے سپہر نہ سنجی کہ ترسم از بیداد
من و بلائے تو نطع ادیم و تاب سہیل
من و جفائے تو شاگرد و سیلیٔ استاد
ستارہ راہمہ رفتار ز اقتضائے قضاست
چنانکہ جنبش نرد از انامل نراد
فلک کجائی و طالع چہ و ستارہ کدام
کنم شکایت دشمن ز دوست شرمم باد
بیا کہ دادہ نوید نکوئی فرجام
حسین ابن علی آبروئے دانش و داد

ان اشعار کی رو سے غالب کا طالع برج قوس تھا جس میں زہرہ موجود تھا - زہرہ کے طالع میں ہونے کی وجہ سے غالب کو لطافت طبع اور صفائے نہاد تو حاصل ہو گئی لیکن چونکہ برج قوس میں زہرہ کی حیثیت ایک اجنبی مسافر کی سی ہے (کیونکہ برج قوس سے زہرہ کا کوئی بھی سعد تعلق نہیں ہے ، یہ نہ بیت ہے ، نہ شرف ہے ، نہ اوج ہے) اس لیے غالب کی زندگی میں اُن کے نقد قبول پر ہمیشہ گرد کساد پڑی رہی گویا چرخ ستمگر نے ایک نیک ستارے کو یعنی زہرہ کو غالب کے طالع میں جگہ دی بھی تو محض انتقام ہاروت کے اثر سے دی (جو زہرہ پر عاشق تھا ، اور اب اپنے رقیب ماروت کے ساتھ چاہ بابل میں اُلٹا لٹکا ہوا ہے) - برج جدی کے صفر درجہ پر ذنب کی موجود گی بھی غالب کے لیے گوناگوں پریشانیوں کا باعث بنی رہی - برج جدی میں شمس اور عطارد کی موجود گی سے بھی غالب کو خانہ بربادی ہی نصیب ہوئی - خانہ چہارم میں برج حوت کے اندر مریخ

اور مشتری کی موجودگی نے بھی غالب کو نقصان ہی پہنچایا کیونکہ مریخ کی موجودگی نے مشتری کے نیک اثر کو بھی زائل کردیا ۔ خانۂ ششم میں یعنی دشمن کے گھر میں برج ثور کے اندر قمر کی موجودگی سے بھی غالب کے دشمنوں ہی کو تقویت حاصل ہوئی ۔ خانۂ ہفتم میں برج جوزا کے اندر زحل کی موجودگی سے تو گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی کیونکہ اس طرح مریخ اور زحل کے درمیان نظر تربیع بھی پیدا ہوگئی ہے جو نحس ہے اور یہ دونوں نحس سیارے و تدوں میں بھی موجود ہیں جس کی وجہ سے ان کو اور بھی زیادہ قوت حاصل ہوگئی ہے ، لہذا یہ دونوں سیارے مل کر غالب پر جو کچھ بھی ستم توڑ سکتے ہیں وہ توڑ رہے ہیں ۔ ان اشعار کے مطابق مندرجہ ذیل زائچہ حقیقی بنتا ہے ۔ اگر مستند زیجوں کی مدد سے حسابات لگائے جائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ زائچہ بمقام آگرہ (یوپی) بروز یکشنبہ بوقت چہارگھڑی پیش از طلوع آفتاب بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۱ھ مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ء علی الصباح ۵ بج کر ۳۶ منٹ (انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم) کے لیے بنایا گیا تھا ۔ لہذا غالب کی صحیح تاریخ پیدائش یہی ہے ۔ عام طور پر جو غالب کی تاریخ پیدائش مشہور ہو گئی ہے وہ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء مطابق ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بروز چہار شنبہ ہے لیکن یہ تاریخ پیدائش غلط ہے اور اسے بھول جانا چاہیے ۔ صحیح تاریخ پیدائش ۸ جنوری ۱۷۹۷ء ہے ۔ (غالب کا زائچہ طالع اس مضمون کے آخر میں دیکھیے)

ایک اور زائچہ حقیقی کا ذکر غالب نے کلیات فارسی کے نوزدہمیں قصیدے میں کیا ہے جو ابو ظفر بہادر شاہ کی شان میں جشن نو روز کے موقع پر بمقام دہلی کہا گیا تھا ۔ قصیدے کے ضروری اشعار ذیل میں دیئے جاتے ہیں :

همچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دهر قلم مدعی و نکته گواست
ذوق مدح تو برآں داشته باشد کامروز
رگ اندیشه زدم گرچه قمر در جوزاست
اینکه خور در حمل و مه به دو پیکر باشد
هست تسدیس و همایون نظر مهر فزاست

بادہ با نیّر اعظم زدہ کیواں بہ حمل
همنشینی بہ شہنشہ ز کشاورز خطاست

زهره دیدم بہ حمل تن زدم از خبث زحل
بهر شه مطربه آورده نه دهقان تنهاست

قاضیٔ چرخ کہ در خوشه بود وازوں بوے
متحیر که چرا اوج و وبالش یکجاست

چوں فرود آمده مریخ به منزلگه ماه
کدہ پیک طرب گاه سپهبد نه رواست

تا چه افتاده که در خانهٔ قاضیست دبیر
پرسش واقعهٔ هست اگر پرسی راست

گشته در دلو و اسد روئے برو جاده نورد
ذنب و راس که از طالع و غارب پیداست

ان اشعار میں غالب نے تمزیج سیارگان کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر بیان کیا ہے اور کنایتہً اپنے حریفوں پر اور خصوصاً اُستاد ذوق پر بڑی چشمک زنی کی ہے ۔ اس مقام پر غالب نے بہادر شاہ ظفر کو شمس ، خود کو قمر اور ذوق کو زحل فرض کرلیا ہے ۔ باقی سیاروں کو بھی حسب مناسبت اپنے باقی حریفوں سے تشبیہ دی ہے ۔ غالب کے بیان کے مطابق اُس وقت طالع برج دلو میں تھا جس میں ذنب بھی موجود تھا ، غارب برج اسد میں تھا جس میں راس بھی موجود تھا ۔ جوزا میں قمر تھا ، حمل میں شمس ، زحل اور زهره تھے ، سنبلہ میں مشتری تھا جو راجع تھا ، سرطان میں مریخ تھا ، اور حوت میں عطارد تھا ۔ شمس کی نظر تسدیس قمر پر تھی جو نیک سمجھی جاتی ہے ۔ شمس اپنے برج شرف میں تھا ، مشتری ایسے برج میں تھا جہاں اُس کا اوج بھی ہے اور وبال بھی ہے ، مریخ قمر کے بیت میں تھا ، اور عطارد مشتری کے بیت میں تھا ۔ ان اشعار کے مطابق جو نوروز کا زائچہ حقیقی بنتا ہے وہ بمقام دهلی بتاریخ ۲۱ مارچ ۱۸۵۰ء مطابق ۷ جمادی الاول ۱۲۶۶ھ بروز پنجشنبہ علی الصباح ۴ بج کر ۱۷ منٹ سے ۵ بج کر ۲ منٹ تک (انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم) کے لیے بنایا گیا تھا ۔ (وہ زائچہ نو روز مضمون کے آخر میں دیا جارہا ہے)

۲- مکمل تقویم سیارگان برائے احکام زائچہ فرضی :

غالب کے کلیات فارسی کے قطعہ ۳۳ میں ایک زائچے کی مکمل تقویم کا ذکر ہے ۔ یہ زائچہ غالب نے اپنے ممدوح یعنی جان جاکوب بہادر کے لیے محض فرضی طور پر بنایا تھا ، اور اس زائچے میں یہ خوبی رکھی تھی کہ طالع پر کسی نحس سیارے کی نظر نہیں تھی - یعنی یہ فرضی طالع تمام برے اثرات سے پاک تھا اور تمام اچھے اثرات سے مملو تھا ۔ اس زائچے کو دیکھ کر غالب کی منجمانہ صوابدید کی بیساختہ داد دینی پڑتی ہے کہ فرضی زائچہ بھی بنایا تو بالکل حقیقی زائچے کی مانند بنایا ، جس میں کسی قسم کا عیب نہیں ڈھونڈا جا سکتا ۔ غالب نے دعا کے طور پر اپنے ممدوح کے لیے یہ فرضی زائچہ پیش کر کے کہا ہے کہ " خدا کرے میرے ممدوح کا طالع اس طرح کا ہو جیسا کہ اس فرضی زائچہ میں دکھایا گیا ہے " ۔ قطعہ یہ ہے :

جان جاکوب بہادر کہ ز یزداں دارد
خوبی خوے و فروزندگی جوہر رائے

طالعش حوت بود تا بنظر گاہ کمال
مشتری سوئے سعادت بودش راہ نمائے

بحمل مہر درخشان و عطارد بادے
چوں دبیرے کہ بود پیش شہنشاہ بپائے

بہ سوم خانہ کہ ثور است مہ و زہرہ و راس
آں یکے در شرف خویش و دگر خانہ خدائے

بہ نہم خانہ ذنب عقدہ طراز و برجیس
بہ قوی پنجگی از کار ذنب عقدہ کشائے

دلو کاں زائل ساقط بود از روئے حساب
کردہ مریخ و زحل ہر دو دراں زاویہ جائے

مہر در ساقط مائل شدہ تمثال طراز
ماہ در زائل ناظر شدہ آئینہ زدائے

ہر دو نیر ز شرف یافتہ اقبال قبول
ہر دو کوکب ز خوشی آمدہ اندوہ ربائے

زهره و ماه بهم فرخ و فرخ تر ازاں
که شود واس بدیں فرخی اندازه فزائے
ماه و ناهید بتسدیس بطالع نگراں
زده برجیس به تثلیث دم مهر گرائے
نظر کلفت نحسین ز طالع ساقط
چشم بد دور ازیں طالع عالم آرائے
آں که ایں اختر مسعود نگارد غالب
مهر تحریر مداد آورد از ظل همائے

اس قطعے میں غالب نے اپنے ممدوح کے لئے دعا کی ہے کہ " خدا کرے میرے ممدوح کا طالع حوت ہو ، تا کہ اس برج کا مالک یعنی مشتری سعد اکبر ہونے کی وجہ سے میرے ممدوح کو سعادت مندی کی طرف رہنمائی کرتا رہے ۔ شمس برج حمل میں یعنی اپنے برج شرف میں ہو اور عطارد بھی اس کی مدد کے لیے بطور پیشکار کے کھڑا ہوا ہو ۔ برج ثور میں قمر ہو جو کہ اس کا برج شرف ہے ، اسی برج ثور میں زہرہ بھی ہو جو کہ ثور کا مالک ہے ، اور راس بھی ساتھ ہو تا کہ ان نیک اجتماعات کی سعادت میں کچھ زیادتی ہو جائے کیونکہ راس جب نیک سیاروں کے ساتھ موجود ہوتا ہے تو ان کے نیک اثر کو اور بھی بڑھا دیتا ہے ۔ نویں خانے میں ذنب اپنی نحوست دکھانا چاہتا ہو لیکن اسی کے پاس مشتری بھی ہو جو سعد اکبر ہونے کی وجہ سے ذنب کی نحوست کو زائل کر سکے ۔ مریخ اور زحل برج دلو میں ہوں جو کہ بارھویں خانے میں ہونے کی وجہ سے زائل ساقط ہو جائے تا کہ ان دونوں کی نحس نظریں طالع پر نہ پڑ سکیں ۔ شمس اور قمر دونوں اپنے اپنے برج شرف میں ہونے کی وجہ سے " اقبال قبول " کو ظاہر کریں جو صاحب طالع کے لیے نہایت ہی سعد سمجھا جاتا ہے ۔ قمر اور زہرہ دونوں کی نظریں تسدیس کی حیثیت سے طالع پر ہوں تا کہ طالع کی سعادت اور بھی زیادہ بڑھ جائے ، اور مشتری کی بھی نظر تثلیث طالع پر ہو جو نہایت ہی نیک سمجھی جاتی ہے ۔ ایسا طالع اتنے نیک اثرات کا حامل ہو گا کہ اگر کوئی اس کی سعادتوں کی تفصیل لکھنے بیٹھے گا تو اسے ہما کے سائے سے

روشنائی حاصل کرنی پڑے گی "۔ اس جگہ غالب نے ظل ہما کا ذکر کر کے اشارۃً یہ بھی بتا دیا ہے کہ جس طرح ظل ہما کا حاصل ہونا محض فرضی ہے اسی طرح یہ زائچہ بھی محض فرضی ہے اور یہ کسی حقیقی ساعت کے لیے نہیں بنایا گیا ہے۔ ان اشعار کے مطابق زائچے کے حسابات لگانے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس قسم کا زائچہ پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی عیسوی تک کی مدت میں نہیں بن سکتا۔ پندرھویں صدی عیسوی سے بھی پہلے کا حساب میں نے غیر ضروری سمجھ کر نہیں لگایا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ زائچہ غالب نے محض اپنی دماغی کاوش سے ایجاد کیا ہے اور بہت خوب ایجاد کیا ہے۔ " چشم بد دور" کا فقرہ استعمال کر کے غالب نے اشارۃً یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس زائچے میں خاص طور پر یہ کوشش کی گئی ہے کہ نحس سیاروں کی نظر ممدوح کے طالع پر نہ پڑنے پائے۔ (یہ فرضی زائچہ مضمون کے آخر میں دیا جا رہا ہے)

۰۳ جزوی تقویم سیارگان برائے تعین ساعات و ثمرات

غالب کے کلام میں جا بجا مختلف ساعتوں کے ایسے مختلف سیاروں کے مقامات کا ذکر بیساختہ طور پر ملتا ہے جس سے ان ساعتوں کے تعین میں اور بھی زیادہ پختگی ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اثر انگیزی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض جگہ اس قسم کی ساعتوں کے نیک و بد ثمرات بھی ساتھ ہی ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں جس سے کلام کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنے زائچے کے صرف ایک اجتماع کی بنیاد پر مندرجہ ذیل پیش گوئی کی تھی :

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواھد شدن

یعنی " چونکہ میرے زائچے میں میرے سیارے کو یعنی خداوند طالع کو خانۂ عدم میں یعنی خانۂ چہارم میں اوج قبول حاصل ہوا ہے ، اس لیے میری شاعری کی شہرت میری زندگی میں نہیں ہوگی بلکہ میرے مرنے کے بعد ہوگی اور اتنی ہوگی کہ تمام روئے زمین پر پھیل جائے گی "۔ غالب کی یہ منجمانہ پیش گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اس پیش گوئی کو سمجھنے کے لیے چند اصطلاحات کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ غالب کے زائچے میں

(جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے) خانۂ اول یعنی طالع میں برج قوس ہے جس میں سیارہ زہرہ موجود ہے ۔ قوس کا مالک مشتری ہے جو چوتھے خانے میں موجود ہے ۔ مشتری چونکہ خداوند طالع ہے اس لیے یہی غالب کا سیارہ ہے ۔ یہ سیارہ خانۂ عدم میں ہے جہاں برج حوت واقع ہے جو اس کا بیت ہے اور زہرہ کا برج شرف ہے ۔ زہرہ سفلی ہے اور مشتری علوی ہے ۔ زہرہ سعد اصغر ہے اور مشتری سعد اکبر ہے ۔ مشتری پر زہرہ کی نظر تربیع بھی ہے ۔ اس قسم کے اجتماع کو علم نجوم میں '' اوج قبول '' کہتے ہیں ، اور اس اجتماع کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ مولود عالمی شہرت کا مالک ہو جاتا ہے ۔ اس اوج قبول کو ظاہر کرنے والا سیارہ یعنی مشتری اگر طالع میں ہوتا تو مولود کو بچپن ہی سے عالمی شہرت حاصل ہو جاتی ، اگر خانۂ شہود یعنی دسویں خانے میں ہوتا تو جوانی میں شہرت حاصل ہوتی ، اگر غارب میں ہوتا تو بڑھاپے میں شہرت حاصل ہوتی ، لیکن چونکہ وہ سیارہ غالب کے زائچے میں خانۂ عدم میں ہے اس لیے مرنے کے بعد مولود کو شہرت حاصل ہوگی ۔ غالب کی پیش گوئی میں یہی نکتہ پنہاں ہے ۔

غالب نے اپنے زائچے کی ایک خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا ہے ۔

شبابم کہ تاب و تبے بودہ است
ز شبہائے جوزا شبے بودہ است

یعنی '' میری جوانی جو میرے لیے تاب و تب ہے ، برج جوزا کی راتوں میں سے ایک رات ہے '' ۔ (یعنی بہت ہی قلیل المدت ہے) ۔ غالب کے زائچے میں خانۂ ہفتم یعنی غارب میں برج جوزا ہے اور چونکہ غارب کا تعلق غروب آفتاب یعنی وقت شب سے بھی ہے ، عیش و عشرت سے بھی ہے ، تاب و تب اور شباب و توانائی سے بھی ہے ، اس لیے ثابت ہوا کہ مولود یعنی غالب کے لیے عیش و عشرت ، تاب و تب اور شباب و توانائی کا زمانہ اس رات کی طرح قلیل المدت ہو گا جو '' شمس در برج جوزا '' کی آخری ساعت میں واقع ہوتی ہے ۔ یہ پیش گوئی بھی غالب نے اپنے زائچے کی جزوی تقویم کی بنیاد پر کی ہے جو بالکل صحیح ثابت ہوئی ۔ شمس جب برج حمل میں داخل ہو کر آگے بڑھتا ہے تو شمالی نصف کرہ میں دن کی مدت بڑھنے لگتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ رات کی مدت کم ہونے لگتی ہے ۔ اسی طرح آگے بڑھتے بڑھتے جب شمس برج ثور میں پہنچتا ہے تو رات کی مدت اور بھی کم ہو جاتی ہے ، اور جب برج جوزا میں

پہنچتا ہے تو رات کی مدت بہت ہی کم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جب شمس برج جوزا کے آخری درجے پر پہنچتا ہے تو رات کی مدت کم سے کم ہو جاتی ہے - ایسی ہی رات کو ، یا اس رات کے آس پاس کی کسی رات کو غالب نے '' شبے از شبہائے جوزا '' کہا ہے ، اور اپنے عالم شباب اور تاب و تب کو بھی اتنا ہی مختصر المیعاد بتایا ہے - یہ پیش گوئی منجمانہ اعتبار سے نہایت اعلیٰ پائے کی ہے اور غالب کے چند روزہ نشاط سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے - (زائچۂ غالب اس مضمون کے آخر میں دیکھیے)

مندرجہ ذیل اشعار میں غالب نے '' فتح پنجاب '' کے عنوان سے اس ساعت کا تعین کیا ہے جبکہ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دریائے ستلج کے کنارے پر جنگ ہوئی تھی جس میں انگریزوں کو فتح ہوئی تھی -

چوں بر ہزار و ہشت صد و چل فزود شش
نو شد شمار سال دریں کاخ ششدری
ناگہ دریں زمانۂ فرخ کہ آفتاب
در دلو جائے داشت بہ تربیع مشتری
روزے کہ بست و ہشتم ماہ گزشتہ بود
واں بود چار شنبۂ آخر ز جنوری
دشتے کہ بر کنارۂ دریائے ستلج است
گردید جلوہ گاہ دو سد سکندری
ایں قطعہ بیں کہ کرد اسد اللہ خاں رقم
روز دو شنبہ و دوم ماہ فروری

یعنی '' ۱۸۴۶ء میں ایک ایسی مہم سر ہوئی ہے کہ اس کاخ ششدری یعنی دنیا میں اس مہم کی یاد میں ایک نئے سنہ کی ابتدا ہوئی ہے - یہ وہ مبارک زمانہ ہے جب کہ شمس برج دلو میں واقع ہے اور اس پر مشتری کی نظر تربیع بھی پڑ رہی ہے - یہ مہم ماہ گزشتہ (یعنی جنوری) کی اٹھائیس تاریخ کو سر ہوئی تھی جب کہ جنوری کا آخری چہار شنبہ تھا - اس روز دریائے ستلج کے کنارے پر میدان کارزار میں آمنے سامنے دو سد سکندری (یعنی دو مخالف فوجیں) دیکھنے میں آئی تھیں - اس قطعے کو دیکھیے جسے اسد اللہ خاں نے

بتاریخ دوم فروری بروز دو شنبہ رقم کیا '' ۔ غالب کے کلیات فارسی کے شائع شدہ قطعہ ۴۰ میں جنوری کی بست و ہفتم یعنی ستائیس تاریخ لکھی ہے لیکن چونکہ یہ صریحاً کاتب کی غلطی ہے اس لیے میں نے بست و ہشتم کر دیا ہے۔ حساب لگانے سے معلوم ہوا کہ جنوری ۱۸۴۶ء کا آخری چہار شنبہ ستائیسویں تاریخ کو نہیں بلکہ اٹھائیسویں تاریخ کو پڑا تھا ۔ مزید برآں مستند کتب تاریخ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ سکھوں کی یہ جنگ ۲۸ جنوری ۱۸۴۶ء کو بروز چہار شنبہ ہوئی تھی ۔ اس روز شمس برج دلو کے آٹھویں درجے پر تھا اور مشتری برج ثور کے چوتھے درجے پر تھا ۔ چونکہ برج دلو سے برج ثور چوتھے نمبر پر ہے اس لیے شمس پر مشتری کی نظر تربیع پڑ رہی تھی ۔ اسی کا ذکر غالب نے اپنے قطعے میں کیا ہے ۔

مندرجہ ذیل دو شعروں میں غالب نے اس ساعت کا تعین کیا ہے جب کہ ۳۵ سالہ مسٹر اسٹرلنگ کی وفات ہوئی تھی ۔

بروز بست و یکم از مئی بہنگامے
کہ بود خسرو انجم بہ برج ثور مکیں
ہزار و ہشتصد و سی ز عہد عیسیٰ بود
کہ جست برق جہاں سوز این الم ز کمیں

یعنی '' جب کہ اس الم کی برق جہاں سوز کمیں گاہ سے نمودار ہوئی ، اس وقت ۱۸۳۰ء کے مئی کی اکیسویں تاریخ تھی اور ستاروں کا بادشاہ یعنی شمس برج ثور میں مکین تھا ''۔ غالب کے کلیات فارسی کے شائع شدہ قطعہ نمبر ۵۴ میں مئی کی بست و سوم یعنی تئیسویں تاریخ لکھی ہے لیکن یہ کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے ، جسے میں نے درست کر کے بست و یکم یعنی اکیسویں تاریخ کر دیا ہے ۔ دراصل ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء کو بروز یکشنبہ شمس برج ثور میں نہیں تھا بلکہ برج جوزا کے دوسرے درجے پر تھا ۔ ۲۲ مئی ۱۸۳۰ء کو شمس برج جوزا کے پہلے درجے پر تھا ، اور ۲۱ مئی ۱۸۳۰ء کو شمس برج ثور کے تیسویں درجے پر تھا ۔ اس لیے صحیح تاریخ ۲۱ مئی ۱۸۳۰ء ہی ہو سکتی ہے ۔ اس تاریخ کی مزید تصدیق کے لیے مجھے کسی مستند کتاب میں مسٹر اسٹرلنگ کی وفات کی صحیح تاریخ نہ مل سکی ، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ۲۱ مئی ۱۸۳۰ء ہی ہوگی ۔

مندرجہ ذیل تین شعروں میں غالب نے جشن نوروز کی ساعت کا تعین کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جلوس شاہی اور عید ذی‌الحجہ کا بھی ذکر کیا ہے جو نوروز ہی کے آگے پیچھے واقع ہونے تھے -

در بں زمانہ کہ کلک رصد نگار حکیم هزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم
اواخرمہ ذیقعدہ خسرو انجم فزود شان حمل رابہ فرہ دیہیم
جلوس شاہی و نوروز و عید ذی‌الحجہ
هجوم خاص و تماشائے عام و شور عظیم

یعنی '' یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بحساب ہیئت ۱۲۵۰ھ ہے ، ماہ ذیقعدہ کا آخری حصہ ہے ، اور شمس نے بڑے کروفر کے ساتھ برج حمل میں داخل ہو کر اس کی شان بڑھادی ہے - جلوس شاہی ، نو روز اور عیداضحیٰ ، یہ تینوں جشن قریب قریب رونما ہونے کی وجہ سے هجوم خاص ، تماشائے عام ، اور شور عظیم برپا ہو گیا ہے'' - غالب نے یہ قصیدہ نمبر ۱۳ جشن نوروز کے موقع پر کہا تھا جب کہ تحویل آفتاب در برج حمل واقع ہوئی تھی - یعنی ۲۱ مارچ ۱۸۳۵ء مطابق ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ بروز شنبہ جشن نوروز منایا گیا تھا - اس تاریخ کے قریب ہی محمد اکبر شاہ ثانی کا جلوس شاہی منایا گیا تھا اور کچھ عرصے بعد یعنی ۹ اپریل ۱۸۳۵ء کو بروز پنجشنبہ عیداضحیٰ واقع ہوئی تھی - اس طرح یہ تینوں جشن آگے پیچھے ہی منائے گئے تھے -

مندرجہ ذیل دو شعروں میں غالب نے عیداضحیٰ کی ساعت کا تعین بڑے لطیف پیرائے میں کیا ہے - یہ اشعار قصیدہ نمبر ۵۷ کے شروع میں آئے ہیں -

عیداضحیٰ بسر آغاز زمستان آمد وقت آراستن حجرہ و ایوان آمد
گرمی از آب بروں رفت وحرارت ز ہوا عمل مہر جہانتاب بہ میزان آمد

یعنی '' آغاز زمستان اپنے سر پر عیداضحیٰ کو اٹھائے ہوئے آیا ہے جس کی وجہ سے حجرہ و ایوان کو سجانے کا زمانہ آ گیا ہے - پانی سے گرمی اور ہوا سے تپش دور ہو گئی ہے اور عمل مہر جہانتاب کا داخلہ برج میزان میں ہوگیا ہے'' - غالب کے زمانے میں ایسی عیداضحیٰ جو '' تحویل آفتاب دربرج میزان'' کے فوراً بعد آئی ہو ، ۲۷ دسمبر ۱۸۵۲ء کو مطابق ۱۰ ذی‌الحجہ

۱۲۶۸ھ بروز شنبہ آئی تھی ، جب کہ آفتاب کو برج میزان میں داخل ہوئے تقریبا دو دن گزر گئے تھے - لہٰذا یہ قصیدہ اسی زمانہ میں کہا گیا تھا -

مندرجہ ذیل رباعی میں غالب نے ایک ایسی ساعت کا تعین کیا ہے جب کہ شب قدر اور دیوالی کے تیوہار ایک ہی رات کو منائے گئے تھے -

ہیں مہ میں صفات ذوالجلالی باہم
آثار جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کے شب قدر و دوالی باہم

جس رات کے لیے غالب نے کہا ہے کہ اس وقت شب قدر بھی تھی اور ساتھ ہی ساتھ دیوالی بھی تھی ، وہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۴۳ء (یکشنبہ) اور ۲۳ اکتوبر ۱۸۴۳ء (دو شنبہ) کی درمیانی رات تھی - رمضان کی ستائیسویں شب کو عام مسلمان شب قدر مانتے ہیں (حالانکہ اہل تحقیق کے نزدیک تیئسویں شب کو شب قدر ہوتی ہے) رمضان ۱۲۵۹ھ کا چاند ۲۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کی شام کو بروز دو شنبہ نظر آنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن قرائن سے پتا چلتا ہے کہ اس شام کو دہلی کے افق پر مطلع اس قدر گرد و غبار آلود تھا کہ چاند نظر نہ آسکا - اس لیے ۲۶ ستمبر (بروز سہ شنبہ) کی شام کو شرعی طور پر رمضان کی چاند رات یعنی پہلی شب مانی گئی - اس لحاظ سے ۲۲ اکتوبر کی شام کو رمضان کی ستائیسویں شب مانی گئی اور شب قدر کا چراغاں کیا گیا - اسی رات کو ہندوؤں کی پورنمانت تقویم کے مطابق سمبت ۱۹۰۰ بکرمی کے کارتک مہینے کی اماوس تھی جو کہ دیوالی کی رات مانی گئی اور دیپک جلائے گئے -

مندرجہ ذیل چار اشعار میں غالب نے ایک ایسی ساعت کا ذکر کیا ہے جب کہ تین تیوہار یعنی عیدالفطر ، ہولی اور نو روز اکیس دن کے اندر ہی اندر منائے گئے تھے -

مرحبا سال فرخی آئیں عید شوال و ماہ فروردیں
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو اس اکیس دن میں ہولی کی جابجا مجلسیں ہوئیں رنگیں
تین تیوہار اور ایسے خوب جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں

جس زمانے کا ذکر ان اشعار میں کیا گیا ہے وہ ٢٨ فروری ١٨٦٥ء سے ٢١ مارچ ١٨٦٥ء تک کا زمانہ ہے - عیدالفطر کا تیوہار یکم شوال ١٢٨١ھ مطابق ٢٨ فروری ١٨٦٥ء بروز سہ شنبہ منایا گیا تھا کیونکہ عید کا چاند ٢٧ فروری ١٨٦٥ء کی شام کو نظر آنے کے قابل ہو گیا تھا - اس کے بارہ دن بعد یعنی ١٢ مارچ اور ١٣ مارچ کی درمیانی رات کو سمبت ١٩٢١ بکرمی کے پھاگن مہینے کی پورنماسی تھی لہذا اس رات کو ہولکا جلائی گئی تھی یعنی ہولی کا تیوہار منایا گیا تھا ، اور اس کے آٹھ دن بعد یعنی ٢١ مارچ کو نوروز کا تیوہار منایا گیا تھا جب کہ تحویل آفتاب در برج حمل واقع ہوئی تھی - اس طرح یہ تینوں تیوہار تین ہفتوں کے اندر آگے پیچھے جمع ہو گئے تھے ، اور نوروز پر ماہ شوال و ماہ فروردیں ساتھ تھے - یہ قصیدہ بھی غالب نے جشن نو روز کے موقع پر کہا تھا -

٤- تذکرات ثوابت و سیار برائے ترتیب و تمثیل و تمزیج :

غالب کے کلام میں جہاں جہاں ثوابت و سیار کا ذکر آیا ہے وہ منجمانہ اور شاعرانہ دونوں لحاظ سے اتنا جامع ہے کہ غالب کے کمال فن پر حیرت ہوتی ہے - مثلاً انھوں نے اپنی ایک ناتمام مثنوی موسوم بہ " ابر گہر بار " میں (جو کلیات فارسی کی گیارھویں مثنوی ہے) جب معراج نبی کا بیان شروع کیا ہے تو زمین سے اسمان کی بلندیوں تک براق نبی کے راستے کا مفصل ذکر سیاروں اور ستاروں کے فاصلوں کی ترتیب کے لحاظ سے بڑے استادانہ انداز میں کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان سیاروں اور ستاروں کے تذکرات خصوصی کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے ، اور ہر ہر مقام پر مناسبات لفظی و معنوی کا خیال رکھا ہے - منجمانہ تمزیج سیارگان کو بھی اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ شاعرانہ طور پر صنعت حسن تعلیل بن گئی ہے - پہلے براق فلک اول پر پہنچتا ہے ، پھر بالترتیب سارے افلاک کو طے کرتا ہوا فلک الافلاک یعنی عرش تک پہنچ جاتا ہے - اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

قدم تا بر اورنگ ماهش رسید | به اکلیل کیوان کلاهش رسید
ببالید چندان زبیشی قدر | که بے منت مهر گردید بدر
شد از پردلی هم بتحت الشعاع | مقابل بخورشید در اجتماع

ز مہ گر کند مہر پہلو تہی
چہ غم چوں ز خویشش بود فربہی

یعنی '' جب براق نے کرہ ارض کو پیچھے چھوڑ کر فلک اول یعنی تحت ماہ پر قدم رکھا تو بزرگی قامت کی وجہ سے اس کے سر کی کلغی فلک ہفتم یعنی عصابہ زحل تک پہنچ گئی اور بیشی قدر کی وجہ سے وہ اتنا پر نور ہو گیا کہ آفتاب سے روشنی مانگے بغیر بدر کامل بن گیا ۔ لہذا اپنی پوشیدگی کی وجہ سے تحت الشعاع یعنی اجتماع کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی بدر کامل ہونے کی حیثیت سے آفتاب کا مد مقابل بن گیا ، کیونکہ اگر آفتاب کسی ایسے ماہتاب کو روشنی سے محروم کردے جو خود اپنے ہی نور سے روشن رہتا ہو تو کوئی غم نہیں''۔

بسیمائے مہ داغ چوں بر نہاد		دوم پایہ را پایہ بر تر نہاد
صفائے کشاد خدنگ نگاہ		بداں حد کہ شد تیرش آماج گاہ
بہ شمعے کہ بینش بشبگیر سوخت		شہ دیدہ ور تیر بر تیر دوخت
عطارد بآہنگ مدحت گری		زباں جست بہر زباں آوری
بدستوری خواہش روزگار		نہان خود از پردہ کرد آشکار
در اندیشہ پیوند قالب گرفت		بحود در شد و شکل غالب گرفت

یعنی '' جب براق نے اپنے سم کے نشان سے ماہتاب کی پیشانی پر داغ ڈال دیے تو پھر اس نے دوسرا قدم اس سے بھی زیادہ بلندی پر (یعنی فلک دوم پر) رکھا جہاں تیر نگاہ کی پہنچ ہے اور جو تیر یعنی عطارد کی آماج گاہ ہے ۔ وہاں پہنچ کر شہ دیدہ ور نے اس شمع کے ذریعے جو بینائی نے پچھلی رات کو روشن کی تھی ، تیر یعنی عطارد پر تیر یعنی پیکان لگایا ۔ پھر عطارد نے نبی کریم کی مدحت گری کر کے اپنی زبان آوری کے لیے ان سے زبان مانگی اور خواہش روزگار کے دستور کے مطابق اپنے پوشیدہ حال کو ظاہر کردیا ۔ اس اندیشے میں عطارد کو جسم حاصل ہو گیا اور اس نے مجسم ہو کر غالب کی شکل اختیار کرلی ''۔ گویا غالب علم و فضل و زباں آوری میں مجسم عطارد تھے ۔

ازاں پس کہ گشت اندراں مرحلہ		عطارد فروزاں بنور صلہ

سپہر سوم گشت جولانگہش جبیں سود ناھید اندر رھش

یعنی '' جب اس مرحلے میں عطارد اپنا صلہ پا کر فروزاں ھو چکا تو پھر براق دوڑ لگا کر فلک سوم تک پہنچ گیا جہاں زھرہ نے اُس کے راستے میں عقیدت کے ساتھ جبیں سائی کی ''۔

بداں دم کہ زھرہ برامش گرفت چو شہ سوئے بالا خرامش گرفت

ز مہرش بجنبش در آمد لبے پھر بوسہ رست از فلک کوکبے

یعنی '' جب زھرہ نے خوشی سے رقص کرنا شروع کردیا تو براق نبی نے اور زیادہ بلندی کی طرف قدم بڑھایا ۔ جب چرخ چہارم پر پہنچا تو آفتاب نے بوسے لینے شروع کر دیے اور ھر بوسے سے ایک ستارہ بنا '' ۔

سپہرے سپہبد بہ پر کلاہ گہر ریزہ ھا رفت از شاھراہ

ولے بود چوں برکمر دامنش توانگر نکرد آں گہر چیدنش

یعنی '' پھر براق چرخ پنجم پر پہنچا جہاں مریخ نے اپنے پر کلاہ سے براق کے راستے سے موتیوں کے ٹکڑوں کو سمیٹا لیکن چونکہ اُس کا دامن اُس کی کمر سے بندھا ھوا تھا اس لیے وہ اُن گہر ریزوں کو دامن میں باندھ کر نہ رکھ سکا ۔ یہی وجہ ھے کہ وہ صاحب ثروت نہ ھو سکا بلکہ لئیم اور سوم ھی رھا ''۔ (مریخ کا دامن اُس کی کمر سے بندھا رھتا ھے تاکہ خونریزی میں آسانی ھو ۔)

شہنشاہ چوں عرض لشکر گرفت فراز ششم چرخ رہ بر گرفت

خداوند دریا و برجیس میل از ینسو کششش بود زانسوئے میل

یعنی '' جب نبی کریم نے فلک پنجم بر مریخ کے لشکر کا معائنہ کرلیا تو پھر فلک ششم کی بلندی نے اُن کے قدم لیے ۔ سعادت کے لحاظ سے نبی کریم ایک دریائے ناپیدا کنار کی مانند تھے اور مشتری ایک چھوٹے سے میل رواں کی مانند تھا ۔ اس طرف کشش تھی اُس طرف سے میلان طبع تھا ، اس لیے مشتری کو اتنی سعادت نصیب ھو گئی کہ وہ سعد اکبر ھو گیا ''۔

بہ لطفش دم از آب حیواں گزشت بہو جش سراز کاخ کیواں گزشت

براں رفتہ مسکیں تاسف کناں ز خجلت برفتن توقف کناں

یعنی " براق اور صاحب براق کے لطف کے آگے آب حیات کی تیزی ہیچ تھی اور اُس کی رفتار نے اُس کے سر کو کاخ زحل یعنی فلک ہفتم تک پہنچا دیا ، (لیکن چونکہ زحل آلشی عقل کا ہندو تھا اور اپنے زنار میں پھنسا ہوا تھا اس لیے پیشوائی کے لیے جلدی نہ آسکا) لہذا وہ بد نصیب زحل بعد میں افسوس کرتا ہوا آیا اور دیر سے آنے پر شرمندہ ہو کر رہ گیا ۔ اسی وجہ سے وہ اکتساب سعادت سے محروم رہا اور آج تک منحوس اور سست رفتار ہے "۔

سپہر ثوابت بہ پیش آمدش		گہرہا ز اندیشہ بیش آمدش
صور گونہ گوں از جنوب و شمال		کشودند بند نقاب خیال

یعنی " جب براق فلک ہفتم سے آگے بڑھا تو پھر وہ فلک ہشتم یعنی فلک ثوابت پر پہنچا جہاں اندازے سے بھی زیادہ ستارے موتیوں کی طرح بکھرے پڑے تھے گویا کہ یہ موتی فلک ہشتم کو نبی کریم کی طرف سے انعام میں ملے تھے ۔ ان ستاروں کے مجامع سے جنوب اور شمال کی طرف طرح طرح کی شکلیں خیال میں آرہی تھیں "۔

حمل سر بہ نرمی فراپیش داشت		سپاسے ازاں لابہ بر خویش داشت
نبودی اگر شیر در عرض راہ		چریدی بچالاکی از خوشہ کاہ

یعنی " جب براق فلک ثوابت پر پہنچا تو سب سے پہلے حمل یعنی برج حمل نے (جو مینڈھے کی شکل کا ہے) خوشامدانہ انداز میں اپنے سر کو جھکایا اور سپاس مند کہلایا ۔ اس معصومانہ انداز کے باوجود یہ اتنا چالاک ہے کہ اگر شیر یعنی برج اسد اس کے راستے میں حائل نہ ہوتا تو یہ آگے بڑھ کر اُس خوشہ گندم کو ، جو سنبلہ کے ہاتھ میں ہے ، چبکے سے گھاس کی طرح چر لیتا "۔

تو گوئی براہ خداوند دور		سپہر از نمود ثریا و ثور
گدائیست ہندی کہ سرتا بپا		بحر مہرہ آراستہ دو را

یعنی " حمل کے بعد ثور آیا (جو سانڈ کی شکل کا ہے) ۔ اس کے متعلق یوں سمجھ لیجیے کہ خداوند دور (یعنی آفتاب) کے راستے میں (یعنی مدار پر) آسمان کی رونق محض ثریا اور ثور کے چمکدار اور خوبصورت ستاروں ہی کی وجہ سے قایم ہے ۔ یہ برج اس طرح نظر آتا ہے گویا کسی ہندو

بھکاری نے اپنی گائے کو ہر طرف سے کوڑیوں سے سجا رکھا ہو "۔ (ثریا کے چھوٹے چھوٹے چھ ستارے نہایت خوبصورت نظر آتے ہیں اور ثور کے قریب ہی ہیں ۔ ان کو پروین اور جھمکا بھی کہتے ہیں) ۔

دو پیکر نہ ثوئی وراں تو اماں برہرو پذیری در آمد چماں
ریس بود جو را مراں رہروی کمر بستہ خدمت خسروی

یعنی " جب براق جوزا میں پہنچا جسے دو پیکر اور تواماں بھی کہتے ہیں (اور جس کی شکل جڑواں بچوں کی سی ہے) تو وہ اس کی پیشوائی کے لیے ناز و انداز سے چل کر آیا اور خدمت شاہی میں کمر بستہ ہو گیا " (غالب نے کمر بستہ کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کیونکہ جوزا کے دونوں بچوں کی کمریں آپس میں بندھی ہوتی ہیں ۔)

چو ہمسایہ بکشود در ہائے نور بغلطید سرطاں بدریائے نور
چناں دلکش افتاد از ہر طرف کہ برجیس را گشت بیت الشرف

یعنی " جب براق جوزا سے آگے بڑھا اور روشنی کے دروازے کھلے تو سرطان دریائے نور میں تیرنے لگا (برج سرطان میں روشنی کا ایک بادل یا دریا نظر آتا ہے جسے نثرہ کہتے ہیں ۔ غالب نے اسی نثرہ کی رعایت سے دریائے نور کا لفظ استعمال کیا ہے) یہ برج اتنا دلکش ہو گیا کہ مشتری کے لیے خانہ شرف بن گیا "۔

بشاہانہ کاخے کاسد نام داشت در از نقطہ اوج بہرام داشت
نشد گرچہ چوں گاؤ قرباں او ولے شیر شد گربہ خواں او

یعنی " جب براق و صاحب براق اس کاخ شاہانہ میں پہنچا جس کا نام اسد ہے اور جس کا دروازہ مریخ کے لیے نقطہ اوج ہے تو وہاں پر وہ برج (جو کہ شیر کی شکل کا ہے) اگرچہ گائے کی طرح اس پر قربان تو نہ ہو سکا لیکن اس کے خوان پر بلی کی طرح خاموش بیٹھا رہا اور لطف و کرم کا امیدوار رہا "۔ (غالب نے اسد کو شاہانہ کاخ اس لیے کہا ہے کہ وہ شہنشاہ فلک یعنی شمس کا بیت ہے ۔ اور اس لیے بھی کہا ہے کیونکہ برج اسد کے ستارے بہت روشن ہیں اور کافی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں ۔)

دراں راہ گر توشہ داشت چرخ ہم از خرمنش خوشہ داشت چرخ

ازیں رہ بخود بسکہ بالید تیر هم از خانۂ خود شرف دید تیر

یعنی '' پھر براق سنبلہ میں پہنچا (جس کی شکل ایک لڑکی کی طرح ہے جس کے ہاتھ میں خوشۂ گندم ہے) جو آسمان کے خرمن کے ایک خوشے کی حیثیت رکھتا ہے اور بطور توشۂ راہ کے ہے ۔ اس جگہ عطارد کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہی اس کا گھر بھی ہے اور اسی جگہ اس نے اپنا شرف بھی دیکھا ہے ''۔

ازانجا کہ در مطرح روزگار ترازو پئے سختن آید بکار

سپہر از شرف تاخیالے بہ پخت زحل را بخاک رہ خواجہ سخت

یعنی '' پھر براق میزان میں پہنچا (جس کی شکل ترازو کی طرح ہے) جہاں مطرح روزگار میں ترازو سے تولنے کا کام لیا جاتا ہے ۔ اس مقام پر آسمان نے شرف حاصل کرنے کے لالچ میں زحل کو نبی کریم کی گرد راہ کے ساتھ تولا ۔ اسی وجہ سے زحل خاکی کہلایا اور میزان میں اس کا شرف مانا گیا ''۔

بہ عقرب خداوند آں جلوہ گاہ بران شد کہ تازد بسویش ز راہ

نگہداشت خود را ازاں بیر ہے کہ از حکم شہ سر نہ پیچد رہے

یعنی '' جب براق عقرب میں پہنچا تو اس برج کا مالک یعنی مریخ سامنے آیا تاکہ اس بے راہ عقرب کو راستہ سے ہٹانے کے لیے دوڑے ، اور چونکہ نبی کریم کے حکم کے بغیر کوئی بھی راہ سر نہیں اٹھا سکتی اس لیے مریخ اپنی کوشش میں کامیاب رہا ''۔

بہ قوس اندر آورد چوں خواجہ روئے سعادت بہ برجیس شد مژدہ گوئے

کماں گشت زیں فخر قربان خویش زہے طالع غالب عجز کیش

یعنی '' جب نبی کریم قوس میں تشریف لائے تو اس برج کے مالک یعنی مشتری کو بخشش سعادت کی خوش خبری ملی ۔ اس فخر سے وہ کمان خمیدہ ہوکر اپنے ہی اوپر قربان ہونے لگی ۔ خوشا نصیب ! کہ یہی برج قوس غالب عجز کیش کے زائچے میں طالع ولادت کی حیثیت سے موجود ہے ''۔

گرفتش دواں سعد ذابح براہ کہ نخچیر گیرد جلو دار شاہ

سپہرے رفیقان بسیار فن گسستند از دلو گردوں رسن

به غمخوارگی تافتندش بدست که گیرد مگر خواجه ماهی بشست

یعنی " پھر براق آگے بڑھا اور جدی میں آیا - راستے میں برج جدی کا خاص ستارہ یعنی سعد ذابح نبی کریم کے سائیس کی مانند سامنے آیا اور اُس نے دوڑ کر شکار کو پکڑ لیا - پھر براق دلو میں آیا اور آسمان کے ستاروں نے رفیقان با تدبیر کی حیثیت سے اُس گھوڑے کی گردن سے ڈوری توڑی اور جب براق حوت میں پہنچا تو اُنھوں نے از راہ دوستی ڈوری اپنے ھاتھوں سے بٹ کر اور کانٹا وغیرہ باندھ کر نبی کریم کو پیش کی تا کہ وہ اُس ڈوری سے مچھلی کو شکار کریں "۔

نہم پایه کاں را تواں خواند عرش بره ز اطلس خویش گسترد فرش
بسادی در آمد علی از درش و صل علی شادی دیگرش
نگنجد دوئی در نبی و امام علیه الصلواة و علیه السلام

یعنی " پھر براق فلک نہم تک پہنچا جسے فلک الافلاک یا فلک اطلس بھی کہتے ھیں - یہ فلک سادہ و صاف ریشم کی طرح ہے اور انتہائی بلندی پر واقع ہے اس لیے اسے عرش بھی کہہ سکتے ھیں - جب نبی کریم عرش پر پہنچے تو اُس نے اُن کے قدموں کے نیچے اپنا اطلسی فرش بچھایا اور نبی کریم کو خداوند تعالیٰ کے انتہائی قرب کی خوشی حاصل ہوئی - پھر اسی عرش کے دروازے سے علی ابن ابی طالب امام اول مسکراتے ہوئے بر آمد ہوئے جن کو دیکھ کر محمدالرسول اللہ نبی آخرالزماں کی خوشی دوبالا ہو گئی - ایمان کی بات تو یہ ہے کہ نبی علیہ الصلواۃ اور امام علیہ السلام بلا فصل ھیں اور ان کے درمیان دوئی سما ھی نہیں سکتی کیونکہ یہ ایک ھی نور کے ٹکڑے ھیں "۔ (اسی وجہ سے غالب نے علیہ الصلواۃ و علیہ السلام کو بھی ایک ھی جگہ لکھا ہے جو دونوں کے لیے مشترک ہے -)

۵- اصطلاحات ھیئت و نجوم برائے تلمیحات و تشبیہات و استعارات :

غالب کے کلام میں ھزاروں مقامات در اصطلاحات ھئیت و نجوم کو ایسی قادرالکلامی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے کہ وہ عام تلمیحات و تشبیہات اور استعارات کے مقابلے میں کہیں زیادہ با معنی اور لطیف ھو گئی ھیں - اس مقام پر صرف چند اشعار پیش کیے جائیں گے تا کہ غالب کا انداز کلام معلوم ھو جائے ورنہ اگر غالب کا تمام منجمانہ کلام جمع کیا جائے اور

اُس پر سیرحاصل تبصرہ کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں ۔ نمونے کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمایے ۔

در بروت نحس اصغر چنگ سفاکی زدہ
در گلوئے سعد اکبر طیلسان انداختہ

غم چو گیرد سخت نتوان شکوہ از دلدار کرد
بہر آسانی اساس آسمان انداختہ

جادہ پیمایان راحت نہ فلک را چوں جرس
در گلوئے ناقہ ھائے کاروان انداختہ

یہ اشعار کلیات فارسی کے قصیدہ' اول در توحید سے لیے گئے ہیں ۔ اس مقام پر غالب نے خداوند تعالیٰ کی خلاقی کی بوقلمونیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ '' اے خداوند تعالیٰ تونے ایک طرف تو نحس اصغر یعنی مریخ کی مونچھوں میں اُس کی سفاکانہ روش سے اُس کی انگلیاں ڈال دی ہیں گویا کہ وہ قتل و غارت پر کمر باندھے ہوئے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے ، اور دوسری طرف سعد اکبر یعنی مشتری کے گلے میں قانون کا سا لبادہ ڈال دیا ہے جس کو پہن کر وہ رحمدلی اور نیکی کے کاموں میں مشغول ہے اور سفاکی کے خلاف اپنے فیصلے سناتا ہے ۔ جب محبوب کا ظلم و ستم بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے تو بیساختہ نالہ و فریاد اور شکوہ' بیداد کرنے کو جی چاہتا ہے ، لیکن ایسی شدید حالت میں بھی اپنے محبوب سے شکایت کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا ۔ ایسے نازک موقع پر آسانی پیدا کرنے کے لیے اے خدا تونے آسمان کی بنیاد ڈال دی تاکہ ہم ہر رنج و غم کی ذمہ داری اُسی پر ڈال کر اُس سے شکوہ' بیداد کر سکیں ۔ جو لوگ تیری راہ میں معرفت کی منزل تک سفر کر رہے ہیں اُنھوں نے غفلت سے دور رہنے کے لیے تو آسمانوں کو جرس کے طور پر قافلے کے اونٹوں کی گردنوں میں لٹکا دیا ہے ۔ یعنی راہ معرفت میں چلنے والے لوگ جب آسمانوں کی گردش کو دیکھتے ہیں اور ثوابت و سیار کے نیک و بد اثرات پر غور کرتے ہیں تو اُن پر ایسا بیدار کن اثر پیدا ہوتا ہے گویا وہ لوگ بانگ درا سن رہے ہیں اور اپنے سفر سے غافل نہیں ہیں ''۔

نہ من بلکہ اینجا برامشگری		اگر زہرہ آید شود مشتری

یہ شعر مثنوی یازدھمیں موسوم بہ ابر گہر بار سے لیا گیا ہے ۔ اس مثنوی کے ساقی نامے میں غالب نے نبی کریم کی بزم کی سنجیدگی و پاکیزگی کا ذکر بڑے اچھوتے انداز میں کیا ہے ۔ فرماتے ہیں کہ (حالانکہ میں ایک رند مشرب شاعر ہوں اور ہرکسی کی بزم آرائی کا ذکر رود و سرود و شراب و کباب کی اصطلاحات کی مدد سے کرتا ہوں ، لیکن اے نبی کریم ! آپ کی بزم پاک ایسی برگزیدہ ہے کہ آپ کی شان بیان کرنے کے لیے میں اس قسم کے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا ، بلکہ نہایت ادب و احتیاط کے ساتھ بڑے سنجیدہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں) '' یہ احتیاط صرف میری ہی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس بزم میں اگر زہرہ بھی رقص کرنے کے ارادے سے آئے تو وہ بھی اس بزم کی پاکیزگی دیکھ کر اس قدر مرعوب ہو کہ اپنی رندانہ عادت ترک کردے اور مشتری کے سنجیدہ خواص کو اختیار کر کے عابد و زاہد بن جائے ۔ یعنی اس بزم میں اگر زہرہ بھی آئے تو مشتری ہو جائے ''۔ (اس جگہ ایک باریک نکتہ یہ بھی ہے کہ اس محفل میں آکر سعد اصغر بھی سعد اکبر ہو جاتا ہے ۔)

پیغمبر آفتاب فروغش جمال دیں		بعد از نبی امام مہ و پیروان پرن

اے از تو بودہ رونق دین محمدی		رویت سہیل و کعبہ ادیم وعرب یمن

یہ اشعار قصیدۂ پنجم در منقبت سے لیے گئے ہیں ۔ ان میں حضرت علی ابن ابی طالب امام اول کی شان میں غالب نے کہا ہے کہ '' نبی کریم آفتاب کی مانند ہیں ، دین اسلام آفتاب کی روشنی کی مانند ہے ، حضرت علی آپ ماہتاب کی مانند ہیں جو آفتاب کی روشنی سے چمکتا ہے اور جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو اسی اخذ شدہ روشنی کو دوبارہ دنیا میں پھیلا دیتا ہے ، نبی و علی کی پیروی کرنے والے لوگ اپنی صفائی قلب کے باعث عقد ثریا کی مانند ہیں ۔ حضرت علی ہی کی ذات سے دین محمدی میں رونق ہے ، آپ کا چہرہ گویا ستارۂ سہیل ہے ، کعبہ آپ قیمتی چمڑے کی مانند ہے جو سہیل کی شعاعوں کے اثر سے خوشبودار ہو جاتا ہے ، اور ملک عرب جس میں حضرت علی جلوہ گر ہوئے آپ یمن کی مانند ہے جس سمت سے سہیل کی شعاعیں کعبہ کی طرف آتی ہیں ''۔

فرزانہ زہر خانہ کہ فیضے رسدش خاص		خواہد شرف ذات خداوند مکاں را

نازم روشِ زہرہ کہ در شکر گزاری		ازحوت بہ تثلیث ببیند سرطان را
دوران تو و یار تو فرخندہ قرانیست		در طالع من جلوہ دہ آثار قران را

یہ اشعار قصیدہ چہارم مشترک در نعت و منقبت سے لیے گئے ہیں - اس مقام پر غالب نے نبی کریم کو مشتری سے مناسبت دی ہے جو سعد اکبر ہے اور حضرت علی کو زہرہ سے مناسبت دی ہے جو سعد اصغر ہے - جب یہ دونوں سیارے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو وہ ساعت نہایت ہی نیک سمجھی جاتی ہے اور اسے قران السعدین کہتے ہیں - غالب کہتے ہیں کہ " فرزانہ وہ ہے جسے جس گھر سے بھی فیض خاص پہنچتا ہے وہ اس گھر کے مالک کے لیے شرف ذات کی خواہش کرتا ہے - لہذا میں بھی سیارہ زہرہ کی طرح ناز کرتا ہوں کیونکہ وہ بھی جب برج حوت میں پہنچتا ہے (جہاں اسے شرف حاصل ہوتا ہے اور جس کا مالک مشتری ہے) تو وہ اس سے پانچویں برج یعنی برج سرطان کو (جو مشتری کا برج شرف ہے) نظر تثلیث سے دیکھتا ہے جو مکمل دوستی کی نظر ہے ، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ زہرہ خداوند مکان شرف یعنی مشتری کے لیے بھی شرف ذات کی خواہش کر رہا ہے - یہی حال نبی کریم اور حضرت علی کا بھی ہے - چونکہ حضرت علی کو نبی کریم کے گھر سے شرف حاصل ہوا تھا ، اس لیے وہ بھی ہمیشہ نبی کریم کے لیے شرف ذات کی خواہش کرتے رہے - نیک ذات لوگوں کا باہمی معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ مشتری و زہرہ کے درمیان ہے - اے نبی کریم ! آپ اور آپ کے دوست حضرت علی کا ایک جگہ پر مجتمع ہونا گویا قران السعدین ہے لہذا آپ اس قران کے نیک اثرات میرے طالع میں بھی پیدا کر دیجیے اور میری بدنصیبی بھی دور کر دیجیے "-

در گریہ در گرفتن زان روئے تابناک		پروین نشاندن است و ثریا گریستن
گویند در طلوع سہیل است قطع سیل		ما را فزود زان رخ زیبا گریستن
رشک آیدم بہ ابرکہ درحد وسع اوست		بر خاک کربلائے معلیٰ گریستن

یہ اشعار قصیدہ دہم سے لیے گئے ہیں - یہ قصیدہ غالب نے سیدالشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں کہا ہے - غالب کہتے ہیں کہ " غم حسین میں روتے وقت اگر حسین مظلوم کے روئے تابناک کا تصور آنکھوں کے سامنے رہے تو پھر اشکوں کے قطرے بھی تابناکی اور قدر و منزلت میں پروین یعنی ثریا کے ستارے بن جاتے ہیں اور ایسے پرنور رونے کو پروین

نشاندن اور ثریا گریستن کہنا چاہیے - لوگ کہتے ہیں کہ جب ستارہ سہیل طلوع ہوتا ہے تو برسات کا موسم ختم ہو جاتا ہے اور بارشیں بند ہو جاتی ہیں ، لیکن میرا ذاتی تجربہ اس کے برعکس ہے کیونکہ میرا سہیل جب طلوع ہوتا ہے یعنی جب حسین علیہ‌السلام کے روئے روشن کا تصور آتا ہے تو اشکوں کی بارشیں اور بھی زیادہ ہو جاتی ہیں - مجھے ابر پر رشک آتا ہے کیونکہ کربلائے معلیٰ کی خاک پاک پر جا کر رونا اس کی دسترس کے اندر ہے اور میری دسترس سے باہر ہے''۔

دید چوں نقش کف پائے تو بر خاک زحل
خورد سوگند کہ ایں کفہ میزان منست
ذرہ گرد رہت را بہوا در پرواز
چرخ ہفتم بہ قسم گفت کہ کیوان منست
زہرہ چوں بزم ترا نام طلب کرد کہ چیست
مشتری گفت کہ حوت تو و سرطان منست

یہ اشعار قصیدہ سی وہشتم سے لیے گئے ہیں - ان میں غالب اپنے ممدوح کی شان و شوکت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ '' جب فلک ہفتم کی بلندی سے زحل نے خاک پر تیرے دونوں قدموں کے نشان دیکھے تو ان کے متوازن انداز اور علو شان کی بنا پر قسم کھا کر کہا کہ یہ تو میری اس میزان کے پلڑے ہیں جس میں مجھے شرف حاصل ہوتا ہے (یعنی ان نقوش قدم پر جبیں سائی کے لیے اگر میں اپنا سر رکھ دوں تو یہ میرے لیے باعث شرف ہے) - تیرے راستے کی گرد کے ایک ذرے کو جب ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا اور اس کی بلندی پر غور کیا تو فلک ہفتم نے قسم کھا کر کہا کہ یہ تو میرا حکمران یعنی زحل ہے - جب تیری بزم کے چراغاں کو آسمان سے زہرہ نے دیکھا تو اس کی رونق اور سعادت پر متحیر ہو کر اس نے مشتری سے پوچھا کہ یہ کیا ہے - مشتری نے فوراً جواب دیا کہ یہ تیرا برج حوت ہے اور میرا برج سرطان ہے یعنی اس بزم میں باریاب ہونا ہم دونوں کے لیے باعث شرف ہے''۔

غالب نے کف اور کفہ کے الفاظ میں بڑی اعلا پائے کی رعایت لفظی

پیدا کی ہے" اور یہ بتایا ہے کہ جس مقام پر ممدوح کے نقوش قدم ہیں اُس مقام پر زحل کی پیشانی ہے - یعنی جب زحل کی پیشانی کی بلندی ممدوح کے قدموں کی خاک کی بلندی کے برابر ہو تو پھر ممدوح کے سرکی بلندی کا توکہنا ہی کیا ہے۔ زحل خاکی ہے اور اسی لفظی رعایت سے فائدہ اُٹھا کر غالب نے زحل کو خاک کف پا اور ذرہ گرد راہ سے مناسبت دی ہے -

به عهدش ماه هر شب کامل و آفاق مهتابی
بدورش زهره دایم حوتی و برجیس سرطانی

یہ شعر قصیدہ سی و سوم سے لیا گیا ہے - اس میں غالب اپنے ممدوح کے عہد کی خوش حالی و خوش بختی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ " اُس کے زمانے میں ہر رات کو ماہ کامل طلوع ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہر طرف چاندنی پھیلی رہتی ہے - مزید برآں زہرہ کا قیام ہمیشہ اُس کے برج شرف یعنی حوت میں رہتا ہے اور مشتری کا قیام ہمیشہ اُس کے برج شرف یعنی سرطان میں رہتا ہے تا کہ ہر طرف سعادت کا دور دورہ رہے " -

دوش در بزمے کہ ناهید از صفائے آں بساط
گفت دستم گیرمی ترسم کہ لغزد پائے من

یہ شعر قصیدہ نمبر ۱۶ سے لیا گیا ہے جس میں غالب نے اپنے ممدوح کی بزم کے فرش کی صفائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ " کل رات کو اُس کی بزم کے فرش کی صفائی کا یہ عالم تھا کہ زہرہ جیسی ماہر فن رقاصہ فلک بھی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میرا ہاتھ پکڑلو ورنہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرا پاؤں نہ پھسل جائے "۔ (غالب نے ہاتھ اور پاؤں کا ذکر کر کے بڑی اعلا صنعت تضاد پیدا کردی ہے -)

به دستگاه گرامی چو ماهتاب به ثور
به مهرشاه قوی دل چو زهره در تصمیم

یہ شعر قصیدہ سیزدہم سے لیا گیا ہے - یہ قصیدہ غالب نے محمد اکبر شاہ کی مدح میں کہا تھا - وہ فرماتے ہیں کہ " اس بادشاہ کو شرف و اقتدار کے لحاظ سے وہ بزرگی حاصل ہے جو ماہتاب کو اپنے برج شرف یعنی ثور میں پہنچ کر حاصل ہوتی ہے ، اور مہر و مروت کے لحاظ سے یہ بادشاہ ایسا قوی دل ہے جیسا کہ سیارہ زہرہ حالت تصمیم میں ہوتا ہے "۔ (تصمیم اُس حالت

کو کہتے ہیں جب کوئی سیارہ گردش کرتے کرتے آفتاب کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ دونوں کے مقامات میں سولہ دقیقوں سے کم فرق ہوتا ہے ۔ ایسی حالت میں وہ سیارہ بہت قوی ہو جاتا ہے خصوصاً زہرہ کو تصمیم میں بہت ہی زیادہ قوت حاصل ہوتی ہے کیونکہ دیگر سیاروں کی بہ نسبت زہرہ کا ظاہری قطر بھی زیادہ ہے اور مدار شمسی پر اُس کا عرض بھی زیادہ ہے) ۔

در دل افتاد رہ بارگہش سر کردن اول گام فراز سر کیواں رفتم

یہ شعر قصیدہ نمبر ۹ سے لیا گیا ہے اس میں غالب نے نصیرالدین حیدر نواب اودھ کے مرتبے کی بلندی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "جب میرے دل میں اُس کی بارگاہ کا راستہ طے کرنے کا ارادہ ہوا تو پہلے ہی قدم پر میں زحل کے سر کی بلندی تک پہنچ گیا جو فلک ہفتم پر ہے"۔ (یعنی ممدوح کی بارگاہ تک پہنچنے میں جتنے قدم کا فاصلہ ہے ، اُن قدموں کی تعداد کو فلک ہفتم کی بلندی سے ضرب دے کر جو بلندی حاصل ہوگی وہ ممدوح کے مرتبے کی بلندی کے برابر ہوگی) ۔

با ساغر شہ ساغر خورشید سفالست

با خنجر شہ خنجر مریخ نیامست

یہ شعر بستمین قصیدہ سے لیا گیا ہے جو ابو ظفر بہادر شاہ کی شان میں کہا گیا تھا ۔ غالب نے اس شعر میں بادشاہ کی بزم و رزم کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ " میرے بادشاہ کی بزم آرائی کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ اس کے ساغر کی قدر و قیمت کے سامنے آفتاب جیسے شہنشاہ فلک کا ساغر زریں بھی گویا ایک مٹی کا ٹھیکرا ہے ، اور اُس کی رزم آرائی کی ہیبت کا یہ حال ہے کہ اُس کے خنجر کی تیزی و برش کے آگے مریخ جیسے سپہ سالار فلک کا تیز خنجر بھی اتنا کند نظر آتا ہے گویا کہ وہ محض ایک نیام ہے "۔ (منجمین نے آفتاب کی شکل و صورت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ وہ ایک بادشاہ کی مانند سر پر تاج مرصع پہنے ہوئے تخت شاہی پر بیٹھا ہے اور ہاتھ میں ساغر زریں لیے ہوئے ہے ۔ اسی طرح مریخ بھی ایک سپہ سالار کی مانند کلاہ وکمر سے آراستہ ہے اور ہاتھ میں تیز خنجر لیے ہوئے ہے) ۔

خورشید بدریوزۂ دیہیم رخ آورد بہرام طلبگار کلاہ و کمر آمد

یہ شعر هژدهمین قصیدے سے لیا گیا ہے ، جو ابو ظفر بہادر شاہ کی شان میں کہا گیا تھا ۔ غالب نے اس شعر میں بادشاہ کی داد و دهش کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ '' میرے بادشاہ کی شان و شوکت و سخاوت کا شہرہ سن کر آفتاب بھی اپنے لیے تخت شاہی مانگنے اس کی بارگاہ میں نمودار ہو گیا ، اور مریخ بھی اپنے لیے کلاہ و کمر کی طلبگاری کی غرض سے اس کے حضور میں پیش ہو گیا '' ۔

نظر بہ منظر جاهش بود سرم برپشت
اگرچہ بنگرم از سقف کاخ کیوانش

یہ شعر قصیدہ نمبر ۴۶ سے لیا گیا ہے ۔ اس میں غالب اپنے ممدوح کے مرتبے کی بلندی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ '' اس کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ اگر میں فلک هفتم پر پہنچ کر زحل کی رهائش گاہ کی چھت پر چڑھ کر بھی اسے دیکھنا چاہوں تو مجھے اپنی آنکھیں اوپر اٹھانے کے لیے اپنی گردن اتنی موڑنی پڑے گی کہ میرا سر میری کمر سے لگ جائے گا '' ۔ (اس مقام پر کاخ کیوان سے برج جدی یا برج دلو مراد نہیں ہے بلکہ وہ فرضی مکان مراد ہے جس میں زحل اپنی زندگی گزارتا ہوگا) ۔

کیوان ندیدہ کہ بود دیدبان بام
گفتی کہ بام کاخ بہ کیوان برابر است

یہ شعر قصیدہ هفدهمیں سے لیا گیا ہے ۔ اس میں غالب نے ابو ظفر بہادر شاہ کے مرتبے کی بلندی کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ '' تو یہ غلط کہتا ہے کہ میرے ممدوح کے محل کی چھت بلندی میں زحل کے برابر ہے کیونکہ یہ بات تو نے زحل کو دیکھے بغیر کہی ہے ، ورنہ اگر تو زحل کو دیکھتا تو تجھے خود پتا چل جاتا کہ زحل تو خود اپنی نظریں اوپر کی طرف اٹھائے ہوئے میرے ممدوح کے محل کی چھت کو غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے '' ۔

آسمان آستان بہادر شاہ		کہ فلک بر درش سر اندازد
بگمان دوئی عطارد را		از فراز دو پیکر اندازد

یہ اشعار بست و چارمین قصیدے سے لیے گئے ہیں ، ان میں غالب نے ابو ظفر بہادر شاہ کے علم و فضل کی مدح کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ''بہادر شاہ

کا محل بھی عظمت و بلندی کے لحاظ سے آسمان کے برابر ہے ، اور اس محل میں بیٹھے ہوئے شہنشاہ کے دروازے پر آسمان بھی اپنا سر جھکا رہا ہے ۔ میرے ممدوح نے اس گمان سے کہ عطارد کو دو پیکر یعنی برج جوزا میں (جو کہ عطارد کا بیت یعنی گھر ہے) بیٹھا ہوا دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ عطارد بھی شہنشاہ کا ہمسر ہے ، عطارد کو دو پیکر کی بلندی سے نیچے گرا دیا ہے "۔ (عطارد اپنے علم و فضل کے لیے مشہور ہے اور غالب کا ممدوح بھی علم و فضل میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا ۔ اس لیے غالب نے قصر شاہی میں بیٹھے ہوئے بہادر شاہ کو برج جوزا میں بیٹھے ہوئے عطارد سے تشبیہ دی ہے ، اور پھر چونکہ عطارد خاکی ہے ، اس لیے غالب نے اس رعایت معنی سے مدد لے کر اس کو آسمان سے زمین پر گرانے کا مضمون پیدا کیا ہے ۔ یعنی غالب کے ممدوح نے ذرا سی دوئی بھی گوارا نہ کی اور عطارد کو بلندی سے محروم کردیا) ۔

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج والم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

یہ اشعار غالب کے ایک قطعے سے لیے گئے ہیں جو ابو ظفر بہادر شاہ کی شان میں کہا گیا تھا ۔ بہادر شاہ کے عہد کی خوش حالی کا ذکر کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں کہ " تیرے عہد حکومت اور زمانۂ سلطنت میں قمر نے ثور سے یعنی اپنے برج شرف سے باہر جانا چھوڑ دیا ہے تا کہ اس کے نیک اثر سے تیری رعایا کو ہمیشہ عیش و طرب حاصل رہے ۔ اسی طرح تیرے زمانے میں زہرہ نے بھی حوت سے یعنی اپنے برج شرف سے تحویل کرنا ترک کردیا ہے تا کہ اس کے نیک اثر سے تیری رعایا کے رنج و الم میں ہمیشہ کمی ہی ہوتی رہے "۔

ز روئے ضابطۂ مدت آں بود یکروز   سنین عمر شہنشاہ عالم آرا را
کہ سعی سیر ثوابت بحسب رائے حکیم   در آورد بہ نشانگاہ ثور جوزا را

یہ اشعار بست و یکمین قصیدے سے لیے گئے ہیں جو ابو ظفر بہادر شاہ کی شان میں کہا گیا تھا ۔ اس قصیدہ کے آخری دو شعروں میں غالب نے

بہادر شاہ کے لیے درازیٔ عمر کی دعا اس طرح مانگی ہے کہ " خدا کرے شہنشاہ عالم آرا کی عمر کے جتنے برس قضا و قدر نے مقرر کردیے ہیں ، آن برسوں میں سے ہر ایک سال کا ایک ایک دن پیدائش وقت کے لحاظ سے اتنی مدت کا ہو جائے جتنی مدت میں ہیئت دانوں کے حساب کے مطابق فلک ثوابت اپنے مقام سے ایک برج کے برابر پیچھے سرک جائے یعنی جس جگہ اس وقت برج ثور ہے آس نشانگاہ پر برج جوزا آجائے "۔ (ہیئت دانوں کے حساب کے مطابق فلک ثوابت نہایت آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف گردش کر رہا ہے اور آس کا ایک دور (یعنی ۳۶۰ درجے) تقریباً پچیس ہزار سال میں پورا ہو جاتا ہے ۔ اس مدت میں ہر ایک برج پیچھے سرکتے سرکتے پھر اپنی آسی جگہ پر آجاتا ہے جس جگہ پر پچیس ہزار سال پہلے تھا ۔ اس طرح فلک ثوابت کو ایک برج کے برابر یعنی صرف تیس درجے پیچھے سرکنے میں تقریباً دو ہزار سال لگتے ہیں - یعنی جس جگہ اس وقت برج ثور ہے آس نشانگاہ پر برج جوزا کو آنے میں دو ہزار سال لگیں گے ۔ اس حساب کو پیش نظر رکھ کر غالب کہتے ہیں کہ خدا کرے یہ دو ہزار سال کی مدت شہنشاہ کی عمر کے ایک دن کے برابر ہو جائے ۔ یعنی بادشاہ کی عمر کا ہر ایک سال تقویم شمسی کے لحاظ سے تقریباً ساڑھے سات لاکھ سال کے برابر ہو جائے ۔ سیر ثوابت کو اہل ہند اننانش کہتے ہیں اور اہل مغرب پری سیشن کہتے ہیں ، یہ علم ہیئت کا ایک بہت دقیق مسئلہ ہے اور غالب اس دقیق مسئلے سے بھی کما حقہ واقف تھے) ۔

نیر نازد گر به ادریسی بخاک اندازمش
زهره نازد گر به بلقیسی سلیمانش منم

یہ شعر ترکیب بند سے لیا گیا ہے ۔ اس میں غالب نے شاعرانہ تعلی سے کام لیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ " اگر عطارد کو اپنی ادریسی پر (یعنی فضا میں بلند ہونے پر اور علوم و فنون میں ماہر ہونے پر) ناز ہے تو میں بھی اپنی عقل و دانش کے زور سے آسے زمین پر گرا سکتا ہوں اور آس کے غرور کو خاک میں ملا سکتا ہوں ۔ اسی طرح اگر زہرہ کو اپنی بلقیسی پر (یعنی عشوہ و غمزہ پر اور حسن و جمال پر) ناز ہے تو میں بھی اپنے جاہ و حشم کے لحاظ سے آس کے مقابلے میں حضرت سلیمان کی سی حیثیت رکھتا ہوں "۔ (حضرت ادریس ایک پیغمبر تھے جو علوم و فنون میں ماہر تھے اور زندگی ہی میں آسمان پر

پہنچ کر جنت میں داخل ہوگئے تھے - حضرت سلیمان اور ملکہ بلقیس کی حقیقت بھی سب کو معلوم ہے - چونکہ عطارد خاکی ہے اس لیے غالب نے اس رعایت لفظی کے سہارے اسے خاک پر گرانا آسان سمجھا اور چونکہ زہرہ بادی ہے اس لیے اسے تخت سلیمان کی پرواز سے مرعوب کرنا مناسب سمجھا - تمزیج سیارگان اور شاعرانہ صنائع و بدائع کے امتزاج کی یہ ایک بہترین مثال ہے - اس قسم کے اعلا نمونوں سے غالب کا فارسی کلام بھرا پڑا ہے) -

نیر را از پئے دوام وبال		جائے جز در کمان نمی خواہم
نیش عقرب جگر شگاف سہ است		زیں گزندش امان نمی خواہم

یہ اشعار قصیدہ نمبر ۳۶ سے لیے گئے ہیں - یہ قصیدہ کلیات فارسی کا آخری قصیدہ ہے اور اس میں غالب نے بڑے مایوسانہ انداز میں اپنی محرومیوں کا ذکر کیا ہے اور بے نیازانہ طور پر خوشی سے آفات زمانہ کو قبول کرنے کا اعلان کیا ہے - ان اشعار میں وہ کہتے ہیں کہ " میں چاہتا ہوں کہ تیر یعنی عطارد ہمیشہ کمان میں یعنی برج قوس میں رہے تاکہ اس پر دائمی وبال مسلط رہے اور اس کے ڈر سے میرے علم و فن کی نا قدری ہوتی رہے - میں اس گزند سے بھی امان نہیں چاہتا جو اس وقت پہنچتی ہے جب کہ قمر برج عقرب میں داخل ہو کر اس کے نیش کے قریب پہنچ جاتا ہے ، حالانکہ یہ ساعت قمر کے لیے جگر شگاف ثابت ہوتی ہے اور اس کے اثر سے مجھ پر بڑی تباہ حالی مسلط ہو جاتی ہے "- (جب قمر برج عقرب میں داخل ہوتا ہے تو وہ ساعت قمر در عقرب کہلاتی ہے - یہ ساعت نہایت نحس سمجھی جاتی ہے کیوں کہ عقرب قمر کا برج ہبوط ہے - یہ ساعت تقریباً سوا دو دن تک رہتی ہے اور اس ساعت میں کوئی بھی خوشی کی تقریب نہیں کرنی چاہیے - اس سوا دو دن کی مدت میں بھی وہ گھڑیاں خاص طور پر نحس اکبر خیال کی جاتی ہیں جب کہ قمر ان دو ستاروں کے قریب پہنچتا ہے جو نیش عقرب پر واقع ہیں اور جنھیں شولہ کہتے ہیں - غالب نے قمر کو نیش عقرب پر پہنچا کر انتہائی نحس ساعت کا تصور پیش کیا ہے - تیر اور کمان کے الفاظ اس خوبی سے استعمال کیے ہیں کہ نہایت اعلا درجے کی صنعت ایہام پیدا ہوگئی ہے) -

قمر در عقرب و غالب بہ دہلی		سمندر در شط و ماہی در آتش

یہ غالب کی ایک فارسی غزل کا مقطع ہے ۔ اس میں انھوں نے اُ اذیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو دھلی میں رہتے ہوئے انھیں پیش آئی تھیں وہ کہتے ھیں کہ '' جس طرح سمندر یعنی آگ کا کیڑا دریا میں پہنچ کر بےچین ھو جاتا ہے ، یا جس طرح مچھلی آگ میں پڑ کر تڑپتی ہے یا جس طرح قمر عقرب میں پہنچ کر ھبوط میں مبتلا ھو جاتا ہے ، بالکل اسی طرح غالب بھی دھلی میں رہ کر اذیتیں اٹھا رہا ہے''۔

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقی دھر　　ریزد ھمہ درد درد و تلخابۂ زھر
بگزر ز سعادت و نحوست کہ مرا　　ناھید بہ غمزہ کشت و مریخ بہ قہر

یہ رباعی کلیات فارسی سے لی گئی ہے ۔ اس میں غالب اپنی بد نصیبی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ھیں کہ '' میں وہ بدنصیب ھوں جس کے پیمانے میں ساقی دھر ھمیشہ درد کی تلچھٹ اور زھر کی تلخی ھی ڈالتا رھتا ہے ۔ اے لوگو ! تم سیاروں کی سعادت و نحوست کے چکر میں ھرگز نہ پڑنا ۔ (کیوں کہ سیارے بھی اپنا اچھا اثر اسی وقت دکھاتے ھیں جب قدرت کی نظر سیدھی ھوتی ہے ورنہ نحس تو نحس ، سعد سیارے بھی خراب اثر دکھانے لگے ھیں) ۔ مجھ کو دیکھو کہ مریخ نے تو اپنے قہر سے مجھے مارا ھی تھا زھرہ نے بھی اپنے غمزے سے مجھے مار رکھا ہے''۔

آسمان وھم است و از برجیس و کیوانش مگوئے
نقش ما ھیچ است بر پنہان و بیدائیش پیچ

یہ شعر غالب کی ایک فارسی غزل سے لیا گیا ہے ۔ اس میں غالب نے بتایا ہے کہ آسمان کے ستاروں اور سیاروں کی مدد سے قضا و قدر کے راز ھائے سربستہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا سخت نادانی ہے کیوں کہ یہ راز اتنی آسانی سے معلوم نہیں ھو سکتے ۔ وہ کہتے ھیں کہ '' آسمان اور اس کی گردش محض خیالی چیزیں ھیں اور اصل میں ان کی کوئی حقیقت نہیں ۔ اس کے ستاروں اور سیاروں کی سعادت و نحوست بھی محض فرضی ہے ۔ لہذا مشتری و زحل کی گردش سے کسی امر کی سعادت و نحوست کے متعلق کوئی حتمی حکم نہیں لگانا چاھیے ۔ یہ بھی یاد رکھنا چاھیے کہ ھمارے ظاھری و باطنی حالات کا یا ماضی و مستقبل کے واقعات کا اس آسمان اور اس کے ثوابت و سیار

ہے "کوئی حقیقی تعلق نہیں ہے"۔ (بلکہ محض مشاہدات و تجربات کی بنا پر تعلق پیدا کر لیا گیا ہے) -

چون جنبش سپہر بفرمان داورست
بیداد نبود آنچہ بما آسمان دہد
هم نغمہ سنج عشقم و ہم نکتہ دان علم
ناہید ساز و مشتریم طیلسان دہد

یہ اشعار قصیدۂ دواز دہم در منقبت امام دواز دہم سے لیے گئے ہیں -

یہ قصیدہ غالب نے بارھویں امام یعنی امام مہدی آخر الزمان علیہ السلام کی شان میں کہا ہے - ان اشعار میں غالب نے لوگوں کے لیے صبر و شکر کی تلقین بالکل ہی نئے انداز میں کی ہے - پہلے شعر میں صبر کی تلقین اس طرح کی ہے کہ "چونکہ آسمان کی گردش خدا وند تعالیٰ ہی کے حکم سے قایم ہوتی ہے ، اس لیے اس گردش کے اثر سے سعادت و نحوست سیارگان بھی خدا ہی کے حکم سے ہم کو حاصل ہوتی ہے ، اور چونکہ خدا کی ذات عین عدل ہے ، اس لیے جو کچھ بھی آسمان ہم کو دیتا ہے اسے ہم ظلم و ستم نہیں کہہ سکتے - لہذا ہم کو ہر حال میں راضی برضا رہنا چاہیے"۔ اس کے بعد دوسرے شعر میں شکر کی تلقین فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آسمان جو کچھ مجھے دیتا ہے وہ میری ذاتی اہلیت کے عین مطابق ہے ، مثلاً میری نغمہ سنجی عشق اتنی اعلا ہے کہ اس سے مسحور ہو کر مطربۂ فلک یعنی زہرہ بھی اپنا ساز مجھے پیش کرتی ہے ، اور میری نکتہ دانئی علم اتنی ارفع ہے کہ اس سے مرعوب ہو کر قاضیٔ فلک یعنی مشتری نے بھی اپنی عبا و قبا اور دستار فضیلت میرے لیے وقف کر دی ہے"۔ (اس مقام پر علم کے لفظ سے غالب کی مراد علم تصوف و معرفت الٰہی سے ہے ، کیونکہ مشتری کو ایسے ہی علوم سے نسبت دی جاتی ہے ، ورنہ عام قسم کے علوم کے لیے عطارد کو منسوب کیا جاتا ہے - اس شعر میں غالب نے بتایا ہے کہ میں بہ یک وقت نغمہ سنج عشق بھی ہوں اور نکتہ دان علم بھی - نغمہ سنجی کے لیے مجھے زہرہ سے ساز ملتا ہے اور نکتہ دانی کے لیے مجھے مشتری سے طیلسان ملتا ہے - آسمان کی یہ داد و دہش میرے حق میں ہمت افزئی کی حیثیت بھی رکھتی ہے ' قدردانی کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور باج گزاری کی حیثیت بھی

و کھتی ہے۔ غالب نے زہرہ و مشتری کی تلمیحات تنجیمی کی مدد سے اید
نہایت ہی باریک نکتہ بیان کیا ہے، اور عشق و معرفت کے باہمی امتزاج
بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ یہ غالب کی شان شکر گزاری ہے کہ اثرا
نحسین سے بے نیاز ہو کر صرف اثرات سعدین کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ زہ
نے مجھے ساز دیا ہے اور مشتری نے مجھے طیلسان دیا ہے۔)

غالب کا سفر کلکتہ

[ایک غلط فہمی کا ازالہ]

ڈاکٹر محمود الہی

غالب کے سفر کلکتہ کو جو اہمیت حاصل ہے ، وہ محتاج بیان نہیں لیکن آج تک غالب کے سوانح نگار یہ سوال حل نہ کرسکے کہ اس سفر کے لیے وہ دہلی سے کب نکلے اور عمر کا کتنا حصہ انہوں نے اس سفر میں گزارا ۔ غالب نے اپنی پنشن کے سلسلے میں جو پہلی درخواست کلکتہ کے ذمہ داروں کے سامنے پیش کی تھی ، اس میں انہوں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہ بھی بتا دیا تھا کہ کن مراحل سے گزر کر وہ کلکتہ پہنچے ۔

ان کی درخواست سے واضح ہوتا ہے کہ جب ۱۸۲۵ء میں وہ نواب احمد بخش کی معیت میں بھرت پور کے لیے روانہ ہوئے تو پھر دہلی واپس نہیں لوٹے بلکہ فیروز پور ، لکھنؤ ، باندہ وغیرہ میں قیام کرتے ہوئے سیدھے کلکتہ پہنچ گئے ۔ غالب کلکتہ سے ۱۸۲۹ء میں دہلی واپس پہنچے ۔ درخواست کے الفاظ اتنے واضح ہیں کہ جناب مالک رام بھی اسی نتیجے پر پہنچے کہ غالب ایک مرتبہ جو دہلی سے نکلے تو پھر فیروز پور ، کانپور ، لکھنؤ اور باندہ میں کوئی سال بھر قیام کرنے کے بعد سیدھے کلکتہ چلے گئے ۔ لیکن وہ اس نتیجے سے مطمئن نہیں ہوئے ، انہوں نے مزید تحقیق کی اور اردو دنیا کو مطلع کیا کہ :

" کلیات نثر غالب [ص ٦٥ – ٦٣] سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفر پر روانہ ہوئے تو چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضل حق خیرآبادی سے وداعی ملاقات نہیں کرسکے تھے اس لیے ان سے ملنے کو دہلی واپس گئے اور پھر دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے ۔ کلیات کا

بیان صحیح معلوم ہوتا ہے - درخواست میں انہوں نے اختصار سے کام لیا اور اس کا ذکر مناسب (ضروری) خیال نہیں کیا - "

[ذکر غالب ص ۹۶ - نیز ' افکار ' کراچی ، غالب نمبر ص ۱۰۵

مندرجہ بالا اقتباس کا یہ جملہ بطور خاص اہم ہے کہ 'چونکہ روانگی سے پہلے مولوی فضل حق خیرآبادی سے وداعی ملاقات نہیں کرسکے تو اس لیے ان سے ملنے کو دہلی واپس گئے - گویا جناب مالک رام نے صرف یہی نہیں ثابت کیا کہ وہ کلکتہ والے سفر کے ضمن میں فیروز پور سے دہلی واپس آئے بلکہ اس کا ایک سبب بھی ثابت کر دیا -

' ذکر غالب ' میں کتابیات کے ذیل میں کلیات نثر غالب [فارسی نول کشور پریس کانپور ، ۱۸۷۵ع کا ذکر ملتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ جناب مالک رام نے اسی کتاب سے حوالے پیش کیے ہیں - اگرچہ میرے پیش نظر بھی یہی نول کشوری نسخہ ہے لیکن حیران ہوں کہ اتنی اہم بات اس میں سے کہاں غائب ہو گئی - ممکن ہے جناب مالک رام کے پیش نظر کلیات زیر بحث کی کوئی اور اشاعت ہو یا از قسم مخطوطہ کوئی چیز ان کے پاس ہو جس میں یہ تحریر ہے کہ وہ مولوی فضل حق خیرآبادی سے ملاقات کے لیے دہلی واپس ہوئے -

میرا یہ شبہ اب یقین میں بدل رہا ہے کہ موجودہ سیاق و سباق میں اس اہم جملے کا کلیات نثر غالب سے کوئی تعلق نہیں - غالب نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ مولوی فضل حق خیرآبادی سے ملنے دہلی آئے -

کلیات نثر غالب فارسی میں وہ مضمون بھی شامل ہے جو غالب نے اپنے مجموعۂ اشعار گل رعنا کے " خاتمہ " کے طور پر لکھا تھا - گل رعنا غالب کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے - مجموعۂ اشعار میں نمونۂ نثر کی گنجایش کہاں لیکن غالب نے " خاتمہ " میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس میں نمونۂ نثر کی گنجایش نکل آئی اور انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں اپنی فارسی نثر کے دو نمونے پیش کر دیے -

غالب نے ان دونوں نمونوں کے سبب تحریر یا شان نزول پر بھی روشنی ڈالی ہے ، ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے حالات زندگی بیان کریں - وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ ان نثری نمونوں کو پڑھنے والے

یہ بھی جان جائیں کہ یہ کن حالات میں لکھے گئے ۔

ان نمونوں میں سے پہلا نمونہ ایک خط کی شکل میں ہے جو مولوی فضل حق کو لکھا گیا تھا ۔ غالب نے اس کے سبب تحریر پر جو روشنی ڈالی ہے ، اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ جب سفر پر نکلے تو مولوی فضل حق سے وداعی ملاقات نہ کر سکے تھے ۔ اس کا انھیں بے حد افسوس تھا ، اس لیے جیسے ہی وہ اپنی منزل پر پہنچے ، انھوں نے یہ خط جو صنعت تعطیل میں ہے ، مولوی صاحب کو لکھ کر بھیجا ۔ کلیات نثر کی متعلقہ عبارت یہ ہے :

" .... مولوی حافظ محمد فضل حق کہ از وے دستوری نا خواستہ سفر کردن بمذاق شوقم نا گوار افتاد و معہذا میانہ من و او شکر آبی نیز بود دل بدرد آمد و جان بیغمائے اندوہ رفت ۔ چوں کاروان بمنزل رسید و رہرو از رنج راہ بر آسود ، کتابتے در صنعت تعطیل بخدمتش فرستادہ شد و سوزش و پوزش را باھم آمیختہ بدیں رنگ سخن گزاردہ آمد ۔ ھذا "۔

اس کے بعد غالب نے وہ خط نقل کردیا ہے ۔ مولوی فضل حق والی بات یہیں ختم ہو جاتی ہے ۔ اس کے بعد جو کچھ غالب نے لکھا ہے ، اس کا مولوی صاحب سے کوئی تعلق نہیں ، بلکہ وہ دوسرے نمونہ' نثر کے سبب تحریر کی تمہید ہے ۔ بہرحال اس میں یہ نہیں ہے کہ وہ مولوی صاحب سے ملاقات کرنے دہلی واپس ہوئے !

[۲]

ہاں گل رعنا کے زیر بحث خاتمے میں اس کی صراحت ہے کہ غالب فیروز پور سے دھلی واپس آئے لیکن جن لوگوں نے غالب کی زندگی کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے ، ان کے نزدیک یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ غالب کے سفر فیروز پور کی تعداد ایک سے زیادہ ہے ، وہ لازمی طور پر یہ بھی جانتے ہیں کہ غالب فیروز پور سے واپس ہوئے ۔ فیروز پور سے واپس ہوئے بغیر وہ دوبارہ وہاں کیسے پہنچتے ؟

اس بات کا ثبوت کہ غالب کے سفر فیروز پور کی تعداد ایک سے زیادہ ہے ، غالب کے خطوط سے مل جاتا ہے لیکن اس کا سب سے دلچسپ ثبوت ان کی اس درخواست سے فراہم ہوتا ہے جس کا حوالہ سطور بالا میں دیا جا چکا ہے ۔

اس درخواست میں جہاں غالب نے یہ لکھا ہے کہ وہ نواب احمد بخش خاں سے ملنے فیروز پور گئے اور ان سے انصاف کے طالب ہوئے وہاں اس کا بھی ذکر ہے کہ وہ نواب احمد بخش خاں کی معیت میں بھرت پور کے لیے روانہ ہوئے۔ بھرت پور کا سفر کن حالات میں کیا گیا، ان کا ذکر غالب نے کچھ اس طرح کیا ہے:

"... میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ھذیان کی حالت میں چھوڑا، چار آدمیوں کو اس کی نگہداشت کے لیے مقرر کیا ...... دوسروں کی نظروں سے چوری چھپے بھیس بدل کر کسی طرح کا ساز و سامان لیے بغیر سو مشکلوں سے میں نواب احمد بخش کے ساتھ بھرت پور کے لیے روانہ ہو گیا"۔

[بحوالہ ذکر غالب و افکار کراچی غالب نمبر]

ظاہر ہے کہ نہ تو میرزا یوسف فیروز پور میں تھے اور نہ ان کے قرض خواہ وہاں تھے۔ یہ بیان دھلی سے متعلق ہے جو اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ فیروز پور سے دھلی آئے۔ گویا ۱۸۲۵ء میں جب وہ بھرت پور کے لیے نکلے تو اس سے قبل کم از کم ایک بار وہ فیروز پور کا سفر کر چکے تھے۔ پھر یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ خاتمۂ گل رعنا میں فیروز پور سے جس واپسی کا ذکر ہے وہ بھرت پور کی روانگی کے بعد اور کان پور، لکھنؤ، باندہ، کلکتہ وغیرہ کے سفر سے پہلے ہوئی؟

خاتمۂ گل رعنا میں مولوی فضل حق کے نام جو خط ملتا ہے، اگر اس کا زمانۂ تحریر متعین ہو جائے تو فیروز پور سے زیر بحث واپسی کا زمانہ بھی متعین ہو جائے گا۔

قراین سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خط سفر بھرت پور سے پہلے لکھا گیا۔ اس میں غالب نے اپنی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ نواب احمد بخش خاں کی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اما عم کامگار در وہم و ہراس مکر و حسد اعدا و درد عدم حاصل سرکار الور و ملال در آمد دگرھا سرگرم و سوگوار و گم کردہ آرام ..."۔

اس اجمال کی تفصیل ان سوالات کے جواب میں پوشیدہ ہے کہ نواب احمد بخش خاں دشمنوں کے نرغے میں کب تھے ، الور سے ان کی آمدنی کب بند ہوئی یا ان کی پریشانیوں کا سخت ترین دور کون سا تھا ۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ سفر بھرت پور سے پہلے ان پر مصیبتیں نازل ہوئی تھیں ۔ بھرت پور اور الور کا سفر تو ان کی زندگی کا اہم سنگ میل ہے ۔ اسے ان کی زندگی کا سب سے کامیاب سفر بھی کہا جا سکتا ہے ۔ اس سفر میں ان کے ممدوح مٹکاف نے بھرت پور اور الور دونوں کو بری طرح پسپا کردیا تھا ۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ الور پر مٹکاف کی چڑھائی کا ایک بڑا محرک نواب احمد بخش خاں کی ذات تھی ۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نواب احمد بخش کی طرف سے مٹکاف نے انتقامی کارروائی کی تھی ۔ گویا نواب کی حیثیت ایک فاتح کی تھی ۔ اس ظفر مندی کے بعد دشمنوں سے خوف کا کیا سوال اور عدم تحاصل سرکار الور کا کیا غم ؟

اسی کے ساتھ اگر غالب کے اس بیان کا بھی مطالعہ کیا جائے جو انہوں نے نواب احمد بخش خاں کے بارے میں اپنی ملکہ والی درخواست میں لکھا تھا تو بات اور واضح ہو جاتی ہے ، وہ کہتے ہیں :

> ''... میں مایوس ہو کر نواب احمد بخش خاں کے پاس فیروز پور گیا ... اس زمانے میں نواب صاحب کو بہت زخم آئے تھے اور ان کے باعث وہ بہت بیمار رہے تھے ۔ انھی ایام میں وہ بستر علالت سے اٹھے تھے ۔ پھر ان کی الور کی مختاری بھی جاتی رہی تھی جس سے وہ بہت افسردہ اور غمگین تھے''۔
>
> [بحوالہ ذکر غالب و افکار کراچی غالب نمبر]

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بیان فیروز پور کے اس سفر سے متعلق ہے جو سفر بھرت پور سے قبل کیا گیا تھا ۔ غالب کا یہ بیان مولوی فضل حق والے خط کے مضمون سے ملتا ہے اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہ خط فیروز پور کے اس سفر کے دوران لکھا گیا تھا جس کا ذکر انہوں نے درخواست میں کیا ہے ۔

پھر خاتمہ ' گل رعنا کے ان اہم جملوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جب وہ فیروز پور سے دہلی واپس پہنچے تو :

۱۸' روزگار ے دراز بخاک نشینی بسرے شد و چرخ گردندہ بسے برگرد ابن تیرہ خاکدان بگشت کہ غنودگیہائے مرا بامداد رسید و مرغ سحر خواں شوق نو بر آورد ... ہائے خوابیدہ برفتار آمد ...''۔

غالب کے یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ فیروز پور سے واپسی اور دوبارہ سفر پر نکلنے کے درمیان اچھا خاصا وقفہ ہے اور یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نواب احمد بخش پر قاتلانہ حملہ یا عدم تحاصل سرکار الور اور سفر بھرت پور کے درمیان بھی اچھا خاصہ وقفہ ہے۔ اس لیے خط کا یہ مضمون اور خاتمہ' گل رعنا کا یہ بیان سفر بھرت پور سے پہلے کے حالات سے زیادہ قریب ہے۔

ان معروضات سے یہ بات پایہ' ثبوت کو پہنچ گئی کہ غالب مولوی فضل حق خیرآبادی سے ملنے دھلی نہیں آئے۔ اب رہ گیا بھرت پور اور کلکتہ والے سفر کے دوران فیروزپور سے دھلی کی واپسی کا سوال تو میں سمجھتا ہوں کہ اسے خاتمہ' گل رعنا کے بیانات سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس سوال کا خود غالب نے یہ جواب اپنی کلکتہ والی درخواست کے ذریعہ دیا ہے :

''...... لیکن قرض خواہوں کے شور و غل کے ڈر سے میرا [فیروز پور سے] دھلی جانا ناممکن تھا۔ مجھے اپنی عزت کا خیال آیا اور آخر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

... میں فیروز پور سے تو دلی جا نہیں سکا تھا ، اب باندہ سے کیسے اور کیوں کر اس کی جرأت کر سکتا تھا ...''۔

[بحوالہ افکار کراچی ، غالب نمبر]

غالب کے اس واضح بیان کا اگر کوئی منکر ہے اور اسے اصرار ہے کہ وہ فیروزپور سے دھلی آئے تو ثبوت میں اسے کوئی اور بیان پیش کرنا ہوگا !

غالب اور اقبال

بشیر احمد ڈار

عمرها چرخ بگردد که جگر سوخته ای
چون من از دودهٔ آزر نفساں بر خیزد

اپنے بارے میں غالب کی یہ رائے ہے۔ اور یہ غالب کی خوش نصیبی ہے کہ اس نے اردو اور فارسی شاعری کے مداحوں سے اپنی شاعری کی خوبیوں، نزاکتوں اور بلندیوں کو منوا لیا۔ وہ خود اپنی جگہ اپنے فن کی عظمت سے آگاہ تھے اور اسی لیے ناقدریٔ دنیا سے بیزار۔ بیزاری کے اسی احساس کا اظہار ان کے اردو اور فارسی کلام میں ملتا ہے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اس کے باوجود وہ خود کو عظیم تخلیقی فن کار جانتے تھے۔ ایک فارسی شعر میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس ید بیضا ہے اور ان کے ناقدین جھوٹے پیغمبر سامری کے گوسالہ کے پرستار ہیں:

غالب به سخن صاحب قرتاب کجائی؟   سنمای به گوساله پرستاں ید بیضا

انہیں یقین تھا کہ اگر ان کی زندگی میں انہیں نہ بھی مانا گیا تو موت کے بعد ضرور ان کے اعلیٰ مقام کو تسلیم کیا جائے گا۔

تازدیوانم که سرمست سخن خواهد شدن
این می از قحط خریداری کہن خواهد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بوده است
شهرت شعرم به گیتی بعد من خواهد شدن

لیکن غالب کی خواہش یہ تھی کہ اسے نہ صرف قادر الکلام شاعر سمجھا جائے بلکہ جن خیالات کا اظہار وہ اپنی شاعری اور خصوصاً فارسی

شاعری میں تکر رہے ہیں، وہ تازہ بھی ہیں اور جدید بھی لہذا قدر و قیمت کے لحاظ سے ان کی نوعیت الہامی کتب سے کم نہ سمجھی جائے -

غالب اگر این فن شعر دین بودی   آن دین را ایزدی کتاب این بودی

ایک عظیم تخلیقی فنکار اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ غالب ایک دانشور بھی تھے - یہی وجہ ہے کہ انھیں اکثر فلسفی شاعر کہا گیا ہے اگرچہ فلسفے کی اصطلاح کے مطابق یہ کہنا بجا ہے، کیونکہ غالب کے ہاں ہمیں کسی منضبط خیال یا نظریے کی توضیح و توسیع نہیں ملتی - یہ ضرور ہے کہ ان کے ہاں ایک نکھرا ہوا ذہنی شعور اور اصل اشیا کے بارے میں ایک جستجو نظر آتی ہے یا وہ حقائق کو نئے انداز سے اپنے لیے دریافت کرتے ہیں -

اپنی ایک فارسی مثنوی ' مغنی نامہ ' میں غالب نے انسانی زندگی میں عقل و دانش کی اہمیت پر زور دیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ شاعری ایک انمول خزانہ ہے لیکن صرف عقل ہی اسے پرکھ سکتی ہے - زندگی کا سر چشمہ کبھی خشک نہیں ہوتا، نہ ضعیفی میں اس میں ضعف پیدا ہوتا ہے، یہ جتنا فلسفیوں کے لیے ضروری ہے اتنا ہی صوفیہ کے لیے -

جب شاعری کوئی پیغام دیتی ہے اور جب موسیقی سننے والوں کے دلوں میں گرمی اور گداز پیدا کرتی ہے تو یہ سب عقل کی کرشمہ سازی ہے - عقل ہی دل کو روحانی روشنی سے منور کرتی ہے اور فرد کی حقیقت مطلقہ کے نظارے کی طرف رہنمائی کرتی ہے :

خرد چشمۂ زندگانی بود   خرد را بہ پیری جوانی بود
فروغ سحر گاہ روحانیان   چراغ شبستان یونانیان
زدودن ز آئینہ زنگار برد   ز دانش نگہ ذوق دیدار برد

انیسویں قصیدے کی تشبیب میں وہ عقل فعال سے اپنی خیالی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں - مسلمان حکما کے مطابق عقل فعال، عقول عشرہ کا آخری مورلہ ہے جو ہیولیٰ کو انفرادی شکل دیتی ہے اور انسانی عقل کو جزئیات سے کلیات کی طرف انتقال کرنے کا ملکہ بخشتی ہے - عقل فعال نے تمام دانشوروں کو مسائل کے حل کے لیے مدعو کیا اور زندگی کی عام الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی :

تابہ بینند کہ اسرار نہانی پیداست

غالب آگے بڑھتے ہیں اور سوالات پوچھنے شروع کرتے ہیں ۔ میں یہاں ان کے پوچھے ہوئے سوالوں میں سے چند کا ذکر کروں گا ۔ زندگی کا راز کیا ہے ؟ یہ دنیا کیا ہے ؟ واحد اور کثرت میں کیا رشتہ ہے ؟ جبر و قدر کی نوعیت کیا ہے ؟ نیکی اور بدی کیا ہے ؟ کیا محدود کا لامحدود سے اتصال ممکن ہے ؟ اگر نہیں تو اس منزل تک حد و جہد کہاں تک مناسب ہے ؟ غالب کا یہی وہ عقلی رجحان ہے جو انہیں دوسرے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے ۔ اس رجحان کا اظہار اردو سے زیادہ ان کی فارسی شاعری میں ملتا ہے ، اگرچہ اردو شاعری میں بھی اس کی جھلکیاں واضح ہیں ۔ مثال کے طور پر ان کے مندرجہ ذیل مشہور شعر ایک ایسے ذہن کی غمازی کرتے ہیں جو حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے ، لیکن غالب جس طرح اس کا اظہار کرتے ہیں ، وہ لہجہ منطقی ذہن کا نہیں تخلیقی فنکار کا ہے ۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے ؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ؟ ابر کیا چیز ہے ؟ ہوا کیا ہے ؟

لیکن اس کا فلسفیانہ عروج ان کی فارسی شاعری میں ہے جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ۔ اقبال نے ایک مرتبہ غالب کے پرستاروں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی ۔ یوم غالب کے موقع پر (فروری سنہ ۳۷ء) انجمن اردو پنجاب کے نام ایک پیغام میں انھوں نے کہا تھا :

" اپنا پیغام تو میں کیا دوں گا ۔ البتہ غالب کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو آج یوم غالب منا رہے ہیں ۔ ان کا پیغام یہ ہے :

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

مرزا آپ کو اپنے فارسی کلام کی طرف دعوت دیتے ہیں ، اس دعوت کا قبول کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے ۔ لیکن اگر آپ اسے قبول کرنے کا فیصلہ کرلیں تو ان کے فارسی کلام کی حقیقت اور ان کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے ۔ اول یہ کہ عالم شعر میں مرزا عبد القادر بیدل

اور مرزا غالب کا آپس میں کیا تعلق ہے ؟ دوم یہ کہ مرزا بیدل کا فلسفۂ حیات غالب کے دل و دماغ پر کہاں تک موثر ہوا اور مرزا غالب اس فلسفۂ حیات کو سمجھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آج کل کے وہ نوجوان جو فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں ، اس نقطۂ نگاہ سے غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کریں تو بہت فائدہ اٹھائیں گے'' ۔

ذیل کے اشعار میں غالب اس مشکل کا اظہار کرتا ہے جو اسے اپنے اچھوتے اور ایک دوسری دنیا کے خیالات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں پیش آئی :

آتش اندر نہاد من زدہ اند
لالہ و ارغواں نمی خواہم
بادۂ من مدام خون دل است
ارمغاں از مغاں نمی خواہم
سخن از عالم دگر دارم
ہمدم و رازداں نمی خواہم
سینہ صافم ، قلندرم ، مستم
راز خود را نہاں نمی خواہم

ان اشعار میں الفاظ اور معانی دونوں لحاظ سے اقبال سے مشابہت جھلک رہی ہے ۔ غالب نے اپنے لیے ایک الگ دنیا بسانے کی کوشش کی اور دوسروں کو محظوظ ہونے اور غور و فکر کرنے کی دعوت دی تھی ۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے چمن کا بلبل کہتے ہیں جو ان کے نغموں سے پیدا ہوگا اور یہ نغمے اس محبت کی گرمی سے پیدا ہوئے ہیں جو انہیں نئی دنیاؤں سے ہے :

ہوں گرمئی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

یہی بھسم کردینے والی آگ تھی جو غالب اپنے اندر محسوس کرتے تھے اور یہی ان کے شعروں سے ظاہر ہوتی ہے :

ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عار دل نفس اگر آزر فشاں نہ ہو

اپنی ایک فارسی غزل میں وہ کہتے ہیں :

دلے دارم کہ در ہنگامہ شوق
سرشتش دوزخست و گوہر آتش
بہ خلد از سردیٔ ہنگامہ خواہم
برافروزم بہ گرد کوثر آتش

غالب کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت آزادیٔ افکار ہے جو رسم دہر اور رواج زمانہ کے خلاف ان کے شعوری احتجاج اور پرانی قدروں کی بجائے نئی قدروں کو قبول کرنے کے لیے ان کی ذہنی آمادگی سے واضح ہے۔ وہ اپنے یقین پر جمے رہتے اور اس کی وجہ سے عصبیت جھٹلانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ حالی کی روایت کے مطابق انھوں نے کہا تھا، یہ نہ سمجھو کہ قدما نے جو لکھا ہے وہی صحیح ہے، کیا اگلے زمانے میں گدھے نہیں ہوتے تھے؟

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ایک فارسی شعر میں انھوں نے اسی خیال کو ابراہیم اور ان کے باپ (یا چچا) آزر کی کہانی کے سلسلے میں ظاہر کیا ہے:

با من میاویز اے پدر، فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

اسی خیال کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب پیمبر ہم رہ اجداد رفتے

ان کی اسی آزاد خیالی کا اظہار اس تبصرے میں ہے جو سرسید احمد خان کی آئین اکبری پر انھوں نے کیا تھا۔ تحقیقی لحاظ سے یہ کتاب ایک کارنامہ تھی لیکن غالب کا خیال یہ تھا کہ فرسودہ نظام کی جگہ نیا نظام ضرور آئے گا جس میں عوام کے لیے بہتر مواقع ہوں گے۔ سید احمد خاں کے لیے پورے احترام کے باوجود وہ اپنے یقین کے اظہار سے باز نہیں رہے۔

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار گشتہ آئین دگر تقویم پار

پھر یہ کہ غالب زندگی کے والا و شیدا تھے، وہ زندگی جو انسان کو اس کرۂ ارضی پر چند دنوں کے لیے میسر آتی ہے۔ وہ زندگی کو بامعنی اور

با مقصد سمجھتے تھے اگرچہ ان کی اپنی زندگی تکلیفوں اور مصائب سے پر تھی - وہ پوری طرح درد کی شدت سے با خبر تھے اور جانتے تھے کہ دنیا میں بدی اور اس کے نتیجے میں بے اطمینانی حاصل ہوتی ہے اور ہر دور میں ہر جگہ نومیدی کا احساس اجاگر ہوتا ہے - پھر بھی وہ اسی زندگی سے حظ اٹھاتے اور تسکین حاصل کرتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ زندگی نعمت ہے اور چاہے کچھ ہو زندہ رہنا چاہیے :

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

کئی ایسے اشعار ہیں جن میں زندگی بسر کرنے کی بھرپور خواہش کا انہوں نے اظہار کیا ہے - مثلاً :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

زندگی گزارنے کا یہ جذبہ اکثر انسان کو گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے ، تو کیا یہ ضروری ہے کہ آدمی ثابت قدم رہے تا کہ گمراہ نہ ہو جائے - یہی بدی اور نیکی کی ازلی کشمکش ہے جو آدمی کو اس پر تیار کرتی ہے کہ وہ زندگی کو جیسی بھی ہے کلی طور پر قبول کرلے اور اس میں خود کو ڈبودے اور کبھی موتی چن لائے اور کبھی اتھاہ تاریکیوں میں گم ہو جائے - مگر آدمی کی جدو جہد جاری رہتی ہے اور مقصد کے حصول میں یہی جدو جہد اصل چیز ہے - خاکی ہوتے ہوئے آدمی گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے اور یہی بات اس کی جدو جہد کے لیے مہمیز بن جاتی ہے - اس کوشش اور جد و جہد میں گناہ کا سرزد ہونا اتنا بڑا جرم نہیں جتنا کہ کوشش اور جد و جہد ہی نہ کرنا - غالب اس حقیقت کا شناسا ہے ، وہ کہتا ہے :

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم ز عصیاں می زنم

یہاں میں جاوید نامے میں اقبال کے ان شعروں سے بھی تقابل کرتا چلوں :

چوں بروید آدم از مشت گلے
با دلے ، با آرزوے در دلے
لذت عصیاں چشیدن کار اوست
غیر خود چیزے ندیدن کار اوست
ز انکہ بے عصیاں خودی نا ید بدست
تا خودی ناید بدست ، آید شکست

یوں نہیں ہے کہ کوئی گناہ کرنے کے لیے گناہ کرتا ہے بلکہ آدمی کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ مسلسل مشکلات کے خلاف جد و جہد کرتا رہے ۔ اور ہمیں غالب زندگی کے ہر چیلنج کے لیے تیار نظر آتا ہے :

می ستیزم با قضا از دیر باز		خویش را بر تیغ عریاں می زنم

ایک اور جگہ غالب کہتا ہے :

ساقیٔ ہمت کہ صلا می دہد
بادہ ز خم خانۂ لا می دہد
ہمت اگر بال کشائی کند
صعوہ تواند کہ ہمائی کند
نیرٔ توفیق اگر بر دمد
لالہ عجب نیست کز اخگر دمد

غالب اور اقبال کی یہی ہم نوائی تھی جس نے اقبال کو غالب کے قریب تر کردیا ۔ اس سے پہلے کہ میں یہ ذکر کروں کہ اقبال غالب کو کیا سمجھتے ہیں ، میں ان چند اہم واقعات کا ذکر کروں گا جو دونوں کی زندگیوں میں مشترک ہیں ۔ روایت یہ ہے کہ عبد الصمد نامی ایک ایرانی عالم سے جو مسلمان ہونے سے پہلے زردشتی تھے ، غالب کی ملاقات ہوئی اور دو سال

غالب ان کے ساتھ رہے اور عین ممکن ہے کہ اسی کے نتیجے میں غالب کو ایرانی فلسفے میں دلچسپی پیدا ہوئی ہو اور وہ ابن عربی اور شہاب‌الدین سہروردی مقتول کے خیالات سے متاثر ہوئے ہوں ، ابن عربی سے زیادہ سہروردی سے جن کے تصورات زردشتی ماخذ سے متمتع تھے -

سوال یہ ہے کہ وحدت الوجود کا تصور جس کا بار بار غالب نے جوش اور ولولے سے اردو اور فارسی اشعار میں تذکرہ کیا ہے ، کیا وہ اس تصور تک عملی طور پر پہنچے تھے یا یہ صرف برائے شعر گفتن تھا جیسا کہ حزیں نے کہا تھا : تصوف برائے شعر گفتن خوب است -

میں یہ سمجھتا ہوں کہ غالب کے ہاں وحدت الوجود کا تصور محض برائے شعر گفتن تھا - یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ اس کے قائل تھے ، ممکن ہے کہ اس رجحان کو تقویت ایرانی عالم کے اثر سے پہنچی ہو -

لیکن غالب اس سے بھی آگاہ تھے کہ اس تصور کو عملی زندگی میں اختیار کرنا اور اخلاقی ذمہ داریوں کو رد کرنا اسلامی شعائر کے تقاضوں کے خلاف ہے - اس تضاد پر انہوں نے ایک نہایت خوبصورت شعر کہا ہے :

رموز دیں نشناسم ، درست و معذورم

نہاد من عجمی و طریق من عربی است

عرب اور عجم کے تفاوت پر غالب کے بعد بڑی بحث ہوئی ہے اور ابھی تک کوئی یقینی نتیجہ حاصل نہیں ہوا لیکن اقبال اس تفریق کے قائل تھے اور غالب کے اسی شعر کے الفاظ اپناتے ہوئے کہتے ہیں :

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ

ایرانی عالم کے اثر ہی کا نتیجہ تھا کہ غالب فارسی محاورے سے شناسا ہوئے اور بعد کو اس پر فخر کرتے تھے - شیعیت کی طرف ان کا رجحان بھی اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ، اگرچہ وہ خود کو ترک بتاتے تھے - میں نے جو یہ کہا ہے کہ شیعیت کی طرف ان کا رجحان تھا تو ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ان دو عظیم مدرسہائے فکر کو قریب تر لانا چاہتے ہوں - عرب اور عجم کا تفاوت ایک‌ہمہ گیر اور اعلیٰ حقیقت سے ختم ہو سکتا ہے - غالب کے سلسلے میں شاید یہ یقینی نہ ہو لیکن اقبال نے اس سلسلے میں سنجیدگی سے

کوشش کی ہے ۔ اقبال کی زندگی بھی غالب کی زندگی کے مماثل ہے ، دونوں کے مقاصد بھی ایک ہیں ۔ ایک ایرانی عالم عبدالعلی ہروی لاہور آئے تھے اور اقبال نے ان کی مذہبی تقریریں سنی تھیں ۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط میں اقبال نے ان عالم کا ذکر کیا ہے اور انھیں جید عالم مانا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : "وہ ایک جید عالم ہیں اگرچہ مذہباً ...... ہیں لیکن قرآن کی تفسیر تعجب ہے کہ انتہائی عمدہ اور موثر کرتے ہیں ۔ میں اکثر آن کی مجلسوں میں حاضر ہوتا ہوں" ۔

غالب کے لیے اقبال کے جذبات کا اظہار سب سے پہلے ان کی ۱۹۰۱ء کی نظم میں ہوتا ہے جو مخزن میں چھپی تھی اور بعد میں بانگ درا میں شامل کی گئی ۔ غالب کی ایسی تعریف کسی اور شاعر نے نہیں کی لیکن یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غالب کی یہ تعریف اقبال نے اس کے صرف اردو کلام کو سامنے رکھ کر کی تھی ۔

اقبال کے خیال میں غالب کی دو خوبیاں ہیں ، ایک تخلیقی بلند خیالی جو حسن کے کئی عالم تخلیق کرتی ہے ، گونگے کو زبان دیتی ہے ، مردے کو زندگی بخشتی ہے اور جامد میں حرکت پیدا کرتی ہے ۔ وہ حسن کی تلاش میں تھے جو دنیا کی ہر شے کے دل میں تلاش و جستجو کی صورت میں متمکن ہے ۔ اور اس کا اظہار انھوں نے ایسے الفاظ میں کیا جنھوں نے ہماری زندگی کو معنی دیے ، جیسے چشمے سے پھوٹتے ہوئے پانی کا دھیما نغمہ پہاڑ کی یکسانیت اور جمود کو توڑ دیتا ہے اور پورے ماحول کو زندہ کر دیتا ہے ۔ دوسری خوبی ذہنی طور پر ان کی بلندی تھی جس نے ان کے فن شعری کو بخشہ کیا اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک اچھوتا رنگ پیدا کیا ۔

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

تخیل اور فکر کی اسی یکجائی کے باعث غالب یعنی " غنچہ دہلی " گل شیراز ہونے کا دعویٰ کرسکے ۔ ۱۹۰۱ء میں اقبال نے جس کو "غنچہ دہلی" کا لقب دیا تھا وہ وقت کے ساتھ ساتھ کھل کر پورا پھول بن گیا اور چہار دانگ عالم میں اس کی خوشبو پھیل گئی ۔ اس نظم میں اقبال نے اسے گوئٹے سے ملایا ہے اور اقبال کی نظر میں گوئٹے سب سے بڑا تخلیقی فنکار تھا ۔

پیام مشرق میں اقبال نے " زندگی " کے موضوع پر ایک مباحثے میں

دنیا کے چار عظیم شعرا کو جمع کیا ہے - دو شاعر مغرب سے ہیں براؤننگ اور بائرن اور دو مشرق سے غالب اور رومی - براؤننگ کے خیال میں مے ' زندگی میں تندی نہیں اور اسی لیے اسے بیرونی امداد کی ضرورت ہے جس سے تندی اور تیزی پیدا ہو جائے - اسی وجہ سے وہ خضر سے مدد کا طالب ہوتا ہے جو انسانیت کا ایسا رہنما ہے جو غلطی نہیں کرتا اور اس کے بارے میں روایت یہ بھی ہے کہ وہ سکندر کو چشمہ' حیواں پر لے گیا تھا - براؤننگ خضر کے پیالے میں سے اپنے جام میں شراب ڈال کر اسے تیز و تند بنانا چاہتا ہے - لیکن بائرن کسی کا احسان اٹھانے کا قائل نہیں ، خضر کا بھی نہیں کیونکہ اس سے زندگی خالص نہیں رہے گی ، بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دل کو پگھلا کر جام زندگی میں شامل کرے اور اسے تند و تیز بنا لے -

غالب اپنا نسخہ تجویز کرتا ہے - زندگی میں حرارت اور تندی پیدا کرنے کے لیے وہ سمجھتا ہے کہ شراب کو تلخ تر اور تیز تر بنایا جائے تا کہ وہ دل کے اندر تک نفوذ کر جائے اور آبگینہ پگھلا کر جام زندگی میں شامل کر دے :

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

آخر میں رومی آتے ہیں - وہ سب سے جدا بات کہتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ زندگی میں کسی چیز کی آمیزش کی ضرورت نہیں ، چشمہ' حیواں کے پانی سے یا دل خون کر کے یا آبگینہ پگھلا کر شامل کرنے سے ابدی حقیقت حاصل نہیں ہوتی - زندگی کا اہل ہونے کے لیے فرد کو خدا سے بلا واسطہ رابطہ قائم کرنا چاہیے اور جب تک یہ رابطہ قائم نہیں ہوتا کوئی ادھ کا علاج ہماری زندگی کو اہم اور با معنی نہیں بنا سکتا :

آمیزشے کجا گہر پاک او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

اقبال نے اس طرح دنیا کے چار عظیم شاعروں کو ایک نظریاتی بحث میں جمع کردیا ہے ، فنی سطح پر نہیں - یہ زندگی کا بنیادی سوال ہے اور اقبال کے خیال میں رومی کا نظریہ غالب سے بلکہ باقی دونوں سے بھی بہتر ہے -

لیکن فنی طور پر اقبال غالب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ یہ تمام مباحثہ انہوں نے غالب کے ہی رنگ میں لکھا ہے ۔ غالب کی اس غزل کے چند شعر پیش کرتا ہوں :

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افکنم
در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افکنم
نخلم کہ ہم بجائے رطب طوطی آورم
ابرم کہ ہم بروے زمیں گوہر افکنم
واہے ز کنج دہر بہ مینو کشادہ ام
از خم کشم پیالہ و در کوثر افکنم

' جاوید نامہ ' میں اقبال نئی بلندیوں کی تلاش میں مشتری پر جا نکلتے ہیں جہاں وہ غالب حلاج اور قرۃ العین طاہرہ سے ملتے ہیں جن کی پاک روحیں اپنے جلو میں ایسی آگ لیے ہوئے ہیں جو دنیا کو پگھلا دے۔ لالے کی طرح سرخ رنگ کا لباس اس خلش کا اظہار ہے جس نے انہیں ابد تک ایک سرور اور ایک کیف میں ڈبو دیا ہے اور اسی کے لیے انہوں نے جنت میں گوشہ گیر ہونے پر آوارگی کی زندگی کو ترجیح دی ہے ۔

اقبال کے نزدیک غالب ، حلاج اور طاہرہ میں ایک مشترک بات ہے جسے وہ آتش نوائی کا نام دیتے ہیں۔ یہ آگ کے گیتوں کے موسیقار جو ہر ایسی روایت کو خاک کر دیتے ہیں جو زندہ رہنے کے قابل نہیں ، وہ ایک ایسے نشے میں سرشار ہیں جو ایک حقیقی نابغہ کا حصہ ہے اور جو ایک مستحکم مستقبل کی بنیاد رکھنے کے لیے ہر نقش کہن مٹا دیتا ہے ۔ یہ تینوں مسلم قوم کی منزل کے تین مرحلے ہیں ۔ جو لفظ یہ استعمال کرتے ہیں وہ چونکانے والے ہوتے ہیں گویا کہ یہ ان لوگوں کے کانوں میں چبھنا چلانا چاہتے ہیں جو سننے کو تیار نہیں ، جو اس عذاب سے بے خبر ہیں جس میں وہ مبتلا ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہیں کسی علاج کی ضرورت نہیں ، جنہیں کسی ایسے جراح کی ضرورت نہیں جس کی نوک نشتر خیال انہیں وقت کے تقاضوں سے آگاہ کر سکے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی وجہ سے لوگوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا جو نشاۃ ثانیہ کی طرف ایک قدم ہے ۔

اسلامی تاریخ میں حلاج انقلابی اور نظام نو کا علمبردار ہے ۔ اس کا

نعرہ " انا الحق " انسانی خودی کی ابدیت کا نعرہ ہے ۔ جیسا کہ اقبال کہتے ہیں یہ متکلمین کے لیے چیلنج تھا ۔ اقبال کی نظر میں حلاج حال کی اقدار کے خلاف چاہے اخلاقی ہوں یا مذہبی یا ادبی ، ایک باغی ہے ۔ حلاج کے باغی کردار کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب اقبال جرمن فلسفی نطشے اور کیمبرج میں اپنے استاد Mc Taggart کو نئے حلاج کا لقب دیتے ہیں کیونکہ دونوں اپنے اپنے زمانے کی اقدار کے باغی ہیں ۔ خاتون عجم قرۃالعین طاہرہ بھی پرانی اقدار کو ختم کر کے نئی اقدار کی بنیاد رکھنا چاہتی ہیں ۔ حلاج اور طاہرہ دونوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنے مقصد کی خاطر جان کی قربانی دے دی ۔

غالب اگرچہ حلاج اور طاہرہ کی طرح شہید تو نہیں ہوئے لیکن اقبال کی نظر میں وہ ادب کے میدان کے ویسے ہی باغی ہیں ۔ ان کے اشعار روح کے لیے سکون کا باعث ہیں :

این نواہا روح را بخشد ثبات

حلاج کے ہم آواز ہو کر غالب کہہ سکتے تھے :

ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلیٔ دگرے در خور تقاضا نیست

اور پھر نعرہ لگا سکتے تھے :

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

غالب اور حلاج جو فطرتاً باغی تھے اور عشق کی آگ میں جل رہے تھے اس جنت میں کہاں رہ سکتے تھے جسے ملا کھانے ، سونے اور موسیقی کی جگہ بتاتا ہے یا آپ کہہ سکتے ہیں جہاں شراب ، حوروں اور غلمان کا ہجوم ہے ۔ غالب جیسے عاشق ابدی آوارگی کو ترجیح دیں گے نا کہ ' دیدار ذات ' کا موقع نصیب ہو سکے :

جنت عاشق تماشائے وجود

یا غالب کے الفاظ میں :

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اپنی ایک فارسی مثنوی ' ابر گہر بار ' میں غالب نے ایک قصہ بیان کرتے ہوئے روایتی جنت کی تصویر کھینچی ہے جو انتہائی غیر دلچسپ جگہ ہےاور جس کی یکسانیت عشاق کبھی برداشت نہیں کر سکتے :

در ان پاک میخانۂ بے خروش — چہ گنجایش شورش نائی و نوش
سیہ مستی ابر و باراں کجا — خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
نظر بازی و ذوق دیدار کو — بفردوس روزن بدیوار کو

جہاں کوئی ان ہونی بات نہ ہو ، کوئی غیر متوقع واقعہ پیش نہ آئے ، کوئی یکسانیت کو ختم کرنے والا حادثہ نہ ہو تو غالب اور حلاج ایسی جگہ رہنا گوارا نہیں کریں گے اور اسی لیے انھوں نے ابدی آوارگی اختیار کی ہے :

بے خلشہا زیستن نازیستن — باید آتش در تہ پا زیستن

محی الدین ابن عربی نے کہا تھا کہ جنت کے پھلوں کو پکنے کے لیے جہنم کی انچ کی ضرورت ہے ، بالفاظ دیگر بہشت دوزخ کے بغیر نامکمل ہے ، دونوں کو ایک ساتھ رکھنا چاہیے۔ غالب کہتا ہے :

خلد میں کہیو تو دوزخ بھی ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس دل میں عشق کی آگ ہو وہ بہشت میں مطمئن نہیں رہ سکتا ۔ غالب کے الفاظ میں :

جنت نشود چارۂ افسردگی دل — تعمیر باندازۂ ویرانی ما نیست

بہشت میں دوزخ ، پانی میں آگ ، جیسا غالب اپنے بارے میں کہتا ہے ۔

از بروں سو آبم اما از دروں سو آتشم

وہ چیزیں ہیں جو '' جگر سوختہ '' سے پیدا ہوتی ہیں ، ان کا ذکر غالب نے اپنے اس مشہور شعر میں کیا ہے جس پر لمبی بحثیں چلی ہیں :

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

اقبال نے بھی غالب کے اسی خیال کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے - ایک نالہ جو دل شکستہ کے تاروں سے پیدا ہوتا ہے ، اس زندگی میں مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے - یہی نالہ ہے جس کے باعث قمری ایک ' کف خاکستر ' ہو کر رہ گئی اور بلبل جس کے باعث ' قفس رنگ ' ہوگئی - ہر حالت میں ' بالفعل ' کا پھیلاؤ ' بالقوہ ' کے مطابق ہوتا ہے - جیسی انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے ویسا ہی ظہور اس سے سرزد ہوتا ہے - قمری کی حالت میں موت اور خاکستری اور بلبل کی حالت میں رنگوں کا خوبصورت تنوع اور زندگی کا خوشگوار اظہار - اس تمام بحث کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے :

تو ندانی ایں مقام رنگ و بوست		قسمت ہر دل بقدر ہائے و ہوست

یہ غالب ہی کی باز گشت ہے :

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

ہر چیز کا انحصار ایک فرد کی کوشش اور جد و جہد پر ہے جو عشق و شوق کا بیرونی مظہر ہے !

شوق ہے ساماں طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

آخری نکتہ جو اقبال غالب کے بارے میں 'جاوید نامہ' میں بیان کرتے ہیں وہ اس مثنوی کے متعلق ہے جو غالب نے اپنے دوست جناب فضل حق خیرآبادی کے کہنے پر لکھی تھی - فضل حق خیرابادی حکمت و منطق میں بلند مقام پر فائز تھے لیکن مذہباً ان کا رجحان کچھ روش زمانہ کے خلاف تھا - انہوں نے شاہ اسماعیل شہید کی اصلاحی تحریک کی انتہائی مخالفت کی اور غالب سے کہا کہ وہ بھی انھی کے مسلک کے مطابق ایک مثنوی لکھ ڈالیں - غالب نے مثنوی لکھنی شروع کی تھی لیکن دلائل کے زور میں اور شاید خود غالب کے اپنے

عقیدے کے مطابق اس کا مفہوم شاہ اسماعیل شہید کے نظریے کے مطابق تھا :

صورت آرائش عالم نگر　　یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر

لیکن بعد میں انھوں نے یہ اضافہ کیا کہ خدا کئی عالم پیدا کرسکتا ہے اور ہر عالم میں ایک خاتم النبیین ہو سکتا ہے :

ہر کجا ہنگامہ عالم بود　　رحمۃ للعالمینے ہم بود

اقبال غالب سے اس شعر کی مزید توضیح کے لیے کہتے ہیں لیکن غالب سادہ الفاظ میں نازک خیالیاں بیان کرنے سے عذر کا اظہار کرتے ہیں ، اقبال کے اصرار پر غالب کہتے ہیں -

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست　　رحمۃ للعالمینی انتہاست

یہ اس قرآنی آیت کی طرف اشارہ کرتا ہے ، الذی خلق وسوی والذی قدر فہدی -

خدا کائنات کا خالق ہے اور ہر شے کی فطرت معین کرتا ہے اور ہر ایک کی ہدایت اندرونی طور پر ہوتی ہے - لیکن تمام تخلیقی عمل کا مقصد کیا ہے؟ یہ اس مرحلہ تکمیل تک پہنچنا ہے جو رحمۃ للعالمین کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے یعنی انسان کامل، جو تخلیق کائنات کا کمال ماحصل ہے -

غالب کے ایک سادہ سے شعر کے گرد اقبال نے فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کے تانے بانے بنے ہیں اور انسان کامل کا ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا ہے -

یہ نظریہ یہودی حکیم فیلو نے پیش کیا تھا جو یونانی فلسفہ سے متاثر تھا - لیکن یہ خدا جو پاک روح ہے اور کائنات جو مادی ہے ان کے درمیان کوئی رشتہ بلاواسطہ نہیں ہوسکتا ، انسان کامل دونوں کے مابین واسطہ ہے اور وہی ہے جو نور حقیقی کو کائنات تک پہنچاتا ہے - مسلمان مفکرین میں اس نظریے کو سب سے پہلے حلاج نے اپنایا پھر ابن عربی اور الجیلی نے اور اس وقت سے یہ مسلمان صوفیوں اور شاعروں کی میراث ہے - غالب اس کی طرف مثنوی کی ابتدا میں اشارہ کرتے ہیں :

جلوہ اول کہ حق بر خویش کرد
مشعل از نور محمد پیش کرد

شد عیاں زاں نور در بزم ظہور
ہر چہ پنہاں بود از نزدیک و دور
نور حق است احمد و لمعان نور
از نبی و اولیا دارد ظہور

یہی انسان کامل کا نظریہ جس کی طرف غالب اشارہ کرتے ہیں اقبال نے اسی کی تفصیل پیش کی ہے۔ لیکن اقبال اسے حلاج سے کہلواتے ہیں جس نے اس کی فلسفیانہ نہیں بلکہ صوفیانہ توضیح کی تھی - پھر حلاج اقبال کی طرح وحدت‌الوجود کے قائل نہیں تھے جب کہ غالب ابن عربی کی تقلید میں وحدت الوجود کے داعی تھے -

غالب کے اس شعر پر میں اس مختصر مضمون کو ختم کرتا ہوں -

در نہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ
تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

غالب کی انانیت

سلیم احمد

یہ تو سبھی کہتے ہیں کہ غالب کے مزاج میں انانیت تھی ، لیکن کسی شاعر کو اس کے مزاج کی بنا پر پسند یا ناپسند کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ اسے لمبا یا ٹھنگنا ہونے کی بنا پر مطعون کریں یا سراہیں ۔ شاعری میں اصل مسئلہ مزاج کا نہیں ہوتا کیونکہ مزاج تو حالات سے ، تربیت سے ، خاندانی وراثت سے جیسا بننا ہوتا ہے بن جاتا ہے اور بالعموم شاعر کے شاعر بننے سے پہلے بن جاتا ہے ، اور خود شاعر کو بھی اس پر قابو نہیں رہتا ۔ دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی شاعری میں اس سے کیا کام لیا ہے ۔ کیا وہ اس کی مدد سے انسانی فطرت کے کسی گوشے کو بے نقاب کرتا ہے ، کیا اس کے پردے میں وہ اپنے دور کے کسی رجحان کی عکاسی کرتا ہے ، کیا وہ اسے حقیقت کی تفتیش کا ذریعہ بناتا ہے ؟ شاعر نے اگر ان میں سے کوئی بات بھی کردی تو اپنا کام پورا کردیا ۔ اب اس کا مزاج انفرادی مسئلہ نہیں رہا بلکہ اپنے زمانے کے لیے ایک ایسی چیز بن گیا جیسے موسمی معلومات کے لیے حرارت ناپنے کا آلہ ۔ آپ آلے پر یہ اعتراض تو کرسکتے ہیں کہ اس نے درجۂ حرارت ٹھیک نہیں بتایا لیکن یہ اعتراض نہیں کرسکتے کہ وہ درجۂ حرارت بتاتا ہی کیوں ہے ۔ غالب کی انانیت کا مطالعہ بھی ہمیں اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں کرنا چاہیے ۔ یعنی انفرادی خصوصیت کے طور پر نہیں بلکہ تہذیبی درجۂ حرارت کے پیمانے کے طور پر ۔

جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے غالب کی انانیت کو بالعموم سراہا ہی گیا ہے ۔ کچھ تو اس بنا پر کہ لوگوں کو اس میں اپنی انانیت کی آسودگی کا سامان نظر آتا ہے اور کچھ اس بنا پر کہ غالب کی انانیت

میں بعض لوگوں کو روایتی تہذیبی اقدار سے بغاوت کا سراغ ملتا ہے اور یہ بات انہیں اپنے مخصوص مقاصد کے لیے کارآمد معلوم ہوتی ہے - صرف ایک آفتاب احمد صاحب ایسے ہیں جنھوں نے غالب کی انانیت پر یہ کہہ کر تنقید کی ہے کہ وہ انانیت کی بنا پر سپردگی سے محروم ہیں، اس لیے بڑی عشقیہ شاعری نہیں کرسکتے - ذاتی طور پر مجھے ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں ایک ناآسودگی سی محسوس ہوتی ہے - انانیت کو پسند کرنے والے تو مجھے یوں پسند نہیں ہیں کہ ایک تو یہ میری افتاد طبع کے خلاف ہے اور دوسرے میں اپنی تہذیب کی روایت سے بغاوت کو بجائے خود کوئی قابل قدر بات نہیں سمجھتا - رہ گئی آفتاب احمد صاحب کی تنقید تو مجھے اس میں وزن ، تہ داری ، بصیرت اور معقولیت سب کچھ نظر آتی ہے - لیکن میں ان سے اور اپنے آپ سے یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بلند عشقیہ تجربہ یا بلند عشقیہ شاعری سے محرومی صرف غالب کا المیہ ہے یا غالب کے پورے دور کا ؟ دوسرے لفظوں میں غالب کی انانیت ان کی صرف ذاتی خصوصیت ہے یا انہوں نے اس سے کوئی غیر ذاتی کام بھی لیا ہے ؟

یوں انانیت تو میر کے مزاج میں بھی تھی اور غالب سے کم نہیں تھی بلکہ شاید عام زندگی میں غالب سے زیادہ تھی - غالب کی انانیت تو لچک بھی جاتی ہے ، سودا اور سمجھوتہ بھی کرلیتی ہے ، لیکن میر کی زندگی اس قسم کی باتوں سے پاک ہے - پھر میر نے ایسی بلند عشقیہ شاعری کیسے کی ؟ میر جیسی عشقیہ سپردگی اردو شاعری میں اور کہاں ملے گی مگر میر کا مزاج صرف سپردگی کا نہیں ہے - میر کی سپردگی میں بلا کا کھنچاؤ ہے - میر نے ایسی بلند عشقیہ شاعری اس لیے نہیں کی کہ ان میں انانیت نہیں تھی- ایسی شاعری صرف اس لیے ہو سکی کہ انہوں نے اپنی انانیت کو اقدار کے تحفظ کا ذریعہ بنالیا تھا - غالب تو اپنے زمانے کی پستی کے سارے گلے شکووں کے باوجود زمانہ ساز بھی تھے - میر نے تو اپنے زمانے پر تھوک دیا - میر کی انانیت میں اتنی قوت تھی کہ وہ صرف اپنے بل پر اپنے زمانے کے خلاف کھڑے ہو سکتے تھے ، مخالف دھارے کے رخ پر تیر سکتے تھے - اور ان تمام ترغیبات اور تحریفات سے بلند ہوسکتے تھے جن کا سامنا کرنے میں غالب کی ہڈیاں بول گئیں - میر کی زندگی میں جو استغنا ، درویشی اور دست کشی پائی جاتی ہے کچھ لوگ اسے فراری ذہنیت کا نتیجہ کہتے ہیں لیکن دراصل اس کے پیچھے اتنی زبردست قوت ارادی ہے کہ اس زمانے کے کسی با عمل آدمی میں نہیں تھی -

میر تو زندہ ہی اپنی انانیت سے رہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی انانیت کا اظہار بڑے نرم اور مہذب لہجے میں کرتے ہیں ۔

تری چال ٹیڑھی ، تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

غالب اور میر میں انانیت کے ہونے یا نہ ہونے کا فرق نہیں ہے ۔ انانیت تو دونوں میں تھی اور دونوں اپنے زمانے اور اپنی ذات کے بعض گوشوں سے برسر پیکار تھے ۔ فرق یہ ہے کہ میر نے یہ لڑائی تہذیبی اقدار کی مدد سے لڑی ۔ اس لڑائی میں میر کی انفرادی قوت کے ساتھ ایک جمے جمائے معاشرے کی اعلیٰ ترین قدروں کی کمک شامل تھی ۔ میر نے اپنی تہذیبی قدروں کو مضبوطی سے پکڑا اور مر کھپ کر اتنا چمکایا کہ میر کا کلام ہند اسلامی تہذیب کی سب سے زندہ دستاویز بن گیا ۔ غالب کو یہ لڑائی تنہا لڑنا پڑی ۔ ذوق اور مومن ، غالب کے ہم عصر کہلاتے ہیں مگر ان کا شعور 'عصریت' سے خالی ہے ۔ یہ میں ان دونوں کی تنقیص نہیں کر رہا ۔ ذوق اور مومن دونوں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہند کی اسلامی تہذیب میں ابھی اتنی جان باقی تھی کہ وہ زندگی اور زمانے کی منفی رفتار کو سنبھال لے ۔ غالب اگر غالب نہ ہوتا تو اپنی تہذیب کی باطنی شکست و ریخت سے آنکھیں چرا کر ایسی مثبت شاعری کر سکتا تھا جو قدیم روایت سے ہم آہنگ ہوتی ۔ لیکن غالب نے تہذیبی انتشار کی اس آندھی میں اپنا چراغ کھلی ہواؤں کی زد پر رکھ دیا ۔

غالب کی شاعری میں منفی اثرات کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے زمانے کا سب سے سچا گواہ تھا ۔ یہ جو وہ عشق اور عشق کی قدروں کا مذاق اڑاتا ہے ، یہ جو وہ حسن پر نکتہ چینی کرتا ہے اور حریم ناز میں بھی خود نمائی سے باز نہیں رہتا ، یہ جو وہ نہ صرف محبوب کو بلکہ اپنے آپ کو بھی خدا کو سونپنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ، یہ سب باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ غالب نے اپنے زمانے کی حقیقی روح کو سمیٹ لیا تھا ۔ تہذیب جب باطنی طور پر نشو و نما کرتی ہے تو اس میں ہمیشہ وہ لوگ پیدا ہوتے ہیں جو نیچے سے اوپر اٹھتے ہیں ، لیکن تہذیبی انحطاط کے زمانے میں اوپر سے نیچے آنے کا عمل ہوتا ہے ۔ جس طرح چھلانگ لگانے والا آدمی ہمیشہ اوپر نہیں جا سکتا ، اسے دوسری چھلانگ لگانے کے لیے زمین پر اپنے

پاؤں ٹکانے پڑتے ہیں ، اسی طرح تہذیب بھی اپنے دور انحطاط میں نیچے اترتی ہے ۔ اس زمانے میں قدروں پر باطنی یقین ختم ہو جاتا ہے ۔ روایات فرسودہ اور باسی نظر آنے لگتی ہیں ۔ معاشرے کے اخلاق ، عقائد اور ادارے نیم جان ہو جاتے ہیں ۔ اور انھیں از سر نو تازگی ، جان اور قوت دینے کے لیے منفی عمل سے گزارنا پڑتا ہے ۔ ایسے زمانے میں انحطاط کا کھلی آنکھ سے مطالعہ کرنا اور انحطاط کو طے کرانا ہی سب سے بڑا تحلیقی عمل ہوتا ہے ۔ غالب نے نفی کے عمل کو اختیار کیا اور اس طرح ایک نئے اثبات کی طرف نیا قدم اٹھانے کا امکان پیدا کیا ۔ نفی کے اس عمل میں غالب کے پاس اثبات کے لیے کچھ تھا تو صرف ایک چیز — اس کی اپنی انانیت ۔ تہذیبی خلا کے دور میں جب ہمارے پاس کچھ باقی نہ رہے اس وقت فنکار کے پاس ایک چیز باقی رہتی ہے ، اس کی اپنی ذات جہاں وہ نئی قدروں کی تحلیق کر سکتا ہے ۔ ان معنوں میں غالب کی انانیت اس کے لیے تحلیق اقدار کا ایک ذریعہ تھی ۔ وہ ایک طرف انحطاط کے عمل کو اپنے اندر محسوس کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف اس سے اوپر اٹھنا چاہتا تھا ۔ نفی و اثبات کے اس دھرے عمل میں غالب کی حقیقی عظمت کا راز چھپا ہوا ہے ۔

غالب کی انانیت کیا ہے ۔ پشنگی و افراسیابی ہونا نہیں ، یہ اس کی انانیت کی پست ترین سطح ہے ۔ یہ انانیت کمال فن کا احساس بھی نہیں ہے ۔ ایسے دعوے تو شعرا بہت کیا کرتے ہیں ۔ یہ حسن و عشق کے معاملات میں اکڑ تکڑ بھی نہیں ہے ، ان معنوں میں کہ یہ اس کی بلند ترین سطح نہیں ہے ۔ غالب کی انانیت اپنی بلند ترین سطح کو اس وقت چھوتی ہے جب وہ پوری کائنات کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے :

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اور صاف اعلان کرتا ہے کہ :

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

آپ نے دیکھا غالب نے اپنی انانیت کو کیا بنایا ۔ اب یہ صرف غالب کے مزاج کی انانیت نہیں ہے ، اب یہ حقیقت کی تفتیش کا ایک ذریعہ ہے ۔

حقیقت کی تفتیش اور تخلیق اقدار — یہ دو ذمہ داریاں ہیں جو غالب نے تنہا اپنے بل پر قبول کی ہیں۔ وہ بنے بنائے جوابوں سے مطمئن نہیں ہو سکتا ۔ روایتی رد عمل کا اظہار نہیں کر سکتا ۔ اسے تو جو کچھ دریافت کرنا ہے اپنے تجربے سے دریافت کرنا ہے ، جو کچھ پانا یا کھونا ہے اپنے عمل سے پانا کھونا ہے۔ یوں غالب اپنی انا یا ذات کو کائنات کی تمام قوتوں کے مقابل رکھتا ہے۔ خدا ، انسان، کائنات سب سے غالب کا تعلق حریفانہ ہے۔ وہ چیز جسے ہم غالب کی دیدہ وری کہتے ہیں ، غالب کے اسی حریفانہ تعلق سے پیدا ہوتی ہے۔ اب غالب ایک فرد نہیں ہے ایک تہذیب کی ذمہ داری ہے۔ غالب کے کلام میں ہمیں جس دماغی قوت کا احساس ہوتا ہے ، وہ جس طرح اپنے تجربات کا تجزیہ کرتا ہے ، انہیں ایک دوسرے کے تقابل میں رکھ کر دیکھتا ہے ، اور پھر سب کو ملا کر ایک نقش بنانا چاہتا ہے ، یہ سارے عناصر غالب کے کلام میں اسی ذمہ داری سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک بہت چوکس مد مقابل کی طرح وہ اپنی ساری قوتوں اور کمزوریوں پر نظر رکھتا ہے ، اسے حملہ کرنے ، پیچھے ہٹنے اور حصار بندی کے سارے گر معلوم ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ شکست اس کا مقدر ہے ، خدا سے لڑا نہیں جا سکتا اور مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ۔ یہاں سے اس غالب کی طرف ایک راستہ جاتا ہے جو وحدت الوجود کا قائل ہوا اور عزیزو اب اللہ ہی اللہ کہتا ہوا مرا ۔ آپ چاہیں تو اسے غالب کی شکست کہہ سکتے ہیں ، لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی شکست کا مطالعہ بھی کر سکتا ہے۔

میں نے کہا ہے کہ غالب کی انانیت کا ایک پہلو تخلیق اقدار سے متعلق ہے ۔ انا جب دوسری اناؤں سے تعلق پیدا کرتی ہے تو اس سے اقدار پیدا ہوتی ہیں ۔ یعنی اس کا تعلق انسانوں کے باہمی رشتے سے ہوتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ غالب دوسرے انسانوں کے بارے میں خوشگوار محسوسات نہیں رکھتے ۔ انہیں اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں اور خود ایک ایسی خیالی دنیا کا باشندہ ہونے پر فخر کرتے ہیں جس میں کسی اور انسان کا کوئی حصہ نہیں ۔ اس بات میں تعریف و تنقیص کے جو پہلو بھی نکلتے ہوں لیکن یہ ایک نامکمل بات ہے ۔ دوسرے انسانوں پر غالب کی تنقید انسان کے نامکمل ہونے کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور یہ احساس دوسروں ہی تک ختم نہیں ہو

جاتا ہے ۔ غالب انسان کے نامکمل ہونے کا تجربہ اپنی ذات میں بھی ک
ہیں ، اور یوں ہر پیکر تصویر انھیں نقش فریادی نظر آتا ہے ۔ اس بلند ،
پر دوسرے انسانوں کی تنقید غالب کے کلام میں خود اپنی تنقید بھی بن ۔
ہے ۔ یہ شکست انا کا مقام ہے ۔ اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو کہہ کر غ
نے اپنی انانیت کو جو ایک گنبد بے در بنایا تھا ، اس میں ایک شگاف
ہوتا ہے ، اب غالب کی انانیت اپنی حریف بن کر خود اپنے آپ پر نکتہ ۔
کرنے لگتی ہے ۔ اور غالب میں وہ معروضیت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ خا
دنیا یا دوسرے انسانوں کے تجربے سے عبرت بھی حاصل کرتے ہیں اور آ
بھی ۔ غالب کی یہی معروضیت ہے جو ان کی اقدار کو یکسر منفی ہونے
بچا لیتی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ وہ میر کی طرح نہ دوسرے انسانوں سے مـ
ہم آہنگی پیدا کر سکے نہ اپنے اندر کے عام آدمی سے ۔ یہ ان کے لیے مـ
بھی نہیں تھا ۔ جو کام پوری تہذیب کا ہوتا ہے اس کی توقع آپ ایک
سے نہیں کر سکتے ۔ لیکن ہمارے لیے یہ بات اہم ہے کہ غالب ہم آہ
کے نہ ہونے ہوئے ہم آہنگی کے فریب میں نہیں رہے ۔ پروفیسر کرار حـ
نے لکھا ہے کہ غالب سے پہلے انا اور غیر انا یعنی کائنات میں جو ہم آہ
تھی وہ غالب میں ٹوٹ گئی ۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ ہم آہنگی ٹو
کے اس عمل کا سب بڑا مبصر ہے ۔ وہ اس کا ادراک رکھتا ہے ۔ اس کے
کو برداشت کرتا ہے ، اور اس صورت حال میں اپنی ذمہ داری کو جانتا ہے
یہ ذمہ داری کیا ہے ، تہذیبی درجۂ حرارت کا صحیح اندراج ۔ غالب
ہمیں صحیح صورت حال دکھا دی ہے ۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ
ایسی نظر کی تلاش کرتا ہے جو زندگی کے پست و بلند ، خیر و شر ، نفی و اثبات
ایک بلند سطح سے دیکھ سکے اور تضادات کی اس بازی گاہ میں ہر پہلو
ہر رنگ سے زندگی کا اثبات کر سکے ۔ غالب اس تلاش میں کہاں
کامیاب ہوا یہ تو سخن فہم جانیں یا غالب کے طرف دار ۔ لیکن غالب میر
طرح یہ کہہ سکے یا نہ کہہ سکے کہ :

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

یہ ضرور کہا ہے :

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی   تماشائے نیرنگ صورت سلامت

غالب کے دو قلمی دیوان
اور
میر ولی بخش خاں رنجور

ڈاکٹر سید حامد حسین

تحقیق میں قیاس کو درجۂ استناد حاصل نہیں ہو سکتا، خاص طور پر ادبی تحقیق میں جہاں مصدقہ حقائق کی روشنی میں پیش کیے گئے براہین کے لیے یہ ہمیشہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سائنسی حقائق کے ذریعے مرتب نتائج کی طرح، امر واقعہ سے مطابقت رکھیں۔ اس کے باوجود ادبی میدان میں تحقیق و تفتیش کے دوران بعض خلا ایسے رہ جاتے ہیں جنھیں پر کرنے کے لیے محققین کو قیاس کی مدد لینا پڑتی ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ دوسرے محققین جب ان مسائل سے دو چار ہوں تو وہ اتنی احتیاط برتیں کہ اپنے پیش رو محققین کے قیاس کو قیاس کا ہی درجہ دیں اور ان کو مصدقہ حقائق کی حیثیت دے کر ان پر نئے قیاسات کی بنیاد نہ ڈالیں۔

غالب کی زندگی کے بھی ابھی تک کئی ایسے پہلو باقی ہیں جن کے بارے میں صحیح صحیح اور پوری معلومات فراہم نہیں ہو پائی ہیں اور معتبر شواہد کی عدم موجودگی میں میسر حقائق کی بنیاد پر قیاس آرائیوں کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی صورت حال دیوان غالب کے ان دو قدیم ترین نسخوں کے ساتھ پیش آئی ہے جن میں سے ایک بھوپال میں میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں تھا اور دوسرا پروفیسر محمود شیرانی کے ذخیرۂ کتب میں شامل تھا اور جو بالترتیب ''نسخۂ بھوپال'' اور ''نسخۂ شیرانی'' کے نام سے موسوم ہیں۔ ان دونوں قلمی نسخوں کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ان میں غالب کا ایسا کلام بھی موجود ہے جسے

غالب نے طباعت کے لیے اپنا دیوان منتخب کرتے وقت حذف کر دیا تھا۔ ' نسخۂ بھوپال ' پر کاتب نے جو تاریخ اختتام کتابت درج کی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کا متن ۱۸۲۱ء میں تحریر ہوا تھا۔ ' نسخۂ شیرانی ' پر کوئی ایسی شہادت موجود نہیں ہے ، لیکن عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کی کتابت ۱۸۲۶ء کے قریب ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ان دونوں نسخوں میں غالب کا ۲۰ سے ۳۰ سال کی عمر تک کا کلام موجود ہے اور اس لیے کلام غالب کی تاریخی ترتیب میں ان نسخوں سے بہت مدد ملتی ہے۔

ان نسخوں کے بارے میں جہاں دوسرے مباحث محققین کی دلچسپی کا موضوع بنے ہیں وہیں اس مسئلے پر بھی غور کیا گیا ہے کہ یہ دیوان کس کے لیے لکھے گئے ہیں اور بعد میں یہ کس کس کے پاس رہے ہیں۔ خود ان نسخوں سے کوئی ایسی شہادت فراہم نہیں ہوتی جو اس سلسلے میں کسی یقینی نتیجے پر پہنچا ئے۔ نہ ہی غالب کی دوسری تحریرات یا کسی معاصرانہ تحریر سے کوئی خاص مدد ملتی ہے۔ لہٰذا ضمنی حوالوں کی مدد سے بعض امکانات کے بارے میں قیاس کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے معتبر شہادتوں کی غیر موجودگی میں کوئی ایک قیاس مختتم حیثیت اختیار نہیں کر پاتا اور ہمیشہ متبادل قیاسات کی گنجائش رہتی ہے۔

' نسخۂ بھوپال ' کے بارے میں ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ میاں فوجدار محمد خاں نے خود اپنا کاتب بھیج کر کلام غالب کے اس نسخے کو تیار کروا کے منگوایا تھا(۱)۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس نسخے کو غالب نے خود فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا (۲) اور ایسے فوجدار محمد خاں

۱- '' غالب کے پانچ شاگرد '' از سید محمد یوسف قیصر ، مطبوعہ روزنامہ ندیم بھوپال ، ۵ فروری ۱۹۰۶ء ، منقولہ در '' نسخۂ حمیدیہ اور میاں فوجدار محمد خاں '' از نادم سیتا پوری مطبوعہ فروغ اردو ' غالب نمبر ' ص ۵۰ ۔

۲- '' چند ہم عصر '' از مولوی عبد الحق (اضافہ شدہ ایڈیشن) ص ۳۷۸ ۔

کے لیے ہی تیار کرایا گیا تھا(۱)۔ لیکن جناب امتیاز علی عرشی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس نسخے کو غالب نے خود اپنے لیے ہی لکھوایا تھا۔ یہ قلمی نسخہ اب گم ہو چکا ہے۔ لیکن عرشی صاحب(۲) اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف (۳) جنہوں نے اس نسخے کو تفصیل سے دیکھا ہے بتاتے ہیں کہ اس میں قصیدوں اور غزلوں کے لیے علاحدہ علاحدہ دو لوحیں تھیں جو سنہری کام سے مزین تھیں، جدولیں رنگین اور طلائی اور باریک لاجوردی تھا، تحریر صاف اور خوشخط تھی۔ جس اہتمام سے یہ نسخہ تحریر کیا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض شاعر کا اپنا نسخہ نہ تھا بلکہ اسے خصوصیت کے ساتھ کسی اہم شخص کے لیے نقل کروایا گیا تھا۔ جہاں تک فوجدار محمد خاں کے اپنے کاتب بھیجنے کا سوال ہے تو ۱۸۲۱ء میں جب یہ نسخہ تحریر کیا گیا تھا، فوجدار محمد خاں کی عمر صرف دس سال کی تھی اور اس لیے اس قسم کا کوئی اہتمام کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے۔ جہاں تک بعد میں کسی وقت اس نسخے کو فوجدار محمد خاں کی نذر کیے جانے کی بات ہے تو اس کے بھی کوئی شواہد موجود نہیں ہیں۔ فوجدار محمد خاں، والیۂ بھوپال نواب قدسیہ بیگم کے بھائی تھے۔ بعد میں ان کی بھانجی سکندر بیگم رئیسہ بھوپال رہیں۔ خود فوجدار محمد خاں نے کچھ عرصے کے لیے نائب الریاست اور سکندر بیگم کے بیوہ ہونے کے بعد شش سالہ رئیسہ بھوپال شاہجہاں بیگم کے ریجنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ اس لحاظ سے فوجدار محمد خاں ایک اہم اور با اثر شخصیت کے مالک تھے اور اگر غالب سے ان کے براہ راست روابط ہوتے تو اس کے ضرور کوئی شواہد ملتے۔ لیکن فوجدار محمد خاں کے ان خطوط میں بھی جن کی نقول پر مشتمل نو جلدیں بھوپال کی مولانا آزاد سنٹرل

۱۔ نسخۂ حمیدیہ : تمہید ص ہ

۲۔ دیوان غالب (نسخۂ عرشی) : دیباچہ ص ۵۷

۳۔ مقالہ 'دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷ھ' مترجمہ سید محمد، مجلۂ مکتبہ (حیدرآباد) جلد ۲، شمارہ ۶، ص ۵۵، منقولہ بعنوان "نسخۂ بھوپال اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف" ہماری زبان، یکم مئی ۱۹۶۹ء، ص ۷ تا ۹۔

لائبریری میں محفوظ ہیں ، غالب کا کوئی براہ راست یا بالواسطہ حوالہ نہیں ملتا ۔ چنانچہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ یہ نسخہ بالخصوص فوجدار محمد خاں کے لیے لکھا گیا ہو یا براہ راست ان کو پیش کیا گیا ہو۔ مزید براں اس قلمی نسخے کے متن میں جابجا اصلاحات کے علاوہ حاشیے اور آخر میں موجود سادہ اوراق پر بھی اضافے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ متن کی کتابت کے بعد بھی کسی نہ کسی حیثیت سے اس نسخے کا غالب سے تعلق باقی رہا ہے۔ مفتی محمد انوار الحق مرتب نسخہ' حمیدیہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ نسخہ بار بار بھوپال سے غالب کے پاس جاتا رہا ہے اور غالب نے خود اس میں اصلاحات اور اضافے کیے ہیں (۱)۔ لیکن دہلی اور بھوپال کے درمیان فاصلے اور اس زمانے میں رسل و رسائل کی دشواریوں کے مد نظر یہ امکان اتنا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ایسی صورت میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اولاً کسی ایسے شخص کے پاس رہا ہے جو یا تو غالب سے بہت قریب ہے اور وقتاً فوقتاً غالب سے ان کا نیا کلام حاصل کر کے اپنے نسخے میں بڑھاتا رہا ہے ، یا اس کے غالب سے اتنے قریبی تعلقات ہیں کہ خود غالب اس کو اپنے اشعار روانہ کرتے رہے ہیں ۔

۱۸۲۱ء کے قریب غالب کے ایسے احباب میں جو ان کے کلام کو جمع کرنے میں دلچسپی رکھتے ہوں اور ہر نئے اضافے سے پوری طرح باخبر رہنا چاہتے ہوں ، سب سے نمایاں نام مرزا علی بخش خاں رنجور کا ہے۔ رنجور میرزا الٰہی بخش معروف کے صاحبزادے اور غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کے حقیقی بھائی تھے ۔ عمر میں غالب سے چار سال چھوٹے تھے ۔ نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھرکہ و لوہارو ان کے چچا تھے اور ان کے ہی ساتھ رنجور کا قیام فیروز پور میں تھا مگر وقتاً فوقتاً دہلی آتے رہتے تھے (۲) ۔ ۱۸۲۵ء میں جب بھرت پور پر انگریزوں نے چڑھائی کی تو نواب احمد بخش کے ساتھ رنجور اور غالب بھی تھے ۔ اسی مہم کے دوران رنجور نے غالب سے یہ آرزو ظاہر کی تھی کہ وہ فارسی خط و کتابت میں استعمال کیے جانے والے القاب و

۱۔ نسخہ حمیدیہ ' تمہید ص ٦ ۔

۲۔ کلیات نثر غالب ' ص ۲ ۔

آداب اور خط ملنے کے شکریے اور نہ ملنے کی شکایت وغیرہ کے لیے موزوں فقرے ایک مختصر رسالے کی شکل میں یکجا کردیں - باوجودیکہ غالب نے اس روش سے اپنی بیگانگی ظاہر کی ، پھر بھی انھوں نے اس فرمائش کو پورا کیا (۱) - یہ رسالہ اب " پنج آہنگ " میں آہنگ اول کی صورت میں شامل ہے -

۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش نے انتقال کیا اور ان کے ساتھ ھی رنجور کے سارے عیش ختم ہوگئے (۲) - غالب اس وقت کلکتے کے سفر پر روانہ ہو چکے تھے ، جب ان کو اس سانحے کی خبر ملی تو وہ رنجور کے بارے میں کافی متفکر ہوئے (۳) - نواب احمد بخش نے اپنی زندگی میں ھی اپنی ریاست کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست ان کے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کے حصے میں آئی تھی - شمس الدین احمد خاں کی والدہ مدی عرف بہو خانم میواتی تھیں ، جب کہ احمد بخش کے دوسرے دو بیٹے امین الدین احمد خاں اور ضیاالدین احمد خاں نیر ، بیگم جان کے بطن سے تھے جو کہ ان کی ہم قوم تھیں - اس وجہ سے اہل خاندان شمس الدین احمد خاں کونسلاً اپنا ہم رتبہ خیال نہیں کرتے تھے اور یہی جذبہ اس تنازعے کی بنیاد بنا جس میں خاندان کے باقی افراد نے شمس الدین احمد خاں کے خلاف ایک مضبوط محاذ بنا لیا - لیکن نواب احمد بخش نے شمس الدین احمد خاں کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنی وفات سے ایک سال قبل اپنی جائداد کو اپنے بیٹوں میں اس طرح تقسیم کردیا کہ فیروز پور کی جاگیر شمس الدین احمد خاں کے پاس رہی اور امین الدین احمد خاں اور ضیا الدین احمد خاں کو لوھارو ملا - چنانچہ نواب احمد بخش کے انتقال کے بعد جن اعزہ کی پنشن فیروز پور کی جاگیر سے متعلق تھی ، اس کی ادائی میں دشواری پیدا ہوئی - ان میں رنجور اور غالب بھی تھے جنھوں نے اس خاندانی تنازعے میں شمس الدین احمد خاں کے خلاف امین الدین احمد خاں اور ضیا الدین احمد خاں کا ساتھ دیا تھا - چنانچہ نواب احمد بخش کے انتقال کے بعد حالات کو غیر اطمینان بخش پاکر رنجور

۱- کلیات نثر غالب ، ص ۵ -

۲- کلیات نثر غالب ، ص ۲ -

۳- ملاحظہ ہو مکتوب بنام رنجور ، کلیات نثر غالب ، ص ۹۹ -

نے بھی فیروز پور چھوڑا - کچھ عرصے کے لیے لکھنؤ میں رہے ، اس کے بعد جے پور چلے گئے - ۱۸۳۵ء میں جب شمس الدین احمد خاں ، ولیم فریزر کے قتل میں ماخوذ ہوئے اور انہیں پھانسی دے دی گئی تو رنجور دھلی لوٹ آئے (۱) -

رنجور کو فیروز پور جھرکہ سے سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا جو نواب احمد بخش کے انتقال کے بعد غالباً بند ہو گیا - ۱۸۳۵ء میں ولیم فریزر کے قتل کے بعد فیروز پور کی ریاست ضبط ہوگئی اور سرکار انگریزی کی طرف سے رنجور کا پچاس روپیہ ماہانہ مقرر ہوا جو انہیں آخر دم تک ملتا رہا ، (۲) البتہ غدر کے ہنگامے کی وجہ سے بائیس مہینے ادائی رکی رہی - لیکن فروری ۱۸۵۹ء میں گیارہ سو روپے میں سے چھ سو مل گئے - ممکن ہے کہ بقایا بھی مل گئے ہوں (۳) -

دھلی لوٹنے پر رنجور نے غالب کے پاس قیام کیا (۴) - رنجور کے بیان کے مطابق غالب اس وقت '' میخانہ' آرزو انجام '' کے نام سے اپنا ایک دیوان مکمل کر چکے تھے جس میں نثری تحریرات بھی درج تھیں - رنجور نے یہ خواہش ظاہر کی دیوان میں شامل نثر کے ساتھ دوسری متفرقہ عبارات جو اس سے ربط رکھتی ہیں اور القاب و آداب پر مشتمل وہ رسالہ جو رنجور کے پاس پہلے سے موجود تھا ، یکجا کر کے ایک علاحدہ مجموعہ' نثر تیار کیا جائے - اس سلسلے میں رنجور کو حکیم رضی الدین حسن خاں کی تحریک اور میر محمد حسین خاں کی تائید بھی حاصل رہی - علاوہ ازیں رنجور کو خیال رہا کہ ان کے صاحبزادے غلام فخر الدین خاں بھی اس مجموعہ' انشا سے استفادہ کر سکیں گے (۵) - اس طرح '' پنج آہنگ '' مرتب ہوئی جس کی تمہید خود رنجور نے لکھی -

---

۱- کلیات نثر غالب' ص ۳ -

۲- ' غالب ' از غلام رسول مہر ، ص ۳۹ -

۳- ' نادرات غالب ' از آفاق حسین آفاق ، ص ۱۰۴ -

۴- کلیات نثر غالب' ص ۳ و ۱۰۹ -

۵- ' کلیات نثر غالب' ص ۳ و ۴ -

رنجور غالب سے قرابتوں کے کئی سلسلوں میں منسلک تھے ۔ وہ نہ صرف غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کے حقیقی بھائی تھے بلکہ رنجور کی اہلیہ امانی خانم بھی غالب کی بھانجی تھیں ۔ غالب کی صرف ایک بہن چھوٹی خانم تھیں جو مرزا اکبر بیگ بدخشی سے منسوب تھیں ۔ ان کے علاوہ غالب کے ایک بھائی مرزا یوسف خاں تھے جو عین عالم شباب میں پاگل ہو گئے تھے ، وہ دوران غدر ہلاک ہوئے ۔ مرزا یوسف خاں کی اکلوتی صاحبزادی عزیزالنسا بیگم تھیں جن کی غالب نے رنجور کے صاحبزادے غلام فخر الدین خاں سے شادی کی تھی ۔ آیندہ صفحے پر درج شجرہ ان قرابتوں کو بخوبی ظاہر کرتا ہے ۔

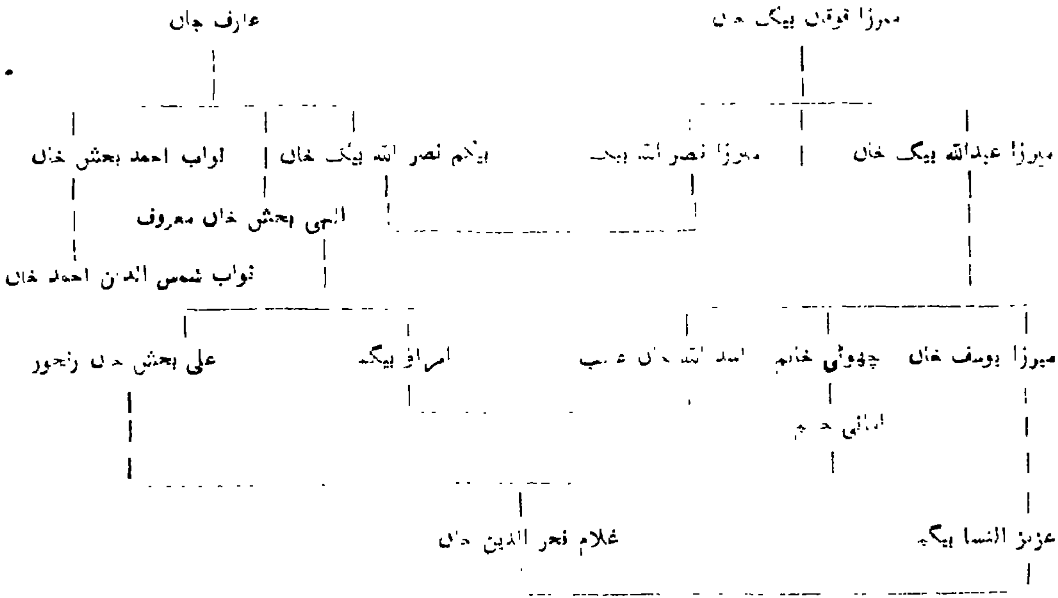
رنجور نے باقی عمر دھلی میں ہی گزاری ۔ یکم جنوری ۱۸۶۳ء کو ۶۶ سال کی عمر میں انتقال کیا اور نظام الدین میں دفن ہوئے ۔ (۱)

غالب کو رنجور سے جو خصوصیت رہی وہ ان قرابتوں کے علاوہ ان خطوط سے بھی اچھی طرح واضح ہے جو غالب نے رنجور کو لکھے ہیں (۲) ۔ پنشن کے قضیے میں بھی رنجور ، غالب کے خاص ہمراز و معاون تھے اور قیام کلکتہ کے دوران بھی غالب ، رنجور کو حالات سے آگاہ کرتے رہے ۔ ان خطوط میں جہاں غالب نے رنجور کو اپنی سرگردانیوں کا حال سنایا ہے وہیں احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد پیدا ہونے والی پریشانیوں کے لیے اپنی فکر اور تشویش کا اظہار بھی کیا ہے ۔ اس کے نتیجے میں رنجور کو غالب سے جو گہرا تعلق تھا ، اس کا اندازہ '' پنج آہنگ '' کے اقتباس سے ہوتا ہے (۳) ۔ غالب کی تحریرات سے ان کی دلچسپی معرکۂ بھرت پور کے دوران رسالۂ انشا کی فرمائش اور دھلی واپس آنے پر '' پنج آہنگ '' کی ترتیب ، کے واقعات سے بخوبی ظاہر ہے ۔ رسالۂ انشا کے بارے میں رنجور تحریر کرتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام علاء الدین خاں علائی ، مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۳ء اور ۱۰ جولائی ۱۸۶۳ء ۔ '' خطوط غالب '' مرتبہ غلام رسول مہر ، ص ۹۰ و ۹۳ ۔

۲۔ کلیات نثر غالب ، ص ۹۸ تا ۱۰۰ ۔

۳۔ کلیات نثر غالب ، ص ۲ تا ۳ ۔


میرزا قوقان بیگ خاں
عارف جان
میرزا عبداللہ بیگ خاں
میرزا نصر اللہ بیگ
نصر اللہ بیگ خاں
نواب احمد بخش خاں
الٰہی بخش خاں معروف
نواب شمس الدین احمد خاں
میرزا یوسف خاں
چھوٹی خانم
اسد اللہ خاں غالب
امراؤ بیگم
علی بخش خاں رنجور
عزیز النسا بیگم
غلام فخر الدین خاں

"حسب الالتماس من ورقے چند از آداب و القاب و شکر رسید خطوط و شکوہ عدم رسی مکاتبات رقم فرمود و بمن عطا نمود ۔ آن اوراق را چون تعویذ بیازو بستم و آن نگاشتہ ھا را در فن تحریر دستور العمل خود ساختم"۔ (۱)

اس کا اندازہ ہوتا ھے کہ ابتدا میں غالب نے اپنی ساری نثری نگارشات کو محفوظ رکھنے میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا ۔ "میخانۂ آرزو انجام" کا نثری حصہ بھی غالباً صرف ان تقاریظ اور مقدمات وغیرہ پر مشتمل تھا جو "پنج آہنگ" کے آھنگ چہارم میں شامل ھیں ۔ باقی چار حصے یعنی آھنگ اول جس میں القاب و آداب وغیرہ پر مشتمل رسالۂ انشا شامل ھے ، آھنگ دوم جس میں مصادر و مصطلحات فارسی درج ھیں ، آھنگ سوم جس میں خطوط میں کام آنے والے غالب کے فارسی اشعار کا انتخاب ھے اور آھنگ پنجم جس میں غالب کے فارسی خطوط یکجا کیے گئے ھیں ، معلوم ھوتا ھے رنجور نے اپنی کوششوں سے جمع کیے ھیں ۔

غالب کی نثر نگاری سے اتنی دلچسپی کے پیش نظر یہ امر بعید از قیاس نہیں ھے کہ رنجور نے غالب کی شعری تخلیقات کو بھی اپنے پاس رکھنے کی کوشش کی ھوگی ۔ اسی مفروضے پر اس نظریے کی بنیاد رکھی جاسکتی ھے کہ "نسخۂ بھوپال" میں جس وقت اصلاحات اور اضافے ھوئے ھیں ۔ اس وقت وہ رنجور کے پاس تھا ۔ اور اسی کی مدد سے رنجور نے "نسخۂ شیرانی" کی شکل میں ایک صاف اور زیادہ مکمل نسخہ تیار کروایا تھا ۔

"نسخۂ بھوپال" پر کاتب نے تاریخ اختتام کتابت ۵ صفر ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء درج کی ھے ۔ ۱۸۲۱ء تک غالب کی مالی حالت جو دھلی آنے کے بعد رفتہ رفتہ بگڑتی جارھی تھی ، خاصی بگڑ چکی تھی اور وہ قرض کے بوجھ میں کافی دب چکے تھے ۔ ان کے چچا سسر نواب احمد بخش خان فیروز پور جھرکہ و لوھارو سے انھیں جو ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ (یعنی سوا باسٹھ روپیہ ماھانہ) پنشن ملتی تھی ، (۲) وہ پہلے ھی ناکافی تھی کہ اسی دوران میں نواب اور ان کے بیٹوں کے درمیان کشمکش کے آثار پیدا ھوئے اور اس کے نتیجے میں ۱۸۲۲ء

۱۔ کلیات نثر غالب ، ص ۳ ۔

۲۔ 'غالب' از غلام رسول مہر ، ص ۱۳ ۔

میں نواب احمد بخش نے سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور کی اجازت سے اپنے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کو تمام جائداد کا وارث قرار دے دیا ۔ (۱) غالب کی پنشن فیروز پور کی جاگیر سے متعلق تھی اور چوں کہ نواب احمد بخش کے بیٹوں کے تنازع میں غالب کا رویہ شمس الدین احمد خاں کے خلاف اور امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کی حمایت میں تھا ، اس لیے غالب کو پنشن کی اس محدود رقم کی ادائی میں بھی اندیشے پیدا ہوتے نظر آتے ہوں گے ۔ اس لیے بدلتے ہوئے حالات کا رخ دیکھ کر ، غالب نے ہو سکتا ہے کسی اور ذریعے سے مالی امداد حاصل کرنے کی مساعی شروع کی ہوں اور کسی خاص توقع کے پیش نظر اپنا دیوان صاف نقل کرایا ہو ۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ قلمی دیوان نواب احمد بخش خاں کو ہی پیش کیا ہو ، اور چوں کہ احمد بخش خاں کی رنجور پر خاص نظر عنایت تھی اور رنجور کو غالب کی تحریرات سے خاص دلچسپی ، اس لیے ممکن ہے کہ یہ نسخہ احمد بخش خاں سے رنجور نے لے لیا ہو ، کیونکہ رنجور فیروز پور سے دھلی آتے جاتے رہتے تھے ۔ (۲) اس لیے اس کا امکان ہے کہ بعض مواقع پر رنجور نے غالب کی اپنی بیاض کی مدد سے اپنے اس نسخے کو مکمل بنائے رکھنے کی کوشش کی ہو ۔

" نسخۂ بھوپال " میں کیے گئے اضافوں اور اصلاحات کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بتایا ہے کہ " حاشیے کی بعض تحریریں خوشنما نستعلیق خط میں ہیں اور بعض شکستہ خط میں " (۳) ۔ جناب امتیاز علی عرشی نے لکھا ہے کہ بعض غزلوں پر "مقابلہ کردہ شد " تحریر ہے اور نسخے کے آخر میں شامل سادہ اوراق پر اضافہ کی ہوئی غزلوں کے اختتام پر درج ہے " تمام شد ، کار من نظام شد ، رب یسروتمم بالخیر " (۴) ۔ یہ خاتمہ

۱۔ ' حیات غالب ' از شیخ محمد اکرام (دھلی ایڈیشن) ص ۶۷

۲۔ کلیات نثر غالب ' ص ۲ ۔ غالب نے خود ' خاتمہ ' کل رعنا میں فیروز پور کا فاصلہ چالیس کوس بتایا ہے ۔ (کلیات نثر غالب ، ص ۶۳

۳۔ ' دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷ھ ' مترجمہ پروفیسر سید محمد ، مجلہ مکتبہ ، حیدر آباد ، جلد ۲ شمارہ ۶ ص ۵۶ ۔

۴۔ نسخۂ عرشی ' دیباچہ ، ص ۷۶ ۔

کسی پیشہ ور کاتب کا معلوم ہوتا۔ لیکن بعض اضافے بدنما خط میں ہیں اور ان میں املا کی غلطیاں بھی ہیں مثلاً ''تقاضا'' کو ''تقضا'' ''بہانہ'' ''کو ''بہانئے'' '' مضائقہ '' کو '' مضاعقہ'' ، '' مہک '' کو '' مہہک '' اور '' بھاگیں گے'' کو '' بھاگے نگے'' لکھا ہے (۱)۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف کہتے ہیں '' کاتب نے حاشیے پر غزلیں نقل کرتے ہوئے نہایت بے پروائی کے ساتھ دوسری غزلوں کی بیتوں اور مصرعوں کو خلط ملط کردیا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ کئی غزلیں باوجود متن میں مندرج ہونے کے ایک سے زیادہ مرتبہ لکھی گئی ہیں '' (۲) ۔ ان دونوں قسم کے اضافوں اور اصلاحات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی وقت رنجور کو غالب کی بیاض سے فائدہ اٹھانے کے لیے خاصا موقع ملا ہے اور انھوں نے نئی غزلوں کو کاتب سے خوشخط نقل کروا لیا ہے اور پہلے سے تحریر غزلوں سے مقابلہ کر کے ان پر ''مقابلہ کردہ شد '' تحریر کیا ہے۔ لیکن کبھی یہ اضافے بہت عجلت میں کیے گئے ہیں اور کسی کم استعداد والے شخص کو بول بول کر تصحیح کا کام کروایا گیا ہے جس کی وجہ سے املا کی غلطیاں ہوئی ہیں ۔ اسی طرح اضافے کرتے وقت عجلت کی وجہ سے بعض ایسی غزلوں کو دوبارہ بھی لکھ لیا گیا ہے جو پہلے سے درج تھیں ، لیکن کاتب کو ان کی موجودگی کی تصدیق کرنے کا وقت نہ تھا ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کہیں کہیں متن کے اشعار میں اصلاحیں یا حاشیے پر معمولی اضافے خود غالب کے قلم ہی سے ہوں ۔

نسخہ٫ بھوپال کے شروع میں موجود سادہ اوراق پر وہ غیر منقوط فارسی خط نقل ہے جو غالب نے مولوی فضل حق کو تحریر کیا تھا ۔ یہ خط بعد میں غالب نے ''خاتمہ٫ گل رعنا '' میں شامل کیا اور اسی حوالے سے اسے ''پنج آہنگ'' میں درج کیا گیا ہے (۳) لیکن ڈاکٹر سید عبداللطیف بتاتے ہیں کہ نسخہ٫ بھوپال میں منقول خط کے خاتمے پر ''محمد اسداللہ'' نام بھی درج ہے (۴) جو کلیات نثر میں تحریر نہیں ہے ۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ

۱- نسخہ٫ عرشی ، دیباچہ ، ص ۶۷ -

۲- مضمون محولا بالا ، ص ۵۷ -

۳- کلیات نثر غالب ، ص ۶۳ و ۶۴ -

۴- مضمون محولا بالا ، ص ۵۷ -

یہ خط ''پنج آہنگ'' یا ''گل رعنا'' سے نہیں بلکہ بہت ممکن ہے کہ اصل خط یا اس کے مسودے سے نقل کیا گیا ہو۔ غالب نے یہ خط مولوی فضل حق کو فیروز پور سے لکھا تھا۔ جہاں غالب اپنی پنشن کے معاملے میں بات کرنے کے لیے نواب احمد بخش خاں کے پاس گئے ہوئے تھے۔ نواب ان دنوں الور میں تھے، اس لیے ان کے انتظار میں غالب کو کچھ عرصہ فیروز پور میں قیام کرنا پڑا (۱)۔ ہو سکتا ہے فیروز پور میں اسی قیام کے دوران رنجور نے مولوی فضل حق کے نام اس غیر منقوط خط کو اپنے دیوان کے ابتدائی صفحات پر درج کروایا ہو۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ غالب اپنی بیاض ساتھ لیتے گئے ہوں اور رنجور نے اس کی مدد سے اپنے نسخے میں مزید اضافے اور ترمیمات کروالی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا فیروز پور میں یہ قیام طویل نہیں رہا۔ اس وجہ سے یہ اضافے اور ترمیمات بھی عجلت میں کی گئی ہوں گی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف بتاتے ہیں کہ مولوی فضل حق کے نام خط کی نقل کے خاتمے پر 'محمد اسداللہ' اس طرح لکھا گیا ہے کہ 'اسد' اور 'اللہ' کے درمیان ایک واؤ زائد ہے (یعنی 'محمد اسد و اللہ') (۲)۔ کتابت کی اسی قسم کی غلطیاں، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، متن میں کی گئی دوسری اصلاحات اور اضافوں میں نظر آتی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بدنما خط میں اور غلط املا میں کی گئی ترمیمات اور اضافے غالب کے قیام فیروز پور کے وقت کے ہیں۔ یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ صاف خط میں اضافے کبھی پہلے کے ہیں جب کہ رنجور شاید دہلی گئے ہیں اور وہاں انھوں نے ایک عرصے تک قیام کیا ہے اور باطمینان ہر غزل کا مقابلہ کروا کے کسی کاتب سے اضافوں کو درج کروایا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تاریخی ترتیب میں خوشخط اضافے، بدنما خط میں اضافوں سے پہلے کے ہیں۔ یہ بھی امکان ہے کہ غالب کے قیام فیروز پور کے دوران رنجور نے اپنے قلمی نسخے پر جو اضافے کروانا چاہے، ان سب کے لیے گنجائش نہ نکل پائی ہو۔ اس لیے ان میں سے بعض کو انھیں علاحدہ درج کرلیا گیا ہو۔ شاید ان باقی ماندہ غزلوں کے پیش نظر یا حاشیوں وغیرہ پر بے ربط اضافوں اور املا میں غلطیوں وغیرہ کو دیکھتے ہوئے رنجور یا خود غالب نے دیوان کی ایک اور صاف نقل تیار کرنے کی تجویز رکھی ہو یا اس کے برعکس رنجور

۱- کلیات نثر غالب، ص ۱۵۵ و ۱۵۶ -

۲- مضمون محولہ بالا، ص ۷۵ -

یا غالب کو ایک نئی نقل تیار کرانے کا خیال پہلے پیدا ہوا ہو اور اس کے لیے رنجور کے پاس موجود نسخے کو بعجلت تمام ، خط میں نفاست ، ترتیب میں درستی یا املا میں صحت کو مدنظر رکھے بغیر ، اضافے اور ترمیمات کر کے مکمل کرلیا گیا ہو ۔ بہرحال غالبا اسی مقصد کے تحت بعض ایسی غزلوں پر بھی نشانات لگائے گئے جنھیں نئے نسخے سے حذف کرنے کا خیال تھا ۔ عرشی صاحب نے تحریر کیا ہے :

" کچھ غزلوں کے آغاز کی سادہ جگہوں میں لفظ ' غلط ' لکھا گیا ہے اور بعض غزلوں پر حرف 'ع' اس طرح لکھا ہے کہ اس کا سر مطلع کے دونوں مصرعوں کے بیچ میں آیا ہے اور دائرے نے ساری غزل کو گھیر لیا ہے ۔ یہ سب غزلیں وہ ہیں جو نسخہ شیرانی میں شامل نہیں کی گئی ہیں "۔(۱)

یہ نیا صاف کیا ہوا نسخہ وہ نسخہ ہو سکتا ہے جو اب لاہور یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور ' نسخہ شیرانی ' کے نام سے موسوم ہے ۔ عرشی صاحب نے نسخہ شیرانی کو نسخہ بھوپال کا مبیضہ قرار دیا ہے (۲) اور ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کی تصدیق کی ہے کہ ''نسخہ شیرانی'' کے متن میں ''نسخہ بھوپال'' میں موجود ساری اصلاحات اور اضافوں کو شامل کرلیا گیا ہے ۔ کو چند ایسی غزلیں بھی نسخہ شیرانی کے متن میں داخل ہیں جو نسخہ بھوپال میں درج نہیں ہیں (۳) ۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے ، نسخہ شیرانی میں بڑھائی گئی غزلوں کو ممکن ہے نسخہ بھوپال میں موزوں مقام پر گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے جداگانہ محفوظ کرلیا گیا ہو اور نئے نسخے کی کتابت کے وقت انہیں اس میں شامل کردیا گیا ہو ۔ اس لحاظ سے ' نسخہ شیرانی ' کے متن میں یہ اضافے غالباً اسی وقت کے ہیں جب ' نسخہ بھوپال ' میں آخری اضافے اور ترمیمات کی گئیں ۔

عرشی صاحب نے بتایا ہے کہ " نسخہ بھوپال " میں بعض ایسی غزلوں پر جو دو بار درج ہو گئی ہیں کہیں کہیں " مکرر نوشتہ شد "

---

۱ ، ۲- نسخہ عرشی ' دیباچہ ، ص ۷۸ -

۳- ' غالب اور نسخہ شیرانی ' از ڈاکٹر وحید قریشی ' نقوش ' غالب نمبر ، ۱۹۶۱ء -

تحریر ہے ۔ ہو سکتا ہے 'نسخہ' شیرانی' کے کاتب نے 'نسخہ' بھوپال' سے نقل کرتے ہوئے اس اعادے کا اندازہ کیا ہو اور یہ اندراج کیا ہو ۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ جس وقت غالب نے ان غزلوں پر نشانات لگائے ہیں جن کو حذف کرنا مقصود تھا ، اسی وقت دو بار تحریر کی ہوئی ان غزلوں پر ان کی نظر پڑی ہو اور ان پر ''مکرر نوشتہ شد'' لکھا ہو ۔ مفتی انوارالحق نے بعض اشعار کے بارے میں لکھا ہے ان کو کاٹ کر ''لا ، لا'' لکھ دیا دیا ہے اور متن میں ہی یا حاشیے پر اصلاح شدہ شعر یا مصرع لکھ دیا ہے (۱) ۔ مفتی صاحب کا خیال ہے کہ یہ اصلاحات غالب نے خود کی ہیں ۔ مفتی صاحب کا یہ قیاس درست ہو سکتا ہے اور یہ اصلاحات بھی اسی وقت کی ہو سکتی ہیں جب غالب نے بعض غزلوں کو حذف کرنے یا ان کی تکرار کے بارے میں اشارے درج کیے ہیں ۔

غالب نے فیروز پور کا سفر غالباً ۱۸۲۶ء میں کیا تھا ۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اسی سفر کے دوران 'نسخہ' شیرانی' کی کتابت شروع ہو گئی اور نسخہ' بھوپال میں اضافے بند ہو گئے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 'نسخہ' بھوپال' میں اس کی کتابت (یعنی ۱۸۲۱ء) کے بعد پانچ سال کے اضافے اور اصلاحات شامل ہیں اور اس کے بعد جو اضافے ہوئے انھوں نے 'نسخہ' شیرانی' میں جگہ پائی ۔

غالب وسط ۱۸۲۷ء میں دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے (۲) اور لکھنؤ ، کانپور ہوتے ہوئے باندہ پہنچے ۔ 'نسخہ' شیرانی' میں دو غزلیں ایسی درج ہیں جن پر ''از باندہ فرستادند'' اور ''از باندہ رسید'' لکھا ہے (۳) ۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک ''نسخہ' شیرانی'' کی کتابت مکمل ہو چکی تھی یا کم از کم اس ردیف کی کتابت پوری ہو گئی تھی ، اسی وجہ سے ان غزلوں نے بجائے متن کے حاشیے میں جگہ پائی ۔ یہ بھی گمان غالب ہے کہ یہ غزلیں رنجور کو ہی بھیجی گئی ہوں گی کیونکہ پنشن کے اس قضیے میں وہ غالب کے خاص ہمراز و خیر خواہ تھے

۱۔ نسخہ حمیدیہ' ص ۳، ۵، ۲۲، ۲۷ وغیرہ ۔

۲۔ 'حیات غالب' از شیخ محمد اکرام ، ص ۱۷ ۔ 'غالب' از غلام رسول مہر ، ص ۹۲ ۔

۳۔ 'غالب اور نسخہ' شیرانی' از ڈاکٹر وحید قریشی ' نقوش ' غالب نمبر ، ۱۹۶۹ء ، ص ۲۸۴ ۔

اس سلسلے میں غالب کے دو خطوط جو انھوں نے رنجور کو کلکتے سے لکھے تھے "کلیات نثر غالب" میں درج ہیں (۱) - اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ غالب ، رنجور کو اپنے سفر کی دوسری منازل سے بھی خطوط روانہ کرتے رہے ہوں اور کلام غالب سے ان کا شغف دیکھتے ہوئے ، اس خیال کے پیش نظر کہ فیروز پور میں ابھی ان کا دیوان زیر کتابت ہے ، غالب نے انھیں اپنی تازہ غزلیں بھی ارسال کی ہوں - لیکن بعض ایسی منظومات جو کہ غالب کے قیام کلکتہ سے متعلق ہیں " نسخۂ شیرانی " میں درج نہیں ہیں - اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کلکتے پہنچنے کے کچھ عرصے بعد (۲) غالب نے رنجور کو اپنا کلام بھیجنا بند کردیا - اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں - اول یہ کہ بہت ممکن ہے کہ غالب کے علم میں آچکا ہو کہ "نسخہ شیرانی" کی کتابت مکمل ہو گئی ہے اور اس لیے ہوسکتا ہے انھوں نے حاشیوں وغیرہ پر اضافے کروانا مناسب نہ سمجھا ہو - دوم یہ کہ سفر کلکتہ کے دوران ہی نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا اور کچھ عرصے بعد ہی رنجور فیروز پور چھوڑ کر جگہ جگہ مارے پھرے - لکھنؤ پہنچے ، وہاں رک نہ سکے اور گھومتے گھامتے جے پور پہنچے - رنجور کی ان سرگردانیوں کے دوران تازہ کلام سے واقفیت تو کیا ، ہوسکتا ہے رنجور کی غالب سے خط و کتابت بھی موقوف رہی ہو - سوم یہ کہ اسی زمانے میں غالب " گل رعنا " کے لیے انتخاب میں مصروف ہو گئے ، اس لیے ہوسکتا ہے انہیں اپنے نئے کلام کو کسی دوسرے دیوان میں شمولیت سے دلچسپی نہ رہی ہو -

" نسخۂ شیرانی " کی کتابت پوری ہو جانے کے بعد رنجور کے پاس ایک صاف اور مکمل دیوان تھا ، اس لیے ہوسکتا ہے کہ فیروز پور چھوڑتے وقت ، اس کے بعد کبھی انھوں نے " نسخۂ بھوپال " اپنے سے جدا کردیا جو کسی وسیلے سے بھوپال پہنچا اور میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں داخل ہوا - " نسخۂ شیرانی " کب تک رنجور کے پاس رہا اور کن واسطوں سے پروفیسر شیرانی کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوا ، ابھی حل طلب مسائل ہیں -

---

۱- کلیات نثر غالب ، ص ۹۹ و ۱۰۰ -

۲- غالب کلکتہ ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو پہنچے (' غالب ' از غلام رسول مہر ، ص ۱۰۵)

آشـــوب آگہی

سید قدرت نقوی

۱۹۵۷ء کی جنگ آزادی کی یادگار ۱۸۵۷ء میں منانے کے اہتمام ہو رہے تھے - مجھ سے بھی کہا گیا کہ کچھ لکھوں - ذہن میں آیا کہ غالب نے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے ، اس کے خطوط اور دیگر تصانیف سے اس زمانے کے حالات مرتب کیے جائیں - عود ہندی اور اردوئے معلیٰ کے ذریعے حالات ترتیب دینے کی کوشش کی - دونوں کتابوں میں حالات تو تھے ، تاریخی ترتیب نہ تھی ، اس لیے دقت پیش آئی - خواجہ حسن نظامی کا مرتبہ ''غالب کا روزنامچہ'' ملا ، اسے دیکھا ، بات پھر بھی نہ بنتی نظر آئی تو خطوط کی تاریخی ترتیب کا خیال آیا - عود ہندی کے خطوط کی تاریخیں معین کر لی تھیں کہ مولانا مہر کے مرتبہ ''خطوط غالب'' مل گئے - جب میں نے اپنی معینہ تاریخوں سے مقابلہ کیا تو خاصا اختلاف نظر آیا - منشی مہیش پرشاد کے مرتبہ ''خطوط غالب'' دستیاب نہ ہو سکے ، مگر مولانا مہر کے مرتبہ مجموعے نے اس کی عدم موجودگی کو محسوس نہ ہونے دیا - میں نے مولانا کی خدمت میں تاریخوں کے اختلاف کے متعلق لکھا ، اپنے دلائل بیان کر دیے - موصوف نے میرے خط کا جواب نہایت مشفقانہ انداز میں مرحمت فرمایا - اس وقت سے اب تک مولانا سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہے -

مولانا ہمیشہ مجھ پر کرم فرماتے رہے ہیں - میرے استفسارات کا جواب بڑی تفصیل سے عنایت فرمایا ہے - مجھے جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے ، میں نے اسے موصوف کی خدمت میں پیش کیا - اکثر مباحث کو اتفاق و اختلاف منازل سے گزرنا پڑا ، اور اس مبحث پر جانبین کی رائے مع

استدلال خطوط میں منتقل ہوتی رہی ۔ یہ اگرچہ نجی طور پر افہام و تفہیم کا ذریعہ تھی ، مگر عام افادیت کے پیش نظر اس کو محدود کر دینا مناسب نہیں ، اس لیے یہ خطوط پیش خدمت ہیں تاکہ جس طرح میں مستفید و مستفیض ہوا ہوں ، دوسرے بھی ہوتے رہیں ۔

مبحث پر روشنی ڈالنے کی خاطر میں نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے دو خطوط بھی شامل کر لیے ہیں ۔ مولانا کے چار خط ''ماہ نو'' بابت اکتوبر ۱۹۶۵ء میں چھپ چکے ہیں لیکن ترتیب درست نہیں اور میرے خطوط بھی سامنے نہیں ، اس وجہ سے مطلب مبہم رہ گیا ہے ، ان میں یہ دونوں خط بھی شامل ہیں ۔

مولانا مہر اور مولانا عرشی کی شفقت و عنایت پر مجھے ہمیشہ ناز رہے گا ۔ دونوں میرے بزرگ ہیں اور میری ہر بات کو شرف قبولیت بخشتے رہے ہیں ۔ میری حوصلہ افزائی فرما کر مجھ میں کام کرنے کی لگن پیدا کی ، ان کی تحسین و آفرین نے مجھے سر بلند کیا ۔ کہیں کہیں عرض مطالب میں میری طرف سے '' شوخی '' نمایاں ہوگئی ہے اور یہ ان بزرگوں کی بندہ نوازی کی بدولت ہے ۔

میں نے ایک مبحث پر مربوط خط و کتابت کو جمع کردیا ہے اور حسب موقع اشارات کی وضاحت بھی کردی ہے تاکہ کوئی بات ابہام کا شکار نہ ہونے پائے ۔ اس خط و کتابت کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان میں اختلاف رائے کے باوجود جانبین کا خلوص ملوث نہیں ہوا ۔ یہ جذبۂ خلوص ہماری موجودہ نسل کے لیے ایک نمونہ بن سکتا ہے ۔ ان خطوط میں غالب کو مرکزیت حاصل رہی ہے ، اس لیے یہ غالبیات میں ایک اضافہ ہیں ۔

بنام مولانا غلام رسول مہر :

۱۰ جنوری ۱۹۶۴ء

قبلہ ، آداب

۲۸ دسمبر کو ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا اور گزارش کی تھی کہ خیریت مزاج سے جلد مطلع فرمایے ۔ خط نہ ملنے پر تردد بڑھتا گیا ۔ آپ کی خیریت کا خواہاں ہوں ۔ خدا کرے کہ آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں ۔

اگر جناب کی طبیعت بحال ہو ، اور معمول پر آ گئی ہو ، تو براہ کرم 'قاطع برہان' میں ''آشیاں چیدن و ارتنگ و ارژنگ'' کے متعلق جو مبحث ہے اس سے سرفراز فرمایئے - میرے پاس نہ 'قاطع برہان' ہے اور نہ 'درفش کاویانی' اور ان الفاظ کے متعلق بحث دیکھنا ضروری ہے ۔ سردست لاہور آنے کا کوئی امکان نہیں ، ورنہ وہیں دیکھ لیتا ، اور کتاب ایک ہفتے کے لیے یہاں بھیج دینے کی استدعا کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہے کہ کتاب تو آپ یقیناً ارسال فرما دیں گے ، مگر مجھے زحمت دینے میں شرم محسوس ہوتی ہے - فی الحال مقصد الہی الفاظ کی تحقیق سے ہے جو غالب نے لکھی ہے - جو طریقہ ان الفاظ کی تحقیق کے ارسال میں آپ مناسب خیال فرمائیں ، اختیار فرمایئے -

آشیان زغن و زاغ ، نچیدم بر سر
سر ، قدم ساختہ ، در خار مغیلاں رفتم

عرفی کا یہ شعر '' آشیاں چیدن '' بمعنی '' آشیاں بستن و ساختن '' کی سند میں پیش کیا جاتا ہے - میرے خیال میں اس شعر میں یہ معنی مراد نہیں ہو سکتے ، بلکہ دشت نوردی و ہرزہ گردی کا مفہوم پیدا ہوتا ہے - گھونسلا بنانے کے معنی جس مفروضہ روایت پر مبنی کیے جاتے ہیں اس میں فاعل '' زغن و زاغ '' ہیں اور یہاں فاعل '' من '' (عرفی) ہے ، نیز یہ شعر قطعہ بند ہے - اس سے پہلے دو شعر اور ہیں ، ان کے ساتھ اس شعر کے معنی متعین کیے جائیں تو یہی مفہوم پیدا ہوگا جو میں نے لکھا ہے :

راہ مجنونی و فرہادیم ، آمد در پیش
رفتم این راہ و لیکن نہ چوں ایشاں رفتم
ناخن تیشہ ، نراندم ، برگ و ریشہ' سنگ
کوہ غم ، در تہ پا سودہ ، بجولاں رفتم
آشیان زغن و زاغ ، نچیدم ، بر سر
سر ، قدم ساختہ ، در خار مغیلاں رفتم

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مصرع اول کی ترتیب یہ بھی ہو سکتی ہے : '' زغن و زاغ برسرم آشیاں نچید '' - اور ایسا قیاس بعض کے از بھی نہیں ، لیکن تینوں اشعار کو مربوط خیال کیا جائے تو شعر کا

پر طعنہ کیا گیا ہے۔ اس کے پیش نظر اس شعر میں بھی فاعل ''من'' (عرفی) ہی قرار دیا جائے گا۔ فرہاد کی صفت، سنگ تراشی کے مقابل، مجنوں کی صفت دشت نوردی ہی قرار دی جائے گی۔ میرے خیال میں ''آشیان زغن و زاغ چیدن'' سے کنایہ، دشت نوردی بکار عبث و بیہودہ ہے۔ اگر مفروضہ روایت کو سامنے رکھا جائے تو انسان کے سر پر چیل کووں کا گھونسلا بنانا محال عقلی ہے۔ اگر مجنوں کو بے حس و حرکت ایک جگہ ایستادہ مان بھی لیں تو ان پرندوں کی فطرت یہ ہے کہ بلندی پر گھونسلا بناتے ہیں۔ مجنوں کتنا ہی بلند قامت کیوں نہ ہو، ان کے گھونسلا بنانے کا محل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میں اس سلسلے میں غالب کو حق بجانب خیال کرتا ہوں۔ اس کے تحریر کردہ دلائل سامنے ہوں جو مزید کچھ کہا جاسکتا ہے۔ بہرحال آشیاں چیدن و آشیاں بستن و ساختن ہم معنی نہیں ہیں۔ ان تمام امور کا جواب بحالی طبع پر موقوف ہے۔ والسلام۔

نیاز کیش، سید قدرت نقوی

مکتوب مولانا مہر :

مسلم ٹاؤن، لاہور

۱۳ - جنوری ۱۹۶۳ء

بھائی! تعجب ہے کہ آپ کو عرفی کے ایک صاف اور واضح شعر میں عجیب و غریب الجھنیں پیش آئیں۔

۱- ''چیدن'' دوسرے معنی کے علاوہ ''آراستن'' کے معنی میں بھی مستعمل ہے، اور آشیاں چیدن بہ معنی آشیان آراستن یعنی گھونسلا بنانا مسلم ہے۔

۲- ''آشیان زغن و زاغ بہ چیدنم بر سر'' سے آپ نے ہرزہ گردی او صحرانوردی کے معنی کس بنا پر لئے؟ کیا یہ فارسی کا کوئی محاورہ ہے یا عرفی کے بعد اسے اہل زبان کا مسلم محاورہ مان لیا گیا ہے؟

۳- عرفی بداہتہ اسی مشہور قصے کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اس میں آپ کو عقلی استبعاد نظر آیا۔ یعنی یہ کہ زاغ و زغن بلندیوں پر گھونسلا بناتے ہیں، ایک انسان کے سر پر کیوں کر بنائیں گے جو زیادہ بلند قامت نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ پانچ چھ فٹ کا ہوگا۔

اس آخری استدلال میں آپ نے ان تمام افسانوں پر خط نسخ کھینچ دیا جن سے ہمارے شعرا نے نہایت پاکیزہ شعر پیدا کیے ۔

آپ جانتے ہیں کہ شعرا کو افسانوں کی درستی و نادرستی سے کچھ کام نہیں ہوتا ، اور صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جو افسانہ مسلمات ادب میں شامل ہو گیا ہے ، اس سے بے تکلف کام لیں ۔ میرزا غالب نے خطوط میں خود لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے قسم قسم کے افعی منگائے ، زمرد ان کے سامنے رکھے ، کوئی بھی اندھا نہ ہوا ۔ کتاں کے کپڑے جگہ جگہ تلاش کرائے ، چاندنی میں پھیلائے ، ایک بھی نہ مسکا ۔ تاہم ان مسلمات شعری کی واضح تردید کے باوصف ، میرزا غالب یا دوسرے شعرا نے ان سے کام لینا کبھی نہ چھوڑا ۔

اقبال نے '' رموز بے خودی '' میں عالمگیر کا ایک قصہ نظم کیا ہے ، جس کی کوئی اصل کسی کتاب میں نہیں ملتی ۔ میں نے خود ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ اس قصے کی اصل کیا ہے : فرمایا : مجھے اصل سے کیا تعلق ؟ ایک قصہ مجھے اپنے مطالب کے لیے موزوں معلوم ہوا ، اور میں نے اس سے کام لے لیا ۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو تاریخی اعتبار سے غلط ہے اور آپ تاریخ کو بگاڑ رہے ہیں ، یعنی غلط واقعات لوگوں میں پھیلا رہے ہیں ۔ فرمایا : جو لوگ میری کتاب کو تاریخی حقائق پر محمول کرتے ہیں وہ خود غلط اندیش ہیں ۔ یہ شعر کی کتاب ہے ، اسے تاریخ سے کیا تعلق ؟

پھر آپ کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ قیس عامری کے متعلق یہ قصہ بنانے والوں کا مقصد کیا یہ تھا کہ وہ واقعی سوکھ کر درخت کا ایک ٹنڈ سا رہ گیا تھا ، اور کوے یا چیل نے اس پر گھونسلا بنا لیا تھا ؟ ہرگز نہیں ۔ وہ محض یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ لیلیٰ کے انتظار و شوق میں مجنوں کی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ جانور اس کے سر پر گھونسلے بنا لیتے ۔

پھر زاغ و زغن بلاشبہ درختوں کی بلندیوں پر گھونسلے بناتے ہیں ، مگر کہاں ؟ ہمارے ہاں جہاں اونچے اونچے درخت موجود ہیں ، صحرا میں تو چند فٹ کا بودا بھی چنار اور دیودار کا قائم مقام ہوتا ہے ، وہاں اونچے درخت ملتے ہی کہاں ہیں جن پر گھونسلے بنائے جائیں ۔

سب سے آخر میں یہ کہ عرفی کا دعویٰ خاص غور کا محتاج ہے ۔ اسے مجنونی و فرہادی کی منزل پیش آئی تو کہتا ہے کہ میں نے قیس و کوہکن کا

طریقہ اختیار نہ کیا ، میں نے پہاڑ پر تیشہ نہیں چلایا یا ناخن تیشہ رگ سنگ میں نہیں چلایا ، بلکہ غم کے پہاڑ کو پاؤں تلے روند کر سرمہ بنایا ا اچھلتا کودتا نکل گیا ۔ پھر کہتا ہے کہ میں نے اپنے سر پر زاغ و زغن آشیانہ آراستہ نہیں کیا ، بلکہ سر کے بل چلتا ہوا خارزاروں میں گھس گیا صحرا گردی کا یہاں کیا معاملہ تھا ؟ وہ تو کانٹوں پر چل رہا ہے ۔

پہلے مصرعے میں یقیناً فاعل زاغ و زغن نہیں ، بلکہ " من " ۔ یعنی عرفی ۔ وہی تو کہتا ہے کہ میں نے آشیانہ آراستہ نہیں کیا ۔ زاغ و زغ کو فاعل کون بنا سکتا ہے ؟ اور کس کا خیال اس طرف جاسکتا ہے ؟

آپ نے میرزا غالب کا حوالہ دیا ہے کہ میرزا نے کہیں ان صاف ا واضح معنی سے اختلاف کیا ہے ؟ میرے علم میں تو اب تک یہ بات نہیں آئی ، اگر کہیں کچھ لکھا ہے تو اس کا حوالہ دیجیے ۔

خود مجھے تین چار روز کے لیے ایک ضروری کام در پیش ہے ۔ حتیٰ کہ میں نے یہ عبارت بھی کتاب کے دو صفحوں کا خون کر کے لکھی ہے ۔ اگر آپ کی تحریر پر چند روز صبر کر سکتا ، تو میرے اوقات محنت میں کم و بیش نصف ساعت کی تخفیف ضرور ہو جاتی ۔

قاطع برہان ہے ، لیکن بھیجنی ممکن نہیں ، نہ ڈاک میں نہ آدمی کے ہاتھ ۔ سات سال کی محنت کے بعد حیدرآباد دکن میں ایک نسخہ ملا تھا ۔ اسے حرزجاں بنائے ہوئے ہوں ۔ اس کمرے سے بھی باہر نہیں نکالتا ، جہاں یہ رکھی ہوئی ہے ۔ بڑی بڑی لائبریریاں اس سے خالی ہیں ۔ آپ آئیں گے تو یہاں دیکھ لیں گے ۔ اشد ضرورت ہو تو جو عبارتیں آپ کہیں ، تین چار روز کے بعد نقل کرا کے بھیج دوں گا ۔ اگر خدانخواستہ یہ کتاب کہیں ضائع ہو جائے گی تو پھر کہیں سے نہیں ملے گی ۔ خصوصاً موجودہ حالت میں کہ ملک تقسیم ہو چکا ہے اور جن گوشوں میں ایسی کتابیں تھیں ، وہ دسترس سے باہر جا چکے ہیں ۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں ۔ آخر میں آپ کو غالب کے شعر سناؤں ؟

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشم کم مبیں
ہیں نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

مے گساراں قحط و ما بے صبر ، عشرت مفت نیست
بادۂ ما تا کہن گردید ارزاں کردہ ایم

السلام علیکم ۔

آپ کا ، مہر

بنام مولانا مہر :

۱۹ جنوری ۱۹۶۴ء

قبلہ ، آداب !

گرامی نامہ باعث سرافرازی ہوا ۔ جملہ امور مندرجہ معلومات افزا ثابت ہوئے ۔ " چیدن " بمعنی " آراستن " ہرگز میری نظر سے نہیں گزرا تھا ۔ جناب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ یہ آراستن کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ حافظے پر بہت زور ڈالا کہ کوئی مثال یاد آجائے ، لیکن ناکام رہا ، البتہ غالب کے اس شعر میں خفیف سا احتمال ہوتا ہے کہ غالب نے بھی ممکن ہے کہ یہی معنی مراد لیے ہوں ۔ اگرچہ اس میں بھی " چیدن " بمعنی آراستن سے انحراف کیا جاسکتا ہے ، اور قائم کرنے کے معنی لیے جاسکتے ہیں ، جو زیادہ مناسب ہیں ۔

در تہ ہر حرف ، غالب چیدہ ام میخانہ
تا ز دیوانم ، کہ سرمست سخن خواہد شدن

عرفی کے شعر کے مذکورہ معنی ابتدا ہی سے معلوم تھے ۔ الجھنے کی وجہ یہ ہوئی کہ غالب نے ان معنی کی مخالفت کی تھی ۔ نواب کلب علی خاں نے قصائد بدرچاچ کی شرح پر دیباچہ لکھا تھا ۔ وہ دیباچہ غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا ۔ غالب نے اصلاح دی تو اورنگ و اورنگ اور اشیاں چیدن کے استعمال کو غلط بتاتے ہوئے کاٹ ڈالا اور اصلاح دے دی ۔ نواب صاحب نے غالب کو لکھا کہ جمیع لغات نویسان و شرح نویسان قصائد عرفی آشیان چیدن کو آشیاں بستن و ساختن کے ہم معنی قرار دیتے ہیں ، آپ نے کس طرح اس کو غلط قرار دے دیا ؟ غالب نے لغت نویسان ہندی نژاد کو خوب جلی کٹی سنائیں اور لکھ دیا کہ " اب جو پیرومرشد نے لکھا کہ اورنگ و ارزنگ متحدالمعنی ، اور آشیانہ ساختن و بستن و چیدن گھونسلا بنانے کے معنی

ہر ہے ، تو میں نے بے تکلف مان لیا ، لیکن نہ ان صاحبوں (فرہنگ نویسوں) کے قیاس کے بموجب ، بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے مطابق"۔ (خط ۶ ۳۲ مکاتیب غالب ص ۹۱) - ظاہر ہے کہ یہاں غالب نے آشیاں چیدن بمعنی گھونسلا بنانے سے اختلاف کیا ہے ۔ غالب کے نزدیک اس کے کیا معنی تھے اس کا سراغ نہ مل سکا تو میں نے جناب سے امداد چاہی کہ "قاطع برہان میں غالب نے اس کے متعلق ضرور لکھا ہو گا ، کیونکہ غیاث اللغات میں آشیاں ساختن و بستن و چیدن ہم معنی ہیں ، برہان قاطع میں بھی یہی معنی ہوں گے ، اس لیے غالب نے اس کی نشاندھی کی ہوگی - ممکن ہے کہ وہاں آشیاں چیدن ، کے معنی بتائے ہوں ۔ "ارتنگ" بمعنی مرقع تصویر و "ارژنگ" بمعنی نقاش ، کلیات نثر غالب ص ۳۶ پر غالب نے لکھے ہیں - میں نے خار چیدن ، گل چیدن کے قیاس پر آشیاں چیدن کے معنی گھونسلا چننا یعنی جمع کرنا اور اس سے کنایہ فعل عبث و صحرا نوردی و ہرزہ گردی خیال کیا عرفی کے شعر میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے ، اور میں سمجھتا ہوں کہ غالب نے بھی یہی معنی مراد لیے ہوں گے ۔

اپنے قلم کی کوتاہی تصور کرتا ہوں کہ جناب پر مدعائے اصلی واضح نہ ہو سکا ۔ مقصد صرف اتنا تھا کہ قاطع برہان میں اگر آشیاں چیدن کے متعلق غالب نے کچھ لکھا ہے تو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے ، اور بس ۔

آپ کے قیمتی وقت کا احساس تھا ، اور اب یہ احساس اور شدید ہو گیا ۔ میں نے آخر میں لکھ دیا تھا کہ جواب بحالیٔ طبع پر موقوف ہے ، اس کے باوجود جناب نے جواب سے نوازا ، یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ۔ غالب کے شعر پڑھ کر بے ساختہ زبان پر جاری ہو گیا :

چشم لطفت قسمت ما بود ، اما چہ کنیم
شوق بے حد را نشاں دادیم و نقصاں کردہ ایم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔ والسلام

طالب عفو ، سید قدرت نقوی

مکتوب مولانا مہر :

۲۳ جنوری ۱۹۶۴ء باسمہ سبحانہ

بھائی ! میں نے ابھی بہار عجم دیکھی ، اس میں مرقوم ہے کہ آشیاں کے ساتھ مندرجہ ذیل افعال آسکتے ہیں اور آتے ہیں :

'' بستن وگزاشتن و برداشتن و چیدن و نہادن وکردن و گرفتن و ساختن ''

چیدن کے لیے عرفی کا زیر بحث شعر ہی پیش کیا ہے۔ چیدن بمعنی آراستن کے لیے تو غالب کا یہ شعر بھی ہے :

دمید ، دانہ و بالید و آشیاں گہ شد

در انتظار هما ، دام چیدنم بنگر

مجھے ایک دو روز کی فرصت درکار ہے ، پھر غالب کی کتاب نکال کر دیکھوں گا اور عرض کروں گا - میرے ذہن میں بھی اس وقت عرفی کے اس شعر کے سوا کوئی اور شعر نہیں آتا ، اور جو معنی میں نے اس شعر کے عرض کیے تھے ، ان میں بہ ظاہر کلام کی گنجائش نہیں - پھر کسی فارسی محاورے کے لیے عرفی سے بڑی سند کس کی ہوگی ؟ تاهم میں خیال رکھوں گا اور حضور والا کو اطلاع دوں گا - غالب کے شعر کے لیے دلی شکریہ قبول فرمایے ! (۱) آپ نے کبھی اس کا یہ شعر بھی دیکھا ہے ، یا آپ کو یاد ہے ؟ :

هفت دوزخ در نہاد شرمساری مضمر است

انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردہٴ

آپ کا ، مہر

بنام مولانا مہر صاحب :

۲۳ - جنوری ۱۹۶۳ء

قبلہ ، السلام علیکم !

حیف باشد ، گر نباشد ، رهن احسانت دلم

هر چہ بامن کردہٴ ، بیش از تمنا کردہٴ

آپ کے الطاف بزرگانہ پر جس قدر ناز کروں بجا ہے کیوں کہ آپ

۱- سابقہ خط میں جو شعر میں نے لکھا تھا وہ برجستہ ہوگیا تھا - (ق - ن)

نے میری جا و بے جا گزارش کو شرف قبولیت بخشا ، اور یہ صرف اس تہذیب کا اثر ہے جس میں آپ نے کلیتہً زندگی بسر کی ، اور میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی ہے ۔ پاس وضع اس تہذیب کا طرہ استیاز ہے ۔ موجودہ نسل میں یہ خلوص و ارتباط کہاں ؟ اور اسی بنا پر میں :

شوخیٔ عرض مطالب میں ہوں گستاخ طلب

قبلہ ! بہار عجم ہو ، یا برہان ، یا غیاث ، مجھے ان میں تحریر کردہ معنی سے سروکار نہیں ۔ مدعائے اصلی صرف اتنا ہے کہ غالب نے آشیاں چیدن بمعنی گھونسلا بنانے سے انحراف کن وجوہ کی بنا پر کیا ، اور خود کیا معنی لیے ؟ دام چیدن بمعنی دام گستردن بھی ہے ، اور غالب کے شعر میں صاف دام گستردن کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ میں باوجود کج فہمی ، اس شعر میں دام چیدن بمعنی آراستن کی توجیہ کرنے سے قاصر رہا ۔ خیر آپ فرماتے ہیں تو تسلیم ! مگر شعر مزید غور چاہتا ہے ۔

بہزار نیاز و شرم مجھے لکھنا پڑتا ہے کہ آپ کے سامنے شرح پیش کرنا ، ارسطو و لقمان کو حکمت سکھانے کے برابر ہے ۔ جناب والا ! آشیاں چیدن کے سلسلے میں عرفی کی سند مسلم ، مگر ہم کیا معنی لیں ؟ لغات پر اعتبار اس وجہ سے نہیں رہتا کہ عرفی کہتا ہے کہ ''من بر سر خویش آشیان زغن و زاغ نچیدم '' ۔ روایت سے تطبیق کرتے ہیں تو وہاں یہ پایا جاتا ہے کہ ''زغن و زاغ بر سر مجنوں آشیاں ساختہ بودند '' ۔ عرفی کے شعر میں فاعل خود عرفی ہے ، اور روایت میں فاعل ''زغن و زاغ'' ہیں ۔ پس اگر ''مجنوں بر سر خویش آشیان زغن و زاغ چیدہ بود '' ہوتا تو عرفی کا شعر اسی معنی پر دلالت کرتا کہ آشیاں چیدن بمعنی گھونسلا بنانا ہی ہے ، لیکن وہاں فاعل اور ہے ، اور یہاں فاعل اور ۔ اس سے پہلے شعر میں فرہاد کے متعلق کہتا ہے کہ ''من کار فرہاد (ناخن تیشہ برگ و ریشۂ سنگ راندن) نکردم '' ۔ اسی طرح اس شعر میں کہتا ہے کہ '' من کار مجنوں (آشیان زغن و زاغ بر سر چیدن) نکردم '' ۔ ظاہر ہے کہ مجنوں نے چیل کووں کے گھونسلے خود نہیں بنائے تھے ، بلکہ روایت تو یہ ہے کہ '' مجنوں آں قدر با وحوش و طیور انس گرفتہ بود کہ طائراں برسر او آشیاں چیدہ بودند و او آں قدر بے ہوش بود کہ ازاں ہم خبر نداشت کہ دفع آں نماید '' (حاشیہ قصائد عرفی ۔ ص ۳۴ ، مطبوعہ نولکشور ۔ ۱۸۸۰ء) ۔ میں نے صرف اسی بنا پر آشیاں چیدن بمعنی گھونسلا

بنانے، سے انحراف کیا تھا ۔ کیوں کہ مجنوں کی صفت صحرا نوردی کو شہرت عام حاصل ہے، اسی لیے میں نے ''آشیان زغن و زاغ چیدن'' سے صحرانوردی و ہرزہ گردی کے معنی لیے تھے ۔ کیوں کہ چیل کووں کے گھونسلے چننا یعنی جمع کرنا ، فعل عبث ہے ۔ عرفی بالکل اسی طرح جیسا کہ وہ فرہاد کے متعلق کہتا ہے، یہاں بھی کہتا ہے کہ میں نے چیل کووں کے گھونسلے جمع نہیں کیے ، بیکار صحرانوردی نہیں کی ، بلکہ میں تو اس وادی میں اپنے سر کو پاؤں بنا کر خار مغیلاں پر چلا ہوں ۔ مصیبتوں سے گھبرا کر جنگل کی طرف نہیں بھاگا ہوں ، بلکہ عشق کے دشوار گزار راستوں کو میں نے طے کیا ہے ۔ یہاں آراستن کا محل بھی ہو سکتا ہے، لیکن عرفی کے شعر میں میرے نزدیک گھونسلا بنانے کا محل قطعاً نہیں ۔ آپ کے معنی اور میرے مقصود میں صرف معمولی سا فرق ہے ۔ '' من بر سر خویش آشیان زغن و زاغ نچیدم ، یعنی نیاراستم '' تسلیم ، مگر '' نساختم '' قبول کرنے میں تامل ہے ، کیوں کہ آراستن کا فاعل عرفی ہی ہے ۔ اور ساختن کا فاعل عرفی نہیں ہو سکتا ، کیوں کہ روایت میں فاعل '' زاغ و زغن '' ہیں ۔ آراستن و جمع کردن ایک ہی سے ہیں ، (۱) کیوں کہ ہندوستان میں چننا بمعنی بنانا بھی ہے ، اس لیے ممکن ہے کہ لغت نویسوں نے ہندی محاورے کو سامنے رکھ کر '' آشیان چیدن '' گھونسلا بنانا معنی لے لیے ہیں ۔ اس تمام ہرزہ بہانی سے اپنی تسلی مقصود ہے ، بحث مطلوب نہیں ۔ اور نہ مجھ میں یارائے بحث و استدلال ہے ، بلکہ منظور صرف رفع اشکال ہے ۔ اکثر اشعار ایسے ہیں کہ میں جن کے مطالب میں جمہور انام سے اختلاف رکھتا ہوں ۔ مثلاً حافظ کا یہ شعر ہے :

در پس آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

۱۔ دراصل چیدن کے معنی ترتیب دادن ہیں ۔ آراستن میں ترتیب کا عمل ہوتا ہے ، اس لیے مجازاً آراستن معنی لے لیے جاتے ہیں ۔ 'چننا' یعنی 'ایک ایک اٹھا کر رکھنا' کا نتیجہ جمع کرنا ، اکھٹا کرنا ہے ، اس لیے چیدن کے یہ معنی بھی لے لیے جاتے ہیں ۔ اس شعر میں عرفی یہی کہتا ہے کہ میں نے چیل کووں کے گھونسلے نہیں چنے ۔ سیدھی سی بات اور صحیح ترجمہ ہے ۔ گھونسلا بنانے کا یہاں کوئی محل نہیں ۔ (ق - ن)

اس کا مطلب کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ " مجھ کو آئینے کے پیچھے طوطی کے مانند رکھے ہوئے ہیں " ۔ میرے نزدیک مصرع اول کے یہ معنی قطعاً نادرست نہیں ۔ (۱)

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔

والسلام ، نیاز کیش ، سید قدرت نقوی

مکتوب مولانا مہر :

(موصولہ ۔ ۔ جنوری ۱۹۶۳ء)

باسمہ سبحانہ

با بندۂ خود این همه سختی نمی شنند
خود را به زور بر تو مگر بسته ایم ما

بھائی ! آپ نے یہ کیا طریقہ اختیار کرلیا ، اور کیوں کر لیا ؟ کیا اسی لیے کہ مجھے اپنی پہلی تحریر پر شرمسار ہونا چاہیے ؟ جس کا انداز یقیناً کچھ اچھا نہ تھا ، اور میں لکھ چکا تو خود احساس ہوا ، مگر دوبارہ لکھنے کی ہمت نہ تھی ۔ اگر مرضیٔ مبارک یہی ہے تو یقین رکھیں میں حد درجہ شرمسار ہوں ۔

کردہ ام توبہ و از کردہ پشیماں شدہ ام
کافرم باز نہ گوئی کہ مسلماں شدہ ام

تاہم میرے نزدیک عرفی کے شعر کا مطلب وہی ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں ۔ آپ معارف ادب اور حقائق ترتیب و نسق کلام میں مہارت تامہ رکھتے ہیں ، اور میں فاعلات فاعلات سے بالکل کورا ہوں ، لیکن اتنا جانتا

۱۔ حافظ کے اس شعر کی نثر اس طرح ہے : در پس آئنہ انچہ استاد ازل گفت همان می گویم کہ مرا طوطی صفت داشتہ اند یعنی استاد ازل آئینے کے پیچھے جو کچھ کہتا ہے وہی کہہ رہا ہوں ، مجھے طوطی کے مانند رکھا ہے ۔ جو لوگ "در پس آئنہ" کو طوطی کے متعلق خیال کرتے ہیں ، وہ یہ نہیں سوچتے کہ طوطی کو پڑھانے کے لیے اسے آئینے کے سامنے رکھتے ہیں اور پڑھانے والا آئینے کے پیچھے بیٹھتا ہے ۔

ہوں کہ عرفی کا مدعا وہی تھا ، جو میں نے عرض کیا ۔ یعنی اس کی غرض یہ تھی کہ فرہاد و مجنوں کے طریق و مشرب کو ٹھکرائے ، اور اپنے لیے اس سے جداگانہ مشرب تجویز کرے۔ فرہاد نے کوہکنی کی یعنی ناخن تیشہ رگ سنگ میں دوڑایا ۔ مجنوں لیلیٰ کے انتظار میں کھڑے کھڑے اس درجہ بے حس ہوگیا کہ زاغ و زغن نے اسے ایک سوکھے ہوئے درخت کا ٹنڈ سمجھ لیا ، اور عام روایت کے مطابق اس کے سر کو آشیاں گہ بنا لیا ۔ عرفی نے ان دونوں مسلکوں کو حقیر جانا۔ فرہاد کا رد کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ناخن تیشہ ، رگ سنگ میں نہ دوڑایا بلکہ :

کوہ غم در تہ پاسودہ بہ جولاں رفتم

باقی رہے حضرت قیس عامری تو فرماتے ہیں کہ ان کی طرح میں نے اپنے سر پر زغن و زاغ کے آشیانے آراستہ نہ ہونے دیے اور :

سر قدم ساختہ در خار مغیلاں رفتم

آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ''مجنوں آں مدر با وحوش و طیور انس گرفتہ بود '' تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مجنوں ان سے پیار کرتا تھا ۔ مطلب صرف یہ ہے کہ رات دن صحرا میں رہتا تھا ۔ اور رات دن ایک جگہ رہنے والے جانوروں کا خاصہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اک گونہ مانوس ہو جاتے ہیں ۔ ورنہ غریب مجنوں کو لیلیٰ کے سوا دنیا کی کسی شے سے سروکار ہی نہ تھا ، یہ سچ ہے کہ ''در عشق لیلیٰ یک قلم بے ہوش بود ، ازاں ہم خبر نہ داشت کہ طائراں بر سر او آشیانہ چیدہ بودند'' ۔

یقیناً مجنوں کی مشہور ترین صفت صحرا نوردی ہی ہے ۔ مگر صحرائی زندگی کا کوئی پہلو اس سے مستثنیٰ نہیں ، مثلاً عشق لیلیٰ میں انہماک کمی کے باعث اس درجہ بے حس ہو جانا کہ جانور اس کے سر پر گھونسلا بنا لیں ۔ عرفی کو یہ مسلک پسند نہیں ۔ وہ سر کو قدم بنا کر خار زار میں دوڑ پڑا ہے ۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ۔ اور یہ تو سراسر افسانے ہیں ، جنہیں ادبیات میں حقائق کی حیثیت دے دی گئی اور ان سے خاص مضامین پیدا کر لیے گئے ۔ ورنہ بے ستوں تو اب بھی موجود ہے اور اسے کبھی کسی نے نہ کاٹا ۔ فرہاد نام کے کسی انجینیر نے کوئی نہر نکالی ہوگی ، اور اس کے لیے کسی قدر کٹائی

بھی کرنی پڑی ہوگی ، مگر وہ کوہکنی نہیں ، جس کے افسانے ہمیں ادبیات میں ملتے ہیں -

اسی طرح مجنوں نے ممکن ہے کسی قدر صحرا گردی کی ہو ، اور نجد جہاں کا وہ رہنے والا تھا ، وہاں صحرا کے سوا ہے بھی کچھ نہیں - مگر ایسی صحرا گردی اور بے حسی و بے ہوشی کہ پرندے سر پر گھونسلے تعمیر کرلیں ، بالکل بے اصل ہے -

بہر حال مفروضات کی بنا پر واضح ہوتی ہے کہ کہ عرفی نے اپنے لیے یہ طریق منظور نہ کیا - آپ غور فرمائیں گے تو امید ہے وہ الجھن باقی نہ رہے گی جو اب تک خدا جانے کس وجہ سے خاطر عاطر میں چلی جا رہی ہے -

مجھے فرصت نہیں تھی مگر آپ کے پاس خاطر سے درفش کاویانی کی ، اور اول ارتنگ کی بحث دیکھی - وہ بہت مختصر ہے - ''برہان قاطع'' کی عبارت بھی سامنے رکھی جائے تو زیادہ سے زیادہ تیرہ سطریں ہیں - خلاصہ یہ کہ برہان قاطع میں مرقوم تھا ، ارتنگ بروزن فرہنگ : نگار خانۂ مانی نقاش باشد و نام بت خانۂ چین ہم است و نام کتابے است کہ اشکال مانی تمام دراں نقش است -

غالب نے اس پر مختلف اعتراضات کیے :

۱- آیا ''نگار خانۂ مانی'' الگ چیز ہے ، اور ''کتابے کہ در آں اشکال مانی نقش است'' دوسری شے ہے ؟

۲- ''برہان قاطع'' میں یہ لفظ مختلف مقامات پرمختلف صورتوں میں آیا ہے ، مثلاً ارتنگ کے بعد ارہنگ (بہ ثائے خبث) ار حنگ ، ار سنگ ، ارغنگ ، ارژنگ - غالب کے نزدیک پہلے چار لفظ بے وجود ہیں -

۳- ارژنگ (بہ زائے فارسی) تین ہوئے ، اول ایک دیو جسے رستم نے مارا تھا ، دوم ایک پہلوان جسے طوس نے قتل کیا ، سوم مانی و بہزاد جیسا ایک نقاش : آخری معنی کے ثبوت میں شیریں خسرو سے نظامی کا یہ شعر پیش کیا ہے :

بہ قصر دولتم مانی و ارژنگ		طراز سحر می بستند بر سنگ

غرض اس سلسلے میں عرفی کے شعر کا کوئی ذکر نہیں - لفظ آشیاں ہے

ہی نہیں - اسی طرح زاغ و زغن بھی نہیں - آخر میں جو فوائد لکھے ہیں (اور درفش کے فوائد میں قاطع برہان کے فوائد سے اضافہ کردیا ہے) وہ بھی سرتاسر دیکھے - کہیں وہ ذکر نہ ملا جس کا آپ حوالہ دے رہے ہیں - آپ نے یہ چیز کہاں دیکھی ؟

اس وقت کام زیادہ ہے اور میں کم فرصت ، اگر آپ اجازت دیں تو میں پوری کتاب چند روز میں دیکھ جاؤں گا جہاں بھی ذکر ملے گا ، عرض کروں گا - اگر کسی دوسری کتاب میں دیکھا ہے تو اس کا حوالہ دیں -

میں آپ کا یہ ارشاد بھی سمجھ نہیں سکا کہ اگر آراستن معنی کے جائیں تو فاعل عرفی نہیں رہا - اس کا مطلب کیا ہے ، اور اس تخصیص کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ " آشیان " جن مصادر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے ، ان میں چیدن ، بستن ، آراستن ، ساختن وغیرہ سب شامل ہیں - یہ ضروری نہیں کہ ہم آراستن یا چیدن کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ کر سوچیں کہ فاعل بدلتا ہے یا نہیں ، میرے نزدیک ساختن کی صورت میں بھی فاعل عرفی ہی رہتا ہے ، اور مطلب ہرگز یہ نہیں کہ عرفی نے گھونسلا آراستہ کیا یا بنایا - اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنے سر کا استعمال برائے آشیانہ چیدن یا آراستن یا ساختن گوارا نہ کیا - چیدن ، آراستن اور ساختن کا عمل تو اصلاً پرندوں ہی کے متعلق رہے گا - عرفی کی فاعلیت اس حد تک ہے کہ اس نے گھونسلا بنانے کے لیے اپنا سر استعمال کیا جانا منظور نہ کیا - یہ بھی نہیں مان جا سکتا کہ اس طرح دو فاعل ہو گئے ، اول پرندے دوم عرفی - عرفی اس اعتبار سے فاعل ہے کہ اس نے پرندوں کو جو آشیاں چیدن پر آمادہ تھے ، ایسا کرنے نہ دیا ، اور سر قدم ساختہ ......

میں نحوی پیچیدگیوں سے آگاہ نہیں ، مگر شعر میرے نزدیک بالکل صاف ہے ، اور اس کے دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے - اگر آپ کوئی قوی اشکال پیش کردیں ، اور وہ درست بھی ثابت ہو جائے تو میں کہوں گا کہ شعر میں نقص رہ گیا ، مگر معنی وہی ہیں ، جو عرض کیے - آشیاں چیدن سے صحرا گردی اور ہرزہ نوردی مراد لینا بلا سند کون قبول کرے گا ؟

یہ بھی عرض کردوں کہ میں فرہنگ نگاروں کی معصومیت کا قائل کبھی نہیں ہوا ، اور پچھلے دنوں اردو فارسی فرہنگیں زیادہ دیکھنے کا موقع ملا تو واضح ہوا کہ ان بزرگوں کو تو زبان سے بھی آگاہی نہیں - نوراللغات

اور آصفیہ میں وہ الفاظ بھی کمتر ملتے ہیں جو غالب کے اردو شعروں آچکے ، اور لازماً اردو ہیں - پھر بیان عموماً ناقص ہوتا ہے ، اور غلط بے شمار - لغت نگاری کا فن میرے نزدیک صرف غالب جانتا تھا ، اس نے قاطع یا درفش کے سوا لکھا کچھ نہیں -

میرا گناہ معاف کیجیے - برادراله لطف و نوازش سے شاد کام رکھیے بے تکلفی میں خواہ کچھ لکھ گیا ، یہی سمجھیے کہ :

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات

میں وہی دیرینہ نیاز مند ہوں ، جس کے لیے نیاز مندی باعث شر ہے - اور خدا گواہ ہے کہ اس کے اعلان عام میں کبھی تامل نہیں ہوا نہ ہوگا - انشاءاللہ - آپ کا ، سہر

مولانا کے اس خط کا جواب میں نے نہیں دیا کیونکہ میرا مقصد صرف " آشیاں چیدن " کے متعلق غالب کی رائے معلوم کرنا تھا - اس کا سراغ نہ ملا - عرفی کے شعر کا مطلب ہر پہلو سے واضح ہو گیا - میں اور مولانا نفس مضمون میں متحدالخیال ہیں - صرف آشیاں چیدن کے معنی میں اختلاف رائے رہا - مولانا نے لغت نویسوں کے متعینہ معنی کو ملحوظ رکھا - میں نے لغت نویسوں کے معنی سے انحراف کیا - یہ ترکیب عرفی کے شعر کے علاوہ اور کہیں نظر سے نہیں گزری ، اس لیے اس کو محاورہ قرار نہیں دیا جاسکتا میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ عرفی نے فعل عبث کے لیے یہ کنایہ اختیار کیا ہے - ہندوستان کے لغت نگاروں کے قیاس کی غلطی ہے کہ انھوں نے ہندی محاورے کی روشنی میں آشیاں چیدن کے معنی گھونسلا بنانا لکھ دیے - چنانچہ مولف فرہنگ نظام نے صرف آشیانہ گزاشتن بمعنی آشیاں ساختن لکھے ہیں اور چیدن کے صرف دو معنی لکھے ہیں :

۱- با ترتیب نہادن مثل چیدن غذا برسفرہ - ۲- جدا کردن جز را از کل مثل جدا کردن میوہ از درخت -

ہندوستان کی زبانوں میں " چننا " انھی معنی میں مستعمل ہے -

کیونکہ مکان بنانے میں اینٹوں کو قرینے اور ترتیب سے رکھتے ہیں ، اس لیے دیوار چننا اور گاہ گاہ مکان چننا بھی استعمال ہوتا ہے ، اسی کے پیش نظر آشیاں چیدن کے معنی آشیانہ بنانا لے لیے گئے ۔ تنہا عرفی کا استعمال اس بات پر بھی مبنی ہو سکتا ہے کہ اس نے ہندی محاورے کی تقلید میں یہ استعمال کیا ہو لیکن اور اہل زبان آشیاں چیدن بمعنی آشیاں ساختن استعمال نہیں کرتے ۔ اور اسی وجہ سے غالب نے گھونسلا بنانا معنی سے اختلاف کیا ہے ، جس کا حوالہ میں اپنے خط میں دے چکا ہوں ۔ عرفی کے شعر کا مطلب شرح نویسوں نے اس روایت کے پیش نظر لکھا کہ مجنوں لیلیٰ کے انتظار میں بے حس و حرکت صحرا میں کھڑا رہا اور پرندوں نے اس کے سر پر گھونسلا بنالیا ، اور اس نے پر بنانے مدہوشی ان کو نہیں بھگایا ۔ میں اس روایت سے انکار نہیں کرتا ، لیکن اس شعر میں اس کی تطبیق درست نہیں سمجھتا ، اور آشیاں چیدن کو محاورہ نہیں بلکہ ترکیب خیال کرتا ہوں ۔ جس میں چیدن کے دونوں لغوی معنی سے مفہوم واضح ہو سکتا ہے ۔ یعنی چیل کووں کے آشیانے میں نے اپنے سر پر ترتیب سے نہیں رکھے یعنی ان کو درختوں سے اتار کر جمع نہیں کیا ، اور اس سے کنایہ فعل عبث قرار پاتا ہے ۔ مشاہدہ شاہد ہے کہ دیوانے فضول اور بیکار چیزیں جمع کرتے پھرتے ہیں ، مجنوں بھی فعل عبث کرتا رہا ، اس نے صحرا نوردی میں کوئی مہتم بالشان کام انجام نہیں دیا ، چیل کووں کے گھونسلے جمع کیے ۔ میں اس کی صحرا نوردی کو اہمیت دیتا ہوں ۔

میرے مقصد کی حد تک مولانا کی رائے کافی تھی ، اور منزل ہنوز روز اول کے مصداق تھی ، اس لیے مولانا کو مزید زحمت دینا مجھے پسند نہ ہوا ، اور اپنے مقصد کی جستجو میں مولانا عرشی کو لکھا ، کہ وہ "آشیاں چیدن" کے متعلق غالب کی رائے معلوم ہو تو لکھیں ۔ یہ خط اور مولانا کا جواب آپ ملاحظہ فرمائیں گے ۔

میں نے مولانا مہر کو خط نہیں لکھا تھا ۔ کچھ تکلیف اور کچھ مصروفیت ساتھ رہی ۔ مولانا کی شفقت و عنایت میں فرق نہ آیا ۔ "ماہ نو" فروری ۱۹۶۳ء میں میرا مضمون "غالب کا اعتذار" چھپا ۔ مولانا نے ملاحظہ فرمانے ہی خط لکھا ۔

مکتوب مولانا مہر :

(موصولہ ۲۰ فروری ۱۹۶۴ء)　　باسمہ سبحانہ

بھائی ! آپ نے تازہ مضمون میں ایک جگہ :

اسد اللہ خاں غالب مرد

کا حوالہ دیا ہے ، اور فرمایا ہے کہ حالی نے غالب کی یہ آرزو پوری کردی - لاریب حالی کے مرثیے میں ایک بند کی ٹیپ یہ شعر بھی ہے - یہ تقاضا بہ طریق احسن مجروح نے پورا کیا - اس کے دس بند کے مرثیے میں ہر بند کی ٹیپ یہی ہے :

رشک عرفی و فخر طالب مرد　　اسد اللہ خاں غالب مرد

یہ اعتراض نہیں ، صرف اخبار و اطلاع ہے - غالب نے ترکیب بند اور ترجیع بند کی تفریق نہیں کی تھی ، لیکن مقصود ترجیع بند ہی تھا - یہ آرزو صرف مجروح نے پوری کی - اگرچہ میرے نزدیک مجروح کا مرثیہ حالی کے مرثیے کے برابر نہیں -

آپ کے مضمون کا آخری شعر یقیناً غلط چھپا - آخری مصرع یوں ہے :

کوہے معارض پر کاہے گرفتہ ایم

آپ کے مضمون سے خوش وقت ہوا - پرچہ کل ملا تھا - آج دوپہر کو پڑھنے کی فرصت مل سکی - اللہ کرے زور قلم اور زیادہ - تصویر بھی دیکھی ، گویا آپ کو دور سے ایک نظر دیکھ لیا - انکھیں بند کیں اور آپ کا تصور ذہن میں تازہ ہوگیا - یہ سب دل کو بہلانے کے بہانے ہی سہی ، مگر دل تھوڑی دیر کے لیے ضرور بہل گیا - اگرچہ تصویر میں صرف مشابہت ہے ، گویائی نہیں ، شنوائی نہیں - نہ دل کی باتیں انسان سن سکے اور نہ اپنے دکھ سنا سکے - امید ہے کہ آپ بخیر ہوں - کیا میرے گزشتہ خط کے بعد پھر رنجش کا دور شروع ہوگیا :

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

و السلام

آپ کا ، مہر

بنام مولانا مہر :

۲۰ فروری ۱۹۶۴ء

قبلہ ، آداب !

یہ عاجز و خاکسار ، پر تقصیر و شرمسار ، عرض پرداز ہے کہ :

ضعف و تکلیف سے تھی خط و کتابت متروک

موسم کی خرابی ، کچھ نہ پوچھیے ! ملتان کی تاریخ میں ایسا پالا کب پڑا تھا ؟ امسال سردی میں وطن متروک (میرٹھ) یاد آگیا۔ ماہ صیام ، روزے چھوڑنے ہوئے دل کڑھا ۔ اوقات خور و نوش میں خلل واقع ہوا ۔ میں تبخیر معدہ کا مریض ، سارا دن ، خالی پیٹ بسر ہوتا ، شام کو تھوڑا کھاتا ، مگر پھر بھی تبخیر کا حملہ ہو جاتا ۔ سردی کی شدت اس پر مستزاد ۔ موئے پر سو درے ، ۲۸ رمضان کو نزلے اور زکام کا سخت حملہ ہوا ۔ اب تک طبیعت نہ سنبھل سکی ۔ داڑھ میں تکلیف ، نزلے کا ایک اور انعام پانچ دن سے ملا ہوا ہے ۔ عرض انھی مکروہات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جناب کی خدمت میں عریضہ ارسال نہ کر سکا ۔ آپ کی بزرگانہ محبت نے اس تاخیر کو رنجش پر محمول فرمالیا ۔ حاشا و کلا ! میں اور آپ سے رنجیدہ ؟ میں تو :

کافر عشقم ندانم جز خلوص و ارتباط
شیوہ ہائے زندگیم اصل ایمان منست

آپ کا ہر خط میرے ذوق کو دعوت دیتا رہا ، اور یہ آپ ہی کی کرامت ہے کہ اس تازہ خط و کتابت میں چند فارسی کے شعر برجستہ ہو گئے ، اور ایسا اتفاق کم ہوتا ہے ۔ (۱)

" ترکیب بند " کیوں کہ غالب نے لکھا تھا ، اس لیے میں نے بھی اسی کو برقرار رکھا ، اور ذہن میں بھی حالی کا ترکیب بند ہی تھا ۔ دیوان تو ہے نہیں کہ نکال کر دیکھتا ۔ مدت ہوئی جب دیکھا تھا ۔ ذہن

۱۔ سابقہ خطوط میں جتنے فارسی شعر میں نے لکھے ہیں ، وہ سب میں نے فی البدیہہ کہے تھے ۔

میں پہلا بند تھا ، اور غالباً اس میں ٹیپ کا یہی شعر ہے ، اس لیے حالی حوالہ دے دیا ۔ مجروح کا دیوان بھی نہیں ۔ البتہ سال گزشتہ ''ماہ نو'' میں مجر کا مرثیہ چھپا تھا ۔ مگر وہ حالی کے مرثیے کے برابر نہیں ، اور وقت تح میرے ذہن میں بھی نہیں تھا ، اس لیے اس کا ذکر نہیں آسکا ۔ مجھے اپ بیان میں واقعی ترجیع بند لکھنا چاہیے تھا ۔

آخری شعر کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ، مجھے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ۔ آخری مصرع آپ کے نزدیک یوں ہے :

کوہے معارض پر کا ہے گرفتہ ایم

مصرع مطبوع '' کوہے معارض و برکاهش گرفتہ ایم '' ہے ۔ اس میں واو عاطفہ یقیناً بے جا ہے مگر '' کا ہے '' کی جگہ '' کاهش '' غلط نہیں ہے کیوں کہ غزل کا قافیہ ہی کاهش ، راهش ، چاهش ، آهش ہے ۔ اس ک ایک شعر ہے :

دل با حریف ساختہ و ما ز سادگی
ہر مدعائے خویش ، گواهش گرفتہ ایم

لیجیے ایک اور شعر یاد آگیا :

در عرض شوق ، صرفہ نبردیم در وصال
در شکوہ ہائے حواہ خواهش گرفتہ ایم

واو عاطفہ کا معاملہ یہ ہے کہ میں نے اس میں تصرف کیا تھا ۔ '' کوہے مصائب و برکاهش گرفتہ ایم '' ۔ اور یہ تصرف نفس مضمون سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے تھا ۔ یعنی غالب پر جو کچھ گزری تھی وہ کل بیان نہیں کی ، صرف تھوڑی سی حالت بیان کر دی گئی ہے ۔ مدیر ''ماہ نو'' کو لکھ دیا تھا کہ میں نے یہ تصرف کیا ہے ۔ مناسب سمجھیں تو رہنے دیں ، ورنہ ''مصائب'' کی جگہ اصل '' معارض '' بنا دیں ۔ انھوں نے '' معارض '' بنا دیا اور واو عاطفہ کا خیال نہ کیا ۔ پھر کاتب نے '' پر '' پر ایک ضمہ ملموم کا اضافہ کر کے غلط در غلط کی نادر مثال قائم کردی ۔ بہر حال آپ کی عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔

مضمون کی داد آپ نہ دیں گے تو کون دے گا ؟ میری محنت بارآور

ہوئی - اس اعتذار کو سب خط سمجھتے رہے - نفس مضمون کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا -

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا

والسلام

نیاز کیش ، سید قدرت نقوی

مکتوب مولانا مہر :

۲۴ - فروری ۱۹۶۴ء

باسمہ سبحانہ

برادر مکرم ! " پرکاہش " بالکل درست ہے - کیا میں " پر کاہے " لکھ گیا تھا ؟ - یہ بقول غالب سہو طبیعت تھا ، ورنہ غزل کے قافیے میں تبدل کا کونسا موقع تھا ؟ آپ نے مضمون میں ساری ضروری چیزیں جمع کردیں ، بہت اچھا کیا - اعتذار کا لفظ میرے لیے بھی بادی النظر میں غلط فہمی کا موجب بنا تھا ، لیکن میں نے پورا مضمون دیکھا کیوں کہ اعتذار کئی صفحات پر نہیں پھیل سکتا تھا - والسلام -

مہر

بھائی ! رات خط ڈاک میں نہ ڈالا جاسکا - صبح نماز کے بعد یہی شعر خیال میں آ گیا ہے - اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں ، صحیح وہی ہے جو آپ نے لکھا تھا یعنی " کوہ معارض و پرکاہش گرفتہ ایم " پہلا مصرع اسی کا موید ہے - البتہ " پر کاہے " ہوتا تو میری قرأت درست ہوتی -

بنام مولانا مہر :

۲۶ - فروری ۱۹۶۴ء

یکم - مارچ ۱۹۶۴ء

قبلہ ، آداب !

طبیعت تاحال بحال نہیں ہوئی ، وہی عالم ہے - آپ نے بجا ارشاد فرمایا ، صرف اعتذار اتنے صفحات پر نہ پھیل سکتا تھا - دو تین سال ہوئے جب خطوط پر کام کر رہا تھا ، اسی زمانے میں اعتذار پر کچھ تحقیقی اشارے

لکھ دیے تھے - "ماہ نو" کا تقاضا ہوا تو اتفاق سے وہ کاغذ ہاتھ میں آ گیا - انھی اشارات کو سامنے رکھ کر مضمون لکھا تو کچھ بھی نہ ہوا - وقت میں گنجائش نہ تھی - اسی کو نیا آہنگ اور نیا انداز دینا پڑا - تحقیق و تخلیق دونوں کو ملا دیا - مضمون نہایت جامع ہو گیا - یہاں گورنمنٹ کالج ملتان کی بزم اقبال نے یوم غالب منایا تھا - مجھ سے بڑی فرمائش کی گئی نہ کچھ پڑھوں - میں نے یہی مضمون وہاں پیش کر دیا - مگر اس کو مختصر کر لیا تھا - یعنی استدلال کا تحقیقی حصہ نکال دیا تھا - اور " غالب کے آخری ایام " سنوا ن دے دیا تھا - ایک دن قبل جناب کا گرامی نامہ مل چکا تھا - آپ کی داد نے مضمون کی اہمیت بڑھا دی تھی - ....

مصرع آخر کی کیفیت بالتفصیل پہلے لکھ چکا ہوں - اب کلیات نظم غالب کو نکال کر دیکھا تو اس میں بھی مصرع اس طرح ہے :

" کو ہے معارض بر کاہش گرفتہ ایم "

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا - والسلام

نیاز کیش ، سید قدرت نقوی

(۱۳) مکتوب مولانا مہر :

۳ - مارچ ۱۹۶۳ء

باسمہ سبحانہ

بھائی ! شکریہ - دیکھیے اگر " کاہش " نہ ہوتا تو وہی خواندگی ٹھیک تھی جو میں نے پہلے عرض کی تھی - لیکن اس "شین" نے معاملہ بگاڑ دیا - اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ " و " قبول کی جائے - مصرع یوں ہی صحیح ہوگا :

کو ہے معارض و پر کاہش گرفتہ ایم

اس کا پہلا مصرع ہے :

حرفے مزن ز غالب و رنج گران او

یعنی رنج گران ایک پہاڑ ہے ، جس سے مقابلہ آپڑا ہے ، اور خود غالب پر کاہ کی حیثیت رکھتا ہے - " شین " غالب کی طرف جائے گا تو " و " کے

بغیر چارہ نہیں ، ورنہ شعر غلط ہو جائے گا ۔ اس سے کیا بحث کہ کنایات میں کیا ہے ؟ "پر کاہے" سے وہ مطلب نہ نکلے گا ، جو نکلنا چاہیے ۔ "کاہش" ہی سے نکلے گا ، اور "شین" غالب کے لیے ہے ۔

امید ہے آپ بخیر ہوں ۔

کیا آپ نے آغا حسین صاحب ارسطو جاہی سے کہا تھا کہ غالب کے مکاتیب میں کہیں مفتی صدر الدین آزردہ کے جگراؤں جانے کا ذکر ہے ؟ میری نظر سے تو آج تک ایسا کوئی مکتوب نہیں گزرا ۔ اگر آپ کو علم ہو تو اس کا حوالہ دیجیے ۔

مہر

بنام مولانا مہر :

۱۸ - ۲۳ اپریل ۱۹۶۳ء

قبلہ ، آداب !

۳ ۔ مارچ کے گرامی نامے کا جواب ۶ ۔ مارچ ہی کو لکھا تھا ، لیکن وہ بھیجنا بھول گیا ۔ کچھ ایسے مشاغل میں گرفتار ہوا کہ لکھنا پڑھنا یکسر چھوٹ گیا ۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم نہ رہ سکا ۔ آج کچھ دیر کے لیے فراغت نصیب ہوئی تو ڈاک کا انبار اٹھایا ۔ خطوط کے جوابات لکھنے بیٹھا ۔ ان میں وہ خط بھی اس وقت سامنے آگیا ۔ دیکھ کر حیران اور نادم ہوا کہ یہ کیسی بھول ہوئی !

جناب والا نے غالب کے شعر کے متعلق اظہار خیال فرمایا تھا :

حرفے مزن ز غالب و رنج گراں او
کوشہ معارض و پر کاہش گرفتہ ایم

شعر میں معارض کے بعد "واؤ" ہونا چاہیے ورنہ حسن کے بغیر یہ شعر غلط ہو گا۔ آپ نے مجھے مذبذب میں مبتلا کر دیا ۔ میں حیران ہوں کہ کیا لکھوں ؟ اور کیوں نہ لکھوں ؟ شعر کی قرات میرے نزدیک صحیح اور ہے ، اور آپ نے کچھ اور متعین فرما دی ہے ۔ اب میرے تذبذب ... اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اپنے ذہن کی کوتاہی اور فکر کی کوتاہ اندیشی

آپ کے سامنے پیش کروں ۔ اگر آپ توثیق فرمادیں تو ناز کروں ، ورنہ توہمات بے جا سے خود کو نجات دلاؤں ۔ اب شعر کی قرآت کی دو نوعیں ہوئیں ۔ ایک ''واو'' کے ساتھ ایک بغیر ''واو'' کسرۂ اضافی کے ساتھ ۔ دونوں کے متعلق میری رائے یہ ہے :

حرفے مزن ز غالب و رنج گران او
کوہے معارض پر کاہش گرفتہ ایم

کسرۂ اضافی کے ساتھ نثر اس طرح ہوگی :

'' از غالب و رنج گران او حرفے مزن ، معارض آن پر کاہ ، کو گرفتہ ایم '' ۔

یعنی غالب اور اس کے رنج گراں کی بات نہ کر ہم نے اس پر (غالب) کے مد مقابل ایک پہاڑ (رنج گراں) قرار دیا ہے ۔ لف و نشر غیر مرتب ہے ۔ غالب کو ''پرکاہ'' اور رنج گراں کو ''کوہ'' کہا گیا ہے اور شین کا مرجع '' پر کاہ '' ہے ۔ غالب کو اس کے مانند قرار دیا گیا ہے معہود ذہنی غالب ہے ۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ غالب اور اس کے رنج گراں کا مقابلہ گویا ایک پہاڑ کے مقابل گھاس کا تنکا ہے اور :

حرفے مزن ز غالب و رنج گران او
کوہے معارض و پر کاہش گرفتہ ایم

'' واو '' کے ساتھ شعر کی نثر اس طرح ہوگی :

'' از غالب و رنج گران او حرفے مزن ، کوہے معارض بود و آن ر پر کاہ گرفتہ ایم '' ۔

یعنی غالب اور اس کے رنج گراں کی بات نہ کر ، ایک پہاڑ مد مقابل تھا اور ہم نے اس کو پرکاہ خیال کیا ہے ۔ واؤ آجانے سے معنی میں کس قدر تبدیلی واقع ہو گئی ہے ؟ اور ش کا مرجع کوہ بن گیا ہے اور '' پر کاہ '' کو کی صفت قرار پاتا ہے ۔ واؤ تب درست ہوتا جب شعر میں معارض کی جگہ کوئی لفظ ، مثل مصائب ، درد ، رنج و غم وغیرہ ہوتا ۔ اور ایسی صورت میں بھی میرے خیال میں یائے وحدانیت نہیں آتی ، کیوں کہ یہ مرکب اضافی بنتا ہے اور مضاف پر یائے وحدانیت و تنکیر داخل نہیں ہوتی بلکہ کسرۂ اضافی آیا کرتا

ہے ، مضاف الیہ پر البتہ داخل ہو سکتی ہے۔ نیز '' واؤ '' کے آنے سے رنج گراں میں تخفیف پیدا ہو جاتی ہے کہ رنج گراں پہاڑ کے مانند تھا اور ہم نے اس کو پرکاہ خیال کر لیا ہے۔ یقیناً غالب کا مقصود یہ نہ تھا ۔ غالب رنج گراں اور اپنا مقابلہ کر رہا ہے ، اور تمثیل میں کوہ و پرکاہ لا رہا ہے ۔ جناب والا معارض کی جگہ '' مقابل '' پڑھ کر غور فرمایے گا تو میری حقیر رائے کو صائب پایے گا ۔ پس میرے نزدیک معارض کے بعد واؤ نہیں ہے ، بلکہ کسرہ اضافی ہے ۔ یعنی '' معارض آں پرکاہ یک کوہ گرفتہ ایم '' اور غالب نے یقیناً یہی بات کہی ہے ۔

قبلہ ! میں نے شعر میں تصرف کیا تھا :

حرفے مزن ز غالب و رنج گران او	کوہ مصائب و پرکاهش گرفتہ ایم

اس سے مقصود یہی تھا کہ غالب اور اس کے رنج گراں کی بات نہ کر مصیبتوں کا پہاڑ تھا اور اس میں سے ہم نے گھاس کے تنکے کے مانند یعنی بہت تھوڑا سا لے لیا ہے ۔ میرے تصرف کے مقابلے میں غالب کے اصل مصرع کو ملاحظہ فرمایے تو ظاہر ہوگا کہ وہ رنج گراں کو پہاڑ بتا رہا ہے اور خود کو پرکاہ ۔ اور میں نے رنج گراں کو پہاڑ اور اس میں سے کچھ حصے کو پرکاہ بتایا ہے ۔

ارسطو جاہی صاحب سے میں نے کیا کہا تھا ؟ یہ تو یاد نہیں ، چار پانچ سال پہلے کی بات ہے ۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ غالب کے کئی خطوط میں جگراؤں اور مولوی رجب علی کا ذکر ضرور ہے اور غدر کے بعد کسی صاحب کے قیام ہی کے متعلق ہے ۔ مفتی صاحب کے متعلق بالیقین تو کچھ نہیں سکتا کہ غالب نے جگراؤں میں ان ہی کے قیام کے متعلق لکھا ہے ، لیکن اتنا یاد ہے کہ مفتی صاحب کے قیام لاہور کا ذکر کئی خطوط میں ہے ۔ وقت فرصت نشاندہی کر سکوں گا ۔

میرے چھوٹے بھائی کی شادی ۱۷ ، ۱۸ ذی الحجہ کو ہو رہی ہے ۔ ۱۷ کو برات ملتان سے احمد پور سیال ضلع جھنگ جائے گی ، ۱۸ کو واپسی اور ۲۰ ذی الحجہ کو دعوت ولیمہ ہے ۔ آپ کی شمولیت باعث صد افتخار ہوگی ۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔

والسلام

نیاز کیش ، سید قدرت نقوی

مسلم ٹاؤن ، لاہور
۲۸ - اپریل ۱۹۶۰ء

باسمہ سبحانہ

بھائی : آپ صاحب فن اور حقائق زبان کے ماہر ہیں اور میں بقول مولانا روم :

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

میرا تاثر یہ ہے کہ شِں کی ضمیر غالب کی طرف جاتی ہے ۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا :

غالب اور اس کے رنج گراں کے بارے میں کچھ نہ کہو ، ایک پہاڑ مقابلے پر کھڑا ہے ، اور سامنے غالب کی حیثیت پرکاہ کی ہے ۔ رنج چونکہ گراں تھا ، اس لیے اسے پہاڑ قرار دیا اور اپنی حیثیت پرکاہ کی رکھی ۔ اس صورت میں میرے نزدیک " و " ضروری ہے ۔ اگر شعر یوں ہوتا :

کوہے معارض پر کاہے نوشتہ ایم

تو " و " ضروری نہ تھی ۔ میرے پاس وقت بھی نہ تھا ، اور معاملے کو الجھانا بھی گوارا نہ تھا ۔ رات کے آٹھ بجے یہ چند الفاظ لکھ رہا ہوں ۔ دونوں صورتوں پر غور فرمائیں ۔ مجھے یقین ہے " پرکاهش " کے ساتھ " و " ہونی چاہیے ۔ اگر آپ کے نزدیک ضروری نہیں ، بلکہ مخل معنی ہے تو مضائقہ نہیں ۔ اپنی رائے پر قائم رہیے ۔ میرا ذوق شعر ابھی آپ کی ہم نوائی کے لیے آمادہ نہیں ۔ اسے مہلت دیجیے کہ سوچتا رہے ، اور جب ہم نوا بن جائے تو آپ کو فوراً اطلاع دے دی جائے گی ۔

نشتر صاحب صبح کے وقت آتے ہیں ۔ آج یاد نہ رہا ، ان سے کل پوچھوں گا ، اور آپ کو اطلاع دوں گا ۔

بھائی ! دعوت کا دلی شکریہ ۔ لیکن اس جسم گداز اور عافیت سوز گرمی میں کہاں نکل سکتا ہوں؟ آپ کی دعوت نے دل خوش کر دیا ۔ مجھے شرکت سے جتنی خوشی ہوتی ، محض دعوت ہی سے اتنی خوشی حاصل ہوئی ۔ کیا یہ شرف کم ہے کہ عزیز از جان دوست کی یاد میں ہوں ، اور ہر تقریب خاص پر مجھے دعوت شرکت سے مشرف فرمایا جاتا ہے ۔　　والسلام　　مہر

یہ خط رات ڈاک کے حوالے نہ ہو سکا ۔ صبح نشتر صاحب آئے ۔ میں نے ان سے پوچھا ، اور تین صورتیں پیش کیں ۔

کوہے معارض و پرکاهش گرفته ایم
کوہے معارض پرکاهش گرفته ایم
کوہے معارض و پر کا ہے گرفته ایم

ان کے نزدیک پہلی صورت واضح ہے ۔ دوسری ٹھیک نہیں ۔ اور تیسری درست ہے ۔ یہ میں نے اپنی بات کا وزن بڑھانے کے لیے نہیں کہا ۔ حاشا وکلا ! صرف اتنا کہ شعر کی معنویت واضح کی جائے تو وہی صورت درست معلوم ہوتی ہے جو میں نے پیش کی ۔

بہرحال آپ میری رائے کی پابندی کیوں کریں ۔ میں اپنی ہی تعبیر کو اب تک صحیح سمجھتا ہوں ۔ جگرکاؤں اور مفتی آزردہ مرحوم کا ذکر آپ نے فارسی خطوط میں دیکھا تھا یا اردو میں ؟ لکھیے بتائیے ۔ میں حقیقت جاننے کے لیے مضطرب ہوں ۔　　　والسلام　　　مہر

(مولانا کے مندرجہ بالا خط کا جواب ۷ مئی کو لکھا تھا ، مگر کثرت کار کی وجہ سے ڈاک میں نہیں ڈالا ، پھر ۲۰ ۔ مئی کو مکمل کیا ۔ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ درج ذیل خط مولانا کی خدمت میں بھیجا تھا یا نہیں ، کیونکہ مولانا کا جواب خطوط میں موجود نہیں ، اور میرے ۳ ۔ جون کے خط سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ خط ڈاک میں نہیں ڈالا گیا ۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ اب اس شعر کے سلسلے میں جانبین کی طرف سے اعادۂ تکرار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو رہا تھا ۔ مولانا کا ذوق شعر " واو " عاطفہ کو قبول کرتا تھا اور میں اس کو مخل معنی خیال کرتا ہوں ۔ چنانچہ درج ذیل خط میں بھی اس کا اظہار ہے ۔ میں نے مولانا عرشی کو زحمت دی کہ وہ مخطوطات سے دیکھ کر صحیح قرأت تحریر فرمائیں ، نیز بلحاظ مضمون کیا میری رائے درست ہے ؟ یہ خطوط میں آگے ملاحظہ فرمایئے ۔)

بنام مولانا مہر :

۱۷ ۔ ۲۰ مئی ۱۹۶۳ء

قبلہ ، آداب !

گرامی نامہ باعث صد افتخار ہوا ۔ آپ نے مجھ ہیچمدان کو " صاحب

فن اور حقائق زبان کا ماہر'' قرار دیا ہے۔ اس عنایت پر مجھ کو فخر و ناز ہے۔ مگر در حقیقت یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے، ورنہ میں تو خود کو ہیچ گردانتا ہوں۔ اس میں کسر نفسی کو قطعاً دخل نہیں۔ ایک ذوق سلیم خداوند عالم نے کرامت کیا ہے، جس کی رہنمائی میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کر لیتا ہوں۔ آپ سے تو بالکل استفادے کی نوعیت ہے، جو بات سمجھ میں نہ آئی، یا جس بات میں تذبذب ہوا، آپ کو لکھ دیا۔ آپ مہربانی فرماتے ہیں، نوازتے ہیں، اور جواب عطا فرماتے ہیں۔ کج بحثی کبھی میرا مسلک نہیں رہا۔ جب دیکھتا ہوں کہ میرے ذوق کی تسلی ہو گئی، یا نہیں ہو سکتی تو مسئلے کو ختم کر دیتا ہوں۔

آپ نے اور نشتر صاحب نے مصرع کی قراءت کے یہ تین پہلو قرار دیے ہیں:

کوہے معارض و پرکاہش گرفتہ ایم
کوہے معارض پرکاہش گرفتہ ایم
کوہے معارض پر کاہے گرفتہ ایم

اول کو واضح، ثانی کو نادرست اور ثالث کو درست لکھا ہے۔ مجھے اب صرف یہ عرض کرنا ہے کہ شکل ثالث میں '' پرکاہے '' کی یائے وحدت کی جگہ شین ضمیر کا لے آنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اور ش کا مرجع پرکاہ یا غالب دونوں ہی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ '' کوہے معارض و پرکاہش گرفتہ ایم '' میں آپ واؤ کو غالباً اس لیے جائز قرار دیتے ہیں کہ آپ کے نزدیک مفہوم مصرع ثانی یہ ہے کہ ایک پہاڑ مقابل تھا اور ہم نے اس (غالب) کو پرکاہ خیال کر لیا ہے۔ اس طرح ش کا مرجع غالب کو قرار دے دیا ہے۔ مگر گزارش یہ ہے کہ واؤ کی موجودگی میں صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ ایک پہاڑ مقابل تھا، اور ہم نے اس کو پرکاہ قرار دے دیا ہے۔ ش کا مرجع کوہ ہوگا۔ کسرۂ اضافی کی صورت اس لیے بہتر ہے کہ اس طرح مفہوم یہ متعین ہوتا ہے کہ اس گھاس کے تنکے یعنی غالب کا مد مقابل ایک پہاڑ قرار دے لیا ہے۔ یہ واضح اور صاف شکل ہے۔ اس کو ایک اور طرح ملاحظہ فرمایے کہ '' کوہے '' کو ابتدا میں نہ لایے بلکہ پرکاہ کے بعد لایے۔ پھر دیکھیے کہ واؤ کی گنجائش رہتی ہے یا نہیں۔ یعنی معارض پرکاہ کوہے گرفتہ ایم۔ واؤ کی موجودگی میں ش کا مرجع غالب کو قرار دینے میں توجیہات کا سہارا

لینا پڑتا ہے ، کسرہ اضافی میں نہیں - واؤ کے ساتھ صفت لف و نشر برقرار نہیں رہتی ، اور کسرہ اضافی کے ساتھ رہتی ہے - صفت کا ہونا خوبی ہے ، اس لیے میرا ذوق شعری کسرہ اضافی کا موید ہے -

اپنی ترمیم کے متعلق پہلے لکھ چکا ہوں - ماہ نو کے کار پردازان نے جو غلطی کی تھی ، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے '' پرکاهش '' میں '' کاهش '' کو حاصل مصدر از کاستن خیال کیا ، جس کے مرادی معنی تکلیف بھی آتے ہیں ، اور '' پر '' کو سابقہ '' پُر '' خیال کر کے پیش لگادیا - '' پُر کاهش '' کے معنی تکالیف سے معمور قرار دے لیے - حالانکہ ان حضرات نے غور نہیں فرمایا کہ اس قسم کے سوابق پر کسرہ داخل نہیں ہوا کرتا - ''پُر کاهش'' کو کوئی قبول نہیں کرے گا - ''پُر کاهش'' ہو سکتا ہے ، مگر وزن کی وجہ سے کسرہ لگائے بغیر نہیں بنتا ، لیکن واؤ برقرار رکھنے کی وجہ بھی قرار پاتی ہے کہ انہوں نے شعر کا مفہوم یہ متعین کیا کہ غالب اور اس کے رنج گراں کی بات نہ کرو ایک پہاڑ مد مقابل ہے ، اور حس کو تکالیف سے معمور ہم نے قرار دے لیا ہے - اسی غلط فہمی کی بنا پر ان لوگوں نے میری ترمیم کو قبول نہ کیا نہ لفظ مصاحب لانے کی ضرورت نہیں جب کہ '' کاهش '' بمعنی تکلیف موجود ہے - دیگر قباحتوں پر غور نہ فرمایا -

اگر معارض کے بعد واؤ لایا جائے تو ایک جملہ معارض پر ختم ہونا ضروری ہے - یعنی '' کوہ معارض است یا بود '' اب واؤ عاطفہ آ کر جملہ اول کی توصیف کرے گا ، اور بیان مابعد کو جملہ اول ہی سے متعلق قرار دے گا - اس لیے وہ مقصد کہ پرکاہ غالب نے اپنے لیے استعمال کیا ہے ، پورا نہیں ہوتا - وہ کسرہ اضافی ہی سے پورا ہوتا ہے کہ کوہ ، پرکاہ کا مدمقابل ہے - رنج گراں کا غالب سے مقابلہ ہے - (۷ - مئی)

آج کل یہاں ایم - اے کے طلبہ اور پروفیسر صاحبان میں علامہ اقبال کے متعلق بحث ہو رہی ہے - ضمناً ان کی زندگی کے بعض مخفی پہلو بھی زیر بحث آگئے - ان میں سے ایک شراب نوشی ہے - میں نے یہ کہہ دیا ہے کہ اول تو ہمیں تذکروں وغیرہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں ملتا - دوسرے یہ کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے کچھ مدت تک شراب پی بھی تھی تو اس سے ان کی عظمت و برتری پر کوئی حرف نہیں آتا - ایک صاحب نے شراب نوشی کے متعلق بتایا کہ انہوں نے کسی تذکرے میں پڑھا ہے - لاہور میں کئی

معمر حضرات لیے بھی یہ بات سنی تھی ، اس لیے وہ صاحب بالوثوق شراب خوار بتلاتے ہیں ۔ کیا یہ سچ ہے ؟ میں تو سن کر حیران ہوں ۔ کیونکہ جناب والا کو علامہ کی صحبت حاصل رہی ہے ، آپ سے بہتر کون حقیقت کا اظہار کر سکتا ہے ؟

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔

والسلام

نیاز کیش ، سید قدرت نقوی

بنام مولانا امتیاز علی خاں عرشی :

۲۵ - مئی ۱۹٦۷ء

قبلہ ، آداب !

مدت ہوئی کہ ایک خط میں آپ نے اپنی ضعیفی کا ذکر فرمایا تھا۔ اس کے بعد مجھے آپ کو زحمت دیتے ہوئے شرم محسوس ہوئی ، اور میں بعض مشکلات میں بھی آپ سے استفادے کی جرأت نہ کر سکا ۔ لیکن اب :

بات بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے

آپ کی مدد کے بغیر میرا کام نہیں چلتا نظر آرہا ۔ اس لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں ۔

ماہ نو فروری ۱۹٦٤ء میں میرا مضمون " غالب کا اعتذار " شائع ہوا ۔ مولانا مہر نے اس کی تعریف فرمائی ، اور آخری شعر کی طرف میری توجہ مبذول کرائی کہ غلط چھپا ہے ۔ میں نے جواب میں لکھا کہ شعر واقعی غلط چھپا ہے کیونکہ میں نے اس میں تصرف کیا تھا اور مدیر 'ماہ نو' کو لکھ دیا تھا کہ اگر وہ میرے تصرف سے متفق نہ ہوں تو اصل شعر لکھ دیں ۔ انہوں نے غالباً اصل شعر لکھا ، لیکن اہل دفتر نے اصل کو بھی بگاڑ دیا ۔ غالب کا شعر ہے :

حرفے مزن ز غالب و رنج گران او
کو ہم بعارض تو کاہش گرفتہ ایم

مگر چھپا ہے :

حرفے مزن ز غالب و رنج گران او
کو ہے مصائب و پُر کاہش گرفتہ ایم

گویا میں نے معارض کی جگہ مصائب بنا کر واؤ عاطفہ کا اضافہ کردیا تھا ۔ میرا مطلب یہ تھا کہ مصیبتوں کا پہاڑ تھا ، اور اس میں سے ہم نے تھوڑا سا لے لیا ہے ، (مدیر موصوف) نے مصائب کی جگہ معارض بنا دیا ، واؤ عاطفہ رہنے دیا ۔ اهل دفتر نے کاهش میں ش ضمیر کا نہ سمجھا ، بلکہ کاهش کو حاصل مصدر (کاهِش) خیال کر لیا ، اور ''پر'' کو سابقہ قرار دے کر ضمہ لگادیا ۔ '' پُر کاهش'' تکلیف سے بھرا ہوا معنی سمجھ لیے ۔

میں نے مولانا مہر کو تمام حقیقت لکھ کر ، یہ لکھا کہ واؤ عاطفہ بھی غلط ہے ، اور یہاں اس کا محل نہیں ۔ مگر موصوف نے جو اباً لکھا کہ بغیر واؤ عاطفہ شعر غلط ہے ۔ کلیات نکالا تو اس میں بھی واؤ عاطفہ نہ تھا ۔ میں نے پھر لکھا ، مگر انہوں نے واؤ عاطفہ کے سلسلے میں میری بات نہ مانی۔ میں واؤ عاطفہ کو غلط اور بے محل کہتا ہوں ، اور یہاں کسرہ اضافی کو صحیح اور بر محل قرار دیتا ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ میری رائے درست ہے ، کیونکہ غالب کہتا ہے کہ غالب اور اس کے رنج گراں کی بات نہ کر ، ہم نے اس پر کاہ (غالب) کا مد مقابل ایک پہاڑ (رنج گراں) قرار دے لیا ہے ۔ اگر واؤ عاطفہ لائیں تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ غالب اور اس کے رنج گراں کے متعلق کچھ نہ کہو ، ایک پہاڑ مقابل تھا اور ہم نے اس کو گھاس کا تنکا قرار دے لیا ہے ۔ واؤ کے آجانے سے معنی میں فرق آگیا ، اور رنج گراں کی تخفیف کا پہلو نکل آیا ۔ آپ اس کے متعلق اپنی رائے سے سرفراز فرمایے۔

نواب کلب علی خاں نے جب شرح قصائد بدرچاچ کا دیباچہ لکھ کر غالب سے اصلاح چاہی تو آشیاں چیدن بمعنی گھونسلا بنانا کو غالب نے غلط بتایا۔ عرفی کا مشہور شعر آشیاں چیدن کی سند میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ غالب نے ان معنی سے کیوں انحراف کیا ؟ اور ان کے نزدیک آشیاں چیدن کے معنی کیا تھے ۔ اس کی جستجو ہے ، اس سلسلے میں رهنمائی فرمایے ۔

جواب سے جلد سرفراز فرمایے ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔ و السلام

نیاز کیش ، سید قدرت نقوی

مکتوب مولانا عرشی :

رضا لائبریری ، رامپور

۲ جون ۱۹۶۴ء

مکرم و محترم ، سلام مسنون

مودت نامہ ملا - خدا آپ کو سلامت با کرامت رکھے - میں اب اچھا ہوں ، اور خوب ڈٹ کر کام کر رہا ہوں - والحمد للہ علیٰ ذالک

غالب کا جو شعر آپ نے لکھا ہے ، اس میں بالیقین "کوہے معارض ہر کاهش گرفتہ ایم" ہی غالب نے لکھا ہے - چنانچہ دیوان غالب کے تمام نسخوں (میں) بالاتفاق اسی طرح ہے - کسی ایک میں بھی اس کے خلاف نہیں پایا گیا - ان نسخوں میں سے تین خود غالب کے پڑھے ہوئے اور تصحیح کیے ہوئے ہیں - لہذا اگر دوسری شکل با معنی بھی ہو ، تب بھی آپ اسے غالب کا لکھا ہوا نہ مانیں - ویسے میں آپ سے متفق ہوں کہ معناً بھی یہی قرأت درست ہے - و السلام

مخلص ، عرشی

مکتوب مولانا عرشی :

رضا لائبریری ، رامپور

۳ جون ۱۹۶۴ء

مکرمی ' سلام مسنون

کل جواب لکھ چکا ہوں - ایک بات بھول گیا تھا - اس کے بارے میں آج عرض ہے کہ " آشیاں چیدن " کے معنی خود غالب نے کیا بتائے ہیں ؟ اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں - بظاہر اس محاورے کے معنی گھونسلا بنانا ہی ہیں - چنانچہ ٹیک چند بہار نے دو جگہ اس محاورے کے یہی معنی بتائے ہیں - و السلام

احقر ، عرشی

مندرجہ بالا خطوط میں " آشیاں چیدن " اور غالب کے مصرع "کوہے

معارض پر کاهش گرفته ایم" کے ہر پہلو پر غور و فکر کے نتائج پیش ہوچکے ہیں۔ بعض مخلص احباب کی تمنا تھی کہ عام افادے کے لیے جملہ خط و کتابت کو شائع کیا جائے۔ آیندہ اسی عنوان سے مزید خطوط پیش کروں گا کیونکہ یہاں تک ایک موضوع مکمل ہو جاتا ہے، دوسرے موضوعات پر جو خط و کتابت ہوئی ہے، وہ آیندہ ملاحظہ فرمایئے گا۔

ان خطوط کی انفرادیت کے کئی پہلو ہیں۔ سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اب تک جتنے خطوط منظر عام پر آئے ہیں وہ یک طرفہ ہیں، یعنی مکتوب نگار کے خطوط جمع کر لیے گئے ہیں۔ اب تک مکتوب نگار کے خطوط کے جوابات شامل نہیں ہوئے، اس لیے کسی مبحث پر پوری طرح روشنی نہیں پڑتی۔ آپ کے سامنے جانبین کے خطوط ہیں، جن کے ذریعے پورے مبحث پر سیر حاصل تبصرہ اور خیالات منظر عام پر آگئے ہیں۔

یہ امر پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس مفید خط و کتابت میں اختلاف رائے کے باوجود کہیں تلخی کا وجود نہیں، احترام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ خلوص و احترام کے جذبات میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ علمی، ادبی اور اخلاقی افادیت ہی نے ان کی اشاعت پر مجبور کیا۔ ان شاء اللہ آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

کے

نئے ایڈیشن

کی چند

خصوصیات

- یہ لغت اہل علم کی ایک جماعت کے تعاون سے تیار ہوئی۔ اس لیے اس کی جامعیت، افادیت اور صحت مطالعہ کو درجہٗ استناد حاصل ہے۔
- اس میں انگریزی زبان کے تمام مروجہ الفاظ کے معانی دیئے گئے ہیں۔
- انگریزی الفاظ کے صرف اردو مترادفات درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ضروری جگہوں پر الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔
- اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ انگریزی کے محاورے یا روز مرہ لیے اردو محاورہ یا روز مرہ، انگریزی مثل کے لیے اردو مثل اس طرح درج کی جائے کہ انگریزی کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔
- انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اردو مترادف الفاظ سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں معانی کا نمبر شمار دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف طور پر نظر آسکے۔ ہر معنی کا فرق مثالیں دے کر واضح کیا گیا ہے۔
- باطنی حسن کے ساتھ صوری اعتبار سے بھی خاص ایڈیشن اپنی مثال آپ ہے۔ اسے اعلیٰ درجے کے بائیبل پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ یہ کاغذ خاص طور پر اس ایڈیشن کے لئے درآمد کیا گیا ہے۔

یہ ایڈیشن

محدود تعداد میں شائع کیا گیا ہے اس لیے اپنا نسخہ جلد از جلد حاصل کر لیں

ایک ساتھ دو نسخے منگوانے پر محصول ڈاک معاف

کچھ غالب کے متعلق

محمد ایوب قادری

مکتوب غالب بنام عزیز الدین بدایونی

مرزا غالب کا ایک مکتوب مولوی عزیز الدین بدایونی کے نام ہے جو اردوئے معلیٰ(۱) اور عود ہندی دونوں میں شامل ہے۔ ان دونوں مجموعوں کے علاوہ یہ خط ''خطوط غالب'' مرتبہ مولانا غلام رسول مہر میں بھی موجود ہے۔ مولانا مہر صاحب کو عزیز الدین بدایونی کا حال نہ مل سکا، البتہ مالک رام صاحب نے مختصر سا حال لکھا ہے جس میں بعض باتیں محل نظر ہیں۔(۲)

غالب کے اس خط میں ایک محضر کا ذکر ہے جو ایک خاص واقعے کے متعلق ہے جس کی یہاں وضاحت پیش کی جاتی ہے۔ پہلے مولوی عزیز الدین بدایونی کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں۔

مولوی عزیز الدین بدایونی ابن مولوی اساس الدین صدیقی فرشوری بدایوں کے قدیم باشندے تھے۔ وہ ۱۷ صفر ۱۲۴۴ھ کو پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ کی تحصیل کی اور شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ خوش خطی میر پنجہ کش سے سیکھی۔ ۱۸۵۵ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور

۱۔ اردوئے معلیٰ، مطبع مجیدی، کانپور ۱۹۲۲ء، ص ۱۷۰

۲۔ تلامذۂ غالب از مالک رام، نکودر ۱۹۵۷ء، ص ۱۹۲-۱۹۳

۱۸۵۷ء تک دهلی میں وکالت کی ۔ اس کے بعد اپنے وطن بدایوں چلے گئے ۔ کچھ دنوں شاهجهانپور میں وکالت کی ، پھر وهیں وکیل سرکار مقرر هوئے ، پھر منصف کے عہدے پر ترقی پائی ، ۲۶ جمادی الآخر ۱۳۱۱ھ کو انتقال هوا ۔ (۱)

مولوی عزیزالدین کے ایک بڑے بھائی مولوی حکیم سعیدالدین المتخلص به کامل تھے جو ۲۱ رمضان ۱۲۴۱ھ کو پیدا هوئے ، وہ علوم متداولہ میں دستگاه کامل رکھتے تھے ۔ علم طب میں حکیم صادق علی خاں دهلوی کے شاگرد تھے ، خط نستعلیق خوب لکھتے تھے ، ان کے لکھے هوئے بعض رسالے میری نظر سے گزرے هیں ، حکیم سعادت علی خاں مدارالمہام ریاست رام پور و رئیس آنولہ کے یہاں ملازم تھے ، ۲۷ رجب ۱۳۱۶ھ کو ان کا انتقال هوا ۔ (۲)

اتفاق سے جس زمانے میں دهلی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ھ کا آغاز هوا۔ اس وقت حکیم سعیدالدین بدایونی رام پور میں تھے ۔ هنگامے کے فرو هونے کے بعد جب دهلی میں معافی و املاک کی بحالی کا سلسلہ شروع هوا اور تحقیقات کا آغاز هوا تو ان کی جو املاک و معافیات دهلی اور اس کے مضافات میں تھیں ، ان کی بحالی کے لیے وہ درخواست گزار هوئے ۔ بعض دستاویزوں میں دوسرے لوگوں کے ساتھ عزیز الدین کے بڑے بھائی حکیم سعید الدین کا نام بھی شامل تھا اور اس تحقیقات کا انچارج ایک انگریز افسر تھا ۔ هوا یہ کہ دهلی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے موقع پر جہاد کا جو فتویٰ مرتب هوا تھا ، اس میں ایک صاحب مولوی سعید الدین نامی کی بھی مہر تھی (۳)۔ اس انگریز کو خیال هوا کہ یہ وهی مولوی سعید الدین هیں۔ لہٰذا اس نے ان کو اصالتاً طلب کرلیا اور اب حکیم سعید الدین کی زندگی خطرے میں تھی ۔ بدایوں اور رام پور کے عمائد و مشاهیر کی مواهیر سے حکیم سعید الدین کی بدایوں میں موجودگی کا محضر مرتب هوا اور دهلی کے مشاهیر کی مواهیر سے ان کی دهلی میں عدم موجودگی کا محضر مرتب هوا ۔ یہی وہ محضر ہے جس کا اس خط میں ذکر ہے ۔ مولوی

۱۔ انساب شیوخ فرشوری بدایوں از رضی الدین بسمل (کاکس پریس شاہ آباد ، بغیر سال طباعت) ص ۱۰۴ - ۱۰۵

۲۔ ایضاً ، ص ۹۰ - ۹۲

۳۔ ملاحظہ هو: ۱۸۵۷ء کے مجاهد شعرا از مولانا امداد صابری (مکتبہ شاهراه دهلی ، ۱۹۵۹ء) ص ۱۲۹

عزیز الدین نے اپنے استاد مرزا غالب کے ذریعے اس محضر پر دہلی کے مشاہیر کے دستخط اور مہریں کرائی تھیں ۔ اب اس داستان کو مولوی عزیز الدین کے بھتیجے اور حکیم سعید الدین کے بیٹے خان بہادر مولوی رضی الدین وکیل بدایونی (ف ۱۹۲۵ء) کی زبان قلم سے سنیے : (۱)

'' ان املاک کی تحقیقات میں ... ایک قضیۂ نامرضیہ پیش آیا ، ایک سلک میں ہمارے والد ماجد مرحوم حکیم محمد سعیدالدین کا نام بشمول جد امجد و چچا وغیرہ کے داخل تھا اور تحقیقات معافی داروں کی شروع تھی کہ آیا معافی دار تو باغی نہیں ہوا ۔ یہ تحقیقات ایک یوروپین غصہ ناک شخص کے سپرد تھی اور اس نے ایام غدر میں جو اپنی ہم قوموں کو گرفتار ہوتے اور مارے جاتے دیکھا ، اس کو ذرا ذرا بات پر شبہ ہوتا تھا ۔ جب ہمارے والد کا نام آیا تو اس کو یہ شبہ ہوا کہ محمد سعید ایک شخص کی مہر فتویٰ جہاد پر جو دہلی کے رہنے والے تھے ، دفتر میں برآمد ہوئی تھی ۔ صاحب بہادر نے فرمایا کہ محمد سعید وہی شخص ہے ، جس نے محضر پر مہر کی تھی ۔ میرے دادا صاحب وقت تحقیقات موجود تھے ، انھوں نے عرض کی کہ حضور اس کا نام محمد سعید الدین ہے ، محمد سعید نہیں ہے (۲) اور وہ ایام غدر میں دہلی میں نہ تھا بلکہ رام پور اور آنولہ میں تھا ، لیکن صاحب نے حکم حاضری اصالتاً کا دیا ۔ جب والد کو یہ خبر ہوئی تو والد مرحوم نے حکیم محمد سعادت علی خاں بہادر رئیس آنولہ جن کے ساتھ وہ ایام غدر میں رہے ، ان سے تذکرہ کیا ۔ انھوں نے اپنی تصدیق لکھ کر اور نواب صاحب بہادر جنت آشیاں یوسف علی خاں بہادر مرحوم مغفور والی ریاست رام پور کی مہر و دستخط مزین فرما کر وہ کاغذ روانہ کیا کہ حکیم محمد سعیدالدین ہمارے یہاں ایام غدر میں رہے اور وہ خیر خواہ سرکار ہیں ۔ جب یہ کاغذ پیش

۱۔ کنز التاریخ از مولوی رضی الدین بسمل (نظامی پریس بدایوں ۱۹۰۷ء) ص ۳۰۱ - ۳۰۲

۲۔ فتوے میں محمد سعید نہیں سعید الدین نام ہے ، ملاحظہ ہو ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا ، ص ۴۹

ہوا ، اس وقت بھی صاحب کو یقین نہ ہوا اور فرمایا کہ مسلمان مسلمان کو بچانے کی کوشش کرتا ہے ، اس کو حاضر ہونا چاہیے۔ تب تو مایوسی ہوئی کہ اتنی بڑی صفائی پر کچھ خیال نہ ہوا تو کیا امید جان بری ہے ۔ پھر بدایوں سے مسٹر کارمیکل صاحب بہادر مجسٹریٹ ضلع بدایوں کے روبرو رؤسائے بدایوں نے محضر بنا کر پیش کیا اور انھوں نے تصدیق کر کے بھیج دیا کہ یہ شخص دھلی نہیں گیا تھا اور پھر بھی عذر غیر حاضری مسموع نہ ہوا۔ الغرض والد ماجد کو بدایوں سے جانا پڑا ۔ جب والد یہاں سے گئے ھیں تب مایوسی ہم لوگوں کو تھی کہ اب دیکھیے سلامت آتے ھیں یا نہیں ، پھر دھلی پہنچ کر یہ حاضر حضور صاحب مجسٹریٹ بہادر کے ہوئے ۔ انھوں نے دریافت کیا کہ تمھارا کیا نام ہے ، اپنا نام بتایا اور اپنی مہر کے کاغذات جو قبل غدر کے تھے اور ان پر مہریں تھیں پیش کیے کہ میری مہر میں محمد سعیدالدین ہے اور فتوے پر محمد سعید صرف مہر میں تھا ۔ پھر تحقیقات کے لیے یہ معاملہ تحصیلدار دھلی کے سپرد ہوا۔ ایک شخص کھتری یا بنئے تحصیلدار دھلی کے تھے، جب ان کے پاس والد و دادا صاحب گئے تو وہ دیکھ کر سروقد اٹھ کھڑے ہوئے ۔ انھوں نے فرمایا کہ میں جناب حافظ یعنی ھمارے والد کے جد امجد کا شاگرد ھوں ، آپ کا کیا کام ہے ۔ ان سے سب قصہ کہا گیا ، انھوں نے تحقیقات کر کے خود جا کر صاحب سے کہا کہ یہ شخص اور ھیں اور یہ مقام دھلی ایام غدر میں نہ تھے ۔ تب صاحب کا شک رفع ہوا اور اس بلائے ناگہانی سے نجات پائی اور معافی بدستور قائم رہی ۔"

اس تشریح و توضیح کے بعد مرزا غالب کا اصل خط ملاحظہ فرمایئے ۔

" صاحب !

کیسی صاحب زادوں کی سی باتیں کرتے ہو ؟ دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی آگے تھی۔ قاسم جان کی گلی ، میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے اور ہاں اگر آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی اسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف

رکھتے ہیں ، ضیاء الدین خان اور ان کے بھائی مع قبائل و عشائر لوہارو میں ۔ لال کنویں کے محلے میں خاک اڑتی ہے ، آدمی کا نام نہیں ۔ تمھارے مکان میں جو چھوٹی بیگم رہتی تھی اس کے پاس اور لکھمی کی دوکان پر اس اشتہار کو بھیجا ۔ بیگم لاہور گئی ہوئی ہے ۔ لکھمی کی دوکان میں کتے لوٹتے ہیں ۔ مولوی صدرالدین صاحب لاہور ، ایزد بخش ، تراب علی ان لوگوں سے میری ملاقات نہیں ۔ میں نے آپ مہر کردی ۔ حکیم احسن اللہ خاں اور میاں غلام نجف اور بہادر بیگ اور نبی بخش سا کن دریبہ ، ان کی مہریں ہوگئیں ۔ مختصر آپ کے پاس بھیجتا ہوں''۔

خط از روئے احتیاط بیرنگ بھیجا ہے ۔ پوسٹ پیڈ خط اکثر تلف ہو جاتے ہیں ، چنانچہ قاضی عبدالجمیل صاحب کا خط ، جس کا آپ نے ذکر لکھا ہے ، آنکھیں پھوٹ جائیں اگر میں نے دیکھا ہو ۔ آپ ان سے میرا سلام نیاز کہیے اور خط کے نہ پہنچنے کی ان کو خبر پہنچایے '' ۔

غالب اور احسن بلگرامی :

محمد احسن بن محمد احمد صدیقی ، اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام میں ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے ۔ صفی پور (ضلع اناؤ) میں سکونت اختیار کرلی تھی ، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور پھر لکھنؤ سے فراغ حاصل کیا ، فارسی زبان و ادب میں کامل دستگاہ رکھتے تھے ۔ مولوی احسان اللہ ممتاز اور گل محمد ناطق مکرانی کے شاگرد تھے ، احسن تخلص تھا (۱) ۔ کچھ مدت نواب مختارالملک مدارالمہام حیدرآباد دکن کی سرکار سے بھی وابستہ رہے ، بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں کے صاحبزادوں کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے ، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ نواب صدیق حسن خاں کے یہاں ہر ماہ کے اختتام پر ایک مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی تھی جس میں ممتاز و مخصوص شعرا شرکت کرتے تھے ، ان میں احسن بلگرامی بھی تھے (۲) ۔

۱۔　تلامذہ غالب ، ص ۲۶۵

۲۔　مآثر صدیقی ، جلد چہارم ، از نواب علی حسن خان (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۵ء) ص ۱۹۵

نواب علی حسن خاں لکھتے ہیں : (۱)

" بموجب طلب حضرت والدی دام ظلہم از آنجا (حیدرآباد دکن) رخت برداشت و در دارالاقبال بھوپال قدم گزاشت و بتعلیم نامہ نگار و جناب برادر صاحب عالی مقدار (نواب نورالحسن) توجہ گماشت "۔

احسن بلگرامی نے فارسی زبان و بیان سے متعلق چند وقیع تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن میں ارتنگ فرہنگ ، کارنامہ فرہنگ ، صحیفہ شاہجہانی اور اسرار احسن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آخرالذکر فارسی انشا پردازی کی تعلیم کے لیے نہایت موزوں اور مفید تصنیف ہے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں: (۲)

" بعبارت عام فہم این رسالہ است محتوی تعلیم حکمی سہ فن بہر زبان کہ باشد یکے نثر بہر طرز و روش کہ خواہند ، دوم کارگزاری بداں پایہ کہ در ابتدائے علاقہ ہر کار تحریر کہ باشد صورت کمال انتہا نماید ، سوم شاعری اختیاری یعنی عام مضمون تازہ بےزحمت فکر ہرآں زیر قلم و زیر نگیں باشد "۔

اس زمانے میں بڑی حد تک ریاستوں میں دفتری کام فارسی زبان میں ہوتا تھا ، لہٰذا دفتری مراسلات اور کارگزاریوں کے لیے یہ رسالہ نہایت مفید تھا۔ اس رسالے "اسرار احسن" کی ترتیب اور احسن بلگرامی کے طریقۂ تعلیم کو غالب نے سراہا اور اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا ، بلکہ غالب نے ان کی دستگاہ اور قابلیت سے متاثر ہوکر ان کے مشاہرے میں ترقی کی سفارش کی چنانچہ احسن لکھتے ہیں : (۳)

" چوں بہ تعلیم ہمشیر زادہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب دہلوی

۱- بزم سخن از نواب علی حسن خاں (مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۰ھ) ص ۱۰

۲- اسرار احسن از محمد احسن بلگرامی (قومی پریس لکھنؤ ۱۹۰۳ء) ص ۲

۳- اسرار احسن ، ص ۳

کہ امروز بصدرالصدوری علی گڑھ ناموروکامور هستند ، چاکر شدم ۔ تنے چند از واردان دولت کدہ شان کہ از ایمنان یکے از اعزہ مرزا غالب دهلوی بودہ اند۔ اولیں مسودہ کہ بخواهر زادہ ممدوح نویسانیدم ، بے اطلاع من پیش مرزا غالب رواں داشتند۔ مرزا بجواب آں سلام شوق بمن و ورائی ستائش مسودہ بآں فرستندگاں مسودہ نگار کرد کہ خدارا مولوی صاحب را دریں تعطیل انگیزی کہ نزدیک است بالضرور بدهلی آوردن است و نیز چوں مرزا دریافت کہ فلانے یعنی فقیر همگی پانزدہ روپیہ از علاقہ چاکری مولوی سمیع اللہ خاں صاحب می یابد آگہی ندادندش کہ چہل روپیہ دیگر از تعلقہاۓ دیگر می یابد بہ معزی المہم بر نگاشت کہ براۓ مولوی صاحب چاکری پنجاہ روپیہ ماهانہ ورائی خورش بجائی قرار دادہ ام کہ سخن شناس است و قدرداں "

اس کے بعد مرزا نے اپنے کسی اکبر آبادی شاگرد کے خط میں احسن بلگرامی کو سلام شوق لکھا، اس کا یہ اثر ہوا کہ غالب کے حلقۂ تلامذہ میں احسن کی پذیرائی شروع ہو گئی، احسن لکھتے ہیں : (۱)

زیں تحریر بیش از دو هفتہ نگزشتہ بود کہ مرزا در نامۂ موسومہ یکے از تلامذہ خویش باز هم چناں سلام شوق با وعدہ احسان بنامم برنگاشت و بعد ظہور ایں معاملہ بعضے از شاگرداں مرزا شیرینی مرسوم بیش فقیر آوردند و بتلمذ فقیر پا فشردند چنانچہ از جملہ آناں بودند حافظ مصلح الدین منصور تخلص ساکن لوہا منڈی کہ از محلات اکبرآباد ست هر کہ خواهد دریابد " ۔

غالب کی اس ہمت افزائی اور قدردانی سے احسن کو بھی ملاقات کا اشتیاق ہوا، مگر عظیم آباد کا سفر درپیش آجانے کی وجہ سے ان کو ملاقات کا موقع بہم نہ پہنچ سکا، چنانچہ لکھتے ہیں:(۲)

" شوق دیدار مرزا دل بعزم دهلی داشتم کہ ناگاہ اهل مشرق کمندے بگردنم انداختند و بہ عظیم آباد رساندند " ۔

۱- اسرار احسن ، ص ۳

۲- ایضاً

بعض لوگوں نے احسن بلگرامی کی غزلوں وغیرہ کو مرزا غالب کے پاس بھیجا - مرزا نے ان میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہ پائی اور ان کو بھیج دیا اور اس کے بھیجنے والوں کو ایک گونہ شرمندگی ہوئی ۔ احسن بلگرامی لکھتے ہیں : (۱)

" تنے چند دیگر کہ بقواعد این نقشہ ھا غزلہا بر طرازیدند و باغوائے حسودان پیش اسد اللہ خاں غالب دھلوی رواں داشتند و چوں غزلہا بیداغ اصلاح ھم چناں واپس آمد ، پیش فقیر آمدند و عذرھا خواستند و عہد کردند کہ دگر گرد چنیں کردار نخواھیم گشت ھر کہ خواھد از خود شاں دریابد " -

غالب نے عود ھندی میں ایک موقع پر اشارتاً اور دوسرے موقع پر صراحتاً بیدل پر تعریض کی تھی (۲)- یہ بات احسن بلگرامی کو پسند نہ آئی اور انھوں نے اس سلسلے میں اپنے قلم کو حرکت دی ، چنانچہ لکھتے ھیں : (۳)

" ھمچناں غالب دھلوی در عود ھندی ھجو حضرت مرزا بیدل علیہ الرحمتہ رقم کردہ است و تبحر حضرت بیدل روشن تر از آفتابست ، وجود حقیقت آں ھجا گو از انشائے صحیفہ شاھجھانی دریابند کہ پارہ ازاں بحکم ضرورت جواب گزاری از جانب حضرت بیدل در یکے از رقعاتش رقم کردہ ام " -

غالب اور شعری کشمیری :

خواجہ ابو محمد حسن شعری (۴) ابن خواجہ صدر الدین بچ ۱۲۲۳ھ میں سری نگر میں پیدا ہوئے ، وہ ایک علمی خانوادے کے فرد تھے - ان کے بھائی

۱- اسرار احسن ، ص ہ

۲- خطوط غالب ، جلد دوم (مرتبہ غلام رسول مہر) ص ۲۳۹

۳- اسرار احسن ، ص ہ

۴- شعری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: مرأت خیال (دیوان شعری) مطبع ریاض ھند امرتسر ۱۳۰۴ھ ، ص ب تا ط - نیز دیکھیے : " کشمیر کی فارسی شاعری " از مولوی محمد عبداللہ قریشی (ادبی دنیا ، لاھور ، کشمیر نمبر ، مارچ و اپریل ۱۹٦٦ء) ص ۲۳۱ - ۲۴۳

حافظ محمد مشتری (ف ۱۲۴۹ھ) اور چچا حبیب اللہ عنقا بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے - سکھوں کی چیرہ دستیوں کی بنا پر کشمیر کو خیر باد کہہ کر امرتسر میں طرح اقامت ڈالی - مختلف دیار و امصار کی سیاحت بھی کی - ایک موقع پر دہلی پہنچے - بہادر شاہ ظفر قلعہ دہلی میں رونق افروز تھے ، مفتی صدر الدین آزردہ ، صہبائی ، مومن اور مولوی عبداللہ خاں علوی جیسے اساتذہ سخن دہلی میں موجود تھے - مفتی صدر الدین آزردہ کے توسط سے شعری نے غالب سے ملاقات کی - شعر و شاعری کا ذکر و اذکار رہا ، یہاں تک کہ مجلس مشاعرہ منعقد ہوئی اور پھر آپس میں شاعرانہ نوک جھوک بھی رہی - اس داستان کو شعری کے دیوان "مرآت خیال" کے مقدمہ نگار کے قلم سے سنیے : (۱)

" بوجہ ہم قومی مہمان خواجہ صدر الدین صدر الصدور آزردہ گردید کہ روزے ہمراہش بر مکان دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب برد ، بعد از چنین و چناں مرزا گفت کہ اگر جناب شاعر اند بر مصرع :

باز ماندم خود وگرنہ در برویم باز بود

طبع آزمایند ، شعری گفت شاعر نیستم اما آنچہ توانم بیارم ، چنانچہ غزلے بدیہ آورد من بعد مصرع :

ندانم از کجا ابر جوش شادابی ست مینا را

طرح مشاعرہ انداخت ، صہبائی و مومن و غالب و علوی مع استخلاف طبع آزمودند ، از اسد اللہ خاں غالب است :

نمی بینیم در عالم نشاط کاسماں ما را
چوں نور از چشم نابینا ز ساغر رفت مینا را

ہریک کرت بعد مرزہ داد سخنوری داد ، مشاعرہ قریب الاختتام بود کہ صدر الصدور از غریب الوطن ارمغان خواست ، پیشکش کرد :

جنونے کو کہ دست از آستین بیروں نہد ہا را
زند چاکے بجیب و خوش کند داماں صحرا را

بہر شعر مرا احسنت رفت تا آنکہ صہبائی امام بخش بود و مومن مقتدی ،

۱- مرات خیال ، ص ۵ - ۹

بعض لوگوں نے احسن بلگرامی کی غزلوں وغیرہ کو مرزا غالب کے پاس بھیجا - مرزا نے ان میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہ پائی اور ان کو بھیج دیا اور اس کے بھیجنے والوں کو ایک گونہ شرمندگی ہوئی - احسن بلگرامی لکھتے ہیں : (۱)

" تنے چند دیگر کہ بقواعد ایں نقشہ ہا غزلہا بر طرازیدند و باغوائے حسودان پیش اسد اللہ خاں غالب دہلوی رواں داشتند و چوں غزلہا بیداغ اصلاح ہم چناں واپس آمد ، پیش فقیر آمدند و عذرہا خواستند و عہد کردند کہ دگر گرد چنیں کردار نخواہیم گشت ہر کہ خواہد از خود شاں دریابد " -

غالب نے عود ہندی میں ایک موقع پر اشارتاً اور دوسرے موقع پر صراحتاً بیدل پر تعریض کی تھی (۲)- یہ بات احسن بلگرامی کو پسند نہ آئی اور انھوں نے اس سلسلے میں اپنے قلم کو حرکت دی ، چنانچہ لکھتے ہیں : (۳)

" ہمچناں غالب دہلوی در عود ہندی ہجو حضرت مرزا بیدل علیہ الرحمتہ رقم کردہ است و تبحر حضرت بیدل روشن تر از آفتابست ، وجود حقیقت آں ہجا گو از انشائے صحیفہ شاہجہانی دریابند کہ پارہ ازاں بحکم ضرورت جواب گزاری از جانب حضرت بیدل در یکے از رقعاتش رقم کردہ ام " -

غالب اور شعری کشمیری :

خواجہ ابو محمد حسن شعری (۴) ابن خواجہ صدر الدین بچ ۱۲۲۳ھ میں سری نگر میں پیدا ہوئے ، وہ ایک علمی خانوادے کے فرد تھے - ان کے بھائی

۱- اسرار احسن ، ص ہ
۲- خطوط غالب ، جلد دوم (مرتبہ غلام رسول مہر) ص ۲۳۹
۳- اسرار احسن ، ص ہ
۴- شعری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: مرآت خیال (دیوان شعری) مطبع ریاض ہند امرتسر ۱۳۰۴ھ ، ص ب تا ط - نیز دیکھیے : " کشمیر کی فارسی شاعری " از مولوی محمد عبداللہ قریشی (ادبی دنیا ، لاہور ، کشمیر نمبر ، مارچ و اپریل ۱۹۶۶ء) ص ۲۴۱ - ۲۴۳

حافظ محمد مشتری (ف ۱۲۴۹ھ) اور چچا حبیب اللہ عنقا بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے - سکھوں کی چیرہ دستیوں کی بنا پر کشمیر کو خیرباد کہہ کر امرتسر میں طرح اقامت ڈالی - مختلف دیار و امصار کی سیاحت بھی کی - ایک موقع پر دھلی پہنچے - بہادر شاہ ظفر قلعہ دھلی میں رونق افروز تھے ، مفتی صدر الدین آزردہ ، صہبائی ، مومن اور مولوی عبداللہ خاں علوی جیسے اساتذہ سخن دھلی میں موجود تھے - مفتی صدر الدین آزردہ کے توسط سے شعری نے غالب سے ملاقات کی - شعر و شاعری کا ذکر و اذکار رہا ، یہاں تک کہ مجلس مشاعرہ منعقد ہوئی اور پھر آپس میں شاعرانہ نوک جھوک بھی رہی - اس داستان کو شعری کے دیوان ''مرآت خیال'' کے مقدمہ نگار کے قلم سے سنیے : (۱)

'' بوجه هم قومی مهمان خواجه صدر الدین صدر الصدور آزرده گردید که روزے همراهش بر مکان دبیر الملک مرزا اسد الله خان غالب برد ، بعد از چنین و چنان مرزا گفت که اگر جناب شاعر اند بر مصرع :

باز ماندم خود وگرنه در برویم باز بود

طبع آزمایند ، شعری گفت شاعر نیستم اما انچه توانم بیارم ، چنانچه غزلے بدیه آورد من بعد مصرع :

ندانم از کجا ابن جوش شادابی ست مینا را

طرح مشاعره انداخت ، صهبائی و مومن و غالب و علوی مع استخلاف طبع آزمودند ، از اسد الله خان غالب است :

نمی بینیم در عالم نشاط کاسمان ما را
چون نور از چشم نابینا ز ساغر رفت مینا را

هریک کرت بعد مرة داد سخنوری داد ، مشاعره قریب الاختتام بود که صدر الصدور از غریب الوطن ارمغان خواست ، پیشکش کرد :

جنونے کو که دست از آستین بیرون نهد پا را
زند چاکے بجیب و خوش کند دامان صحرا را

بهر شعر مرا احسنت رفت تا آنکه صهبائی امام بخش بود و مومن مقتدی ،

۱- مرات خیال ، ص ۰ - و

مگر شیر بیشه عالی دماغی غالب علی کل غالب درنیستان آتش رشک سوخت ، تلامذه اش مُستدعی طرح دیگر شدند و به مشاعره دوم غالب بطرح گفت :

سپردم دوزخ و آن داغ هائے سینه تابش را
سرائے بود در رہ تشنهٔ برق عتابش را
به پیدائی حجاب جلوه سامان کردنش نازم
کف صهباست گوئی پنبه مینائے شرابش را

این غزل مملو مطاعن آتش صهبائی بجوش آورد و صدر الصدور را آزرده ساخت، هنوز فرونشده که کرت شعری درست در دهن نمود بالآخر محاکمه بمجادله رسید بالغ الکلام را دو صنف شد ـ جمعے جنب غالب گرفتند و برخے جانب غالب، بلا مغالطه نتیجه قضیه نظری بدیهی شد ، صهبائی جام طرح بدور آورد ، آواره وطن آنچه گفت بدیوان است نوشته نتوانست شقیقه راحیله کرد مگر بعد از دو یوم به معمائے نوشت :

در گریه از بس نازکی رخ مانده برخاکش نگر
وان سینه سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر
خواند به امید اثر اشعار غالب هر سحر
از نکته چینی درگزر فرهنگ و ادراکش نگر

چونکه شعری قبلش دهلی را خیرباد گفته بود ، صهبائی ریخت ، آن قدح بشکست و آن ساقی نماند "

شعری کا انتقال ۸ ۔ رجب ۱۲۹۸ھ کو امرتسر میں ہوا ۔ اور وہیں دفن ہوئے " رحمت خدا آمد " سے سال انتقال برآمد ہوتا ہے ۔ (۱)

ماتم مرگ :

[۱]

مرزا غالب کے انتقال پر شعری و ادبی حلقوں میں خاصا ماتم برپا رہا ، شاعروں اور ادیبوں نے ان کے انتقال پر قطعات تاریخ اور مرثیے لکھے ۔ بقول حالی :

" ان کی وفات کی تاریخیں ...... مدت تک ہندوستان کے اردو

۱۔ مرأت خیال ، ص ط

اخباروں میں چھپتی رہیں ، وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں "۔ (۱)

اسی قسم کی دو غیر مطبوعہ تحریریں ہمیں ملی ہیں جن میں سے ایک حکیم
عفر حسین دیوبندی کا خط ہے جو ان کے خطوط کے مجموعے " مکتوبات جعفری "
یں شامل ہے۔ انھوں نے یہ خط اپنے بھائی یوسف علی صاحب کو لکھا ہے
و ضلع ہوشیار پور میں سب اورسیر تھے ۔

حکیم جعفر حسین دیوبند (محلہ سرائے پیر زادگان) کے رہنے والے تھے،
ن کے والد کا نام حکیم غلام عباس ہے جو ریاست بھوپال میں صیغۂ پولیس
یں ملازم رہے اور گھر پر مطب بھی کرتے تھے ۔ مولوی سید محبوب
ضوی مولف تاریخ دیوبند کے والد سید ظہور الحسن(۲) کے ماموں تھے ، رضوی
صاحب لکھتے ہیں : (۳)

" سید جعفر حسین بن حکیم غلام عباس میرے والد مرحوم کے
حقیقی ماموں تھے ، دیوبند میں محلہ سرائے پیر زادگان کے رہنے والے
تھے ۔ ان کے جد اعلیٰ دیوبند کے مشہور بزرگ الحاج بندگی سید محمد
ابراهیم صاحب قدس سرہ (وفات ۱۰۴۳ھ) ہیں ۔ راقم السطور کے
جداعلیٰ بھی یہی بزرگ ہیں ۔

حکیم سید غلام عباس ، ریاست بھوپال میں انسپکٹر پولیس تھے ،
ملازمت کے ساتھ گھر پر مطب کا مشغلہ بھی جاری رہتا تھا ۔
سید جعفر حسین صاحب .... ایک فاضل شخص
تھے ، فقہ اور قانون سے طبعی مناسبت تھی ۔ ان علوم میں صاحب کمال
سمجھے جاتے تھے ۔ والد مرحوم سے میں نے سنا ہے کہ وہ
ریاست بھوپال میں مشیر قانون تھے ، کثرت مطالعہ سے آخر

۱۔ یادگار غالب (لاہور ۱۹۳۲ء) ص ۹۰

۲۔ سید ظہور الحسن ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے، دارالعلوم دیوبند کے
درجات فارسی میں تعلیم پائی ۔ بچپن میں کچھ عرصے اپنے نانا حکیم سید غلام
عباس صاحب کے پاس بھوپال میں بھی قیام رہا ۔ محکمۂ انہر میں ملازم تھے ۔
رمضان ۱۳۷۰ھ میں انتقال ہوا ۔ مکتوب سید محبوب رضوی بنام راقم مورخہ
۲ - مئی ۱۹۶۷ء

۳۔ مکتوب سید محبوب رضوی بنام راقم مورخہ ۱۲ - مارچ ۱۹۶۷ء

عمر میں بینائی جاتی رہی تھی ۔ ان کے فرزند محمد ابراہیم صاحب لاولد فوت ہوئے سید جعفر حسین کا سنہ ولادت و وفات معلوم نہیں ہو سکا ''۔

حکیم جعفر حسین بھوپال کے نامور فاضل اور ادیب شہیر ابو الفضل محمد عباس شروانی (ف ۱۳۱۵ھ) کے شاگرد تھے۔ محکمہ پولیس وغیرہ میں ملازم رہے۔ ان کی دو کتابیں ہمارے ذخیرۂ کتب میں ہیں ، ایک تو یہی ان کے مکتوبات کا مجموعہ اور دوسری میر غلام علی آزاد بلگرامی کی مشہور کتاب سرو آزاد کا خلاصہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں قلمی ہیں ۔

مکتوب منشی جعفر حسین دیوبندی :

بنام خداوند پیروزگر مرو مہر ساز و شب و روز گر

سخنے کہ بر ہر سخن می چربد ، ستائش ایزد بخشاینده دادگر است و روشے کہ بر ہر روش ارزد سپاس توانا داور بخشائش گر اگرچہ من بے ریا را چہ یارا کہ ہنگامہ شوری برپا کنم و کمند ہیچ در پیچ بر ایوان ستودن کسی افگنم مگر امروز غالب ببازد سخن پرزور جہان سخن چنان رام گردانید و آفتاب روشن روش گویائی از گوشہ باختر برگردانید ۔ دشنہ کلکش زخم ریز ، آب و آتش مرہم کافور آمیز زبان چاشنی جویان شیرین سخنان بجوش مایہ شہد پرمزہ ساخت ۔ کوس بلند آوازگی و موشگافی در شش سوئے گیتی نواخت و سخنش در خوبی انگشت نما ، گوہر گفتارش گران بہا ، اگر جامہ ماہ نو آسا بر میدان چرخ نیلگوں نہ برآمدی ، زنگ تیرگی از آئینۂ روزگار بہ کزلک فروغ کہ ربودی ، چکامہ نشتر مژہ چشم نازک مانا ، اگر سر پنجہ رساوے از رگ جانہا آگاہی نہ گرفتے تلخ کامان را داروئے بہ از کجا بودے ، تخم یکتائی در گلزمین دلہائے آرش خرمنان پاشد ، رشک بینان خود فروشان را از تیغ آبدار خراشد و الا مایگان زبرگاہ نشینان جوہر شناسی را چوب کیانی بر سر می نہد و سرفرازان گیہاں بیشگہ نشین بزم سروب خوانی را پیرہن دربر از شوخی ہوائے بہار آنگہای شاخ زرینش غنچہ رواں خوشاب و از اندازہ رنگینی شاخ گل گفتارش سبزہ نگاہ سیراب ہر گاہ زبان نیرنگ سازی کشودے ، غوغائیان گلبن را اسیر فرمودے و در تبسم غنچہ خندہ از گلزار چہرہ بر انداختن ، خاموشی لبہایش دریائے موج داشتے ، از خاکپایش زمین آسمان شد از اوج جاہش آسمان زمین شد ، سخنش چوں زلف مشکین سواداں بے آہو از آب زمرد وار گویایش گوہر

دندان را آبر و گل نوخیز اندیشه رنگینش از خار ناکامی پاک و لاله پندار خوش اندازش از داغ نامرادی بیباک و اگر گل از سرواد رنگیں برکان خود را همچو شهپر ژند خوان برباد سازد اوزد گر شبخوان از شرمندگی گفتار نغمه آرائی خوش لہجه وے گرد گل بر سر افشاند سزد پنج آهنگ وے مرغ شب آهنگ ایست باشبآهنگ سپهر مینا رنگ هم آهنگ نے نے دریائیست بے پایاں پر از گوهر هائے رنگ برنگ با دانش و فرهنگ سهر نیمروز و دستبو به هوائے سرمایه فروغ بخش جهاں و بوئے رساں دماغ پریشاں که پیش گرمی هنگامه وے آفتاب جهانتاب پائیدار از غم می سوزد وچوں آں دل سوخته ماه برمیداں آسمان هموخ شرم بر افروزد غازهٔ جاں بری بر روئے جهانیاں مالید و سرمه از آں سواد در چشم مردمان کشید پیچیدگیهائے آں نامهائے مستان بادهٔ سرجوش اند که دست در گردن یکد گراند وابستگاں نزاکت سخن با هزاراں زباں نیائش گر گشتند سخن زنان و آتش زبانان شیریں بیانان خاک آستانش بمژگان رفتند ، غبار درگاهش کیمیائے دانائی و خاکروبه برنگاهش پارس بینائی درش چاک گریباں زهے پریچهره غبار آستانش پرتو سهر ۔

کاش اینک اوستادان پیشیں بودندے زبان سپاس شکربار بزور بازوئش کشادندے و مایهٔ بے نیازی آں برگزیده بارگاه بے نیاز کمایه بازو نمودندے و از سروچشم براهش پوئیدندے بزرگاں راست گفتند و در سفتند که تا در یکتائی و سخن پروری دریا نشود گوهر آبدار شیوا بیانی بدست نیاید تا در پرده مانا هوا نه گردد ، فروغ بخش جهاں آرا نه برآید هیهات هیهات گوش ستم دیدگاں خورد ۔ "آه غالب بمرد" جان بجهان آفریں سپرد و چراغ پرماس و سخن مرد حزم شکیبائی بے برگاں سوخت و هنگامه گرمی سوز و گداز افروخت سرس کار ایں سرائے ناپائیدار چون است دیده هائے کارگزاراں روزگار همه کور و گوشها کر است دریں کاخ سپنج خالی زگنج هیچ نماند له هیچ چیزے جاوید خواهد ماند ۔

اے بخاک رسیدن آں مرد زباندان کشاده زباں سر بخش شیریں گویاں جوهر شناس موزوں بیاں رستم دستاں تازه گوئے سام نریمان رزم شگفته ، روئے جمشید اریکه تارک بیانی شاهنشه ایران تر زبانی ، سروش کردار زیرک سار هم شاه سخن سرائی هم پهلوان پلارک آزمائی آسمان ساز زمین شیوا روش روگاه اجزائے سرخوش نیک آهنگ نجم الدوله دبیر الملک مرزا اسد الله خان بهادر

نظام جنگ انچه در دل بود ، بدل ماند ، و کار بیدل بدردے رساند از نارسائیهائے در خیابان نامرادی جز دانہ' اشک چه بایدم کاشت و از ناسازیهائے در زمین سینه جز نوک خار ناتوانی چه بایدم گزاشت ، خواهم نبشته را در آب و آتش گزارم و دست ازیں کار برآرم هنگام زیست آن راه گزیں که آفتاب لب کوه بودند ، بن زبان سخن سرائی و آرش برآری می کشودند دوتا نامه پارسی زبان فرستاده بودم و نوشته بودم که بنگاه اوستادی بنگرند و نشیب و فراز سخن نگرند سپس بست روز از فرسته واپس فرسود و از کلک پرویں سلک فرو ریخته بود که راهے تو پسندیدم و خوش گردیدم ، پیچ آهنگ و دستنبو بینید ، و بر آن ورزش کنید ، اوستاد تو نیز یکتائے روزگار است و از هوا خواهان راست کردار ما است از وے کار بگیر و انچه گویدت ، بپذیر ، اکنون بارغم پشت خامه شکسته و غبار اندوه را سخن بسته ۔

[۲]

منشی فضل حسین برشته کا قلمی دیوان همارے ذخیرہ' کتب میں موجود هے ۔ کلام لکھنوی انداز کا اوسط درجے کا هے ۔ برشته کے تفصیلی حالات معلوم نه هو سکے ۔ غالبا دهلی کے رهنے والے تھے ۔ مرزا قادر بخش صابر گورگانی مولف تذکرہ' گلستان سخن اور خدا بخش تنویر کے شاگرد تھے ۔ انهوں نے اپنے دیوان میں بعض یادداشتیں بھی لکھ رکھی هیں اور اکثر غزلیات سے متعلق یه صراحت بھی کی هے که کب، کهاں اور کس شخص کے یهاں مشاعرے میں وہ غزل پڑھی گئی ۔ اندازہ ایسا هوتا هے که وہ مراد اباد میں متوطن هوگئے تھے کیونکه انهوں نے اپنا یه دیوان مرادآباد هی میں مرتب کیا هے اور تاریخ اختتام ۸ ۔ جون ۱۸۹۹ء درج هے ۔ برشته نے مرزا غالب کے انتقال پر دو قطعات تاریخ تحریر کیے هیں جو درج ذیل هیں :

تاریخ وفات مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب دهلوی

وحید زماں تھا جو دهلی میں غالب
وہ معنی سرا اٹھ گیا هائے ویلا

برشتہ لکھو پھر تاریخ مصرع

" سخن کا مزہ اٹھ گیا ہائے ویلا "(۱)

دیگر :

اٹھا دنیا سے لیا مرزائے غالب جہاں سے اٹھ گئی شیریں زبانی

برشتہ نے لکھی تاریخ رحلت ہوا ہے سعدی شیراز ثانی

۱۲۸۵ھ

[۳]

ذیل میں چند قطعات تاریخ اور دی جا رہے ہیں جو مطبوعہ ہیں لیکن عام نگاہوں سے اوجھل ہیں :

تاریخ وفات مرزا اسداللہ خاں غالب متخلص بہ نوشتہ

کہ فن شاعری میں یکتا بلکہ عدیم المثل تھے

از محمد علی جوہا

غالب چو ازیں جہان گزراں

شد داخل خلد ہر ملک گفت

تاریخ وفات او ز جوہا

" تاج سر شاعراں " فلک گفت(۲)

[۴]

تاریخ وفات مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی صانہا اللہ بالمعمورہ

از منشی اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی (۳)

۱- اس مصرع سے ۱۲۸۳ برآمد ہوتے ہیں اور اگر قاعدے کے خلاف ہمزہ کا ایک عدد بھی شامل کرلیا جائے تو ۱۲۸۴ ہو جاتے ہیں لیکن اس بے قاعدگی کے ساتھ اگر " ہائے " کو "وائے" سے بدل دیں تو ۱۲۸۵ھ ہو جاتے ہیں - (ق)

۲- ' تاج سرشاعراں ' سے ۱۲۸۶ برآمد ہوتے ہیں -

۳- نظم منیر (مطبع سعیدی رام پور) ص ۵۱۷

ان غالبِ دہلوی کلیم دوراں سلطان سخن غلام آل یسنین
در نظم و زبان فارسی نامیِ دہر در نثر بمسند افادات مکین
برداشتہ رخت ازیں سرائے فانی یارب برسانیش بفردوس برین
دنیا ست سیاہ بدیدۂ اہل سخن در برج لحد چو رفت آں مہر مبین
تاریخ وفات او چنیں گفت منیر آہ افصح عصر و حیف ثانی حزین
۱۲۸۰ھ

[٥]

قطعات (۱) تاریخ وفات نواب اسداللہ خاں غالب دہلوی

از منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی (۲)

حیف کہ غالب ز جہاں رخت بست بود یکے شاعر با حلم و فضل
سرد چو او ایں ہمہ بے جاں شدند شعر و سخن، نثر و ہنر، علم و فضل
۵۰۰ + ۱۱۰ + ۲۵۰ + ۲۰۰ + ۱۱۰ + ۱۱۰ = ۱۲۸۰ھ

تھا شاعر نامی یہی اب دنیا میں
افسوس یہ ہے کہ مرگیا غالب بھی
ہے سحر یہ مصرع مرے لب پر جاری
دنیا سے آج چل بسا غالب بھی
۱۲۸۰ھ

۱۔ ملاحظہ ہو دیوان سحر ''سحر سامری و طامات سحر'' نول کشور پریس کان پور ۱۸۹۳ء، ص ۱۱۱

۲۔ منشی دیبی پرشاد سحر ۲۴ دسمبر ۱۸۴۰ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے، کتب متداولہ مولوی طاہر الدین فرشوری سے پڑھیں۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے، تصنیف و تالیف کا ذوق تھا، متعدد کتابیں یادگار ہیں۔

مر گیا غالب جو لاثانی تھا شاعر ہند میں
لے گیا دنیائے دوں سے حسرتیں کیا کیا دریغ
فکر میں اے سحر میں بیٹھا ہوا تھا نا گہاں
یہ ندا آئی فلک سے '' وائے واویلا دریغ '' ۱۲۸۵ھ

[۶]

قطعہ تاریخ وفات (۱) مرزا غالب دهلوی

از مفتی محمد حسن خاں بریلوی صدرالصدور (۲)

غالب کہ بود پیر مغان سخنوری — زیں دھر چوں بدار سلامت گرفت راہ
ساغر شکست ومیکدۂ شعر شد خراب — مینا گریست زارکہ '' غالب بمرد آہ ''
۱۲۸۵ھ

[۷]

قطعہ تاریخ از مولوی عبد الحکیم جوش

آغا احمد علی مصنف ہفت آسمان لکھتے ھیں : (۳)

مولوی عبد الحکیم جوش تخلص ، مدرس اسکول میرٹھ ، تاریخ وفات او کہ در سنہ یک ہزار و دو صد و ہشتاد و پنج واقع شدہ چنیں یافتہ

مرد ہیہات میرزا نوشہ ۱۲۸۵ھ

۱- چمنستان سخن از مفتی محمد حسن خاں ، مطبع رفاہ عام گورکھپور ۱۹۰۸ء ، ص ۲۱

۲- مفتی محمد حسن خاں بریلوی سے غالب کے خاصے تعلقات تھے ، رام پور کے دوسرے سفر میں دھلی واپس ہوتے ہوئے مرزا غالب مفتی صاحب ھی کے پاس ٹھیرے تھے - تقریباً ۱۸۷۳ء میں انتقال ہوا -

۳- ملاحظہ ہو ' ہفت آسمان ' از آغا احمد علی ، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ ۱۸۷۳ء ، ص ٦٦

[۸]

شمس الملک مظہرالدین حیدر خاں بہادر مظفر جنگ

شعر :

سال میلاد اوست لفظ " غریب " ۱۲۱۲ھ

سال فوتش " بمرد غالب آہ " ۱۲۸۵ھ

تعمیر مزار :

امتداد زمانہ سے مرزا غالب کی قبر شکست و ریخت ہوگئی تھی اور اس کی حالت بہت خراب و خستہ تھی ۔ تعمیر کے سلسلے میں بعض موقر اخبارات میں تحریک بھی چلی ، چنانچہ سب سے پہلے مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۱۲ء میں اس سلسلے میں آواز اٹھائی ۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں نے اس بات کو آگے بڑھایا ۔ ہمیں مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی ایڈیٹر ذوالقرنین (ف ۱۹۳۰ء) کا ایک اعلان ملا ہے ۔ جس کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :

مرزا غالب کے مزار کی مرمت (۱)

" کئی مرتبہ ملک کے بعض معزز اخبارات نے مرزا غالب مرحوم کی قبر کی مرمت کی آواز اٹھائی ہے لیکن افسوس کہ اب تک اس کے متعلق کوئی عملی کاروائی نہیں ہوئی ۔ مرزا مرحوم کا مزار جو ابھی بالکل بے نشان نہیں ہوا اور جو ایک مشہور اور مقدس درگاہ کے احاطے کے اندر واقع ہے ، اس کی مرمت ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں اور نہ اس کے لیے کسی خاص چندے اور بڑے بڑے عطیوں کی ضرورت ہے ۔ تمام ہندوستان میں دلدادگان کلام غالب تھوڑا تھوڑا چندہ دیں جب بھی یہ کام آسانی سے پورا ہوسکتا ہے ۔ میں اپنی طرف سے اردو دیوان غالب کے خاص ایڈیشن کی بقیہ ۳۰۰ (جلدیں) اس ضروری کام کے لیے اس طریقے سے پیش کرتا ہوں کہ وہ تمام ارباب درد و احساس جو مرزا غالب کی یاد کو زندہ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں اجازت دیں کہ ایک روپیہ آٹھ آنے میں اردو

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو " عبرت " نجیب آباد ، ستمبر ۱۹۱۶ء

دیوان غالب کا خاص ایڈیشن بذریعہ وی۔ پی ان کے نام نامی پر بھیج دیا جائے اور جس وقت یہ سب کتابیں فروخت ہو جائیں تو کل روپیہ حضرت خلیق دہلوی یا کسی دوسرے دوست کو جو دہلی میں مقیم ہوں ، سپرد کردیا جائے کہ وہ اس تاجدار سخن کے ٹوٹے ہوئے مزار کی جس کا نظارہ اہل نظر اور اہل دل کے لیے ایک عبرت ناک سین کا کام دیتا ہے ، مرمت درا کے آثار سلف کی بقا و حفاظت کے فرض کفایہ کو انجام دیں۔

خاکسار نظامی عفی عنہ ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں "

معلوم ہوتا ہے کہ نظامی مرحوم کی اس پیش کش کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا ، ان کی یہ اپیل ماہنامہ عبرت ، نجیب آباد میں شائع ہوئی تھی ، بشیر الدین دہلوی مولف ' واقعات دارالحکومت دہلی ' ۱۹۱۹ء میں لکھتے ہیں :

" اتنا بڑا نامی گرامی شاعر اور اس کی قبر جو آج یادگار زمانہ ہوتی اس کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ وائے برقوم ! اس سے معلوم ہوا کہ نفسی نفسی کا معاملہ ہے یہاں قوم ووم خاک بھی نہیں ، غالب کے ایک نہیں دو نہیں ، ہزاروں شاگرد تھے جن میں سے اب بھی بہت سے کھاتے پیتے خوش حال ہیں۔ جن کو دعوئ غالب سے تلمذ کا ہے ، اگر تھوڑا تھوڑا بھی دیتے تو قبر کی یہ حالت نہ ہوتی۔ کچھ دن ہوئے باسی کڑھی میں ابال آیا تھا ، غلغلہ سنا تھا کہ غالب کی قبر بن رہی ہے ، چندہ ہو رہا ہے اور کچھ چندہ ہوا بھی، مگر جس طرح مسلمانوں کے اور کام اینڈ رہ جاتے ہیں ، یہ دفتر بھی گاؤ خورد ہو گیا۔ خیر ان کی کوئی یادگار بنائے یا نہ بنائے ان کا کلام اور ان کی تصانیف ایک ایسی دائمی یادگار ہے کہ ابدالآباد تک رہے گی۔ قبر پر یہ کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوہو یہ غالب کی قبر ہے ورنہ کوئی جانتا بھی نہ کہ یہ در بے بہا کہاں رل گیا۔

رشک عرفی و فخرطالب مرد		اسد اللہ خان غالب مرد

کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محزوں
تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا ''گنج معانی ہے تہ خاک''
۱۲۸۵ھ

پھر ۱۹۳۰ء میں یہ تحریک نہایت زور کے ساتھ اٹھی اور آخر ۱۹۵۵ء میں مرزا غالب کی قبر کی مرمت و تعمیر کا کام انجام کو پہنچا اور اس کا افتتاح ۱۵ - فروری ۱۹۵۵ء کو ہوا جو ان کی وفات کا دن ہے۔ (۱)

علامہ اقبال ، غالب کے مزار پر :

درگاہ نظام الدین اولیا میں غالب کا مزار ہونے کی وجہ سے اکثر لوگ غالب کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے پہنچتے ہیں، چنانچہ جب علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے عازم یورپ ہوئے تو پہلے درگاہ نظام الدین اولیا میں حاضری دی اور پھر مرزا غالب کی قبر پر فاتحہ پڑھی - اس فاتحہ خوانی کا ذکر شمس العلما خواجہ حسن نظامی دہلوی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو : (۲)

'' چلتے چلتے مرزا غالب کے مزار پر بھی گزر ہو گیا اور ایک ایسا نظارہ دیکھا جو وفات غالب سے لے کر آج تک کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ جب ہم قبرستان کے احاطے میں داخل ہوئے، سورج ڈھل چکا تھا شاید ایک بجا ہوگا - دھوپ میں ناقابل برداشت تیزی تھی - اول چند مغل امرا کی قبروں کو پامال کرنا پڑا جو مرقد غالب کے رستے میں حائل تھیں۔ اس کے بعد ہم خاک کے اس ڈھیر پر پہنچ گئے جس کے نیچے گنج معانی دفن ہے۔ مرزا غالب کا آدھا چبوترہ مٹی میں پوشیدہ تھا - ہم اس رخ ایک کچی دیوار کا تکیہ لگا کر بیٹھ گئے - یہ چھوٹی سی دیوار غالب کے دائیں پہلو میں اداس اور

۱- غالب سوسائٹی از مالک رام ماہنامہ 'آجکل' دہلی مارچ ۱۹۵۸ء
۲- اخبار '' وطن '' لاہور، مجریہ ۸ ستمبر ۱۹۰۵ء روز جمعہ مطابق ۷ رجب ۱۳۲۳ھ جلد ۵ شمارہ ۳۰ ص ۸ -

چپ چاپ کھڑی تھی - اس نے باوجود بے سر و سامانی ہم پر سایہ ڈالا اور مرنے والے غالب کی طرف سے میزبانی کی - نیرنگ و اقبال پر اس سین کا اتنا اثر تھا کہ افسردگی کے عالم میں خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے ، ویسی ہی ، اکرام ، نذر محمد ، نور الدین ، حسن نظامی کی حالت تھی اور مزار کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے - یکایک ولایت کی سریلی اور مہین آواز میں غالب کی روح بولنے لگی جس وقت ولایت نے غالب کا یہ شعر پڑھا :

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

سب پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہوگئی - خاص کر اقبال جھوم جھوم کر شعر کی تکرار کرتے تھے - اس پر عبرت و پر حسرت سین کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا اور ہم غالب کو اکیلا چھوڑ کر چلے آئے "۔

اب خواجہ حسن نظامی کے رفیق حضرت ملا واحدی کے تاثرات ملاحظہ فرمایئے :

" واپسی میں پارٹی مرزا غالب کی قبر پر ٹھہری - میر نیرنگ قبر کی لوح کو پکڑے بیٹھے تھے ، اقبال دائیں جانب عالم محویت میں تشریف فرما تھے ، ستمبر کا مہینہ تھا ہوا بند تھی اور دھوپ بڑی تیز ، لیکن کسی کو گرمی کا احساس نہ تھا - ولایت بولا : حضور ! اجازت ہو تو مرزا غالب کی غزل پیش کروں - سرود بہ مستاں یاد دہانیدن ، یہاں کسے عذر تھا - چنانچہ اس نے کہنا شروع کیا :

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

غزل کے ان دو شعروں نے حاضرین میں ہلچل پیدا کردی - دیکھیے کس قدر بر محل تھے :

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ، ہوس بال و پر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

ولایت نے غزل ختم کی اور پارٹی ہوش بجا کر کے چلنے کے لیے اٹھی۔ اقبال نے جوش عقیدت میں غالب کی لوح مزار کو بوسہ دیا اور شہر کا راستہ لیا ''۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اور مافی الضمیر

ڈاکٹر ابو محمد سحر

[۱]

شعر و سخن کے قدیم تصورات کے مطابق کلام کا ذو معنی ہونا محاسن میں داخل تھا بلکہ دو متضاد معانی کا نکالنا بھی حسن سمجھا جاتا تھا۔ علم بدیع میں صنعت ادماج اور صنعت توجیہ کی موجودگی اس کا ثبوت ہے۔ ان دونوں صنعتوں کی بنیاد ایہام پر ہوتی تھی۔ ایک تو ان سے شعر میں بسا اوقات واقعی لطف پیدا ہوجاتا تھا، دوسرے شعرا اپنے زمانے کے فنی ذوق و شعور سے بے نیاز نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ صنعت پرست شعرا ان صنعتوں کو جا و بے جا برتنے کی کوشش کرتے تھے تو دیگر شعرا بھی جا بجا ان سے کام لیتے تھے۔ ان کتابی محاسن کے علاوہ شعر کا ایک حقیقی وصف جو ذہن کو ایک سے زیادہ معانی کی طرف منتقل کرتا ہے ابہام ہے۔ اگر یہ اہمال کی حد تک نہ پہنچ جائے تو شاعری بلکہ تمام فنون لطیفہ کے لیے اس کی سحر کاری مسلم ہے۔

اردو کی قدیم شاعری میں ایہام گوئی بھی ملتی ہے اور ابہام کی سحر کاری بھی، یہی وجہ ہے کہ ایک شعر میں کئی معانی تلاش کرنے کا طریقہ بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس کا ایک اور سبب شعر کے فہام و تفہیم سے سروکار رکھنے والوں میں وہ عدم اعتماد بھی ہے جو متعدد دو معنی شعروں نے پیدا کیا ہے۔ چناں چہ شارحین نے اسے ایک عام اصول کی طرح اختیار کر لیا ہے کہ ایک شعر میں ایک سے زیادہ معانی تلاش کیے جائیں۔ ہر شارح شعر کے الفاظ یا پیرایۂ بیان سے ایک سے زیادہ

معانی نکالنا چاہتا ہے اور اس کو سخن فہمی کی دلیل جانتا ہے ، حالانکہ کچھ ایسے شعروں کو چھوڑ کر جن میں شاعر نے قصداً ایہام و ابہام کا پہلو رکھا ہو ، سخن فہمی کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ہی صحیح مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے ۔ کسی اچھے شاعر کا مقصد عموماً یہ نہیں ہوتا کہ ایسے الفاظ یا پیرائے جمع کر دیے جائیں جن سے کئی کئی معانی نکل آئیں ، کیونکہ شاعر خواہ اپنے مافی‌الضمیر کو آشکار کرے یا چھپائے ، اس کے کلام میں مافی‌الضمیر کی ادائی کو مرکزیت حاصل رہتی ہے ۔ چناں چہ بعض شعروں میں ایک سے زیادہ معانی پر نظر نہ پڑنا سخن فہمی کی کوتاہی پر دلالت کرتا ہے ، وہیں ہر شعر میں ایک سے زیادہ معانی تلاش کرنا یا صحیح معنی کے بجائے یا اس کے ساتھ ساتھ کبھی سطحی اور کبھی بعید معنی پر زور دینا بھی سخن فہمی کا کوئی اچھا نمونہ قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اگر شاعر کا مقصد اپنے مافی‌الضمیر کی ادائی ہے تو سخن فہم کا فرض بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ شاعر کے مافی الضمیر کا پتا لگائے ۔

غالب کے کلام کی شرحوں میں متعدد اشعار کے ایک سے زیادہ معانی بیان کیے گئے ہیں ۔ کچھ اشعار تو فی‌الحقیقت اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ شارحین کو عقلی گدا لگانے کے سوا چارہ ہی نہ تھا ۔ کچھ اشعار کی معنویت اور تہ داری نے انہیں کئی کئی معانی لکھنے پر مجبور کیا ہے ، لیکن اس رجحان نے ان کے بہت سے ایسے اشعار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جن کے صحیح معنی ایک ہی ہو سکتے ہیں ۔ الفاظ کے پیچوں میں الجھنے اور شاعر کے مافی الضمیر کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ان کے بھی ایک سے زیادہ معانی لکھے گئے ہیں ۔ ہر شارح ایک الگ معنی بھی لکھتا ہے ، اس طرح ایک شعر اور کئی معانی سے گزر کر بات جتنی شرحیں اتنے معانی تک پہنچ جاتی ہے ۔ غالب کے شعروں میں کئی کئی معانی بیان کرنے میں جو قباحت ہے اس کو ایک اور زاویے سے ان کے کلام کے ایک مشہور شارح عبد الباری آسی نے محسوس کیا تھا ۔ چناں چہ انہوں نے لکھا ہے :

” میں یہ تو کیوں کر کہہ دوں کہ میں نے جو معانی بیان کیے ہیں وہ صحیح اور حتمی ہیں ۔ اگر واہمۂ خلاق نہ ہو تو کافی ہیں ۔ ایک شعر کے دس دس معنی بیان کرنا غالب پر تہمت

لگانے سے کم نہیں"۔ (۱)

یہ خیال تو بالکل غلط ہو گا کہ غالب کے کلام کی شرحوں سے ان کے کلام کو سمجھنے میں مدد نہیں ملتی کیوں کہ انھیں شرحوں میں فرداً فرداً سخن فہمی اور ذہانت کے ایسے نمونے بکھرے ہوئے ہیں جن کے بغیر غالب کے بعض اشعار کے صحیح مفہوم تک رسائی حاصل کرنا آسان نہ تھا ۔ لیکن استدلالی طرز فکر کی کمی کی وجہ سے کوئی ایک شرح بھی ایسی نہیں ہے جس پر غالب کے کلام کے مطالعے میں اکتفا کی جا سکے ۔ آغا محمد باقر کی شرح "بیان غالب" ان شرحوں سے تو ضرور ایک حد تک بے نیاز کر دیتی ہے جن کی تلخیص اس میں کر دی گئی ہے لیکن کئی شرحوں کے مطالعے کے بعد جو الجھاؤ پیدا ہوتا ہے وہ بدستور قائم رہتا ہے۔ اس شرح کا مقصد براہ راست غالب کے اشعار کے صحیح معانی سمجھانے کے بجائے مختلف شارحین کی تشریحات کو یکجا کرنا ہے ۔ بقول مرتب :

> "اس شرح کی تالیف سے میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ دیوان غالب کی شرح پڑھنے والوں کو اگر بالتفصیل نہیں تو مجملاً اس قدر معلوم ہو جائے کہ مختلف شارحین نے غالب کے ہر شعر کو کس نقطہ نظر سے دیکھا ہے اور اس کے مفہوم میں کیا کیا موشگافیاں کی ہیں ۔ چناں چہ جن اشعار پر شارحین نے اختلاف کیا ہے ، میں نے کوشش کی ہے کہ مختصراً ان کے نقطہ نظر کو پیش کر دیا جائے تا کہ پڑھنے والا آسانی سے سمجھ جائے کہ اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے"۔ (۲)

غرض یہ کہ ایک سے زیادہ معانی بیان کرنے کی مسلسل کوشش سے کوئی شرح خالی نہیں ۔ غالب کی دقت پسندی اور معنی آفرینی کے پیش نظر ان کے بہت سے اشعار کے صحیح معنی سمجھنا دشوار تھا تو ان کے کلام کی شرحوں نے اسے دشوار تر بنا دیا ہے ۔

۱۔ مکمل شرح دیوان غالب (ترمیم شدہ) از آسی ، صدیق بک ڈپو ، لکھنؤ ، مقدمہ ص ۳۱ ، ۳۲

۲۔ بیان غالب ، شرح دیوان غالب ، آزاد بک ڈپو ، امرتسر ، ص ۲ ، ۳

غالب نے اپنے ایک مقطعے میں تو صرف طرز بیدل میں ریختہ لکھنے کا ذکر کیا ہے (۱) لیکن ایک اردو خط میں انھوں نے '' ابتدائے فکر سخن '' میں بیدل کے ساتھ ساتھ فارسی کے دو اور شعرا ، مرزا جلال اسیر اصفہانی اور شوکت بخاری کی پیروی کا بھی اعتراف کیا ہے(۲) - یہ کہنا محال ہے کہ '' ابتدائے فکر سخن '' سے انھوں نے اپنی شاعری کے آغاز کا کتنا زمانہ مراد لیا ہے - عام طور پر ان کی اردو شاعری کا ابتدائی دور دیوان غالب نسخۂ بھوپال (قلمی) کی کتابت یعنی ۱۸۲۱ء تک خیال کیا جاتا ہے لیکن دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ میں اس دور کے کلام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۲۱ء تک وہ اپنے مخصوص اور بہترین رنگ میں بھی کہنے لگے تھے - ان کا بہترین رنگ بہت کچھ سلاست و روانی کے باوجود مجموعی حیثیت سے کسی زمانے میں بھی فارسیت یا فارسی آہنگ سے مبرا نہیں رہا - چنانچہ ان کے کلام کی صحیح فہم و تفہیم کے لیے فارسی شاعری سے سرسری واقفیت تو کیا گہری واقفیت بھی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے لازمی ہے ان کے اشعار کے ایک ایک لفظ ، ایک ایک ترکیب اور ایک ایک مضمون کو ذہن میں رکھ کر بیدل ، اسیر ، شوکت اور دوسرے فارسی شعرا کے کلام کا بالاستیعاب تحقیقی مطالعہ کیا جائے - ان کے بعض شارحین اور ناقدین نے اپنی فارسی دانی کی بدولت ان کے بہت سے اشعار کے ہم مضمون فارسی اشعار تو ڈھونڈھ نکالے ہیں لیکن فارسی شاعری میں ان کے الفاظ و تراکیب اور طرز تخیل کا کوئی ایسا کھوج لگانے کی بھرپور کوشش ابھی تک نہیں کی گئی جس سے ان کے مشکل اشعار کے معانی یقینی طور پر متعین ہو سکیں -

اسی طرح ان کے متعدد اشعار کے جو کئی کئی معانی شارحین نے لکھ دیے ہیں ، ان کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کر کے ایک معنی کا تعین ضروری ہے کیوں کہ غالب جیسے شاعر سے اس کی زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ

۱- طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

۲- خط بنام عبدالرزاق شاکر مورخہ یکم اگست ۱۸۶۵ء بحوالہ خطوط غالب ، مرتبہ غلام رسول مہر ، کتاب منزل لاہور ، طبع دوم ، ص ۳۲۰

ایسے الفاظ اور پیرائے جوڑنے میں اپنا فن صرف کرے گا جن سے کئی کئی معانی نکال لیے جائیں ۔ چند شعروں میں بالقصد یا اتفاقاً یہ بات ہو سکتی ہے ورنہ زیادہ تر اشعار اس کے مافی الضمیر کے ترجمان ہوں گے ۔ غالب کے اشعار میں جہاں کہیں شارحین کو ایک سے زیادہ معانی کی موجودگی کا التباس ہوا ہے ، وہاں الفاظ کے ظاہری رکھ رکھاؤ کو دیکھنے کے بجائے غالب کی زندگی اور شخصیت ، ان کی شاعری کے مزاج اور فکری و فنی تصورات وغیرہ کو مشعل راہ بنانا چاہیے کیوں کہ ان کی مدد سے الفاظ کے حقیقی یا فرضی پیچوں سے دوچار ہونے کے باوجود اس کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے گا کہ غالب کا مدعا کیا ہوگا ۔

غالب کے متعدد اشعار کے نہ صرف ایک سے زیادہ معنی لکھے گئے ہیں بلکہ بعض اشعار کے صحیح معنی بیان کرنے کے لیے ظاہری معنی کا نام دے کر ایسے معنی بھی فرض کیے گئے ہیں جن کو ان کے اشعار سے کوئی علاقہ نہیں ہے ۔ گویا صحیح معنی بیان کرنے کے لیے ایک نہ ایک غلط معنی بیان کرنا بھی ضروری سمجھا گیا ہے ۔ اس کی ابتدا یادگار غالب میں مولانا حالی کی بعض مشہور تشریحات سے ہوتی ہے ۔ انھوں نے غالب کے کلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ " ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں لطف نہیں اٹھا سکتے (۱) "۔ لیکن اس کی جو مثالیں انھوں نے دی ہیں ان میں سے بعض میں ظاہری معنی محض اپنے قول کی تائید کے لیے پہنائے ہیں ۔ مثلاً :

کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لے گا ، اس لیے جان کو عزیز نہیں رکھتا ۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے ، پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جاسکتی ہے "۔ (۲)

۱- یادگار غالب (رام دیال اگروال ، الہ آباد ، ۱۹۰۸ء) ، ص ۱۲۶

۲- یاد گار غالب ، ص ۱۲۷

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

'' اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے، اس لیے وہ ایک قدآدم کم ہوگیا ہے''۔ (۱)

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

'' کون اٹھاتا ہے مجھے۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اٹھاتا ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اٹھا دیتے تھے، دیکھوں اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے''۔ (۲)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

'' اس شعر سے جو معنی فورا متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے''۔ (۳)

پہلے شعر میں '' جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لے گا '' دوسرے شعر میں '' ترے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے '' اور تیسرے شعر میں ''اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں (محفل معشوق) سے کون اٹھاتا ہے

۱۔ یاد گار غالب ، ص ۱۲۸
۲۔ یاد گار غالب ، ۱۲۸ ، ۱۲۹
۳۔ یاد گار غالب ، ص ۱۲٦

کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے - چوتھے شعر میں دشت کو دیکھ کر گھر یاد آنے کا یہ مفہوم کہ خوف معلوم ہوتا ہے قطعاً غیر شاعرانہ ہے اور کوئی اوسط درجے کا سخن فہم بھی شعر سے یہ مفہوم لینے کے لیے تیار نہ ہوگا ، کیونکہ اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ دیوانے کو زیادہ سے زیادہ ویرانی ہی مرغوب ہوتی ہے - ویرانی سے خوفزدہ ہونے کا مطلق کوئی پہلو نہیں ہوسکتا - اس شعر کے دوسرے معنی بیان کرنے میں بھی حالی کی نظر اس نکتے پر نہیں پڑی کہ شاعر کا مقصود دشت کی ویرانی کی تائید یا توثیق نہیں ہوسکتا کیونکہ دشت تو ویران ہوتا ہی ہے - دراصل غالب نے اس شعر میں غزل کی روایات کے مطابق دشت کی ویرانی سے مشابہ قرار دے کر اپنے گھر ہی کی انتہائی ویرانی کا بیان کیا ہے -

ان تنقیحات کی روشنی میں مندرجہ بالا اشعار میں سے ہر شعر کے ایک ہی معنی صحیح ہیں - اس لیے ان کے ایک ایک اور معنی جو حالی نے فرض کیے ہیں نظری خیال کیے جانے کے لائق ہیں - کلام غالب کی شرح کے سلسلے میں اگرچہ دوسرے موقعوں پر حالی کی تشریحات اور نکتہ آفرینیاں استناد کا درجہ رکھتی ہیں لیکن یہاں قابل قبول نہیں ہیں - اسی طرح بعض دوسرے اشعار کے بھی جنھیں دیگر شارحین نے ذو معنی قرار دیا ہے ، ایک معنی متعین کیے جاسکتے ہیں - مثلاً :

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اس شعر کا صحیح مفہوم شارحین نے بہ تبدیل الفاظ یہ لکھا ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے ، وہ اس سے پہلے نہیں آسکتی ، لیکن رات بھر نیند کیوں نہیں آتی ؟ کیا وہ بھی موت ہوگئی ہے کہ وقت مقررہ سے پہلے نہ آئے گی - لیکن اس کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ :

> " دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب موت کا ایک دن مقرر ہے تو پھر موت کے خوف کی وجہ سے نیند رات بھر کیوں نہیں آتی "- (۱)

لیکن یہ دوسرا مفہوم نفسیات انسانی کے بالکل خلاف ہے اور اس کا

۱- بیان غالب ، ص ۱۰۴

شعر سے کوئی تعلق نہیں ۔ موت کی ناگزیری کے کئی دوسرے اثرات انسانی نفسیات پر پڑتے ہیں اور پڑسکتے ہیں لیکن شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو جس کو اس خیال سے رات بھر نیند نہ آتی ہو ۔ بعض خاص صورتوں میں موت کے خوف سے یہ کیفیت رونما ہو سکتی ہے لیکن اس شعر میں موت کی فطری ناگزیری کے سوا کسی اور حالت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ دوسرے مفہوم سے ملتی جلتی بات غالب نے مختلف پس منظر میں یوں کہی ہے :

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

-- --- -

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

(الف) '' کیسی وفا اور کہاں کا عشق ، جب سر ہی پھوڑنا ٹھیرا تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں ہونا کیا ضرور ہے ۔ جہاں جی چاہے گا سر پھوڑ لیں گے ۔ غالب :

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

بقول طباطبائی یہ شعر ولگ و سنگ میں گوہر شاہوار ہے۔ آسی لکھتے ہیں کہ اس شعر کی بندش میں وہ چستی ہے جس کی تعریف غیر ممکن ہے'' ۔ (۱)

(ب) ''وفا کیسی کہاں کا عشق ، یہ معشوق کے کہے ہوئے الفاظ ہیں جن کو استفہاماً دھرایا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جو فرماتے ہیں کہ کیسی وفا اور کہاں کا عشق تو اگر میں وفادار نہیں ہوں اور مجھے عشق نہیں ہے بلکہ خواہ مخواہ اور بے وجہ سر پھوڑتا ہوں تو اس میں آپ ہی کے سنگ آستاں کی کیا خصوصیت تھی ، ہر پتھر اور ہر دیوار سے سر پھوڑا جا سکتا تھا ۔ حضور عالی آپ ہی کے آستاں سے سر مارا جانا تو اسی کی دلیل ہے کہ مجھے آپ ہی

۱- بیان غالب ، ص ۳۴۳ ، ۳۴۴

سے عشق ہے اور میں وفادار ہوں '' - (۱)

ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب نے '' حرف غزل '' میں اس شعر سے جو بحث کی ہے اس سے سہا مجددی کے لکھے ہوئے ثانی الذکر معنی کی تائید ہوتی ہے - جدید تر پیرائے میں شعر کی تشریح کرنے کے بعد انھوں نے لکھا ہے :

'' اس شعر کو اس پہلو سے دیکھیے تو اس میں غالب کی جدت ادا بھی ملے گی اور پھیلی ہوئی بات کو ایک شعر میں سمیٹنے کی عادت بھی - اس کے علاوہ غزل کی روایت میں یہ باعث ننگ ہے کہ عاشق آئین عشق و وفا ترک کرنے کا اعلان کر دے اور یہ بھی نہ بتائے کہ محبوب کی کس غلطی پر وہ اس قدر چراغ پا ہو رہا ہے ، صرف سنگ دلی تو اس کی علاحدگی کا معقول بہانہ نہیں بن سکتی -

غالب نے اس شعر میں جو معنویت رکھی ہے ، بات کو ایک نئی طرح کہہ کر اس میں جو لطف پیدا کیا ہے ، اسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے - عاشق کی خفگی کا مفہوم نکالنا شعر کو بالکل سپاٹ کر دینا ہے اور غالب کی فنکاری کے ساتھ ظلم کرنا ہے '' - (۲)

اول الذکر تشریح پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر متعلق شعر کے بطور مثال ذہن میں آجانے کی وجہ سے دیگر شارحین صحیح مفہوم کی طرف رجوع نہیں کر سکے -

نظم طباطبائی نے اس شعر کے '' رنگ و سنگ '' کی ستائش کی ہے لیکن ان کی نظر بس سنگ ہی سنگ سے ٹکرائی ہے - رنگ کو انھوں نے ٹھیک سے نہیں دیکھا اور '' ڈھنگ '' پر تو انھوں نے نگاہ ہی نہیں ڈالی ، ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ غالب کی غزل گوئی کا دامن واسوخت نگاری سے بالکل پاک ہے - معشوق کی بے نیازی کے مقابلے میں یا تو وہ تسلیم کی خو

۱- شرح دیوان غالب از سہا مجددی ، ص ۳۱۷ ، ۳۱۸

۲- حرف غزل ، ص ۱۸۱ ، ۱۸۲

ڈالنے کا تہیہ کرتے ہیں یا پھر ان کے دل میں غم و غصہ کے عالم میں اس کے دامن کو حریفانہ کھینچنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ معشوق کی سنگ دلی سے تنگ آ کر کسی دوسرے معشوق سے محبت کا ارادہ کرنے کی منزل ان کے یہاں نہیں آئی ۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(الف) '' غالب عشق پر کسی کا زور نہیں ۔ یہ وہ آگ ہے کہ نہ لگائے لگ سکتی ہے اور نہ بجھائے بجھ سکتی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ عشق نہ اپنی خواہش سے پیدا ہوتا ہے اور نہ اپنی خواہش سے ترک کیا جا سکتا ہے '' ۔ (۱)

(ب) '' غالب عشق پر کسی کا زور نہیں ہے ۔ یہ ایک ایسی آگ ہے کہ نہ لگائے لگ سکتی ہے اور نہ بجھائے بجھ سکتی ہے ، یعنی اگر چاہیں کہ معشوق کے دل میں یہ آگ لگا دیں یا عشق کے دل سے اس شعلے کو بجھا دیں تو قریب قریب غیر ممکن ہے '' ۔ (۲)

ثانی الذکر مطلب میں معشوق کے دل میں عشق کی آگ لگانے اور عاشق کے دل سے اس شعلے کو بجھانے کی تاویل محض ٹھونس ٹھانس ہے ، کیونکہ شعر میں جذبۂ عشق کی بے اختیاری کے سوا کسی دور دراز پہلو کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے ۔

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

'' یعنی ہم تیرے وعدہ کرنے سے جیے تو تو نے یہ سمجھ کر جھوٹ جانا کہ اگر ہمارے وعدے کا اعتبار ہوتا تو تجھے شادی مرگ ہو جاتی ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تیرے وعدہ کرنے پر جو ہم جیتے رہے تو تو سمجھ کہ ہم نے اس کو جھوٹ سمجھا

۱- بیان غالب ، ص ۳۸۱

۲- مکمل شرح دیوان غالب (ترمیم شدہ) از آسی ، ص ۳۰۱

کیوں کہ اگر کہیں ہم کو اس وعدے کا اعتبار ہوتا تو ہم خوشی سے مر جاتے " - (۱)

اس تشریح میں جس مفہوم کو دوسرا درجہ دیا گیا ہے شعر کا اصل مفہوم ہے - غالب نے معشوق کی وعدہ خلافی یا جھوٹے وعدے کرنے کی روش پر طنز کا ایک نادر پیرایہ اختیار کیا ہے جس کو دوسرے مضامین کی آمیزش سے خبط کر دینا شارحین کلام غالب ہی کا کام ہے -

مختصر یہ کہ کلام غالب کو شارحین کے واہمۂ خلاق ، دور کی کوڑیوں اور نکتہ ناشناسی سے پاک و صاف کر کے ایک مستند شرح لکھی جاسکتی ہے تا کہ عروس معنی کی مشاطگی کے شوق میں اس کے چہرے پر جو نقاب ڈالے گئے ہیں ، ان میں سے اگر سب نہیں تو کچھ ضرور اٹھ جائیں اور کلام غالب کے متعلمین اور شائقین کو اس کا جلوہ دیکھنے میں اتنی مشکل نہ ہو جتنی اس وقت ہے - لیکن یہ کام آسان نہیں - اس کی دشواری کا تھوڑا بہت اندازہ تو انہیں مثالوں سے ہو سکتا ہے جو اس سے پہلے پیش کی گئی ہیں ، کیوں کہ جب قدرے آسان اور مشہور شعروں کی تشریحات میں اتنے گودڑ بھرے ہوئے ہیں تو مشکل اور غیر معروف اشعار کی تشریحات کا کیا حال ہوگا ؟ اس کے علاوہ اس قسم کی کوشش کا اصل مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب اسے دوسرے بھی تسلیم کریں ، ورنہ جہاں دیوان غالب کی کم و بیش دو درجن شرحیں اس وقت موجود ہیں وہاں ایک شرح کا اضافہ اور ہو جائے گا - دیوان غالب کی شرحوں نے غالب کے اشعار کو سمجھنے سمجھانے میں جو خلفشار برپا کیا ہے وہ سخن فہمی کی کمی سے زیادہ استدلالی طرز فکر کی کمی کا نتیجہ ہے ، کیوں کہ شعر کے صحیح مفہوم تک رسائی نہ حاصل کرنے کی اتنی مثالیں نہیں ہیں جتنی گوہر مقصود کو پالینے کے بعد ادھر ادھر بھٹک کر اس کو گنوا دینے کی ہیں - جس ذہنی کیفیت میں شارحین گرفتار ہیں اس سے دیگر شائقین سخن بھی آزاد نہیں - اس لیے کامل اتفاق رائے کی توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے ، خصوصاً ایسی صورت میں کہ حالی ، نظم طباطبائی اور حسرت موہانی جیسے صاحب علم اور صاحب نظر شارحین ، غالب کے متعدد اشعار کے مختلف معانی لکھ چکے ہیں - لیکن خوش قسمتی سے اس موضوع کا

۱- مکمل شرح دیوان غالب (ترمیم شدہ) از آسی ، ص ۴۴

ایک چھوٹا سا دائرہ ایسا ہے جس کی طرف توجہ دینے سے مکمل اتفاق رائے کے لیے زمین ہموار ہو سکتی ہے۔

[۳]

غالب اپنے کلام کی فنی اقدار کا پورا پورا شعور اور احساس رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کئی شعروں میں اس کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً :

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

وہ اپنے کلام کے ابہام و اجمال کی معنویت سے بھی آگاہ تھے :

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

انھوں نے اپنے اشعار کے ہر لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بھی کہا ہے :

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ان کے اشعار کے ہر لفظ پر چاہے یہ بات پوری نہ اترے لیکن انھوں نے

یسے الفاظ و تراکیب کثرت سے استعمال کیے ہیں اور اس میں تو ذرا بھی
بالغہ نہیں کہ ان کے اکثر اشعار گنجینۂ معنی کا طلسم ہیں ۔ دوستوں
ور شاگردوں کے استفسار پر انھوں نے اپنے خطوط میں جگہ جگہ اس طلسم
کو توڑنے اور اپنے مافی‌الضمیر کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اگر
لفاظ و تراکیب اور اسالیب بیان سے کئی کئی معنی نکالنے کی ذہنی بازی گری
ی کو سخن فہمی کا مقصد اصلی نہ سمجھا جائے تو کم از کم ان اشعار کے
یک مفہوم کو متفقہ طور پر قبول کیا جاسکتا ہے ، جن کے معنی خود انھوں نے
لکھے ہیں ، ورنہ ہماری حیثیت گنجینۂ معنی کے ایک ایسے متلاشی سے
یادہ نہ ہوگی جس کے نزدیک نہ تو خلوص فن کی کوئی قدر ہے اور نہ شاعر کے
افی‌الضمیر کی کوئی حقیقت ۔ غالب نے ایک سچے فنکار کی طرح اپنے اشعار
میں ان مضامین کی ادائی کے لیے اتنا خون جگر کھایا ہے کہ ان کے شارحین
کا مزید خون جگر کھانا تحصیل حاصل تھا ۔

عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں غالب کے بیان کیے ہوئے معانی کو
غالباً سب سے پہلے حالی نے یادگار غالب میں پیش نظر رکھا تھا ۔ انھوں نے
بھی چند تشریحات میں غالب ہی کی عبارتیں ، معمولی سا لفظی فرق کر کے
بغیر حوالوں کے نقل کردی ہیں ۔ دیوان غالب کے شارحین کو عموماً
یا تو غالب کی تمام تشریحات کی خبر ہی نہیں ہوئی یا ان میں سے چند کا
ان کو علم ہوا تو انھوں نے ان کو پوری اہمیت نہیں دی ۔ چنانچہ چند
شعروں کو چھوڑ کر اکثر شرحوں میں یا تو غالب کے بیان کردہ معنی
ملتے ہی نہیں یا ملتے ہیں تو ان کے ساتھ دوسرے معنی بھی چسپاں ہیں ۔
'' بیان غالب '' میں بھی جو کئی دوسری شرحوں کی جامع ہے ، غالب کی بعض
تشریحات عام غلط فہمی کی بنا پر حالی سے منسوب کی گئی ہیں (۱) ۔ لیکن

۱۔ دیکھیے بیان غالب ، ص ۱۰۷ ، ۲۲ء اور خطوط غالب مرتبہ
غلام رسول مہر ، ص ۵۹۶ ، ۵۹۷ پر ان اشعار کی تشریحات :

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہوگئے

شاید یہی وہ واحد شرح ہے جس میں غالب کی تشریحات کو ان کے حوالے سے بھی التزام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ تاہم اس کا منطقی نتیجہ اس شرح میں بھی مفقود ہے کیونکہ ان کی ترجیح کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیا گیا ہے اور اختلاف کی صورت میں دوسرے شارحین کے لکھے ہوئے معنی بھی دے دیے گئے ہیں ۔ گویا غالب کی حیثیت بھی دیگر شارحین کی طرح ہے کہ ان کے بتائے ہوئے معانی کو قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے ۔

غالب کے بیان کیے ہوئے معانی سے واقفیت اورعدم واقفیت دونوں صورتوں میں اکثر ممتاز شارحین نے جو مختلف معانی لکھے ہیں وہ نہ صرف اس لحاظ سے مسترد کر دینے کے لائق ہیں کہ غالب کی تحریروں سے صحیح معانی معلوم ہو جاتے ہیں بلکہ وہ کسی آزادانہ تجزیے کی تاب لانے سے بھی قاصر ہیں ، مثلاً :

نک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

پیارے لال آشوب کے نام ایک خط میں غالب نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے :

" پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت ہے فولاد کے آئینے سے ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے ۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی ۔ اس کو الف صیقل کہتے ہیں ۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہوگیا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے ۔

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سن تمیز سے مشق جنوں ہے ۔ اب تک کمال فن حاصل نہیں ہوا ۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا ۔ بس وہی ایک لکیر صیقل کی جو ہے سو ہے چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جیب آثار جنوں ہی سے ہے "۔ (۱)

حسرت موہانی لکھتے ہیں :

۱- خطوط غالب ، مرتبہ مہر ، ص ۹۰ ۔

" یعنی جب سے میں نے گریبان کی حقیقت سمجھی ہے اسے چاک کر رہا ہوں لیکن ہنوز صیقل آئینہ ایک الف سے زیادہ نہیں ہے۔ استعاروں کو حذف کرنے کے بعد یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ترک تعلقات صفائی باطن خاطر خواہ حاصل نہیں ہوئی۔ واللہ اعلم " - (۱)

عبدالباری آسی نے نظم طباطبائی کی تشریح میں خفیف سی ترمیم کر کے لکھا ہے:

" جب سے میں نے اپنے آئینے (یعنی دل) کو گریبان سمجھا ہے اسی وقت سے اسے چاک کرنے میں مصروف ہوں۔ گویا جب ہی سے اس آئینے پر صیقل کر رہا ہوں مگر اب تک یہ پورے طریقے سے صاف نہیں ہوا۔ یا یہ گریبان اتنا پھٹا ہے کہ ایک الف کا نشان بن گیا ہے۔ آزاد قلندر منش لوگ اپنے سینے پر ایک الف کا نشان کھینچ لیا کرتے ہیں۔ یعنی صفائی دل خاطر خواہ حاصل نہیں ہوئی ......"- (۲)

غالب کی تشریح سے ناواقفیت کی بنا پر جب نظم طباطبائی حسرت اور آسی کو صیقل آئینہ کے صحیح معنی نہ معلوم ہو سکے تو پھر شعر کا مفہوم ان پر کیونکر واضح ہوسکتا تھا۔

متقابل ہے مقابل میرا رک گیا دیکھ روانی میری

" تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا؟ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، وجود و عدم۔ مقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہے جیسے حریف کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روئے خوے و عادت ضد ہمدگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رک گیا " - (۳)

اس شعر کے معنی لکھنے کے بعد عود ہندی میں غالب کی مندرجہ بالا

۱- شرح دیوان غالب، ص ۲۰

۲- مکمل شرح دیوان غالب، ص ۳۷

۳- غالب بنام عبدالرزاق شاکر، خطوط غالب مرتبہ مہر، ص ۴۳۱

تشریح حسرت کے سامنے آچکی تھی لیکن پھر بھی جو معنی انھوں نے پہلے لکھ دیے تھے ان کو شرح میں برقرار رکھنے میں انھیں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔ چنانچہ اب بھی شرح اس شعر کے ایک اور معنی کے طور پر پوش کی جاتی ہے جیسا کہ ''بیان غالب'' میں بھی درج ہے۔ لطف یہ ہے کہ غالب نے جو مضمون معشوق سے منسوب کیا ہے حسرت نے اس کو رقیب سے جوڑا ہے۔

> '' متقابل ہے یعنی بہ تصنع مقابل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حریف میری روانی (روانی طبع) کو دیکھ کر درحقیقت قائل ہو گیا لیکن ظاہر میں مقابلہ کیے جاتا ہے''۔ (۱)

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

قاضی عبدالجمیل جنون کے نام غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :

> '' یعنی اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر تیرا ملنا آسان نہیں ، نہ سہی ، نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں ، جس سے تو چاہتا ہے مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل کرلیا تھا ، رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کرسکتے''۔ (۲)

حالی بھی رشک کے پہلو کی صراحت نہ کرنے کے باوجود اسی مفہوم پر قائم رہے :

> '' مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی ، کیونکہ ہم مایوس ہو کر بیٹھے رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے ، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اسی لیے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی ''۔ (۳)

۱۔ شرح دیوان غالب ، ص ۱۰۸
۲۔ خطوط غالب مرتبہ مہر ، ص ۳۰۲
۳۔ یادگار غالب ، ص ۱۲۱

لیکن نظم طباطبائی نے ایک نیا نکتہ پیدا کر دیا :

" اسی شے کے لیے آسان ہونا اور دشوار ہونا کہتے ہیں جو ممکن الوقوع ہو لیکن جو آسان بھی نہ ہو اور دشوار بھی نہ ہو وہ ممتنع اور ناممکن الوقوع ہے"۔ (۱)

اسی سے اشارہ پا کر حسرت اور آسی نے شعر کا ایک اور مفہوم نکالا اور اس کو صحیح مفہوم پر ترجیح دے دی ۔ بقول حسرت :

" تحصیل دشوار آسان نہیں ہوتی مگر ممکن ہوتی ہے اور تحصیل محال سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتی ۔ شاعر کہتا ہے کہ ملنا تیرا آسان نہ ہو یعنی دشوار ہو ، تاہم سہل ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ دشوار بھی نہیں محال ہے ، جس میں میرا کسی طرح قابو نہیں محض مجبور ہوں "۔ (۲)

دشوار اور محال کا لغوی فرق صحیح بیان کیا گیا ہے لیکن " دشوار بھی نہیں " کے معنی صرف یہ ہیں کہ " دشوار نہیں ہے" یعنی آسان ہے۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ محال ہے ۔ سیدھے سادے الفاظ اور اسالیب کی تشریح میں اس قسم کا تصرف اور تحریف کلام غالب کی تفہیم میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

نبی بخش حقیر کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں :

" اس میں دو استفہام آ پڑے ہیں کہ وہ بطریق طعن و تعریض معشوق سے کہے گئے ہیں ۔

موت کی راہ نہ دیکھوں ، کیوں نہ دیکھوں ، میں تو دیکھوں گا ہی کہ بن آئے نہ رہے ، کیونکہ موت کی شان میں سے یہ بات ہے

۱۔ شرح دیوان اردوئے غالب از نظم طباطبائی ، انوار بک ڈپو ، لکھنؤ ، ۱۹۵۳ء ، ص ۱۲۹

۲۔ شرح دیوان غالب ، ص ۳۷

کہ ایک دن آئے گی ہی - انتظار ضائع نہ جائے گا - تم کو چاہوں ، کیا خوب - کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بلا سکے - گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں - اس میں یہ خوبی ہے کہ بن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی - تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ اؤ تو تم کو بلا نہ سکوں .... " - (۱)

اس تشریح کی روشنی میں شارحین پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اسے دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی کیونکہ یہ بعد میں ' نادرات غالب " میں شائع ہوئی ہے - لیکن اس سے یہ آشکار ہو جاتا ہے کہ غالب کے کلام کے شارحین اکثر شعر کے صحیح مفہوم سے کس طرح دور رہ جاتے ہیں - اس شعر کی تشریح میں " موت کی راہ نہ دیکھوں " اور " نہ اؤ تو بلائے نہ بنے " کی وہ وہ تاویلیں کی گئی ہیں کہ ان سب کا تجزیہ کیا جائے تو اچھا خاصا طومار ہو جائے - مختصر کیفیت یہ ہے کہ نظم طباطبائی ، حسرت ، سعید اور بیخود سب نے الگ الگ معنی لکھے ہیں (۲) - آسی نے ان سب سے الگ چار اور معنی بیان کیے ہیں (۳) - صرف سعید کی تشریح شعر کے مفہوم سے کسی قدر قریب ہے :

" یعنی میرے اوپر شب انتظار میں جو کلفت ہے وہ صرف دو صورت سے رفع ہو سکتی ہے - یا تم آؤ یا موت آئے لیکن تمھاری کیفیت یہ ہے کہ اگر تم نہ اؤ تو میں بلا بھی نہیں سکتا - اس لیے تمھاری آمد کو کیوں چاہوں اور موت ہی کا راستہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ اس تکلیف میں یقیناً آ کر رہے گی " - (۴)

۱- نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق (۱۹۴۹ء) ، حصہ دوم ، ص ۳۰ -

۲- تفصیل کے لیے دیکھیے : بیان غالب ، ص ۴۸۰

۳- مکمل شرح دیوان غالب ، ص ۳۵۰

۴- بیان غالب ، ص ۴۸۰

اس تشریح میں کئی دوسرے شارحین کے مقابلے میں "موت کی راہ نہ دیکھوں" کے معنی موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں ٹھیک لیے گئے ہیں لیکن ایک تو اس میں شعر کے مضمون کو شب انتظار تک محدود کر دیا گیا ہے، دوسرے "تم کو چاہوں" کے سیدھے سے معنی اس میں بھی نہیں لیے گئے ۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تم جیسے شخص سے کہ اگر تم نہ آؤ تو تم کو بلاتے بھی نہ بن پڑے، محبت کرنے کے بجائے موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ بن بلائے بھی اس کا آنا یقینی ہے، یعنی تمھاری محبت سے موت سے لو لگانا بہتر ہے۔ معشوق کی بے نیازی پر ایک لطیف طنز ہے جس کی بنیاد موت کے بن بلائے آنے اور معشوق کے بلانے پر بھی نہ آنے کے یقین پر رکھی گئی ہے ۔

آخر میں صرف غالب کی دیگر تشریحات درج کی جاتی ہیں ۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

" یعنی اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں ڈرتا ہوں، یہ جملہ سارا مقدر ہے ۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں " ۔ (۱)

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

" پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے؟ قد اس کا کتنا لمبا ہے؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں؟ رنگ کیسا ہے؟ جب یہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جسم و جسمانیت میں سے نہیں، ایک اعتبار محض ہے ۔ وجود اس کا صرف تعقل میں ہے ۔ سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے ۔ یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں ۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا، ہمارے فنا ہونے کی دلیل ہے " ۔ (۲)

۱۔ خطوط غالب مرتبہ مہر، ص ۱۳۲
۲۔ خطوط غالب مرتبہ مہر، ص ۳۰۸

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

"اس مطلع میں خیال ہے دقیق مگر کوہ کندن و کاہ بر آوردن یعنی لطف زیادہ نہیں - قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے بقدر یک مژہ برہم زدن ثبات و قرار ہے - حیرت ازالۂ حرکت کرتی ہے - قطرۂ مے افراط حیرت سے ٹپکنا بھول گیا - برابر برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالی کا خط بہ صورت اس تاگے کے بن گیا جس میں موتی پروئے ہوں" - (۱)

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن، آہ و فغاں اور

"یہ بہت لطیف تقدیر ہے - لیتا کو ربط ہے چین سے، کرتا مربوط ہے آہ و فغاں سے - عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں - فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے بلکہ فصیح و بلیغ - ریختہ تقلید ہے فارسی کی - حاصل معنی مصرعین یہ کہ اگر دل نہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا، اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا" - (۲)

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

"مولوی صاحب کیا لطیف معنی ہیں - داد دینا - حسن عارض اور حسن ظن، دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے، کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا - پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسا ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے؟ حسن ظن نے رقیب

۱- خطوط غالب مرتبۂ مہر، ص ۵۲۳

۲- خطوط غالب مرتبۂ مہر، ص ۵۲۳، ۵۲۴

کی شرم رکھ لی ، ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا ۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا ، ہوسناک آدمی تھا ۔ اگر پانے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی " ۔ (۱)

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

" یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی ، مگر کھٹکا یہ ہے کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ۔ ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضع دار اور معتمد علیہ ہے ۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کرے گا ۔ خیر ، اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا ۔ قضا را عاشق کا گمان سچ ہوا ۔ قاصد معشوق کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہو گیا ۔ کیسا خط ، کیسا جواب ، دیوانہ بن ، کپڑے پھاڑ ، جنگل کو چل دیا ۔ اب عاشق اس وقوعے کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے ، کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر ۔ اے ندیم تجھ سے تو کلام نہیں ، لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا " ۔ (۲)

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

" اس میں کوئی اشکال نہیں ۔ جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں ۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا ؟ مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا ۔ خدا جانے شہر میں یا نواح شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے " ۔ (۳)

---

۱ ، ۲ ، ۳ مکتوب بنام قاضی عبد الجمیل جنون ، خطوط غالب مرتبہ مہر ، ص ۵۲۴ ، ۵۲۵

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

" اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے۔ یہ خبر ہے۔ پہلا مصرع :

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

یہ مبتدا ہے۔ شب غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ، ظلمت غلیظ ، سحر نا پید ۔ گویا خلق ہی نہیں ہوئی ۔ ہاں دلیل صبح کی بود در ہے بجھی ہوئی شمع ، اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں ۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا ، وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے ، جس گھر میں علامت صبح موید ظلمت ہو گی ، وہ گھر کتنا تاریک ہو گا " ۔ (۱)

کار گاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمن راحت خون گرم دھقاں ہے

" داغ ساماں مثل انجم انجمن ، وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و ساماں ہو ۔ موجودیت لالے کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورزہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے دھقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے ۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عناد ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے ، وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے ۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت اور صورت رنج " ۔ (۲)

غنچہ تا شگفتنہا برگ عافیت معلوم
باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے

۱- خطوط غالب مرتبہ مہر ، ص ۵۳۰
۲- خطوط غالب مرتبہ مہر ، ص ۵۳۱

" کلی جب نئی نکلے ، بہ صورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے ' برگ عافیت ' معلوم ۔ یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی مایہ' آرام ۔

برگ عیسیٰ به گور خویش فرست

برگ اور سر و برگ بمعنی ساز و سامان ہے ۔ خواب گل بہ اعتبار خاموشی و بر جا ماندگی ۔ پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی ۔ وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا ۔ غنچہ بہ صورت دل جمع ہے ۔ با وصف جمعیت دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے "۔ (۱)

ہم سے رنج بیتابی کس طرح اٹھایا جائے
داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

" پشت دست ، صورت عجز اور خس بدنداں و کاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے ۔ پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلے نے تنکا دانتوں میں لیا ہو ، ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو؟ " (۲)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

" ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے ، جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا ۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے؟ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج و ملال و آزار ہے ۔ " (۳)

شوق ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

۱۔ خطوط غالب مرتبہ' مہر ، ص ۵۳۲

۲۔ خطوط غالب ، ص ۵۳۴

''رقیب بمعنی مخالف یعنی شوق سر و سامان کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا تھا ، تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا ، لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر با تن عریاں ہی کھنچتی ہے۔ '' (۱)

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے ، جیسا کہ اس شعر میں :

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

یعنی زخم تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بہ سبب ایک طرف سا کھل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پرافشاں بمعنی بے تاب اور یہ لفظ تیر کے مناسب حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود ضیق مقام سے گھبرا کر پرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا '' ۔ (۲)

'' صوفیوں کی اصطلاح میں مجاورت و مسافرت دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوئے ہیں ۔ میرا شعر پڑھو :

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

مطلب یہ ہے کہ شاہد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے دہان زخم پیدا کرنا چاہیے یعنی جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا '' ۔ (۳)

شاہد حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اس کو تغافل

۱، ۲- خطوط غالب ، ص ۵۳۴
۳- خطوط غالب ص ۵۹۶ ، ۵۹۷

کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سحابی رباعی میں لکھتا ہے :

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ
دور تو و نزدیک تو در حال تباہ
کس نیست کہ جاں از تو سلامت برود
اں را بہ تغافل کشی ایں را بہ نگاہ

اب میرا شعر سنو :

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے ، جب اس نے توجہ کی تو ایک نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا "۔ (۱)

رباعی: کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

" یہ رباعی عاشقانہ ہے مگر مضمون بالکل نیا ہے۔ باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں " (۲)

رباعی: ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے ، اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

" دیکھو تم نے ایسی شوخی کہیں نہیں دیکھی - یہ بالکل

۱، ۲- خطوط غالب مرتبہ مہر ، ص ۵۹۷ ، ۶۹۱

نئی بات ہے اور میرا حصہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ہر چند دربار کے با اختیار لوگوں کو جھک جھک کے سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری کام روائی میں درنگ و لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں، آؤ خدا ہی سے کہیں۔ پھر دل میں خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو، وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ شام کو صبح کرنا اور صبح کو شام کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ " (۱)

غالب کی ان تشریحات کو جدید زبان اور انداز بیان میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کہیں ان کی بات صاف نہیں ہے تو یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ وہ شعر میں اپنے خیال کو پوری طرح ادا نہیں کر سکے، لیکن ان کی تشریحات کے برخلاف ان کے اشعار میں نئے نئے معانی پہنانا غلط بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ غالب کے کلام کے ایک بڑے حصے کو گزشتہ شارحین کی صنعت ذومعنین سے نجات دلا دی جائے تو اس کے افہام و تفہیم کے لیے ایک زیادہ سازگار فضا تیار ہو سکتی ہے۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

۱۔ خطوط غالب مرتبہ مہر، ص ۵۹۷، ۵۹۸

طرز غالب

جمیل جالبی

اس وقت میرے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ آخر غالب کے طرز ادا میں وہ کون سی خصوصیات یکجا ہو گئی تھیں جن کے تخلیقی اتحاد سے وہ نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ ساری اردو شاعری میں سب سے الگ اور سب سے بڑا شاعر بن گیا ۔ ایک ہی سانس میں بہت مشکل سوال اٹھا کر میں نے خود اپنے لیے یقیناً بہت سی مشکلات ضرور پیدا کرلی ہیں ، لیکن بات جب غالب کی ہو اور مشکل پسندی سے دامن بچایا جائے تو ایسا ہی ہے جیسے سچے موتی کی تلاش کی جائے اور گہرے پانی میں غوطہ نہ لگایا جائے ۔ بہرحال جواب دینا اب میری مشکل ہے اور جواب سننا آپ کی ۔

اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے چند ابتدائی باتوں کا ذکر ضروری ہے ۔ میری طرح آپ بھی یہ بات ضرور جانتے ہیں کہ ہر انسان کی شخصیت کی تعمیر میں چند چیزیں مل جل کر حصہ لیتی ہیں ۔ ایک تو وہ رجحان طبع جو ہر انسان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور جو قدرت سے اسے پیدائش کے وقت ودیعت ہوتا ہے ، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کسی میں شروع ہی سے ایجاد کا رجحان موجود ہے ۔ کسی میں مذہب ، طب یا حکمت کی طرف میلان موجود ہے اور کسی کی طبیعت علم و ادب کی طرف مائل ہے ۔ بعض میں یہ رجحان بہت قوی ہوتے ہیں اور بعض میں اوسط درجے پر ۔ جس میں یہ رجحان قوی ہوتا ہے وہ ماحول کی باد مخالف میں بھی اپنے رجحان کا چراغ روشن رکھتا ہے اور جس میں رجحان طبع کی یہ شدت نہیں ہوتی ، اسے اگر ماحول سازگار مل گیا تو اس نے اپنے رجحان کو آگے بڑھا دیا اور

اگر ماحول سازگار نہیں ملا تو اللہ اللہ خیر سلا - اس پیدائشی رجحان میں خاندانی ماحول بھی بطور ورثہ شامل ہو جاتا ہے اور تعلیم و تربیت ، گردوپیش کی معاشرتی و تہذیبی قوتیں بھی اپنا کام کرتی ہیں - پھر جیسے جیسے انسان بڑھتا رہتا ہے بچپن کے واقعات اور یادیں ، ہم عمروں اور چھوٹے بڑوں سے تعلقات ، زندگی کی سختیاں اور آسائشیں ، دکھ اور سکھ سے پیدا ہونے والے اثرات بھی انسان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں - شخصیت میں یہ سب چیزیں گھل مل کر ایک اکائی بن جاتی ہیں - جن شخصیتوں میں یہ اتحاد پورے طور پر ایک اکائی بن جاتا ہے ، شخصیت کا جماؤ بھی اسی اعتبار سے نمایاں ہو جاتا ہے اور جہاں یہ اثرات پورے طور پر گھل مل کر ایک مکمل اکائی نہیں بنتے ، وہاں اس اکھاڑ پچھاڑ سے شخصیت بھی کمزور رہتی ہے - اسی عمل سے چھوٹی اور بڑی شخصیت وجود میں آتی ہے اور پسند و ناپسند ، روایت و جدت ، مذاق و بدمذاقی کے کے معیار پیدا ہوتے ہیں - انھی معیاروں سے ہم اس '' شخص '' کے '' مزاج '' کا پتا لگاتے ہیں - مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں کا مذاق بہت روایتی ہے ، فلاں میں جدت پسندی ہے ، فلاں کی پسند یہ ہے ، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم یہ کہہ کر اُس کے '' مزاج '' کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ، نہ صرف مزاج کی طرف بلکہ پوری '' شخصیت '' کی نشاندھی بھی کر رہے ہیں - مزاج دراصل شخصیت کا پھول ہے - گویا شخصیت کی تعمیر میں جو عوامل کام کرتے ہیں ، جب پیدائشی رجحان کے ساتھ گھل مل کر وہ ایک اکائی بن جاتے ہیں تو اس '' اکائی '' سے نکلنے والی شعاعوں سے اس شخصیت کا مزاج بنتا ہے اور جب یہ مزاج اظہار کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے تو یہاں پوری شخصیت پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ میں یہاں ہوں ، میں یہاں ہوں - اسی لیے شخصیت ' مزاج ' سے پہچانی جاتی ہے اور ' مزاج ' اظہار سے اور اسی لیے اظہار شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے - ''اسٹائل از دی مین '' کے بھی یہی معنی ہیں - دو شخص ایک ہی بات کے اظہار کے لیے مختلف قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں ، اُن کے لہجے مختلف ہوتے ہیں ، اُن کا آہنگ اور طرز مختلف ہوتا ہے - طرز کا یہ فرق دو شخصیتوں ، دو مزاجوں کا فرق ہے -

آپ مجھ سے کتنا ہی اختلاف کریں لیکن اس بات پر ضرور اتفاق

کریں گے کہ غالب بھی ہم جیسے ہی گوشت پوست کے انسان تھے ۔
س لیے ان کی شخصیت کی تعمیر میں بھی یقیناً اسی طرح مختلف عوامل نے
حصہ لیا ہوگا جن سے ان کا ''مزاج'' بنا ہوگا اور جب یہ مزاج اظہار کے
وپ میں آیا تو اس سے ایک طرز وجود میں آیا جسے آج ہم دور سے دیکھ کر
کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ غالب ہیں اور کوئی دوسرا نہیں ۔ یہ بات بالکل
یسی ہے جیسے ہم دور سے کسی کے قدموں کی چاپ سن کر یا بغیر الفاظ
نے صرف لہجے سے آدمی کو پہچان کر کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ فلاں شخص
ہے ۔ آئیے دیکھیں کہ غالب کے مزاج کی بنیادی خصوصیت کیا تھی ؟
یکن ، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ، غالب کے مزاج کی تلاش میں
ہمیں ان عوامل کو دیکھنا ہوگا جنھوں نے اس کی شخصیت کی تعمیر میں
حصہ لیا ہے ۔

[۲]

اس بات پر کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ غالب شعر و ادب
ی طرف رجحان لے کر پیدا ہوئے تھے ۔ وہ ایک خوشحال متمول گھرانے میں
یدا ہوئے ۔ نسلاً تورانی ترک تھے اور انھیں اپنے خاندان پر نہ صرف فخر تھا
لکہ اس افتخار کو اپنے لیے وجہ امتیاز جانتے تھے ۔ ان کے دادا شاہ عالم
کے زمانے میں ہندوستان آئے اور شاہی دربار سے عزت اور جاگیر ملی ۔ سپہ گری
ن کا پیشہ تھا ۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ ، دکن اور الور کے درباروں
سے وابستہ رہے اور کسی لڑائی میں مارے گئے ۔ اس وقت میرزا غالب کی عمر
انچ سال کی تھی ۔ ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے اپنے بیٹوں کی طرح پالا ۔
صراللہ بیگ مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبیدار تھے ۔ جب جنرل لیک کا
مل دخل ہوا تو انھیں چار سو سواروں کی جمعیت کا افسر مقرر کیا گیا ۔
ترہ سو روپے مہینہ ذات اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر ملی ۔ چچا کے
رنے کے بعد غدر تک مرزا کو انگریز سے کسی نہ کسی طرح پنشن ملتی رہی ۔
جوانی میں شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار ہوتے تھے ۔
میرزادے تھے ، اپنے کو دوسروں سے الگ سمجھتے تھے اور شاہانہ دل و دماغ
رکھتے تھے ۔ جب یہ سب عوامل ان کی تخلیقی شخصیت میں ایک اکائی
ن کر ابھرے اور ان کے مزاج کو متعین کیا تو اس میں ایک بات کا
یدا ہونا فطری تھا کہ وہ اس راستے کو ناپسند کریں جس پر سب چلتے

ہیں ۔ مولانا حالی اور آزاد دونوں نے لکھا ہے کہ مرزا عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے تھے ۔ اسی لیے جب یہ مزاج شعر و شاعری میں ظاہر ہوا تو یہاں بھی اس نے اپنا الگ راستہ بنانے کی شروع ہی سے کوشش کی ۔ سب سے الگ چلنا اور سب سے الگ راستہ اختیار کرنا اُن کے مزاج کی بنیادی خصوصیت تھی ۔ جب تیرہ چودہ سال کی عمر تھی تو بھی سب سے الگ چلنے کا مزاج ان کی نمایاں خصوصیت تھی ۔ جب نواب حسام الدین حیدر خاں نے میر تقی میر (م ۱۲۲۰ھ) کو غالب کے شعر سنائے تو انھوں نے کہا کہ " اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا " ۔ میر نے جب یہ بات کہی ہوگی تو انھیں میرزا کے شعروں میں ضرور کچھ ایسی بات نظر آئی ہوگی جو دوسروں سے مختلف ہوگی ۔ " مہمل بکنے لگے گا " کے الفاظ اسی بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ۔ نو عمری میں شاعری شروع کی تو سب سے الگ اور مشکل شاعر بیدل کا اتباع کیا ۔ ایسا کام جو آسان ہو اور جسے سب کرسکیں غالب کے مزاج کے بالکل خلاف تھا ۔ قدم قدم پر اُن کے اس مزاج کا احساس ہوتا ہے ۔ لباس کو دیکھیے ، سیاہ پوستین کی ٹوپی ہی سے آپ انھیں دور سے پہچان لیتے ہیں ۔ کسی نے یہ شعر پڑھ کر سنایا :

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی　　مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

اور کہا " آپ نے کیا اچھا شعر کہا ہے " ۔ آگ ہی تو لگ گئی ۔ کہنے لگے اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس پر رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی ۔ ایسے بد دل ہوئے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس تخلص کو ہی خیرباد کہہ دیا ۔ یہ مزاج مرتے دم تک باقی رہا ۔ جب بہت کمزور ہوگئے تو یہ سوچ کر کہ اب ایک سال جینا بھی مشکل ہے ، اپنی وفات کا مادہ تاریخ نکالا جس سے ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے ۔ اتفاق سے اسی سال دھلی میں زبردست وبا پھیلی لیکن میرزا اس کے باوجود نہ مرے ۔ ایک خط میں لکھا " میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا ۔ واقعی اس میں کسر شان تھی "۔ ڈاڑھی موچھ کا قصہ بھی سن لیجیے ۔ ایک خط میں لکھا کہ " جب ڈاڑھی موچھ میں بال سفید آ گئے ، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے

گالوں پر نظر آنے لگے ۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی ۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام ۔ ملا ، حافظ ، بساطی ، نیچہ بند ، دھوبی ، سقہ ، بھٹیارہ ، جولاہا ، کنجڑہ ، منہ پر ڈاڑھی ، سر پر بال ۔ میں نے جس دن ڈاڑھی رکھی ، اسی دن سر منڈایا "۔

غرض کہ میرزا کے مزاج میں عام راستے سے ، عام چیزوں سے ، عام خیالات سے ، عام وضع سے ، عام روایت سے ہٹ کر چلنا بنیادی خصوصیت تھی ۔ یہی مزاج جب شعر و ادب میں ظاہر ہوا تو یہاں بھی سب سے ہٹ کر چلا اور اپنی الگ راہ نکالی ۔ ابتدا میں جب میرزا نے موجود شاعرانہ روایت کی طرف قدم بڑھایا تو اس وقت بھی انھوں نے ایسی شاعری نہیں کی جیسا کہ اس زمانے میں رواج تھا کہ شعر ایسا ہو " ادھر قائل کے منہ سے نکلا اور ادھر سامع کے دل میں اتر گیا "۔ ایسے شعر وہ کہتے تو اس میں زبان و بیان روایتی ہوتے ۔ محاورے کی چاشنی اور روزمرہ کی بے ساختگی سے شعر میں زور پیدا کیا جاتا ۔ سنگلاخ زمینوں میں چٹپٹے مزیدار شعر نکالے جاتے ۔ رعایت لفظی سے فائدہ اٹھایا جاتا ۔ ایسی بندشیں اور تراکیب استعمال کرتے جسے سن کر لوگ فوراً پھڑک اٹھتے ۔ لیکن اس دور میں بھی مرزا نے روایتی شاعری کی تقلید کے باوجود استاد بے بدل جناب بیدل کا ہاتھ تھام لیا جو روایت سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنی فکر کی علویت ، معنی آفرینی اور مشکل پسندی کی وجہ سے سب سے الگ تھے ۔ میرزا نے سوچا کہ جو کام بیدل نے فارسی میں کیا اگر وہ اردو میں کر جائیں تو سب سے الگ رہیں گے ۔ چند سال تک وہ اس روایت کے گنبد بے در میں گھومتے رہے لیکن جب وہاں بھی اطمینان میسر نہ آیا تو طرز بیدل میں ریختہ لکھنا ، اسد اللہ خاں قیامت ہے ' کہہ کر باہر آ گئے ۔ ایک ایسے دور میں جب سادگی شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی ، جب روزمرہ و محاورہ شاعری کے اصل جوہر سمجھے جاتے تھے ، جب عام گفتگو ، عام اخلاقی کلیوں ، تہذیب و معاشرت کے مختلف مروجہ روایتی پہلوؤں کو شعر میں باندھنا ہنر تھا ، میرزا نے ایسے شعر کہے :

کرے کی فکر تعمیر خرابی ہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثل استخواں بیروں ز قالبہا

پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش
خیال شوخی خوباں کو راحت آفریں پایا

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

ان اشعار میں غالب کے مزاج کا بنیادی عمل موجود ہے۔ آہنگ و ترنم اور لہجے میں غالبیت تو ضرور موجود ہے لیکن ساتھ ساتھ فکری سطح پر یہ اسی روایت کا ایک حصہ ہیں جو اس وقت اس معاشرے کے رگ و پے میں رچی بسی تھی اور جس پر معاشرے کا تہذیبی ڈھانچا قائم تھا۔ یہاں زبان فارسیت لیے ہوئے ہے لیکن فکر کی وہی سطح ہے جو ہمیں اسالیب کے تغیر کے ساتھ میر سے ذوق تک سب شاعروں کے ہاں ملتی ہے۔ غالب کے مزاج میں طرز بیدل کو اختیار کرنے میں ناکامی اور ذاتی بے اطمینانی کی وجہ سے ایک نئی اکھاڑ پچھاڑ شروع ہوئی۔ شاہراہ عام سے ہٹ کر چلنے اور اپنے لیے ایک نیا راستہ نکالنے کی کوشش نے اور شدت اختیار کی۔ لیکن مروجہ تہذیبی روایت سے ہٹ کر نیا راستہ نکالنا کوئی ہنسی کھیل تو ہے نہیں کہ جس کے جی میں آئے اپنا الگ راستہ نکالنے کی کوشش میں ایک دم الگ راستہ نکال لے۔ اس کا دار و مدار تو تہذیبی روایت کی قوت یا کمزوری پر ہے جس میں وہ زندہ ہے۔ اگر روایت طاقت ور ہے اور وہ تہذیبی اکائی کی حیثیت میں باقی و سالم ہے تو بڑے بڑے سورما اسے اپنی جگہ سے ہلانے کی کوشش میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ غالب کی خوش قسمتی تھی کے وہ اس وقت پیدا ہوئے جب بظاہر تو تہذیبی روایت زندہ اور جیتی جاگتی نظر آرہی تھی لیکن اس میں آگے بڑھنے اور پھیلنے کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ تضاد نے اس میں لئی نئی خرابیاں اور کمزوریاں پیدا کر دی تھیں۔ عورتوں کے بالوں میں ایک بیماری ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ سر کے ہر بال کے آخری سرے پر دو منہ بن جاتے ہیں ، اس کے بعد بالوں کا بڑھنا بند ہو جاتا ہے۔ غالب کے دور میں ہماری تہذیب کے بالوں میں دو منہ

بن گئے تھے اور اس میں بڑھنے کی قوت ختم ہو گئی تھی ۔ صورت حال یہ تھی کہ سات سمندر پار سے آنے والی قوم کے قدم اس سر زمین پر جم چکے تھے ۔ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں اب جنرل لیک کی جمعیت کے افسر تھے ۔ لارڈ ولزلی ہندوستان کے گورنر جنرل تھے ۔ مرہٹے ختم ہو چکے تھے ۔ فرانسیسی اپنے گھر جا چکے تھے ۔ بادشاہ انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا ۔ نئے فرنگی انتظامات کے ساتھ ساتھ جدید خیالات بھی پھیل رہے تھے ۔ غالب کا واسطہ انگریزوں سے بچپن سے رہا تھا اور چونکہ وہ آزاد و غیر متعصب تھے ، اس لیے جب کلکتہ گئے تو وہاں " خوبان کشور لندن " بھی دیکھیں اور " بادہ ہائے ناب " کا مزہ بھی چکھا ۔ کلکتہ میں جدید دور کا آغاز ہو چکا تھا اور یہاں کا ماحول دہلی کے ماحول سے مختلف تھا ۔ غالب کے ذہن پر ان خیالات اداؤں نے گہرا اثر ڈالا ۔ مغلیہ سلطنت کا تماشا ان کے سامنے تھا ۔ یہ سب چیزیں ان کے مزاج کا ایک حصہ تھیں ۔ سر سید احمد خاں نے جب بڑی محنت سے ' آئین اکبری ' مرتب کی اور میرزا سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے نثر کے بجائے فارسی میں مثنوی لکھ کر بھیج دی ۔ یہ دراصل وہ خیالات تھے جن کا اظہار انھوں نے کھل کر واشگاف الفاظ میں کیا اور جن کے دبے دبے اثرات بچپن ہی سے ان کی شخصیت میں رچ بس کر مزاج کا حصہ بن چکے تھے ۔ دیکھیے میرزا غالب ہم سے کیا کہہ رہے ہیں :

گر ز آئیں می رود با ما سخن　　چشم بکشا وندریں دیر کہن

صاحبان انگلستان را نگر　　شیوہ و انداز اینان را نگر

تاچہ آئیں ہا پدید آوردہ اند　　آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

حق ایں قومیست آئیں داشتن　　کس نیارد ملک بہ زیں داشتن

داد و دانش را بہم پیوستہ اند　　ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

اور اس بات پر زور دیا کہ :

مردہ پروردن مبارک کار نیست

اس ابھرتی اور بنتی تہذیبی قوت کا مرزا کو واضح طور پر احساس تھا ۔ فرزند آذر کا دین بزرگاں کو خوش نہ کرنے والا کام بھی ان کے سامنے تھا ۔

اس طرح اپنے مزاج کے عین مطابق اپنا الگ راستہ تلاش کرتے کرتے میرزا مروجہ شعری روایت کے دائرے کو توڑ کر جدید شعور کے تہذیبی دائرے میں داخل ہو گئے اور معترضوں کو میرزا نے جواب دیا کہ :

ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود میرزا اپنے دور کے صف اول کے شاعر ہونے کے باوجود ''غریب شہر'' بن کر رہ گئے اور وہ اشعار جن پر آج ہم پھڑک اٹھتے ہیں، اُن کے زمانے میں یوں دیکھے گئے جیسے زچہ تارے دیکھتی ہے۔ غالب کی یہی انفرادیت ، یہی عظمت اور یہی الگ پن ہے کہ وہ تہذیب کے روایتی دائرے کو توڑ کر وقت سے پہلے نہ صرف باہر نکل آئے بلکہ تخلیقی سطح پر اپنا ایک الگ دائرہ بنا یا جو جدید شعور اور جدید طرز احساس کا دائرہ ہے۔ جس میں ہم آپ سب کھڑے ہیں۔ یہ مشکل کام غالب نے اس وقت انجام دیا جب ہمیں اس کا شعور تک نہ تھا اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اور اس نئے تہذیبی دائرے کی آبادی بڑھتی گئی غالب کی عظمت کے طلسم بھی ہم پر کھلتے گئے اور آج سو سال گزر جانے کے باوجود وہ ہمارے جدید شعور، ہمارے نئے تجربات کے زندہ ساتھی ہیں۔

[۳]

جیسے غالب کا عالم خیال نئے نئے فلسفوں کو جذب کرنے کی گنجائش رکھتا ہے، ویسے ہی ''طرز غالب'' طرز ادا کے جدید نظریات پر پورا اترنے کی قوت رکھتا ہے۔ جس طرح غالب کے نقاد ، بغیر فرق کیے ، اُن کے تخیل کی بلند پروازی ، معنی آفرینی ، جدت مضامین اور طرفگی خیالات کو اُن کی عظمت کی بنیاد بتاتے رہے ہیں، اسی طرح اُن کے طرز ادا کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا رہا ہے کہ نئی اور موزوں تشبیہات کا استعمال، استعارہ و کنایہ کا برمحل برتاؤ، صنائع بدائع اور شوخی و ظرافت اُن کے طرز کی اصل خصوصیات ہیں۔ یہ باتیں سن کر معلوم ہوتا ہے گویا مرزا تشبیہہ و استعارہ کے بادشاہ ہیں اور یہی اُن کے طرز کی اصل صفت ہے۔ ایسے میں یہ بات بھلادی جاتی ہے کہ یہ سب چیزیں تو صرف و محض ذریعہ ہیں، منزل نہیں۔ اس عمل جراحی کا عام طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے رنگ کو مشکل ، ان کی فکر کو مبہم اور ان کے طرز کو فارسیت زدہ کہہ کر حق تنقید ادا کر دیا جاتا ہے۔ طرز غالب کے سلسلے میں یہ

بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ ایک جدت پسند طبیعت اپنے انقلابی مزاج کو فن کا جامہ پہنانے کی کوشش میں کن کن مراحل سے گزری ، کہاں کہاں لڑکھڑائی اور آخرکار کس طرح کامیاب ہوئی ۔ اسی لیے غالب کا طرز کامل طرز نہیں ہے اور نہ آپسے ایسا ہونا چاہیے تھا کیونکہ انھیں جدید شعور و فکر کے دائرے میں داخل ہونے کے لیے ایک نئی زبان ایجاد کرنے کی ضرورت تھی ۔

غالب کے زمانے تک زبان کو ترقی دینے اور استعمال کرنے کے دو راستے مقرر تھے ۔ ایک راستہ لکھنوی شعرا اور دہلی کے استاد ذوق کا تھا جس میں اردو کو عوامی زبان سے قریب تر لانے کی کوشش میں عام محاوروں اور روزمرہ کو شاعری میں کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا ۔ شاعری کی یہی راہ مقبول تھی ۔ غالب کے سامنے زبان جدید شعور و فکر کے اظہار کا ایک ذریعہ تھی ۔ وہ جانتے تھے کہ محاورے مردہ استعارے ہوتے ہیں اور ان کا کثرت سے استعمال شاعرانہ زبان کو گہرے لطف سے خالی کر دیتا ہے ۔ دوسری راہ فارسیت کی تھی جس کی روایت سے اردو شاعری نے پورا پورا استفادہ کیا ۔ غالب نے جب اردو میں شعر کہے تو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اسی زبان کا سہارا لیا ۔ اس کے ذریعے بات کو موثر اختصار کے ساتھ بیان بھی کیا جا سکتا تھا ۔ غالب نے یہ عمل اس لیے نہیں کیا کہ وہ اپنی طبیعت پر زور دینا نہیں چاہتے تھے یا اردو کو فارسی بنا دینا چاہتے تھے بلکہ اس صورت حال میں اس کے علاوہ دوسرا راستہ ممکن ہی نہیں تھا ۔ غالب کی فکر کے اظہار کے لیے صرف محاوروں ، رعایت لفظی یا لفظوں کے مروج معنی سے تو کام چل نہیں سکتا تھا، اسی لیے انھوں نے فارسی کا سہارا لے کر 'زبان غالب' ایجاد کی ۔ غالب جب اپنے تخیل کی گہرائی میں ڈوبتے ہیں تو ان کی زبان وہ ہو جاتی ہے جو ' اے تازہ واردان بساط ہوائے دل' والی غزل میں یا جو ' دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ' والے قصیدے میں ملتی ہے اور جب وہ عام جذبات و خیالات کی سطح پر رہتے ہیں تو ان کا رنگ 'ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام ' والے قصیدے اور 'ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے' والی غزل کا سا ہو جاتا ہے ۔ یہاں بھی شخصیت کی چھاپ گہری ہے لیکن جب کسی نے ایسی غزلوں کی تعریف کی تو انھوں نے کہا '' بھائی تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں ۔ یہ غزلیں کاہے کو ہیں ' پیٹ پالنے کی باتیں ہیں '' ۔ اس جملے سے اس بات کا ضرور پتا چلتا ہے کہ ان کے ذہن میں معیار کا ایک ایسا بلند تصور تھا کہ اس سے

ذرا نیچے اترنا بھی انھیں گوارا نہیں تھا ۔ اردو کے اس مختصر دیوان میں ، جس پر غالب کی شہرت کی بنیاد قائم ہے ، انھوں نے زبان کی پوری وسعت کو سامنے رکھا اور اس کی دونوں حدوں اور اُن کے درمیان کے تمام مدارج سے اپنے موضوع فکر کے مطابق کام لیا ۔ اسی لیے غالب کے کلام میں زبان کے کئی روپ کئی معیار نظر آتے ہیں ۔ یہاں زبان ایک درخت کی طرح پھیلتی بھی ہے اور نئے نئے امکانات کو ابھارتی بھی ہے ۔ ہر زندہ بڑے شاعر کی طرح وہ زبان کے سارے امکانات کو اپنے تصرف میں نہیں لاتے بلکہ نئے امکانات کے راستے کھول کر بہت دور اس راستے پر چل کر دکھاتے ہیں ۔ اسی لیے اردو میں ان کی فارسیت کو دیکھ کر یہ کہہ دینا کہ وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے یا فارسیت کے رد میں ان کے صاف اردو کلام ' دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے ' قسم کی غزلیں اور اشعار پیش کرنا تخلیقی عمل کے صرف ایک پہلو کو دیکھنے کے مترادف ہے ۔

غالب کی شخصیت کی طرح ان کی زبان کا دائرۂ عمل بھی بہت پہلودار اور وسیع ہے جس میں ایک طرف روایت کی رچاوٹ بھی اپنا کام کر رہی ہے اور دوسری طرف بغاوت کرتی ہوئی ذہنیت بھی اپنا الگ راستہ نکال کر ایک ایسا چمن کھلا رہی ہے جس کا منظر آج تک کی شاعری سے الگ اور مختلف ہے ۔ غالب کی زبان نے آنے والے دور کے شعرا کے ہر طبقے کو متاثر کیا ۔ اس میں حالی ، فانی ، اصغر ، شاد ، یگانہ ، حسرت ، اکبر الہ آبادی ، عزیز لکھنوی بھی شامل ہیں اور گزشتہ تیس سال کے شعرا بھی ۔ اقبال نے اسی رنگ و آہنگ کو اپنا کر شعری سرمائے میں عظیم اضافہ کیا اور اب پاکستان میں جہاں اردو دہلی اور لکھنؤ کے محاوروں سے دور ہوگئی ہے، غالب کی یہی زبان مستقبل کی زبان ہے ۔ جیسے ہندی کو تمام ہندوستان کی زبان بنانے کے لیے سنسکرت سے قریب تر لایا جا رہا ہے کیونکہ سنسکرت لغت ہندوستان کی تمام زبانوں کی مشترک لغت ہے ، ویسے ہی مغربی پاکستان کی سب زبانوں کی مشترک لغت فارسی ہے اور ان سب کو وہی اردو اپنے قریب تر لاسکتی ہے جو غالب اور اقبال کی اردو ہے ۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو ایک زندہ اور آج بھی بولی جانے والی زبان پر تکیہ کر رہی ہے اور ہندی ایک مردہ زبان کے ذخیرۂ الفاظ پر ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی تعمیر میں کسی الہامی قوت نے غالب کو وہ راستہ دکھا دیا تھا جو اس کے مستقبل کی ضمانت کی تھی ۔

لیکن ساتھ ساتھ یہ بات اہم ہے کہ غالب نے فارسیت کے باوجود اردو

ی بنیادی صفت اور مزاج کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اس طرح زبان کی ساخت پر گہرا اثر ڈالا - غالب نے اردو زبان کو ذہنی و عقلی رنگ دیا ۔ نئی تراکیب اور بندشیں وضع کر کے زبان میں علوی خیالات کے اظہار کا مسئلہ آسان کردیا ۔ اردو زبان کے نسائی لہجے میں مردانہ پن اور ٹھوس پن کے عناصرو آہنگ کو ابھارا اور اس میں گہرے اور لطیف جذبات و احساسات کے اظہار کی صلاحیت پیدا کی ۔ جیسا کہ ان کی تحریروں سے پتا چلتا ہے وہ زبان کے سلسلے کے تمام علوم سے بخوبی واقف تھے مگر ان کا تخلیقی عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے ان سب علوم کے بندھے ٹکے اصولوں سے بغاوت کی اور ان سے بالاتر ہو کر اردو زبان کو ایک نئے اعلیٰ معیار سے روشناس کیا ۔ زبان دانوں نے ان کی زبان میں غلطیاں نکالیں لیکن ان کی یہی " غلطیاں " اب خود اصول زبان بن گئی ہیں ۔ غالب کے زمانے نے اس زبان کو مصنوعی سمجھا، لیکن آج جب ہم جدید دور میں داخل ہو کر دنیا کے بہترین، لطیف ترین اور عمیق ترین خیالات سے واقف ہوگئے ہیں ، زبان غالب کی اہمیت کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کی معنی بھی جانتے ہیں ۔

غالب نے یہ زبان اس لیے بنائی کہ ان کی شاعرانہ فطرت کو اپنے اظہار کے لیے ایک نئی زبان کی ضرورت تھی جس کے بغیر ان کا اظہار تشنہ رہ جاتا اور ممکن ہے کہ وہ بقول میر مہمل بکنے لگتے ۔ غالب نے ایک طرف عام طرز ادا کو ضرورت کے موافق بدلا اور دوسری طرف کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی ادا کرنے کی کوشش کی ۔ اسی لیے غالب کی شاعری میں ارض و سما کی طرح پھیلا ہوا خیال اظہار کے نظام شمسی میں سمٹ آتا ہے ۔ ادھر تنگنائے غزل بھی دریا کو کوزے میں بند کردینے کی مقتضی تھی ۔ دو مصرعوں میں سب کچھ سمودینے کی رسم بھی بہی کچھ چاہتی تھی ۔ اس تخلیقی عمل نے طرز غالب کو جنم دیا جس میں جدید شعور جدید اظہار کے ساتھ مل کر ایک ہوگیا ۔ اس لیے غالب کی ایک ایک بندش ، ایک ایک مصرع اپنے اندر ایک عالم رکھتا ہے ۔ یہ ابہام جو غالب کی شاعری کی خصوصیت ہے ، اس تخلیقی عمل کا فطری لتیجہ تھا ۔ یہاں خیال و احساس خود شاعر کے ذہن میں آئینے کی طرح صاف ہے لیکن وہ اتنا بڑا ، اتنا پیچیدہ اور پہلودار ہے کہ اسے سمیٹ کر خوبصورتی کے ساتھ دو مصرعوں میں بند کرنا غالب جیسا شاعر ہی کرسکتا تھا ۔ طرز غالب میں جملوں کی ساخت ، لفظوں

کے ساتھ خیال و احساس کی بناوٹ ، تراکیب کی سفاک جدت ، تشبیہ و استعارہ میں دور دراز کی مناسبتیں، سب ان کے پیچیدہ مگر متحد تجربے کی آئینہ دار ہیں جن میں تخیل اور ذکاوت نے مینا کاری کی ہے - جب پیچیدہ مگر متحد تجربہ شعر کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے تو زبان بھی ایک نیا روپ اختیار کرلیتی ہے - 'پوت کے پیر پالنے میں' کے مصداق یہ عمل غالب کی شاعری میں اُس وقت سے نظر آتا ہے جب دس بارہ سال کی عمر میں وہ طرز بیدل میں ریختہ لکھ رہے تھے - طرز غالب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادراک و شعور ، تخیل و ذکاوت ، روحانی اور کلاسیکی رجحانات تجربے کی بھٹی میں گھل مل کر ایک وحدت ، ایک اکائی بن گئے ہیں - اسی لیے ان کے اشعار ، ہر بڑی شاعری کی طرح ، مختلف کیفیتوں میں ، عمر کے مختلف حصوں میں ، زندگی کے مختلف تجربات کی روشنی میں ، جتنا جتنا ان کو پڑھتے جائیے معنی و مفہوم ، احساس و جذبہ کی اتنی ہی تہیں ہمارے سامنے کھلتی جاتی ہیں اور مشکل سے مشکل مبہم سے مبہم شعر سورج کی طرح روشن ہو جاتے ہیں - ہم سارے دیوان غالب سے ایک دم اسی لیے لطف اندوز نہیں ہو سکتے ، وہ تو مختلف کیفیتوں میں ، زندگی کے مختلف موڑوں پر بار بار پڑھنے کی چیز ہے - کیا ان اشعار کو آپ آج بھی مہمل کہنے کی جرات کر سکتے ہیں :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

نہ اتنا برش تیغ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

ہے آرمیدگی میں نکوهش بجا مجھے
صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

احساس ، تجربہ اور معنی کی اسی گہرائی کی وجہ سے غالب کے اشعار میں جو استعارے آتے ہیں ، وہ ایک دم سے سمجھ میں نہیں آجاتے - وہ پہلے بجلی کا ایک شاک سا دیتے ہیں اور یہی آن کی آمد کی دلیل ہے

اور پھر فکر کی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں ہماری ذکاوت ، ہمارے تجربے اور محسوسات گنجینۂ معنی کے طلسم کھولتے ہیں ۔ حالی نے اس خصوصیت کو 'ندرت' کہہ کر پورا حق ادا نہیں کیا لیکن وہ لوگ جو جدید مابعدالطبیعیات کے رنگ سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ غالب کہاں پہنچ رہے ہیں - خدا بخشے اقبال نے اس نکتے کو پالیا تھا ۔

یہی رجحان غالب کو نادر تراکیب تراشنے کی طرف لے جاتا ہے جو اُن کے طرز کا خاص جوہر ہے جن کے ذریعے ظاہر ہے کہ وہ محض شاندار الفاظ کا نمائشی ذخیرہ تیار نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے مخصوص مزاج کو مختصر ترین الفاظ میں سمیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ہیرے کی طرح ترشی ہوئی ان تراکیب سے فکر و احساس کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہمارے سامنے آجاتا ہے اور تجربہ ان تراکیب کی اکائی میں سمٹ کر اثر کی شدت میں اضافہ کر دیتا ہے ۔ اسی لیے یہ تراکیب مثلاً نقش فریادی ، عالم تقریر ، سرگشتۂ خمار رسوم و قیود ، جوہر اندیشہ ، طرز تپاک اہل دنیا ، ہمت دشوار پسند ، مجموعۂ خیال ، تالیف نسخہ ہائے وفا ، چارہ سازیٔ وحشت ، فیض بے دلی ، آئینۂ بے مہریٔ قاتل ، شرمندۂ معنی ، گزرگاہ خیال ، جلوۂ برق فنا ، دیدۂ عبرت نگاہ ، دشمن ایمان و آگہی ، ہوس نا و نوش ، دامان باغبان و کف گل فروش ، جنت نگاہ ، فردوس گوش ، محرومیٔ قسمت ، پرتو نقش خیال یار ، نا گزیر الفت ہستی ، گنجینۂ گوہر ، خیال حسن ، حسن عمل اور اسی قسم کی سینکڑوں تراکیب ہماری زبان کا حصہ بن گئی ہیں ۔ دانشور ، ادیب اور شعرا اپنی کتابوں ، مضامین ، نظموں ، افسانوں ، ڈراموں اور ناولوں کے نام غالب کی انھی تراکیب سے مستعار لے کر اپنی فکر اور تجربے کے نقوش ابھارتے ہیں اور اپنی نظم و نثر میں غالب کی زبان سے اظہار کے وسیلوں کو آسان بناتے ہیں ۔ اگر گزشتہ سو سال کی نظم و نثر کا جائزہ لیا جائے تو اردو زبان پر طرز غالب کے فیضان کا نہ صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ تراکیب کتنے مختلف متن اور کتنے مختلف معنی میں کس کس طریقے سے استعمال ہوئی ہیں ۔ ان تراکیب کی رمزیت سے طرز غالب کی مخصوص فضا ، مخصوص آہنگ اور مخصوص امیجری جنم لیتے ہیں ۔

غالب کی اس مخصوص فضا اور مخصوص امیجری کی ایک بنیادی

خصوصیت آگ یا گرمی ہے - اس گرمی سے سوز کا عالم بھی پیدا ہوتا ہے اور نفس بھی آتش فشاں ہو جاتا ہے - یہ آگ ، یہ گرمی غالب کی ساری شاعری میں جاری و ساری ہے - اس گرمی اور آگ کو دیکھنے کے لیے میں دیوان غالب اٹھاتا ہوں اور جلدی جلدی چند شعر ادھر اُدھر سے نقل کرلیتا ہوں :

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے

نکہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے

ڈھونڈے ہے اس مغنئ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

بس کہ ہوں غالب ' اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

آگ اور گرمی کی امیجری غالب کے تخلیقی مزاج کا حصہ تو ضرور ہیں لیکن اگر ہم اس امیجری سے کوئی ایسا نظام بنانے کی کوشش کریں

جیسا کہ مغرب کے جدید اشاریت پسندوں کے ہاں بن جاتا ہے تو ہمیں اس وجہ سے کامیابی نہیں ہوگی کہ اول تو غزل کی داخلی دنیا میں کسی منظم اشاریت کی گنجائش نہیں تھی، پھر غالب کو دانتے کی طرح کوئی واضح اسکیم بھی نہیں ملی تھی ۔ ایک تصوف اُن کو ضرور ملا تھا جس کا مسئلہ وحدت‌الوجود اُن کے ہاں نئے نئے نقش ابھارتا ہے اور غالب کے بنیادی تصورات ایک تار سے پیوست ہو جاتے ہیں لیکن ان کی امیجری کی معنی خیز لطافت اور خیال و احساس کی تہوں میں چھپی ہوئی آوازیں اور لہجے ہمیں جدید دور میں پہنچادیتے ہیں ۔ کبھی وہ اپنی مخصوص امیجری کے ذریعے مجرد چیزوں کو جیتی جاگتی شکل میں ہمارے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں :

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

کبھی وہ علوم متداولہ کی اصطلاحوں کے استعمال سے خیال کی تصویر بناتے ہیں ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فکر و احساس کی معنی خیز لطافتوں کو لفظوں کی تصویر میں ابھارنے کی کوشش میں آگ کو تلوار سے کاٹا جارہا ہے ۔ اُن کی شاعری کو پڑھتے وقت آج یہ خیال بار بار آتا ہے کہ غالب کے علاوہ شاید ہی اردو کا کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اتنے حقائق ، ادراک و شعور کی اتنی گتھیاں ، فکر و احساس کی اتنی معنی خیز لطافتیں ، اتنے جامع اور صاف انداز میں پیش کی ہوں جو اس قدر واقعاتی بھی ہوں کہ زندگی کے ہر موقع پر ہمارا راستہ روک کر ذہن کی فضا کو روشن کر دیتی ہوں ، مثلاً آج کل یہ اشعار میرے آدرشوں کے ظلمات میں روشنی پھیلا رہے ہیں :

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

ممکن ہے آپ کے ذہن کے دریچوں کو غالب کے کچھ اور اشعار کھول رہے ہوں ۔ غالب کے ساتھ یہ ہر شخص کا خالص اپنا ذاتی معاملہ ہے جس میں وہ ، اس کے تجربات و کیفیات اور میرزا نوشہ ایک دوسرے کے رازدار ہیں ۔ فکر کی بھی وہ آفاقیت ہمہ گیریت اور جامعیت ہے جو طرز غالب میں سمٹ آئی ہے ۔

غالب کے طرز میں ہر سطح پر ، مزاج کی رنگا رنگ کیفیات میں ایک ضبط ، ایک ٹھہراؤ کا احساس باقی رہتا ہے جو اس میں ایک ایسا توازن پیدا کر دیتا ہے جو تخلیق کے پل صراط سے زندہ و سالم گزرنے کے لیے ضروری ہے اور جو کلاسیکیت کی جان ہے ۔ شعر پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیال ، یہ احساس اس سے بہتر طریقے پر ادا نہیں کیا جاسکتا تھا ۔

احساس و خیال غالب کے ذہن میں اتنے واضح طور پر اتنی قوت کے ساتھ آتا ہے اور پھر وہ اسے اس طور پر لفظوں کے سانچے میں ڈھالتے ہیں کہ طرز غالب خالص مصوری کے دائرے میں داخل ہوجاتا ہے اور خیال و احساس کی تصویر مصورانہ انداز میں ہمارے سامنے آجاتی ہے ۔ یہ چند اشعار پڑھیے :

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ آسے ، پر کس وقت

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

اب اس شعر کی مصورانہ معنی خیزی دیکھیے :

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

غالب کے طرز میں وہی تنوع ہے جو ان کے خیال اور احساس میں ملتا ہے۔ غالب کی انفرادیت ہر رنگ کو ایک رنگ کر دیتی ہے اور ساتھ ساتھ اپنی مخصوص حدیں بھی قائم رکھتی ہے۔ یہ مخصوص طرز ہر چھوٹے بڑے ، سادہ و پیچیدہ تجربے میں یکساں طور پر اپنی تخلیقی سطح برقرار رکھتا ہے۔ یہاں اردو شاعری کی نسائی آوازیں غائب ہو جاتی ہیں اور مردانہ آوازیں پڑھنے والے کو اپنے آہنگ اور زور و جوش سے متاثر کرتی ہیں - یہ مردانہ پن اور اس کا آہنگ بنیادی طور پر غالب کے فکر و احساس میں ہے جو ان کے طرز میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی ان کی انفرادیت ہے کہ ہم ،ان کی ٹوپی کی طرح ،ان کے اشعار کو بھی دور سے دیکھ کر پہچان لیتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ صرف غالب ہی ہو سکتے ہیں - کوئی اور نہیں -

غالب نے اپنے جذبات و خیالات کی بجلی کو الفاظ کی دھات میں منتقل کر دیا ہے۔ ہر لفظ شاک کا نقطہ اور ہر شعر بہتی بجلی بن گیا ہے۔ اس طرز میں ایک وقار ہے۔ ایک گہری سنجیدگی ہے اور اس میں وہ صفت ہے جسے ٹی ایس ایلیٹ grows on you کے الفاظ سے ادا کرتا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ شعر کے پورے معنی سمجھ میں آنے سے پہلے ہی معنی کے اندر چھپی ہوئی موسیقی سے کیف کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور پھر شعر کے معنی کی لطافتیں ہم پر ظاہر ہونا شروع ہوتی ہیں اور اس کی برقیت ہمارے دل و دماغ کے تاروں میں بہنے لگتی ہے۔ یہاں ہر لفظ ایک زندہ باشعور آدمی کی طرح لا تعداد پہلو رکھتا ہے۔

یہ انفرادیت جب محض روایتی طرز میں ظاہر ہوتی ہے تو اس بھی نئی جان ڈال دیتی ہے، مثلاً رعایت لفظی و معنوی اردو شاعری کا بہت ہی فرسودہ راستہ رہا ہے مگر جب غالب اس میں رنگ بھرتے ہیں تصنع غائب ہو جاتا ہے۔ الفاظ رمز و کنایہ سے ہم آہنگ ہو جاتے اور رعایت لفظی و معنوی تخئیلی فن کا جزو بن جاتے ہیں۔ مثال کے پر غالب کی یہ غزل پڑھ کر:

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

رعایت لفظی و معنوی کی طرف ہمارا دھیان تک نہیں جاتا بلکہ یہ رنگ بر غالب کی انفرادیت کے رنگ میں غالب جیسا بن جاتا ہے۔ غالب کی پراسر شاعرانہ قوت خس و خاشاک کو بھی لے اڑتی ہے اور اس میں نئے پھو کھلا دیتی ہے۔

طرز کی اس علویت میں معنوی اور صوری دونوں سطح پر صوتی کیفیا اور موسیقانہ جھنکار اہم کام انجام دیتی ہیں۔ اگر مجھے صحیح یاد ہے تو کالر نے کہا تھا کہ شاعر کی روح میں موسیقی ابلتی ہے اور بڑا شاعر وہ ہے جو اپ ایک راگ جگائے۔ غالب کے ہاں یہ راگ اعجاز کے درجے پر پہنچ گیا ہے او اُن کی شاعری کے الہامی رنگ کا جزو اعظم ہے۔ ہمارے ہاں شاعری کی موسیق کی طرف کم توجہ دی گئی ہے اور خاص طور پر غزل میں بحور اور قافیوں ک

سخت پابندی نے اس شعری موسیقی کو مجروح کیا ہے جو بحر میں تنوع ، مصرعوں کو چھوٹا بڑا کرنے اور قافیوں کے نئے نئے التزامات سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہماری موسیقی میں آرکیسٹرل میوزک کی بھی کوئی روایت نہیں ہے۔ غزل کا میوزک بہر حال محدود اور بندھا ٹکا ہوتا ہے جس میں ڈھولک کی تھاپ کا سا اثر ہوتا ہے۔ یہ تمام پابندیاں غالب کی روح کی موسیقی کو بھی مجروح کرتی ہیں لیکن اس محدود دائرے میں بھی وہ حد امکاں تک ضرور پہنچ جاتے ہیں اور ان کا الگ راگ ہمارے کانوں میں ، روح میں رس گھولنے لگتا ہے۔ غالب کا راگ اردو غزل کا اعجاز ہے۔ ان کے فکر و احساس کی طرح اس محدود موسیقی میں بھی ایک تنوع ہے۔ ہر غزل میں کیفیت کے مطابق بحر استعمال کی گئی ہے اور بحروں کے رکن کو قاعدے کی حد تک آزادی سے برتا گیا ہے۔ اکثر ایسی جدت برتی گئی ہے جو روایتی کانوں کو ناگوار گزرتی ہے لیکن راگوں سے مانوس کان جانتے ہیں کہ خود غالب کی شاعری کے لیے یہ ازادی کتنی ضروری تھی۔ غالب جو راگ جگاتے ہیں اس میں تین صفات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ توانائی، آتش نفسی اور شگفتگی۔ توانائی اور آتش نفسی مردانہ آوازوں کو ابھارتی ہیں اور شگفتگی کا اجلاپن دل و دماغ دونوں کو بھلا لگتا ہے۔ اور ان تینوں صفتوں کی وحدت پڑھنے والے کو حوصلہ دیتی ، ابھارتی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی بحروں حتیٰ کہ نرم لہجے والی غزلوں میں بھی یہ صفات یکساں طور پر موجود ہیں۔ مثلاً :

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

عموماً پہلے مصرع کا راگ دھیما ہوتا ہے مگر دوسرے مصرع کی قوت اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ اس قوت میں بلا کی تیزی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مصرع میں ایک تیر کمان پر چڑھایا گیا ہے اور کھینچ کر تیار کر لیا گیا ہے اور دوسرے مصرع میں وہ تیزی سے دل و دماغ کو اپنا ہدف بنا لیتا ہے :

تو اور آرائش خم کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

یہ راگ خلش اور بے کلی کے ساتھ ایک توازن کو سامنے لاتا ہے
ہے شگفتگی کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ آگ کے شعلے میں شگفتگی ——— یہی
غالب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اس راگ کے اثر سے محروم کر دیا۔
غالب کے ہاں قواعد کی غلطیاں پکڑتے ہیں۔ ڈومنی سے تعلقات کی نحۃ
عمر عزیز بسر کرتے ہیں۔ اضافتوں کے نئے استعمال کی غلطی کو اشارے
بتاتے ہیں مگر جن تک اس راگ کی گرمی پہنچتی ہے وہاں خس و خا
ایک شعلہ بن جاتے ہیں اور راگ کی بے ساختگی دلوں کو مٹھی میں لے
ہے۔ یہ راگ کہیں دھیما ہے، کہیں تیز ہے۔ لیکن اثر میں آگ
'بے ساختگی' اتنا ہی عام لفظ ہو گیا ہے جتنا 'عظیم' کا لفظ، لیکن اب
احساس کی لطافتوں کو ظاہر کرنے کے لیے میں نیا لفظ کہاں سے لاؤں۔ غ
کے راگ کا آہنگ اس لفظ سے زیادہ وسیع اور اثر انگیز ہے۔

اکثر غزلیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ غالب میں مرکب ا
جگانے کی بڑی قوت ہے۔ شعر کا پہلا وجود شاعر کے دماغ میں ایک مبہم
راگ کی صورت میں سامنے آتا ہے اور اس کے بعد پھیلتا بڑھتا اور اپنی شکا
صورت بناتا ہے۔ غالب کے وہ اشعار جن کو مہمل تک کہا گیا ہے، موہ
کے اعتبار سے مکمل ہیں۔ اگر ان میں کوئی خرابی ہے تو وہی جو ایلیٹ
ملٹن کے بارے میں لکھی ہے کہ "بصری تخیل" "سمعی تخیل" کا ۔
نہیں دیتا، لیکن ایسے اشعار کا راگ بھی شعر کی کیفیت کو ہم تک پہ
دیتا ہے۔ یہ بدنام زمانہ شعر دیکھیے :

شب، خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یہاں بھی راگ کا آہنگ کیفیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

غزل کی ساخت ایسی ہے کہ اس میں خیال کا اتحاد ممکن نہیں ہے، ا
لیے ہر شعر اپنے الگ معنی رکھتا ہے۔ غالب نے اس میں جتنا تنوع ممکن

سکتا تھا پیدا کیا ہے اور بحر ، قافیہ و ردیف کی اکائی سے صوتی اتحاد پیدا کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج سو سال کے بعد بھی ہر شخص کو غالب کے کچھ نہ کچھ اشعار ضرور یاد ہیں ۔ ان کی بہترین غزلوں میں جیسے — اے تازہ واردان بساط ہوائے دل — خیال راگ اور جذبہ تینوں مل کر ہم آہنگ ہوجاتے ہیں ۔ ہر شعر اثر میں اضافہ کرتا جاتا ہے اور آخری شعر میں راگ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے ۔ اسی طرح — مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — یا — آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — یا — نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں — بیا کہ قاعدۂ آسماں بگر دانیم — اور اسی قسم کی دوسری غزلوں میں موسیقی ایک مکمل آرکیسٹرا کا سا اثر رکھتی ہے اور ایک جادو بھرے عالم میں لے جاتی ہے ۔ یہی راگ ان کے قصیدوں میں پھیل کر تمام تفصیل کی تکمیل کے ساتھ ابھرتا ہے ۔ میرا خیال ہے اور آپ بھی یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ :

دھر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

والا قصیدہ موسیقانہ اثر کے لحاظ سے غالب کا شاہکار ہے ۔ یہاں غالب کے انفرادی راگ میں تیزی کچھ کم ہوگئی ہے اور مفکرانہ ضبط نے آفاقی گہرائی پیدا کردی ہے جو پڑھنے والے کو ایک نشے کے عالم میں لے جاتی ہے ۔ شاعری میں حقیقی موسیقی کے سلسلے میں غالب اپنے دور سے بالاتر ہیں ۔ یہ ان کے کلام اور طرز کی وہ امتیازی صفت ہے جس سے وہ غنائی شاعری کے لیے وہ راہیں کھول دیتے ہیں جن سے گزشتہ سو سال میں اردو شاعری نے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ حاصل کیا ہے ۔

میر تقی میر اور میر انیس کے راگ ان کے اپنے دور کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں وہی رفتار ہے جو شاہ عالم اور واجد علی شاہ کے دور کی رفتار تھی ۔ لیکن غالب کے راگ جدید دور کے راگوں کے ساتھ چلتے ہیں ۔ اس میں تیز رفتاری تنومندی ، حوصلے اور اٹھان کا احساس ہوتا ہے ۔ یہاں آواز میں مردانہ پن اور استقلال نمایاں ہے ۔ یہ راگ غموں میں ڈھا دینے والے نالوں

سے نہیں بنا جس سے لذت و سکون حاصل کیا جاتا ہے ، بلکہ یہاں مضطر اعتماد اور پر خلش استقلال کا لطف آتا ہے ۔ غالب اور اقبال کے راگ اسی لیے ایک دوسرے سے قریب ہیں ، نہ صرف قریب ہیں بلکہ اقبال غالب کے اس راگ تکمیل بھی کرتے ہیں ۔ الٰہی عناصر کی وحدت سے طرز غالب وجود میں آتا ہے اور جب ہم اس راگ کے جادو میں آجاتے ہیں تو وہ ہمیں الہام معلوم ہونے لگتا ہے ۔ غالب کا '' مزاج '' ان حقائق کو سمجھ سکتا تھا اُن کے سامنے تھے ۔ ان کا تجربہ کر سکتا تھا جو بمشکل محسوس کیے جا سکتے ہیں ۔ اسی لیے غالب جب اپنے تجربات کو اپنے مخصوص مزاج کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو الفاظ نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور ہمیں فکر و احساس کی نئی دنیا میں لے جاتے ہیں اور ہم کہہ اٹھتے ہیں :

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آج غالب ایک شاعر کے بجائے قوم کے نمایندہ شاعر ہیں اور یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ قوم کا نمایندہ شاعر عالم انسانیت کا شاعر ہوتا ہے

سخن در سخن

[۱]

غالب اور تلامذۂ غالب کے بارے میں بہت سی معلومات اور روایات ایسی ہیں جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آئیں اور اسی وجہ سے غالب پر لکھنے والوں نے ان سے استفادہ نہیں کیا۔ بہت سی قدیم کتابیں اور رسالے اب نایاب ہیں اور اگر کہیں موجود ہیں تو ان کے مندرجات عام نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ یہاں غالب اور تلامذۂ غالب کے بارے میں چند ایسی ہی تحریریں پیش کی جاتی ہیں۔ اولاً غالب کے تین غیر معروف شاگردوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

دیبی دیال نامی:

گلدستہ ''نغمۂ بہار'' لکھنؤ بابت ۱۰ - ستمبر ۱۸۸۷ء (ص ۲۳) میں نامی کی طرحی غزل کا مندرجہ ذیل ایک شعر ملتا ہے:

کبھی صبا سے معطر نہ ہو گلوں کا دماغ
طواف تیری گلی کا اگر صبا نہ کرے

شاعر کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔ ''جناب دیبی دیال صاحب لکھنوی شاگرد غالب مرحوم از اکبر پور''۔

کرم فیروز پوری:

''پیام یار'' بابت جولائی ۱۸۸۸ء میں (ص ۱۴) کرم فیروز پوری کی ایک طرحی غزل شامل ہے۔ غزل سے پہلے شاعر کا نام یوں لکھا ہے۔

"جناب شیخ کرم الٰہی صاحب کرم فیروز پوری شاگرد جناب غالب دہلوی"۔ غزل یہ ہے :

وہ بھی اب بے چین رہتے ہیں ہماری یاد میں
یہ اثر آیا ہمارے نالہ و فریاد میں
چین یاں ہم کو نہیں ہے ، واں نہیں اُن کو قرار
ہم ہیں ان کی یاد میں ، وہ ہیں ہماری یاد میں
آپ سے باہر ہوں میں فرط خوشی میں اے صنم
تم اگر آجاؤ میرے خانۂ برباد میں
بے سبب خون رگ گردن نہیں ہے جوش زن
باڑھ رکھوائی ہے اُس نے خنجر فولاد میں
تم اُدھر دشمن کے گھر میں چین سے سوتے رہو
ہم ادھر روتے رہیں شب بھر تمہاری یاد میں
غیر کے آگے یہ پوچھا اُس نے مجھ سے اے کرم
تم بھی کیا بے چین رہتے ہو ہماری یاد میں

ان کی ایک اور غزل کے مندرجہ ذیل تین شعر "پیام عاشق" بابت ۱۸۹۳ء (ص ۴) میں بھی شائع ہوئے تھے - شعروں سے پہلے جو تعارف ہے ، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرم "نہر جمن" میں ملازم تھے اور گڑھی عبد اللہ خاں میں قیام تھا :

آب حیواں کا مگر چشمہ ہے مے خانوں میں
پی کے کچھ جان سی آ جاتی ہے انسانوں میں
شکر صد شکر کہ مے ہو گئی زاہد کو حرام
ورنہ قطرہ بھی نہ ملتا ہمیں مے خانوں میں
مے کدے میں ہے کرم دیکھ لو جا کر اس کو
اتقا جس کا ہے مشہور مسلمانوں میں

حکیم جمشید علی خاں اختر :

گلدستہ '' نشو و نما '' بریلی بابت ستمبر ۱۹۰۲ء (ص ۳) میں اختر کی ایک طرحی غزل شامل ہے ۔ غزل سے پہلے یہ تعارفی عبارت ہے : اختر جناب حکیم جمشید علی خاں صاحب شاگرد حضرت غالب مرحوم دھلوی ۔ غزل یہ ہے:

للہ باز آئیں نہ جور و جفا سے آپ
مرتے ھیں مرنے والے تو اپنی قضا سے آپ

بیزار ہو کے کہتے ہیں اہل وفا سے آپ
مرجائیں زہر کھا کے ہماری بلا سے آپ

وعدہ اگر وفا نہیں ہوتا نہ ہو ، مگر
دیتے رہیں ذرا تو تسلی دلاسے آپ

یہ بھی ہے کوئی بات کہ تم سے تو ہم کہیں
اور تم کہو کہ جائیے کہیے خدا سے آپ

دو دن میں انقلاب طبیعت یہ ہوگیا
کل آشنا تھے ، آج ہیں نا آشنا سے آپ

ق

بچپن کا عذر مانا کہ تھا مانع وصال
اب تو جوان ہو گئے فضل خدا سے آپ

پھر بھی ہے وہ ہی سد نظر ہم سے دور باش
ایسے ہی ننھے بچے ہیں گویا ذرا سے آپ

فرمائیے تو حضرت دل کی بساط کیا
اور اس پہ بل کی لیتے ہیں زلف دوتا سے آپ

ق

اختر یہ کیا غضب ہے کہ کل خانقاہ میں
بیٹھے تھے لو لگائے ہوئے کبریا سے آپ

مسواک و خرقہ ، سبحہ و دستار و جبہ سے
معلوم سب کو ہوتے تھے اک پارسا سے آپ ۲
یا آج ہے کدے میں یہ سر ہے پائے خم
سرخوش ہیں دور بادۂ عشرت فزا سے آپ
بیٹھے ہو آہ بیعت دست سبو کیے
ایسے تو منحرف نہ تھے راہ ہدیٰ سے آپ
کچھ خوف بھی تو چاہیے روز شمار کا
کچھ شرم بھی تو کیجیے حضرت خدا سے آپ
ہم کو بھی دیکھنی ہے رعونت حضور کی
کب تک کھنچیں گے اختر جادو نوا سے آپ

---

[۲]

غالب کے معروف شاگردوں کے بارے میں کچھ نئی معلومات مختلف ذرائع سے حاصل ہوئی ہیں ، جو یہ ہیں :

ریاض الدین طالب کی غزل :

غالب کے شاگرد ریاض الدین طالب کے دو شعر لالہ سری رام نے خم خانۂ جاوید میں درج کیے ہیں ، یہی دو شعر '' تلامذۂ غالب '' میں ملتے ہیں ۔ طالب کی پانچ شعر کی ایک طرحی غزل ماہانہ گلدستہ '' ارمغان'' کے جولائی ۱۸۹۶ء کے شمارے میں ملتی ہے ۔ جو اس گلدستے کی پہلی جلد کا پہلا شمارہ ہے ۔ اس غزل کے پہلے تین شعر یہ ہیں :

میں یاد زلف میں جو غریب الوطن ہوا
مار سیاہ جادۂ راہ ختن ہوا
مہمان میرے گھر جو بت گلبدن ہوا
خلوت کدے کا رنگ ، بہار چمن ہوا
وہ چپ رہے جو سن کے سوال وصال کو
عالم میں لاجواب ہمارا سخن ہوا

بقیہ دو شعر وہی ہیں جو ''خم خانۂ جاوید'' اور ''تلامذۂ غالب'' میں درج ہیں -

جواہر سنگھ جوہر :

پروفیسر وزیر الحسن عابدی ، استاد شعبۂ فارسی ، اورینٹل کالج لاہور کے پاس ''گلستان سخن'' (مصنفہ قادر بخش صابر) کا ایک ایسا مطبوعہ نسخہ ہے جس پر بہاء الدین بشیر اور درگا پرشاد نادر کے قلمی حواشی ہیں - نادر نے غالب کے شاگرد جواہر سنگھ جوہر کے بارے میں چند سطریں لکھی ہیں ، جو پروفیسر عابدی کے شکریے کے ساتھ درج کی جاتی ہیں :

''منشی جواہر سنگھ صاحب مرحوم مغفور ، قوم کھتری ، ساکن گندھی گلی ، خلف الرشید رائے چھجمل صاحب ، غریق لجہ رحمت - یہ جناب تذکرہ [گلستان سخن] کی تیاری کے وقت پنجاب میں سر رشتہ دار تھے اور غدر کے بعد دہلی میں تحصیل داری کے بعد پنشن یاب رہے - ۱۸۶۹ء میں سفر آخرت اختیار کیا - اپنی تصنیفات سے (۱) ...... ''

سخن و غالب :

صفیر بلگرامی کے شاگردوں کا تذکرہ ''مرقع فیض'' مولفہ سلطان مرزا سلطان ۱۲۹۰ھ میں شائع ہوا تھا - خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی نے اس کا جواب لکھا تھا جو ''تنبیہ صفیر بلگرامی'' کے نام سے شائع ہوا تھا - اس پر بہ حیثیت مصنف سردار مرزا کا نام ہے ، لیکن در حقیقت یہ سخن ہی کی تصنیف ہے - اس میں سخن کے خود نوشت حالات بھی آ گئے ہیں - ذیل میں ''تنبیہ'' کے ایسے اقتباسات دیے جاتے ہیں ، جن میں سخن نے اپنے حالات سردار مرزا کی زبان سے بیان کیے ہیں - خواجہ سخن کے بیانات میں بعض غلط بیانیاں ہیں ، جن کی نشان دہی کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی - ''قولہ'' کے بعد ''مرقع فیض'' کی اور ''تنبیہ'' کے بعد ''تنبیہ صفیر بلگرامی'' کی عبارت ہے :

قولہ : سخن ، خواجہ سید فخر الدین ، لکھنوی نسل ، دہلوی اصل ، خلف حضرت فقیر صاحب سجادہ نشین مقام لکھنؤ -

---

۱- اس کے بعد کچھ نہیں لکھا -

تنبیہ: دروغ گو را حافظہ نباشد ۔ اٹھارہ برس سے خواجہ صاحب ملک میں روشناس خرد و کلاں ، آپ کے استاد ، ممدوح پیر و جوان ہ مگر آج تک آپ نے ان کو نہ پہچانا ۔ اپنے استاد کے والد بزرگوار کا نام تک جانا ۔ باوجودیکہ دو برس تک انہوں نے آپ کی پرورش کی ، شاعری رموز بتائے ، بوستان خیال اور فیض صفیر اور چند مثنویوں پر اصلاح دی ، اس پر بھی آپ ان سے نا واقف ہی رہے ۔ خیر اگر آپ انہیں نہیں جانتے کے مدارج اور مراتب نہیں پہچانتے ہیں تو مجھ سے سنیے کہ " ج مولوی خواجہ سید فخر الدین حسین خاں صاحب بہادر ادام اللہ بقائہ خلف الم اعلم علمائے بلاغت و ایقان ، برگزیدۂ بارگاہ یزداں ، جناب تقدس مآ کرامت انتساب ، سیدنا و مولانا حضرت خواجہ سید محمد جلال الدین ح المعروف بہ حضرت صاحب مد ظلال جلالہم الی یوم الدین و لازوال افاضا عن رؤس المریدین والمترشدین ، ولد مہر سپہر فضل و کمال ، مقبول با حضرت ذوالجلال ، قدوۂ ارباب دین ، زبدۂ اصحاب صدق و یقین ، عالم ع شریعت ، واقف رموز طریقت ، الہادی الی سبیل الرشاد ، حضرت سیدنا و مولا مرشدنا و ہادینا سید ابو القاسم محمد نظام الدین احمد رضوی المعروف بہ خوا فقیر صاحب چشتی مودودی الکمہاری اعلی اللہ درجاتہ ، فی اعلی علیین کے ہیں

اللہ تعالیٰ ان کی ذات والا صفات کو قایم اور برقرار رکھے اور ان فضل و کمال اور جاہ و صفات میں ترقی دے کہ حاسدوں کا دل کباب ہو دشمنوں کو ان کے رنج بے حساب ہو ۔

قولہ : یہ آرہ میں مرزا محمد صدیق کے بڑے بیٹے مرزا محمد ابراہ صاحب کی دختر سے منسوب ہوئے تھے ۔ اس کے بعد ۱۲۷۵ھ میں ان آنا ہوا ۔

تنبیہ : صفیر کس بے پروائی اور معمولی طور سے تم نے نام نامی جناد حضرت مرزا محمد صدیق خاں صاحب بہادر مرحوم و مغفور کو لکھا ہے ، جو سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو جناب خواجہ صاحب کے اعزہ و اقران سے شاید عداوت ہے اور یہ تحریر تمہاری اس کی شاہد ہے کہ تم کو علم ادب سے مطلق بہرہ نہیں ۔ نہ تم میں آدمیت ہے نہ کسی قسم کی لیاقت کوئی میت مسلمان ہو ، تحریراً یا تقریراً جب آدمی اس کو یاد کرتا ہے تو

اس کے نام کے ساتھ مرحوم یا مغفور ضرور کہتا ہے یا لکھتا ہے مگر تم نے اپنی تحریر میں جناب غفران مآب مرزا محمد صدیق صاحب مرحوم و مغفور کے اسم گرامی کے ساتھ 'صاحب' کا لفظ بھی لکھنا دریغ کیا، لفظ 'مرحوم' یا 'مغفور' تو بہت دور ہے۔ بعد اس کے 'صاحب' کے لفظ کو تم نے بالائے سطر ان کے نام کے پاس رقم کیا۔ ان باتوں کو تمہاری وہی سمجھتا ہے جو تمہارے خبث نفس اور شرارت طبیعت سے واقف ہے۔

ناظرین پر تمکین پر اچھی طرح سے واضح اور آشکارا ہے کہ جناب غفران مآب مرزا محمد صدیق خاں صاحب بہادر علیہالرحمۃ و الغفران ایسے شخص تھے جن کی عظمت اور شان جلالت سے آپ بزرگوار یعنی میر بہادر علی مرحوم اور ان کے برادر اور اخوان جن کی آپ ذریات میں سے ہیں، واقف اور آگاہ تھے۔ بلکہ ہنوز ایسے لوگ موجود ہیں جن کے قلوب میں خلوص پایا جاتا ہے اور جن کے دلوں میں عظمت اس خاندان کی باقی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ اب تک وہی اتحاد قدیم دونوں خاندانوں میں اسی طرح برقرار و بحال ہے۔ اور مرزا صاحب کے عزیزان کو بھی اس وقت تک آپ لوگوں کا ویسا ہی خیال ہے جس طرح جناب مرزا صاحب خیال رکھتے تھے۔ ان باتوں کو جو جانتے ہیں وہی سمجھتے ہیں۔ اور آپ بھی خوب سمجھتے ہیں مگر نفسانیت آپ کی نہیں چاہتی کہ بزرگوں کی عظمت باقی رہے۔ آپ کے والد ماجد تو کیا آپ کے دادا جناب میر غلام یحییٰ صاحب بھی شاید اس طرح نام نامی جناب مرزا صاحب مرحوم کا زبان پر نہیں لائیں گے جس طرح آپ نے مرقع فیض میں لکھ کر چھاپ دیا ہے۔ خیر یہ باتیں آپ کی لیاقت ظاہری و باطنی کے نشان دیتی ہیں۔ ہم تو اسی قدر کہہ کر چپ رہتے ہیں کہ واہ ماشاءاللہ جب ایسے ہو تب ایسے ہو۔

قولہ : ایک دن خواجہ صاحب نے کہا کہ میں ایک قصہ لکھا چاہتا ہوں، مگر اسی شرط پر کہ آپ مجھے شاگرد بنائیے اور اس میں مدد کیجیے۔

تنبیہ : 'شاگرد بنائیے' کیا اچھا محاورہ ہے۔ ہائے استادی کا دعویٰ اور یہ زبان، وقائع نگاری اور یہ بہتان، یہ جو آپ کے بلگرام کا محاورہ ہے کہ چلم بنالاؤ، وہی آپ ہر جگہ خرچ کرتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ قصہ لکھنے کے واسطے شرط کس قدر معقول ہے اور مدد کرنے کا فقرہ کس قدر مجہول ہے۔

قولہ : غرض قصۂ سروش سخن کی بنا پڑی۔ اور روزمرہ وہ طبع زاد

دو ایک ورق کہانی کے لکھ لاتے اور حضرت صفیر اس کو وسعت دے کر مسجع فرماتے ۔

تنبیہ : قصہ کیا تھا ، کوئی مکان تھا یا کوئی دیوار تھی ، اور آپ کوئی مزدور تھے کہ بے آپ کے اس کی بنا پڑنی دشوار تھی ۔ صفیر میں پوچھتا ہوں کہ کہ اس جھوٹ اور فریب کی باتوں سے فایدہ ۔ کہاں آپ کہاں خواجہ صاحب ۔ وہ اور نثر نویسی یا نظم گوئی میں آپ جیسے دیہاتیوں کی مدد چاھیں گے ۔ خدا کی شان ہے ۔ اور آپ کے اس جھوٹ کے قربان ، نیکی برباد گنہ لازم ، استاد تو شاگرد بن گئے اور شاگرد اپنے استاد کے استاد ہوگئے ۔ یہ سزا ہے حضرت خواجہ صاحب کی مروت اور جانفشانی کی کہ برسوں آپ کی تعلیم میں انھوں نے محنت کی ۔ بوستان خیال کے ترجمے کو درست کیا ، فیض صفیر پر اصلاح دی ، روز مرہ بنایا ، محاورے دھلی اور لکھنؤ کے سکھائے ، آپ کے ہر طرح کے امور ضروری میں مددگار رہے مگر آپ ان کے احسانات ذبح کرنے کو چھری لیے تیار رہے ، سچ ہے :

نکوئی با بدان کردن چنان است
که بد کردن بجائے نیک مردان

قولہ : اس قصہ میں سال بھر تک محنت کی ۔

تنبیہ : چھ مہینے میں تین نقلیں آپ سے اس قصے کی لکھوائی گئیں ۔ اور چار آنے جزو کے حساب سے بارہ روپے آپ کی مزدوری کے آپ کے ھاتھ دیے ۔ اور جو آپ اپنی ضرورت پر خواجہ صاحب سے مانگ کر لے گئے اس کا حساب نہیں ، جس کو میں خوب جانتا ہوں ۔ بس زیادہ منہ نہ کھلوائیے ۔ یہیں تک رہنے دیجیے ۔ بہت نہ بڑھ جائیے ۔

قولہ : حضرت استاد نے کوئی دقیقہ ان کی تعلیم کا نہ چھوڑا اور شفقت بزرگانہ سے درگزرے ۔

تنبیہ : آپ اور خواجہ صاحب کی تعلیم ! سبحانک هذا بہتان عظیم ۔ آپ ھنوز حرف اور حزف کا فرق جانتے ھی نہیں ۔ ابجد کے رموز کو پہچانتے ھی نہیں ، آپ کیا ان کی تعلیم کریں گے ۔

سنیے ۔ حضرت خواجہ صاحب دھلی میں پیدا ہوئے ، سترہ برس کی عمر

تک دہلی میں رہے ۔

حاجی مولوی عبدالرحمٰن اور مولوی محمد علی علیہم الرحمتہ والغفران ، مولوی فضل حسین ، مولوی محمد مجتبیٰ اور مولوی فتح محمد سے صرف و نحو ، منطق ، حکمت کو ۱۶ برس کی عمر تک حاصل کیا ۔

حضرت جناب نواب اسداللہ خاں غالب مرحوم و مغفور خواجہ صاحب کے نانا تھے ۔ ان سے فارسی کی تکمیل کی ، انھوں نے رموز شاعری کو بھی بتایا مگر یہ فرمایا کہ ابھی شعر نہ کہو جب تک جمع علوم کی تحصیل سے فراغ حاصل نہ ہو ۔ مگر خواجہ صاحب ان دنوں کسی اور ہی عالم میں تھے ، ان سے نہ رہا گیا ۔ اور شعر کہنے لگے ۔ ایک غزل حضرت غالب قدس سرہ کو دکھائی جس کا ایک شعر یہ ہے :

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

خواجہ صاحب کے نانا صاحب نے خواجہ صاحب کو گلے لگایا اور آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ میری جان ایسے شعر نہ کہا کرو ۔ ابھی تو تم نے ہوش بھی نہ سنبھالا ، دنیا میں کیا دیکھا بھالا ۔ دیکھو عارف ایسے ہی لخت جگر آکل کر دنیا سے نا شاد گیا ۔ تم بھی زندگی سے بیزار ہو ۔ غرض نہایت خفا ہوئے اور تاکید کی کہ خبردار اب جو سنوں گا کہ ایسا شعر کہا ہے تو سید تیری جان اور اپنے ایمان کی قسم صورت سے بیزار ہو جاؤں گا ۔

بس کہ حضرت خواجہ صاحب ان سے بہت ڈرتے تھے ، شعر کہنا موقوف کیا اور سہر نیمروز و تاریخ فارسی جو خاص ان کے نانا کی تصنیف تھی اس کو تمام وکمال حضرت مصنف ہی سے پڑھا اور کچھ رقعے پنج آہنگ کے دیکھتے تھے کہ زمانے کا انقلاب ہوا اور خواجہ صاحب دہلی سے لکھنؤ آئے ۔ بسکہ ذوق شعر گوئی دامنگیر تھا اور اپنے مالوف سے مفارقت ہوئی تھی ، زبان دہلی اور مکان دہلی ایک طرح خود ایجاد کر کے اس میں ایک سہر حاصل غزل کہی اور جناب نواب اصغر علی خاں صاحب تسلیم دہلوی مرحوم کی خدمت میں واسطے اصلاح کے پیش کی کہ وہ لکھنؤ کے شعرائے نام برآوردہ میں تھے ۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ کا ادب مانع ہے کہ میں آپ کے کلام بلاغت نظام میں کچھ بھی تصرف کروں ۔ مگر الامر فوق الادب ناچار آپ کی خدمت گزاری بدل و

جان قبول ہے ۔ چنانچہ غزل کو دیکھا اور اصلاح سے مزین فرمایا اور چونکہ وہ غزل ایک حالیہ واقعے کے پیرائے میں ناخن بدل زن تھی کہ انھوں نے غزل مذکور اخبار میں چھپوادی ۔ چند روز کے بعد دہلی میں وہ زمیں طرح ہوئی اور سیکڑوں شعرا نے اسی طرح میں غزلیں کہیں ۔ یہاں تک کہ وہ ایک کتاب ہو گئی ۔ جب سے خواجہ صاحب برابر غزلیں اور قصائد کہتے رہے ۔

صرف دو مہینے لکھنؤ میں رہے اور تیسرے مہینے بہ ہمراہی جناب پھوپا صاحب اپنے بمقام آرہ ۱۲۷۶ھ میں تشریف لائے ۔ بسکہ طبیعت طرف تحصیل علوم کے مائل تھی ، حضرت جناب مولوی امداد علی خان صاحب بہادر اور مولوی عبدالکریم سے صاحب شرح مسلم وغیرہ کا درس لیتے رہے ۔ آخر ایک واقعۂ جگر خوں کن کا اثر حضرت خواجہ صاحب کے دل پر ایسا تھا جس کو وہ دہلی سے ہمراہ لائے تھے کہ اس کی وحشت نے ایک داستان عشق و عاشقی ان سے لکھوائی یعنی کچھ دنوں طبیعت سروش سخن کی تصنیف سے بہلائی ۔

بعد اس کے امتحان وکالت کا دے کر سند وکالت درجہ اول کی پائی ۔ خوش نویسی میں اصلاح جناب حکیم حاجی مولوی ناظر عبدالعلی صاحب مرحوم سے لی اور اس میں مدت تک مشق کی ۔ غزلوں کی اصلاح برابر اپنے نانا سے بذریعۂ تحریرات لیتے رہے ، یہاں تک کہ ایک دیوان ۱۲۸۲ھ تک مرتب ہو گیا ، جس کا دیباچہ حضرت غالب مرحوم کا اس دیوان کے عنوان میں موجود ہے ۔

قولہ : اور سخن تخلص استاد ہی کا بخشا ہے ۔

تنبیہ : " تخلص بخشا ہوا ہے " یہ محاورہ آج نیا سنا ۔ تخلص کیا ہوا کوئی پڑھنت کوئی منتر ہوا کہ فلاں نے فلاں کو بخشا ۔ اس بھونڈی اور مہمل عبارت سے مطلب شاید آپ کا یہ ہے کہ سخن تخلص خواجہ صاحب کا ہم نے رکھا ہے ۔ یا ہم نے کہا کہ یہ تخلص آپ رکھیے ۔ ماشاءاللہ جہاں تک آپ سے ہوسکے جھوٹ بولے جائیے ۔ فریب کی باتوں سے باز نہ آئیے ۔ سخن تخلص خواجہ صاحب کا ان کے نانا نواب اسداللہ خاں غالب مرحوم نے رکھا ہے ۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے جو غزلیں دہلی میں کہیں ان میں سے ایک کا مقطع یہ ہے ۔ سخن دہلوی :

سخن غذا ہے جو ہجر صنم میں لخت جگر
تو خون دل ہے ہمارا شراب کے بدلے

اور قبل آنے آرہ کے جو غزل لکھنؤ میں کہی اس کا مقطع یوں ہے۔ سخن دہلوی :

نام ہے ہند کا دہلی سے سخن عالم میں
اور ہے حضرت غالب سے نشان دہلی (۹۵—۹۸)

عبدالرزاق شاکر :

" اردوئے معلیٰ " بابت دسمبر ۱۹۱۲ء میں شاکر کے حالات زندگی پر ایک مقالہ شائع ہوا تھا ، جس کا عنوان تھا : " مولانا سید محمد عبد الرزاق صاحب شاکر ' شاگرد مرزا غالب " ۔ اور مقالہ نگار کا نام " یکے از نامہ نگاران اردوئے معلیٰ " تھا ۔ اس میں غالب و شاکر کے تعلقات کی وضاحت بھی کی گئی ہے ، اس مقالے کے بعض ضروری حصے درج ذیل کیے جاتے ہیں :

آپ ماہ ذیقعدہ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے ، آپ کا سلسلہٴ نسب باپ اور ماں دونوں طرف سے جناب رسالت مآب تک پہنچتا ہے ۔ آپ حضرت زینب بنت حضرت فاطمہ جگر گوشہٴ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ہیں ۔ آپ کا وطن قصبہ مچھلی شہر ضلع جونپور ہے ۔ ممالک متحدہ کے قصبوں میں سے اس قصبے کو ایک خاص شہرت حاصل ہے ۔ آپ کے مورث اعلیٰ قاضی ثناء الدین صاحب غزنوی سلاطین شرقیہ کے وقت میں مچھلی شہر ضلع جونپور کے قاضی مقرر ہوئے تھے ۔ اس وقت سے آپ کا خاندان اس قصبے میں آباد ہے اور اس کو اور نیز آپ کے اہل برادری کو قرب و جوار میں ایک خاص قسم کا امتیاز حاصل ہے ۔ آپ نے اپنے والد ماجد سید محمد عبدالوہاب صاحب مرحوم و مغفور کے سایہٴ عاطفت میں پرورش پائی ۔ بچپن ہی سے آپ میں جودت طبع کے آثار پائے جاتے تھے ۔ عربی و فارسی میں آپ نے کمال حاصل کیا ہے جس سے آپ کی طبیعت کو ایک خاص مناسبت ہے ، اس وقت آپ کی عمر اسی سال کی ہے ۔ آپ کی ذات بابرکات تمام خوبیوں کا مجمع ہے ۔ بعد تحصیل علم آپ کو کسب معاش کی تلاش ہوئی ۔ آپ نے ۱۸۶۳ء میں وکالت ہائی کورٹ کا امتحان پاس کیا اور عرصے تک ضلع گورکھپور میں وکالت کرتے رہے ۔ چونکہ آپ کی طبیعت میں ایک

قسم کی الوالعزمی تھی ، اس نے آپ کو گورکھپور اور احباب گورکھپور کو چھوڑنے پر مجبور کیا ۔ آپ ۱۸۷۱ء میں مقیم اله آباد ہوئے اور عدالت عالیہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی ۔ وہاں وکالت کے زمانے میں بھی آپ اپنا زیادہ وقت اہل علم و کمال کی صحبت میں صرف کرتے تھے اور آپ کے احباب میں سے جناب منشی غلام غوث خاں صاحب ذوالقدر بہادر میر منشی افشنی غرب و شمال مرحوم خاص طور سے قابل تذکرہ ہیں ۔ عرصے تک وکالت کرنے کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کی اور ۱۸۷۳ء میں منصف مقرر ہوئے ، بیس اکیس سال تک آپ نے ممالک متحدہ کے مختلف اضلاع میں منصفی اور سب ججی کی اور ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے پنشن پاکر خانہ نشیں ہوئے ۔ آپ نہایت منکسر مزاج اور متواضع بزرگ ہیں ۔ آپ ہر طبقے اور ملت کے لوگوں سے باخلاق حسنہ پیش آتے ہیں ۔ علم اور اہل علم سے آپ کو ایک خاص تعلق ہے ۔ اصحاب کمال کی آپ بے انتہا عزت فرماتے ہیں اور اکثر مداح رہا کرتے ہیں ۔ گورکھپور کے قیام کے زمانے میں آپ کو شاعری کی طرف توجہ ہوئی ۔ اور اسی الوالعزمی نے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ، آپ کو مجبور کیا کہ آپ حضرت غالب ایسے جلیل القدر شاعر کو اپنا استاد بنائیں ۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں آپ ان کے شاگردوں میں شامل ہوئے ۔ اور اس وقت سے شعر و شاعری کا سلسلہ جو شروع ہوا ، اب تک قائم ہے ۔ آپ کا نام عبدالرزاق ہے اور رزق کا مقتضا شکر ہے ، اس سے آپ نے اپنا تخلص شاکر کیا۔ عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں آپ کے نام بہت سے خطوط ہیں ۔ ان میں حضرت غالب جابجا شاگرد کے علم و فضل کا اعتراف فرماتے ہیں ۔ حضرت شاکر کا استاد مرحوم کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہے ۔ عربی ، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اشعار موجود ہیں ۔ جن کو ہم بطور نمونہ مشتے از خروارے و اندکے از بسیارے و گلے از گلزارے، آگے چل کر درج کریں گے ۔ آپ کو علم نسب کی طرف خاص توجہ ہے اور آپ نے اس کی تحقیق میں بہت وقت صرف کیا ہے ۔ آپ نے اپنے خاندان کے حالات بھی لکھے ہیں جو طبع ہو چکے ہیں اور نیز اکثر اشعار میں اس کا کا ایما فرما دیا کرتے ہیں ۔ منجملہ ان کے ایک قطعہ یہ ہے :

والدین جعفری الزینبی — باد من موسویہ بودہ است
در مصائب بود مثل فاطمہ — راست می گویم ولیہ بودہ است

آپ کے خطوط جو آپ نے وقتاً فوقتاً مجتہد العصر و الزمان لکھنؤ

جناب رضواں مآب سلطان العلما مولانا سید محمد صاحب جعفری النقوی کو لکھے ہیں ، ان سے آپ کی قابلیت اور تجربے کا پتا چلتا ہے ۔ یہ خطوط فارسی زبان میں ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان سے آیندہ نسلیں فائدہ اٹھائیں ....

آپ کو صحت و ترکیب الفاظ کا بہت خیال رہتا ہے اور آپ ان کی تحقیق میں بڑا وقت صرف کرتے ہیں حتیٰ کہ تجویزیں جو آپ نے بحالت منصفی و سب ججی لکھی ہیں ، ان میں بھی کبھی ایسے الفاظ استعمال نہیں فرمائے جو علی العموم قانونی دنیا میں غلط رائج ہیں ۔ اس بیس برس کی ملازمت میں آپ نے ہزاروں فیصلے تحریر کیے ، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی لفظ آپ نے غلط یا خلاف محاورہ استعمال کیا ہو ۔ مثلاً آپ نے لفظ 'متدعویہ' کا جو عدالتوں میں کثرت سے رائج ہے ، ہمیشہ خیال رکھا اور آپ کے قلم سے کبھی نہیں نکلا ، بلکہ آپ ہمیشہ اس کی جگہ مدعاٖبہا یا اس کے مترادف الفاظ استعمال کرتے رہے ۔ اگر آپ کے سامنے کوئی پڑھا لکھا آدمی غلط لفظ استعمال کرتا ہے تو آپ کو ایک قسم کی تکلیف ہوتی ہے اور باوجود مجسم اخلاق ہونے کے آپ اسی وقت متنبہ و مطلع کر دیتے ہیں ، چناں چہ بد خطی و لفظ غلط کے باب میں فرماتے ہیں :

آفت باصرہ ہے سوء الخط موذیٔ سامعہ ہے لفظ غلط

آپ کو اپنے استاد مرحوم سے بہت محبت تھی ۔ اس کا ثبوت ایک فارسی غزل کے اس شعر سے ملتا ہے :

حضرت دہلی مقام حضرت غالب چو شد
غیرت شیراز و رشک اصفہاں نامیدمش

اس کے علاوہ عربی کی تاریخ جو کہ آپ نے اپنے استاد مرحوم کی وفات پر لکھی تھی ، قابل اندراج ہے اور وہ یہ ہے :

مات ہیہات صاحب التحقیق صائب الرای راسخ الملکہ
مالک النثر حاکم التنظیم جعل اللہ غالباً اسمہ
مثل الشاکر عن الاستاذ دخل الارض طالب الجنہ
ما قضی اللہ فی التراب علیہ قال ہاتف موخاً غفرہ

۱۲۸۵ھ

آپ کی طبیعت نہایت غیور اور قانع واقع ہوئی ہے ، آپ کو امرا و اغنیا کی صحبت سے ہمیشہ پرہیز رہا ، جیسا کہ آپ خود اپنے ایک مقطع میں فرماتے ہیں :

پیشہ فقر کا تو شیر بنا وہ شاکر
اغنیا سے نہ ملا کر سگ دنیا ہو کر

اور ایک غزل کے ایک شعر میں فرماتے ہیں :

دنیا کی تونگری پہ لعنت
لکھواؤں گا اس کو آب زر سے

گوشہ نشینی سے آپ کو خاص دلچسپی ہے ۔ اور آپ اہل دنیا سے بہت کم ملتے ہیں ۔ آپ صفائی بہت پسند کرتے ہیں ، چناں چہ اس کا خیال لباس و مکان ہر چیز میں ملحوظ رہتا ہے ۔ خلاف وضعی کو نہایت نا پسند فرماتے ہیں ۔ وضعداری آپ پر ختم ہے ۔ زمانے نے اس قدر ترقی کی لیکن آپ نے اور لباس تو درکنار کبھی انگریزی جوتا بھی نہیں استعمال کیا ۔ آپ ہر چیز میں سادہ روی کو پسند فرماتے ہیں ، جیسا کہ خود فرماتے ہیں ۔ بیت :

خیرالامور اوسطہا لا خلاف فیہ
نقشہ فی فوادک یا ایہا الفقیہ

آپ میں مذہبی یا قومی تعصب قطعاً و مطلقاً نہیں ہے ۔ آپ شیعہ ، سنی ، عیسائی ، ہندو ، سب سے یکساں برتاؤ رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں ۔ بیت :

من اللہ جاءت جمیع مذاہب
فلو کان مسلم و لوکان راہب

اور انہیں خوبیوں کی وجہ سے آپ سے ہر ملت کا آدمی محبت کرتا ہے ۔ آپ کو مذہبی مباحث بالکل مرغوب نہیں ہیں ۔ اور کسی مذہب یا شخص کی توہین کرنا آپ گناہ عظیم سمجھتے ہیں جیسا کہ اس شعر میں آپ نے اپنا خیال ظاہر فرمایا ہے :

أسكت أسكت لعيب خلق الله

كل شيء يحكي من عنده

آپ کی صحبت سے ہر شخص مستفید و مستفیض ہوتا ہے۔ اور آپ کو علمی تذکروں میں بہت لطف آتا ہے۔ چناں چہ آپ اب باوجود معدوم البصر و مسن ہونے کے ہر وقت اپنے قصبے کے اہل علم و کمال سے بتوسط ملازمان، علمی مذاق میں مشغول رہا کرتے ہیں۔ اکثر علم دوست لوگ آپ کی صحبت تلاش کرتے ہیں اور آپ کی تقریر و تحریر سے بے انتہا فوائد اٹھاتے ہیں۔ آپ کی طبیعت میں سختی مطلق نہیں ہے، آپ اپنے متوسلین اور ملازمین سے بھی نہایت نرمی سے پیش آتے ہیں۔ جس قدر آپ کا ظاہر صاف ہے اتنا ہی آپ کا باطن بھی آئینہ ہے۔ آپ کا غصہ فوری ہوتا ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ بوجہ پیرانہ سالی کے اب آپ قریب معدوم البصر ہو گئے ہیں اور خود کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آپ اس علم پر جو آپ حاصل کر چکے ہیں، قناعت کرتے ہیں۔ منشی اکبر علی خاں نامی آپ کے ایک ملازم ہیں، ان کا یہ کام ہے کہ وہ آپ کو کتابیں پڑھ کر سنایا کریں۔ چناں چہ آپ روزانہ تین چار گھنٹے ان سے کتابیں سنتے ہیں اور اس علم و کمال میں جو آپ کو حاصل ہے، ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے۔ آپ کے فیضان صحبت سے اکبر علی خاں بھی صاحب استعداد ہو گئے ہیں اور ان کو آپ سے وہی نسبت ہے جو رمضانی کو جناب علی حزیں سے تھی۔ آپ جونپور کے رؤسا اور شرفا میں سے ہیں، آپ کی دنیوی حالت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ آپ کے پاس زرعی اور سکنی دونوں قسم کی جائداد ہے اور سرکار انگلشیہ سے معقول پنشن پاتے ہیں۔ آپ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑے صاحبزادے مولوی سید محمد تقی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ دوسرے مولوی سید علی نقی صاحب بی، اے، وکیل ہائی کورٹ ہیں اور مدرسۃ العلوم مسلمانان علیگڈھ میں قانون کے سینیر پروفیسر ہیں۔ تیسرے بیٹے سید محمد ہادی ہیں جو بی۔ اے۔ پاس کر چکے ہیں اور اس وقت مدرسہ مذکورہ میں قانون پڑھ رہے ہیں۔ آپ کے تینوں بیٹوں میں صرف مولوی سید محمد ہادی صاحب کو شعر و شاعری سے مذاق ہے، شاعری میں حافظ جلیل حسن صاحب کے شاگرد ہیں اور نہایت موزوں طبیعت پائی ہے۔ نظم کے علاوہ نثر سے

بھی شوق ہے - چناں چہ ان کے مضامین اور ان کی غزلیں اکثر پرچوں اور گلدستوں میں ملیں گی - حضرت شاکر یادگار غالب ہیں اور آپ کی ذات پاک غنیمت ہے - چند برس ہوئے کہ آپ کی اہلیہ نے انتقال کیا، اس وقت سے اپ کسی قدر افسردہ رہا کرتے ہیں ، جس کا اظہار آپ خود مرحومہ کے قطعۂ تاریخ میں فرماتے ہیں :

از مردن خلیلۂ خود مضطرب شدم
آہ دلم ز روئے زمیں تا سما رسید
میخواستم کہ سال وفاتش کنم رقم
چوں آں خدا رسیدہ حضور خدا رسید
تاریخ گفت ہاتف غیبی ز قطع ز ے
فی جنت النعیم نعیم النسا رسید

اب آپ اکثر زندگی سے بے زاری کا ظاہر فرماتے ہیں اور مرنے کی تمنا کیا کرتے ہیں - چناں چہ آپ نے اپنا سنگ مزار ابھی سے کندہ کرا کے نصب کرا دیا ہے جس کے عربی و فارسی اشعار قابل تحریر ہیں - وھو ھذا :

ان ھذا عبدہ الشاکر اقال
جئت فی الریحاں بعد الانتقال
صار قبری عند قبر زوجتی
نعم ھذا اقرب تا بت تربتی

زندہ بودم تا بدنیا رنجہا برداشتم
جائے آسائش مگر شہر خموشاں یافتم

آپ کی جو کچھ تمنا ہو ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ابھی آپ کو کچھ دنوں اور زندہ رکھے اور آپ صحیح اور تندرست رہیں - آمین - ثم آمین - آپ کی غزلیں اور اشعار اس کثرت سے ہیں کہ اگر ترتیب دی جاتی تو وہ دیوان کی صورت میں ہو جاتے لیکن آپ کی گوشہ نشیں طبیعت نے جو شہرت کو پسند نہیں کرتی تھی ، آپ کو اس طرف متوجہ نہیں کیا - ہم

آپ کی اس بے توجہی پر افسوس کرتے ہیں، اس بے توجہی کی بدولت آپ اپنا علم و فضل اپنے ساتھ لے جائیں گے اور دنیا کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ ....

(ص ۱۰ — ۳)

غالب کا ایک گمنام مقلد :

رسالہ ''جادو'' ڈھاکہ بابت اکتوبر ۱۹۲۳ء میں فدا علی خاں رام پوری کا ایک مقالہ ''مکاتیب سید غلام مصطفیٰ صاحب'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں غالب کے ایک مقلد کے حالات اور اس کی ایک تصنیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس مقالے کا ایک حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جناب سید غلام مصطفیٰ صاحب مرحوم ایک ایسے خانوادے کی یادگار تھے جسے سلاطین مغلیہ کی جانب سے جاگیر ملی تھی جس کی نقول اسناد اب تک ان کے ورثے میں موجود ہیں اور انہیں وثیقوں کے ذریعے سے لاخراج اراضی کے وہ مالک ہیں۔ سید مرحوم ڈھاکہ کی عدالت ججی کے طلیق اللسان فصیح البیان وکیل اور بتیس برس تک عہدہ آنریری مجسٹریٹ سے سرفراز تھے۔ آزاد خیال صوفی منش بزرگ تھے۔ ستانوے برس کی عمر پائی جو عموماً ہندوستان اور خصوصاً بنگال میں نہایت نادر الوجود ہے۔ ۱۳۲۵ھ میں دار ناپائدار سے رحلت فرمائی۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۲۲۸ ہجری ہوتا ہے۔ چند ماہ کا ذکر ہے کہ مرحوم کے نبیرے اور ہمارے کرم فرمانے لے رہا سید طیفور صاحب نے غایت عنایت سے مرحوم کے مکتوبات کا قلمی نسخہ جسے وہ حرز بازوئے سعادت سمجھ کر نظر آشنا سے چھپاتے ہیں، ہمیں دکھایا اور مرحوم کے اوصاف حمیدہ و خصائل پسندیدہ مختصراً بیان کر کے، ارشاد کیا کہ جناب مغفور مکان کے جس گوشے میں نماز پڑھا کرتے اور ورد و وظائف میں مصروف رہا کرتے تھے، وہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کی تاریخ وفات پتھر پر کندہ کرا کے نصب کروں........

سید صاحب مرحوم، نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں غالب کے معاصر اور مرید خاص اور شاگرد معنوی ہیں۔ سید مرحوم کے کلام کا جو نسخہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، وہ ڈھائی سو صفحوں کا مجموعہ مکاتیب ہے جو غالب کی پنج آہنگ کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی رعایت سے اس کا نام ''گرد پاهنگ غالب'' رکھا گیا ہے۔ پہلوی نامانوس کی تشریح مصنف

نے خود حاشیہ' کتاب پر کی ہے ، چنانچہ لفظ پاهنگ کے معنی پاپوش بتائے ہیں ان تشریحات کے متعلق بھی جہاں کہیں صاحب برہان قاطع اور میرزا کی را۔ میں اختلاف پایا ہے ، سید مرحوم نے میرزا ہی کو ترجیح دی ہے۔ سید مرحو کی دیدہ وری و بالغ نظری کی اس سے بڑھ کر روشن دلیل کیا ہوگی کہ جہ زمانے میں باد مخالف کے جھونکوں نے تمام بنگال میں میرزا کے خلاف ایک سخت طوفان اٹھا رکھا اور اندھیر مچا رکھا تھا اور سید مرحوم کے تمام فارسی دا اہنائے وطن میرزا کے کلام کے چہرے پر لپ بھر بھر کے خاک ڈال رہے تھے یہاں تک کہ مولوی احمد علی جہانگیر نگری پروفیسر ہوگلی کالج جیسے بزرگ بھی مویدالبرہان لکھ کر اس خاک آلیچنے میں شریک ہو گئے ، شرف امتیاز آپ ہی کے مذاق صحیح کے ہاتھ آیا کہ اس طوفان بے تمیزی م، شریک ہونے کی بجائے کلام غالب کے حسن خدا داد کے طالب بن گئے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا کی طرح عوام کالانعام کی شرکت سے آپ کو بھی سخ تنفر تھا۔ میرزا نے وہانے دام میں مرنے تک کو کسر شان سمجھا۔ روش عو سے بچنے کو '' جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈا دیا ''۔ سید مرحوم۔ آزادہ منشی میں غالب کے بھی کان کترے یعنی داڑھی تو داڑھی موچھوں بکھیڑا بھی نہ رکھا ۔ آجکل بنگال کے مغربی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانو میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں رہی مگر اس زمانے میں یہ جیسی جرأت کام تھا ، محتاج بیان نہیں ۔

غالب کی نثروں میں سے بھی ، معلوم ہوتا ہے ہمارے سید صاحب دستنبو کی زبان زیادہ پسند تھی ۔ میرزا نے اس میں التزام کیا ہے کہ جہا تک ہو سکے عربی کا لفظ زبان پر نہ آئے ، چاہے بات لوگوں کی سمجھ سے با ہی کیوں نہ ہو جائے ، تیرھا کی بدھیا تین ہی میں کیوں نہ جائے ۔ میرزا اردو کلام کے اشکال کی نسبت جس شخص نے شکایت کی ہے کہ :

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور بیان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ یا ان کا خدا سمجھے

نہ معلوم وہ دستنبو کی اس حمد کو سن کر کیا کہتا ۔ فرماتے ہیں

چرکر کہ ز زخمہ بر چنگ زند		پیداست کہ از بہر چہ آہنگ زند
در پردہ ناخوشی پنہان است		گاذر نہ ز خشم جامہ برسنگ زند

ہمارے سید صاحب نے بھی اس مجموعہ مکاتیب کے کم از کم نصف اخیر میں اسی پہلوی زبان میں جو عربوں کے تسلط سے پہلے ایران میں جاری و ساری اور عربی الفاظ سے مطلقاً عاری تھی ، زور قلم دکھایا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ اس لزوم مالایلزم کو خوب نبھایا ہے ۔ یہ کوششیں میرزا سے پہلے بھی اکثر ہو چکی تھیں ، مگر سوائے فردوسی کے کسی کو ان میں کامیابی نہ ہوئی ، حتیٰ کہ شیخ الرئیس جیسے استاد یگانہ حکیم فرزانہ کو بھی اس آئینے میں چہرہ مراد دیکھنا نصیب نہ ہوا ۔ اور حکمت علائیہ کو خمول کی تاریکی ہی میں منہ چھپائے پڑے رہنا پڑا ۔ شیخ جیسے مسیح زمانہ کو جن مردوں کے جلانے میں ناکامی سے سابقہ پڑا ہو ان کے زندہ کرنے کی اور کسی سے تو کیا توقع ہو سکتی ہے مگر ہاں ڈھاکہ جیسے دور افتادہ مقام کے رہنے والے کا اس وادی پُر خار و صحرائے دشوارگزار میں دلیرانہ قدم رکھنا ، ظاہر ہے کہ نہایت علوئے ہمت کی دلیل ہے جو مقبولیت عام کی نہ سہی تو خراج تحسین و آفریں کی تو ضرور کفیل ہے ۔ نصف اول کے خطوط گو مخلوط زبان میں ہیں مگر پہلوی الفاظ ان میں بھی بہت کثرت سے آئے ہیں ۔

دیباچے میں سبب تصنیف یہ بتایا گیا ہے کہ ایک روز مصنف نے اپنی انشاپردازی کے چند نمونے جناب مولانا عبیداللہ العبیدی کو پڑھ کر سنائے تو انہیں ایسے پسند آئے کہ طلبۂ مدرسہ ڈھاکہ کے افادے کی غرض سے ، جس کے وہ پرنسپل تھے ، بصورت کتاب مرتب کرنے کی فرمائش کی ، چنانچہ یہ مجموعہ رسائل اسی تعمیل ارشاد کا نتیجہ ہے ۔

اس تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنے اعزہ و احباب کو فارسی یا اردو میں جو خطوط لکھتے رہتے تھے ، انہیں کو مولانا عبیداللہ کے فرمانے سے پہلوی کے سانچے میں ڈھال دیا ۔ نہ یہ کہ یہ سب خطوط ابتداً اسی زبان میں لکھے گئے ہوں کیوں کہ اس صورت میں اکثر مطلب سمجھانے کے لیے مصنف کو خود ہی خط کے ہمراہ جانے کی ضرورت ہوتی یا شرح و حواشی لکھنے کی آخری تقدیر پر مکتوب الیہ کو بے سبب گھر بیٹھے ذلیل کرنا تھا اور پہلی صورت میں یہ مقولہ صادق آتا کہ :

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع ہنر کے ساتھ

ء اب شاہد مقصود کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اور بقول حضرات لکھنؤ مجرا بجا لا کر رخصت ہوتے ہیں ۔

(۱) اپنے ایک دوست مولوی وارث علی صاحب کو جنھوں نے عقد ثانی کی صلاح دی ہے، یوں تحریر فرماتے ہیں :

از مرگ زوجه ام که دلم صید تحپش بود نه سال میگزرد که خواستگاری خاتون ثانی را بتانی گزاشته رنجور قلق بے پایان و گنجور رنج فراوان شده سینهٔ ویرانهٔ دیرینه را گنجینهٔ درد و الم ساخته می آیم ۔ رباعی :

نه چو فرهاد بود کوه کنی پیشهٔ ما کوه ما سینهٔ ما ناخن ما تیشهٔ ما
ما بیک جرعهٔ بے منت ساقی لکشیم اشک ما بادهٔ ما دیدهٔ ما شیشهٔ ما

درازی سخن پیشکش ۔ اگر همگی کوشش و کشش به غمخواری من باشد رحمتے بیش ازیں نیست که زحمت سامعه آزاری خویش گزیده بزبان خواں ستوده دودمان جاور (حال) ماتم آورم شنیده و نشیب و فراز وادیٔ سخن دیده و در هر کنج و پیغوله اش فرا رسیده اگر همت عالی شما دستوری دهر فکر بیداری ایں خفته بستر درد و الم کنید وگرنه روئے از موئے ایں نزند بر تابید که گفته اند ۔ (بیت)

---

[۴]

قتل فریزر اور غالب :

مولوی مسعود علی محوی اپنی تالیف '' مخدوم زادگان فتح پور '' (حصہ دوم ، مطبوعہ حیدرآباد دکن ، ۱۹۳۶ء) میں اپنے والد مولوی شیخ احمد علی (متوفی ۱۲۸۱ھ) کے حالات میں لکھتے ہیں :

'' شیخ [احمد علی] صاحب تقریباً دس بارہ سال فریزر صاحب کے ساتھ رہے ۔ اس عرض مدت میں شیخ صاحب دفتر میں نقل نویس سے اہلمد اور اہلمد سے صدر اہلمد اور ناظر وغیرہ کے درجے تک پہنچ گئے ۔ اور فریزر صاحب کے خانگی معاملات میں اُن کے عزیز اور بھروسے کے قابل معتمد خانگی ہو گئے ۔ فریزر صاحب نے شادی نہ کی تھی ، مگر اُن کے پاس اُس زمانے کی روش کے مطابق کوئی

نہ کوئی ہندوستانی عورت رہتی تھی ، مگر ان کا تمام خانگی انتظام نقد و جنس کا حساب کتاب شیخ صاحب کے ہاتھ میں تھا ۔ کمشنر صاحب کے یورپین دوست ہنسی میں شیخ صاحب کو فریزر صاحب کے ' متبنیٰ فرزند ' کے نام سے یاد کرتے تھے اور نہایت محبت سے ملتے تھے"۔ (ص ۱۰۰)

" فریزر صاحب کے مارے جانے کے بعد مولوی [شیخ احمد علی] صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اب میں نے دنیا میں یتیمی کا مزا چکھا ہے ۔ مسٹر فریزر کے قتل کے واقعے کے متعلق اہل دہلی کی عام رائے جیسا کہ عام طور سے ایسے معاملات میں ہوا کرتا ہے ، بے حد مختلف تھی ۔ فریزر صاحب کے وابستہ اور متوسلین اور سرکاری ملازم جس طرح ممکن ہو ملزمین کی سزا یابی کے درپے تھے ۔ ان کے ساتھ ایک دوسری جماعت بھی تھی ، جو نواب شمس الدین خاں صاحب والیٔ فیروز پور سے مختلف وجوہ سے ناخوش اور ناراض تھی اور اسی جماعت میں مرزا غالب بھی تھے ۔ ہم نے ایسے لوگوں کی زبانی جو اس تفتیش و تحقیقات میں شریک تھے ، سنا ہے کہ اس واقعے کے متعلق سب سے پہلے حکام کے سامنے نواب شمس الدین صاحب کا نام لینے والے مرزا صاحب مرحوم ہی تھے ۔ فریزر صاحب کے یہاں آنے جانے والے اور ان کے مداحوں میں شمار ہوتے تھے۔ ..."

(ص ۱۰۷ - ۱۰۶)

[۵]

" ارواح ثلثہ " کے مرتب ظہورالحسن کسولوی ہیں اور یہ کتاب تیسری مرتبہ ۱۳۷۰ھ میں سہارنپور سے شائع ہوئی تھی ۔ یہ کتاب دراصل مجموعہ ہے مندرجہ ذیل تین رسائل کا :

۱- امیر الروایات ، ملفوظات حضرت امیر شاہ خان

۲- روایات الطیب ، افادات مولانا محمد طیب

۳- اشرف التنبیہ ، ملفوظات مولانا اشرف علی

ان رسالوں میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اہل خاندان اور دیگر

صوفیا و مشائخ کے واقعات ہیں - مندرجہ ذیل واقعات میں غالب کا بھ
ذکر ہے -

حافظ عبدالرحمان اور غالب :

خاں صاحب [حضرت امیر شاہ خان] نے فرمایا کہ حافظ عبدالرحما صاحب دہلوی کے بڑے بھائی بالکل غیر مقلد تھے ، مگر مولانا نانوتوی کی خدمت میں بہت حاضر باش تھے - حافظ عبدالرحمان بھی کسی قدر غیر مقلدی کی طرف مائل اور مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور حافظ عبدالرحمان مولوی فیض الحسن صاحب اور مولوی حسین خان صاحب خورجوی کے شاگرد اور بہت سمجھ دار اور اردو شاعری کے بڑے استاد تھے - مگر خدا کی شان کہ نہ ان کا فارسی کا دیوان مرتب ہوا اور نہ اردو کا دو شعر ان کے مجھے یاد ہیں - صرف ان کی قابلیت دکھلانے کے لیے ان کے شعر لکھواتا ہوں - غالب اور شہیدی کے جانی دشمن تھے ، اس لیے ان کے کلاموں کو پلٹ دیا کرتے تھے - چنانچہ غالب کہتا ہے :

ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس کو حافظ صاحب نے یوں پلٹا ہے :

بچھ گیا میں جو گھر میں وہ (یاتم) آئے
زہے قسمت کہ بوریا نہ ہوا

شہیدی کے قصیدے کا شعر ہے :

ہوا تجھ سا نہ ہوسکتا ہے میرا ہے یہی ایماں
نہ مانو مسئلہ ہرگز کسی زندیق و مرتد کا

حافظ صاحب نے اسے یوں پلٹا ہے :

ترا ثانی بامکان وقوعی ہو نہیں سکتا
نفی امکان مطلق کی مگر ہے قول مرتد کا

غرض اسی طرح اس کے پورے قصیدے کو رد کیا ہے -
(ص ۱۰۴ - ۱۰۵)

غالب ایک مذہبی صحبت میں :

خان صاحب [حضرت امیر شاہ خان] نے فرمایا کہ میں اپنے بچپن کے زمانے میں نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر اپنے پھوپھا کے ساتھ موجود تھا اور وہاں مفتی صدرالدین خاں اور مرزا غالب بھی موجود تھے - مفتی صدر الدین خاں صاحب نے مولوی محمد عمر صاحب ابن جناب مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رح کا ایک قصہ بیان فرمایا کہ یہ مشہور تھا کہ مولوی محمد عمر صاحب کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیارت ہوتی ہے - اس پر میں اور امام صاحب جامع مسجد اور دوسرے اشخاص نے اصرار کیا کہ ہم کو بھی زیارت کرادیجیے - مگر مولوی محمد عمر صاحب نے منظور نہ کیا لیکن ہم نے اپنا اصرار برابر جاری رکھا - ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع مسجد کے منبر پر تشریف فرما ہیں اور مولوی محمد عمر صاحب آپ کو مورچھل جھل رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ صدرالدین آؤ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرلو - اور بعینہ یہی خواب امام صاحب نے دیکھا اور بعینہ اسی طرح ان دوسرے اشخاص نے دیکھا - جب صبح ہوئی تو میں امام صاحب کی طرف چلا تا کہ آن سے یہ خواب بیان کروں اور وہ اپنا خواب بیان کرنے کے لیے میری طرف چلے ، اور وہ دوسرے اشخاص بھی ہماری طرف چلے - اتفاق سے راستے میں ایک مقام پر ہم سب مل گئے اور میں نے کہا کہ میں تمہارے پاس جارہا تھا ، رات میں نے یہ خواب دیکھا ہے - انہوں نے کہا ہم تمہارے پاس آرہے تھے ، ہم نے بھی بعینہ یہی خواب دیکھا ہے ، اب ہم سب مل کر مولوی محمد عمر صاحب کے مکان پر آئے تو اس وقت مولوی صاحب اپنے مکان کے سامنے ٹہل رہے تھے - ہم نے ان سے یہ خواب بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ لوہیں میں ایسا نہیں ہوں - اور یہ کہتے ہوئے بھاگ گئے -

(ص ۱۰۲ - ۰۳)

خان صاحب نے فرمایا کہ اسی مجلس میں نواب مصطفیٰ خاں نے اپنا قصہ بیان کیا کہ ہم چند احباب جن میں مرزا غالب بھی تھے ، اپنے بالا خانے پر بیٹھے ہوئے تھے اور بلا مزامیر کے گانا ہورہا تھا - اتفاق سے مومن خاں کہیں سے مولوی محمد عمر صاحب کو پکڑ لائے - وہ یہ کہتے جاتے

بنادے اور وہ مجھے قتل کر کے رگ گردن کی طرح رشتۂ الفت کو نہ کاٹ دے۔

یہاں ایک خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عاشق کا معشوق کے ہاتھ سے قتل ہونا تو معراج محبت ہے۔ کما قال :

اور کیا چاہیے اے کشتۂ ارمان وصال

آستیں خون میں ڈوبی ہوئی جلاد کی ہے

ایسی صورت میں غالب سے نازک خیال شاعر کا دوست کے اس فعل کو دشمنی سے تعبیر کرنا کیسا ؟ اور پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ رگ گردن کے کٹنے سے رشتۂ الفت قطع کیوں ہونے لگا ؟ اس کو تو اور مضبوط ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غالب نے یہی اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ کہیں رگ گردن کے ساتھ رشتۂ الفت بھی نہ قطع ہو جائے۔ اور وہ میرے غرور دوستی سے خفا ہو کر مرنے کے بعد بھی مجھ کو یاد نہ کرے۔

اب میں شعر کی مفصل شرح کرتا ہوں۔ اس کو ملاحظہ کیجیے اور کوئی فرو گزاشت ہو تو اس سے مطلع فرمائیے۔

مصرع اول، اندیشہ ہے کہ الفت اس حد کمال کو نہ پہنچ جائے کہ عاشق اپنے آپ میں اور معشوق میں کوئی تمیز نہ کرسکے۔ زندگی و الفت ایک ہو جائے۔ اور رگ گردن و رشتۂ الفت میں کوئی فرق نہ رہے۔ اس صورت میں اگر دوست سے مفارقت ہوگی تو جان بھی خیرباد کہہ گی۔ اور رشتۂ الفت ٹوٹے گا تو رگ گردن کے ساتھ، یعنی جان لے کے۔

مصرع دوم میں اول یہ بات غور طلب ہے کہ غرور کیوں ہوتا ہے۔ انسان کے زعم میں جب اس کی کوئی صفت حد کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ مغرور ہو جاتا ہے۔ اور یہ غرور کمال اس کے زوال کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جس شے پر غرور کیا جاتا ہے وہ دیرپا نہیں ہوتی، بلکہ خدا اس نعمت کو اس سے سلب کرلیتا ہے، اسی لیے غرور قبیح ہے۔ غرور کے عوض انسان کو شکر کرنا چاہیے جو ازدیاد نعمت کا باعث ہو۔ اسی لیے شاعر نے غرور کو "آفت" کہا ہے۔

مصرع اول میں شاعر کا دعویٰ ہے کہ الفت کے حد کمال تک پہنچنے کا خطرہ ہے۔

دوسرے مصرعے میں نتیجہ بیان کرتا ہے کہ کمال کے بعد غرور ہوگا اور غرور کے بعد زوال ، خواہ محبت کا ہو یا جان کا ، دونوں متحد ہیں ۔ دوستی ایک صفت ہے لیکن اس کا ظہور بغیر دو کے نہیں ہوتا ۔ خواہ معشوق غرور کرے جو بعید از قیاس ہے ، خواہ عاشق جو قرین قیاس ہے ، اور شعرا کے مذاق کے موافق ۔ غرض جو غرور درے گا دوست اس کا دشمن ہو جائے گا ، اور اس کی جان جائے گی ، اس لیے کہ رشتۂ الفت اور رگ گردن ایک ہو چکے ہیں ۔

یہاں ایک اور بات قابل غور ہے کہ رگ گردن کٹنے سے رشتۂ الفت ٹوٹے گا یا اس کے برعکس ۔ بہتر یہ ہے کہ رشتۂ الفت کے قطع ہونے کو رگ گردن کے کٹنے یا جان کے جانے کا سبب قرار دیں ، اس لیے کہ موت لازمی ہے ۔ مرگ مقدر کی وجہ سے اگر رشتۂ الفت ٹوٹے تو اس میں الفت کا کمال نہیں معلوم ہوتا ۔

میں نے جو اوپر عرض کیا ہے کہ آپ کا مکان بہت دور اور میرا وقت نہایت قیمتی ہے ، اس سے آپ یہ نہ سمجھیے کہ حقیقتاً میں اپنے کم قیمت وقت کو گراں قدر سمجھتا ہوں ، بلکہ مقصود یہ ہے کہ میں کسی کالج کا اسسٹنٹ پروفیسر تو ہوں نہیں کہ تین روپے گاڑی کا کرایہ دے کے بھی اپنے عزیز وقت کو قیمتی نہ سمجھوں ۔ اس لیے آپ یہ سمجھیے کہ میرا وقت ناداری کے سبب سے گراں قیمت ہے ، گراں قدر نہیں ۔ یہ صرف اس خیال سے عرض کیا کہ :

غرور دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

[ترتیب : م ۔ خ]

اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

- یہ ڈکشنری جسے بابائے اردو نے اہل علم کی ایک جماعت کے تعاون سے ۱۹۳۶ء میں مرتب کیا تھا، ایک عرصے سے نایاب تھی۔ انجمن نے اسے نظرثانی اور اضافے کے بعد دوبارہ شائع کیا ہے۔
- $\frac{18 \times 22}{4}$ سائز کے تقریباً سولہ سو صفحات
- اعلی درجے کے بائبل پیپر پر آفسٹ کی طباعت
- مضبوط جلد مع خوب صورت سرورق
- یہ ڈکشنری محدود تعداد میں شائع کی گئی ہے اور دفتر انجمن سے براہ راست فروخت کی جا رہی ہے۔ قیمت فی جلد ساٹھ روپے۔
- پیشگی قیمت آنے پر محصول ڈاک انجمن ادا کرے گی۔

انجمن ترقی اردو
اردو روڈ کراچی

غـــالب
حیات و کلام پر ایک قدیم تحریر

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

مرزا غالب پر بیسویں صدی میں بہت کچھ کام ہوا ، اور ہو رہا ہے ۔ غالب کی اس عظمت و شہرت کا آغاز حالی کی یادگار غالب (طبع اول ۱۸۹۷ء) سے ہوتا ہے ۔ اس سے قبل غالب کی زندگی میں اور اُن کی وفات کے بعد تذکروں وغیرہ میں ان کے بارے میں جستہ جستہ تحریریں ملتی ہیں ۔ غالب کی وفات (فروری ۱۸۶۹ء) کے بعد بعض رسائل و اخبارات میں بھی وقتاً فوقتاً مضامین چھپتے رہے ۔ اسی سلسلے کا ایک مضمون ہفتہ وار '' اخبار انجمن پنجاب '' جلد ۸ ، نمبر ۲۳ (۸ جون ۱۸۷۷ء) میں '' تذکرہ حضرت غالب دہلوی '' کے عنوان سے چھپا ۔ مضمون نگار محمد علی شیر ، مدرس محمود کوٹ ، سابق مدرس لہٹہ سیالاں ضلع مظفر گڑھ ، تھے ۔ محمد علی شیر غالباً فارسی کے مدرس تھے ۔ اخبار انجمن پنجاب میں فارسی شعرا کے بارے میں گاہے گاہے ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے ۔ یہ اخبار ، انجمن پنجاب لاہور نے جاری کیا تھا ۔ اس میں اخبار عالم کے علاوہ ایک حصہ علمی مضامین کے لیے وقف ہوتا تھا ۔ زیر نظر مضمون اسی حصے میں شامل ہے ۔ غالب کی حیات اور کلام کے بارے میں ایک قدیم تحریر کی حیثیت سے (جو وفات غالب کے آٹھ سال بعد لکھی گئی) اس کی اہمیت واضح ہے ۔ لہٰذا یہ مضمون پیش خدمت ہے ۔

تذکرہ حضرت غالب دہلوی

اصل نام ان کا اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ ، غالب اور اسد تخلص ہیں ، اور شاہ دہلی کی طرف سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب

تھا ۔ ان کے والد ماجد کا نام عبداللہ بیگ خان تھا ۔ قوم کے اتراک ہیں ۔ ہندوستان میں کوئی ایسا پڑھا لکھا نہ ہو گا جو ان کو نہ جانتا ہو گا ۔ انھوں نے خود اپنی ایک فارسی کی کتاب میں اپنا حال لکھا ہے ۔ یعنی لکھتے ہیں کہ میرے خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ ترکستان سے ملتا ہے ۔ جب کہ افراسیاب کی سلطنت کا چراغ کیانیوں کے اقبال سے گل ہوا تو شاہی خاندان کے لوگ تباہ ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے گئے ۔ مگر جوہر کی تاثیر نے تلوار کو ہاتھ سے نہ چھوڑا ۔ سپاہ گری کی بدولت روٹی پیدا کرنے لگے ۔ کئی سو برس کے بعد پھر اقبال ادھر جھکا اور تلوار سے تاج نصیب ہوا ۔ سلجوقی خاندان کی بنیاد انھیں میں قائم ہو گئی ۔ مگر اقبال کا جھکنا بھی ہوا کا جھونکا ہے ۔ کئی پشتوں کے بعد پھر رخ پلٹا ، اور شہر سمرقند میں جس طرح اور شرفا تھے ، اس خاندان کے لوگ بھی رہنے لگے ۔ الغرض کہ قریب سوا سو برس کے گزرا کہ مرزا نوشہ کے دادا (۱) کسی بات پر اپنے باپ سے ناراض ہو کر ہند میں آئے اور اول لاہور میں معین الملک کے ملازم ہوئے ۔ بعدہ دربار دھلی میں داخل ہو کر اپنے خاندان اور لیاقت کے جوہر سے پرگنہ پہاسو کی حکومت پائی ۔ یہاں تک کہ ان کے باپ انھیں صغیر سن چھوڑ کر میدان میں مارے گئے ۔ اور مرزا نوشہ پانچ برس کے تھے کہ نصرت اللہ بیگ خاں (۲) ان کے چچا نے ان کو پرورش کیا جو کہ سونک سون (۳) پرگنہ کا حاکم تھا ۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی مر گیا ۔ جاگیر ضبط ہو گئی ۔ اگرچہ بزرگوں نے اکبر آباد میں لاکھوں کی جائداد چھوڑی مگر گردش آسمانی سے کچھ چارہ نہیں ۔ آخر کو یہ نوبت ہوئی کہ گویا میراث میں فقط ساٹھ روپیہ مہینہ پایا کہ ہزارہا طرح کی محنت و مشقت کے بعد سرکار سے پنشن میں ہاتھ آیا ۔ مرزا ایک امیرزادہ اور وہ سلطنت کا زمانہ ، اس لیے تحصیل ان کی علم پیشہ لوگوں کی نہ تھی ۔ لڑکپن مرزا کا اکبر آباد میں گزرا ، مگر طبیعت ان کی پیری میں بھی نوجوانوں سے زیادہ جوان تھی ۔ چناں چہ اپنے

۱- میرزا قوقان بیگ خاں

۲- میرزا نصر اللہ بیگ خاں

۳- سونک اور سونسا (دو پرگنے ، جو میرزا نصر اللہ بیگ نے ھلکر سے چھینے تھے)

خاندان کے شمشیر پیشہ ہونے کو عجب حسرت اور لطف سے بیان کرتے ہیں کہ ہر سننے والے کو مزا آتا ہے۔

غرض اس نوجوان امیرزادے نے جو لکھا پڑھا تھا ، نوکری کے ارادے سے نہ پڑھا تھا ، اپنے دلی شوق سے پڑھا تھا ۔ فارسی میں ایک آتش پرست کے شاگرد تھے (۱) اور اردو میں میر کے معتقد تھے ۔ چونکہ طبیعت نہایت موزوں اور مناسب تھی ، فارسی پر متوجہ ہوئے ۔ اور حق یہ ہے کہ اپنی طرز کو کمال مرتبہ پر پہنچایا ۔ خیالات ان کے نہایت بلیغ اور بلند اور باریک اور دقیق پائے جاتے ہیں ۔ اکثر زلالی ، جلال اسیر ، نظیری ، طالب آملی ، شفائی وغیرہ سے پہلو مارتے ہیں ۔ زبان اردو تو خود اس ملک کی زبان ہے ، اس کا کیا بیان ہو ۔ باوجودیکہ فارسی کا رواج کم تھا مگر یہ صاحب ایسے ہر حال میں سنبھالے گئے اور سرکار نے بھی اس کے نفس کمال اور خاندان کے لحاظ سے ہمیشہ اس کی عزت کی کہ پنشن کے ساتھ دربار کی کرسی اور خلعت مرتے دم تک قائم رکھا ۔ اکثر نواب اور راجہ ہندوستان کے ان کی قدردانی کرتے تھے ۔ تصانیف ان کی بہت ہیں ۔ مگر مشہور یہ سات کتابیں ہیں ۔ یعنی :

۱۔ دیوان فارسی ۲۔ مہر نیمروز ، تاریخ خاندان تیموریہ ۳۔ تاریخ دستنبو ، جس میں بیان غدر کا ہے ۴۔ انشاء پنج آہنگ ۵۔ قاطع برہان ۶۔ دیوان ریختہ ۷۔ اردوئے معلیٰ

غرض کہ اس شوخ طبع رنگین مزاج کی کوئی بات لطیفے سے خالی نہ تھی ، بلکہ وہ باتیں اہل ذوق کے لیے گفتگو میں نمک تقریر ہیں ۔ القصہ اس شیر نیستان سخنوری اور بلبل گلستان پارسی و دری یعنی میرزا نوشہ نے جو کہ ۱۲۱۲ ہجری خاص شہر دہلی میں تولد ہوئے (۲) ، ۱۲۸۵ ہجری میں اس جہان فانی سے طرف عالم جاودانی نقل مکان کیا ۔ مصرع : ہمیشہ

۱۔ عبد الصمد ، ایک نو مسلم پارسی ، مسلمان ہونے سے پہلے اس کا نام ہرمزد تھا ۔ مولانا حالی (بحوالہ یادگار غالب) کے بیان کی روشنی میں عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے ۔

۲۔ مرزا غالب اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے تھے ۔

رہے نام اللہ کا۔ اور عمر شریف ۷۳ سال کی تھی۔ اس حالت میں بھی سوائے سماعت کے اور حواس میں فرق نہ آیا تھا۔ جو کچھ کسی کو کہنا ہوتا لکھ کر دیتا تھا۔ دیکھ کر اس کا جواب مل جاتا تھا۔ کسی استاد نے تاریخ وفات یوں لکھی ہے:

جو غالب سا استاد مر جائے ہائے
الٰہی کوئی صبر کیوں کر کرے
دل قدر غم سے دو پارہ ہوا
کہا دل لگا کر جو غالب مرے
۱۲۸۵

دیگر:

از جہاں رفت حضرت غالب   زہرہ شد آب زیں غم جاں کاہ
راقم خستہ زد رقم سالش   مرد ہیہات میرزا نوشاہ
۱۲۸۵

دیگر، از مولوی محمد حسین صاحب آزاد، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور:

از پئے سال رحلتش آزاد   ہاتف غیب گفت و زد نعرہ
شدہ مغفور از خدائے غفور   کہ بود سال فوت او غفرہ
۱۲۸۵

دیگر، از طبع ایں ناقص فہم یعنی راقم تذکرہ:

چو رفت از جہاں غالب دہلوی
دل اہل دہلی شدہ خورد خورد
ندا سال فوتش ز رضواں بجست
ندا آمد این آہ غالب بمرد
۱۲۸۵

مطبوعات انجمن ترقی اردو

لغـــات

استینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری (بابائے اردو) قیمت : ۶۰ روپے

اسٹوڈنٹس انگریزی اردو ڈکشنری (بابائے اردو) قیمت : ۲۱ روپے

کتب حوالـــہ

قاموس الکتب (بابائے اردو) قیمت : ۴۰ روپے

مخطوطات انجمن ترقی اردو (اردو) (افسر امروہوی)

جلد اول : قیمت : ۱۰ روپے

جلد دوم : قیمت : ۷ روپے

مخطوطات انجمن ترقیٔ اردو (فارسی - عربی) (سید سرفراز علی رضوی)

قیمت : ۳ روپے ۵۰ پیسے

تقویم سنہ ھجری و عیسوی قیمت : ۱ روپیہ ۵۰ پیسے

تنقیـــد و تحقیق

نصرتی ، ملک الشعرائے بیجا پور (بابائے اردو) قیمت : ۵ روپے

مرحوم دھلی کالج (بابائے اردو) قیمت : ۴ روپے

سید احمد خاں ، حالات و افکار (بابائے اردو) قیمت : ۴ روپے

مقالات گارساں دتاسی (جلد اول) قیمت : ۱۰ روپے

سودا (شیخ چاند مرحوم) قیمت : ۷ روپے

اردو تھیٹر (ڈاکٹر عبدالعلیم نامی) پہلی جلد قیمت : ۷ روپے

دوسری جلد قیمت : ۷ رو۔

تیسری جلد قیمت : ۷ رو۔

محمد حسین آزاد (ڈاکٹر اسلم فرخی) جلد اول قیمت : ۸ رو۔

جلد دوم قیمت : ۱۰ رو۔

سرشار کی ناول نگاری (ڈاکٹر لطیف حسین ادیب)

قیمت : ۶ روپے ۵۰ پیسے

جلال لکھنوی (ڈاکٹر محمد حسن) قیمت : ۳ رو۔

کاروان صحافت (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید) قیمت : ۴ رو۔

سعادت یار خاں رنگین (ڈاکٹر صابر علی خاں) قیمت : ۵ روپے ۷۵ پیسے

تلخیص الاردو (سید ہاشمی فرید آبادی) قیمت : ۵ روپے ۵۰ پیسے

ہفت مقالہ (فارسی زبان و ادب سے متعلق

سہ ماہی "اردو" کے مضامین کا انتخاب)

(پیر حسام الدین راشدی) قیمت : ۸ روپے

غالبیات

غالب نام آور (سہ ماہی "اردو" میں

غالب سے متعلق شائع شدہ مضامین کا انتخاب) قیمت : ۱۵ روپے

فلسفۂ کلام غالب (ڈاکٹر شوکت سبزواری) قیمت : ۱۲ روپے

غالب ، فکروفن (ڈاکٹر شوکت سبزواری) قیمت : ۵ روپے

غالب ، ایک مطالعہ (پروفیسر ممتاز حسین) قیمت : ۷ روپے

ہنگامۂ دل آشوب (مرتبہ : سید قدرت نقوی) قیمت : ۷ روپے

مہر نیم روز (ترجمہ : پروفیسر سید عبدالرشید فاضل) قیمت : ۱۲ روپے

سہ ماہی "اردو" غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء قیمت ۸ روپے

ماہنامہ "قومی زبان" شمارہ فروری ۱۹۶۹ء قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے

قدیم اردو

قدیم آردو (بابائے اردو) قیمت : ۵ روپے ۵۰ پیسے

سب رس (ملا وجہی - مرتبہ بابائے اردو) قیمت : ۶ روپے

مثنوی من لگن (قاضی محمود بحری - مرتبہ سخاوت میرزا)
قیمت : ۳ روپے ۵۰ پیسے

مثنوی گلشن عشق (ملا نصرتی - مرتبہ بابائے اردو)
قیمت : ۴ روپے ۵۰ پیسے

مثنوی قطب و مشتری (ملا وجہی - مرتبہ بابائے اردو)
قیمت : ۳ روپے ۷۵ پیسے

ادبیات

خیالات عزیز (مولوی عزیز مرزا کے مضامین کا مجموعہ)
قیمت : ۴ روپے ۵۰ پیسے

مقالات حالی (حصہ اول) (مولانا الطاف حسین حالی) قیمت : ۳ روپے

مضامین سلیم (مولوی وحید الدین سلیم)

جلد اول (ادبی مضامین) قیمت : ۴ روپے ۵۰ پیسے

جلد دوم (تاریخی و سوانحی مضامین) قیمت : ۴ روپے

جلد سوم (انشائیے) قیمت : ۴ روپے

نصاب اردو (نظم) قیمت : ۲ روپے

نصاب اردو (نثر) قیمت : ۳ روپے

آرٹ اِن اردو پوئیٹری (شہاب الدین رحمت اللہ)
قیمت : ۶ روپے ۷۵ پیسے

تذکرے

گلشن ہمیشہ بہار (نصر اللہ خان خویشگی - مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی)
قیمت : ۸ روپے

فیضی کا مذہب

ڈاکٹر اے ، ڈی ، ارشد *

شہنشاہ اکبر کے دربار کا ملک الشعرا فیضی اپنے عہد کی مشہور ہستی تھا ۔ وہ اکبر کے وزیر ابوالفضل کا بڑا بھائی اور شیخ مبارک کا فرزند تھا ۔ اکبری عہد میں مذہب کے نام سے مختلف تحریکیں وجود میں آئیں ۔ خود اکبر نے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ایسی روش اختیار کی کہ مذہب اسلام میں انتشار پیدا ہوگیا ۔ اس انتشار سے وابستگان دربار بھی متاثر ہوئے ۔ بنابریں یہ بتانا کہ فیضی کن مذہبی عقاید کا پیرو تھا ، مشکل کام ہے ۔ فیضی کے مذہب کا معاملہ خاصا الجھا ہوا ہے ۔ بلکہ دشوار فہم ہے ۔ بات یہ ہے کہ فیضی نے اپنی زندگی میں جو جو کام سر انجام دیے اور جو جو خیالات اس سے ظاہر ہوتے رہے ، وہ باہم دگر متضاد ہیں ۔ ان کی بنا پرکوئی پختہ رائے قائم کرنا مشکل ہے ۔ سرسری طور پر مطالعہ کرنے والوں کو فیضی کے کردار ، عقاید ، اور نظریات زندگی میں ہر آن تبدیلی ہوتی نظر آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مذہبی عقاید کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں ہیں ۔

فیضی پر الزامات :

اس معاملے میں جس شخص کی رائے زیادہ وقیع اور ٹھوس مانی جاسکتی ہے وہ فیضی کا معاصر ، ہم سبق اور اکبری دربار کا مورخ ملا عبدالقادر بدایونی ہے ۔ فیضی کے مذہبی عقاید کے متعلق اس کی رائے اگرچہ شدید ہے ، مگر قطعی ہے ۔ وہ اسے سرے سے مذہب اسلام سے خارج قرار دیتا ہے ۔ اسے ملحد ، بے دین اور

* پروفیسر اسلامیہ کالج ، ریلوے روڈ ، لاہور ۔

دھریہ گردانتا ھے ۔ اس پر الزام لگاتا ھے کہ وہ بزرگان دین کی اہانت کرتا تھا ۔ اور یہ کہ اس نے اکبر بادشاہ کو دین اسلام سے منحرف کردیا :

" در وادیٔ عناد و عداوت با اهل اسلام و طعن در اصل اصول دین و اهانت مذهب و مذمت صحابۂ کرام و تابعین و سلف و خلف متقدمین و متاخرین و مشائخ و اموات و احیا و بے ادبی و بے تحاشی نسبت بهمه علما و صلحا و فضلا و سراً و جهراً، لیلاً و نهاراً ۔ همه یهود و نصاریٰ و هنود و مجوس برو هزار شرف داشتند "۔ (منتخب التواریخ ۔ جلد سوم ۔ صفحه ۳۰۰-۲۹۹)

فیضی کی وفات کے متعلق جو تاریخیں بدایونی نے نقل کی ھیں، ان سے بھی فیضی کے مذھبی عقاید کی نسبت زمانے کے لوگوں کی آرا معلوم ھوتی ھیں ۔ مثلاً یہ کہ فیضی ملحد تھا ، وہ بے دین تھا ، فلسفی تھا ، نیچری تھا ، وہ ھر مذھب کی رو سے دوزخی تھا ، وہ نبی صلعم کا دشمن تھا ، وہ کتا تھا ، وہ ھمیشہ دوزخ میں رھے گا ، وغیرہ ۔

فیضی کی بعض تاریخ ھائے وفات یہ ھیں :

بود فیضی ملحدے ۔ قاعدۂ الحاد شکست ۔ وے فلسفی و شیعی و طبیعی و دهری ۔

فیضیٔ بیدین چو مرد سال وفاتش فصیح
گفت سگے از جهان رفته بحال قبیح

سال تاریخ فیضیٔ مردار　　شد مقرش بچار مذهب نار

فیضیٔ نحس دشمن نبوی　　رفت و با خویش داغ لعنت برد
سگکی بود و دوزخی زان شد　　سال فوتش چه ، سگ پرستی مرد

(بحوالۂ منتخب التواریخ ، ج ۳ ، ص ۳۰۱ - ۳۰۰)

مورخ عہد اسی پر اکتفا نہیں کرتا ، بلکہ فیضی کے بے دین اور دشمن اسلام ہونے کی مزید دلیل دیتا ھے کہ اسے دنیا میں بھی سزا مل گئی تھی ۔ علامت یہ تھی کہ مرتے وقت فیضی کتے کی طرح بھونکا ، اس کا منہ سوج گیا ، اس کے ھونٹ سیاہ ھو گئے ۔ یہ مذمت دین اور طعن حضرت خاتم المرسلین صلعم کے سلسلے میں تھوڑی سی سزا تھی !

" وقتیکہ حضرت پادشاہ بعیادت او در دم اخیر رفتند ، بانگ سگ بروی ایشان کرد ...... و روی او و رم کردہ و لبہما تمام سیاہ شدہ بود ...... ہر آینہ در جنب آن بدبختی و مذمت دین و طعن حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ اجمعین اینہا ہنوز کم بود " ۔   (منتخب التواریخ ۔ ج ۳ ۔ ص ۳۰۰)

معاصر مورخ اور شعرا کی آرا کے بعد دربار کے ذی اقتدار علما کا وہ سلوک بھی قابل غور ہے جو انہوں نے فیضی اور اس کے باپ سے روا رکھا ۔ فیضی اور شیخ مبارک کو شیخ عبدالنبی صدر الصدور نے اپنے دربار سے ہتک کے ساتھ اس واسطے نکلوا دیا تھا کہ وہ ان کے مذہبی عقاید کو باطل خیال کرتا تھا ۔ علیٰ ہذا فیضی کو جب اکبر نے پہلی بار اپنے دربار میں طلبی کا فرمان بھیجا تو علمائے دربار نے دشمنی کی بنا پر اس کی تحقیر کی اور اسے پرسان کیا ۔ پھر علمائے دربار نے شیخ مبارک پر شرعی حد صادر کر کے اسے واجب القتل قرار دیا ۔ اس فتوے کے نفاذ سے بچنے کے لیے شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں کو مدت تک روپوش رہنا پڑا ۔ شیخ مبارک کو مذہبی بد اعتقادی میں ماخوذ کیا گیا تھا اور اس پر مہدویت کا پیرو ہونے کی تہمت لگائی گئی تھی ۔

ان باتوں کے علاوہ فیضی کا اپنا طرز عمل بھی انہی نتائج کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ اکبر نے ایک نیا مسلک 'دین الہی' جاری کیا ۔ جس میں شامل ہونے والوں کے لیے بہت سی بدعتوں کا قبول کرنا لازمی تھا ۔ فیضی "دین الہی" کا صرف رکن ہی نہ بنا بلکہ اپنی شاعری کے ذریعے عملاً اس دین کی تبلیغ کرتا رہا ۔ فیضی کے کلام میں بے شمار اشعار موجود ہیں جن میں بادشاہ کی آفتاب پرستی اور دیگر عقاید کی ترجمانی کی گئی ہے ۔ مذہبی اعتبار سے فیضی کی اس روش کو ناپسند کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے فیضی کے ساتھ مراسلت بند کردی ، حالانکہ ان کے آپس میں گہرے دوستانہ تعلقات تھے ۔ محدث صاحب نے سخت برہمی کا اظہار فرمایا ، اور اپنی تالیف میں لکھا :

"فیضی اگرچہ در فصاحت و بلاغت و متانت و رصانت سخن ممتاز روزگار بود ولیکن حیف کہ بہ جہت وقوع و ہبوط در ہاویۂ کفر و ضلالت رقم انکارد و ادبار بر ناصیۂ احوال خود کشیدہ ۔ زبان اہل دین و ملت جناب نبوت را از بردن نام وے و

نام جماعت شوم وے پاک است ۔ تاب اللہ علیہم ان کانوا مؤمنین " ۔

فیضی پر ماحول کا اثر :

فیضی جس گھرانے میں پیدا ہوا اسے دین اسلام سے شغف تھا ۔ فیضی کے اسلاف سبھی دیندار بزرگ تھے ۔ دادا شیخ خضر ناگور میں امام مسجد تھا ۔ والد شیخ مبارک اپنے وقت کا متبحر عالم تھا ۔ جس نے قرآن مجید کی ایک مبسوط تفسیر "منبع العیون" چار جلدوں میں لکھی اور جس نے اسلامی علوم کی درس و تدریس کا شغل اختیار کر رکھا تھا ۔ فیضی کے خیالات ابتدا ھی سے باپ کے زیر سایہ پروان چڑھے اور انھی سے تعلیم پائی ۔ ظاھر ھے کہ فیضی نے خالص اسلامی ماحول میں آنکھ کھولی اور دین اسلام ھی کو اس نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ۔ شیخ مبارک کو اپنی زندگی میں کچھ واقعات ایسے پیش آئے جس سے اس نے ایک خاموش عالم کی زندگی سے ہٹ کر غیر معمولی کردار ادا کیا ۔ ان میں ایک علمائے دربار کا حسد تھا ۔ جس کی وجہ سے شیخ مبارک کو بے حد تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر اس کے دل میں انتقامی کارروائی کا جذبہ پیدا ہو گیا ۔ دوسرے بادشاہ وقت کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خاص خدمات کا شوق اس میں پیدا ھوا ۔ اور تیسرے شیخ مبارک کی اپنی افتاد طبع کہ وہ ہر مذہب اور ہر فرقے کا مطالعہ کرتا رہتا تھا اور جس میں کوئی خوبی پاتا تنہا اس کی حمایت کرتا تھا ۔ اس سے اس کے مذہبی رجحانات تبدیل ہوتے نظر آئے ۔ چنانچہ معاصر تذکرہ نگار شاھنواز خاں اس امر کی شہادت دیتے ھیں کہ شیخ مبارک پہلے مہدوی عقاید کا گرویدہ ہوا ۔ پھر نقشبندی خیالات کا پیرو ھوا ۔ پھر ھمدانی بنا ۔ پھر شیعہ اور بعدہ ، اکبر کے دین الہیٰ کا پیروکار ۔

> " او ضاع مختلفہ بسیار بدو نسبت دادہ اند ۔ در عہد سلیم شاہ بہ ربط شیخ علائی مہدوی بمہدویت شہرت گرفت ۔ و از علمائے وقت چہ سرزنشہا کہ نیافت ۔ در عہد آغاز اکبری (کہ امرائے چغتا بیشتر در عرصہ بودند) بطریقۂ نقشبندیہ خود را وا نمودہ و پس ازان بسلسلۂ مشائخ ھمدانیہ منسوب میکرد ۔ چون آخرھا عراقیہ دربار را فروگرفتند ۔ برنگ ایشان سخن راند ۔ چنانچہ بہ تشیع اشتہار یافت " ۔
>
> (مآثرالامرا ۔ ج ۲ ۔ ص ۸۵ ۔ ۵۸۴)

یہ اطلاع شیخ مبارک کے ابن الوقت ہونے کے رجحان کی مظہر ھے ۔

اور چونکہ بیٹا باپ کی روش پر ہوتا ہے ، فیضی کی فطرت میں بھی یہ رجحان راہ پا گیا ۔ اس کے عقاید و خیالات بھی تقاضائے وقت کے مطابق بدلتے رہے اور وہ ''چلو تم آدھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کے اصول پر کار فرما رہا ۔ مگر ایک امر خاص طور پر قابل غور ہے اور وہ یہ کہ فیضی کی زندگی کے دو پہلو تھے۔ ایک نج کی زندگی جو بالعموم ہر شخص کی ہوا کرتی ہے اور جس میں شخص اپنی مرضی سے کام کرتا ہے ، اور یہ زندگی اس کے حقیقی کردار کی آیتہ دار ہوتی ہے ، دوسری درباری زندگی ۔ فیضی شاہی دربار سے وابستہ تھا اور اس لحاظ سے آسے دربار کی پالیسی کو اپنانا ضروری تھا اور اپنے ولی نعمت کی خوشنودی مزاج حاصل کرنا بھی لازمی تھا ۔ اس حیثیت میں وہ ایسے کام انجام دینے پر بھی مجبور ہوتا تھا جو اگرچہ اس کی طبع کے موافق نہ ہوتے مگر اپنی بقا اور عظمت قائم رکھنے کے لیے ان کے بغیر چارہ نہ تھا ۔

فیضی کی مذہبی زندگی میں جو بے راہ روی نظر آتی ہے وہ آس کی درباری زندگی کا نتیجہ ہے ۔ اس کی نجی یعنی پرائیویٹ زندگی مذہب کے معاملے میں بالکل مختلف رہی ۔ اس کی پرائیویٹ زندگی کے عناصر ہمیں آن مکاتبات سے ملتے ہیں جو اس نے اپنے دوستوں ، عزیزوں ، رشتہ داروں اور ملنے والوں کے نام لکھے اور وہ ایک مجموعے کی شکل میں ہم تک پہنچے ہیں ۔ دوسرے اس کی تصانیف ہیں جن کے مطالعے سے اس کے دل کا ماجرا کھلتا ہے ۔ پس ان کی مدد سے ہم یہ تحقیق کریں گے کہ فیضی پر جو الزامات دین کے بارے میں عائد کئے ہیں وہ کس حد تک درست یا نادرست ہیں اور یہ کہ فیضی واقعی ملحد ، بے دین ، دھریہ یا اسلام سے منحرف تھا ۔ ہم اس کی تحریروں اور کلام سے مواد تلاش کر کے موضوع زیر بحث کے لیے مفید شہادتیں بہم پہنچائیں گے ۔

اسلامی عقاید اور فیضی :

اسلام کیا ہے ؟ قران مجید کی چوتھی سورۃ میں ارشاد ہوتا ہے :
'' اے ایمان والو ! تم اعتقاد رکھو اللہ کے ساتھ اور آس کے رسول کے ساتھ اور اس کتاب کے ساتھ جو آس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور آن کتابوں کے ساتھ جو پہلے نازل ہو چکی ہیں ، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا انکار کرے اور آس کے فرشتوں کا اور آس کی کتابوں کا اور آس کے رسولوں کا اور

روز قیامت کا تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دور جا پڑا " - پس مسلمان ھ کے لیے خدا پر ایمان ، رسول پر ایمان ، قرآن مجید پر ایمان ، فرشتوں پر ایم اور روز قیامت پر ایمان ضروری ہے - ہم ان چیزوں کو فیضی کے کلام تلاش کرتے ہیں -

اقرار توحید :

خدا کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ توحید کے قائل ہوں اور اللہ کی ذا میں کسی اور کو شریک نہ سمجھیں ، نیز اللہ کی صفات کو مانیں - فیضی خ کی معرفت نہایت ضروری خیال کرتا ہے - اس کی ایک رباعی ہے جس میں خ سے خطاب ہے کہ اے باری تعالیٰ ، ہم آسمان و زمین کی نسبت سبھی کہ جانتے ہوں ، یہاں تک کہ اٹھارہ ہزار جہانوں اور ان سے متعلق تمام اشیا علم بھی رکھتے ہوں ، تو بھی اگر تجھ سے واقفیت بہم نہ پہنچائیں تو ہمارا سم علم بیکار محض ہے -

آن نیست کہ ما ارض و سما نشناسیم		سر قدر و راز قضا نشناسیم
این هژده هزار عالم و آنچه دروست		نشناخته به اگر ترا نشناسیم

اس کلام سے فیضی کی توحید پرستی آشکارا ہے - وہ صرف خدا کی وحدانیت اور عظمت ہی کا اقرار نہیں کرتا ، بلکہ خدا کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور اس کی رضا پر راضی رہنے کو اپنا ایمان سمجھتا ہے - ہر چند کہ عہد اکبری ایسا زمانہ تھا جس میں ، کیا دربار کے اندر اور کیا باہر ، مذہب کی ہر بات کو عقل کی ترازو میں تولا جاتا تھا - اور ایمان و ایقان کی بجائے دلیل و برہان کارفرما تھی - مگر فیضی باوجودیکہ فلسفی بھی تھا ، عقل کی رہنمائی قبول کرنے کی بجائے خالق کی مرضی کا طالب ہے :

یا رب! ز کرم امید بے بیمم ده		علمے کہ رضائے تست تعلیمم ده
تاریکی عقل در کشاکش دارد!		از شمع رضا فروغ تسلیمم ده

رسالت پر ایمان:

زمانے کی مذہبی تحریکوں کے بالواسطہ اثرات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اکبری دور میں بہت سے لوگ اس گمرہی میں مبتلا ہوگئے کہ ایمان کی

تکمیل صرف توحید کا عقیدہ رکھنے سے ہوجاتی ہے۔ پیغمبر صلعم کی رسالت کا اقرار اور ان کی شریعت کی پیروی ایمان کا لازمی جزو نہیں۔ (بحوالۂ حیات عبدالحق محدث، از نظامی) لیکن فیضی پر ان خیالات کا مطلق اثر نہیں ہے۔ بلکہ ان کے علی الرغم وہ پیغمبر صلعم کے مقام اور رتبے کا پورا پورا احترام بجا لاتا ہے، اور آپ کی شان و عظمت کا معترف ہے، بلکہ وہ صحابہ کرام کی بھی پیروی پر نازاں ہے۔ ایک قصیدے میں کہتا ہے:

ما طائر قدسیم نوا را نشناسیم مرغ ملکوتیم ہوا را نشناسیم

درکشف حقایق سبق آموز ضمیریم ترتیب دلیل حکما را نشناسیم

بردانش ما انجم و افلاک بخندند گر صاحب لولاک لما را نشناسیم

صد شکر که ماپیرو اصحاب رسولیم در شرع دگر راہ تما را نشناسیم

وہ رسول صلعم کے معجزات پر بھی صدق دل سے ایمان رکھتا ہے۔ اس کی ایک رباعی ہے:

سلطان رسل ماہ عجم، شاہ عرب سنگ در او قبلہ گہ اہل طرب

از تابش قہراو کہ دشمن سوزانست گرسنگ شودموم عجب نیست عجب

دین الٰہی کے تعلق سے اکبر نے باقاعدہ نبوت کا دعوا تو نہیں کیا لیکن اس نے جو حیثیت اختیار کر لی تھی وہ نبوت سے کم نہ تھی۔ ان حالات میں نبوت اور سلطنت کے متعلق ایک عام بدگمانی اور غلط فہمی پیدا ہوجانا لازمی امر تھا۔ اس زمانے کے ایک شگفتہ مزاج شاعر ملا شیری نے جو پنجاب کا رہنے والا تھا اور دربار اکبری سے تعلق رکھتا تھا، اکبر کی اس بوالعجبی کا خوب خاکہ اڑایا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلے
کز خلایق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زین بیت بس کز طرفگی
نقل بزم منعم و ورد گدا خواہد شدن
شاہ ما امسال دعوائے نبوت کردہ است
گر خدا خواہد، پس از سالے خدا خواہد شدن

فیضی نے صرف رسول عربی صلعم ہی کو رسول برحق تسلیم کیا - اور ان کی شان مبارک میں ایک ایسی نعت لکھی جس کی ادبی خوبیوں کی کماحقہ تعریف ممکن نہیں - اس نعت میں فیضی کی عقیدت اور اخلاص کا بحر بیکراں امڈا لیتا ہے - (دیکھیے : مثنوی نل دمن از فیضی) نعت کا عنوان ہے :

" احصاے جواہر نعت سید المرسلین و احراز لولوے ثناے خاتم النبیین " - نعت کے ابتدائی چند اشعار ملاحظہ ہوں :

آں مرکز دور ہفت جدول　　گرداب پسین و موج اول
چابک قدم بساط افلاک　　والا گہر محیط لولاک
قدرش بزمانہ ماہ اکلیل　　نورش بفلک چراغ و قندیل

واقعۂ معراج رسول صلعم کے متعلق ملا عبدالقادر بدایونی نے جو بیان دیا ہے وہ تعجب زا ہے ، مگر اس کی نسبت فیضی کا ردعمل خیال افروز ہے - بدایونی لکھتے ہیں کہ دربار میں کھلم کھلا فقہی مسائل اور شعار اسلامی کا مذاق اڑایا جاتا تھا - معراج کو خلاف عقل ثابت کرنے کے لیے اکبر بیٹھے بیٹھے یکایک ایک ٹانگ پر کھڑا ہوگیا اور کہا - "این معنی را عقل چگونہ قبول کند کہ شخصے دریک لحظہ باگرانی جسم از خواب بآسمان رود " - اکبر کو تو واقعۂ معراج پر حیرت و استعجاب ہوتا ہے مگر فیضی نے اسے کمال عقیدت کے ساتھ قبول کیا - اس نے ۱۸۶ اشعار میں واقعۂ معراج کی صداقت و عظمت خلوص سے بیان کی ہے - وہ جسم و جاں دونوں کے ساتھ آسمانوں پر جانے کا قایل ہے - (دیکھیے : مثنوی نل دمن از فیضی) کچھ اشعار یہ ہیں :

سلطان سریر آسمانی
در خواب بہ قصر ام ہانی

جبریل امیں رسید پویاں
از ایزد پاک مژدہ گویاں

کامشب شب جوش بحر و کانست
معراج صعود جسم و جانست

آورد شگرف مرکبے تند
با پویۂ او تگ خرد کند

قرآن کریم :

قرآن پر بھی فیضی کا یقین محکم ہے ۔ اس نے قرآن مجید کی ایک لاجواب تفسیر ''سواطع الالہام'' لکھی ۔ نظامی صاحب ''حیات عبدالحق'' میں لکھتے ہیں کہ ''ان دنوں اگر قرآن و حدیث سے رجوع کیا جاتا تھا تو حیلہ بازی کے جواز کے لیے ، اور تفسیر لکھی جاتی تھی تو تاویلات کا ایک طوفان برپا کرنے کے لیے '' ۔ (بحوالہ صفحہ ۲۸۷) ۔ فیضی اس روش پر چلنے والوں پر شدید حرف زنی کرتا ہے ۔ اپنی تالیف مثنوی مرکز ادوار میں لکھتا ہے :

معنیٔ قرآن چو ادا مے کنی		این همه تاویل چرا مے کنی
حق ز تو با غیر مشابه شده		پیش تو محکم متشابه شده
فهم تو از قول نبی اجنبی		بے خبر از سر حدیث نبی
چوں سخن از شرح مجج می رود		فکر تو چوں حاشیه کج میرود
طعنه مزن این همه بر اختلاف		کز پئے تسہیل تو رفت اختلاف

روز قیامت :

فیضی روز قیامت اور سزا و جزا کا بھی قائل ہے ۔ اُسے احساس تھا کہ دین کے معاملے میں زمانے کی روش کے ساتھ جو بے راہ روی اس سے سر زد ہو رہی ہے ، قیامت کے روز اس کے لیے باز پرس ہوگی ۔ فیضی کو روز جزا پر ایمان ہے ، دیکھیے احتساب سے بچنے اور سایۂ رحمت میں جانے کے لیے کس خوبصورتی سے اپنی گنہگاری کا اعتراف کر کے بخشش کی درخواست کرتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ الاعمال بالنیات اصول بر حق ہے ۔

یا رب ! من اگر مست و گر هشیارم		گر خفتهٔ غفلتم و گر هوشیارم
هنگام جزا چو با تو افتد کارم		بر نیت من به بیں نه بر کردارم

ان حقایق سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فیضی ملحد ، بے دین ، یا دہریہ نہیں تھا بلکہ وہ مسلمان تھا اور ایمان کامل کی شرائط بجا لاتا تھا ۔

فیضی کا مذہبی رجحان :

اب ہمیں یہ بتانا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کا تعلق اسلام کے کس فرقے سے تھا ۔ اس غرض کے لیے ہمیں وہ واقعہ مد نظر

رکھنا چاہیے ، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ صدر اسلام نے اس ساتھ کہ فیضی اور اس کا باپ شیخ مبارک شیعہ مذہب سے تعلق رکھ انہیں بارگاہ سے نکلوادیا تھا ۔ ان دنوں میں دربار اکبری میں تور اقتدار حاصل تھا اور شیعہ حضرات معتوب تھے ۔ اسلامی عہد میں ص کی مسند پر ہمیشہ سنی علما ہی متمکن ہوتے چلے آئے تھے ۔

اس توہین خیز واقعے کے نتیجے کے طور پر فیضی یا اس کے باپ پوزیشن واضح کرنے کے لیے کوئی اقدام نہ کیا بلکہ وہ آیندہ سے انتقام لینے کی تجاویز سوچتے رہے ۔ اس واقعے کے علاوہ فیضی کی سے بھی آشکارا ہوتا ہے کہ وہ شیعہ عقاید کا پیرو اور فرقہ اثنا عش درہ اماموں کا عقیدت مند تھا ۔ اشعار ذیل اس نظریے کی تائید کرتے ہ

با مشعل خورشید اگر گرم بگردیم
بے نور علی راہ علا را نشناسیم
از کحل یقیں دیدہ ما گر بکشایند
بے خاک رہش کشف عطا را نشناسیم
بے نور بمیریم بظلمت کدہ کفر
گر آں دو چراغ شہدا را نشناسیم
باقر کہ دلش بارقہ عالم غیب است
بے برق تولاش ضیا را نشناسیم
صادق نفسانیم کہ بے طلعت صادق
در صبح دم صدق جلا را نشناسیم
کاظم کہ بود ناظم دیوان ولایت
بے دوستیش سر ولا را نشناسیم
ابلیس ز ما نسخہ تعلیم بگیرد
در عشق اگر راہ رضا را نشناسیم
گر دین تقی را و نقی را نگزینیم
ارباب تقی را و نقی را نشناسیم

از لفس هزیمت بخوریم ار بحقیقت
سر لشکر میدان غزا را نشناسیم
فیضی لشود خاتمهٔ ما بهدایت
گر ختم امامان هدیٰ را نشناسیم

بزرگان دین سے عقیدت :

اس کلام سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بدایونی نے جو یہ کہا کہ فیضی اهل اسلام سے عداوت ، دین کے اصولوں پر طعن ، صحابۂ کرام ، تابعین ، مشایخ وغیرہ کی مذمت اور اہانت کرتا تھا ، قطعاً غلط ہے ۔ اس کے برعکس فیضی کے دل میں بزرگان دین کی عزت و توقیر ہے ۔

صد شکر که ما پیرو اصحاب رسولیم
در شرح دگر راهنما را نشناسیم
در قافلهٔ دیں که شود بدرقهٔ ما
گر پیشرو صدق و صفا را نشناسیم
بر دانش ما انجم و افلاک بخندند
گر صاحب لولاک لما را نشناسیم
فردائے قیامت به پناه که گریزیم
گر آن شه خورشید لوا را نشناسیم

فیضی اکبر کے همراه دو دفعه پاک پٹن ضلع ساهی وال میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے مزار مقدس کی زیارت کے لیے آیا اور دونوں دفعه اپنی عقیدت کا نذرانه دو قطعات کی صورت میں پیش کیا ۔ ایک قطعه یه هے :

قطب ربانی فرید الدیں شکر گنج آنکه خلق
در مقام او به صد رنج سفر پے برده اند
قطع راه عشق آساں نیست کارباب نیاز
در حریم دل به صد خون جگر پے برده اند
در بیابان طلب دل را به خاک افگنده اند
تا نه پنداری که با شمع نظر پے برده اند

طوطیان دیدیم در پرواز گرد مرقدش
گوئی اینہا ہم بہ آن کنج شکر بے بردہ اند

* فیضی نے زمانہ دربار داری میں بہت سے علما و فضلا سے دوستی پیدا کرلی تھی ، اُن کے ساتھ خط وکتابت رہتی تھی - فیضی کے خطوط کا مجموعہ ''لطیفۂ فیاضی'' کے نام سے موسوم ہے - اس میں متعدد خطوط ایسے ہیں جن میں ذیل کے بزرگان دین سے اظہار عقیدت کیا گیا ہے - شیخ عبدالحق محدث دہلوی ، خواجہ معین‌الدین ، محمد الہاشمی مکی ، مولانا شیخ جمال ٹلوی ، مولانا عبداللطیف دکنی ، مولانا کمال الدین حسین شیرازی ، مولانا غوثی منڈوی ، شیخ حسن کابی وال وغیرہ - ان خطوط کی موجودگی بدایونی کے اس الزام کی مزید تکذیب کرتی ہے کہ فیضی بزرگان دین اور صالحین کی تضحیک کرتا تھا - (حوالے کے لیے دیکھیے : منتخب التواریخ - جلد سوم - صفحہ ۲۹۹)

فلسفے سے غیر اثر پذیری :

اکبری عہد میں علمائے ہند کی توجہ زیادہ تر فلسفے اور علم کلام کی جانب منعطف ہوگئی اور قرآن اور حدیث کو اس زمانے کے نصاب میں ثانوی حیثیت دی جاتی تھی - بدایونی نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ :

''فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندۂ آں مطعون و مردود و نجوم و حکمت و طب و حساب و شعر و تاریخ و افسانہ رائج و مفروض''۔

(منتخب‌التواریخ - ج ۲ - ص ۳۰۲)

فیضی ہر چند کہ فلسفہ اس کا محبوب علم ہے ، اس معاملے میں بھی الزام سے مبرا ہے - وہ نہ صرف ترتیب دلایل حکما ہی کا قایل نہیں بلکہ فلاسفہ کے جملہ گروہوں اور ان کے سربراہوں کو خدا کے حضور عاجز اور اس کی جستجو میں سرگردان دیکھتا ہے - حمد کے ایک قصیدے میں لکھتا ہے :

فرقۂ اشراقیاں در غمت آشفتہ سر
زمرۂ مشائیاں در رہت افگار پا
نیست دماغی تہی از سر سودای تو
مغز فلاطوں بسوخت زیں تف ماخولیا

فلسفے کا فیضی پر اتنا ہی اثر پڑا کہ وہ ہر بات حتیٰ کہ دین کی حقیقت کو بھی جستجو کے ذریعے معلوم کرنا چاہتا تھا ، تقلید سے وہ پناہ مانگتا ہے اور تحقیق کی زبردست خواہش کرتا ہے ، ایک رباعی میں دعا مانگتا ہے :

یا رب ! قدسی براہ توحیدم دہ شوق بہ ایہاں خانۂ تجریدم دہ
دل بستگی بسر تحقیقم بخش آزادگی ز قید تقلیدم دہ

فروغ فلسفہ کے اس دور میں (۹۸۷ھ میں) اکبر بادشاہ نے امام عادل بن کر جامع مسجد فتح پور سیکری میں بر سر منبر خطبہ دینا چاہا ، اس کے لیے فیضی نے اشعار ذیل مرتب کر کے دیے تھے ۔ ان میں تمام خیالات قدرت الہی کے اقرار میں ہیں ، اور اعتزال کا شائبہ تک نہیں :

خداوندے کہ مارا خسروی داد
دل دانا و بازوے قوی داد
بعدل و داد مارا رھنموں کرد
بجز عدل از خیال ما بروں کرد
بود وصفش ز حد فہم برتر
تعالیٰ شانہ ، اللہ اکبر

علمائے سو سے مخالفت :

فیضی علمائے سو کی بدعت آفرینیوں اور حب جاہ کے جذبات سے بخوبی واقف تھا ۔ اس کا دل ان لوگوں کی طرف سے زخمی بھی تھا ۔ علمائے دربار نے ہر طرح سے فیضی کو زک پہنچانے کی کوششیں کی تھیں ، چنانچہ فیضی کو جب کبھی موقع ملتا وہ علمائے سو کی بدعملی کے خلاف دل کی بھڑاس نکال لیتا ۔ اپنے ایک قصیدے میں علمائے متکبرین کی نسبت لکھتا ہے :

زباں کشیدہ بدارالقضاے عجب و ریا
شہود کذب ز دعوئِ گران ایمانی
اگر حقیقت اسلام در جہان اینست
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

وہ وقت کے فقہائے سو ہر کھلم کھلا چوٹ کر جاتا ہے ۔ مثنوی مرکز ادوار میں ایک حکایت نقل کرتا ہے کہ صحرا میں کسی عارف نے شیطان کو دیکھا کہ بے فکر بیٹھا ہے اور اپنے کار منصبی یعنی شیطنت پھیلانے سے فراغ پائے ہوئے ہے ۔ عارف نے سبب پوچھا تو شیطان نے بیان کیا کہ میں نے اپنا فرض اب علمائے وقت کے سپرد کر رکھا ہے ، جب تک وہ میرا کام انجام دے رہے ہیں مجھے تردد کی ضرورت نہیں ، موجودہ زمانے کا ایک فقیہ دونوں جہانوں کی گمراہی کے لیے کافی ہے :

رہزن دوراں بدل بد سگال　　طنز کناں داد جواب سوال
کز برکات علمائے زماں　　فارغم از کشمکش این و آں
داشت مرا باز ازیں جد و جہد　　حیلہ گری ہائے فقیہان عہد

حکیمانہ اسلام میں اعتقاد :

دین اسلام کے ارکان خمسہ (کلمۂ شہادت ، نماز ، روزہ ، زکات اور حج) مذہب اسلام کی عملی صورت ہیں ۔ ہمارے پاس یہ بات ثابت کرنے کے لیے مؤثر شواہد موجود نہیں ہیں کہ فیضی ارکان اسلام کی پابندی کرتا تھا یا نہیں ۔ مگر یہ کہنے کے لیے گنجایش ہے کہ چالیس برس کی عمر ہوجانے پر فیضی کے خیالات میں زیادہ پختگی اور گہرائی آجاتی ہے اور اس کا ذہن رسمی اسلام کی بجائے روح اسلام کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے ۔ فیضی پرانی وضع کے اسلام کی مقابلے میں حکیمانہ اسلام کا زیادہ قایل نظر آتا ہے ۔ وہ مذہب کے متعلق آزادانہ نقطۂ نظر کا حامل تھا ۔ اس کے کلام میں ایسے اشعار موجود ہیں جن سے احساس ہوتا ہے کہ وہ حج کا بھی قایل نہیں تھا ۔ بعض اشعار میں کعبے کے متعلق طنزیہ اظہار خیال کیا ہے ، مثلاً :

آنکہ می کرد مرا منع پرستیدن بت
در حرم رفتہ طواف در و دیوار چہ کرد

معلوم ہوتا ہے کہ فیضی بہشت و دوزخ کے مادی وجود کا بھی قایل نہیں تھا اور سمجھتا تھا کہ عارف کا بہشت و دوزخ فقط اس کی حالت بسط و قبض کا نام ہے ۔ ایک قطعہ ہے :

ایا محیط مواعظ کمال ملت و دیں
دریغ گوہر وعظ ترا مصارف نیست

به پیش من سخن از دوزخ و بهشت مگو
که گوش هوش حریفان برین زفارف نیست
خدائے را زمن احوال حشر و نشر مپرس
که ساده لوح محبت ابوالمعارف نیست
غلام صوفی صافی شوم که می گوید
بهشت و دوزخے جزبسط و قبض عارف نیست

تصوف سے وابستگی :

دین سے آزادہ روی شاید اس وجہ سے بھی تھی کہ فیضی نے تصوف کی طرف رجحان پیدا کرلیا تھا ، وہ رسوم دین کو اہمیت نہ دیتا تھا بلکہ تصوف کی راہ میں مجازی مبادیات کو ہیچ سمجھتا تھا ۔ وہ کعبے کو راستے کی ایک منزل قرار دیتا ہے :

کعبه و تعلیم آدابم مکن گرم رو را فرصت خرام نیست
کاروان کعبه شد منزل نشین رهروان عشق را آرام نیست

زاهدوں کی ریاکاری کے مقابلے میں صوفیوں کی پاکبازی اس کے نزدیک زیادہ قابل قدر ہے :

کو عشق که زنجیر در کعبه گدازیم
وز بهر پرستش صنمی چند بسازیم
از پرده در کعبه بریشم بستانیم
بر چنگ به بندیم و به مسجد بنوازیم
وین کعبه که حجاج برافراخته آن را
انداخته چون دیر اساسے بفرازیم
وز سنگ سیه مهره بسیازیم و بمحراب
با مغبچان شعبدهٔ چند بسازیم
بے کردن جمازه درین راه ثواب است
بر قافلهٔ کعبه روان مست بتازیم
بام در میخانه به از صد عرفات است
ما با همه سازیم و بسالوس نسازیم

اکبر کے دین الٰہی کی پیروی :

• سب سے بڑا واقعہ جس نے فیضی کی مذہبی زندگی پر بھاری اثر ڈالا ۹۸۹ھ میں اکبر کے جاری کردہ مبینہ دین الٰہی کی ترویج تھی - فیضی اس تحریک کا سرگرم رکن بنا - اس تحریک میں جو لوگ نمایاں حصہ لیتے تھے انھیں بادشاہ کی خاطر اپنی جان ، مال ، آبرو بلکہ مذہب تک کی قربانی دینے کا اقرار کرنا ہوتا تھا - اس مرحلے پر سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا فیضی نے اکبر کا مبینہ دین قبول کر کے دین اسلام سے انحراف کرلیا - دین الٰہی کو اول تو عام معنوں میں ایک دین قرار نہیں دیا جاسکتا ، بلکہ یہ تو ایک قسم کی صوفیانہ سی تحریک تھی، جس میں بہت سے مذاہب کے اصول منتخب کر کے جمع کردیے گئے تھے - اسے اکبر کا ایک سیاسی مشغلہ کہنا زیادہ مناسب ہے - اکبر سنجیدگی سے کوئی نیا دین رائج کرنا چاہتا تو یہ صورت نہ ہوتی کہ ملک بھر میں فقط گنتی کے آدمی اس دین میں شامل ہوتے - ہر چند کہ دین الٰہی کی تحریک میں شامل ہونے والے ہر فرد کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنے آبائی مذہب سے منحرف ہوجائے ، مگر جہاں تک فیضی جیسے عالم دین کا تعلق ہے اس تحریک سے وابستہ ہوکر شاعری کے ذریعے اکبر کے ایسے عقاید کی تبلیغ کرنا جو دین اسلام کے عقاید سے متضاد ہیں ، زیب نہیں دیتا- فیضی نے ان دنوں دین الٰہی کے زیر اثر ہوکر اکبر کی حمایت اور اس کے عقاید کی تائید میں خاصی تعداد میں اشعار لکھے - ان کے مطالب صریحاً دین اسلام کے منافی ہیں مثلاً :

خواہی کہ چو من راہ ہدیٰ بشناسی　　نشناختہ شاہ را ، کجا بشناسی
این سجدہٴ ناقبول سورت ندہد　　اکبر بشناس تا خدا بشناسی

چون شاہ فلک قدر بہنگام سحر　　از صدق کند بسوی خورشید نظر
رو مصحف توحید کشا وز اخلاص　　ہذا ربی بخوان و ہذا اکبر

ایسی ہی باتوں سے فیضی کو ملحد کہا گیا - نیز بادشاہ کو اسلام سے منحرف کرنے کا ذمہ‌دار ٹھیرایا گیا - معاصر تذکرہ نگار شیر خاں لودھی ''مراۃ الخیال'' میں لکھتے ہیں :

''(اکبر بادشاہ) در مدت قلیل تمامی ہندوستان را باکثرے از توابع بنگالہ و دکن بحوزۂ تسخیر در آورد و لیکن ابو الفضل و فیضی کہ دہریہ مقرری و سرحلقۂ اہل تزویر بودند در صحبت خاص راہ یافتہ و بتر صفات واہی خاطر بادشاہ را از جادۂ مستقیم انحراف دادند .... تا کار بجائے رسید کہ بادای بعضی از رسوم اہل ہند پرداخت و این دو بیت فیضی از قصیدۂ مدح پادشاہ برآں گواہ است :

قسمت نگر کہ در خور ہر جوہر عطاست آیینہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او می کند معائنۂ خود در آینہ این می کند مشاہدۂ حق در آفتاب

اس زمانے میں دربار اکبری میں دین اسلام کی جو بری حالت ہوئی وہ اکثر مورخوں نے بیان کی ہے ۔ اکبر کو خوش کرنے کے لیے علمائے سو نے طرح طرح کی بدعتوں سے اسلام کو روشناس کرایا ۔ بدایونی نے ان تمام بدعتوں کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے اور ان کے بانیوں کا نام بھی لیا ہے ۔ مگر لطف یہ ہے کہ اس نے کوئی بدعت فیضی سے منسوب نہیں کی ۔ ظاہر ہے کہ اگر فیضی نے اکبر کو کسی بدعت کی ترغیب دلائی ہوتی تو بدایونی فیضی کو کسی صورت معاف نہ کرتا ۔ سیاسی امور میں اکبر کی ذہانت مسلم ہے ۔ وہ اپنی مذہبی پالیسی کا بنانے والا خود تھا ۔ اس کے مزاج پر فیضی کا اس قدر قابو اور تصرف ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ اس کے عقاید بدل دے ، یقیناً فیضی کی اہمیت جتانے میں بھاری مبالغہ کرنا ہے ۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فیضی جیسا مصلحت کوش شخص اکبر کی دینی تحریک کی کان تک میں داخل ہو کر تک ہوا ، مگر اس نے اپنے بنیادی عقاید میں تبدیلی نہیں کی جیسا کہ اوپر کے بیانات سے واضح ہوتا ہے ۔

رد عمل :

بہرحال اس طوفان کے بعد فیضی کی طبیعت سنبھل گئی ۔ وہ فلسفے اور عقلیت پسندی کی زد میں تھا ۔ لیکن اس کی زندگی کے آخری چند سالوں کے دوران اس کے خیالات میں ایک غیر معمولی تغیر رونما ہوا ۔ اس نے جان لیا کہ عقل خواہ کتنے ہی عروج پہ کیوں نہ ہو جائے دین کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ اس کا خیال تھا کہ عقل کی مدد سے دنیا جہان کے سارے عقدے حل ہو جائیں گے لیکن اس کی یہ امید پوری نہ ہوئی اور متعدد اشعار میں اس نے عقل کی کوتاہیوں کی شکایت کی ہے ۔ ایک رباعی ہے :

چنداں کہ بعقل گیر و دار است مرا
صد گونہ گرہ بکار و بار است مرا
اے عقل برو کہ از تو کارم نشود !
وے بخت بیا کہ با تو کار است مرا

اس نے خدا سے التجا کی کہ اسے عقل کی تاریکی سے پیدا شدہ کش مکش سے نجات دے اور اپنی رضا کی راہ پر لگائے ۔

یا رب ز کرم امید بے بیمم دہ　　علمی کہ رضاے تست تعلیمم دہ
تاریکیٔ عقل در کشا کش دارد　　از شمع رضا فروغ تسلیمم دہ

وفات سے کچھ مدت قبل فیضی نے اپنی مثنوی ' مرکز ادوار ' مکمل کی جس میں مذہب اور فلسفے کا ایک عمدہ امتزاج پیش کیا۔ ۱۰۰۲ھ میں فیضی نے عوام کے ذہنوں پر اپنی دینداری کی مہر ثبت کردی جبکہ اس نے قرآن کی عربی زبان اور بے نقط حروف سے ایک تفسیر لکھی۔ اس تفسیر سے فیضی کی عالمانہ شان کا اظہار ہوتا ہے اور ایسی ہی تالیفات کی بنا پر علامہ شبلی نے فیضی کو "ملائے مسجدی" کے خطاب سے نوازا ہے۔

وفات سے قبل فیضی کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس نے دنیاوی مصلحتوں کے زیر اثر جو دینی بے راہ روی اختیار کی تھی اس پر اظہار تاسف کرتا ہے۔ وہ اللہ کے حضور میں اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے۔ اسے تسلی تھی کہ اس کی نیت بہرحال نیک تھی :

یا رب! من اگر مست و گر ہشیارم　　گر خفتہ' غفلتم و گر بیدارم
ہنگام جزا چو با تو افتد کارم　　بر نیت ہیں بہ بیں نہ بر کردارم

اردو کا پہلا ساقی نامہ اور اس کا مصنف

ڈاکٹر حسینی شاھد

شاہ معظم سلسلہ‌ٔ امینیہ کے گل سر سبد ھیں لیکن ان کے حالات اور خاندان کے بارے میں ھم تک کچھ بھی معلومات نہیں پہنچ سکی ھیں - یہاں تک کہ ان کے پورے نام سے بھی واقفیت نہ تھی - ان کی شرح شکار نامہ کا ایک نسخہ کتب خانہ‌ٔ آصفیہ میں محفوظ ہے جس سے معلوم ھوتا ہے کہ ان کا نام محمد حسینی تھا اور وہ خانوادہ‌ٔ قادریہ میں بھی بیعت تھے :

"اس شکار نامہ کی شرح فقیر حقیر محمد حسینی معظم قادری اپنے حوصلے موافق فرمائے ھیں - اس واسطے کے یو عاجز اس گھر چشت میں طالب ھوا ہے ھور امین الدین اعلیٰ خود کو سجدہ کیا ہے - ان کے تصدیق سوں یو فقیر اس راز کو پہونچا ہے" - (۱)

شاہ معظم کو بعض محققوں نے (۲) حضرت امین کا اور بعضوں نے (۳) حضرت قادر لنگا کا مرید بتایا ہے - ابو نصر خالدی صاحب نے قیاس آرائی کی ہے کہ "...... معظم کے مرشد بیعت تو امین الدین اعلیٰ ھی سے تھے اور مرشد تربیت ، جنھوں نے امین‌الدین کے حکم پر معظم کو مراتب سلوک قادر و مدارج معرفت اپنی نگرانی میں طے کرائے" - (۴)

۱- مخطوطہ نمبر (۱۱۷۴ جدید) کتب خانہ‌ٔ آصفیہ -

۲- دکنی ادب کی تاریخ ، ص ٦٠ ، علی گڑھ تاریخ ادب ، ص ۳۲۱

۳- اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ، ص ۱۹۲ - فہرست مخطوطات کتب خانہ‌ٔ نواب سالار جنگ ، ص ۱۱۹ -

۴- قدیم اردو ، جلد اول ، ص ۲۲۷

معظم حضرت قادر لنگا کے مرید تھے اور اپنے پیر سے دیوانہ وار عقیدت رکھتے تھے ۔ انھوں نے کم و بیش اپنی ہر مثنوی بلکہ ہر غزل کے مقطع میں اپنے پیر کا ذکر کیا ہے اور بڑے مان سے کیا ہے ۔ بعض غزلوں اور ریختیوں میں تو وہ والہانہ شیفتگی ، ربودگی اور سپردگی پائی جاتی ہے جو صرف مجاز کے لیے مخصوص ہے ۔ انھوں نے اپنی روحانی سرگزشت اپنی مثنوی "مفتاح الاسرار" میں بیان کی ہے جو غالباً ابو نصر خالدی صاحب اور دوسرے محققین کی نظر سے نہیں گزری ۔ اس مثنوی میں معظم نے بتایا ہے کہ حکم نبی کی متابعت میں وہ حضرت امین کے طالب ہوئے اور منازل سلوک طے کیے ہیں :

اب جا تو بیجاپور ہے پور وہاں شہ پور
وہاں امین علی ہے پیر ہے روشن دیکھ ضمیر
اب ہو تو جا کر طالب در عشق تجھے ہے غالب
میں کیتا امر قبول جیوں بولے نبی رسول

حضرت امین نے اوامر و نواہی سے واقف اور اسرار و رموز سے با خبر کرانے کے بعد معظم سے کہا کہ تیرا پیر قادر ہے تو اس کو اپنے دل میں بسا لے اور اس کا دامن پکڑ کر راہ سلوک اختیار کر :

ہے پیر تیرا تو قادر او حاضر ہے تو ناظر
اوس پیر کو ناہیں بسر تو اور اس کو دل میں دھر تو

معظم کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے پیر قادر لنگا ہیں اور انھوں نے اپنے دادا پیر یعنی حضرت امین سے بھی اکتساب فیض کیا ہے ۔

معظم نے حضرت امین ، بابا شاہ اور علی پیر کا ابتدائی زمانہ دیکھا ہے ۔ علی پیر ۱۱۱۹ھ میں سجادہ نشیں ہوئے ہیں ۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بارھویں صدی کے دوسرے دہے کے خاتمے تک بقید حیات تھے ۔

شاہ معظم کثیر التصانیف بزرگ ہیں ۔ ان کی تصانیف میں ضخیم دیوان کے علاوہ گفتار عقل و عشق ، سی حرفی ، معراج نامہ ، مفتاح الاسرار ، آزاد نامہ ، شجرۃ الاتقیا ، گلزار چشت ، سوال صادق و جواب معظم نظم میں اور شرح شکار نامہ نثر میں قابل ذکر ہیں ۔ ہم یہاں ان کے ساقی نامے کا ذکر کریں گے ۔

شاہ معظم کی اس مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہوتا ہے جو کتب خانہ انجمن ترقی اُردو ہند ، علی گڑھ (نمبر مخطوطہ ۲۰ تصوف) میں محفوظ ہے ، یہ نسخہ ۱۰ صفحات اور ۱۹۰ اشعار پر مشتمل ہے ۔ سرنامہ اور ترقیمہ نہیں ہے ۔ ساقی نامہ شاہ معظم کا ادبی کارنامہ ہے لیکن کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے اس کے اکثر الفاظ مسخ اور متعدد مصرعے بحر سے ساقط ہوگئے ہیں ۔ جب تک اس مثنوی کا کوئی دوسرا نسخہ برآمد نہ ہو صحیح متن کا مرتب کرنا بہت مشکل ہے ۔

مثنوی کی لوح پر دو نام جدید قلم سے لکھے ہوئے ہیں ۔ ساقی نامہ یا راگ مالا ۔ اگرچہ ساقی نامے میں ساقی اور مطرب سے خطاب اور مے و سرود کی تعریف ہوتی ہے ، اس کے باوجود کسی مثنوی کا نام ' ساقی نامہ یا راگ مالا ' ان مل اور بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے اور شاہ معظم جیسے باکمال اور صاحب ذوق شاعر سے اس بد ذوقی کی توقع نہیں کی جاسکتی ۔ یہ ستم ظریفی انجمن کے فہرست نگار کے قلم کی ہے ۔

زیر نظر مثنوی کے نصف اول میں ساقی نامے کے مضامین باندھے گئے ہیں اور نصف آخر میں نغمہ و سرود کی عظمت اور اس کے اثرات کا شاعرانہ انداز میں ذکر ہے ۔ نصف اول کی طرح نصف آخر کے مضامین بھی ساقی نامے ہی کے ہیں ۔ اس لیے نغمہ و سرود کے ذکر کے باوجود اس مثنوی کو ساقی نامہ ہی کہنا چاہیے ۔

راگ مالا اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں سنگیت کی اصل ، اس کی پیدائش ، راگوں ، ان کی راگنیوں ، پتر اور بھارجاؤں کی تفصیل ، ان کے موکاؤں ، رنگ ، پوشاک ، تاثیر اور ان کے گانے کے موسم اور وقت کا بیان ہوتا ہے ۔ سنسکرت ، ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں اس قسم کی بیسیوں نظمیں (۱) ملتی ہیں لیکن آردو میں صرف ایک ہی راگ مالا (۲) کا پتا چلا ہے جو بارھویں صدی کے رند مشرب ، صوفی منش اور سیلانی الطبع شاعر عبدالولی عزلت (۱۱۰۳ — ۱۱۹۸ھ) کی تصنیف اور ان کے کمال موسیقی

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : راگ راگنیاں ، از او ۔ سی ۔ گنگولی

۲۔ ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ (مثنویات ۹۱) اور دوسرا انڈیا آفس (۱۰۱) میں ہے ۔

کی سند ہے ۔ یہ مثنوی تقریباً بارہ سو ابیات پر مشتمل ہے جس میں چھ راگوں ، ان کی پانچ راگنیوں اور آٹھ پتروں کی تفصیل اور ان کی لفظی تصویریں (لکشن گیت) پیش کی گئی ہیں ۔ معظم کی مثنوی میں راگ مالا کے یہ مضامین اور موضوعات نہیں ملتے ۔ اس لیے وہ اصطلاحی مفہوم میں راگ مالا نہیں ہے ۔ البتہ راگ مالا کے اصطلاحی مفہوم میں اتنی وسعت اور لچک پیدا کی جائے کہ ساز و سرود کی عمومی توصیف اور ان کے کیف و سرور کے بیان کے لیے بھی اس میں جگہ نکل آئے تو پھر شاہ معظم کی یہ مثنوی ساقی نامہ بھی ہے اور راگ مالا بھی ۔ لیکن جب ساقی نامے کے موضوعات میں مے و ساقی کے ساتھ مطرب و نغمہ کے لیے بھی گنجائش موجود ہے تو راگ مالا کے دامن کو اتنا وسیع کرنا کیا ضروری ہے کہ اس کے تار و پود ہی بکھر جائیں ۔

شاہ معظم کی یہ مثنوی کئی اعتبارات سے بڑی اہم ہے ۔

پہلی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ اردو کا پہلا ساقی نامہ ہے ۔ ساقی نامہ فارسی کی دین ہے جو عموماً بحر متقارب مثمن مقصور (محذوف) اور مثنوی کی ہئیت میں لکھا جاتا ہے ۔ مے و مینا ، ساقی و شاهد ، نغمہ و مطرب اور کیف و مستی کے مضامین ساقی نامے کے بنیادی موضوعات ہیں لیکن کبھی کبھی ان مضامین کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی ، کمال کی ناقدری اور گردش روزگار کا ذکر بھی کیا جاتا ہے اور تصوف و حکمت کے نکات بھی بیان کیے جاتے ہیں ۔ دکنی ادبیات میں یہ مضامین ابتدا ہی سے ملتے ہیں لیکن اس مرتب اور مربوط شکل میں نہیں ملتے جس سے ساقی نامہ عبارت ہے ۔ شیخ چاند مرحوم نے محمد فقیہہ دردمند کے ساقی نامے کے مقدمے میں لکھا ہے (۱) :

> " درد مند کو اردو زبان کی تاریخ میں جو جگہ ملتی ہے وہ محض ان کی مثنوی ساقی نامے کی وجہ سے ۔ یہ ایک مثنوی ہے جس کا تعلق خمریات سے ہے ، یہ کوئی عشقیہ مثنوی نہیں ہے ۔ اس لیے

۱۔ شیخ چاند مرحوم نے مولوی عبدالحق کے کتب خانے کے تین نسخوں سے مقابلہ کر کے ساقی نامہ درد مند کا متن طویل تحقیقی مقدمے کے ساتھ رسالہ ' اردو ' بابت جولائی ۳۴ء میں شایع کیا تھا ۔ ساقی نامہ دردمند کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں اور ایک کتب خانۂ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ میں بھی محفوظ ہے ۔

اس میں کسی فسانے کی مسلسل و مربوط روبداد نہیں ۔ اس کے نام (ساقی نامہ) سے ظاہر ہے کہ رندی و مستی اور خمر و نشہ کے مضامین کی حامل ہے ، اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اردو زبان میں ان مضامین کو اس شکل میں مستقل طور سے پہلی دفعہ اس قادرالکلامی کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے "۔ (۱)

اس خیال کو وضاحت کے ساتھ آگے یوں لکھا ہے :

" فارسی میں ساقی نامے شاعروں نے کثرت سے لکھے ہیں لیکن اردو میں ان کا وجود نہ تھا ۔ دردمند سب سے پہلا شاعر ہے جس نے اس اہتمام اور کامیابی کے ساتھ یہ نظم لکھی ہے کہ اس کے بعد کسی شاعر کو لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ تمام اساتذہ نے اس کی تعریف متفق‌اللسان ہو کر کی ہے (۲) "۔

شیخ چاند مرحوم کے اس ادعا کو پچھلے تیس برسوں میں برابر دہرایا جاتا رہا ہے ۔ چنانچہ ساقی نامہ عزلت (۳) کے مقدمے میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے :

" سلطان محمد قلی قطب شاہ اور قدیم شعرا کے یہاں تعریف شراب سے متعلق جو چند اشعار پائے جاتے ہیں وہ قدیم عربی و فارسی شعرا کی مدح خمر کی طرح محض زیب داستان کے لیے ہیں ۔ سب سے پہلے جس شاعر نے اس صنف کی طرف توجہ کی وہ محمد فقیہہ دردمند ہیں "۔ (۴)

لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے ۔ سب سے پہلا شاعر جس نے اس صنف کی طرف توجہ دی وہ دردمند نہیں ، معظم ہے ۔ دردمند کے ساقی نامے کے سنہ تصنیف کا علم نہیں لیکن عزلت نے دردمند کے جواب میں اپنا ساقی نامہ

۱- رسالہ آردو بابت جولائی ۱۹۳۴ء ، ص ۵۸۲

۲- ایضاً

۳- عبدالرزاق قریشی نے ساقی نامہ عزلت کے ایک ناقص متن کو نوائے ادب جولائی ۱۹۴۹ء میں شائع کیا ہے ۔

۴- ساقی نامہ عزلت ، نوائے ادب بابت جولائی ۱۹۴۹ء ، ص ۹

۱۱۲۰ھ میں لکھا تھا۔ 'بیان ظہور' اس کا تاریخی نام ہے۔ دردمند اور عزلت ہم عصر تھے اس لیے قیاس کہتا ہے کہ درد مند کا ساقی نامہ ۱۱۲۰ھ سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا ہوگا۔ شاہ معظم کے ساقی نامے کے سنہ تصنیف کا پتا نہ چل سکا لیکن اس کو اگر ان کی آخری عمر کی تخلیق بھی مانا جائے تو اس کارنامے کا زمانہٗ تصنیف بارھویں صدی کی دوسری یا تیسری دھائی ہوگا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاہ معظم کا ساقی نامہ درد مند کے ساقی نامے سے کم از کم چالیس پچاس سال پہلے لکھا جا چکا تھا۔

اگرچہ کوئی داخلی یا خارجی شہادت ایسی دستیاب نہیں ہوئی جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ دردمند کی نظر سے شاہ معظم کا ساقی نامہ گزر چکا تھا لیکن راقم الحروف کا قیاس ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ساقی نامہٗ معظم سے واقف ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ خود دکن (۱) کے باشندے تھے اور دوسرے یہ کہ ان کے پیر اور استاد مرزا مظہر جانجاناں کے والد مرزا جان ۱۱۱۱ھ سے قبل عالمگیری فوج کے ساتھ بیجاپور میں رہ چکے تھے اور یہیں شادی بھی کرلی تھی (۲)۔ یہ تو نہیں معلوم کہ مظہر جانجاناں کی بیجاپور کو آمد و رفت رہی یا نہیں لیکن قرینہ اس کا ہے کہ ننھیال سے تعلق برقرار رہا ہوگا۔ تبھی تو ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں بیجاپور پہنچا اور مقبول ہوا۔ یہی نہیں بلکہ بیجاپوری شعرا نے ان کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ چنانچہ قطع نظر دوسرے شعرا کے حضرت امین کے سلسلے کے چوتھے سجادے بابا شاہ حسینی عرف پیر بادشاہ کی بعض غزلیں ایسی ملتی ہیں جو جانجاناں کی غزلوں پر کہی گئی ہیں (۳)۔ ان واقعات کی بنا پر یہ قیاس دور از کار نہیں کہ مظہر

۱۔ اودگیر ضلع بیدر (سابق حیدرآباد حال میسور اسٹیٹ) کے نجبا سے تھے۔ کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ ۱۱۳۶ھ میں شاہ جہاں آباد دھلی چلے گئے۔ ابتدا میں شاہ ولی‌اللہ اشتیاق سرھندی کے زیر تربیت رہے، پھر والد کے انتقال کے بعد جانجاناں کے سایۂ عاطفت میں آگئے۔ فارسی کے شاعر تھے۔ ریختے کی نسبت لکھا ہے کہ جان جاناں کی محبت سے مجبور ہو کر اس میں طبع آزمائی کی۔ دھلی میں ان کا قیام تیس سال رہا۔ مرشد آباد میں انتقال ہوا۔

۲۔ آب حیات (مکتبہ اشاعت آردو) ص ۲۶۸

۳۔ دیوان سید شاہ حسینی بیجاپوری، آردو ادب، بابت جولائی ۱۹۶۰ء ص ۴۶

جانجاناں بیجاپوری شعرا کے کلام سے واقف ہوں گے اور معظم کا ساقی نامہ ان کی نظر سے گزرا ہوگا ، اور ان کے توسط سے ان کے محبوب شاگرد اور مرید کو اس ساقی نامے کی سن گن ملی ہوگی بلکہ کیا عجب ہے کہ جانجاناں نے دردمند کو معظم کے ساقی نامے کے ڈھنگ پر ایک ساقی نامہ لکھنے کا مشورہ بھی دیا ہو۔ اس قیاس کو تقویت خود دردمند کے ان اشعار سے ہوتی ہے :

خدیو سخن میرزا جان جاں — کہ حکم اس کا ہے ناطقے پر رواں
وہ ہے سب میں یارب امامت رہے — قیامت تلک وہ سلامت رہے
کہاں تھا مجھے ریختے کا خیال — ہوا واجب اس امر کا امتثال
نسبت نے مجھ کو کیا لاجواب — و گرنہ میں اور ریختہ کیا حساب

دردمند معظم کے ساقی نامے سے بے خبر بھی رہے ہوں تو بھی تقدم زمانی معظم ہی کو حاصل ہے۔

ساقی نامے کے بنیادی موضوع مے و نغمہ کو معظم نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ پہلے حصے میں مے و مینا اور کیف و مستی کے مضامین باندھے ہیں اور دوسرے حصے میں ساز و نغمہ اور اس کے سرور و نشاط کو بیان کیا ہے۔ معظم نے ساقی نامے کے ان دو موضوعات پر بظاہر علاحدہ حصوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن درحقیقت اس ساقی نامے کا بنیادی موضوع کیف و مستی ہے جو ایک حصے میں شراب سے حاصل کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں نغمے سے۔ تاہم ساقی نامے میں مے و نغمہ کے موضوع کا یہ تجربہ معظم کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ معظم کے بعد مستقل صنف ادب کی حیثیت سے کم ہی ساقی نامے لکھے گئے ہیں لیکن ان میں بھی کہیں یہ جدت اور اپج نظر نہیں آتی۔ درد مند نے اپنے ساقی نامے کے آخری حصے میں مطرب کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن انتہائی سرسری انداز میں اور دو چار اشعار پر ہی اکتفا کیا ہے۔

ساقی نامۂ معظم کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نظم کو حقیقت اور مجاز کے تار حریر دو رنگ سے اس خوبصورتی اور چابک دستی کے ساتھ گوندھا گیا ہے کہ کوئی رنگ ایک دوسرے پر غالب نہیں آتا۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مثنوی شاہ معظم کی صوفیانہ شاعری کے سرمایے میں سب سے زیادہ ادبی نکھار رکھتی ہے۔

معظم نظم کا آغاز خدا کی ساقی گری کے ذکر سے کرتے ہیں :

الہی توں ساقی ازل سوں مدام پلاتا ہے توں جام سب کو تمام
پلایا ہے اول بھی آخر سو توں شراباً طہورا ...... حشر سو توں

سقاھوں (ھم) کھیا ہے او آپیں دھنی
ہے ساقی ھمارا او آپیں غنی

خدا کی ساقی گری کے ذکر کے بعد دو شعروں میں ساقی کی حیثیت سے رسول اکرم صلعم کا ذکر کیا ہے ۔

اتا توں پلانے کوں نائب کیا کتے ہیں جسے خاتم الانبیا
حیات النبی ھات لے جام کوں پلاتا ہے سب خاص ھورعام لوں

خدا اور رسول کے ذکر کے بعد وہ کائنات کی ہر شے کو اس شراب کے نشے سے سرشار دکھاتے ہیں اور اپنے پر جوش اسلوب میں ایک ایک چیز کی مستی اور سرشاری کا ذکر کرتے جاتے ہیں ۔

اسے ہی سوں ہیں مست سب انبیا اسے ہی سوں ہیں مست سب اولیا
اسے ہی سوں یو مست عشاق ہیں اسے ہی کے عاشق یو مشتاق ہیں
اسے ہی سوں یو مست مجذوب ہیں اسے ہی سوں یو مست محبوب ہیں
اسے ہی سوں مدھوش شہدا ہوئے اسے ہی سوں سرمست شیدا ہوئے
اسے ہی سوں مقبول واصل ہوئے اسے ہی سوں کامل یو فاضل ہوئے
اسے ہی سوں ھو مست شمس و قمر دیکھو مست پھرتے ہیں کیوں بے خبر
زمانہ ھوا مست ھور ملک (ب) بھر دیکھو چرخ پھرتا ہے گردش قمر
دیکھو مست سارے ستارے ہوئے فلک پر کے سارے یو تارے ہوئے
دیکھو مست ھو قطب ھلتا نہیں ھوا کیف سو کیں اوچلتا نہیں

مظاہر کائنات کی مستی کا یہ ذکر طولانی ہے ۔ لیکن جس طرح اوپر کے اشعار کے صدر میں ایک جیسے فقروں کی تکرار سے زور بیان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ، بقیہ اشعار میں یہ اہتمام ملحوظ نہیں رکھا گیا ۔

بہرحال ساری کائنات کو مست و بیخود بتانے کے بعد اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہیں کہ اے معظم اٹھ اور ساقی سے جام خاص کے لیے التماس کر۔ اور ساقی کے استعارے کو کھولتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا ساقی خدا کا رسول ہے اور رسول کے نائب علی ہیں اور علی ہی ساقیٔ کوثر ہیں۔ اس ساقیٔ کوثر سے دین اور دنیا کی کامرانی وابستہ ہے :

ہمارا ہے ساقی خدا کا رسول		مناجات میرا کرے گا قبول
نبی کا سو نایب علی ہیں کتے		او بر حق خدا کا ولی ہیں کتے
نبی کا کتے یار یاور ہے او		پلانے کوں ساقیٔ کوثر ہے او
اوسی سونچ ہو عرض کرتا ہوں میں		اوسی سونچ پے کام دھرتا ہوں میں
اوسی سونچ محشر میں مجھ کام ہے		اوسی سونچ دنیا میں آرام ہے

اس سلسلے کے اشعار تو آگے اتنا الجھا دیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے یا حضرت علی سے یا خدائے تعالیٰ سے۔ چنانچہ کہتے ہیں :

ازل کا توں استاد میرا حکیم		ہے مشہور تیرا کرم یا کریم

تخاطب جس کسی سے ہو، التجا شراب معرفت کی ہے لیکن اس کے بعد اپنی بدکیفی اور شراب کی آرزو کا ذکر جس انداز میں کیا ہے اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شراب حقیقی نہیں مجازی ہے :

مرے سر میں ہے درد خمار کا		ہے دوسرا درد مجکوں بیمار کا
اسی درد کا تن میں مج تاب ہے		اسی درد سوں جیو بے تاب ہے
منجم اور فال ہارے تمام		مداوا کرنے آکے سارے تمام
درد دیک ہارے ہیں سارے حکیم		جیتے شہر میانے ہیں سارے ندیم
نجانوں میرا جیو ہے تن میں کہاں		نجانوں چھوپا ہے بدن میں کہاں
نداد ے کدھیں جو کروں ہوش میں		... ہو کے پڑتا ہوں بیہوش میں

شراب کوئی سی ہو التجا بہر صورت ساقیٔ حقیقی ہی سے ہے :

ہریک باب کا علم رکھتا ہے توں		ہریک باب حکمت ہی دھرتا ہے توں

کتنے خوب حکمت ہے تج جان میں	اپنا دور کرتا ہے یک (آن) میں
اپنا جام دیتا ہے کوی پیار سوں	اپنا دور کرتا ہے آزار سوں
اپنا دور ہوتا ہے کلفت مرا	اپنا دور ہوتا ہے زحمت مر
اپنا عرض ہے تجسوں اے کارساز	اپنا جام دو چار کر سرفرا

ساقیٔ حقیقی سے اس تخاطب کے بعد پھر وہ شراب کی التجا اس طر کرتے ہیں جیسے یہ مجازی شراب ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ رات کے گزر جانے کے اندیشے کا اظہار بھی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ طلو آفتاب سے پہلے جس قدر پی سکتے ہوں پی لیں -

ساقی نامے کے وہ شعر بہت دلچسپ ہیں جن میں شاہ معظم رات کے آخری پہر ، سپیدیٔ سحر ، باغ و بہار کی کیفیت وغیرہ کا ذکر ایک بادہ خوا کی طرح للچا للچا کر کرتے ہیں :

اے ساقی یو لہرا ہوا نور کا	طلب کر مئے ناب انگور کا
اے ساقی منگا جام جمشید کا	اجالا ہوا دیکھ خورشید کا
توں اوٹھ بیک ساقی کرم کر عمیم	چلیا ہے یو باد صبا خوش‌نسیم
کرم کر اے ساقی عجب وقت ہے	مجھے درد خمار کا سخت ہے
پیا مے زمستاں کے ہنگام میں	یو پھر جوان ہوتا ہے یک جام میں

اس سلسلے میں شاہ معظم نے بڑی شاعرانہ معنی آفرینی کی ہے - وہ کہتے ہیں کہ اے ساقی تو اپنے آفتاب جیسے چہرے پر نقاب ڈال دے ورنہ یوں محسوس ہوگا کہ آفتاب نکل آیا ہے اور شراب کا سارا لطف جاتا رہے گا :

اے ساقی تو مکہ پر سے سٹ دے نقاب
مبادا نکل آئے گا آفتاب

پیلا بیک ہور قدح مجہ نور کا	ہے مشرق طرف دہدہا سور کا
یو خرقہ گرو رکھ کے یک جام دے	پیا ہے پیلا سجکوں آرام دے
اے ساقی تو واقف مرے حال کا	منگا جام کہنہ او دہ سال کا
دے تب مجھے گنج لاریب کا	دفینہ نکل آئے سب غیب کا

اے ساقی یو فرصت سمجھ کر چکا　　منگا او صراحی ہرے پاچ کا
ہے سوں کتے دور ہوتا ہے رنج　　زمیں سے کتے اسکوں دکتا ہے گنج
اے ساقی مئے ناب صاف و صفا　　شکستہ دلاں کوں کیے ہے نفا
منگیا بیگ ساقی رنگیلا شراب　　پیاسے کوں پانی پلانا صواب

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں رات کی فضا ، طلوع آفتاب کا اندیشہ ، مئے انگور کی ارزو ، نشے کی مختلف کیفیات کا بیان ، مجازی مے و مستی سے تعلق رکھتا ہے ۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ہی وہ اپنے شیخ قادر لنگا سے مخاطب ہو جاتے ہیں :

اے قادر تو ساقی سزاوار ہے　　پیلانے کوں توں دور ...... ہے
ترا عکس دیکھا جو کوئی جام میں　　رہتا ہے متا ہوکر آرام میں

ان اشعار کے بعد کسی تمہید کے بغیر کسی مخصوص پر فضا مقام کی کیفیت کا بیان ہے ، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ کچھ شعر چھوٹ گئے ہیں ۔

یو جاگا آسے ہے فرح بخش ہے　　کتے ہفت کشور اپر نقش ہے
یو شرف المکان ...... بیت الحرم　　تصدق کیا اس پہ باغ ارم
عجایب درختاں کوں دیکھ سایہ دار　　کتے عاشقاں اس کوں دارالقرار
حریفاں اسے باغ بستاں کتے　　پھلاں کو یہاں کے گلستاں کتے
عجب باغ روشن منور ہے یو　　عجب حوض میانے تو کوثر ہے یو
دنیا میں تو یو باغ فردوس ہے　　کتے نیں جو دیکھا تو افسوس ہے
ہمیشہ یہاں یار کا ہے گذر　　ہوا باغ یو مست سب سیر کر
دیکھو مست ہو سرو ڈھلتے ہیں کیوں　　دیکھو مست شمشاد ڈھلتے ہیں کیوں
دیکھو مست دستے ہیں سوسن کے پھول　　ہوے مست سارے یو گلشن کے پھول
زلف دیکھ کر مست سنبل ہوا　　اسے دیکھ کر مست بلبل ہوا
ایسی یار کا دیکھ کہنے کوں راز　　یو سوسن زباں کوں کیا ہے دراز
نین دیکھ کر مست نرگس ہوا　　اسے دیکھ کر مست مجلس ہوا

ہو ... کنول دیکھ تالاب میں
عجب مست دستے ہیں سراب میر

مٹھی باس ہی ہے یو مد مالتی
یو مستی یو ہستی کوں سب گھالتی

یو خوش باس سوں سب معطر ہے باغ
اسی باغ سوں خوش ہوا ہے دماغ

مدن بان کا باس نو خاص ہے
ولے موگرا اس سوں خوش باس ہے

یو چنپا لیا ہے عجب تلخ باس
بھنور گرتے ہیں آن دیتا ہے باس

چنبیلی میں ہے باس اعروس کی
کتے باس آتی ہے فردوس کی

پھولی ہے دیکھو کیتکی سر بسر
تو قربان ہوتا ہے اس پر بھنور

عجایب دیکھو سیوتی کا بہار
عجایب پھولی ریوتی بے شمار

چمن میں عجایب نشیمن ہے یو
عجب ٹھار دلکش سو دامن ہے یو

حجر ہور شجر مست سرشار ہیں
ہمیشہ سدا مست دیدار ہیں

چمن میں پھو لیا ہے یو سارا گلاب
طلب کر قوالاں کوں ہیگی شتاب

دیکھو یار کوں کیوں رجھانے بدل
خروساں بو مل تان گانے بچھل

دیکھو طائراں مست ہو بولتے
چھپے راز سب اس کے مرغولتے

کتک جانور بولتے خوش اواز
اسی یار کا راز کرتے ہیں واز

چمن در چمن دیکھ لالا ہے مست
یو سرو سہی دیکھ بالا ہے مست

اتل کوں یہاں گنج در گنج ہے
یو ہے خوش عجب دیکھ نارنج ہے

عجایب ہے شیریں دہاں نیشکر
مقابل کوں اس کے نہیں کچھ دگر

ولایت کے میوے تو اسام ہیں
ولے یہاں گلابی عجب جام ہیں

یہاں انبہ تو عام ہور خاص ہے
پھنس سوں سرس یہاں اناس ہے

کتے جس کو خمار کا کچھ ہے رنج
او بے دور کرتا بھی کہتے ترنج

دیکھو یہاں عجائب ہے انار یو
کتے دور کرتا ہے خمار یو

باغ و بہار کا یہ سماں معظم کے دل کو گرماتا ہے اور وہ ساقی سے شراب نغمہ کی فرماش کرتے ہیں :

نقل ہے مہیا شراب و کباب
منگتا ہیگ ساقی شراب رباب

مرے پر اتا کیف غالب ہوا
مرا راگ پر جیو طالب ہوا

مے و ساقی کی سرمستیوں اور باغ و بہار کی رنگینیوں کا بیان ہو چکا اب مطرب و نغمہ کی ہوش ربائی اور دلستانی کا ذکر چھڑتا ہے :

مغنی تو ہے آشنا یار کا   او مطرب تو محرم ہے اسرار کا
مغنی زباں کوں درازی کرے   او مطرب کدھیں چنگ بازی کرے
اپنا مست ہوتے ہیں خاص و عام   اپنا مست ہوتی ہے مجلس تمام
اگر قوں گاتے ہیں کچھ یو قوال   اپنا مست صوفی یو کرتے ہیں حال
مغنی کے گانے پہ زہرا بھی دنگ   او مطرب بجاتا ہے جو سو ہے چنگ
مغنی تو کرتا زباں کا ہنر   او مطرب عجائب بجاتا جنتر
کرامت مغنی کی ہے بات میں   سحر ہے یو مطرب کے کچھ ہات میں
او مطرب اگر ہات لیتا ہے دف   اپنا غم کوں کرتا ہے سب برطرف

نغمہ و سرور کی فضیلت اور اہمیت اور اس کے سحر و اعجاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ معظم بعض مسلمان (۱) موسیقاروں کے اس خیال کو دہراتے ہیں کہ راگ درحقیقت عشق کی آگ ہے - جسم میں پہلے راگ آیا اور اس کی تلاش میں روح جسد خاکی میں داخل ہوئی - چنانچہ سید عبدالولی عزلت '' راگ مالا '' میں '' ہفت سور '' کے عنوان کے تحت کہتے ہیں کہ :

خدا نے جب تن آدم بنا کر   کہا اے روح تو جا اس کے بھیتر
کیا عرض آہ بھر کر روح نے یوں   اندھیاری کوٹھری میں جا بسوں کیوں
کہا تب ایک ملک کو بیٹھ تن میں   تو بول ایک راگ آدم کے بدن میں
ملک سے سن کے تانیں درد کی گئی   دوانی ہو کے تن میں روح آ گئی

سروری سے ہوا ہے جیتا انساں
جو سچ بولوں تو تھا نغمہ وہی جاں (۲)

شاہ معظم کے ذہن میں بھی مسلمان موسیقاروں کی یہی تاویل تھی

۱- ' غنچہ ' راگ ' ملاحظہ ہو -
۲- راگ مالا (۹۱) مثنویات کتب خانہ آصفیہ -

لیکن وہ عزلت کی طرح تفصیل میں نہیں گئے ہیں بلکہ موسیقی کی اثر انگ
اور اثر آفرینی کا بیان کرتے ہوئے اس طرف بھی اشارہ کر گئے ہیں ۔

بڑا علم قدرت میں یو راگ ہے کتے راگ سو عشق کا آگ
بھلاتا ہے محبوب کے غیر کوں جلاتا ہے سب کفر ہور دیر کر
اول تن میں یوں راگ آیا کتے مٹھے سر سنا کر ہلایا کر
اوسی دن سوں ہے راگ میرا رفیق اوسی دن سوں ہے راگ میرا شفیق
اسی راگ سوں راز ظاہر ہوا چھپا راز پردے سوں باہر ہوا

راگ کو اصل حیات اور محرم اسرار ٹھیرانے کے بعد کہتے ہیں
یہ وہ طاقت ہے جس سے حیوانات ، جمادات اور نباتات بھی متاثر ہوئے بغیر
نہیں رہ سکتے ۔ راگ میں وہ اثر ہے کہ ہرن چوکڑیاں بھرنا بھول جاتے ہیں
درندے رام ہو جاتے ہیں ، لوہا موم بن جاتا ہے ، سلاطین تخت و تاج
بیٹھتے ہیں اور مہروماہ قدموں میں لوٹنے لگتے ہیں اور سب تو سب :

کتے راگ زینت ہے قرآن کا

یہ راگ کیا ہے ؟ ایک بات ، ایک آواز ! لیکن ایسی بات اور ایسی
آواز جس میں کرامت چھپی ہوتی ہے اور جو کوئی اس بات کو پالیتا ہے
حق کو پا لیتا ہے ۔

عجب راگ کا جگ میں بستار ہے شہد سوں مٹھا تر یو گفتار ہے
جسے راگ کہتے ہیں او بات ہے ولے بات میں اس کرامات ہے
اگر کوئی جو پاتا ہے اس بات کوں انپڑتا ہے سچ حق کی او ذات کوں

اس لیے شاہ معظم مغنی اور مطرب کو آواز دیتے ہیں کہ وہ مجلس میں
آئیں اور اپنی مسیحا نفسی کو کام میں لائیں ۔

اے مطرب بجا عود و بربط کے تار جو نکلے صدا تن میں سب یاد یار
یو جیو اس صدا پر سوں قربان ہے جتا مال دھن ہور ایمان ہے
مغنی سنیا ہوں ترا خوش اواز کتے واز کرتا ہے سب دل کے راز
اے مطرب اگر چنگ ونے دف سوں مل کرے رقص تو صاف ہوتا ہے دل

کہ تا مست ہو وجد میں آتے ہیں　　وراء الوراء پر گذر جاتے ہیں
مغنی غزل قول کچھ یاد کر　　کدورت مرے دل سوں برباد کر
رہوں شاد شاداں ہو مل یار سوں　　کروں عشق مل اپنے دلدار سوں
اے مطرب بجانے کتے جاں گداز　　جو مستاں کریں رقص کا اوٹھ کے ساز
کریں رقص ہو مست ات شوق سوں　　بسر دین دنیا کوں ات ذوق سوں
مغنی اپنا کوئی ترانہ سنا　　جو اوٹھ جائے دل سوں یہ سب میں پنا
سٹوں ہات سوں دھو کے ہستی کے کام　　رہوں سرنگوں ہو کے تا صبح شام
اے مطرب دوتارے کوں دے گوشمال　　دیکھ اپنا آتا ہے مجلس کوں حال
تمارے ہو گانے بجانے اوپر　　کتے مست ہوتے ہیں شمس و قمر

شاہ معظم راگ کو روح کا یار و مددگار سمجھتے ہیں اور ان کا یقین ہے کہ جراحت عشق کا مدوا اس سے ممکن ہے -

کتے راگ ہے یار اس روح کا　　میرے سار کے سچ ہے مجروح کا

اس لیے نظم کو ختم کرتے ہوئے مغنی اور مطرب سے درخواست کرتے ہیں :

دونوں یار مل دستگیری کرو　　دونوں یار مل جہد پوری کرو
دونوں یار مل کارسازی کرو　　مرے ہجر کے غم کو ماضی کرو
اگر جا کے ملنا ہو اس ماہ کوں　　حقیقت کہو جا کہ سب شاہ کوں
مغنی تو محرم ہے سب راز کا　　معظم ہے عاشق سو آواز کا

صوفی شعرا پر حقیقت کا رنگ کچھ ایسا غالب ہوتا ہے کہ وہ کبھی مجاز کی طرف آتے بھی ہیں تو ان کی شاعری میں مجاز حقیقت کا عکس دکھائی دینے لگتا ہے ۔ معظم کے زیر نظر ساقی نامے کا موضوع بظاہر ہے ! نغمہ کا مجازی موضوع معلوم ہوتا ہے لیکن پوری نظم بارہا پڑھ جانے اس کے باوجود یہ تصفیہ کرنا مشکل ہوگا کہ شاعر کے فکر و فن کو قوت محرکہ حقیقت سے مل رہی ہے یا مجاز سے ۔ تاہم معظم کے یہاں یہ چیز کھٹکتی نہیں ہے اس لیے کہ وہ مجاز و حقیقت کے تار حریر دو رنگ سے اپنی نظم کا تانا بانا تیار کرنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور مجاز ہو یا

حقیقت ان کی شاعری جذبات اور احساسات کی شاعری ہوتی ہے ۔ وہ اصطلاح
کی زبان میں شعر کہتے ہیں اور نہ الفاظ کا طلسم باندھتے ہیں بلکہ تصوف
نازک سے نازک مسئلے کو جذبات کی زبان میں بیان کرنے اور پیچیدہ مسئلے
سلیس اسلوب میں پیش کرنے پر قادر ہیں ۔ زیر نظر ساقی نامے میں معنٰم
سرور و سرود کا ذکر کچھ ایسے للچاتے ہوئے انداز میں کیا ہے جو بہ
شدید داخلیت کے ممکن نہیں ۔ اس شدید داخلیت کی وجہ سے ان کی زبان م
روانی اور اسلوب میں بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے جو بہت کم صوفی شع
کے کلام میں ملتی ہے ۔ ان کا شمار نصرتی ، وجہی اور غواصی کی صف
شعرا میں نہیں ہوتا لیکن صوفی شعرا کی صف میں وہ قدآور شخصیت
مالک ہیں ۔

آدینہ بیگ کامل

(حالات و کلام)

محمد اکرام چغتائی

جس طرح بعض نامور اور مشہور و معروف دکنی محققین نے اپنی پر خلوص محنت اور محققانہ انداز فکر کی بدولت دکنی ادب کو گوشۂ گمنامی سے نکالا اور اپنی پیہم کوششوں سے دکنی ادب کا معتد بہ سرمایہ ادبی دنیا کے سامنے پیش کر دیا (۱) ، اسی طرح کچھ عرصے سے شمالی ہند کے محققین بھی جذبے اور محنت سے شمالی ہند کے اردو ادب کے ابتدائی دور (خصوصاً محمد شاہی دور ۱۱۶۱ھ - ۱۱۳۱ھ) پر کام کر رہے ہیں جو قابل صد تحسین ہے ۔ ان کی حالیہ تحقیقات کی بدولت شمالی ہند کے بہت سے ابتدائی شعرا کا کلام دستیاب ہوا ہے اور بعض شعرا کے دواوین کے تنقیدی اڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں (۲) ۔ راقم کا یہ مقالہ اسی طرز مطالعہ کی ایک کڑی ہے ۔

۱۔ اس سلسلے میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق ، حکیم شمس اللہ قادری ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، نصیرالدین ہاشمی ، عبد القادر سروری وغیر کے اسماء قابل ذکر ہیں ۔ بعد میں سخاوت مرزا اور محمد اکبرالدین صدیقی وغیرہ نے اس کام کو جاری رکھا ۔

۲۔ مثلاً دیوان بقا (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی) ، کلیات جعفر علی حسرت (مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی) ، دیوان محمد فقیہ دردمند (مرتبہ ڈاکٹر محمود الہی) ، دیوان مرزا محمد علی فدوی (مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین) ، دیوان شاہ رکن الدین عشق (مرتبہ ڈاکٹر ثریشہ حسنین) ، (جاری)

قدیم و جدید اردو شعرا کے تذکروں میں بہت سے ایسے شعرا کا ذکر موجود ہے جن کے تخلص کامل تھے لیکن مرزا آدینہ بیگ کامل کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام کسی اردو تذکرے میں موجود نہیں۔ تذکروں کے علاوہ اردو ادب کی دیگر کتب میں بھی ان کا ذکر راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔ صرف ولی اللہ فرخ آبادی نے اپنی فارسی "تاریخ فرخ آباد" میں مختصر سے حالات زندگی اور ایک غزل بطور نمونۂ کلام درج کی ہے جس کا ذکر آئندہ صفحات میں ہوگا۔ جن شعرا کے تخلص کامل تھے اور مرزا آدینہ بیگ کامل کے ہم عصر معلوم ہوتے ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ مرزا کامل بیگ کامل، قوم مغل سپاہی پیشہ (۱)۔

۲۔ شیخ لطف اللہ کامل، شاگرد میر حسن (۲)۔

(جاری)

دیوان ناجی (مرتبہ فضل الحق)، قبل ازیں دیوان یقین (مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ)، دیوان بیدار (مرتبہ جلیل احمد قدوائی)، دیوان تاباں (مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبد الحق)، دیوان اثر (مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبد الحق)، دیوان قائم (مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب)، دیوان فغاں (مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن) شائع ہو چکے تھے۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ عیار الشعرا، قلمی، انڈیا آفس، مائیکرو فلم کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور۔ ورق ۳۲۲ ب، عمدۂ منتخبہ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ۵۳۰۔ گلشن بیخار، شیفتہ، ۱۹۱۰ء، ص ۱۶۱۔ سخن شعرا، نساخ، لکھنؤ ۱۲۹۱ھ، ص ۳۹۶۔ تذکرہ شعرائے ہند، مولوی کریم الدین و ڈاکٹر ایف فیلن، دہلی ۱۸۴۸ء، ص ۹۰۔ تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی، (فرانسیسی)، گارسین دتاسی، بار دوم، جلد دوم، ص ۱۵۶۔ فہرست کتب خانہ شاہان اودھ (انگریزی) ڈاکٹر اشپرنگر، ۱۸۵۴ء، جلد اول، ص ۱۳۷۔

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، میر حسن، مرتبہ محمد حبیب الرحمان خاں شروانی، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۱۲۷۔ شاگرد شاہ خاکسار (تذکرہ عشقی مشمولہ "دو تذکرے" مرتبہ کلیم الدین احمد، پٹنہ، جلد دوم، ۱۹۶۲ء، ص ۱۶۶)

۳- میر محمد کامل برہانپوری ، مشہور مرثیہ گو شاعر (۱) -

۴- کامل ، مرید رحمت اللہ بلگرامی ، ان کی ایک تصنیف ' فقرنامہ ' (قبل ۱۱۹۵ھ) ملتی ہے - (۲)

بعض کامل تخلص کے شعرا مرزا آدینہ بیگ کامل کے قریبی زمانے کے معلوم ہوتے ہیں ان کے اسما مندرجہ ذیل ہیں :

۱- مولوی غلام کبریا کامل (۳)

۲- شیخ جمال الدین کامل (۴)

۳- پنڈت ٹھاکر داس کامل (۵)

سابقہ سطور میں لکھا گیا ہے کہ آدینہ بیگ کامل کا کسی اردو شعرا کے تذکرے میں ذکر موجود نہیں ہے - راقم کو ایک قلمی بیاض سے آدینہ بیگ

۱- حمید اورنگ آبادی نے ان کے تفصیلی حالات لکھے ہیں ، دیکھیے گلشن گفتار ، مرتبہ سید محمد ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۳۱ء ، ص ۵۳ ، ۵۵ - آصفی ملکا پوری نے لکھا ہے کہ عین عالم شباب میں ۱۱۷۰ھ میں وفات پائی - (تذکرہ شعرائے دکن ، جلد دوم ، ص ۹۴۰)

۲- تذکرۂ اردو مخطوطات مرتبہ ڈاکٹر زور مرحوم ، حیدر آباد دکن ، جلد اول ، ۱۹۴۳ء ، ص ۱۴۷ ، ۱۴۸ ، و جلد سوم ، ۱۹۵۷ء ، ص ۲۸۱ -

۳- شاگرد فغاں (طبقات الشعرا ، شوق رام پوری ، مرتبہ نثار احمد فاروقی ، لاہور ، ۱۹۶۷ء ، ص ۳۰۳) شاگرد مرزا جان طپش (سخن شعرا ، ص ۳۹۰) ، استاد عزیز الدین ہمرنگ اورنگ آبادی (مجموعۂ نغز ، مرتبہ شیرانی مرحوم ، لاہور ، ۱۹۳۳ء ، حصہ دوم ، ص ۲۶۱)

۴- باشندۂ آنولہ ، شاگرد مصحفی (سخن شعرا ، ص ۳۹۵ - سراپا سخن ، محسن ، لکھنؤ ۱۲۶۹ھ ، ص ۷۴- گارسین دتاسی ، تاریخ ... ، جلد دوم ، ص ۱۰۶)

۵- عمدۂ منتخبہ ، ص ۳۰۶ - گلشن بےخار ، ۱۹۱۰ء ، ص ۱۶۱ ، سخن شعرا ، ص ۳۹۶ - گارسین دتاسی ، تاریخ ، جلد دوم ، ص ۱۰۶ - اشپرنگر ، ص ۲۴۷ -

کے مفصل حالات زندگی اور اچھا خاصا نمونہ' کلام دستیاب ہوا ہے ۔ یہ
بیاض کتاب خانہ دانش پنجاب ، لاہور میں محفوظ ہے ۔ آدینہ بیگ کے حالات
زندگی بیاض نگار نے خود اپنے قلم سے لکھے ہیں ۔ بیاض نگار نے اپنا نام کسی
جگہ نہیں لکھا لیکن وہ آدینہ بیگ کا دوست معلوم ہوتا ہے جیسا کہ
"بارہا ملاقی شدہ" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے ۔ بیاض کا سنہ کتابت
مرقوم نہیں لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیاض بارھویں صدی
ھجری کے نصف آخر کی مکتوبہ ہے ۔

اب ہم آدینہ بیگ کے وہ حالات زندگی قارئین کی خدمت میں پیش
کرتے ہیں جو بیاض نگار نے لکھے ہیں :

"نام مرزا آدینہ بیگ (۱) ، کامل تخلص ، قوم مغل ، تورانی الاصل (۲)
متوطن لاھور ۔"

۱۔ اسی نام کا ایک شخص نواب ذکریا خاں (صوبہ دار لاہور ، ۔
۱۱۰۸ھ) کا نوکر ہوا اور اس کی وفات کے بعد رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا پورے
پنجاب پر قابض ہو گیا ۔ لیکن اس شخص سے مرزا آدینہ بیگ کامل کا اسمی
التباس ناممکن ہے ۔

۲۔ ولی اللہ فرخ آبادی نے لکھا ہے کہ آدینہ بیگ خاں حکمران پنجاب
(م ۱۱۷۳ھ) بھی تورانی الاصل تھا (تاریخ فرخ آباد ، اردو ترجمہ ، ص ۱۶۵)
لیکن موجودہ تحقیق کی بنا پر وہ تورانی نہیں بلکہ ارائیں تھا اور شرقپور ضلع
لاھور کا باشندہ تھا ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے :

(i) Proceedings of the Idara-i-Ma'rif-i-Islamia, Lahore. 1938. "Adina Beg Khan" - Muhammad Baqir Malik pp. 255 - 278.

(ii) Journal of the Panjab University Historical Society, 1940. "Adina Beg Khan". Hari Ram Gupta, pp. 23-77. Islamic Culture, Hyderabad Deccan, July 1939, pp. 323-338.

(iii) احوال آدینہ بیگ (قلمی) مخزونہ کتب خانہ برٹش میوزیم

(جاری)

کامل لاہور کے رہنے والے تھے لیکن وہ زیادہ عرصے یہاں نہ رہ سکے اور لاہور سے فرخ آباد چلے گئے اور پھر تمام عمر فرخ آباد ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی - بیاض نگار نے جس وقت ان کے حالات لکھے ہیں ، اس وقت انہیں فرخ آباد میں آئے ہوئے خاصی مدت ہو چکی تھی - متعلقہ عبارت درج ذیل ہے :

" از مدتے در بلدہ فرخ آباد سکونت نمودہ"۔

کامل کی اس ہجرت کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں لیکن قرین قیاس ہے کہ کامل نے پنجاب کے نامساعد سیاسی حالات کی بنا پر فرخ آباد کو ہجرت کی ہوگی - یہ سیاسی حالات لوگوں کے معاشی حالات پر بھی اثر انداز ہوئے اور بہت سے لوگوں نے تلاش روزگار یا ذہنی سکون کی خاطر ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی طرف رخ کیا - ان مہاجرین میں اہل علم حضرات اور نامور شعرا بھی تھے - خصوصا شعرا نے فرخ آباد ہی کا رخ کیا - دہلی سے جن شعرا نے ہجرت کی ہے ' وہ پہلے فرخ آباد ہی گئے ہیں اور پھر کسی دوسری جگہ - اس ضمن میں میر سوز ، مرزا سودا ، فدوی لاہوری وغیرہ کی مثال پیش کی جا سکتی ہے - اس نقل مکانی کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ہندوستان میں فرخ آباد ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں امن و امان تھا اور وہاں کا ماحول ذہنی کاوشوں کے لیے بالکل سازگار تھا - اور جب نواب احمد خاں بنگش کی وفات (۱۱۸۵ھ) کے بعد یہاں کے سیاسی حالات خراب ہونے لگے تو پھر شعرا نے فیض آباد کا رخ کیا - ہو سکتا ہے کہ مرزا آدینہ بیگ کامل بھی اسی نقطۂ نظر سے لاہور سے فرخ آباد گئے ہوں - (۱)

(جاری)

(رجوع : فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ، جلد سوم ، ص ۱۰۴۴ الف) - ' احوال آدینہ بیگ ' کا فارسی متن اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، ضمیمہ ، بابت فروری ۱۹۳۸ء میں شایع ہوا تھا -

ڈاکٹر زور مرحوم نے لکھا ہے کہ کامل مصنف ' قفر نامہ ' بھی تورانی الاصل تھا ، (تذکرہ اردو مخطوطات ، جلد اول ' ص ۱۰۸)

۱- ولی اللہ فرخ آبادی نے ایک اور شاعر متخلص بہ کامل کا ذکر کیا ہے جو ان دنوں فرخ آباد آئے تھے - منشی خدا بخش خاں کامل (م ۱۲۳۶ھ) نواب دلیر ہمت خاں مظفر جنگ (۱۱۸۵ھ - ۱۲۱۱ھ) کے زمانے میں فرخ آباد آئے - فارسی کے شاعر تھے (تاریخ فرخ آباد ، اردو ترجمہ ، ص ۲۰۲ ، ۲۰۳)

راقم کے خیال کے مطابق کامل نے تلاش روزگار کے لیے فرخ آباد کو ہجرت کی ہوگی ۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے فرخ آباد جاتے ہی پیشۂ تجارت اختیار کر لیا ۔ تجارت میں انہیں بہت فائدہ ہوا ۔ اور کچھ مدت کے بعد اچھا خاصا سرمایہ جمع کر لیا ۔ بیاض نگار لکھتا ہے :

'' در کسب تجارت مال فراوان جمع نمودہ ، فارغ البال گزران میکنند ''۔

اس بیان کی تصدیق ولی اللہ فرخ آبادی کی عبارت '' اچھے سوداگر تھے '' سے بھی ہوتی ہے (۱) ۔ لیکن بعد میں ان کے تجارتی حالات خراب ہو گئے اور پھر بڑی کس مپرسی کی حالت میں اپنی زندگی گزارتے رہے ۔ ' تاریخ فرخ آباد ' میں لکھا ہے :

'' انقلاب زمانہ سے فقر و فاقہ کی زندگی گزارنی پڑی '' ۔ (۲)

اس کے برعکس بیاض نگار نے ان کے مالی حالات خراب ہو جانے کا ذکر نہیں کیا ۔ ہو سکتا ہے کہ جب بیاض نگار نے ان کے حالات لکھے ، اس وقت ان کے مالی حالات ٹھیک ہوں اور بعد میں خراب ہو گئے ہوں جس کی طرف ولی اللہ فرخ آبادی نے اشارہ کیا ہے ۔

اس کے بعد بیاض نگار رقم طراز ہے :

''رشتۂ خویشی با نواب خان خانان نبیرۂ نواب محمد خان بنگش دارد''۔

معلوم ہوتا ہے کہ کامل کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہوگا اور فرخ آباد میں اس کی ابتدائی زندگی بھی بڑی آسودہ حال تھی ۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں وجوہ کی بنا پر اسے فرخ آباد کے حکمران خاندان سے قرابت ہو گئی ہو ۔

۱- تاریخ فرخ آباد ، اردو ترجمہ بہ عنوان '' عہد بنگش کی سیاسی ، علمی اور ثقافتی تاریخ '' ۔ ترجمہ حکیم شریف الزماں ، کراچی ، ۱۹۶۰ء ، ص ۱۱۴ ۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے ' تاریخ فرخ اباد ' کا وہ حصہ جو شعرائے فارسی پر مشتمل بہ عنوان ' تذکرۂ شعرائے فرخ آباد ' شایع کرایا تھا ۔ (رسالہ اردو ادب ، علی گڑھ ، بابت جولائی ۱۹۵۴ء)

۲- ایضاً ۔ ص ۱۱۴

نواب خان خاناں ، جن سے کامل کا ' رشتۂ خویشی' تھا ، نواب اکبر خان کے لڑکے تھے - موخر الذکر نواب محمد خان بنگش (م ۱۱۶۳ھ) کے پانچویں فرزند تھے - (۱) ۱۱۵۲ھ میں سکندر راؤ (ضلع علی گڑھ) کا معرکہ پیش آیا جس میں اکبر خان مارا گیا - نواب محمد خان بنگش کو اکبر خان کے مرنے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ تین روز تک وہ تکیے پر سر رکھ کر روتا رہا اور کھانا پینا بھی چھوڑ دیا (۲) - سکندر راؤ کے معرکے کے وقت اکبر خان نوجوان تھا ، اور تیز مزاج بھی - اس کے مزاج میں نہایت نخوت تھی - حالانکہ وہ منجھلا تھا لیکن اس پر بھی اپنے بڑے بھائی قائم خاں کو کبھی خیال میں نہیں لاتا تھا اور اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ محمد خاں بنگش کی موت کے بعد وہ اس کا جانشین ہوگا - (۳)

ولیم اروِن لکھتا ہے - ''اکبر خان ، یہ شخص سکندر راؤ میں مارا گیا - اس نے دو لڑکے چھوڑے ، کہتے ہیں کہ ان لڑکوں میں سے ایک خان خاناں خاں تھا جس کی لڑکی سعادت علی پسر نواب شجاع الدولہ وزیر نواب کو منسوب ہوئی تھی لیکن نواب احمد خاں نے شادی روک دی اور یہ کہا کہ جب تک لکھنؤ کے خاندان کی کوئی لڑکی میرے بیٹے محمود خاں کو نہ ملے گی تب تک خان خاناں کی لڑکی لکھنؤ نہ جائے گی '' - (۴)

۱- فرخ آباد کے متعلق تمام تاریخوں میں اکبر خاں کو نواب محمد خاں بنگش کا پانچواں لڑکا لکھا گیا ہے لیکن فرخ آباد گزٹ میں انھیں تیسرا فرزند لکھا گیا ہے -

District Gazetteers of theUnited Provinces Vol. IX (Farrukhabad). p 138.

۲- تاریخ فرخ آباد ، ولیم اروِن ، اردو ترجمہ از حسین بخش ، فتح گڑھ ۱۸۸۶ء ، ص ۱۲۶ - اروِن کی انگریزی کتاب کے لیے دیکھیے -

The Bangash Nawabs of Farrukhabad—A Chronicle (1713-1857) William Irvine. (Journal of the Asiatic Society of Bengal, 1878, pp. 259—283 and 1879, pp. 49—170).

۳- ایضاً - ص ۱۲۵ ، ۱۲۶ -

۴- ایضاً - ص ۱۰۲ ، ۱۰۳ -

نواب سعادت علی خاں (۱۲۱۲ھ - ۱۲۲۹ھ) کا سنہ ولادت ۱۱۷۰ھ ہے (۱) - اور نواب احمد خاں بنگش کی تاریخ وفات ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۰ھ ہے (۲) - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ واقعے ۱۱۸۰ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان ہوا ہوگا - لیکن یہ واقعہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ فرخ آباد اور اودھ کی معاصر تاریخی کتب اس واقعے کے متعلق خاموش ہیں (۳) - معلوم ہوتا ہے کہ ارون نے کسی زبانی روایت کو اپنی تاریخ میں لکھ دیا ہے، جیسا کہ '' کہتے ہیں'' کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے -

کالی رائے نے نواب اکبر خاں کا شجرہ نسب دیا ہے (۴) جو اگلے صفحے پر درج ہے :

اس کے بعد بیاض نگار نے کامل کے عادات و خصائل کے متعلق مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے :

'' مردے خوش اخلاق و متواضع و سلیم الطبع '' -

'' صاحب دیوان است '' کی عبارت کے بعد کامل کے تلمذ کے متعلق حسب ذیل عبارت درج ہے :

'' و خود را از شاگردان مرزا رفیع السودا می شمار یا مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری شاگرد (قائم) '' -

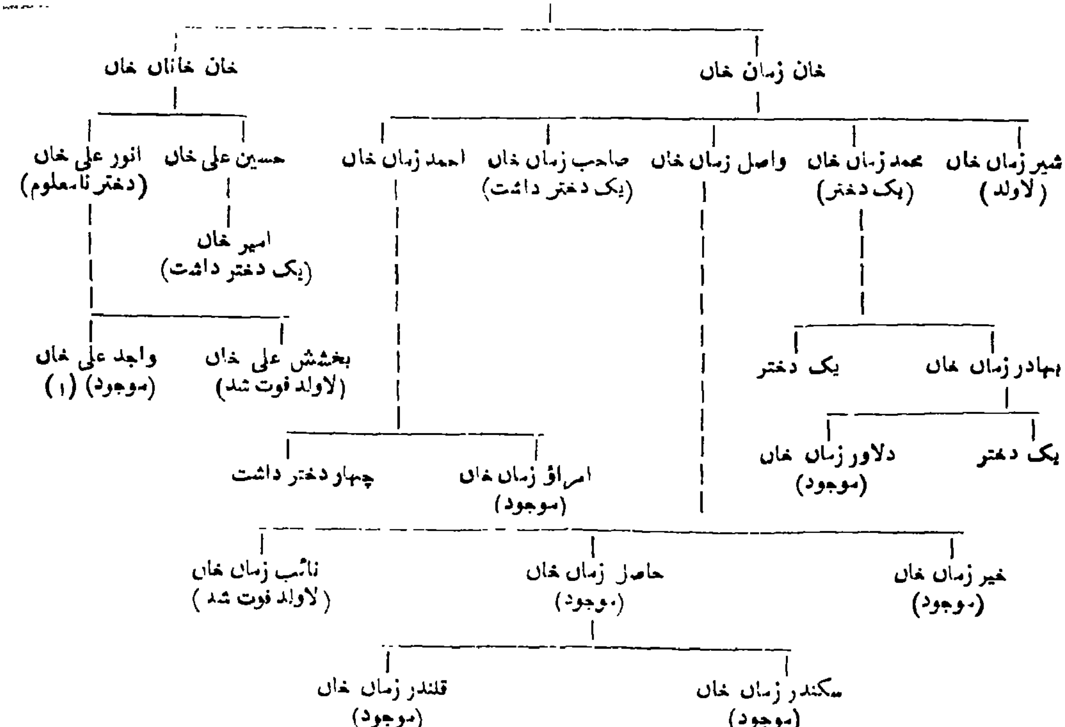
۱- تاریخ فرخ آباد ، ولی اللہ فرخ آبادی ، ص ۱۹۹

۲- تاریخ ضلع فرخ آباد ، پنڈت دیبی پرشاد ، الہ آباد ، ۱۸۵۹ء ، ص ۱۰ -

(۳) (i) Early life of Sa'dat Ali Khan. Ashirbadi Lal Srivastva. (Journal of the United Provinces Historical Society, 1933, pp. 56-80).

(ii) Proceedings of the Indian Historical Records Commission, 17 (1941), pp. 158-162.

۴- تواریخ ضلع فرخ آباد موسوم بہ فتح گڑھ نامہ - کالی رائے - ڈپٹی کلکٹر فرخ آباد - مطبوعہ در مطبع دھلی اردو اخبار ، دھلی- ۱۸۴۹ء - ص ۷۱ -


خان خانان خان
خان زمان خان
انور علی خان
(دختر نامعلوم)
حسین علی خان
امیر خان
(یک دختر داشت)
واجد علی خان
(موجود) (۱)
بخشش علی خان
(لاولد فوت شد)
احمد زمان خان
صاحب زمان خان
(یک دختر داشت)
واصل زمان خان
محمد زمان خان
(یک دختر)
شیر زمان خان
(لاولد)
یک دختر
بہادر زمان خان
دلاور زمان خان
(موجود)
یک دختر
چہار دختر داشت
اسراق زمان خان
(موجود)
نائب زمان خان
(لاولد فوت شد)
حاصل زمان خان
(موجود)
خیر زمان خان
(موجود)
قلندر زمان خان
(موجود)
سکندر زمان خان
(موجود)

کامل کا شوق رامپوری سے تلمذ تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ نثار احمد فارو[قی]
نے شوق کے تلامذہ اور احباب کی ایک طویل فہرست دی ہے (۱)
لیکن ان میں کامل تخلص کے کسی شاعر کا ذکر موجود نہیں ہے۔ علاوہ از[یں]
شوق نے خود اپنے تذکرہ "طبقات الشعرا" میں بھی کہیں ذکر نہ[یں]
کیا۔ بیاض نگار نے شوق رامپوری کو قائم چاند پوری کا شاگرد بھی لکھ د[یا]
ہے لیکن سوالیہ نشان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو خود بھ[ی]
اس کے متعلق شک ہے۔ بیاض کے ورق ۳۳ الف پر پنسل سے یہ عبارت در[ج]
ہے جو بعد کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

"مرزا آدینہ بیگ شاگرد سودا و قائم"۔

اقتدا حسن نے تلامذہ قائم چاند پوری کی ایک طویل فہرست دی ہے (۲) لیکن اس میں کامل تخلص کے کسی شاگرد کا ذکر موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس مرزا آدینہ بیگ کامل کا سودا کا شاگرد ہونا تصدیق شدہ بات ہے۔ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بیاض نگار نے بھی لکھا ہے کہ وہ (کامل) خود کو سودا کے تلامذہ میں شمار کرتے تھے۔ علاوہ ازیں راقم کو کامل کا جو کلام دستیاب ہوا ہے، اس کی غزل ۹ کے مقطع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سودا کو اپنا استاد سمجھتے تھے:

سودا کو تیرے شعر خوش آتے ہیں کاملا
لے جا تو کہہ کے ریختہ استاد کی طرف

ڈاکٹر خلیق انجم نے چھبیس تلامذہ سودا کا ذکر کیا ہے (۳) لیکن کامل کا حال درج نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کامل، سودا کے کہاں اور کب شاگرد ہوئے؟ راقم کے خیال کے مطابق کامل نے فرخ آباد میں سودا کی

۱۔ طبقات الشعرا، شوق رامپوری، مرتبہ نثار احمد فاروقی، لاہور، ۱۹۶۷ء، مقدمہ، ص ۳۰ تا ۳۳۔

۲۔ کلیات قائم، مرتبہ اقتدا حسن، لاہور، ۱۹۶۵ء، مقدمہ، جلد اول، ص ۶۶ تا ۷۱۔

۳۔ مرزا محمد رفیع سودا، ڈاکٹر خلیق انجم، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۵۷۳ تا ۶۲۷۔

شاگردی اختیار کی ہوگی ۔ ولی اللہ فرخ آبادی لکھتے ہیں کہ فرخ آباد کے '' اس زمانے کے شعرا ان کو (سودا کو) اپنا استاد مانتے تھے '' (۱) ۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ جب سودا فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند کے ہاں قیام پذیر تھے ، اس وقت کامل ، سودا کے شاگرد ہوئے ہوں ۔ سودا کے قیام فرخ آباد کے متعلق اختلاف ہے (۲) ۔ لیکن یہ مصدقہ بات ہے کہ سودا ۱۱۷۶ھ

۱۔ تاریخ فرخ آباد ، ص ۳۸۷ ۔

۲۔ مرزا سودا نواب احمد خاں بنگش کے عہد (۱۱۶۳ھ ۔ ۱۱۸۵ھ) میں فرخ آباد آئے (تاریخ فرخ آباد ، ص ۳۸۷)

سال آمد فرخ آباد	سال روانگی فرخ آباد	
۱۱۶۷ھ	۱۱۸۴ھ	سودا ، شیخ چاند ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۳۶ء ، ص ۵۰ ، ۵۲ ، ۵۵ ، ۵۶ ۔
۱۱۷۰ھ	۱۱۸۳ھ	اورینٹل کالج میگزین : ''تنقید بر آب حیات'' حافظ محمود شیرانی ، نومبر ۱۹۳۱ء ، ص ۷۸ ۔
۱۱۷۹ھ		میر حسن اوران کا زمانہ ، ڈاکٹر وحید قریشی ، لاہور ، ۱۹۵۹ء ، ص ۱۴۶ ۔
۱۱۷۳ھ	۱۱۸۴ھ	معاصر ، پٹنہ ، حصہ ۱۰ ، نومبر ۱۹۵۹ء ، مقالہ از قاضی عبدالودود ۔
۱۱۷۴ھ - ۱۱۷۶ھ کے درمیان	۱۱۸۳ھ - ۱۱۸۵ھ کے درمیان	مرزا محمد رفیع سودا ، خلیق انجم ، علی گڑھ ۱۹۶۶ء ، ص ۱۱۳ تا ص ۱۲۰ ۔
۱۱۷۰ھ	۱۱۸۴ھ	صحیفہ ، لاہور ، جولائی ۱۹۶۸ء ، حیات سودا ، کتاب علی خاں فائق ص ۱۲۴ ۔

میں فرخ آباد میں موجود تھے اور اوائل ۱۱۸۰ھ میں فرخ آباد سے فیض آباد چلے گئے تھے - اسی عرصے میں کامل ، سودا کے شاگرد ہوئے ہوں گے -

کامل کے تلمذ کے متعلق بیاض نگار کی مندرجہ ذیل عبارت بھی اہم ہے :

''از دیوان معلوم می باشد کہ ابتداء درایں فن از شیخ ظہورالدین حاتم اصلاح گرفتہ'' -

مذکورہ بیان کی تصدیق کے لیے کامل کے دستیاب شدہ کلام کی غزل نمبر ۲۲ کا یہ مقطع پیش کیا جا سکتا ہے :

آستاں اوس کے پہ سرکیوں نہ رکھوں اے کامل
ہے سخن یوں مرے حاتم کی نظر کا تکیہ

ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم (۱) اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (۲) نے تلامذۂ حاتم کے تفصیلی حالات لکھے ہیں لیکن ان میں کامل کا ذکر موجود نہیں - چوں کہ حاتم کا فرخ آباد جانا ثابت نہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ کامل نے دہلی جا کر حاتم سے اصلاح لی ہو یا باقاعدہ شاگردی اختیار کی ہو - لیکن بیاض نگار کی مذکورہ بالا عبارت کے پیش نظر یہ کامل کی شعر گوئی کے ابتدائی زمانے کی بات ہے -

کامل کا سنہ وفات معلوم نہیں ہو سکا - لیکن ولی اللہ فرخ آبادی (۱۱۶۵ھ - ۱۲۴۹ھ) نے لکھا ہے کہ '' کامل فوت ہو چکے ہیں '' - (۳) چونکہ ' تاریخ فرخ آباد ' کا سنہ اختتام ۱۲۳۵ھ ہے ، اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کامل ۱۲۳۵ھ سے قبل وفات پا چکے تھے - (۴)

۱- سرگذشت حاتم ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۴۴ء ، ص ۶۵ تا ۷۵

۲- شاہ حاتم اور ان کا کلام ، لاہور ، ص ۳۸ ، ۳۹

۳- تاریخ فرخ آباد ، ص ۳۱۱

۴- ' تاریخ فرخ آباد ' ۱۲۳۲ھ میں لکھنی شروع ہوئی اور ۱۲۳۵ھ میں مکمل ہوئی۔ لیکن اس سنہ کے بعد بھی اضافے ہوتے رہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ، دیباچہ تاریخ فرخ آباد ، محمد ایوب قادری ، ص ۲۷)

اگر کامل کے دستیاب شدہ کلام کا بنظر غور مطالعہ کیا جائے تو وہ کوئی اعلیٰ درجہ کا شاعر نظر نہیں آتا بلکہ ایک درمیانہ درجے کا شاعر معلوم ہوتا ہے - اس کے باوجود اس کے کلام کی بعض خوبیاں قابل توجہ ہیں - مندرجہ ذیل اشعار سے کامل کے مذہبی اعتقاد کے متعلق کچھ روشنی پڑتی ہے :

یا مرتضیٰ علی رضا نہیں تجھ بن کوئی مرا
دیکھوں ہوں اس لیے تری امداد کی طرف

طلب کر مدعا اپنے کو کامل شاہ مرداں سے
کسی کو پھرتا دیکھا اس کے در سے ہم نے کم خالی

شاعرانہ تعلی کے متعلق چند اشعار حسب ذیل ہیں :

کیوں نہ کامل ریختے تیرے کو سن تحسین کریں
سمجھے ہیں اشعار کو تیرے تو اب الہام ہم

اس غزل اپنی کو کامل کس کے آگے ہم پڑھیں
اب نہ سعدی ہے نہ خاقانی نہ پیرطوس ہے
ہوتا اس عہد میں جیتا تو یقیں ہے مجھ کو
سنتا کامل کے یہ اشعار فغانی جانی

کامل کا دور سیاسی اعتبار سے پر آشوب دور تھا - سیاسی ابتری اور معاشی بدحالی کا اثر اس وقت کی معاشرت پر بھی ہوا - اور اس دور کے روایتی طبقاتی نظام میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ، ان کا اظہار اس دور کے شعرا کے شہر آشوبوں میں ملتا ہے - اس ضمن میں کامل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے :

کسی کے کوئی کام آتا نہیں ہے
عجب طرح کا اب زمانا ہوا ہے

چمن زمانہ کا رنگ و بو تو نہ پوچھ ہر گھڑی کاملا
جہاں عیش کرتے تھے بیٹھ کر وہاں ہم نے دیکھا تو داغ ہے

بیرونی حملہ آوروں کی لگاتار یورشوں کی وجہ سے لوگوں میں ایک قسم کی بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی جو منفی انداز فکر اختیار کرنے کے بعد دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کی صورت میں ظاہر ہوئی - کامل کا یہ قطعہ دیکھیے :

کل میں عزرائیل سے پوچھا گذشتوں کا جو حال
کہنے لاگا اُن کے غم سے دل مرا مایوس ہے

لے گیا ساتھ اپنے مجھ کو ایسے گورستان میں
گور پر جن کی کبھو نے شمع نے فانوس ہے

ایک اک کا نام لے کر پھر لگا کہنے مجھے
یہ فریدوں ہے یہ کیخسرو ہے یہ شاہ روس ہے

یا تو وہ جاہ و حشم تھا ان کا ہر روئے زمیں
یا تن نازک کا ان کے خاک اب ملبوس ہے

اسی مضمون کے متعلق میر تقی میر کا مندرجہ ذیل قطعہ ملاحظہ فرمائیے -

کل پاؤں ایک کاسہء سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

کامل کی شاعری کی لسانی خصوصیات وہی ہیں جو اس دور کے دیگر شعرا کی ہیں - چند صرفی اور نحوی خصوصیات حسب ذیل ہیں :

۱- حرف علامت ' نے ' کو حذف کر دیا گیا ہے - مثلاً میں پوچھا بجائے میں نے پوچھا - اسی طرح ' کے ' اور ' کر ' کو بھی حذف کر دیا گیا ہے - مثلاً کس پاس بجائے کس کے پاس - اور مسکرا بجائے مسکرا کر -

۲- ' و ' کا اضافہ ہر جگہ موجود ہے - مثلاً آنا کی جگہ آونا - پانا کی جگہ پاونا -

۳- فارسی اور ہندی الفاظ ملا کر متعدد تراکیب بنائی گئی ہیں ، مثلاً آھو نین - آبرو کے ہاں کحل نین اور خوش نین کی تراکیب استعمال ہوئی ہیں -

۴۔ تکرار الفاظ کی صورت میں دونوں لفظوں کے درمیان 'بہ' استعمال کی ہے۔ مثلاً گھر بگھر۔ دکنی زبان میں عموماً 'ے' کا استعمال زیادہ ہوا ہے مثلاً گھرے گھر۔

کامل کا دور مرزا مظہر اور حاتم کی اصلاحی تحریک (لسانی اعتبار سے) سے پہلے کا دور معلوم ہوتا ہے جیسا کہ متروکات کی مندرجہ ذیل فہرست سے ظاہر ہوتا ہے۔

ٹک = ذرا	کبھو = کبھی
جیدھر = جدھر	کیدھر = کدھر
ایدھر = ادھر	اودھر = ادھر
جنے = جس نے	نمط = مثل ، طرح
لادھڑک = بے دھڑک	سیتی = سے
کنے = سے ، پاس	اونے = اس نے یا ان نے
لتیئں = کو	لاگا = لگا
جگ = دنیا	لیک = لیکن
سروار = تلوار	جدی = جدا
جپنا = پڑھنا	

اب کامل کا وہ تمام کلام پیش کیا جاتا ہے جو محولہ بالا بیاض میں ہے۔

ترا مصحف رو ہے ایمان سب کا
ترا چاہنا ہے دل و جان سب کا (ورق ۱۳۳ الف)

نہ دیکھا کسی نے تجھے یار دلخواہ
رہا جی میں اپنے یہ ارمان سب کا

نہ جا گھر میں ہر یک کے شب کو تو مہ رو
نہ لے اپنے سر پر تو احسان سب کا

صنم تیری خاطر سے ، ٹک منصفی کر
بجا لاتا ہوں میں یہ فرمان سب کا

رہا کب مرے گھر میں وہ شب کو مہماں
عبث ہے مجھ اوپر یہ بہتاں سب کا
مرے پیدا کرنے کی ہے لاج تجھ کو
کہ ہے تو الٰہی نگہباں سب کا
سنا دوستوں کو غزل اپنی کامل
طرف تیرے شعروں کے ہے کان سب کا

گو کہ وہ سرو گل اندام ہمیں بھول گیا
لیکن اس کا نہ کبھو نام ہمیں بھول گیا
دوستو پوچھو ہو کیا ہر گھڑی دن کا احوال
رہا غیروں کے وہ تا شام ہمیں بھول گیا
گئے اس شوخ سے کہنے کو یہ لیکن صد حیف
اپنے مطلب کا جو تھا کام ہمیں بھول گیا
روز و شب بت کی پرستش میں ہیں دل سے سرگرم
زاہدا تیرا تو اسلام ہمیں بھول گیا
کیا توقع رکھیں پھر تجھ سے جو تو نے کل رات
کیا عشرت کا سرانجام ہمیں بھول گیا
دل تو رہتا ہے سدا ہاتھ سے غم کے بے چین
تیری فرقت میں تو آرام ہمیں بھول گیا
شکوہ طالع سے نہ اب کیجیے کیوں کر کامل
دل سے اپنے جو دلآرام ہمیں بھول گیا (۱۳۳)

دل دیکھ ستمگر کا بیداد بہت رویا
وہ اگلی محبت کو کر یاد بہت رویا
جب صحن گلستاں سے تو گھر کو گیا درو
کر یاد تیرے قد کو شمشاد بہت رویا

دیکھا جو تجھے جانی اغیار کی محفل میں
اس وقت یہ دل کر کے فریاد بہت رویا
جس دم میں لگا پڑھنے دیوان محبت کا
تعلیم مجھے دے کر استاد بہت رویا
پتھر پہ وہ شیریں کی جب کھود چکا صورت
چھاتی سے لگا اس کو فرہاد بہت رویا
جب جوش جنوں سے دل بیتاب لگا ہونے
نشتر کو لگا رگ پر فصاد بہت رویا
آیا تھا ...... پیکر کل اس کے جو ملنے کو
کر گوش وہ کامل کا روداد بہت رویا

اٹھ کے یہاں سے جس گھڑی وہ نازنیں جاتا رہا
دل بھی پہلو سے مرے اندوہگیں جاتا رہا
ساتھ غیروں کے وہ ہم آغوش تھا کل دوستو
پر مجھے دیکھا تو ہو کر شرمگیں جاتا رہا
بادہ نوشی میں وہ تھا مشغول لیکن مجھ کو دیکھ
پھینک کر ساغر کو بر روئے زمیں جاتا رہا
ایک مدت سے نہیں پاتا جو میں اس کا سراغ
ہمدموں کیدھر مرا وہ مہ جبیں جاتا رہا
نالہ کرتا ہے جو تو ہر روز ہو کر بیقرار
دل ربا تیرا مگر اے دل کہیں جاتا رہا
اپنے دل کو اب تنک اے دوستو آرام تھا
دیکھتے ہی ماہ طلعت کو وہیں جاتا رہا (۱۳۷ الف)
ہر طرف پھرتا ہے تو کامل جو گھبرایا ہوا
سچ بتا کدھر ترا وہ ہم نشیں جاتا رہا

آتش عشق سے دل کا نہ فقط خانہ جلا
لے کے میخانے سے تا بادہ و پیمانہ جلا
ماہ رو شب کو تری بزم میں اغیار کو دیکھ
شمع روتی رہی اور رشک سے پروانہ جلا
پھونک دی آگ خدا جانے یہ کس کافر نے
برھمن جا کے خبر لے ترا بت خانہ جلا
دل بتاں کا بھی نہیں عشق سے خالی شاید
خود بخود آتش غم سے جو صنم خانہ جلا
خس کو بھی دیکھا ترے عشق میں یاں تک مصروف
رقص کرتا ہوا وہ آگ میں مستانہ جلا
جل کے میں آتش حرماں سے ہوا خاکستر
دل ترا میرے لیے حیف نہ جانانہ جلا
ذوفنوں اہل خرد سمجھے ہیں اس کو کامل
شعلۂ عشق سے دل جس کا کہ مردانہ جلا

کر گذارا لطف سے ....دلربا ہر سو کیا
پر ترے در کے سوا ہم نے نہ ہرگز رو کیا
پوچھتا کیا ہے شب ہجراں کا مجھ سے ماجرا
درد و غم نے مجھ کو اپنا یار ہم زانو کیا
کون سی بلبل کے خوں سے یہ بھرا تھا باغباں
دامن گل کو جو شب شبنم نے شست و شو کیا
ہاتھ میں اپنے نہیں لیتا ہے وہ مشک ختن
جعد مشکیں کو ترے یک بار جن نے بو کیا
بارہا میں نے کہا شب کو کہیں جایا نہ کر
گوش میں میرا سخن ہرگز نہ ... سہ رو کیا (۱۳۴ ب

کیوں خبر لیتا نہیں میری تو اے عیسیٰ نفس
عشق کی تپ نے جو میرا جسم مثل مو کیا
گفتگو کامل سے تو ایسی کبھو کرتا نہ تھا
سچ بتا کس نے تجھے اے بے وفا بدخو کیا

کام آیا نہ مرے دیدۂ زار آخرکار
دوست دشمن میں کیا اس نے ھی خوار آخرکار
مرغ دل میں نے جو پالا تھا بصد خون جگر
وہ بھی اب آ کے ہوا تیرا شکار آخرکار
بارہا ہم نے پریرو کو لکھا تھا نامہ
نہ کیا اس نے پر ادھر کو گذار آخرکار
دولت حسن پہ اپنی نہ کرو بدمستی
جاوداں اس کا رہے گا نہ خمار آخرکار
راستی اپنی پہ دل گو کہ کسی کا نہ جلا
آپ سے ہم تو جلے مثل چنار آخرکار
اس کی دوری میں یہ دل لالہ نمط داغ ہوا
پر نہ آیا وہ ادھر رشک بہار آخرکار
ناوک غمزہ سے کہتے تھے حذر کر کامل
کس کے سینے سے ہوا کھینچ تو یہ پار آخرکار

تجھ (۱) کو جس دن سے نہیں ہے بادہ خواری سے فراغ
ایک دم پاتے نہیں ہم آہ وزاری سے فراغ
شمع ساں دوری میں تیری ایک شب اے ماہ رو
دیدۂ تر کو نہیں ہے اشک باری سے فراغ

۱- یہ غزل بیاض میں موجود نہیں ہے بلکہ ولی اللہ فرخ آبادی نے اپنی ' تاریخ فرخ آباد ' میں کامل کے نمونۂ کلام کے طور پر درج کی ہے۔

مضطرب رہنے سے اس کے سخت ہے مجھ پر عذاب
کا شکے پاوے مرا دل بے قراری سے فراغ
ہمدمو ! یاں سے گیا ہے جب سے وہ وعدہ خلاف
ہم کو اک لحظہ نہیں ہے انتظاری سے فراغ
یار بن نالے سے اس کو ایک دم فرصت نہیں
کیوں نہ پاؤں اپنے دل کی غم گساری سے فراغ
خویش و بیگانوں کی کب اس طرح کی باتیں سہیں
چشم گریاں کو جو ہووے اشک باری سے فراغ
اس کے طالع کے برابر نیک ہیں کس کے نصیب
ایک دم جی کو نہیں صحبت تمہاری سے فراغ
ہو گیا جس روز سے کامل مرا بیدار بخت
ایک شب مجھ کو نہیں اختر شماری سے فراغ

— — —

راغب ہے طبع کیوں تری بیداد کی طرف
ٹک دیکھ دلربا دل ناشاد کی طرف
کہتا نہیں میں یہ نہ سنو تم کسی کی بات
پر گوش کیجیے مری فریاد کی طرف
اے چشم تر نہ اتنا بہا سیل اشک تو
ٹک دیکھ اپنے خانے کی بنیاد کی طرف
تیشے سے سر کو چیرتا اپنے نہ کوہکن
شیریں جو دیکھتی کبھی فرہاد کی طرف (۱۳۰ الف)
اے مرغ دل قضا نے تجھے گھیرا ہے مگر
جاتا ہے لا دھڑک جو تو صیاد کی طرف
یا مرتضیٰ علی رضا نہیں تجھ بن کوئی مرا
دیکھوں ہوں اس لیے تری امداد کی طرف

سودا کو تیرے شعر خوش آتے ہیں کا ملا
لے جا تو کہہ کے ریختہ استاد کی طرف

کچھ اس کے جی کا بھید میں پایا نہ اب تلک
آنے کو کہہ گیا تھا پہ آیا نہ اب تلک
بھیجا تھا حال زار اسے لکھ کے میں نے آہ!
قاصد جواب نامے کا لایا نہ اب تلک
گو مجھ پہ تو نے جور و ستم تند خو کیا
میں تجھ سے دل کا راز چھپایا نہ اب تلک
دیدار کو ترستے رہے ہم تو ساری عمر
پر برقع تو نے منہ سے اٹھایا نہ اب تلک
مدت سے ہم تو بیٹھے ہیں ساقی پہ جام بے
افسوس ہے کہ تو نے پلایا نہ اب تلک
رو رو کے چشم تر نے تو عالم بہا دیا
قسمت کے پر لکھے کو مٹایا نہ اب تلک
کامل تو زندگی سے مگر ہاتھ دھو چکا
جو زخم دل کو تو نے سلایا نہ اب تلک

دوستی رکھتا ہے ہم سے وہ ...... کام کم
لطف سے ہرگز نہیں بیٹھے ہے سیم اندام دم
کاٹیے اوقات اپنے .... کس طرح
بھیجے ہے اس بیوفا کا نت مجھے پیغام غم
جب سے وہ آہوئین مجھ سے جدا ہو کر گیا
اس دل محزوں سے کرتا ہے سدا آرام رم (۱۳۵ ب)

زہد و تقویٰ کو ترے خاطر میں وہ لاتا نہیں
زاہدا پشت اپنی مت کر از خیال خام خم
نقد دل دے کر اسے اپنے سے پھر راضی کروں
بادہ گر مجھ کو پلا دے ساقیٔ گلفام فم
واعظا ! آئین دیں داری نہ سکھلا اس کو تو
برہمن زادے کے حق میں ہے ترا اسلام لم
کیوں نہ کامل ریختے تیرے کو سن تحسیں کریں
سمجھے ہیں اشعار کو تیرے تو اب الہام ہم

کہنے نہ پائے دل کی ہم اپنے ہوس تمام
ملک عدم کو آہ گئے ہم نفس تمام
دود جگر سے کیونکہ نہ آوے حذر مجھے
شعلہ سے اس کے یارو جلے خار و خس تمام
اچھا حرص زر کا ذائقہ کم شہد سے نہیں
پابند اس میں ہم ہیں جو مثل مگس تمام
ماتم سرا سے کم نہیں صیاد کا بھی گھر
ٹوٹے پڑے ہوئے ہیں جو اس کے قفس تمام
دکھ اپنے دل کا کس سے کہیں ہم بجز خدا
ہیں سنگدل جو دہر کے فریاد رس تمام
اب تک نہ آیا پاس ہمارے وہ ماہرو
گذرا یہ انتظاری میں اس کی برس تمام
کامل تری یہ تازہ غزل ہم تو سن چکے
کر قصد ہرزہ گوئی کا اے بوالہوس تمام

چلنے کا کرتا ہے تو عزم اودھر دمبدم
ہوتا ہوں بیتاب میں غم سے ایدھر دمبدم
روتے ہیں از بسکہ یہ دیدۂ تر دمبدم
ٹپکے ہے آنکھوں کی راہ خون جگر دمبدم (۱۳۶ الف)
امڈی ہے کالی گھٹا اس گھڑی کیا ساقیا
جام پلا تو ہمیں بادہ سے بھر دمبدم
دختر رز پر بہ دل کب سے ہے مفتوں میرا
ہم سے یہاں تو ... اس کو نہ کر دمبدم
عیش کا اسباب سب تیرے لیے ہے تیار
قصد کہیں کا نہ کر رشک قمر دمبدم
اٹکا نہیں ان دنوں تیرا اگر دل کہیں
باندھے ہے کیوں بے وفا اپنی کمر دمبدم
سیکھا نہیں تند خو ڈھنگ نئے تو ....
ہاتھ میں لیتا ہے کیوں تیغ و سپر دمبدم
آگے میں تھا ناتواں تسپہ ترے ہجر میں
ہوتی ہے حالت مری غم سے بتر دمبدم
جب سے میں کامل تجھے دیکھتا ہوں بیقرار
عشق سے آتا ہے نت مجھ کو حذر دمبدم

سیر کرائے چمن کی غنچہ دہن　　　　پھر نہ یہ پھول ہیں نہ یہ گلشن
جتنا چاہے مجھے ستا لیکن　　　　چھوڑوں گا میں ترا نہیں دامن
دلبروں سے نہ ہم ملیں یارو　　　　مدعی ہے یہ یہ دل دشمن
نوجواں پر ہے دل مرا شیدا　　　　مجھ کو ساقی پلا شراب کہن
جب سے تیری گلی میں رہتے ہیں　　　　ہے فراموش دل سے حب وطن

میں بتوں سے ملوں گا تو ناصح   مثل شیطاں نہ ہو مرا رہزن
(۱۳۶ ب)
۳آتش عشق سے مرا شب و روز   دھکے ہے دل بغل میں جوں گلخن
کس طرف کو چلا ہے اے غم خوار   گرش کامل کا کر تو در سخن

تجھے جس گھڑی اے صنم دیکھتے ہیں
تو اندوہ و غم دل پہ کم دیکھتے ہیں
کسی نے کبھی آکے دیکھا نہ ہوگا
جو کچھ عہد میں تیرے ہم دیکھتے ہیں
گلی میں تری جب کہ آتے ہیں عاشق
تماشائے باغ ارم دیکھتے ہیں
جفا کے سزاوار اک ہم ہیں ورنہ
ترا یار سب پر کرم دیکھتے ہیں
ترے ہاتھ میں تیغ جس وقت ظالم (قطعہ)
ہم آنکھوں سے اپنی علم دیکھتے ہیں
بقیں جان اس وقت و اللہ باللہ
نہ قالب میں پھر اپنے دم دیکھتے ہیں
ستایا ہے تو نے مگر اس کو ظالم
جو کامل کو تجھ پاس کم دیکھتے ہیں

سدا اس صنم کا پرستار میں ہوں
نہ حور و پری کا طلب گار میں ہوں
کسے پوچھتا ہے کہ ہے کون زخمی
ادھر دیکھ بے مہر افگار میں ہوں
مجھے مے کے پینے کی حاجت نہیں ہے
سدا چشم میگوں سے سرشار میں ہوں

مرے پاس کا ہے کو آتا نہیں ہے
نہ تو لالچی ہے نہ زردار میں ہوں (۱۳۷ الف)
تجھے یاد کرتا ہوں ہر آن گاہو
سمجھیو نہ ہرگز کہ بیکار میں ہوں
وہ بے مہر جس دن سے گھر کو گیا ہے
نہ حالت سے اپنی خبردار میں ہوں
میں پوچھا کہ ہے تجھ کو کس سے محبت
لگا کہنے کامل ترا یار میں ہوں

مغرور مال و جاہ پہ مت تو امیر ہو
لاکھوں گئے ہیں شاہ جہاں سے فقیر ہو
پرسش تو اس کی حشر میں یا رب نہ کیجیو
سرزد اگر مرے سے گناہ کبیر ہو
رکھتا ہے مے کا پینا تو اس وقت کیفیت
موسم ہو گل کا اور سحاب مطیر ہو
ملنے نہ دوں رقیب سے اس کو میں زینہار
میرا کہا جو یار کو کچھ بھی پذیر ہو
کیونکر نہ بوجھو بات مرے دل کی شیخ جی
میں جانتا ہوں تم کو کہ روشن ضمیر ہو
کرتا نہیں ہے گوش وہ ہرگز کسی کی بات
کامل کا ناصحا نہ کبھو تو مشیر ہو

مت مصاحب کر تو اپنا اے نگار آئینے کو
اس قدر دیکھا نہ کر لیل و نہار آئینے کو
جی میں آتا ہے کروں پتھر سے اس کو پاش پاش
تجھ سے جب ہوتے میں دیکھوں ہوں دو چار آئینے کو

جس نے دیکھا ہو ترا دلدار روئے با صفا
کیونکہ لیوے ہاتھ میں وہ خاکسار آئینے کو
خط نے چہرے کو ترے اس طرح بے رونق کیا
بے ضیا کرتا ہے جوں دلبر غبار آئینے کو (۱۳۷ ب)
رکھ دیا ہے دیکھ کر جس دن سے تو نے ہاتھ سے
تب سے ہے بے مہر تیرا انتظار آئینے کو
باز آ تو دمبدم کے دیکھنے سے ورنہ یار
پل میں کر ڈالیں گے ہم پھر سنگسار آئینے کو
ہوتا ہے کامل کا دل محزون اس کو دیکھ کر
ہر گھڑی دیکھا نہ کر تو گلعذار آئینے کو

پھرتے ہیں تیرے مبتلا خانہ بہ خانہ کو بہ کو
ڈھونڈے ہیں تجھ کو دلربا خانہ بہ خانہ کو بہ کو
وصف ترا اہ ایک میں کرتا پھروں ہوں روز و شب
ہوتی ہے تیری نت ثنا خانہ بہ خانہ کو بہ کو
آیا نظر نہ تو ہمیں ایک مکاں میں ماہرو
ڈھونڈ پھرا میں بارہا خانہ بہ خانہ کو بہ کو
میرے سے تجھ کو کس طرح ہووے صنم موافقت
ہیں گے جو تیرے آشنا خانہ بہ خانہ کو بہ کو
کرتا نہیں ہے بیوفا گوش تو ہی غرور سے
سمجھے ہیں میرا مدعا خانہ بہ خانہ کو بہ کو
شمس و قمر کی طرح نت تیرا مکاں نہیں ہے ایک
پھرتا ہے تو تو بیوفا خانہ بہ خانہ کو بہ کو
ہووے خدا کرے صنم کامل اوپر تو مہرباں
مانگے ہیں دل سے یہ دعا خانہ بہ خانہ کو بہ کو

امڈی ہے اس گھڑی گھٹا تازہ بہ تازہ نو بہ نو
بادہ پلا تو ساقیا تازہ بہ تازہ نو بہ نو
ملنے کو اپنے یار کے جاؤں میں کیونکہ دوستاں
مجھ پہ کرے ہے وہ جفا تازہ بہ تازہ نو بہ نو
تیرے سوا کسی سے میں رکھتا نہیں ہوں کچھ غرض
بوسہ دے مجھ کو دلربا تازہ بہ تازہ نو بہ نو (۳۸ ، الف)
حال مرا تو مہ جبیں گوش کرے جو لطف سے
تجھ سے کہوں میں ماجرا تازہ بہ تازہ نو بہ نو
ساز کو اپنے مطربا کرکے درست اس گھڑی
ریختہ میرا تو بجا تازہ بہ تازہ نو بہ نو
شکوہ ترا کسی سے میں آج تلک نہیں کیا
گالی نہ دے تو بیوفا تازہ بہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو
کامل دل شکستہ سے یار تو مل کہ ہر سحر
دیتا ہے تجھ کو وہ دعا تازہ بہ تازہ نو بہ نو

بزم رنداں میں عجب جلوہ کناں ہے شیشہ
باعث عیش دل غمزدگاں ہے شیشہ
اس کی نظروں میں ہے جو کرتے ہو تم بدمستی
پاس خاطر کے لیے پنبہ دہاں ہے شیشہ
کیوں تو میخانے میں بے مہر نہیں جاتا ہے
تیری دوری میں سدا اشک فشاں ہے شیشہ
شور قلقل نہیں اے بادہ کشاں مینا میں
شیخ کی ریش پہ نت خندہ زناں ہے شیشہ
شیخ جی نے جو کیا دختر رز سے اب عقد
اس خوشی سیتی یہاں رقص کناں ہے شیشہ

محتسب سے کی نہ کر میرے کنے بد گوئی
محرم راز دل پیر و جوان ہے شیشہ

کل گلستاں میں ملا مجھ کو جو وہ بادہ فروش (قطعہ)
میں نے پوچھا کہ ترے پاس یہاں ہے شیشہ
سن کے تب اوس نے کہا تم کو اگر خواہش ہے
مے کے پینے کی ، مرے پاس بھی ہاں ہے شیشہ (۱۳۸ ب)
مانگا جب میں نے کہا خیر ہے تجھ کو کامل
میں تو ہنستا ہوں مرے پاس کہاں ہے شیشہ

لاؤں کس جا سے ترے واسطے بر کا تکیہ
میرے زانو کو تو کر اپنی کمر کا تکیہ
گو کہ زر بفت کا ہے صاحب زر کا تکیہ
ہے فقیروں کے لیے خشت و حجر کا تکیہ
رشک گلزار نہ ہو کیونکہ اب اس کا بستر
برگ گل سے ہے جو اس رشک قمر کا تکیہ
مفلسوں کو نہیں ممکن ہے پروں کا بالش
اہل دولت کی بہ زینت ہے کمر کا تکیہ
رکھ کے کہنی مری کہنی پہ خوشی سے وہ شوخ
بولا پہلو سے تو اب تو مرے سر کا تکیہ
راہرو کو نہیں درکار سفر میں بالش
ہر جگہ اس کو میسر ہے حجر کا تکیہ
آستاں اس کے پہ سر کیوں نہ رکھوں میں کامل
ہے سخن کوں مرے حاتم کی نظر کا تکیہ

گلی میں تری جس کا آنا ہوا ہے
کٹھن پھر اسے گھر کو جانا ہوا ہے

رہوں شاد کیونکر کہ قسمت میں اپنی
ازل سے بھی غم کا کھانا ہوا ہے
کسی کے کوئی کام آتا نہیں ہے
عجب طرح کا اب زمانا ہوا ہے (۱۳۹ ا ص)
بلائیں جو زلفوں کی لیتا ہے ہردم
میری جان کا دشمن یہ شانا ہوا ہے
نہیں ہے پریرو کو پروا کسی کی
تو کیوں اس پہ اے دل دوانا ہوا ہے
وہ ایدھر نہ آئے گا میں جانتا ہوں
اسے گھر کا جانا بہانا ہوا ہے
ترا کیا بگاڑا ہے ہم نے ستمگر
جو منظور تجھ کو ستانا ہوا ہے
مرا ریختہ سن کے اس بت نے کامل
کہا خوب تجھ سے فسانا ہوا ہے

گو خفا مجھ سے تندخو تو ہے
پر مرے دل کی آرزو تو ہے
جب تصور میں دل میں کرتا ہوں
ہر زماں میرے روبرو تو ہے
مہر سے یہ سخن ہے روشن تر
کہ میں ذرہ ہوں ماہ رو تو ہے
نام یوسف کا ہم تو سنتے تھے
جب کہ دیکھا تو ہو بہو تو ہے
فہم انساں تجھے نہیں بھاتا
لامکاں میں مقام ہو تو ہے

نہیں خالی کوئی مکاں تجھ سے
گھر بگھر اور ہر ایک سو تو ہے
کیوں نہ گارو تجھے کوئی چاہے
گلشن دل کا رنگ و بو تو ہے
وصل میں ماہرو کے مثل کتاں
کیوں دلا قابل رفو تو ہے
آب گوہر سے پاک کر تو زباں
کامل اس کا جو مدح گو تو ہے   (۱۳۹

سنے وہ اگر ناتوانی ہماری   یقیں ہے کرے قدردانی ہم
ہوا جسم تو خاک اس کی گلی میں   نہ سمجھا پہ وہ جانفشانی ہم
کہا اپنا احوال ہر چند لیکن   نہیں اس کو باور زبانی ہما
دیا نقد دل تجھ کو تسپر ستمگر   کبھی قدر تو نے نہ جانی ہما
گئے اس لیے تجھ کو دے کر دل اپنا   رہے پاس تیرے نشانی ہما
نہ جا ساتھ غیروں کے گلشن میں ہرگز   پذیرا تو کر بات جانی همار
سبب ناتوانی کا مت پوچھ کامل   ہوئی صرف غم میں جوانی همار

ہاتھ اس کے سے اپنے نہیں اوسان ٹھکانے
ڈرتا ہوں نہ لگ جاوے کہیں جان ٹھکانے
کس پاس ترا شکوہ میں کرتا ہوں ستمگر
تہمت تو نہ کر مجھ پہ رکھ ایمان ٹھکانے
مت پوچھ شب ہجر کا احوال تو ہم سے
دل میرا نہیں ہے کسی عنوان ٹھکانے
اس آتش دل میرے کا ٹک شعلہ جو بھڑکے
لگ جائیں پھر اک دم میں نیستان ٹھکانے

(قطعہ)

میں نے کہا آؤں ترے ملنے کو ہر پرو
ہوتا ہی نہیں اپنے تو اک آن ٹھکانے

ہنس کر وہ لگا کہنے کہ سنتا ہے فلانے
رہتا ہے کہیں مہر درخشاں ٹھکانے (۱۳۰ الف)

کامل سے جھگڑتا ہے تو اے شیخ یہ سن رکھ
لگ جائے نہ اک پل میں تری شان ٹھکانے

بیٹھ تو اے دلربا ایک گھڑی اور بھی
بات سجھے بر محل سوجھ پڑی اور بھی

آہ ہوائی ہوئی تس پہ مری چشم سے
اشک کی جھڑنے لگی پھولجھڑی اور بھی

شیخ تو میخانے میں آکے ہوا تھا خفیف
رندوں نے داڑھی پکڑ دھول جڑی اور بھی

سخت وہاں بیشتر تھا وہ رقیب لعین
کرنے لگا مے کو پی اب تو اڑی اور بھی

ہم سے وہ .... پسر آگے ہی بیزار تھا
تند ہوا سنتے ہی نام بڑی اور بھی

داغوں سے سارا بدن گو کہ ہوا لالہ زار
مار ہمیں گلبدن ایک چھڑی اور بھی

ہو چکا شیشہ میں تھا جو کہ شراب کہن
ہم کو پلا مے مغاں اس سے کڑی اور بھی

آگے ہی برسات سے روئے زمیں تھا پر آب
تھمتی نہیں چشم کی تس پہ جھڑی اور بھی

سن کے یہ تازہ غزل بولا وہ سیمیں بدن
لکھ تو غزل کا ملا اس سے بڑی اور بھی

ہم سے تو کہہ لے صنم بات کڑی اور بھی
گھر کو یہ یاں سے نہ جا ایک گھڑی اور بھی

ناوک غمزہ سے تھا آگے ہی مجروح دل
تیغ ستم یار نے تس پہ جڑی اور بھی (۱۴۰ ب)

لے کے مرا جان و دل یار ہوا پھر خفا
مجھ پہ مصیبت نئی آہ پڑی اور بھی

مسی لگا دانتوں کو تو نے چبائے جو پان
آفت جاں ہو گئی اب تو دھڑی اور بھی

دے کے دل اپنا اسے ہم نے کیا تھا خوشی
دس پہ ستمگر سے جا آنکھ لڑی اور بھی

اس دل وحشی کی لے جلد تو قاتل خبر
توڑی ہے زنجیر کی اس نے کڑی اور بھی

دل کو اگر کاملا کچھ بھی فلک چین دے
روز غزل ہم لکھیں اس سے کڑی اور بھی

— —

بسکہ دکھ پاتے رہے افلاک کے سائے تلے
خوب روئے بیٹھ کر ہم تاک کے سائے تلے

گردش گردوں سے کچھ خطرہ نہیں ان کے تئیں
سوتے ہیں آرام سے جو خاک کے سائے تلے

جلتے جلتے گرمی سے اب قطرۂ آنسو سوا
کون ٹھہرے دیدۂ نمناک کے سائے تلے

جیتے جی قدموں سے اس کے کیو نکہ ہوں یارو جدا
پرورش پائی جو ہم سفاک کے سائے تلے

خلق کہتی ہے پریرو دیکھ کر تیری بلاق
خوب لٹکے ہے یہ موتی ناک کے سائے تلے

ماندگی سے اب تو آیا ہے عرق اپنے تئیں
بیٹھیں گے ہم پیڑ کوئی تاک کے سائے تلے
کچھ خطر کامل نہیں خورشید محشر کا ہمیں
بیٹھیں گے اس صاحب لولاک کے سائے تلے(۱)

- - -

کہہ سناؤں میں تجھے اپنی کہانی جانی (۱۴۳ الف)
پر مری بات کبھو تو نے نہ مانی جانی
آشنائی سے مرے پاس کہ تجھ بن کب سے
چشم کرتی ہے مری اشک فشانی جانی
بھر نظر دیکھا نہ اک روز تجھے آنکھوں سے
آہ غفلت میں گئی اپنی جوانی جانی
جاں تلک تجھ سے لیا صرفہ نہ اس نے ہرگز
تم نے عاشق کی مگر قدر نہ جانی جانی
خوبرو اور بھی دنیا میں بہت ہیں لیکن
حسن میں کوئی نہیں ہے ترا ثانی جانی
جان قالب میں نئے سر سے مرے آتی ہے
نام سنتا ہوں تیرا جس کی زبانی جانی
ہوتا اس عہد میں جیتا تو یقیں ہے مجھ کو
سنتا کامل کے یہ اشعار فغانی جانی

- -

نہ تو اشک آنکھوں سے تھمتا ہے، نہ فغاں سے دل کو فراغ ہے
چلوں بوستاں میں میں کس طرح، کسے دید گل کا دماغ ہے

۱۔ اس غزل کے بعد دو اوراق پر 'شاعر مرزا' کا ریختہ کلام درج ہے۔ ورق ۱۴۳ الف سے دوبارہ کامل کی غزلیات شروع ہوتی ہیں۔

کبھی اس طرف بھی تو چل صنم ترے کشتہ کی ہے جہاں لحد
وہ عجب طرح کا مزار ہے کہ نہ شمع ہے نہ چراغ ہے
یہی دل میں رکھتا ہوں آرزو مجھے ہاتھ اپنے سے تو پلا
ترے پاس اس گھڑی ساقیا مئے کہنہ کا جو اباغ ہے
مرا دل تو داغوں سے لالہ رو ہوا رشک گلشن و بوستاں
ذرا غور سے تو نگاہ کر کہ عجب طرح کا یہ باغ ہے
گیا گھر میں غیر کے ماہرو مرے سامنے جو تو رات کو
مرے دل پہ لالہ کی طرح اب اسی غم سے آہ یہ داغ ہے
مرے جی میں آیا تھا کل یہی چلوں دیکھنے کو میں یار کے
گیا اس کے گھر میں تو دیکھوں کیا کہ وہاں نہ اس کا سراغ ہے
چمن زمانہ کا رنگ و بو تو نہ پوچھ ہر گھڑی کا ملا
جہاں عیش کرتے تھے بیٹھ کر وہاں ہم نے دیکھا تو داغ ہے
(۱۴۳ ب)

مجھے سیلاب آنسو میں نہ چشم زار لے ڈوبی
یہ کشتی ایک عالم کے تئیں یک بار لے ڈوبی
سمجھتا تھا نہ اتنا سنگدل میں تجھ کو اے ظالم
مجھے بحر محبت میں تری گفتار لے ڈوبی
خیال اپنے میں لاتے تھے نہ چشم تر کے رونے کو
یہ آخر رفتہ رفتہ یہ در و دیوار لے ڈوبی
خبر کچھ بھی تو رکھتا ہے جو گلرو بحر حیرت میں
اس آئینے کو تیری حسرت دیدار لے ڈوبی
شناور عشق کے دریا کا تنہا میں ہوں اب ورنہ
قدم جس نے رکھا اس میں پھر اس کو دھار لے ڈوبی

نصیحت کر رہا پیر مغاں کو بارہا واعظ
یہ الفت دخت رز کی اس کو آخرکار لے ڈوبی
کنویں سے کام کیا تھا اے عزیزو ماہ کنعاں کو
زلیخا کی محبت اس کے تئیں لاچار لے ڈوبی
حذر کرتا رہا بنت العنب سے محتسب اکثر
اسے دریائے عصیاں میں ہے یہ مردار لے ڈوبی
قدم اس بحر میں جنے رکھا ہے تجھ سوا کامل
پھر اس کی طبع ناسوزوں اسے اے یار لے ڈوبی

قدر عاشق کی نہیں تجھ کو صنم افسوس ہے
تیری فرقت میں جو دل اس کا سدا مایوس ہے
کیوں قدم رنجہ نہیں کرتا ادھر کو دلربا
دل کو میرے کب سے تیری حسرت پابوس ہے (۴۴ الف)
میں نہ کہتا تھا دلا تو بیوفاؤں سے نہ مل
کون اب دام محبت میں بتا محبوس ہے
بوستاں میں اس قدر گلرو کے ہے آنے کی دھوم
نغمۂ بلبل ہے گویا جلوۂ طاؤس ہے
محتسب کو میکدے میں ساقیا آنے نہ دے
بادہ خواروں کا یہ ہر شام و سحر جاسوس ہے
(قطعہ) کل میں عزرائیل سے پوچھا گذشتوں کا جو حال
کہنے لاگا ان کے غم سے دل مرا مایوس ہے
لے گیا ساتھ اپنے مجھ کو ایسے گورستان میں
گور پر جن کی کبھو نے شمع نے فانوس ہے
ایک اک کا نام لے کر پھر لگا کہنے مجھے
یہ فریدوں ہے یہ کیخسرو یہ شاہ روس ہے

یا تو وہ جاہ و حشم تھا ان کا بر روئے زمیں
یا تن نازک کا ان کے خاک اب ملبوس ہے
اس غزل اپنی کو کامل کس کے آگے ہم پڑھیں
اب نہ سعدی ہے نہ خاقانی نہ پیرطوس ہے

غیر سے اس کی اشارات چلی جاتی ہے
ہم سے ہر لحظہ وہی بات چلی جاتی ہے
یار اس روز سے اتنا ہے خفا میرے سے
آج تک وہ ہی شکایات چلی جاتی ہے
کس لیے خوش نہیں کرتا ہے تو میرے دل کو
ماہ رو باتوں میں یہ رات چلی جاتی ہے
غیر پر تازہ وہ ہر روز کرے ہے الطاف
ہم سے ہر آن کنایات چلی جاتی ہے
ساقیا مستوں کا دل ہاتھ میں اپنے تو لے
ورنہ یہ مفت میں برسات چلی جاتی ہے (۱۴۴ ب
ہم سے وہ شوخ جو کرتا ہے کنائے سے سخن
اور غیروں سے مدارات چلی جاتی ہے
فکر عقبیٰ کا بھلا کیجیے کیونکر کامل
عمر غفلت ہی میں ہیہات چلی جاتی ہے

سنیں یہ دل کا مرے گر فغاں زمیں کے تلے
کریں نہ خواب کبھو خفتگاں زمیں کے تلے
نہ ہووے داغ یہ دل غم سے کس طرح یاراں
نہاں جو ہوتے ہیں نت گلرخاں زمیں کے تلے
لگے یہ کوچۂ ہستی میں کیونکہ دل اپنا
چلا جو حسن کا اب کارواں زمیں کے تلے

ہزار غنچہ دہن ہیں جو خاک میں پنہاں
ہوا شگفتہ گویا گلستاں زمیں کے تلے

گیا وصال کی حسرت میں جو کہ دنیا سے
جلے ہے اس کی ہر اک استخواں زمیں کے تلے

کبھی تو مقتل عاشق پہ آ تو عیسیٰ دم
کہ تیری یاد میں ہے ہر زباں زمیں کے تلے

ترے فراق میں ہستی سے جو عدم کو گیا
ہے بے قرار وہ نت خستہ جاں زمیں کے تلے

عدم کے ملک میں .... نہیں
گیا انھوں نے بھی امتحاں زمیں کے تلے

خبر شتاب لے بے مہر جا کے کامل کی
نہ ہووے ایسا کہ ہو وہ نہاں زمیں کے تلے

دل جو مانگے ہے تو لے اے دلربا یوں بھی سہی
جیسے میں تیری .. اس کو کیا یوں بھی سہی (۱۳۵ الف)

اب جو رونے پر کمر باندھی ہے تو نے چشم زار
اشک کے بدلے تو خون دل بہا یوں بھی سہی

تو جو کہتا ہے مرا سر ایک سے شکوہ نہ کر
میں بجا لاؤں گا یہ تیرا کہا یوں بھی سہی

گر کہیں کا عزم ہے دل میں ترے جلدی سدھار
آتش غم سے مرے دل کو جلا یوں بھی سہی

یار بن تجھ کو جو اب آرام یک لحظہ نہیں
اے دل اس کے پاس تو جلدی سے جا یوں بھی سہی

دمبدم مجھ کو جو تو کہتا ہے پی جام شراب
ہاتھ سے اپنے مجھے کارو پلا یوں بھی سہی

جس سے دل اٹکا ہے تیرا اس کو بھی اب یاں بلا
یہ ستم خاطر سے تیری میں سہا یوں بھی سہی
ہاتھ میں شمشیر لے کر کیا ڈراتا ہے ہمیں
گر یہی جی میں تمنا ہے لگا یوں بھی سہی
تھا خفا مجھ سے تو وہ پر مسکرا کہنے لگا
کامل اپنے شعر تر ہم کو سنا یوں بھی سہی

باغباں خون جگر پیتا ہے مل کے بدلے
باغ میں خار وہ جب دیکھے ہے گل کے بدلے
گو کہ ہیں بنت عنب پر کئی مفتوں لیکن
ساقیا ہم تو اسے رکھتے ہیں گل کے بدلے
تربت شیخ پہ دن پھولوں کے اے پیر مغاں
قلقل شیشہ سے چاہیے قل کے بدلے
جبکہ طغیانی پہ آتا ہے مرا سیل سرشک
گھر کے گھر کرتا ہے مسمار یہ پل کے بدلے (۱۳۵ ب
تجھ پہ گذرو کی جدائی میں جو گذرا بلبل
اپنا احوال سنا ہم کو تو غل کے بدلے
ٹک ادھر دیکھ گل اندام کہ تیری خاطر
جسم سارا کیا مجروح میں گل کے بدلے
کامل اقلیم سخن تو نے جو تسخیر کیا
کیوں بجاتا نہیں نوبت تو دھل کے بدلے

ہم کو کس دن نہ تمنائے قدم بوسی ہے
جب تو آتا نہیں اس طرف کو مایوسی ہے
بسکہ رویا ہوں ترے ہجر میں اے رشک بہار
اشک جو .... سو وہ طوسی ہے

جو کہ واقف نہ ہو اب تجھ سے اسی کو بھلا
مجھ کو معلوم ستمگر تری سالوسی ہے
جی سے اے شاہ شہاں تیرے کہاتے ہیں غلام
ہم کو درکار نہ کچھ شوکت کاؤسی ہے
دختر رز کو چھپاتا نہیں کس واسطے تو
محتسب کب سے مغاں در پئے جاسوسی ہے
تا دم مرگ نہ بھولے گا وہ اس کی لذت
جس نے شمشیر خوں آلود تری چوسی ہے
تیرے آنے کی خوشی سبتی چمن میں گلرو
نغمہ بلبل کا بھی اب جلوۂ طاؤسی ہے
حق کے دیدار کا تو شوق رکھے ہے لیکن
تاب کب دیکھنے کی تیرے تئیں موسی ہے
تجھ پہ کس طرح سے کامل کا نہ دل ہو مفتوں
بزم میں تیری صنم جلوۂ قدوسی ہے (۱۰۶ الف)

ہر طرف دار جلوہ گر تو ہے
دیکھا جیدھر کو پھر نظر تو ہے
جاں تلک تجھ پہ میں کروں قرباں
دل کا طالب مرے سے گر تو ہے
تیری خدمت میں دل سے حاضر ہوں
کیوں خفا مجھ سے اس قدر تو ہے
عقل حیراں نہ اب رہے کیوں کر
ہر جگہ ہر مکاں پر تو ہے
لامکاں نام کو ترا ہے مکاں
ورنہ دیکھا جدھر ادھر تو ہے
دیکھے باغ جہاں کے میں گلرو
سب سے اے شوخ نامور تو ہے
کیوں نہ چاہوں میں تجھ کو اے کامل
شاعروں سے جو سربسر تو ہے

آج کی رات جو وہ رشک قمر ہاتھ لگے
اپنے نزدیک گویا گنج گہر ہاتھ لگے

ڈھونڈوں میں یوسف دل اپنے کو مثل یعقوب
اس لیے تا وہ کہیں لخت جگر ہاتھ لگے

واسطے میرے شتابی سے آسے لے آنا
ساقیا دختر رز تجھ کو اگر ہاتھ لگے

اس کو میں ہونے نہ دوں اپنی نظر سے غائب
مجھ کو اب کے جو کہیں نور بصر ہاتھ لگے

واسطے دود جگر میرے کے لا پیک نسیم
کسی جاگہہ جو تجھے بکتا اثر ہاتھ لگے

لیجیے اپنی سواری کے لیے اس کے تئیں
شیخ جی تم کو خراساں کا جو خر ہاتھ لگے (۱۴۶ ب)

نامہ بر اس کا تو جلدی سے لے آنا پیغام
میرے گم گشتہ کی تجھ کو جو خبر ہاتھ لگے

کیوں مجھے ٹوکے ہے ناصح کہ میں اس کے گھر میں
اس لیے جاتا ہوں تنہا وہ مگر ہاتھ لگے

تیرے طالع کی تو کیا بات ہے کامل لیکن
اپنی قسمت میں تو یہ دیدۂ تر ہاتھ لگے

نہیں پاتے ہیں محفل کو تری غیروں سے ہم خالی
کریں جو بیٹھ کر تجھ پاس دل اپنا صنم خالی

شکایت سو طرح کی ہے بھری دل میں مرے لیکن
گذرتا ہی نہیں رونے سے مجھ کو ایک دم خالی

کسی کارو میں الفت کی میں بو ہرگز نہیں پاتا
وفا سے گلشن ہستی ہوا ہے یک قلم خالی

کوئی ہمدرد اب آفاق میں ڈھونڈے نہیں ملتا
مگر کرتے ہیں دل کو آہ بھر ہم دمبدم خالی

پھریں ہیں شیخ و زاہد جستجو میں جس کی کعبے میں
جو کیجیے غور تو اس سے نہیں دل کا حرم خالی
جفا گر مجھ پہ تم کرتے ہو تو بوسہ بھی اک دیجے
گوارا آپ کا مجھ کو نہیں ہے یہ ستم خالی
طلب کر مدعا اپنے کو کامل شاہ مرداں سے
کسی کو پھرتے دیکھا اس کے در سے ہم نے کم خالی

مرے دل کو جس کی کہ نت جستجو ہے
اسے جب کہ دیکھا عجب تند خو ہے (۱۳۷ الف)
جدا عمر بھر تجھ سے ہرگز نہ ہوں میں
مرے دل میں کارو یہی آرزو ہے
مکرتا ہے ہر بات پر تو جو ہر دم
عجب طرح کی تیری یہ گفتگو ہے
مرے گل کا رخسار جیسا ہے بلبل
گلستاں میں کس گل میں یہ رنگ و بو ہے
کھلا داغوں سے مرے دل کا گلستاں
رواں اس میں چشموں سے اب آبجو ہے
میں اتنا سمجھتا ہوں اے ماہ طلعت
کوئی جگ میں تجھ سا نہیں خوبرو ہے
ابھی یاد کرتا تھا جس کو تو مہ رو
ادھر دیکھ کامل ترے روبرو ہے

یہ نہیں کہتا ہوں میں مجھ سے وفا کیجے
لیک نہ اتنا ستم جلوہ نما کیجیے
رکھنے کے قابل نہیں یار اگر مرغ دل
دام سے زلفوں کے پھر اس کو رہا کیجیے

سنگدلی اس قدر تجھ کو مناسب نہیں
درد کسی کا صنم ٹک تو سنا کیجیے
آتا نہیں باز تو اپنی جو بدخوئی سے
تجھ سے بھلا کس طرح یار ملا کیجیے
اپنا یہ شیوہ نہیں جا کے کسی کے کنے
شکوہ ترا بے وفا روز کیا کیجیے
منہ میں ہمارے بھی ہے کہتے ہیں جس کو زباں
چپکے تری بزم میں کیوں کہ رہا کیجیے
موسم برسات میں ہاتھ لگے گر شراب
دم کو غنیمت سمجھ خوب پیا کیجیے
ہاتھ اٹھاتا نہیں جور سے وہ تندخو
جان و دل اپنا اگر اس پہ فدا کیجیے (۱۴۷ ب)
والیٔ کامل نہیں دوسرا تم بن کوئی
جگ میں اسے کامراں شیر خدا کیجیے

دینے لگا جو مجھ کو آزار بیٹھے بیٹھے
کیا دھر یہ جی میں آئی اے یار بیٹھے بیٹھے
کچھ بے وفا میں تیرا ہرگز نہیں بگاڑا
کیوں کھینچتا ہے مجھ پر تروار بیٹھے بیٹھے
یہ چونچلا تو تیرا بھاتا نہیں ہے ہرگز
چھیڑا نہ کر تو مجھ کو زنہار بیٹھے بیٹھے
محفل تری سے ظالم جاتا ہوں میں پہ لیکن
مت کر تو ہرزہ مجھ سے گفتار بیٹھے بیٹھے
(قطعہ) کل رات میرے گھر میں آیا جو ماہ طلعت
تب میں کیا یہ اس سے اظہار بیٹھے بیٹھے

ملنے کی تجھ سے دل میں مدت سے آرزو ہے
لگ جا مرے گلے سے یک بار بیٹھے بیٹھے
سنتے ہی اس سخن کو یک بارگی مرے سے
آزردہ ہو گیا وہ خونخوار بیٹھے بیٹھے
حالت یہ دیکھ اس کی فی الفور اے عزیزو
چلنے کو پھر ہوا میں تیار بیٹھے بیٹھے
کہنے لگا وہ مجھ کو اٹھ کر چلا تو کیدھر
کامل سنا تو مجھ کو اشعار بیٹھے بیٹھے

- - -

تجھ کو دل دے کے یہ اب ہم نے پچھانا پیارے
حیف جاتا رہا الفت کا زمانا پیارے
مہربانی سے ادھر کو کبھی آنا پیارے
پر خفا کر کے مجھے گھر کو نہ جانا پیارے
تیرا دیدار مرے واسطے ہے آب حیات
مجھ سے زنہار نہ منہ اپنا چھپانا پیارے (۱۰۸ الف)
قتل اس خستہ جگر کا جو تجھے ہے منظور
خاک پر اس کے لہو کو نہ بہانا پیارے
کاسۂ سر کسی مظلوم کا دیکھے جو کہیں
اپنی ٹھوکر سے اسے تو نہ ہٹانا پیارے
ایک مدت سے دل وحشی جو کرتا ہے فغاں
لطف سے آ کے کبھی اس کو رجھانا پیارے
عمر بھر تجھ کو نہ زنہار میں چھوڑوں تنہا
مجھ کو معلوم ترا ہو جو ٹھکانا پیارے
نقد دل کا تو اگر میرے بھی ہووے سائل
تیری خاطر سے کروں گا نہ بہانا پیارے

مبتلا تیرا کہاتا ہے وہ آفاق کے بیچ
کیوں تو سنتا نہیں کامل کا فسانا پیارے

کی مگر اس نے ستمگر تری تقصیر کوئی
در سے تیرے جو لگا بیٹھا ہے دلگیر کوئی
اس کمان ابرو سے بھڑتا ہے جو تو جا کے دلا
مار بیٹھے نہ تجھے غمزے کا وہ تیر کوئی
ہاتھ سے اپنے اسے تو نے جو کھویا صیاد
دل سا تجھ کو نہ ملے گا کہیں نخچیر کوئی
سیل غم نے جو کیا خانۂ دل آہ خراب
حیف پر اس کے نہیں در پئے تعمیر کوئی
دل کے نالے سے خفا ہے تو اسے چھوڑ دے یار
اس سے بہتر نہیں اس صید کی تعزیر کوئی
جی میں گذرے ہے مرے اس گھڑی نقشہ تیرا
نظر آتی ہے کہیں جب مجھے تصویر کوئی
کو کہ کرتا ہے تو نت گریہ و زاری کامل
دل میں بے مہر کے ہوتی ہے یہ تاثیر کوئی (۱۳۸ ب)

صنم نام خدا جیسا کہ تیرا قد و قامت ہے
مرے سے گر کوئی پوچھے تو میں بولوں قیامت ہے
ترے کوچے میں جس دن سے ہے ظالم بود و باش اپنا
ہمیں چاروں طرف سے ہر گھڑی زجر و ملامت ہے
گلا کچھ بے وفائی کا تری کرتا نہیں لیکن
دلا ملتا ہے بے مہروں سے یہ ہی تجھ کو شامت ہے

خدا حافظ ہے میرا اس گھڑی سنتے ہو اے یارو
لڑا تو وہ نہیں مجھ سے یہ خفگی کی علامت ہے
سحر سے شام تک رندوں سے آ کر تو جو بکتا ہے
تجھے اس گفتگو اپنی سے زاہد کچھ ندامت ہے
سخن رندوں کے دل کا سمجھ میں جو بوجھ لیتے ہو
تمہیں بھی شیخ جی نام خدا پوری کرامت ہے
نہیں ملتا ہے اس سے کس لیے تو جا کے اے ظالم
کہ تیرے دیکھنے کو اب تلک کامل سلامت ہے

غیر کو اس مکاں سے اٹھنے دے — ہم کو ڈرو نہ یاں سے اٹھنے دے
شور مت کر چمن میں تو بلبل — گل کو خواب گراں سے اٹھنے دے
روکتا کیوں ہے نالے کو اے دل — دود ہر استخواں سے اٹھنے دے
اس قدر مت برس تو دیدۂ تر — بادل اب آسماں سے اٹھنے دے
باغباں بلبلوں کے گھر کو تو — اپنے مت بوستاں سے اٹھنے دے
کتنا کھاتا ہے غم تو اے کامل — درد مجھ کو کہاں سے اٹھنے دے

مخمسات :

کیوں کر نہ ملک حسن کی ہووے تجھے اب خسروی
ہے یاد تجھ کو بیشتر سب دلبروں سے دلبری (۹۰ الف)
کہتا ہوں تیری دیکھ کر ہر آن یہ عشوہ گری
اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری
ہر چند وصفت میکنم اما ازو زیبا تری

گو عہد میں تیرے صنم بنیاد الفت رکھ دی
صورت تری ہوتی نہیں پر میری نظروں سے جدی

ویسے کیا ہے دور میں اس واسطے حرف خودی،
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تجھ پر ہوا ہوں مبتلا جس روز سے با چشم نم
جپتا ہوں تیرے نام کو شام و سحر میں اے صنم
دل سخت کر اس واسطے سہتا ہوں نت تیرا ستم
آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام امّا تو چیزے دیگری

مفتوں ہوا ہے دل مرا جب سے کہ تجھ پر تندخو
بیٹھا ہوں میں در پر ترے اوقات اپنی تب سے کھو
اچھی لگے مجھ کو بتا کس طرح پھر تیری یہ خو
عالم ہمہ یغمائے تو خلق خدا شیدائے تو
آں نرگس رعنائے تو آوردہ رسم کافری

کی سیر اک عالم کی میں اس عمر میں اے جلوہ گر
آیا نظر مجھ کو کہیں تجھ سا نہ کوئی سیم بر
در پر ترے اب اس لیے میں نے رکھا ہے اپنا سر
ہر گز نیاید در نظر حسنے ز رویت خوب تر (۱۴۹ ب)
شمسے ندانم یا قمر حورے ندانم یا پری

کرنے لگا ہے جیسے تو آفاق میں غارت گری
خورشید کے اندام میں تب سے پڑی ہے تھرتھری
کیا چیز ہیں تیرے حسن کے آگے ہیں ماہ و مشتری
تو از پری چابک تری وز برگ گل نازک تری
وز ہر چہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری

نکلے اگر اے مہ جبیں تو گھر سے اپنے در تلک
خورشید تجھ کو دیکھ کر فی الفور رہ جائے ٹھٹک

گو حسن کا یوسف کے ہے آفاق میں شور آج تک
تا نقش تو بندد فلک کس را نداده ایں نمک
حورے ندانم یا ملک فرزند آدم یا پری

آنے لگا ہوں جیسے میں اے گلبدن تیرے یہاں
لطف و کرم تیرا کیا اچھی طرح سے امتحاں
تس پر تمنا ہے یہی جی میں مرے تو کر مکاں
اے راحت و آرام جاں با قد چوں سرو رواں
ہر سو مرو دامن کشاں آرام جانم میبری

کیوں کر سخن تیرا یہ ہو اہل خرد کے دل نشیں
تعریف میں اپنی جو تو کہتا پھرے ہے ہر کہیں
کوئی مصور دہر میں ثانی مرا ہرگز نہیں
صورت گر زیبای .... روئے چوں ماهش بہ بیں
شکلے بہ کش بہ ایں چنیں یا ترک کن صورت گری

مدت سے گو تجھ پر صنم کامل کا دل ہے مبتلا
ملنے کو اب اس کے کنے مختار ہے تو جا بجا
پر خیر خواہی سے تجھے کہتا ہوں سن اے دلربا
خسرو غریب است و گدا افتاده در شهر شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

کہا ہے مجھ سے جدا ہو کے جب سے وہ پیارا
پھروں ہوں اس کے تئیں ڈھونڈتا میں بیچارا (۱۰۰ الف)
کچھ اپنی طرف سے میں جستجو میں نئیں ہارا
صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بکوه و بیاباں تو دادهٔ ما را

بہت تھا تجھ پہ مجھے دل سے اعتقاد اے گل
کرے گا لطف سے شاید مجھے تو یاد اے گل
کیا نہ تو نے کبھو دل مرے کو شاد اے گل
غرور حسن اجازت مگر نداد اے گل
کہ پرسشے نہ کنی عندلیب شیدا را

جو چاہتا ہے کہ ہو جگ میں سب سے تو برتر
ہمیشہ عاشق مسکیں سے کر وفا دلبر
میں خیر خواہی سے کہتا ہوں تجھ کو رشک قمر
بلطف و خلق تواں کرد صید اہل نظر
بدام و دانہ نگیرند مرغ دانا را

نہیں ہے حسن میں ثانی ترا کوئی لاریب
ترے دہن کو جو دیکھا ہے سر عالم غیب
کہیں ہیں اہل خرد سر کو ڈال کر در جیب
جز ایں قدر نتواں گفت در جمال تو عیب
کہ حال مہر و وفا نیست روئے زیبا را

تجھے تو غیروں کی صحبت صنم پسند آئی
پہ مجھ کو دیتی ہے دکھ حد سے زیادہ تنہائی
اب اتنی بات تجھے کہتا ہے یہ شیدائی
بہ بزم غیر نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر محبان بادہ پیما را

چمن کی سیر کو جس دن وہ گلعذار گیا
ہر ایک سرو فدا اس کے قد کے آگے ہوا
خوشی سے مرغ چمن اس گھڑی یہ کہنے لگا
شکر فروش کہ عمرش دراز باد چرا
تفقدی نکند طوطی شکر خارا

الٰہی عشق کا ہو نام از خدائی نیست
نہ عاشقوں کا کرے حال تاجدائی نیست
بتوں کے دل سے ہو یا رسم بے وفائی نیست
ندانم از چہ سبب رنگ آشنائی نیست
سہی قدان سیہ چشم و ماہ سیما را

دیا ہے اے شہ خوباں تجھے جو حق نے بخت
بہن خوشی سے ہمیشہ تو سروری کا رخت
پہ تیرے جو کہ ہیں خواہاں انہیں نہ کبھو سخت
بشکر صحبت احباب و آشنائی بخت
بیاد آر محبان دشت پیما را

میں کامل اب سنا راز نہفتہ' حافظ
کیے ہیں گوش جو شعر شگفتہ' حافظ
عجب طرح کے ہیں در ہائے سفتہ' حافظ
بر آسماں چہ عجب گر ز گفتہ' حافظ
سماع زہرہ بہ رقص آورد مسیحا را

رباعی :

تو دیں کا ہے شہسوار یا شاہ نجف
تو سب کا ہے غمگسار یا شاہ نجف
میں دیکھ کے موجزن ترا بحر عطا
آیا ہوں امیدوار یا شاہ نجف (۱۳۶ ب)

مر گیا سر کو پٹک کر یہ گرفتار قفس
کس کے لوھو سے ہے گلگوں در و دیوار قفس
جی نکل جائے مرا کشمکش دم میں کاش
نہ گرفتار چمن ہوں نہ گرفتار قفس
(بیاض دینا ناتھ - ۳۶ الف)

بھر گئی ہے آستیں لوھو سے داماں یک طرف
پڑ گئے ھیں چاک سینے میں گریباں یک طرف

دیر و کعبہ میں ... فریادی ... موجود ھیں
سر پٹکتا یک طرف ھندو، مسلماں یک طرف

(بیاض دینا ناتھ ۔ ۳۶ الف

نئی کتابیں

تذکرہ روضتہ السلاطین
اور
تذکرہ جواھر العجائب

مصنف : فخری بن امیری ہروی

مرتب : سید حسام الدین راشدی

صفحات : ۹۰ + ۳۴۲

قیمت : بیس روپے

ناشر : سندھی ادبی بورڈ ، حیدر آباد (مغربی پاکستان)

فارسی ادب کی تاریخ میں تذکرہ نگاری کی روایت کا آغاز خطہ سندھ میں ہوا ۔ دستیاب تذکروں میں پہلا تذکرہ 'لباب الالباب' ہے جو عوفی نے ۶۲۵ھ میں سندھ میں تالیف کیا ۔ اس کے تقریباً پونے تین سو سال بعد دولت شاہ سمر قندی کا 'تذکرۃ الشعرا' اور میر علی شیر نوائی کا 'مجالس النفائس' وجود میں آئے ۔ اس کے بعد دسویں صدی ھجری کے ربع ثالث میں دو تذکرے 'روضۃ السلاطین' اور 'جواھر العجائب' لکھے گئے جن کا مصنف فخری ہروی ہے ۔ یہ دونوں تذکرے بھی سر زمین سندھ ہی کی پیداوار ھیں ۔ ان دونوں کو فارسی ادب میں اس اعتبار سے بھی تاریخی اھمیت حاصل ہے کہ 'روضۃ السلاطین' ان شعرا کا پہلا تذکرہ ہے جو سلاطین و امرا کے زمرے سے تعلق رکھتے تھے ، اور 'جواھر العجائب' فارسی شاعرات کا پہلا تذکرہ ہے ۔

دسویں صدی ھجری کے ربع ثانی میں فخری ، ھرات سے سندھ میں آیا ۔ وہ تقریباً پندرہ سال یہاں رہا ۔ ان دنوں سندھ کا دار الحکومت ٹھٹھہ

تھا ، اور یہی سب سے بڑا علمی مرکز تھا ۔ علما و فضلا کی ایک بڑی تعداد یہاں موجود تھی ۔ حکمرانوں کی علم دوستی نے اہل علم کے لیے آسودگی سے زندگی بسر کرنے کا سامان فراہم کر دیا تھا ۔ فخری نے اس آسودگی بخش ماحول میں رہ کر یہ دونوں تذکرے لکھے ۔

سید حسام الدین راشدی صاحب کی تحقیق کے مطابق 'روضۃ السلاطین' سنہ ۹۵۸ - ۱۵۵۸ میں لکھا گیا ۔ جیسا کہ عرض کیا گیا یہ اُن سلاطین و امرا کا تذکرہ ہے جو اقلیم سخن میں بھی اپنا نام و نشان چھوڑ گئے ۔ یہ تذکرہ سات ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلا باب '' وجہ تسمیہ شعر و احوال بہرام گور و ابتدائے نظم فارسی '' کے لیے وقف ہے ۔ دوسرا ' خانان ازبک و مغول ' سے متعلق ہے ۔ تیسرے اور چوتھے ابواب میں سمرقند و خراسان اور عراق و روم کے سلاطین کی سخن سرائی کی تفصیل ہے ۔ پانچواں باب سلاطین ہند کے بارے میں ہے ۔ چھٹے باب میں امرا کا ذکر ہے اور ساتویں اور آخری باب میں والیٔ سندھ شاہ حسن ارغون کے حالات ہیں ۔ اس تذکرے کے پانچ مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں - دو پیرس میں ہیں اور تین نسخہ مار بورگ ، (یہ نسخہ پہلے برلن میں تھا) لینن گراڈ اور اسلامبول کے کتب خانوں میں ہیں ۔ پیرس کے دونوں نسخے ' ببلیوتک ناسیونال ' میں ہیں ۔ ان میں سے ایک (شمارہ ۳۲) اس تذکرے کا قدیم ترین مخطوطہ ہے جو مصنف کے عہد کا ہے ۔ راشدی صاحب نے اسی نسخے کو متن میں جگہ دی ہے اور پیرس (نسخۂ ثانی) برلین اور لینن گراڈ کے نسخوں کے اختلافات حواشی میں دیے ہیں ۔ اس طرح زیر نظر متن تذکرے کے چار اہم نسخوں سے تیار کیا گیا ہے ۔

' روضۃ السلاطین ' تذکرۂ شعرا ہی کی حیثیت سے اہم نہیں ، بلکہ ایک قابل قدر تاریخی ماخذ بھی ہے ۔ اس میں بعض سلاطین و امرا کے ایسے حالات بھی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتے ۔ نیز خطۂ سندھ کی علمی و ادبی تاریخ کی بعض اہم کڑیوں کا سراغ اسی تذکرے میں ملتا ہے ۔

فخری کا دوسرا تذکرہ ' جواہرالعجائب ' علمی دنیا میں خاصی شہرت رکھتا ہے ۔ یہ تین مرتبہ شائع ہو چکا ہے اور اس کے متعدد قلمی نسخے بھی دستیاب ہوتے ہیں ۔ یہ پہلی بار مطبع منشی نول کشور سے ۱۸۷۳ء

میں اور دوسری بار اسی مطبع سے ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا تھا ۔ تیسری بار اسے حکیم شمس‌اللہ قادری نے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو کے جریدے ' اردو ' میں جولائی ۱۹۲۸ء کے شمارے میں شائع کیا ۔ نول کشور کے ایڈیشنوں میں (۲۷) شاعرات کا ذکر ہے اور ' اردو ' میں طبع شدہ متن میں (۲۶) شاعرات کے تراجم ہیں ۔ جناب راشدی نے نیشنل میوزیم کراچی کے قلمی نسخے کو متن میں جگہ دی ہے اور مذکورہ مطبوعہ متون کے اختلافات حواشی میں درج کیے ہیں ۔ زیر تبصرہ متن میں (۳۱) شاعرات کے تراجم ہیں ۔ گویا راشدی صاحب نے پہلی مرتبہ اس تذکرے کا مکمل متن پیش کیا ہے ۔ ایک اور اعتبار سے بھی زیر نظر متن بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تذکرہ سندھ میں میرزا عیسیٰ ترخان کے عہد حکومت میں لکھا گیا تھا ، اس لیے فخری نے اسے میرزا عیسیٰ ترخان کی بیوی حاجی ماہ بیگم (جو شاہ حسن ارغون کی بیوہ تھی) کے نام سے منسوب کیا تھا ۔ لیکن جب وہ سندھ سے ہندوستان کی طرف گیا تو اس نے یہ انتساب تبدیل کر دیا ، اور تذکرے کو شہنشاہ اکبر کی دایہ ماہم انگہ سے منسوب کیا ۔ مطبوعہ نسخوں میں یہی انتساب ملتا ہے ۔ نیشنل میوزیم کراچی کا نسخہ اس تذکرے کے اصل متن پر مبنی ہے اور اس کا انتساب حاجی ماہ بیگم ہی کے نام ہے ۔ گویا جناب راشدی کی توجہ سے یہ تذکرہ پہلی مرتبہ مکمل صورت میں چھپا ہے اور اس میں مصنف کا اصل اور ابتدائی متن پیش کیا گیا ہے ۔

فخری ہروی اچھا شعری مذاق رکھتا تھا اور صاحب دیوان شاعر بھی تھا ۔ تذکرہ نگاروں نے اس کے دیوان کا ذکر کیا ہے ، لیکن اب یہ دیوان دستیاب نہیں ہوتا ۔ جناب راشدی نے مذکورہ دونوں تذکروں کے بعد 'دیوان فخری ہروی ' کے عنوان سے فخری کا وہ تمام کلام یک جا کردیا ہے جو انہیں مختلف کتابوں میں ملا ہے ۔ اس طرح زیر نظر کتاب فخری کی ' سخن فہمی ' کے ساتھ ساتھ ' سخنوری ' کے کمالات کی بھی آئینہ دار بن گئی ۔

جناب راشدی نے زیر نظر کتاب میں سندھ میں فارسی ادب کی تین اہم کڑیوں — تحفتہ‌السلاطین ، جواہرالعجائب اور کلام فخری کو پیش کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے ۔ اس کتاب پر ان کا مفصل مقدمہ فخری ہروی کے حالات زندگی ، اس کے عہد اور اس کی تصانیف کے بارے میں علمی تحقیق کے اعلیٰ معیار کا حامل ہے ۔ اس مقدمے کے ذریعے پہلی مرتبہ فخری کے

مفصل حالات اور تصانیف کی تفصیل منظر عام پر آئی ہے ۔ کتاب کے آخر میں ' تعلیقات ' ہیں جو تقریباً سوا سو صفحات پر مشتمل ہیں ۔ ان میں مذکورہ دونوں تذکروں کے شعرا اور شاعرات کے بارے میں مزید معلومات پیش کی گئی ہیں جو اصل پر اضافے کا درجہ رکھتی ہیں ۔

سندھی ادبی بورڈ نے یہ کتاب نہایت اہتمام سے عمدہ کاغذ پر جلی ٹائپ میں طبع کی ہے ۔ اسی قسم کی بلند پایہ علمی کتابوں کی اشاعت کی وجہ سے پاکستان کے علمی اداروں میں سندھی ادبی بورڈ امتیازی حیثیت رکھتا ہے ۔ [م - خ]

نگاہ اور نقطے :

مصنف : سلیم اختر

صفحات : ۲۸۸

قیمت : چھ روپے

ناشر : جدید ناشرین ، لاہور

تنقید کو بالعموم ایک خشک مضمون سمجھا جاتا ہے ۔ عام خیال یہ ہے کہ تنقیدی بحث کے لیے ایسی زبان کی ضرورت ہے جو صرف سنجیدہ افکار کے اظہار پر قادر ہو ، اس میں کسی قسم کی چاشنی بھی نہیں ہونی چاہیے چنانچہ مولانا حالی کی زبان کو اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے مگر اس نوعیت کا انداز فکر درست نہیں ہے ۔ کم از کم سلیم اختر کے انتقادی افکار اس نظریے کی پر زور تردید کرتے ہیں ۔ سلیم اختر کے یہاں علمی اور ادبی موضوعات پر بڑے ٹھوس اور مدلل خیالات ملتے ہیں مگر ان کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں شگفتگی ٔ بیان بھی واضح طور پر جھلکتی ہے ۔ وہ ایک شگفتہ بیان نقاد ہیں ۔ دقیق سے دقیق مسئلے کو بھی بڑے خوب صورت انداز میں سپرد قلم کر دیتے ہیں ۔ ایک خوبی تو ان کی تحریروں کی شگفتگی ہے اور دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ مسائل و کردار کے تجزیاتی مطالعے میں ان نفسیاتی معلومات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں جن کا اچھا خاصا ذخیرہ ان کے ذہن میں محفوظ ہے ۔ انھی خوبیوں کی بنا پر سلیم اختر نے بہت کم مدت میں

اتنی شہرت حاصل کرلی ہے کہ آج ان کی تحریروں کا بڑے شوق اور بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ برابر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

'' نگاہ اور نقطے'' سلیم اختر کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں بارہ مقالات ہیں اور یہ سب ادب کے نہایت اہم موضوعات کو محیط ہیں۔ '' زیوس سے امیر حمزہ تک '' میں مقالہ نگار نے بڑی خوبی سے اساطیر و روایات کی اہمیت واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ ان چیزوں نے شعوری اور لاشعوری طور پر انسانی ذہن کو کس طرح متاثر کیا ہے۔ '' منٹو خطوط کے آئینے میں'' یہ مقالہ اس اعتبار سے بڑا اہم ہے کہ اس میں منٹو کے خطوط کی روشنی میں اس ممتاز افسانہ نگار کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ '' مرزا رسوا کا نظریۂ ناول نگاری '' اپنی طرز کا پہلا مضمون ہے جو رسوا کے مشہور ناول '' امراؤ جان ادا '' کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے مصنف کے نظریۂ ناول نگاری کے متعلق ہے۔ '' غالب کی نرگسیت '' میں غالب کے ایک نئے پہلو کو موضوع فکر بنایا گیا ہے۔ ' باغ و بہار کے درویش عاشق '' میں باغ و بہار کے کرداروں کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے پرکھا گیا ہے۔

باقی مضامین میں بھی مصنف کی وسعت مطالعہ ، ذہنی توازن ، دلیل آفرینی اور شگفتگی بیان کی خوبیاں ملتی ہیں۔ دیباچہ اردو کے حلول القدر محقق ڈاکٹر وحید قریشی کا ہے اور تکملہ پروفیسر عرش صدیقی نے تحریر کیا ہے۔ تکملہ مختصر ہے لیکن جامع ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ [میرزا ادیب]

آر ، یو ، آر

مصنف : کیریل چپک (۱۸۹۰ء — ۱۹۳۸ء)
مترجمین : پطرس مرحوم و سید امتیاز علی تاج
صفحات : ۱۳۲
ناشر : مجلس ترقی ادب ۔ کلب روڈ ۔ لاہور
قیمت : دو روپے پچھتر پیسے

یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے کہ مجلس ترقی ادب لاہور نے ایسے جدید ڈراموں کی طباعت و اشاعت کا انتظام کیا ہے جو ہمارے ملک میں اسٹیج

کیے جا چکے ہیں اور جنھیں آیندہ بھی اسٹیج کیا جا سکتا ہے
کی ترقی میں جہاں اور بہت سے موانعات ہیں ، وہاں اچھے ڈر
موجود نہ ہونا بھی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ہمارا ادب اسٹیج
کے باب میں ابھی تک تہی دامن ہے۔ مجلس ترقیٔ ادب کی یہ کوش
اسٹیج سے دلچسپی رکھنے والی جماعتوں کو مناسب ڈرامے بھی
رہیں ، ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔ آر ، یو ، آر اسی سلسلے کی ایک کڑ
یہ ڈراما ویسے تو کیریل چپیک کا لکھا ہوا ہے جس نے ۱۹۲۰ء میں
یورپ کے اسٹیج پر جنم لیا اور غیر معمولی شہرت حاصل کی ، لیکن
آر ، یو ، آر کے اس اردو قالب کو ہماری نظر میں اہم بناتی ہے وہ یہ
اس کا اردو ترجمہ ۱۹۳۲ء میں پطرس مرحوم نے کیا اور گورنمنٹ کالج
کے ڈرامیٹک کلب کی جانب سے اسے اسٹیج بھی کیا۔ اس کھیل میں
مرحوم نے الکوسٹ کا جو آر ، یو ، آر کے کارخانے کا کلرک ہے اور
امتیاز علی تاج نے ڈومین کا جو کارخانے کا جنرل منیجر ہے اور کھیل کا مر
کردار ہے ، رول ادا کیا۔ یہ رول ، بقول تاج صاحب ، اسٹیج پر ان کا
رول تھا ۔ اس کھیل کا ایک ناقص مسودہ جو کھیل کے ابتدائی تین ای
پر مشتمل تھا ، تاج صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ اس ڈرامے کی تاریخی ۔
اور اس کی افادیت کے پیش نظر تاج صاحب نے اس کے چوتھے ایکٹ
جو کھیل کا دراصل تتمہ ہے ، خود ترجمہ کیا اور اسے کتابی شکل ۔

آر ، یو ، آر دراصل راسمز یونیورسل روباٹ کا مخفف ہے۔ روباٹ
لفظ مشینی آدمی یا خود کار آدمی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چو
اس نئی مخلوق کا موجد راسم تھا اس لیے اس کی نسبت سے یہ مخلوق ر
کے روباٹ کہلائی۔ ان روباٹوں کے قافلے دنیا کے جس جس علاقے
پہنچے ، وہ نکلے ہوئے راسم ہی کے کارخانے کے تھے ، اس لیے ان کی یونیور
یا آفاقی حیثیت بھی مسلم ہے۔

یہ کھیل جدید زندگی کے میکانکی نتائج پر ایک طنز ہے اور بیسو
صدی میں مرکزی نظام حکومت پر مشینی غلبے سے پیدا ہونے والے مسائ
سے تعلق رکھتا ہے۔ روباٹ جن کی تخلیق کا مقصد سوائے اس کے کچ
نہ تھا کہ انسان محض آرام طلب بنے اور یہ نوزائیدہ مخلوق صرف محنت کشر
مگر جیسے ہی ان کل کے پتلوں میں احساس اذیت کو جگایا گیا انھوں ۔

اپنے خلاق یعنی انسان کے خلاف بغاوت کر دی ۔ بظاہر کھیل کا طنزیاتی رخ ہمارے میکانکی دور کی لائی ہوئی بلاؤں کی طرف ہے لیکن ہمارے سرمایہ دارانہ نظام کی بعض بڑی دلچسپ حقیقتوں کی طرف پڑھنے والے کی توجہ مبذول ہو جاتی ہے ۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم انسانوں ہی میں ایک بڑی اکثریت روباٹوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہے ۔ ان کی زندگیوں میں سوائے جفا کشی اور محنت و مشقت کے کوئی اور پہلو بیدار ہی نہیں ۔ لیکن کچھ عرصے سے ان انسانی روباٹوں میں بھی ھل چل پائی جاتی ہے جیسے ان کے اندر احساس اذیت جاگ پڑا ہے ۔ آج ان کے مطالبات سے اسمان گونج رہا ہے ، اور وہ انسانی برادری کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف بر سر پیکار ہیں ۔

اس کے علاوہ ، جب انسان نے اپنے خالق کے خلاف بغاوت کر رکھی ہے تو کیا تعجب ہے کہ روباٹ بھی اپنے خالق کے خلاف بغاوت نہ کریں ۔ یہ تو نسل انسانی کا ورثہ ہے ، اور روباٹ بھی اس کا حق رکھتے ہیں ۔

کھیل کا مجموعی تاثر بڑا اخلاقی اور خوشگوار ہے ۔

آر ، یو ، آر ایک دلچسپ اور مفید ڈراما ہے اور طنز کا ایک مخصوص انداز رکھتا ہے ۔ اسٹیج اور ڈراموں کی انجمنوں کے لیے جہاں اس کی حیثیت ایک سوغات کی ہے ، وہاں عام پڑھنے والوں کے لیے بھی یہ کھیل دلچسپی سے خالی نہیں ہے ۔ [صمدانی نقوی]

غزال و غزل

مصنف : سراج الدین ظفر

صفحات : ۲۱۲

قیمت : دس روپے

ناشر : فیروز سنز ۔ کراچی

کتاب کے شروع میں مصنف نے '' حرف شوق '' کے عنوان سے فکر و فن کے بارے میں کچھ باتیں کہی ہیں جن کی روشنی میں ان غزلوں کا مطالعہ کرنا مفید ہو گا ۔ کہتے ہیں :

" اس (میری شاعری) کا سفر شوق کہیں ختم نہیں ہوتا جب تک وہ اس بحر بیکراں تک نہ پہنچ جائے جس کا ایک کنارہ ازل ہے اور دوسرا ابد ، اور یہاں پہنچ کر وہ اس نور حقیقی سے مل جاتی ہے جو اس کا منبع بھی ہے اور مرجع بھی ۔ اس طوفانی سفر میں وہ اپنی آلودگی حوادث کی تد آور چٹانوں کی پیشانی پر چھوڑ جاتی ہے اور خود بحر نور تک پہنچتی ہے تو خود بھی نور ہوتی ہے " ۔

مجموعے میں شمولہ غزلوں سے اس قول کی صداقت کا احساس ہوتا ہے ۔ در حقیقت ان کی شاعری کا بنیادی محرک ذوق جمالیات اور مقصد تعاین حسن ہے ۔ شاعر کا احساس جمال نہایت لطیف اور نشاط آفریں ہے اور لذت حسن کے اعلیٰ مدارج کا رمز شناس ۔ ان غزلوں میں جگہ جگہ حسن کی سحر کاریاں ، رعنائیاں اور رنگ و آہنگ ، کیف و سرور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ اس کے علاوہ اس شاعری میں آفاقیت بھی ہے ۔ شاعر نے اپنے دور کے ہنگامی واقعات و حوادث کو نظر انداز کر کے اپنی نظر کو زندگی کے کچھ ایسے پہلوؤں پر مرکوز رکھنے کی کوشش کی ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا اور آلائشوں سے پاک ہیں ۔ ان غزلوں میں جو مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں ، وہ ہنگامی نہیں انسانی ہیں ۔ ہر قوم اور زمانے کا انسان اپنے شعوری امکانات کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی نہ کسی صورت سے ان مسائل کا حل تلاش کرتا رہا ہے ۔ اس طرح کی شاعری میں عالمگیر جاذبیت ہونے کا یہی بنیادی سبب ہے ۔

رہی شاعر کے نقطۂ نظر کی بات ، ان کا کہنا ہے :

مری غزل ہے ظفر عصر نو کا آئینہ
قدیم رنگ سے ہے بغض للہی مجھ کو

اسی خیال کا اظہار " حرف شوق " میں بھی ملتا ہے جہاں یہ اور کہا گیا ہے " کوئی میرے کلام کو ایک صوفی کا کلام سمجھ کر پڑھے یا رند کا ، یہ اس کا اپنا شعور ہے ۔

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نہ جست اسرار من "

لیکن اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ آخر یہ غزلیں کن معنوں میں عصر نو کا آئینہ ہیں ، لہذا اس پر خود غزلوں کی روشنی میں غور کرنا ہو گا ۔ مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ غزلیں ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہیں جو جدید و قدیم کے امتزاج سے شکل پزیر ہوا ہے ۔ روایات کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہونے کے باوصف اس پر جدید زندگی اور احساس و خیال کے نمایاں نقوش جلوہ گر ہیں ۔ جہاں ایک طرف ہمیں ان غزلوں میں تلاش حقیقت اور ذوق انکشاف کے لیے ایک صوفی کی سی بے پناہ آرزو کا احساس ہوتا ہے ، وہیں عصر حاضر کے شبستان کے ''نحوردہ گزند غزال'' اور شب یلدا میں اجالے گھولنے والے جام شراب کی تصویریں بھی ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ یہ سب چیزیں نئی زندگی کی نمایندگی کرتی ہیں ۔ اس کے علاوہ ان غزلوں کی جذباتی فضا بھی غزل کے روایتی عشق و تصوف کے داخلی تجربات و واردات سے قطعی مختلف ہے ۔ اس فضا میں قدیم غزلوں کے مجازی یا حقیقی عشق کی گنجائش نہیں ۔ خود سپردگی کا وہ والہانہ جذبہ جسے عشق کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ایثار و وفا جس کی لازمی شرائط تصور کی جاتی ہیں ، اس فضا سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ یہاں روح ذوق نظر کے لیے تڑپتی اور آزادانہ لذت اندوزی کی تمنا رکھتی ہے ۔

ظفر کی غزلوں میں ہمیں کیف و انبساط کا جو ایک زیریں دھارا بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے ، اس کا منبع دراصل جدید زندگی اور سماج کے یہی حقایق ہیں ۔ وہ جب مرمریں جسم کے نشیب و فراز ، بانہوں کے لوچ ، بدن کے گداز اور خطوط اور سینوں کے زاویوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر غزل کے روایتی تصورات نہیں ہوتے بلکہ نئی زندگی میں گوشت پوست کی جیتی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں جو اپنے حسن و جمال سے نگاہوں میں روشنی اور دلوں میں حرارت پیدا کرتی ہیں ۔ اس نئی فضا کا کچھ اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے :

نئے آہو کہ روایت کے نہیں ہیں قائل
اک نیا مکتبۂ رامش و رم رکھتے ہیں

ہمارے دور جوانی میں آہوان بہار
سلامتی سے سر گلستاں نہیں گزرے

شعور رم انھیں آئے تو کس طرح آئے
نئے غزال نخوردہ گزند ہوتے ہیں

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں تسلسل بیان کی گنجائش تو بہت کم ہوتی ہے لیکن خلوص اور جذباتی ہم آہنگی کا ہونا لا ممکن ہے۔ ایسی جذباتی ہم آہنگی ظفر کی غزلوں میں بھی ملتی ہے۔ موضوع سے شغف فن میں جو خلوص پیدا کرتا ہے ، اس کی بھی ان کے یہاں کمی محسوس نہیں ہوتی ۔ جذبات میں شدت ہے لیکن ان کے اظہار میں کلاسیکی ضبط کار فرما نظر آتا ہے ۔

اسلوب سے متعلق مصنف نے کہا ہے :

" جس طرح میرے خیالات بیشتر لوگوں سے جدا ہیں ، میرا اسلوب شاعری بھی جدا ہے ۔ میں نے غزل کے روایتی قالب کی حدود میں رہ کر غزل کی دوسری سب روایتوں کے تانے بانے کو توڑ کر رکھ دیا ہے ۔ میرا اسلوب غزل کا اسلوب نہیں ہے ، میرے فرط شوق کا اسلوب ہے ۔ میرا شوق الفاظ کے لغتی معانی کا اسیر نہیں ، یہ انھیں اپنے وضع کردہ معانی دیتا ہے۔ الفاظ میرے شوق کے روبرو نئے معانی کی پازیب پہن کر رقص کرتے ہیں اور لغتی معانی کو روندتے چلے جاتے ہیں ۔ دیر و حرم ، شاہد و گل ، مے و میخانہ ، غزال و غزل ، زلف و گیسو ، یہ سب میرے شوق کے استعارے ہیں جو شوق کی مختلف کیفیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں " ۔

یہ بیان بھی کسی قدر وضاحت طلب معلوم ہوتا ہے کیوں کہ شاعر نے غزل کی کن روایتوں کے تانے بانے کو توڑا ہے ، جب تک یہ نہ بتایا جائے اس کی تصدیق ممکن ہے نہ تکذیب ۔ اگر مراد صرف یہ ہے کہ شاعر کے جذبات زندگی کے نئے تصورات کی ترجمانی کرتے ہیں اور وہ الفاظ کو حسب ضرورت نئے جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو یہ بات ایک بڑی حد تک صحیح ہے۔ شوق کی مختلف کیفیات کی طرف فنکارانہ اشاروں کی بات بھی بجا ، لیکن یہ کوئی ایسی نئی بات معلوم نہیں ہوتی جسے روایت شکن قرار دیا جا سکے یا جو غزل کی مسلمہ روایات کے خلاف ہو ۔ کسی بھی اچھے غزل گو سے یہ توقع کی جانا چاہیے کہ وہ

و اپنے اظہار جذبات کے لیے مفید آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کی رکھتا ہے۔ غزل میں الفاظ کو ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہ انہیں استعارات و علائم کے طور پر استعمال کرنے کی روایت بھی انی ہے۔ غزل میں الفاظ سے نئے علائم کا کام لینے اور مروجہ علائم مفاہیم کے لیے استعمال میں لانے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے، جس بھی نہ جانے کتنے غزل کو فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بات نئی کہتے ذبات نئے ہوتے ہیں لیکن الفاظ کا علامتی استعمال اسلوب میں غرابت دا ہونے دیتا۔

اپنے خیال کی وضاحت کے لیے مصنف نے اپنے چند اشعار کی جو تشریح اس سے یہ بات اور بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ خود مصنف غزلوں میں الفاظ کو جس طرح استعارات و علامات کے طور پر استعمال ، وہ غزل کی روایات کے عین مطابق ہے۔ یہ اسلوب شاعر کے موق " کا اسلوب سہی مگر یہ ہے غزل ہی کا اسلوب۔ مثلاً ایک ، :

کھلتا نہ تھا کہ کیا ہے خم زلف دلبراں

کل رات ناگہاں یہ معما بھی حل ہوا

اس کے متعلق لکھا ہے " شاہد ازل کی زلف کی کوئی چھوٹی سی گرہ کبھی کسی صاحب شوق و نظر کے ناخن ادراک سے اتفاقاً کھل جاتی ظاہر ہے کہ " خم زلف دلبراں " اور " معما حل ہونے " سے جو ستعار لیے گئے ہیں، وہ غزل کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اسی طرح ر اور ہے :

جام اٹھا کر کیجیے رقص ابر نیساں کی طرح

جو صدف آئے نظر اس میں گہر رکھ دیجیے

اس کی یوں تشریح کی گئی ہے : " والہانہ شوق میں فیض رسانی کا موجود ہے "۔ صدف میں گہر رکھنے سے فیض رسانی مراد لینے کو روایت شکن جدت قرار دینا بھی قرین قیاس نہیں ہے۔

بہر نوع یہ تو محض ایک ضمنی بحث تھی - اصل حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف کو غزل کی ٹیکنک اور فن پر بڑا عبور حاصل ہے۔ ان غزلوں کی پوری فضا میں ایک نئی زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان میں جمالیاتی، جذباتی اور فکری عناصر کا ایک دلکش امتزاج ہے جو کسی بھی سنجیدہ قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا - ساتھ ہی یہ غزلیں شاعر موصوف کی منفرد شخصیت کو پوری طرح نمایاں کرتی ہیں - ان اوراق میں مصنف کے لطیف احساسات کے حسین مرقعے نظر آتے ہیں - یہ کتاب اردو کے شعری ادب میں یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ [را جندر ناتھ شیدا]

ڈاکٹر بارکر کی اردو کتابیں :

اردو زبان کو باہر کی دنیا سے روشناس کرانے اور اس کے حلقے کو وسیع کرنے کے لیے پہلا بنیادی کام اچھی کتابوں کی فراہمی کا ہے۔ ادھر چند سال پہلے ریاست ہائے متحدہ اورکنیڈا میں اردو پڑھاتے ہوئے اچھے نصاب کی کمی بری طرح محسوس ہوتی تھی - انگریزوں نے اس سلسلے میں اچھا خاصا کام کیا تھا، لیکن ایک تو وہ کتابیں اب دستیاب نہیں، دوسرے انھوں نے نصابی کتابوں کو اپنی سامراجی ضرورتوں کے پیش نظر مرتب کیا تھا - پھر اب پڑھانے کے طریقوں میں بھی خاصی تبدیلی آگئی ہے، اور لسانیات کے جدید تقاضوں پر پرانی کتابیں پوری نہیں اترتیں - چنانچہ ادھر اس کام کو از سر نو شروع کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا ریڈر جان گمپرز اور چودھری محمد نعیم کا کیلی فورنیا سے شائع ہوا تھا - اس کے بعد ایک ثانوی ریڈر ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور عظیم حسین کی مشترکہ کوششوں سے شائع ہوا - نعیم صاحب ابتدائی اردو کے بعد تعلیم کو جاری رکھنے والوں کے لیے اردو نظم و نثر کا ایک ستھرا انتخاب بھی پیش کر چکے ہیں - حال ہی میں انھوں نے ابتدائی نصاب کو از سر نو مرتب کیا ہے۔ ارنسٹ بینڈر کی کتاب اردو گرامر اور ریڈر بھی انھیں دنوں شائع ہوئی ہے۔ راقم الحروف نے زبان کی سطح سے آگے بڑھ کر اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اردو کی ادبی نثر کا ایک جامع انتخاب تیار کیا ہے جو وسکانسن یونی ورسٹی پریس سے "ریڈنگز ان لٹریری اردو پروز" کے نام سے پچھلے سال شائع ہوا ہے - اس سلسلے کی تازہ ترین کتابیں ڈاکٹر محمد عبد الرحمان بارکر نے مرتب کی ہیں ان کے نام یہ ہیں :

۱- ابتدائی اردو (تین جلدوں میں) صفحات تقریباً ایک ہزار
۲- اردو اخباری زبان - صفحات : ۴۰۴
۳- بزم نو (اردو شاعری کا ریڈر) صفحات : ۲۷۴

ڈاکٹر بارکر کئی برس ہندوستان اور پاکستان میں گزار چکے ہیں اور مشرف بہ اسلام ہوچکے ہیں - وہ اردو کے ان چند غیر ملکی اسکالروں میں سے ہیں جن کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے - وہ میکگل یونی ورسٹی کے ادارہ علوم اسلامیہ میں عربی اور اردو کے استاد ہیں - لسانیات میں کیلی فورنیا یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کرچکے ہیں اور امریکہ کی انڈین زبانوں پر ان کا کام قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے - اردو اور عربی کے علاوہ ڈاکٹر بارکر بلوچی زبان میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں ، اور ان دنوں بلوچی لسانیات پر کام کر رہے ہیں - اس دور میں کینیڈا میں اپنے کام اور اردو دوستی کی وجہ سے انھوں نے گارساں دتاسی کی روایت کو دوبارہ زندہ کیا ہے اور اردو سے متعلق مندرجہ بالا کتابیں مرتب کر کے اردو کی بے حد اہم خدمت انجام دی ہے - بارکر صاحب کو اردو کی کتابیں جمع کرنے اور مخطوطات کی فراہمی کا بھی بے حد شوق ہے - ان کے کتب خانے میں اردو کے مخطوطات بڑی تعداد میں موجود ہیں - انھوں نے اردو کی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا ہے ، اس کے لیے وہ پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں -

ابتدائی اردو تین جلدوں میں ہے - پہلی جلد میں صوتیات ، رسم الخط ، اور گرامر کے درس ہیں - دوسری میں اردو کے اسباق ہیں اور تیسری میں وضاحتی فرہنگ ہے - مولف نے اردو کی بنیادی گرامر اور صوتیات کو لسانیات کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں پیش کیا ہے - اس سلسلے میں مرتب نے حسن محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے - فرہنگ بھی بڑے سلیقے سے مرتب کی گئی ہے - مکالمے اور اسباق مفید مطلب ہیں اور ان کے ذریعے طالب علم اردو کے علاوہ کلچر سے متعلق بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے -

دوسری کتاب " اردو اخباری زبان " میں ۲۰ اسباق کے تحت پاکستان کے اردو اخباروں سے اقتباس پیش کیے گئے ہیں - ہر سبق کے ساتھ نئے الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں ، اور گرامر اور ترجمے کی مشقیں بھی شامل کی گئی ہیں - ان کی بدولت یہ کتاب صحافتی اردو کا کامیاب ریڈر بن گئی ہے - بارکر

صاحب کا Urdu Newspaper Word Count عن قریب شائع
والا ہے ، جس سے صحافتی اردو کی حدود کا تعین کرنے میں آسانی ہوگی

• تیسری کتاب '' جدید اردو شاعری '' کا ریڈر ہے - اس میں مر
اردو کے جن اٹھارہ '' جدید '' شاعروں کا کلام پیش کیا ہے -
اسمائے گرامی یہ ہیں - سلطان حسین ایمن ، محمد صدیق ثاقب ، حبیب
احسان دانش ، ثریا زیبا ، طفیل ہوشیار پوری ، غلام قطب‌الدین احمد ف
پروین سید فنا ، فیض جھنجھانوی ، سید محمد قاسم رضوی ، قمرالدین احمد
محمد حیات خان کوثر نیازی ، محمد ذکی کیفی ، فضل‌الدین گوہر ، احمد
قاسمی ، ایوب شاہد نسیم ، سید علی منصرم خان نقوی‌الواسطی نظر ، اور
سبط حسن ہوش ترمذی - بارکر صاحب نے ان سب کی تین تین چار چار
پیش کی ہیں - اس کے بعد انگریزی میں لفظی اور آزاد ترجمہ الگ الگ
ہے - آخر میں جامع فرہنگ ہے - اس کتاب کی تیاری میں بارکر صاحب
جو خون جگر بہایا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے - لیکن تعجب
بات کا ہے کہ شاعروں کا انتخاب کرتے ہوئے کیا اصول پیش نظر رہے
احمد ندیم قاسمی اور احسان دانش یا کسی حد تک فیض جھنجھانو
حبیب جالب سے قطع نظر باقی تمام شاعروں کو برصغیر ہند و پاک
کے منجمدہ ادبی حلقوں میں ان کو بہ حیثیت شاعر کے کوئی جانتا
نہیں - خاطر نشان رہے کہ زیر نظر کتاب مغربی کرہ ارض سے '' ج
اردو شاعری '' کے تعارف میں شائع ہونے والی پہلی باقاعدہ تالیف ہے -
لیے مشاعرہ باز قسم کے شاعروں کی شمولیت اور بھی تکلیف دہ ہے
کیونکہ اس کتاب کے ذریعے غیر ملکی طلبہ جدید اردو شاعری کے بارے
جو بھی رائے قائم کریں گے ، وہ حقیقت سے دور ہوگی - افسوس اس بات کا ہو
ہے کہ ڈاکٹر بارکر نے اپنی علمیت ، لسانی مہارت اور اپنے بیش قیمت و
کو ان شاعروں کے حد درجہ رسمی اور ناقابل اعتنا کلام کے تراجم کرنے
حواشی لکھنے پر صرف کیا - کتاب پر بارکر صاحب کے ساتھ شریک مرتب
کی حیثیت سے خواجہ محمد شفیع دہلوی اور جہانگیر ہمدانی کے نام بھی شامل
ہوئے ہیں - اگر انتخاب میں ان لوگوں کا مشورہ بھی شامل رہا ہے تو ظاہر
ہے کہ ان لوگوں نے نہ صرف بارکر صاحب کو (بہ استثنائے چند) لاہور کے
'' مقامی '' شاعروں کے سپرد کر دیا بلکہ انہیں اچھے شاعروں کے ملنے سے

بھی باز رکھا - یا پھر یہ یقین کر لینا چاہیے کہ یہ دونوں حضرات جانتے ہی نہیں کہ اردو میں "جدید شاعری" سے مراد کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں ! اسے ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اردو کے اچھے شاعروں کی سب سے بڑی تعداد لاہور ہی میں ہے -

ڈاکٹر بارکر کو چونکہ عربی پر بھی عبور حاصل ہے ، اردو عروض اور شعری اصول و ضوابط پر ان کی نظر نہایت گہری ہے - چنانچہ کتاب کی جان ڈاکٹر بارکر کا وہ ضمیمہ ہے جو انھوں نے "اردو شعریت" پر لکھا ہے - اس ضمیمے میں ان کی علمیت کے جوہر صحیح معنوں میں کھلے ہیں ، اور اسے بجا طور پر ان کا کارنامہ کہا جاسکتا ہے - انگریزی کے ذریعے اردو شاعری سے لطف اندوز ہونے والا کوئی بھی شخص اس ضمیمے سے صرف نظر نہیں کرسکتا - قطع نظر شاعروں کے غلط انتخاب کے ڈاکٹر بارکر کا کام اعلیٰ پائے کا ہے اور اس کارنامے کے لیے وہ لائق ستائش ہیں - مندرجہ بالا تینوں کتابیں میکگل یونیورسٹی پریس ، مانٹریال ، کینیڈا سے بڑے سائز پر نہایت حسین و جمیل شائع ہوئی ہیں اور کتابت و طباعت کا نیا معیار پیش کرتی ہیں

[ڈاکٹر گوپی چند نارنگ]

سہ ماہی اردو

خصوصی شمارہ بیاد غالب

(حصہ اول)

★ صفحات ساڑھے پانچ سو ★ ٹائپ کی طباعت

★ سفید کاغذ ★ رنگین سرورق

★ قیمت آٹھ روپے

اس شمارے کے مصنفین

مولانا امتیاز علی عرشی ، قاضی عبدالودود ، مولانا غلام رسول مہر ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ، ڈاکٹر وحید قریشی ، ڈاکٹر وزیر آغا ، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ، پروفیسر ممتاز حسین ، پروفیسر عبدالقوی دیسنوی ، سید محمد تقی ، جمیل جالبی، ڈاکٹر سہیل بخاری ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر عبدالغنی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، مخمور اکبر آبادی ، نادم سیتا پوری ، کلب علی خاں فائق ، سید مرتضیٰ حسین فاضل ، محمد علی صدیقی ، مسلم ضیائی ، لطیف اللہ ، سید صمد حسین رضوی ، سید معین الرحمان ، جلیل قدوائی ، شمیم احمد۔

لغت کبیر اردو

مؤلفہ
بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم

(قسط ۱۱)

آستین نکالنا ــ تا ــ آسن

— نکالنا (ف م) ۱- آستین کہنی یا شانے پر سے پھاڑ دینا ۔ م : ایک هی بار کے پہننے میں آستین نکال‌دی ۔ ۲- اس طرح بیونت کرنا کہ آستین کو بھی کافی هو ۔ م : اسی کپڑے میں سے آستین بھی نکالو۔

— نکلنا (ف ل) ۱- آستین کی مقدار کے موافق کپڑے کی گنجائش هونا (خیاطی) م : اس کپڑے میں آستین نہیں نکل سکتی ۔ ۲- آستین پھٹنا ۔ م: کہنیوں پر سے آستین نکلی هوئی ، پھٹے کپڑے برا حال ۔

اسٹھی (ص مث) (تعمیر) چھپر یا کھپریل کے ٹھاٹ کی بغلیوں کو سنبھالنے والی لکڑی ۔ دیوار کا سلامی دار یعنی ڈھالواں پاکھا ۔ [ہ ۔ س : آستھا (= سہارا)]

آسُر (مذ) دیو ، بھوت ، شیطان ، عفریت ۔ (دیکھو) ''آسر'' جو صحیح هے) [ہ : آسر ، اسر ۔ س : اسر]

اسّو (ص) قصابوں کی اصطلاح میں دس روپے ۔ (عربی لفظ '' عشر '' بمعنی دس کا بگاڑ)

اسرا (مذ) ۱- بھروسا ، تکیه ، توکل ۔ ع :

بندے کو آسرا هے فقط اس کی ذات کا (داغ)

۲- آس ، امید ، سہارا :

میں جیتی هوں اس آسرے پر فقط
که هوتا هے تجھ سے مرا غم غلط
(میر حسن)

۳- ضامن ، کفیل ، شفیع ، وسیله

سب ترے آسرے یه بیٹھے هیں
کس کو اپنا میں آسرا لاؤں

۴- ملجا ، ماوی ، پناه‌گاه ، حامی مددگار ۔

جز لطف یار اپنا اور آسرا نہیں ہے (میر

۵۔ دستگیری، اعانت، امداد (بجائے سہارا) ۔ م
آدھ سیر آٹا (آٹے) کا سرکار سے آسرا ہوجائے ۔ ۶
اعتبار، اعتماد، یقین ۔ م : پردیسی کا کیا آسرا نہ جانے
کب واپس آئے ۔ ۷۔ دست نگری، محتاجی ۔ م : اپنے
ڈب پیسا تو پرایا آسرا کیسا ! (کہاوت) ۸۔ بچاؤ کی
جگہ، اوٹ، آڑ، سایہ ۔ م : چراغ کو آسرے میں
رکھ دو۔ [ہ : آسرا ۔ س : آشریہ ۔ اپ : آسیہ ۔ پراکرتی
گجراتی : آسرو]

— آٹھنا (ف ل) توقع درمیان میں نہ رہنا، بھروسا جاتا رہنا۔

اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

(رباعیات حالی، صفحہ ۱۰۸)

— باندھنا (ف م) امید لگائے رہنا، توقع میں رہنا، تکیہ کرنا :

ترے دروازے پر بیٹھے ہیں تیرا آسرا باندھے
(سرور)

— بندھانا (ف م) ۱۔ امید دلانا، ڈھارس بندھوانا۔

ہے عام خطاب، یا عبادی
اس نے تو کچھ آسرا بندھایا (حالی)

— بندھنا (ف ل) دیکھو ''آسرا باندھنا'' جس کا یہ لازم ہے۔
م : آسرا بندھتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے۔

— پکڑنا (ف م) ۱۔ سہارا لینا ۔ م : دیوار کا آسرا پکڑ لیا ورنہ
گرتا ۲۔ حمایت، مدد چاہنا، دست نگر بننا ۔ م : اپنے
ہاتھ پانو کے ہوتے کسی کا آسرا کیوں پکڑیں ۔ ۳۔ امید
باندھنا، توقع لگانا، بھروسے ہونا ۔ م : ایک علاج کو
چھوڑا دوسرے کا آسرا پکڑا اس سے بھی فائدہ نہ ہوا۔

۴۔ (مجازاً) ہاتھ تھامنا، دامن سے لگنا، شادی کر لینا۔
م: جوان وانڈ کب تک پڑی بھرے گی، کسی بھلے آدمی کا آسرا پکڑ کے بیٹھ کیوں نہیں جاتی۔

تکنا (ف ل) ۱۔ امداد کی امید اور بھروسے پر بسر کرنا۔
م: اپنے ہاتھ پانو کیوں نہ ہلائے جو دوسروں کا آسرا تکے! ۲۔ راہ دیکھنا، منتظر بیٹھنا:

آسرا تکتے ہو ناحق بت ہرجائی کا (اشرف)

ٹوٹنا (ف ل) دیکھو آس ٹوٹنا۔ م: مجھ گنہگار کا یہ آخری آسرا بھی نہ ٹوٹ جائے۔ (گوہر مقصود، راشد الخیری صفحہ ۸۷)

توڑنا (ف م) ۱۔ آس توڑنا، مایوس کرنا۔

کیوں یاس توڑتی ہے مرے دل کا آسرا
یہ گھر اجڑ گیا تو بسایا نہ جائے گا
(امیر مینائی)

۲۔ بے سہارا کر دینا، سہارے سے محروم کرنا۔

حکم یہ ہے کہ نہ آئے مرے دروازے پر
آسرا تو نے غریبوں کا صنم توڑ دیا (امیر)

۳۔ امید چھوڑ دینا، بھروسے نہ رہنا، بے نیاز ہونا۔
م: بندوں کا آسرا توڑ دیا خدا کے بھروسے ہو بیٹھے۔

دینا (ف م) ۱۔ سہارا دینا، مدد دینا، تکیے کا آسرا کر کے بیٹھنا۔ ۲۔ امید دلانا، متوقع کرنا۔ م: جھوٹا آسرا دے کر اس سے اپنا کام نکالا۔

ڈھونڈنا (ف م) پناہ یا سہارے کا متلاشی ہونا، دستگیری چاہنا:

جس کو اللہ کا بھروسا ہو
کیوں کسی کا وہ آسرا ڈھونڈے (منظر)

— رکھنا (ف م) امید و توقع رکھنا ، بھروسا کرنا :

آسرا رکھتا ہے یہ بندہ خدا کی ذات کا (بحر)

— رہنا (ف ل) ۱۔ امید ، توقع یا بھروسا قائم رہنا :

تو ، فلک ، مرگ ، ہم سے سب غافل
اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا (مومن)

۲۔ سہارا رہنا ، مدد رہنا ۔ م : اتنا بھی نہ چھوڑا کہ
بال بچوں کے لیے کچھ آسرا رہتا ۔

— کرنا (ف م) ۱۔ تکیہ ، توکل کرنا ، بھروسا رکھنا ، اعتماد
کرنا :

آسرا کس کا کریں ہم وا دریغا یا نصیب (سودا)

۲۔ امید باندھنا ، توقع لگانا ۔ م : فقیر بھی آسرا کیے
دور سے چلا آ رہا ہے ۔ ۳۔ سہارے کا انتظام کرنا ۔
م : اس کے ٹکڑے روٹی کا آسرا کردو تو تمھارا کتا بن
کر پڑ رہے گا ۔

— لگانا (ف م) ۱۔ توقع باندھنا ۔ ۲۔ منتظر رہنا :

غریب دیر سے ہیں آسرا لگائے ہوے (اسیر)

۳ ۔ سہارا لینا ۔ م : تکیے سے آسرا لگا کر ذرا بیٹھے
ہوے تھے کہ غش آنے لگا ، پھر لٹا دیا ۔ ۴۔ روزی
روزگار سے کر دینا ، معاش کا ذریعہ بہم پہنچانا ۔ م :
خدا نے کہیں آسرا لگا دیا تو بال بچوں کی گزر ہوجائے
گی ۔ ۵۔ اڑواڑ دینا ، ٹیک لگانا ۔ م : آسرے لگا کر
ستون کو تھاما ۔

— لینا (ف م) دیکھو : آسرا پکڑنا (معنی اتاہ) ع :

آسرا وہ نہیں لیتے جو خدا رکھتے ہیں (آتش)

— ہونا (ف ل) ۱ تکیہ ، بھروسا ہونا ۔

ہاں آسرا ہے ساقی کوثر کی ذات کا
ہے ساغر شراب وسیلہ نجات کا (ناسخ)

۲- روزی روزگار ہونا - م : کچھہ آسرا ہو گیا تو بال بچے پل جائیں گے - ۳- گزر بسر کا سہارا ہونا ، اثاثہ ہونا - م : بال بچوں کے لیے کچھہ تو آسرا ہو ، یہاں تو کچھہ بھی نہیں -

آسر باد (مث) دیکھو : آشیر باد و اسیر باد -
[ہ : آسیر باد ، آشیر باد ، اسیر باد - س : آشیر باد]

آسرم (مذ) ۱- دیکھو : آشرم - ۲- (ہندہ) مذہبی زندگی کا آئین و قانون جس کے چار مدارج ہیں - م : اس ہندو مذہب میں چار آشرم یعنی آئین ہیں (آرائش محفل ، صفحہ ۳۱)
[ہ : آسرم ، س : آشرم]

آسرمی (ص) آسرم سے منسوب و متعلق - [آسرم + ی]

آسُری (مذ) آسُر یا بد روحوں سے متعلق - ۱- شیطانی ، ابلیسی- ۲- بھتنوں کی ، سفلی -
[ہ : آسری - س : آسری]

— مایا (مث) ۱- کید شیاطین ، ابلیسی حرکات یا فن فریب ۲- سفلیات -
[ہ : آسری + مایا]

آسرے رہنا (ف ل) سہارے ، بھروسے پر گزر کرنا ، تکیہ کرنا ، م : آدمی امید کے آسرے رہتے ہیں -

آسرے میں (مف) (دیوار ، چھپر ، سائبان وغیرہ کی) پناہ میں ، زیر پناہ یا اوٹ میں - م : چراغ آسرے میں رکھہ دو - م : آسرے میں آجاؤ باہر کیوں کھڑے ہو !

آسکت (مث) ۱- ہاتھہ پانو ٹوٹنا ، جماہی ، انگڑائی ، اونگھہ ،

م : انتظار میں خالی بیٹھے بیٹھے آسکت آنے لگی وہیں لیٹ گیا اور سو گیا ۔ ۲۔ سستی ، کاہلی ، آلکس ، ۳۔ سہل انگاری ، تغافل ، تساہل ۔ م : آسکت سے کام خراب ہوتے ہیں ۔ (مصادر : کرنا ، لانا ، ہونا ، [ہ : آسکت ۔ س : اشکت (مادہ : ش ک ۔ توانائی) آ (= نہ) + شکتی (= طاقت)

آسکتانا (ف ل) ۱۔ کاہلی کرنا ، الکسانا ۔ ۲۔ مٹھاپن کرنا ۔ م : کام سے آسکتانا ۔ نوکری پیشہ کو زیبا نہیں ۔ [ہ : دیکھو ' آسکت ']

آسکتی (ص) ۱۔ سُست ، کاہل ، مٹھا ، احدی ۔ م : آسکتی گرا کنوئیں میں کہا آج یہیں مقام کریں گے (مثل) م : رام بھجن کو آسکتی اور بھوجن کو تیار ! (مثل) (ہونا ، کرنا) [ہ : آسکتی ۔ س : آشکت]

آسمان (مذ) ۱۔ نیلا گنبد جو اس دنیا پر سر پوش کی طرح ڈھکا ہوا اور اس میں چاند ، سورج ، ستارے ، معلق نظر آتے ہیں ۔ زمین سے اوپر فضائے بسیط ، نظام فلکی ، گنبد گردوں ، چرخ ، فلک ، آکاش ، امبر ۔ ۲۔ ہوا کا طبقہ جس میں بادل دوڑتے ، بجلیاں چمکتی ، ہوائی جہاز چلتے اور پرند اڑتے پھرتے ہیں :

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں (مومن)

م : ہوائی جہازوں نے آسمان کو کھوند مارا ہے ۔ ۳۔ ہر ایک سیارہ منجملہ سبعہ سیارہ جو مقدرت پر حکمران سمجھے جاتے ہیں اور اپنا اپنا فلک (دائرہ گردش) جدا رکھتے ہیں (نجوم) :

رات دن چکر میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا (غالب)

۳- عالم بالا جہاں کہتے ہیں کہ پاک روحیں ، فرشتے اور دیوتا رہتے ہیں اور خدا کا عرش و کرسی ہے ۔ ملاء اعلیٰ ، بہشت بریں ، اندر لوک ، سورگ ، جنت :

حوروں کے ہوش اڑتے ہیں اڑنے کی شان پر
نیلم پری ہے نام مرا آسمان پر

(امانت)

۴- انتہائی بلندی ، رفعت کیوانی ، عرش معلیٰ ۔ (اکثر طنزاً یا مبالغے سے) معمولی سے زیادہ بلندی کے لیے مستعمل ۔ م : رہیں زمین پر دماغ آسمان پر ! م : لنگڑی کٹو آسمان پر گھونسلا ۔ ۵- افق ، مطلع ۔ م : آسمان پر چاند نکلا سب نے دیکھا (مثل) ۔ ۶- گھٹا ، بادل ، ابر ۔ م : آسمان گرجا آسمان برسا ۔ ۷- بارش ، برسات ۔ م : ساڑھے تین برس آسمان بند رہا یہاں تک کہ سخت کال پڑا (لوقا کی انجیل) ۸- اہل آسمان فرشتے وغیرہ ۔ م: زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے ۔ (شہر آشوب دھلی ، داغ) ۹- (مصوری) تصویر کا نیلگوں پس منظر ۔ م : مصور نے ایک کھجور کا درخت اور آسمان پر چاند نکلا ہوا اس سادگی سے دکھایا ہے کہ عرب کا سین کھینچ دیا ہے ۔ ۱۱- (ترکیب میں بطور مبالغہ) بمعنی بلند پایہ جیسے آسمان اورنگ ، آسمان جاہ وغیرہ:

عرض مجھ کو تری جناب میں ہے
اے شہنشاہ آسماں توقیر

(سالک ، صفحہ ۲۲٦)

[ف : آسمان ۔ پہلوی : آسمان ، اسمن ۔ اوستا : ا س م ن یا ا س م ۔ س : ۱- اشمن بمعنی پتھر ، ٹیلا ، پتھر کا بنا ہوا اوزار (۲) بجلی (۳) ابر ، آسمان ۔ کردی جانی : آس مالک (باقی بولیوں میں آسمان) ۔ بلوچی:

از مان ، اژمان ۔ افغانی : آسمان]

— پر اُڑنا (ف ل) ۱۔ لفظاً بہت بلند پروازی کرنا ، ہوا میں پرواز کرنا ۔ م : انسان زمین کی طنابیں تو کھینچ چکا تھا اب آسمان پر بھی اُڑنے لگا ۔ ۲۔ تیزیٔ طبع اور جودت دکھانا ۔ م : پڑھ لکھ گیا تو دیکھنا آسمان پر بھی اُڑنے لگے گا ۔ ۳۔ (الف) (طنزاً) قابلیت سے بالا باتیں کرنا ، ڈینگیں ہانکنا ۔ (ب) زمین پر پانوںنہ ٹکانا ، غرور سے بھر جانا ، اترانا ، م : ذرا سا پڑھ کیا لیا کہ لگے آسمان پر اُڑنے ۔

— پر پہنچا دینا (ف م) ۱۔ رتبہ بلند کر دینا ، حد سے زیادہ بڑھا دینا ، انتہا کو پہنچا دینا :

آسماں پر حسن نے پہنچا دیا دلدار کو (آتش)

م : تعریف کرنے پر آئے تو ایسے کہ آسماں ہی پر پہنچا دیا ۔ ۲۔ سخت مغرور کر دینا ، بگاڑ دینا ، بھڑوں پر چڑھا دینا ۔ م : تعریفیں کر کے اُن کو آسمان پر پہنچا دیا ۔ م : ان مفلوکان بازاری نے جمشید نابکار کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا ، ورنہ کہاں وہ زنگی بچہ کہاں دعوئی خدائی ۔ (۸۔ بوستان خیال ، صفحہ ۲۳۳)

— پر پہنچنا (ف ل) ۱۔ تا بہ فلک عروج پانا :

حضرت مسیح پہنچے تو کیا آسماں تلک
ہم گھر میں بیٹھے دیکھتے ہیں لامکاں تلک

۲۔ غرور سے بھر جانا ۔ م : زیادہ تعریفوں سے کہیں دماغ آسمان پر نہ پہنچ جائیں ۔ م : اُن کے دماغ تو آسمان پر پہنچے ہوئے ہیں ۔

— پر تھوکنا (ف م) ۱۔ بزرگوں کی برائی کرنا ، بڑوں پر طعنہ زن ہونا ۔ م : آسمان پر تھوکو گے تو منہ ہی پر آئے گا ۔

لیک جان اور بوجھ کر تو چوک مت
منہ اٹھا کر آسمان پر تھوک مت

(ایجاد رنگیں ، صفحہ ۰)

پر چڑھا دینا، چڑھانا ۔ (ف م) انتہا درجے کی شہرت دینا ، ڈھنڈورا پیٹنا ، تعریفوں کے پل باندھنا ۔ م : لکھنؤ کے چھاپے خانے والوں نے جس دیوان کو چھاپا آسمان پر چڑھا دیا ۔ (نثر غالب)۔ ۲۔ مرتبے وغیرہ میں مبالغہ کرنا ۔ م : اب اسلام آیا عورت کے حقوق کی نگہداشت کی ، نہ اس کو دیبی بنایا نہ پوجا کی ، نہ آسمان ہی پر چڑھایا ، نہ اندھے کنوئیں میں دھکا دیا ۔ (پڑھاپے کی برکتیں ، صفحہ ۸۰)

پر دماغ پہنچانا (ف م) مغرور بنا دینا ۔ م: تعریفیں کر کر کے دماغ آسمان پر پہنچا دیتے ہیں ۔

پر دماغ پہنچنا (ف م) ۱۔ مغرور ہونا ، نازاں و مفتخر ہونا ، اترانے لگنا ۔

وہ آفتاب حسن جو نکلے برائے سیر
پہنچے ابھی دماغ زمین آسمان پر (برق)

پر دماغ چڑھانا (ف م) دیکھو : آسمان پر چڑھانا ۔ م : تعریفیں کر کے دماغ آسمان پر چڑھا دیے ۔

پر دماغ چڑھنا (ف ل) ۱۔ غرور میں بھر جانا ۔ ۲۔ حد سے بڑھ جانا :

کیوں آسمان پر نہ چڑھے مغز کا دماغ
کھانے کو ہڈیاں سگ کوچۂ بتاں جھکا

(رشک)

پر دماغ رہنا (ف ل) دماغ دار اور مغرور ہو جانا ۔

آسمان پر دماغ یار رہا
کبھی جھک کر وہ مہ لقا نہ ملا (بحر)

— پر دماغ کھینچنا { (ف م) انتہائی غرور و تکبر کرنا ، بہت دماغ آپ کو بہت بڑا سمجھنا ، خاطر میں نہ لانا ۔

میں کس طرح بتوں کے سر سامنے جھکاؤں
دل تو دماغ اپنا کھینچے ہے آسمان پر
(مومن)

— پر دماغ ہونا (ف ل) ۱۔ مغرور ہونا ، اپنے تئیں بہت بڑا سمجھنا

جب سے اس مہ جبیں کے عاشق ہیں
آسماں پر دماغ ہے اپنا (ظفر)

۲۔ متکبر و بدخو ہونا :

آسماں پر دماغ یار کا ہے
خاکساروں پر التفات نہیں (اسیر)

۳۔ فخر و مباہات میں چور ، نہایت مسرور و ناز ہونا ، بہت اترانا ،

برق کا آسمان پر ہے دماغ
پھونک کر میرے آشیانے کو (مومن)

— پر قدم رکھنا (ف ل) غرور و نخوت اختیار کرنا ، دماغ دار ہو جانا اونچ کی لینا ۔ م : کیوں نہ ہو بڑے آدمی ہو گئے اب تو آسمان ہی پر قدم رکھیں گے ۔

— پر کلاہ پھینکنا { (ف م) (قدیم متروک) فارسی محاورے کلاہ بر آسمان انداختن یا افگندن کا ترجمہ ۔ خوشی منانا ، فخر کرنا :

آئے جو سیر کرنے اک بار وہ چمن میں
گل آسماں پہ پھینکیں اپنی سدا کلاھیں (سودا)

— پر کھینچنا (ف م) ۱۔ حد سے زیادہ غرور و تعلی کرنا ۔

خود کو وہ آسماں پہ کھینچتے ہیں
گور منہ پھاڑے آن پہ ہنستی ہے (نادان)

— پر لے اڑنا (ف ل) ۱- سرمست و مغرور کر دینا ، دماغ میں ہوا بھر دینا - م : دولت اوچھے کو آسمان پر لے اڑتی ہے ، ۲- خیالات کے پر لگا دینا ، عالم بالا کی خیالی سیر کرانا :

لے اڑی ہم کو آسمان پہ شراب (ناصر)

— پر ہونا (ف ل) ۱- لفظاً ، آسمان پر مقیم ہونا :

عیسیٰ ہے آسمان پہ مریض اس جہان میں

۲- پر لوک ، بہشت یا عالم ارواح میں ہونا - م : تلوار کے ایک ہی ہاتھ میں جسد خاکی زمین پر تھا اور روح آسمان پر - ۳- دسترس سے باہر ہونا - بہت اونچا ہونا - م: چھینکا تو آسمان پر ہے اتاروں کس طرح؟ ۴- غرور و نخوت میں مست ہونا - ۵- عالی رتبہ ، بلند مقام ہونا :

کچھ بھی مناسبت ہے یاں عجز ، واں تکبر
وہ آسمان پر ہیں میں ناتوان زمیں پر

(میر)

— پری (ث) (دیکھو : پری) - (عو) عورتوں کے اعتقاد میں یہ اور اسی قسم کی پریاں (مثلاً نور پری ، دریا پری وغیرہ وغیرہ) اور ہستیاں حضرت فاطمہ زہرا رض کی خدمت کرنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے خدا تعالیٰ نے آسمان سے بھیجی تھیں گویا ان کی کنیزیں تھیں - (دریائے لطافت ، صفحہ ۱۶۹)

— پھاڑ کے تھگلی لگانا } (ف م) ۱- لفظاً ، آسمان کا پردہ چاک کر کے اس میں پیوند لگانا (کٹنیوں کی صفت) نہایت چالاک ، عیار ، مکار ہونا ، بلا کے جوڑ توڑ جاننا - م : ان کو یہی ہنسی ہے تو آسمان پھاڑیں گی تھگلی لگائیں گی - (بیگمات کی چھیڑ چھاڑ ، ناصر نذیر فراق ، صفحہ ۴۰)

— پھاڑوں زمین کو تھگلی لگاؤں } (محاورہ) کہانیوں میں کٹنیاں ، دلالہ اپنی تعریف میں یہ کلمات کہتی ھیں - یعنی دلالہ پن کے عجیب و غریب کمالات دکھاؤں - ۱- زمین و آسمان چھان ماروں - م : کٹنی نے کہا کہ آسمان پھاڑوں زمین کو تھگلی لگاؤں تمھاری تمنا کو تمھارے پہلو ھی میں لا کر ملاؤں مگر انعام ٹھہرالو کہ کیا دو گے ؟ (کہانیاں) دیکھو : آسمان پھاڑے (زمین کو) تھگلی (لگائے) -

— پھاڑے تھگلی لگائے } حد درجے چالاک ، عیار - (عو) بلا کے جوڑ توڑ کرنے والی شیطان کی خالہ - م : کٹنی بھی کیسی کہ آسمان پھاڑے (زمین کو) تھگلی لگائے -

— پھٹ پڑنا (ف ل) ۱- دیکھو : آسمان ٹوٹ پڑنا -

پھٹ پڑے دشمن پہ یارب آسماں کونے دوست

(میر)

۲- لگا تار ، موسلا دھار برستا - م : یہاں ایک ھفتے سے آسمان پھٹ پڑا ھے ، گھروں میں بند بیٹھے ھیں سڑکوں پر کمر کمر پانی ھے -

— تانبا ھونا (ف ل) مارے گرمی اور تپش کے پگھلے تانبے کی طرح سرخ ، چرخ کھایا ھوا نظر آنا ، شدت کی گرمی پڑنا - م : آسمان تانبا ھو رہا ھے -

— تک جانا (ف م) اونچے اونچے خیالات کرنا - ارادوں کو بلند پرواز دینا - م : آسمان تک جاتے ھیں - ۲- عالم بالا کی خبریں لانا ، شیخیاں بگھارنا - م : پیر تو تھے ھی خدا رسیدہ ، مرید بھی آسمان تک جانے لگے -

— تکنا (ف م) ۱- آسمان کی طرف آنکھیں لگائے منتظر ھونا - ۲- بارش کے انتظار میں ھونا - م : بیچارے کسان اپنا روپیہ اور محنت زمین میں پھیلائے آسمان تک رہے ھیں - ۳- (پرند) اڑنا چاھنا ، پر تولنا - جیسے ، آسمان تک

ہی رہا تھا کہ چھپ پکڑ لیا - ۴- اپنی قوت پر غرور محسوس کرنا - ۵- (مرغ بازی) مرغ کا لڑنے کے لیے تیاری کی حالت میں ہونا -

— تھرانا (ف ل) فلک کا کانپ اٹھنا - ۲- مراد ، شدید حادثہ یا مظلمہ واقع ہونا - م : جب اس آسمان وقار کو پشت زین سے زمین پر گرایا ، زمین کانپی اور آسمان تھرایا -

زیر خنجر جب ترے مجروح نے نالہ کیا
کانپ کانپ اٹھیں زمینیں آسماں تھرا گئے (غافل)

— ٹل جانا (ف ل) ۱- (استعارہ) امر محال و غیر ممکن کا ظہور میں آنا ، (جزجملہ شرطیہ ہے اس کی خبر لفظ 'مگر' یا 'پر' کے ساتھ آتی ہے - ارادے کو اٹل اور حتمی ظاہر کرنے کے لیے مستعمل) - م : آسمان ہر چند ٹل جائے مگر میں نہ ٹلوں -

آسماں ٹل جائے پر ہرگز نہیں ٹلتا ہے قدر
ڈٹ گیا ڈیوڑھی پہ اب اٹھتا ہے میرا یار کب

ٹوٹ پڑنا (ف ل) ۱- لفظاً ، آسمان گر پڑنا- ۲- قیامت برپا ہوجانا ، عذاب الٰہی نازل ہو جانا -

خدا کے واسطے اتنا تو جھوٹ مت بولو
کہیں نہ ٹوٹ پڑے آسمان کوٹھے پر (نظیر)

۳- حادثہ سخت واقع ہونا (جیسے اکلوتے فرزند یا کماؤ کی ناگہاں ، ناوقت موت واقع ہو جانا) م : دلہن بیچاری پر یہ آسمان ٹوٹ پڑا کہ دولہا شادی کے تیسرے دن ہیضہ کر کے مر گیا -

رو کے کہتا تھا کوئی غم ہے بڑا
یک بیک آسمان ٹوٹ پڑا (مرزا شوق)

ٹوٹنا (ف ل) دیکھو : آسمان ٹوٹ پڑنا- ۱- قیامت آ جانا :

گور پر ساقی نے توڑا آ کے جب مینائے مے
ہم یہ سمجھے آسماں ٹوٹا ہماری خاک پر

۳۔ مصیبت پڑ جانا ۔

بے سبب آسماں ٹوٹا ہے
ہم سے یارو دیار چھوٹا ہے

(مثنوی عالم ، صفحہ ۹۳)

— جھانکنا (ف ل) دیکھو : آسمان تا کنا

— چھلنی ہونا (ف ل) لفظاً ، آسمان میں سینکڑوں چھید پڑجانا (استعارتاً) بارش معمول سے زیادہ جاری رہنے بولتے ہیں ۔

— خیز (ص) آسمان تک بلند ، اونچا ، بلند (کا مبالغہ) جیسے ، طوفان کی آسمان خیز موجیں ۔

— دور زمیں سخت (محاورہ) (دیکھو : زمین سخت آسمان دور) لفظاً آسمان اونچا اور زمین ٹھوس یعنی نہ آسمان پر چلا جا ممکن نہ زمین میں دھنس جانا ۔ بے بسی اور مجبوری میں کوئی چارہ کار نہ ہونے کو ان الفاظ سے ظا کرتے ہیں ۔ (فجائیہ کے طور پر مستعمل)۔

کرے کیا بشر بھی تو مجبور ہے
زمیں سخت اور آسماں دور ہے

(میر حسن

پر میں اب اس کو کیا کروں کمبخت
آسماں دور ہے زمیں ہے سخت

(مرزا شوق

— دیکھنا (ف م) ۱۔ امیدوارانہ منتظر کرم ہونا ، مایوسا نظریں آسمان کی طرف اٹھانا ۔ م : کھیتیاں سوکھی رہی ہیں سب آسماں کو دیکھے جا رہے ہیں ۔

وہ ماہرو نظر نہیں آتا تو اے حبیب
ہم بار بار دیکھتے میں آسمان کو

۲- متلی کو دفع کرنے کا ٹوٹکا - م: متلی ہو رہی ہے تو الائچی چباؤ ، آسمان دیکھو - (عو)

— ڈھانا (ف م) ستم توڑنا ، سخت صدمہ دینا - م: اللہ میاں میں نے تمہارا کیا کیا تھا جو تم نے یہ آسمان مجھ پر ڈھایا -

— زمین یا زمین آسمان (اکثر واو عطف کے ساتھ) (مذ) ۱- ارض و سما ، جہاں ، عالم - م: آخر یہ آسمان زمین خدا نے نہیں بنائے تو کس نے بنائے - ۲- عالم علوی اور عالم سفلی ، ہر دو عالم ، سارا جہاں ، زمانہ بھر - م: آسمان زمین کی خبریں تو ان سے سن لو ، گھر کی خبر ان کو نہیں - ۳- کائنات کی ہر شے ، کل کائنات - م: آسمان و زمین اس کے لیے روتے تھے - ۴- حالات و کوائف - م: واپس آ کر تو ہم نے یہاں کے آسمان (و) زمین ہی بدلے ہوئے پائے -

— زمین الٹ مارنا (ف م) سارے میں ڈھونڈ مارنے کا مبالغہ ، تا حد امکان تلاش کرنا - م: صراحی دار موتیوں کے لیے آسمان زمین الٹ مارے کہیں دستیاب نہ ہوئے -

— زمین الٹ جانا (ف ل) زمانے کے حالات دگرگوں ہو جانا ، دستور قاعدے برعکس ہو جانا ، انقلاب کلی ہو جانا - م: چند ہی سال میں یہاں کے تو آسمان زمین ہی الٹ گئے ، اور ہی کچھ کارخانہ ہو گیا -

— زمین اور ہو جانا (ف ل) صورت حالات بالکل بدل جانا ، اور سے اور ہو جانا ، انقلاب عظم ہو جانا - م: پائے تخت ہونے کے بعد جو دلی کو جا کر دیکھا تو وہاں کے تو زمین آسمان ہی اور ہو گئے تھے -

— زمین ایک کر دینا یا ایک کر ڈالنا } (ف م) ۱۔ ہنگامہ برپا کرنا ، ہل چل ڈال دینا۔ وہ سن لیں گے تو آسمان مین ایک کر ڈالیں گے (۲۔ نہایت جد و جہد ، سعی بلیغ کرنا ، تلاش کر عالم چھان مارنا۔

نہ ملا اس کا پر سراغ کہیں
ایک کر ڈالے آسمان و زمیں (تلو

— زمین ایک ہو جانا } (ف ل) ۱۔ دونوں جہان تہ و بالا اور گڈ مڈ ہون عالم زیر و زبر ہونا۔ م: زلزلہ تھا کہ قیامت ! ؛ چیز جھوٹے کہا رہی توی ، چھتیں الٹی جا رہی تھیں آسمان ، زمین ایک ہو رہے تھے۔ ۲۔ مصائب ٹوٹنا انقلاب آنا۔ م: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں پھر آسمان زمین ایک ہونے کو ہیں ، آپس میں لڑے بغیر نہیں رہیں گے۔

— زمین ایک ہونا

— زمین بہم ہونا (ف ل) ۱۔ دیکھو: آسمان و زمین ایک ہونا۔ ۲۔ قیامت آ جانا ، خواہ کچھ ہی ہو جانا۔

ہوں بہم گرچہ آسمان و زمیں
بات یہ ہم سے کھلنے والی نہیں

(مثنوی عالم ، صفحہ ۳۰)

— زمین دوسرے ہو جانا } (ف ل) عالم بدل جانا ، انقلاب کلی ہو جانا۔ م: جنگ عظیم کے بعد جو جا کر دیکھا تو زمین آسمان ہی وہاں کے دوسرے ہو گئے تھے۔

زمین سیاہ ہو جانا (ف ل) ۱۔ اندھیر تمام میں چھا جانا۔ م: ایسا لگی دل آیا کہ آسمان زمین سیاہ ہو گئے۔ ۲۔ عالم نظروں میں تاریک ہو جانا (بے حد رنج و الم کی حالت میں):

ہو گیا ہجر میں جہان سیاہ
ہے زمین اور آسمان سیاہ (ناسخ)

زمین کا فرق (مذ) نہایت بین فرق ، دن رات کا فرق ، اختلاف عظیم ۔
م : نئی دلی اور پرانی دلی میں آسمان زمین کا فرق ہے ۔
م : میاں بیوی کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔

زمین کے قلابے ملانا (قلابے) { (ف ل) مراد ھل چل مچا دینا ، قیامت ڈھانا ، انقلاب بپا کرنا ۔

گھبرا کے ایک آہ بھی کھینچوں اگر اسیر
قلابے آسمان و زمین کے ملاؤں میں

۲۔ حد درجے جھوٹ بولنا ، بے حد مبالغہ کرنا ۔

نقشے جو مہ سے مہر جبیں کے ملاتے ھیں
قلابے آسمان و زمیں کے ملاتے ھیں
(نادان)

۳۔ بے تکی باتیں کرنا ، بکواس کرنا ، لاف زنی کرنا ۔

قلابے آسمان و زمین کے ملا نہ تو
اس مہروش سے ملنے کی ناصح بتا صلاح
(ذوق)

۴۔ چرب زبانی ، سخن سازی کرنا ، جوڑ توڑ چلنا ۔م : خدا جانے وھاں جا کر کیا زمین آسمان کے قلابے ملائے کہ دم بھر میں راضی کر لیا ۔

باور جنھیں ھوں ان سے یہ باتیں بنائیے
قلابے آسمان و زمیں کے ملائیے

زمین میں ٹھکانا نہ ھونا { (ف ل) کہیں گھر در میسر نہ ھونا ، انتہائی بربادی ، خانہ بدوشی ، بے خانمانی کی حالت ھونا ۔

بے خانماں ھوں جاؤں کہاں کوئے یار سے
ہے آسمان میں نہ ٹھکانا زمین میں
(رشک)

— زمین میں سناٹا ہوجانا { (ف ل) ۱- کل کائنات میں سکوت اور خاموشی محسوس ہونا - ۲- (مراد) سامعین کا محویت میں رہ جانا - م:
میر انیس پڑھ کر اٹھتے تو آسمان و زمین میں سناٹا ہو جاتا -

— زمین میں فرق نہ رہنا { (ف ل) نظم عالم درہم برہم ہوجانا ، بساط کائنات لپٹ سمٹ جانا -

باقی رہے نہ فرق زمین آسمان میں
اپنا قدم اٹھالیں اگر درمیاں سے ہم (صبا)

۲ - آسمان و زمین کا درمیانی فاصلہ مٹ جانا - م: ہوا میں بھی جہاز دوڑ رہے ہیں ، آسمان زمیں میں کچھ فرق نہیں رہا -

— زمین ہلا دینا (ف م) ارض و سما میں زلزلہ ڈال دینا ، سب کو لرزا دینا :

تڑپا تو آسمان و زمیں کو ہلا دیا (برق)

— (و)زمین ہل جانا (ف ل) ۱ - ارض و سما میں زلزلہ یا تہلکا مچ جانا -

زمیں و آسماں ہل ہل گئے ہیں
شب فرقت مری آہ حزیں سے (عاقل)

— سر پر اٹھا لینا } (ف م) ۱ - شور و شر مچانا، غلغلہ برپا کرنا -
— سر پر اٹھانا } شور و شر کرتے ہیں اس ہستی دو روزہ پر
آسماں اہل زمین سر پہ اٹھا لیتے ہیں (رند)

م: حکم کے ساتھ ہی دھونسوں اور باجوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا - (لال قلعے کی جھلک ، صفحہ ۴۰)
۲ - لاف مارنا ، تعلیاں کرنا -

نہ ہو آغاز پر نازاں مآل کار کو دیکھے
یہ پتلا خاک کا کیوں آسماں سر پر اٹھاتا ہے (رند)

سر پر پھٹ پڑنا (ف ل) (دیکھو : آسمان پھٹ پڑنا) شدت یا زور ہونا ۔

سر پر توڑنا (ف م) ۱ ۔ مصیبت عظیم نازل کرنا، آفت شدید توڑنا ، سخت حادثہ ڈالنا ۔

سر زمیں کوچۂ جاناں کی چھڑائی مجھ سے
آسمان غم کا فلک نے مرے سر پر توڑا (صبا)

سر پر ٹوٹ پڑنا (ف ل) زمانے بھر کی مصیبتیں بلائیں اور حادثات پیش آجانا ، بلائے ناگہانی پڑنا، غضب نازل ہوجانا :

ٹوٹ پڑتا آسمان سر پر جو رفعت مانگتا (بحر)،
دیکھو : آسمان ٹوٹ پڑنا

سر پر گرنا (ف ل) سخت مصیبت نازل ہونا ، مصیبت کا پہاڑ گر پڑنا:

جب سے گرا ہے سر پہ یہاں آسمان داغ
رہتا ہے مہر و ماہ پہ مجھ کو گمان داغ (بحر)

سے اُترنا (ف ل) ۱ ۔ اندر لوک سے نازل ہونا ۔ م ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پریاں آسمان سے اُتر آئی ہیں ۔ ۲۔ فوق العادت ، غیر معمولی ، عمدہ ، نادر ہونا ۔ م : زمین پر تو ہوتے نہیں اس لذت کے آم ، آسمان سے اُترے ہیں ۔ ۳ ۔ خدا کی طرف سے انا ، غیب سے پہنچنا ۔ م: من و سلویٰ آسمان سے اترتا تھا ۔ ۴ ۔ (مزاج کے ساتھ) اوسانوں میں آنا، دھیما پڑنا، کم ہونا ۔ م: مزاج ان کے کبھی آسمان سے اترتے بھی ہیں؟ ۔ ۵ ۔ بے منت و تکلف، مفت میں میسر انا ۔ م: نوکری آسمان سے تو اترتی نہیں ، کوشش سے ملتی ہے ۔

سے باتیں کرنا (ف م) ۱۔ بغایت بلند ہونا ، نہایت اونچا ہونا ۔ م : ہمالیہ کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں ۔ م: وہ اتش سحر ایسی تھی کہ ہر ایک شعلہ اس کا اسمان سے باتیں کرتا تھا (۸۔ بوستان خیال ، صفحہ ۱۸۷) ۲۔ آسمان سے ٹکرانا، آسمان تک پہنچنا، بہت بلند و بالا ہونا ۔ ع:

کرے ہے آہ مری آسماں سے باتیں (معروف)

جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے
باتیں ہیں وہ آسمان سے کرتے
(حالی ، برکھارت)

۳ - عام سطح پر نہ رہنا ، بلند پرواز و مغرور ہو جانا ، اونچ کی لینا - م: امیر ہوکر ان کے دماغ تو آسمان سے باتیں کرنے لگے -

- سے پتال (تک) جانا } (ف ل) آسمان زمین کے قلابے ملانا، حد درجہ کوشش و پیروی کرنا -

گر آپ آسمان سے پتال جائیے
مانوں گی اب نہ ایک، نہ یہ راگ لائیے
(جان صاحب)

- سے تارے اتارنا (ف م) ناممکن کام کر دکھانا، محال کام کرنا -

وہ بولی جو تو کہے زباں سے
تارے بھی اتاروں آسماں سے (گلزار نسیم)

۲- اچھوتے اور اعلا مضامین باندھنا ، سوتی ڈھالنا - م: آپ شعر نہیں کہتے واللہ آسمان سے تارے اتارتے ہیں!

- سے تارے توڑ لانا
- سے تارے توڑنا } (ف م) دیکھو : آسمان سے تارے اتارنا :

آسماں سے توڑ کر تارے تو لا سکتے نہیں (سائل)

- سے ٹکرانا (ف ل) ۱- مبالغہ بہت بلند ہونے کا - م : سر تو دیکھو اسمان سے ٹکراتا ہے - م: موجیں اٹھتی تھیں اور آسمان سے ٹکراتی تھیں (۱ - الف لیلہ ، حیرت ، صفحہ ۴۰) -

- سے ٹکر کھانا (ف ل) بہت اونچا ہوجانے کا مبالغہ، سماں سے ٹکرانا ، فلک کو چھونا - م: پتنگ تو آسمان سے ٹکر کھانے لگی-

سے جا لگنا　(ف ل) تارا ہوجانا، بہت بلند ہوجانا ۔ م : گیند آسمان سے جا لگی ۔ م : کجھور آسمان سے جا لگی ۔

سے گرا کجھور میں اٹکا　(کہاوت) زیادہ دشوار مرحلے سے کام نکل جانا مگر ایک معمولی یا غیر متوقع جگہ پر آکر پھر اٹک جانا ۔ کٹھن سے نکل الجھن میں جا پڑنا ۔ کام روا ہو کر پھر رک جانا ۔ م: گورنمنٹ سے منظوری آ گئی تھی ضلع میں روک لی گئی، وہی مثل ہے کہ آسمان سے گرا کجھور میں اٹکا ۔

سے گرنا　(ف ل) ۱ - بڑے مرتبے سے نزول پانا ۔ م : آسمان سے گر کر بھی نپولین کا غرور نہ گیا، اپنے تئیں شہنشاہ کہلوانے کا اصرار کرتا رہا ۔

زمیں سے اڑے آسماں سے گرے ہم
رہے عشق میں تیرے یاں کے نہ واں کے (محمود)

۲ - مفت کا رستے میں پڑا پایا ہونا، مفت میں ہاتھ لگنا۔

پر نہ اتنا بھی سہل جان مجھے
آسماں سے نہیں گرا ہوں میں (تپش)

سے گزرنا　(ف ل) ۱- فلک کے پار ہونا ۔

نہیں معلوم کہ ہے عرش خدا کتنی دور
آسماں سے تو مری آہ گزر جاتی ہے

شق ہونا　(ف ل) قیامت برپا ہونا، آسمان پھٹ پڑنا (گناہ عظیم کے ارتکاب کے موقع پر اکثر استفہام میں، نفیاً و فجاءتاً مستعمل) م : ہے ہے آسمان شق نہ ہوا اس پر بجلی نہ گر پڑی ! ع :

کیوں زمین پھٹتی نہیں شق آسماں ہوتا نہیں
(غافل)

کا تارا　(مذ) بالکل ہی دسترس سے باہر، نایاب، نادر ۔

مصحفی ہاتھ کیوں نہ آئیں گے
ایسے کیا آسماں کے تارے ہیں

۲- (مبالغے سے) بہت بلند کے لیے- م : گینذ کا تارا ہو گئی !

— کا تانتوا (مذ) (پورب) بارش کا تار یا سلسلہ - م : آسمان ٹوٹ پڑا تھمتا ہی نہیں -

— کا تھوکا منہ پر آتا ہے (کہاوت) لفظاً ، آسمان کی طرف منہ اٹھا کر جائے تو تھوک الٹ کر تھوکنے والے کے منہ پڑتا ہے - (مراد) بڑوں پر طعنہ زن ہونے والے نصیب ہوتی ہے - پاک دامنوں کو عیب تھوپ رسوا ہی ہو کر رہتا ہے :

نہ ہووے طعنہ زن کوئی بزرگ و پاک د

کہ تھوکا آسماں کا آدمی کے منہ پر آ

— کا دیا (مذ) روشن چاند ، قمر -

— کا رکھنا نہ زمین کا (ف م) ۱- بالکل کھوجڑا کھو دینا ، بے ٹھکانا کر

دل شق ہوا ہے تیرے ہاتھوں سے گنبد آسما

اس کو رسن کا رکھا نے آسماں کا رکھا

— کا گولا (مذ) ۱- وہ گولا (توپ وغیرہ کا) جو اوپر سے اچا ان کر پڑے ، از غیبی گولا - ۲- ناگہانی ضرر یا صدمہ آسمانی دھکا - م : ایسا آسماں کا گولا لگے کہ عمر ہرا ہے (کو سا) - ۳- (کنایتہ) آفتاب -

— کو پہنچانا (ف م) دیکھو : آسمان پر پہنچانا -

— کو جھانک کر آنا (ف ل) ۱- خدا کے گھر سے لوٹ آنا ، موت کے منہ سے بچ جانا سخت بیماری سے اچھا ہو جانا ، مر مر کے بچنا - م: میاں اب کے تو ہم آسمان کو جھانک آئے طاعون نے پکڑ لیا تھا -

— کو دیکھنا (ف م) دیکھو : آسمان دیکھنا

کو لے اُڑنا (ف م) دیکھو: آسمان پر لے اُڑنا۔

کو ہلا دینا (ف م) دیکھو: آسمان ہلا دینا

کھا گیا کہ زمین } (محاورہ۔ استفہام میں استعجاباً) کہاں اور کدھر گم یا غائب ہو گیا؟ کیا ہوا؟ م: روپیا یہاں سے تو نے نہیں لیا تو پھر بتا تیرے سوا کون تھا؟ آسمان کھا گیا کہ زمین؟

کہاں گیا مرا قاصد خبر نہیں اُس کی
زمیں نے کھایا ہے یا آسمان نے کھایا (ظفر)

کھل جانا (ف ل) ۱۔ بادل پھٹ کر تارے یا دھوپ نکل آنا، ابر سے مطلع صاف ہوجانا، بارش کا ختم ہونا۔ آسمان کھل جائے تو اسے سو کھنے کو ڈال دو۔

کھو نچا (مذ) ۱۔ کنکڑ یعنی بڑے نیچے کا حصہ جس کی نے سڑک سے کوٹھوں تک پہنچی ہے۔ ۲۔ (پھبتی کے طور پر) دراز قد، لمبو۔

کی (مث) مراد، عالم بالا کی، اُس جہان کی:
پوچھو زمین کی تو کہے آسمان کی

کی تاکنا (ف ل) ۱۔ دیکھو: آسمان تاکنا۔ معنی ۵، ۶ ۲۔ خیالات بے جا کرنا۔ م: پیٹ میں پڑی تو لگے آسمان کی تا کنے، نواب زادی پر ڈورے ڈالنے۔

کی جھاڑو (مث) (عو) دم دار ستارہ۔

کی چیل (مث) مراد، ہر کے سے کام کرنے والی (عو)۔ م: آسمان کی چیل گھر کی اصیل، (ساس کی تعریف)۔

کی خبر لانا (ف م) لفظاً، عالم بالا کی کیفیت دیکھ کر بیان کرنا۔ ۲۔ عالم بالا پر پہنچنا، دنیا سے غائب ہو جانا۔ م: سر شام سے، لمبی تان کر جو سوئے ہیں تو آسمان کی خبر لاتے ہیں۔ ۳۔ بہت بلند ہونا (مبالغہ)۔ م: اتنا

بلند ہو جاتا ہے غبارہ کہ آسمان کی خبر لاتا ہے ۔

— کی رقاصہ (مث) مراد ناہید فلک ، زہرہ ستارہ ۔

— کی سوچنا (سونچنا) (ف م) ۱۔ اونچے او نچے منصوبے گانٹھنا ، بڑے بڑے منصوبے باندھنا ۔ م: جب سوچتے ہیں آسمان کی ہی سو چتے ہیں آسمان سے ورے کی نہیں سوچتے۔ ۲۔ بلندی کی دھن میں ہونا ، فلک تک ارادۂ پرواز رکھنا ۔

شکایت کیا تمھارے آستاں کی
زمیں بھی سوچتی ہے آسماں کی (انور)

— کی سیر (مث) کرنا ، ہونا کے ساتھ ۔ ۱۔ عالم بالا و ملاء اعلیٰ کی سیر ، لاھوت ، ملکوت ، عرش و کرسی ، دوزخ ، جنت ، سب کا نظارہ (تصوف) ۔

صورت نہیں جو دیکھتے اس خاک داں کی
دل میں میسر اُن کو ہے سیر آسمان کی

۲۔ چاند ، ستاروں ، سیاروں کی کیفیت ، حال چال ، گردش وغیرہ دیکھنا اور غور و تفحص کرنا (نجوم و رصد) ۔ م : رصد والے دوربین لگائے آسمان کی سیر میں دن رات مصروف ہیں ۔ ۳۔ ستاروں بھرے آسمان کا نظارہ ۔

افشاں کو اُس کی دیکھوں کہ اس آسمان کو
ماتھے نے اُس کے مات کی سیر آسمان کی

۴۔ خیالات کی بلندی ، جو لانی :

اسمان کی سیر کرتاھوں میں ساقی کے سبب
نشۂ بادہ مجھے عقل فلاطوں ہو گیا
(کہف)

— کی طرف دیکھنا (ف م) دیکھو : آسمان دیکھنا ۔ م : سوتیلی ماں کے سوال وصل پر شاہزادہ آسمان کی طرف دیکھ کر رہ گیا (۱۔ الف لیلہ ، حیرت ، صفحہ ۱۷)

کی کمان (مث) قوس قزح ، قوس فلک ، دھنک ۔

نکلا کرے گی قوس قزح کب تلک یہاں
کب تک چڑھی رہے گی کمان آسمان کی

کی مطربہ (م ؕ ط ر ب ہ) (مث) دیکھو آسمان کی رقاصہ ۔

کے تارے توڑ لانا (ف م) ۱- فوق طاقت بشری کام کرنا ، محال کو ممکن کر دکھانا ، دشوار سے دشوار کام انجام دینا ۔ م : میں تمھارا غلام ہوں کہو تو آسمان کے تارے توڑ لاؤں ۔ (۱- طلسم ، صفحہ ۳۴۸) ۲- اچھوتے مضامین پیدا کرنا ۔

سہرے کو تیرے پھول ہیں کیا باغباں کے
لاؤں گا تارے توڑ کے خود آسمان کے
(نادان)

کے تارے توڑنا (ف م) ۱- دیکھو : آسمان کے تارے توڑ لانا ۔ م : واہ میرے نواب بات تو بڑے پتے کی کہی ہم تو تم کو ایسا عقل مند نہیں جانتے تھے ، تم نے کچھ پڑھا لکھا ہی نہیں ۔ اگر پڑھ لکھ لیتے تو آسمان کے تارے توڑ لاتے ۔ (ان پڑھ میاں ، صفحہ ۴۸)

کے طبق (مذ) آسمان کی سات یا چودہ بلندیاں یا درجے جو عام طور پر بیان کیے جاتے ہیں ۔ ہفت آسمان ۔ م : آپ کی ولادت کے وقت فرشتے جھک گئے ، آسمان کے طبق روشن ہو گئے ، شجر و حجر سے مبارک بادیں بلند ہوئیں ۔ (مولود شریف)

گرنا (ف ل) مصائب نازل ہونا ، گردش آنا ، بجلی ٹوٹنا ۔

ہم پہ گرتا ہے آسمان ستم
محفل عیش ہوتی ہے برہم (قلق)

گھرنا (ف ل) ابر چھانا ، گہری گھٹا ہونا ۔ م : آسمان گھرا ہوا ہے ۔

گیر (مذ) سائبان ، شامیانہ ، شبنمی ، چھتر - م : اوس ، سوتے ہو تو آسمان گیر تو لگالو -

لینا (ف م) آسمان کو چھونا ، فلک پر پہنچنا :

نالے ہفت آسمان لیتے ہیں

گر آستان جاناں پر سر ٹکا سکیں ہم
کلبانگ سر بلندی اٹھہ اٹھہ کے آسمان لیں

- میں تھگلی لگانا (ف م) ۱- لفظاً ، آسمان کو پیوند جوڑنا - ۲- چالا کی عیاری ، دلالہ پن یعنی کٹناپا - م : میری بیوی کی ایک انّا تھی جو آسمان میں تھگلی لگاتی تھی ، آفت کی پرکالہ تھی - (۲ - الف لیلہ ، حیرت ، صفحہ ۱۳) :

مہتاب اور زہرہ ہیں دونوں وہ کٹنیاں
تھگلی لگائیں چھید کریں آسمان میں
(جان صاحب)

۳- محال کام کرنا -

ممکن نہیں گزر ہو جو اُن کے مکان میں
تھگلی بھی ہم لگائیں اگر آسمان میں
(نادان)

- میں چھید کرنا (ف م) دیکھو : آسمان میں تھگلی لگانا :

تھگلی لگائیں چھید کریں آسمان میں
(جان صاحب)

- میں چھید ہو جانا (ف ل) آسمان میں شگاف ہو جانا (مراد) مینھہ کا تار نہ تھمنا ، موسلا دھار برسے جانا - م : آج تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان میں چھید ہو گیا ہے -

- میں ڈوب جانا (ف ل) انتہائی بلندی پر اڑنا ، نظر سے غائب ہو جانا ، اُفق سے آگے اڑ جانا - م: پتنگ آسمان میں ڈوب گئی -

- میں لگ جانا (ف ل) دیکھو : آسمان سے جا لگنا - م: نوج اتنا قد ہو کہ سر آسمان میں لگ جائے !

- میں نہ زمین میں { (محاورہ) کہیں نہیں ۔ م : روپے سے کام ہوتے ہیں اور روپے کی یہ کیفیت ہے کہ روپیا آسمان میں نہ زمین میں !

آسماں میں نہ زمیں میں ہے نشان درویش
عالم ہو نظر آتا ہے مکان درویش
(امیر)

- نکل آنا (ف ل) ۱۔ مطلع ابر و غبار سے صاف ہو جانا ۔ م : آسمان نکل آیا تارے کھلے ہوئے ہیں ۔

- نہ پھٹ پڑے (بول چال میں) آسمان شق نہ ہو جائے، قیامت نہ آجائے۔ صریح جھوٹ ، تہمت ، ظلم اور گناہ کبیرہ و سخت کے ارتکاب پر مجازاً مستعمل ۔ م : الٰہی یہ بے عزتی ، یہ بد زبانی ، یہ طوفان بندی ، کہیں ان لڑ نیوں پر آسمان نہ پھٹ پڑے !

- نے ڈالا زمین نے جھیلا { (کہاوت ۔ پورب) محض بے بسی ، ناچاری کے موقع پر مستعمل زبردست کی زیادتی سہنے اور اطاعت کرنے کے سوا غریب کو چارہ نہیں ۔ (امیر اللغات) ۔

- والا (مذ) اللہ تعالیٰ ، مالک اسمان ، خداوند عرش۔ م: لوگو تم زمین والوں پر رحم کرو ، آسمان والا تم پر رحم کرے گا ۔ (م ۔ ح ۔ ف ، صفحہ ۹۳)

- ہلا مارنا (ف ل) دیکھو : آسمان ہلا دینا

اک ذرا ہل کے ادھر آؤ نہیں تو دیکھو
آسماں تک بھی مرا نالہ ہلا مارے گا (ظفر)

- ہل جانا (ف ل) آسمان کو جنبش ہونا ، جھنجھوڑی آنا ، تھراہٹ ہونا (مراد) اہل آسمان کا دہل جانا ، غضب الٰہی کو جنبش ہونا ۔ م : مظلوم کی فریاد سے آسمان ہل جاتا ہے ۔

آسمانا (فعل ل، کسب۔ م) حلول کرنا، کسی چیز میں سماجانا، در آنا۔ م : خدا جانے دماغ میں کیا خناس آ سمایا کہ ...... [ہ : آ (بطور فعل امدادی) + سمانا]

آسمانی (ص) ۱۔ آسمان سے منسوب۔ ۲۔ اکاس کا، سماوی، فلکی

گزرتی عمر ہے یوں دور آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتیٔ دخانی میں (ذوق)

۳۔ خدا اور دیوتاؤں کی، مقدس، الٰہی۔ الہامی، م : سنسکرت کو ہندو آسمانی زبان مانتے ہیں۔ ۴۔ (الف) آسمان سے زمین پر ٹپکنے یا گرنے والا، اوپری، بالائی، جیسے آسمانی گولا (ب) غیبی، تقدیری۔ م : آسمانی دھکا ایک یہ بھی قسمت میں لکھا تھا، کہ جس بنک میں روپیا ان کا جمع تھا اس کا دیوالہ نکل گیا ساری رقم ماری گئی۔ ۵۔ اچانک ناگہانی :

گری اس پہ جو اسمانی بلا
دل اس نازنیں کا ہوا ہو چلا (میر حسن)

۶۔ خدا کا، خدائی اٹل :

ناچار اس میں قسمت تدبیر اس میں عاجز
اس سے مفر نہیں ہے یہ حکم آسمانی (نادان)

۷۔ (تصوف) معرفت کا، صوفیانہ، عرفانی :

پلا ساغر آسمانی مجھے
جو دکھلا دے دنیا کو فانی سجھے (حسن)

۸۔ آسمان کے رنگ کا، نیلگوں، فیروزی، نیلا، آبی۔

رلا رہا ہے صنم ہم کو اشک زنگاری
ہے چوڑیوں کا تری یہ جو آسمانی بند
(۸ ۔ مصحفی)

ع: جو مکھڑا چاند سا ہے تو دو پٹا آسمانی ہے (وزیر)

۹- (اسم) ملاء اعلیٰ کا باشندہ ، اہل آسمان ، فرشتے ، روحیں وغیرہ -

کو آدم و فرشتہ کجا یہ مجال ہے
ہوں آسمانیوں کے برابر زمینیاں
(مصحفی)

اس جلو میں زمینیاں حاضر
جاہ کے اسمانیاں ناظر (میر)

۱۰- انسان کی قدرت و اختیار سے خارج ، قدرتی ، موسمی، ارضی و سماوی ، ناگہانی جیسے آتش زدگی ، خشک سالی، اولا ، پالا ، آندھی ، ٹڈی ، سیلاب وغیرہ (اکثر لفظ آفات کے ساتھ) - م آفات آسمانی سے جو نقصان ہو بٹے دار کے ذمے ہو گا ۔مالک سے اس کو واسطہ نہ ہوگا (شرط پٹہ) -

[ف : آسمان + ی (نسبتی و وصفی)]

آفات / آفت
(مث) ۱- آفات ارضی و سماوی ، موسمی و قدرتی نقصانات جو آندھی ٹڈی ، بارش ، غرقابی ، زلزلے وغیرہ سے ہو جائیں - م : آفات آسمانی سب بٹے دار کے ذمے ہوں گے (شرط پٹہ) ۲- غیبی دھکا ، ناگہانی مصیبت۔ م: آسمانی آفتیں تجارت میں بھی ہیں اور تاجروں کو جھیلنی پڑتی ہیں - ۳- گردش تقدیر ، مصائب روزگار ، ابتلا ، چکر - م : آفات آسمانی میں مبتلا بیچارے مارے مارے پھرتے ہیں - ۴- عجیب و غریب و مہیب و خوفناک چیز - م: کتے نے موٹر دور سے دیکھی تھی اب یہ جو آفت آسمانی سر پر کھڑی دیکھی تو دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے - (دلی کی آوازیں ، صفحہ ۸۰)

باپ
(مذ) عیسائیوں کے محاورے میں خدا تعالیٰ - م: بیٹی ! آسمانی باپ رحیم و کریم بھی ہے - (مضامین ناصر نذیر فراق ، صفحہ ۱۹)

— بلا (مث) ۱۔ دیکھو : آسمانی آفت

گری اُس پہ جو آسمانی بلا
دل اُس نازنیں کا ہوا ہو چلا (میر حسن

— بوچھاڑ (مث) ۱۔ وہ بھرمار جو بارش یا اولوں وغیرہ سے
۲۔ خدا کی هزار در هزار لعنت ۔

— تھپیڑا (مذ) ۱۔ قدرت کی طرف سے ہلکی سر زنش یا تنبیہ۔ جب کسی قوم کے گناہ حد سے بڑھ جاتے ہیں تو زلز قحط و وبا وغیرہ کے آسمانی تھپیڑے لگنے شروع ہو میں یہاں تک کہ پورا عذاب نازل ہو جاتا ہے اور قوم برباد کردی جاتی ہے۔ ۲۔ مفت کا نقصان ، غی دھکا ۔ م : دیکھو : آسمانی آفت ۔

- تیر (مذ) وہ خدنگ جو آسمان کی طرف چھوڑا جاوے، یا ہ میں غائب ہو جائے ، خدنگ ہوائی ، ہوائی تکا ۔ ۲ ۔ ا تیر جو آسمان سے اچانک آ کر پڑے ، شخص نامعلوم تیر ۔ م: کسی آسمانی تیر سے ہلاک ہوا۔ ۳۔ دور از کا بات ، اٹکل پچو بات، عقلی تکا ۔ م: اسمانی تیر چھوڑنے سے کیا فائدہ عقل کی بات درو!

— جالا (مذ) بارش کی آب پاشی ، آسمانی تری (دیہات) ۔

— حکم (مذ، قضا و قدر کا اٹل فیصلہ، خدا کا فرمان، مشیت ایزدی، تقدیری امر ۔

لاچار اس میں حکمت تدبیر اس میں عاجز
اس سے مفر نہیں ہے یہ حکم آسمانی (نادان)

— دھکا ۱۔ اچانک زبردست نقصان ۔ ۲۔ ناگہانی حادثہ یا صدمہ ۔ م: مظلوم کی آہ بری ہوتی ہے، ایسا آسمانی دھکا لگے گا کہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ جاؤ گے ۔

— رنگ (مذ) ابی ، ہلکا نیلا ۔

— سلطانی (مث) (دکن) وہ آفت جو آسمان سے نازل ہو، جیسے آندھی، ٹڈی ، اولے وغیرہ یا جو حکم بادشاہ سے کلے

بندے جیسے بیگار یا جرمانہ وغیرہ ۔ م: بعد میں کچھ آسمانی سلطانی ہو تو ہم ذمےدار نہیں ۔

— غضب (مذ) ۱۔ قہر الہی ۔ م: سنگین اولوں کی بھرمار آسمانی غضب کا نمونہ تھی ۔ ۲۔ بلائے ناگہانی ۔ ۳ ۔ حادثۂ عظیم ۔ م: کیا خبر تھی کہ یہ آسمانی غضب ٹوٹ پڑے گا ۔

— فرمانی (مث) (دکن) دیکھو آسمانی سلطانی ۔

— فیصلہ (مذ) دیکھو : آسمانی حکم ۔

— قہر (مذ) دیکھو : آسمانی غضب ۔ ع :

وہ چشم قہر، قہر آسمانی کا نمونہ ہے (ظفر)

— کتاب (مث) پیغمبروں کے الہاموں کا مجموعہ، جو کتاب کی صورت میں مدون کر لیا گیا ہو، الہامی صحیفہ، مراد توریت، زبور، انجیل، وغیرہ کتب سماوی ۔ م: مگر بہت سے پڑھے لکھے ہندو ان (ویدوں) میں سے صرف تین کو آسمانی کتاب جانتے ہیں (۱ ۔ رسوم ہند، صفحہ ۳)

تری ہر بات پر ظالم ہمیں گردن جھکانی ہے
ترا چہرہ ہمیں ظالم کتاب آسمانی ہے
(ارشد گورگانی)

(مجازاً) نہایت فصیح و بلیغ بے عیب کلام :

شہیدی تشنہ ہوں ان صاحبوں کی قدردانی کا
سمجھتے ہیں کتاب آسمانی میرے دیوان کو (شہیدی)

— گولا (مذ) ۱۔ لفظاً، وہ گولا، اینٹ، پتھر، جو فضا میں سے اچانک آن پڑے یا جس کا پھینکنے والا نامعلوم ہو ۲ ۔ اگن گولوں کی بارش ۔ م: فریقین جنگ کے آسمانی گولوں سے ایک لندن کیا سارا یورپ کھنڈر ہوجائے گا ۔ ۳ ۔ آفت ارضی و سماوی جو ناگہانی نازل ہو، خصوصاً ژالہ باری ۔ م: آسمانی گولوں نے کھیتیاں مسمار کردیں ۔

م : دفعتاً آسمانی گولا پڑنا شروع ہوا یعنی برف گرنے لگی - (۲ - قصص ہند ، صفحہ ۲) - ۵ - اچانک صدمہ ، اتفاقیہ حادثہ ، مرگ ناگہانی - م: آسمانی گولا ایسا آن کر پڑا کہ محفل شادی بزم ماتم بن گئی۔

— مار (مث) ۱ - دیکھو : آسمانی گولا ، آسمانی دھکا - ۲- (عو) خدا کا غضب، قہر الہی - م: تجھ پر آسمانی مار پڑے۔ ۳ - دیکھو : آسمانی بوچھاڑ -

آسن (مذ) ۱ - بیٹھنے کا طور ، وضع نشست ، بیٹھک - م : گھنٹوں ایک آسن سے بیٹھے رہنا مشکل کام ہے- ۲ - رانوں کا زاویہ ، ران کی محراب ، جنگھاسا ، جانگ - م : آسن میں بیٹھ کر اکھیڑ کی (کشتی)- ۳- (سوار کے) رانیں جما کر بیٹھنے کی ترکیب ، رانوں کی داب ، دبوچ :

کرتا ہے مجھ سے ابلق ایام شوخیاں
پہچانتا نہیں ابھی آسن سوار کا (آتش)

م: (ہاتھی) کے تئیں انکس اور آسن کے زور سے زیر کرتے ہیں - (آرائش محفل ، صفحہ ۱۸) ۴ - جانگھ ، ران :

ڈب تلک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے تیرے در پر تو مرا آسن جلا
(میر تقی میر)

۵- سواری ، چڑھی ، جیسے آسن گانٹھنا میں - ۶- (جوگ مختلف ریاضتوں میں بیٹھنے کے خاص طریق - م : جوگیوں کے چالیس چلے چوراسی آسن مشہور ہیں - ۷ - (جوگ چلہ کشی اور ریاضت کی جگہ ، خلوت نشینی کا مقام ، مٹھ مڑھی ، مڑھی ، کٹی ، سمادھ - م : اشنان کے بعد اپنے آسن پر جانے لگا (باغ و بہار) - ۸ - نمدے کا ٹکڑا مرگ چھالا وغیرہ ، جس پر عبادت کے وقت (ہندو بیٹھتے ہیں ، پوجا پاٹ کی گدی ، آسنی ، پاٹی - م اشنان کے بعد آسن بچھا کر پوجا پاٹ کرنے لگا -


رُوح افزا
کی پیکنگ
کا نیا انداز
جدید نفیس سُبک سیلوفین پیکنگ
ہمدرد نے مشروب مشرق رُوح افزا کو سیلوفین کے
جدید پیکٹوں میں پیش کرکے ایک بار پھر نئی مثال قائم
کردی ہے رُوح افزا ان نئے محفوظ اور مشین بند
پیکٹوں میں دستیاب ہونے کے علاوہ ہمیشہ کی طرح آپ کی
بوتلوں میں بھی ملتا رہے گا۔ رُوح افزا کا ہر پیکٹ ایک
گلاس بنانے کے لئے کافی ہے
جانی پہچانی
مفرح اور لذیذ
۱۴ پیکٹوں کے ڈبوں
میں دستیاب ہے
ہمدرد دواخانہ (وقف) کراچی ۔ لاہور ۔ ڈھاکہ ۔ چٹاگانگ